ادارۂ فروغِ اُردو ۰ لاہور

یہ شوکت تھانوی کا نیا ناول ہے۔ یہ واحد لکھنے والے
ہیں جنکے قلم نے کبھی بھی اپنے معیار سے نیچے آتر ناگوارا
نہ کیا اور یہی انکی مقبولیت کا راز بھی ہے۔ قیمت ۳/۸

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۵۳، ۵۴

دسمبر سنہ ۱۹۵۵ء

افسانہ نمبر

(انتخاب سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک)

مرتّب

محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

قیمت افسانہ نمبر
دس روپے

سالانہ قیمت
پندرہ روپے

ترتیب

اُردو کی پہلی کہانی

۱ ۔ رانی کیتکی — اِنشاء اللہ خاں انشاء ، ۹

طویل مختصر داستانوں کا دور

۲ ۔ طوطا کہانی — حیدر بخش حیدری ، ۲۵
۳ ۔ آرائشِ محفل — حیدر بخش حیدری ، ۲۹
۴ ۔ باغ و بہار — میرامّن دہلوی ، ۴۱
۵ ۔ بیتال پچیسی — مظہر علی ولا و للو لال ، ۵۸
۶ ۔ سنگھاسن بتیسی — کاظم علی جوان و للو لال ، ۶۰
۷ ۔ انشائے نورتن — محمد بخش مہجور ، ۶۵
۸ ۔ فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرور ، ۶۹
۹ ۔ الف لیلہ — حسن علی خاں کشمیری ، جعفر علی خاں و شدید الدین خاں ، ۷۴

ناولوں کا دور

۱۰ ۔ بھروسا — ڈپٹی نذیر احمد ، ۹۴
۱۱ ۔ جامِ سرشار — رتن ناتھ سرشار ، ۱۰۲
۱۲ ۔ دل و دنیا — شرر لکھنوی ، ۱۱۸
۱۳ ۔ شریف زادہ — مرزا محمد ہادی رسوا ، ۱۲۱
۱۴ ۔ بھنور کی دلہن — راشد الخیری ، ۱۳۱

ترجموں کا دور

۱۵ ۔ تولہ بھر ریڈیم — ظفر علی خاں ، ۱۴۰
۱۶ ۔ نجم السحر — عنایت اللہ دہلوی ، ۱۵۰
۱۷ ۔ شاعر کی وصیت — عبدالرزاق ملیح آبادی ، ۱۸۹
۱۸ ۔ بیتا — خواجہ منظور حسین ، ۱۵۹
۱۹ ۔ کیڈوہ کا مصوّر — منصور احمد ، ۱۶۳
۲۰ ۔ بلّی کے بچے — جلیل قدوائی ، ۱۶۸
۲۱ ۔ مصوّر کا راز — حامد علی خاں ، ۱۷۲
۲۲ ۔ دلہن کی پوشاک — فضل حق قریشی ، ۱۷۹
۲۳ ۔ ہڈیوں کا پنجر — تیرتھ رام فیروز پوری ، ۱۸۴

افسانوی مضامین کا دور

۲۴ - شہزادے کا بازار میں گھسٹنا — خواجہ حسن نظامی ، ۱۹۴
۲۵ - اوکھلے کی سیر — آغا حیدر حسن ، ۱۹۷
۲۶ - جہان آباد — ناصر نذیر فراق ، ۲۰۱
۲۷ - دربارِ دہلی کی کنکوا بازی — عشرت لکھنوی ، ۲۰۶
۲۸ - زود پشیماں — چودھری افضل حق ، ۲۰۹
۲۹ - ریاکار — فلک پیما ، ۲۱۷
۳۰ - پربت کی بیٹی — چراغ حسن حسرت ، ۲۲۰
۳۱ - حاجی بغلول، لاہور میں — اشرف صبوحی ، ۲۲۷

اُردو افسانہ

پہلا دور

۳۲ - خارستان و گلستان — سجاد حیدر یلدرم ، ۲۳۲
۳۳ - طوقِ آدم — سلطان حیدر جوش ، ۲۴۶
۳۴ - کیوپڈ و سائیکی — نیاز فتحپوری ، ۲۵۳
۳۵ - سمن پوش — مجنوں گورکھپوری ، ۲۷۴
۳۶ - بھینٹ — ل ۔ احمد ، ۲۸۳
۳۷ - تیسری جنس — محمد علی ردولوی ، ۲۸۹

دُوسرا دور

۳۸ - کفن — پریم چند ، ۲۹۶
۳۹ جاں نثار — سدرشن ، ۳۰۲
۴۰ - چینی کی انگوٹھی — عظیم بیگ چغتائی ، ۳۰۸
۴۱ - پریم کی چوڑیاں — اعظم کریوی ، ۳۱۵
۴۲ - اندھا دیوتا — حکیم احمد شجاع ، ۳۲۲
۴۳ - تین پیسے کی چھوکری — قاضی عبدالغفار ،
۴۴ - میلہ گھومنی — علی عباس حسینی ،
۴۵ - ڈالی کا جوگ — حامد اللہ افسر
۴۶ - زندگی — عاشق بٹالوی ، ۳۴۵
۴۷ - لاری میں — فیاض محمود ، ۳۵۴
۴۸ - ـــ کہ عالم دوبارہ نیست — امتیاز علی تاج ، ۳۶۲
۴۹ - بیلے — عابد علی عابد ، ۳۷۱
۵۰ - کیمیاگر — پروفیسر مجیب ، ۲۸۲
۵۱ - دولت خانہ — شوکت تھانوی ، ۲۹۲
۵۲ - صنوبر کے سائے — حجاب امتیاز علی ، ۴۰۳
۵۳ - نیا مریض — ایم اسلم ، ۴۰۸
۵۴ - نازو — اختر انصاری ، ۲۸۹
۵۵ - درونِ تیرگی — میرزا ادیب ، ۳۹۷

۵۶ - بنتِ قمر — صادق الخیری ، ۴۲۲
۵۷ - لکھ داتا — شیر محمد اختر ، ۴۳۲
۵۸ - رسیلا — مسز عبدالقادر ، ۴۳۵
۵۹ - سنبھالا — صالحہ عابد حسین ، ۴۴۹

تیسرا دور

(انگارے کے افسانے)

۶۰ - نیند نہیں آتی — سجاد ظہیر ، ۴۶۲
۶۱ - مہاوٹوں کی ایک رات — احمد علی ، ۴۶۷
۶۲ - دلی کی سیر — رشید جہاں ، ۴۷۱
۶۳ - جوانمردی — محمود الظفر ، ۴۷۳

چوتھا دور

۶۴ - زندگی کے موڑ پر — کرشن چندر ، ۴۷۸
۶۵ - نیا قانون — سعادت حسن منٹو ، ۵۰۱
۶۶ - گرہن — راجندر سنگھ بیدی ، ۵۰۸
۶۷ - چوتھی کا جوڑا — عصمت چغتائی ، ۵۱۴
۶۸ - ہماری گلی — احمد علی ، ۵۲۳
۶۹ - آنندی — غلام عباس ، ۵۳۲
۷۰ - پرمیشر سنگھ — احمد ندیم قاسمی ، ۵۴۱
۷۱ - آپا — ممتاز مفتی ، ۵۵۳
۷۲ - زعفران کے پھول — خواجہ احمد عباس ، ۵۶۱
۷۳ - مجھے جانے دو — اختر حسین رائے پوری ، ۵۶۹
۷۴ - حجاموں کی یونین — ملک راج آنند ، ۵۷۴
۷۵ - نئی مصیبتیں — رشید جہاں ، ۵۸۱
۷۶ - حرامجادی — حسن عسکری ، ۵۸۵
۷۷ - زریں تاج — عزیز احمد ، ۵۹۶
۷۸ - آخری کوشش — حیات اللہ انصاری ، ۶۰۹
۷۹ - بینگن کا پودا — اوپندر ناتھ اشک ، ۶۲۶
۸۰ - لال دھرتی — دیوندر ستیارتھی ، ۶۳۰
۸۱ - کلیاں اور کانٹے — اختر اورینوی ،
۸۲ - جگا — بلونت سنگھ ، ۶۵۸
۸۳ - بھالو — ہاجرہ مسرور ، ۶۷۲
۸۴ - خون — انور ، ۶۷۸
۸۵ - جلاوطن — قرۃ العین حیدر ، ۶۸۷
۸۶ - بینوں سے چلے بابلا سے چلے وے — خدیجہ مستورہ ، ۷۱۴
۸۷ - جینی — شفیق الرحمٰن ، ۷۱۸
۸۸ - الاؤ — سہیل عظیم آبادی ، ۷۳۵

۸۹ - آئینہ — ممتاز شیریں، ۷۴۵
۹۰ - زرد چہرے — ابراہیم جلیس، ۷۵۹
۹۱ - سردار جسونت سنگھ — قدرت اللہ شہاب، ۷۶۵
۹۲ - ٹوٹ گیا اک تارا — تسنیم سلیم چھتاری، ۷۷۳
۹۳ - سمندر اور تین کھڑے — مدھوسودن، ۷۹۲
۹۴ - کلوا — سید رفیق حسین، ۸۰۸
۹۵ - سرگزشت — ابوالفضل صدیقی، ۸۱۵
۹۶ - جہاں میں رہتا ہوں — مہندر ناتھ، ۸۳۰
۹۷ - آب حیات — رامانند ساگر، ۸۴۲
۹۸ - باجی ولایت — آغا بابر، ۸۵۰
۹۹ - آنکھ مچولی — شکیلہ اختر، ۸۵۹
۱۰۰ - اب اور تب — ہنس راج رہبر، ۸۶۴
۱۰۱ - روپ چند — صدیقہ بیگم سیوہاروی، ۸۷۰
۱۰۲ - تجاوز — عبدالرحمٰن چغتائی، ۸۷۶

پانچواں دور

۱۰۳ - گڈریا — اشفاق احمد، ۸۸۴
۱۰۴ - راون کے دیس میں — اے حمید، ۹۰۹
۱۰۵ - تیسرا آدمی — شوکت صدیقی، ۹۲۲
۱۰۶ - اجودھیا — انتظار حسین، ۹۳۸
۱۰۷ - سمجھوتہ — پرکاش پنڈت، ۹۴۵
۱۰۸ - چاند بجھ گیا — سرلا دیوی، ۹۵۳
۱۰۹ - موم کی مریم — جیلانی بانو، ۹۵۷
۱۱۰ - لڑھکتی چٹان — انور عظیم، ۹۶۶

مقالات

۱۱۱ - داستان سے افسانے تک — سید وقار عظیم، ۹۸۰
۱۱۲ - مختصر افسانے کا فن — عبادت بریلوی، ۹۹۳
۱۱۳ - مغربی افسانہ کا اثر اُردو افسانہ پر — ممتاز شیریں، ۱۰۰۵
۱۱۴ - اُردو افسانے کا مستقبل — محمد حسن عسکری، ۱۰۲۲
۱۱۵ - اُردو افسانے میں روایت اور تجربے — (مذاکرہ) ۱۰۲۷

محمد طفیل پرنٹر پبلشر ایڈیٹر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اُردو لاہور سے شائع کیا

نیاز فتحپوری
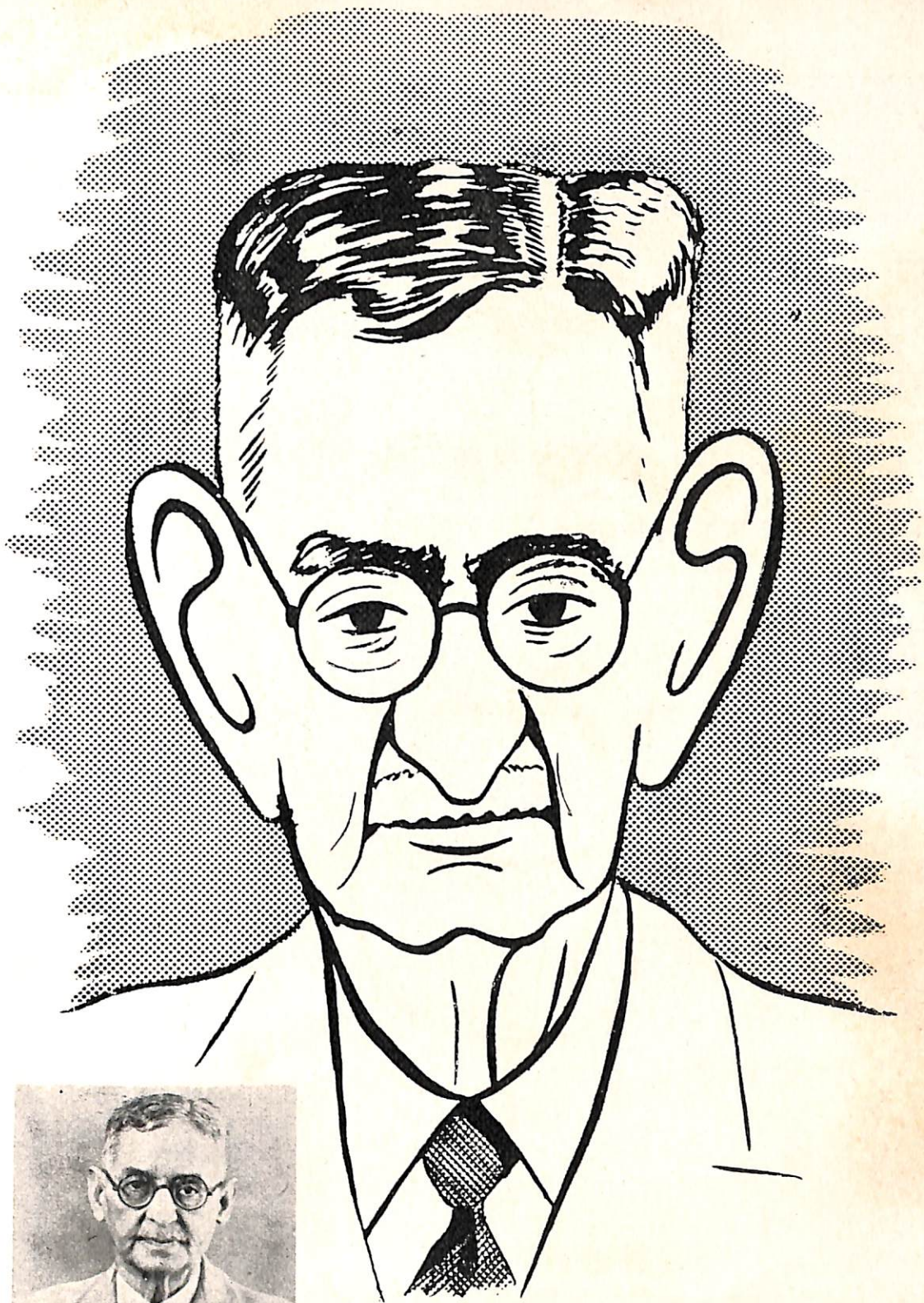
سجاد حیدر یلدرم
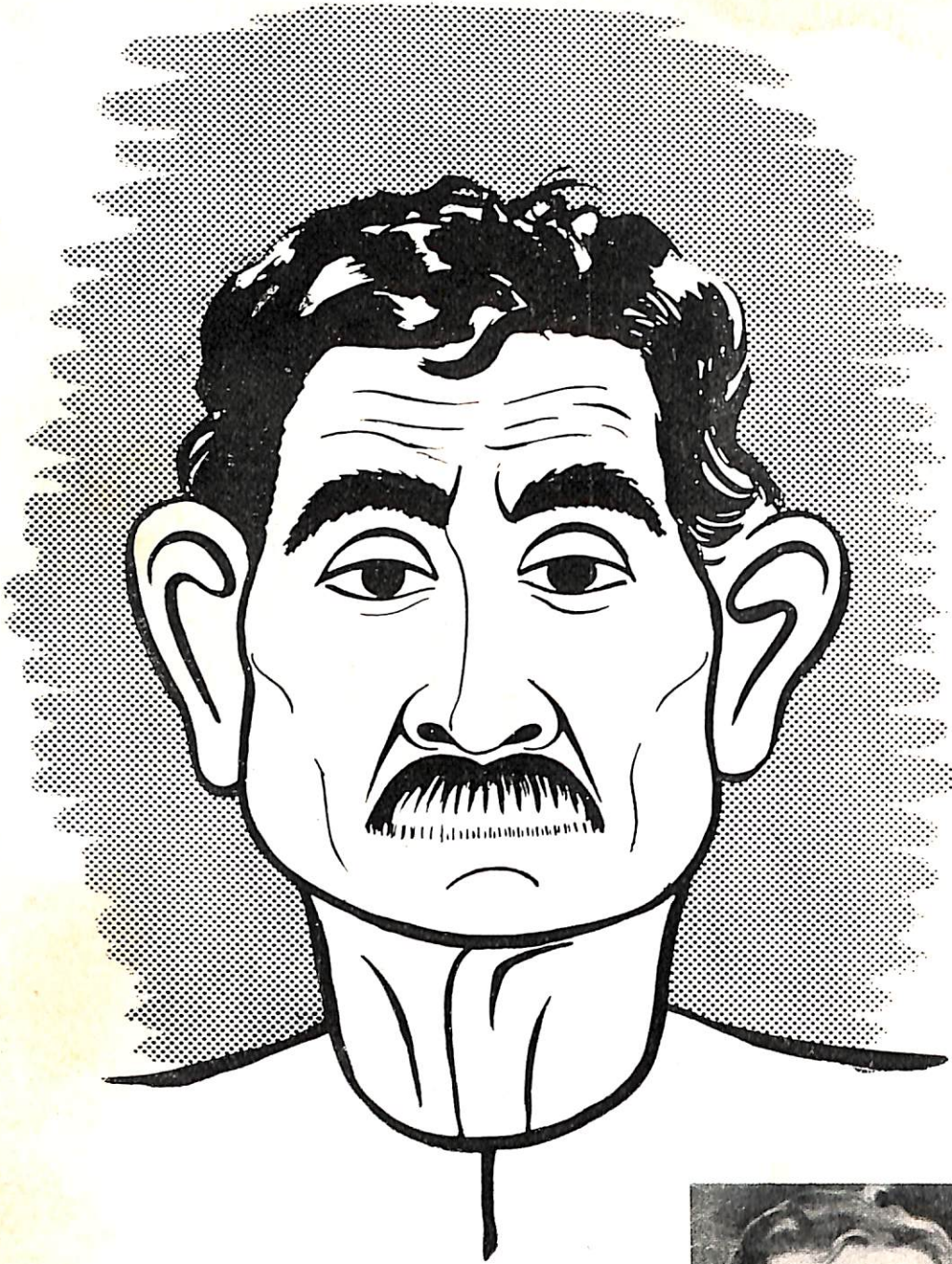
پریم چند

حجاب امتیاز علی
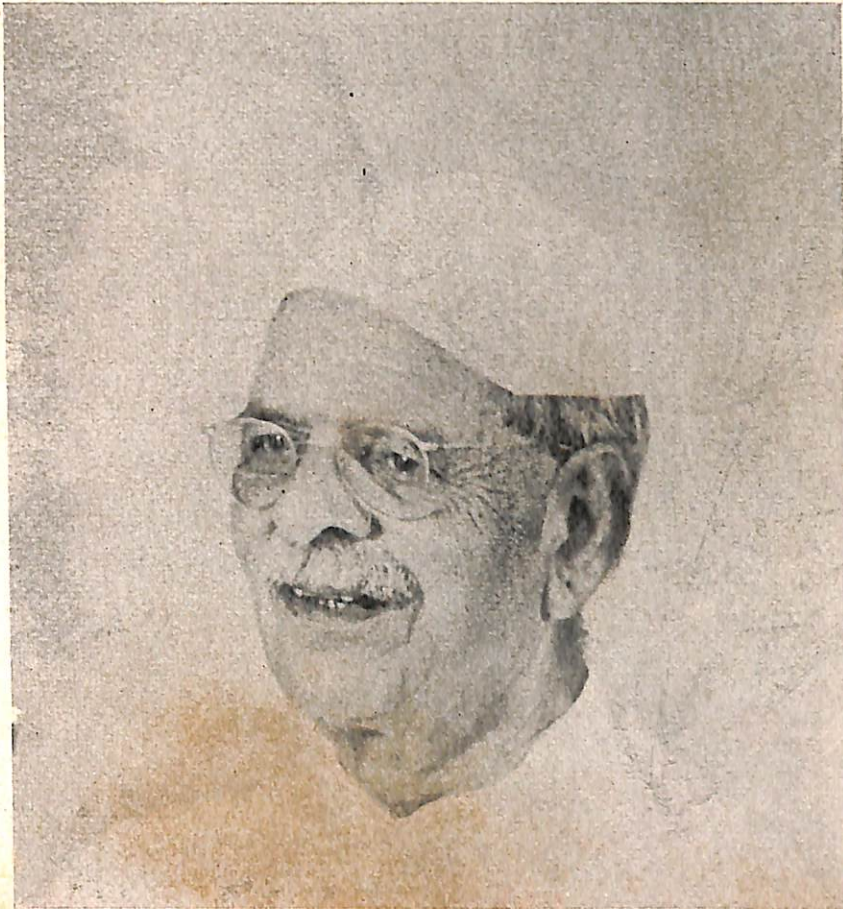
چودھری محمد علی
(ردولوی)

طلوع

کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچّہ پیدا ہُوا۔ جو بے حد ذہین، موٹا تازہ اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر اُتر آتا تو چُپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ درسلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔

مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچّے کو اپنی ماں کا دُودھ نصیب نہ ہُوا۔

جب یہ بچّہ کچھ بڑا ہُوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پُختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدّن اور اپنی معاشرت سے بے حد اُنسیّت پیدا ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی یاوہ گوئی نہ رہی، قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا، ایک تسلسل تھا اور ایک نقطۂ نظر تھا۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اِسی بے منزلی میں اس نے، اپنے مُلک سے دُور، مغرب کے بچّوں سے یارانہ گانٹھا۔ کیونکہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اُس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصوّر کر لیا۔ اور اس کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دُہرا دُہرا کر بہت کچھ سیکھا۔

مغربی بچّوں کی دیکھا دیکھی جب اُس نے اُسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا۔ تو اپنی چال بھی بھُول گیا۔ نہ اُن بچّوں والی کوئی بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعضوں کو اِسکی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذبذب کی یہ کیفیت اُس پر زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وہ بچّے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمّت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔

آپ کو سُنکر حیرت ہو گی کہ وہ بچّہ جو بعد میں بالغ ہو کر جوان بھی ہُوا آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گذار رہا ہے۔

یہ کہانی اُردو افسانے کی تھی۔

محمد طفیل

پرچے کی ترتیب اور افسانوں کے چناؤ میں کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، وقار عظیم، احتشام حسین، عبادت بریلوی اور محمد حسن عسکری کے مشورے بھی شامل رہے ہیں۔

اس پرچے کی ترتیب کے بارے میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن جن راہوں سے گذر کر اُردو افسانے نے موجودہ شکل پائی اس کا دور بہ دور یہ ایک تفصیلی ڈھانچہ ہے۔

نظریاتی اختلاف کے باوجود میں نے کسی بھی افسانہ نگار کو نظرانداز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے، نہ ہی کسی کے فنی اعتبار سے، اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ اپنے ذمہ لیا ہے، ہو سکتا ہے کہ پڑھے لکھوں کا ایک طبقہ میری اس قدر فراخ دلی کو عیب کا درجہ دے دے لیکن میں اپنی جگہ مطمئن ہوں۔ اس لئے کہ کسی صنفِ ادب کے انتخاب میں جو مرتب کے فرائض ہونے چاہئیں، ان سے (شاید) پوری طرح عہدہ برآ ہوا ہوں۔

رہا افسانوں کے انتخاب کا قصہ، وہ تو ہے ہی اپنی اپنی پسند کا معاملہ، لیکن میری پسند میں مشہور افسانہ نگاروں اور نامور نقادوں کی پسند بھی شامل ہے۔

افسانہ نگاروں اور نقادانِ کرام کے تعاون کے ساتھ پبلشر دوستوں میں خصوصیت کے ساتھ مکتبہ اُردو، مکتبہ جدید، نیا ادارہ کا بھی شکر گذار ہوں، ورنہ یہ نمبر اتنی جامعیت کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نقوش کے ٹائیٹل ایشیا کے نامور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی اعجاز کاریوں کے شاہکار ہیں۔ ادارۂ نقوش کو ان کی اشاعت پر فخر ہے۔

اسکیچ اور کتابوں کے چھوٹے چھوٹے ٹائیٹل نوجوان آرٹسٹ جاؔلی کے فن کے آئینہ دار ہیں۔

(مرتب)

(۱)

داستانوں کا دور

اُردو کی پہلی کہانی

رانی کیتکی

انشاءاللہ خاں انشاءؔ

سیّد انشاء اللہ خاں انشاء

رانی کیتکی

(سنہ ۱۸۰۳ء)

سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں اوس اپنے بنانے والے کے سامنے جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں وہ سب کر دکھایا جس کا بھید کسی نے نہ پایا۔

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں
اوس کے بن دھیان سب یہ پھانسیں ہیں

یہ کل کا پتلا جو اپنے اوس کھلاڑی کی سدھ رکھے تو کھٹائی میں کیوں پڑے؟ اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اوس پھل کی مٹھائی چکھے جو بڑوں سے بڑے اگلوں نے چکھی ہے۔

دیکھنے کو آنکھ دی اور سننے کو یہ کان دیئے۔ ناک بھی اونچی سب میں کر دی مورتوں کو جی دان دیئے۔ مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں، جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ تاڑ سکے؟ سچ ہے جو بنایا ہوا ہو، سو اپنے بنانے والے کو کیا سراہے؟ اور کیا کہے؟ یوں جس کا جی چاہے پڑا بکے۔ سر سے لگا پاؤں تک جتنے رونگٹے ہیں جو سب کے سب [illegible] اٹھیں اور سراہا کریں اور اتنے برسوں[1] اسی دھیان میں رہیں جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں تو بھی کچھ نہ ہو سکے۔

اس سر جھکانے کے ساتھ ہی دن رات جپتا ہوں اوس داتا کے بھیجے ہوئے پیارے کو جس کے لئے یوں کہا ہے "جو تو نہ ہوتا میں کچھ نہ بناتا"، اور اوس کا چچیرا بھائی جس کا بیاہ اوسی کے گھر ہوا اوس کی سرت[2] مجھے لگی رہتی ہے۔ میں پھولا اپنے آپ میں نہیں سماتا اور جتنے اون کے لڑکے بالے ہیں اونہیں کے یہاں پر چاؤ[3] ہے اور کوئی ہو، کچھ میرے جی کو نہیں بھاتا۔ مجھے اس گھرانے کے چھٹ[4] کسی لے بھاگ، اوچک، چور، ٹھگ سے کیا پڑی؟
جیتے مرتے اونہیں سبھوں کا آسرا اور اون کے گھرانے کا رکھتا ہوں تیسوں گھڑی —
ڈول ڈال ایک انوکھی بات کا

---

۱ (ن) برس - ۲ دھیان - ۳ محبت - ۴ سوا -

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی سے نپٹ[1] نہ ملے، تب جاکے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اوس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے سر ہلا کر[2] موںہ بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر لگے کہنے، یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکھا پن نہ ٹھُوس[3] جائے۔ جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی ڈول رہے اور چھانہہ کسی کی نہ پڑے، یہ نہیں ہونے کا! میں نے اون کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا انوکھا بولا[4] نہیں، جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے اونگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی اوجھی سلجھی باتیں سمجھاؤں[5]۔ جو مجھ سے نہ ہوسکتا، تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا؟ جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اوسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ دھنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا، جو بجلی سے بھی بہت چنچل، اچھلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے اپنی چوکڑی بھول جائے۔

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں
کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اوس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی
کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

اب آپ کان رکھ کے سنمکھ[6] ہو کے ٹک ادھر دیکھئے کس ڈھب سے بڑھ چلتا ہوں اور اپنے ان پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ سے پھول اوگلتا ہوں۔

(کہانی کا اوبھار اور بول چال کی دولہن کا سنگار)

کسی دیس میں کسی راجہ کے گھر ایک بیٹا تھا اوسے اوس کے ماں باپ اور سب گھر کے لوگ کنور اودے بھان کہہ کے پکارتے تھے۔ سچ مچ اوس کے جوبن کی جوت میں سورج کی ایک سوت آ ملی تھی۔ اوس کا اچھا پن اور بھلا لگنا کچھ ایسا نہ تھا جو کسی کے لکھنے اور کہنے میں آسکے۔ پندرہ برس بھر کے سولہے میں پاؤں رکھا تھا۔ کچھ یوں ہیں سی اوس کی مسیں بھیگتی چلی تھیں۔ اکڑ تکڑ اوس میں بہت سی سما رہی تھی، کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ پر کسی بات کے سوچ کا گھر گھاٹ پایا نہ تھا اور چاہ کی ندی کا پاٹ اون نے دیکھا نہ تھا۔ ایک دن ہریالی دیکھنے کو اپنے گھوڑے پر چڑھ کے اٹھکیل پنے اور لڑکپن[7] کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے آئی، تو اس کا جی لوٹ پوٹ ہوا۔ اس ہرنی کے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا اپھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اوس کو پا سکتا تھا؟ جب سورج چھپ گیا اور ہرنی آنکھوں سے اوجھل ہوئی، تب تو یہ کنور اودے بھان بھوکا پیاسا اوداسا جانبائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہکا بکا ہو کے لگا آسرا ڈھونڈھنے۔ اتنے میں کچھ امریاں دھیان چڑھیں اودھر چل نکلا۔ تو کیا دیکھتا ہے؟ چالیس پچاس رنڈیاں[8] ایک سے ایک جوبن میں اگلی[9] جھولا ڈالے ہوئے پڑی جھول رہی ہیں اور ساون گاتیاں ہیں۔ جو انھوں نے اوس کو دیکھا، تو کون؟ تو کون؟ کی چنگھاڑ سی پڑ گئی (اون سبھوں میں سے ایک کے ساتھ اس کی آنکھ لڑ گئی)۔

دوہا:-

کوئی کہتی تھی یہ اوچکا ہے   کوئی کہتی تھی ایک پکا ہے

---

[1] بالکل۔ [2] (ن) ٹھٹھیا۔ [3] (ن) گھس۔ [4] (ن) بڑبولا۔ [5] (ن) سجاؤں۔ [6] روبرو، سامنے۔
[7] (ن) الھڑپن۔ [8] عورتیں۔ [9] بڑھ کر۔

وہی جھولنے والی لال جوڑا پہنے ہوئے جس کو سب رانی کیتکی کہتے تھے، اوس کے بھی جی میں اس کی چاہ نے گھر کیا۔ پر کہنے سننے کو اس نے بہت سے ناہ نوہ کی۔ اس لگ چلنے کو بھلا کیا کہتے ہیں؟ یک نہ یک[1] جو تم جھٹ سے ٹپک پڑے یہ نہ جانا جو یہاں رنڈیاں اپنی جھول رہی ہیں۔ اجی تم جو اس روپ کے ساتھ بے دھڑک چلے آئے ہو، ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں چلے جاؤ۔ تب انھوں نے مسوس[2] کے ملولا[3] کھا کے کہا کہ اتنی رکھائیاں نہ دیکھیے۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھانہہ میں اوس کا بچاؤ کر کے پڑ رہوں گا۔ بڑے تڑکے دھوندلکے اوٹھ کر جدھر کو منہ پڑے گا چلا جاؤں گا۔ کسی کا لیتا دیتا نہیں۔ ایک ہرنی کے پیچھے سب لوگوں کو چھوڑ کر گھوڑا پھینکا تھا جب تلک اوجالا رہا، اوسی کے دھیان میں تھا۔ جب اندھیرا چھا گیا اور جی بہت گھبرا گیا، ان امریوں کا آسرا ڈھونڈھ کر یہاں چلا آیا ہوں۔ کچھ روک ٹوک تو نہ تھی جو ماتھا ٹھنک جاتا اور رک رہتا، سر اوٹھائے ہانپتا ہوا چلا آیا۔ کیا جانتا تھا پدمنیاں یہاں پڑی جھولتی، پینگیں چڑھا رہی ہیں۔ پر یوں ہی بدی تھی، برسوں میں بھی جھولا کروں گا۔ یہ بات سن کر جو لال جوڑے والی، سب کی سر دھری تھی اوس نے کہا: ہاں جی بولیاں ٹھولیاں نہ مارو۔ ان کو کہہ دو جہاں جی چاہے اپنے پڑ رہیں اور جو کچھ کھانے پینے کو مانگیں سو انھیں پہنچا دو۔ گھر آئے کو کسی نے آج تک مار نہیں ڈالا۔ ان منہ کا ڈول گال تمتمائے اور ہونٹھ پپڑائے اور گھوڑے کا ہانپنا اور جی کا کانپنا اور گھبراہٹ اور تھرتھراہٹ اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا اور نڈھال ہو کر گرے پڑنا ان کو سچا کرتا ہے۔ بات بنائی اور سچوٹی[4] کی کوئی چھپتی ہے؟ پر ہمارے اور ان کے بیچ میں کچھ اوٹ سی کپڑے لتے کی کر دو۔ اتنا آسرا پا کے سب سے پرے کونے میں جو پانچ سات چھوٹے چھوٹے پودے سے تھے اون کی چھانہہ میں کنور اودے بھان نے اپنا بچھونا کیا۔ سرہانے ہاتھ دھر کے چاہتا تھا سو رہے، پر نیند کوئی[5] چاہت کی لگاوٹ میں آتی تھی؟ پڑا پڑا اپنے جی سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں کیا ہوتا ہے؟ جو رات سائیں سائیں بولنے لگتی ہے اور ساتھ والیاں سب سو رہتی ہیں، رانی کیتکی اپنی سہیلی مدن بان کو جگا کر یوں کہتی ہے۔ اری تو نے کچھ سنا ہے؟ میرا جی اس پر آ گیا اور کسی ڈول سے نہیں تھم سکتا۔ تو سب میرے بھیدوں کو جانتی ہے، اب جو ہونی ہو سو ہو۔ سر رہتا رہے جاتا جائے، میں اوس کے پاس جاتی ہوں۔ تو میرے ساتھ چل، پر تیرے پاؤں پڑتی ہوں کوئی سننے نہ پاوے۔ اری یہ میرا جوڑا میرے اور اس کے بنانے والے نے ملا دیا۔ میں اسی لئے ان امریوں میں آئی تھی۔ کیتکی مدن بان کا ہاتھ پکڑے وہاں آن پہنچتی ہے جہاں کنور اودے بھان لیٹے ہوئے کچھ سوچ میں پڑے پڑے بڑبڑا رہے تھے۔ مدن بان آگے بڑھ کے کہنے لگی۔ تمھیں اکیلا جان کے رانی آپ آئی ہیں۔ کنور اودے بھان یہ سن کے اوٹھ بیٹھے اور یہ کہا کیوں نہ ہو جی سے جی کو ملاپ ہے۔ کنور اور رانی دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے، پر مدن بان دونوں کے بدن گدگدا رہی تھی۔ ہوتے ہوتے اپنے اپنے پتے سب نے کھولے۔ رانی کا پتہ یہ کھلا۔ راجہ جگت پرکاس کی بیٹی ہیں اور ان کی ما رانی کام لتا کہلاتی ہیں۔ ان کو ماباپ نے ان کے کہہ دیا ہے ایک مہینے پیچھے امریوں میں جا کے جھول آیا کرو۔ آج وہی دن تھا سو تم سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ بہت مہاراجوں کے کنوروں کی باتیں آتیاں پر کسی پہ ان کا دھیان نہ چڑھا۔ تمھارے دھن بھاگ، جو تمھارے پاس سب سے چھپ کے ہیں جو ان کی لڑکپن کی گوئیاں[6] ہوں مجھے ساتھ اپنے لے کے آئیں ہیں۔ اب تم اپنی کہانی کہو کہ تم کس دیس کے کون ہو۔ انھوں نے کہا میرا باپ راجہ سورج بھان اور ما رانی لچھمی باس ہے، آپس میں جو گٹھ جوڑا ہو جائے، تو انوکھی اچرج اور اچنبھے کی بات نہیں۔ یوں ہی آگے سے ہوتا چلا آیا ہے[7]۔ جیسا منہ ویسی تھپیڑ[8] جوڑ توڑ ٹول لیتے ہیں۔ دونوں مہاراجوں کو یہ چیت[9] چاہی بات اچھی لگے گی۔ پر ہم تم دونوں کے جی کا گٹھ جوڑ اچا ہے۔ اسی میں مدن بان بول اوٹھی۔ سو تو ہوا۔ اب اپنی اپنی انگوٹھیاں ہیر پھیر کر لو اور آپس میں لکھوٹی[10] بھی لکھ دو۔ پھر کچھ ہچر مچر نہ رہے۔ کنور اودے بھان نے اپنی

---

۱ یکایک۔ ۲ فکر کر کے۔ ۳ رنج، غم، افسوس۔ ۴ جو سچ نہ ہو۔ ۵ (ن) کہیں۔ ۶ سہیلی۔ ۷ (ن) ہوتی چلی آئی۔ ۸ (ن) تھپیڑا۔ ۹ منشا کے مطابق، حسب مراد۔ ۱۰ تحریر۔

انگوٹھی رانی کیتکی کو پہنا دی اور رانی کیتکی نے انگوٹھی کنور کی انگلی میں ڈال دی[1] اور ایک دھیمی سی چٹکی بھی لے لی۔ اس میں مدن بان بول اٹھی جو سچ پوچھو تو اتنی بھی بہت ہوئی اتنا بڑھ چلنا اچھا نہیں میرے سر چوٹ ہے۔ اب اٹھ چلو اور ان کو سونے دو اور پڑے رونے دو۔ بات چیت تو ٹھیک ٹھاک ہو چکی تھی، پچھلے پہر سے رانی تو اپنی سہیلیوں کو لیکے جدھر سے آئی تھی ادھر چلی گئی اور کنور اودے بھان اپنے گھوڑے کی پیٹھ لگ کر اپنے لوگوں سے مل کر اپنے گھر پہنچے۔ کنور جی کا انوپ روپ کیا کہوں کچھ کہنے میں نہیں آتا۔ کھانا نہ پینا نہ لگ چلنا نہ کسی سے کچھ کہنا نہ سننا جس دھیان میں تھے اوسی میں گھو بیٹھے رہنا اور گھڑی گھڑی کچھ کچھ سوچ سوچ سر دھننا۔ ہوتے ہوتے اس بات کا لوگوں میں چرچا پھیل گیا۔ کسی کسی نے مہاراج اور مہارانی سے بھی کہا، کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ کنور اودے بھان جن سے تمہارے گھر کا اوجالا ہے ان دنوں کچھ اس کے برے تیور اور بے ڈول آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ گھر سے باہر پانوں نہیں دھرتا۔ گھر والیاں جو کسی ڈول سے بہلاتیاں ہیں تو اور کچھ نہیں کرتا ایک اونچی سانس لیتا ہے بہت کسی نے چھیڑا تو چھپر کھٹ پر جا کے اپنا منہ لپیٹ کے آٹھ آٹھ آنسو پڑا روتا ہے۔ یہ سنتے ہی ماں باپ کنور کے پاس دوڑے آئے۔ گلے لگایا منہ چوما، پانوں پر بیٹے کے گر پڑے، ہاتھ جوڑے اور کہا۔ جی کی بات ہے سو کہتے کیوں نہیں؟ کیا دکھ پڑا[2]، جو پڑے پڑے کراہتے ہو؟ راج پاٹ جس کو چاہو دے ڈالو۔ کہو تو تم کیا چاہتے ہو۔ تمہارا جی کیوں نہیں لگتا؟ بھلا، وہ ہے کیا، جو ہو نہیں سکتا، منہ سے بولو، جی کھولو جو کہنے میں کچھ سکچتے[3] ہو تو ابھی لکھ بھیجو۔ جو کچھ لکھو گے جوں کی توں وہی کر تمہیں دے جاویں گے۔ جو تم کہو کنوئیں میں گر پڑو تو ہم دونوں ابھی گر پڑتے ہیں، جو کہو سر کاٹ ڈالو تو ابھی سر کاٹ ڈالتے ہیں۔ کنور اودے بھان وہ جو بولتے ہی نہ تھے انھوں نے لکھ بھیجنے کا آسرا پا کے اتنا بولے "اچھا آپ سدھاریے میں لکھ بھیجتا ہوں۔ پر میرے اوس لکھ بھیجنے کو میرے منہ پر کسی ڈھب سے نہ لانا، نہیں تو میں شرماؤں[4] گا۔ اسی لئے منہ بات[5] ہو کے میں نے کچھ نہ کہا" اور یہ لکھ بھیجا۔ "اب جو میرا جی ناک میں آگیا اور کسی ڈھب نہ رہا گیا اور آپ نے مجھے سو سو روپ سے کھولا اور بہت سا ٹٹولا، تب تو لاج چھوڑ کے ہاتھ جوڑ کے منہ کو پھاڑ کے گھگیا کے یہ لکھتا ہوں۔ جگ میں چاہ کے ہاتھوں کسی کو سکھ نہیں ہے۔ بھلا، وہ کون ہے جس کو دکھ نہیں۔ وہ اس دن جو میں ہریالی دیکھنے کو گیا تھا، وہاں جو میرے سامنے ایک ہرنی کنوتیاں اوٹھائے ہوئے ہو لی تھی اس کے پیچھے میں نے گھوڑا باگ چھٹ پھینکا، جب تک اوجالا رہا اسی کے دھن میں چلا گیا۔ جب اندھیرا ہو گیا اور سورج ڈوبا تب جی میرا بہت اوداس ہوا۔ امریاں تاک کے میں اون میں گیا، تو اون امریوں کا پتا پتا میرے جی کا گاہک ہوا، وہاں کا یہ سہل[6] ہے، کچھ رنڈیاں جھولا جھول رہیں تھیں۔ اون سب کی سر دھری کوئی رانی کیتکی مہاراجہ جگت پرکاس کی بیٹی ہیں اونھوں نے یہ انگوٹھی اپنی مجھے دی اور میری انگوٹھی انھوں نے لی اور لکھاوٹ[7] بھی لکھ دی۔ سو یہ انگوٹھی اون کی لکھاوٹ سمیت میرے لکھے ہوئے کے ساتھ پہنچتی ہے۔ آپ دیکھ لیجیے اور جس میں بیٹے کا جی رہ جائے وہ کیجیے۔" مہاراج اور مہارانی اوس بیٹے کے لکھے ہوئے پر سونے کے پانی سے یوں لکھتے ہیں۔ ہم دونوں نے اوس انگوٹھی اور لکھاوٹ کو اپنی آنکھوں سے ملا۔ اب تم اپنے جی میں کچھ کڑھو مت جو رانی کیتکی کے ماں باپ تمہاری بات مانتے ہیں تو ہمارے سمدھی اور سمدھن ہیں، دونوں راج ایک جا کہ ہو جائیں گے اور جو کچھ نانہ نوہ کی ٹھیرے گی تو جس ڈول سے بن آویگا ڈھال تلوار کے بل تمہاری دلہن ہم تم سے ملا دیں گے، آج سے اوداس مت رہا کرو کھیلو کودو بولو چالو آنند[8] کرو۔ اچھی گھڑی شبھ مہورت سوچ کے تمہارے سسرال میں کسی باہمن کو بھیجتے ہیں جو بات چیت چاہیے ٹھیک کر لادے۔ باہمن جو شبھ گھڑی دیکھ کر ہڑبڑی سے گیا تھا اوس پر بڑی کڑی پڑی۔ سنتے ہی رانی کیتکی کے باپ نے کہا اون کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا، اون کے باپ دادے ہمارے باپ دادوں کے آگے سدا ہاتھ جوڑ کے باتیں

---

[1] (ن) اور رانی کیتکی نے اپنا چھلا کنور اودے بھان کی انگلی میں ڈال دیا۔ [2] (ن) دکھڑا ہے۔ [3] گھبرانا۔ [4] (ن) لجاؤں۔ [5] زبانی [6] کام کاج کا دستور۔ [7] (ن) کھوٹ۔ [8] خوش رہو، مزے کرو۔

کرتے تھے اور جو ٹک تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے، کیا ہوا جو اب وے بڑھ گئے اور اونچے پر چڑھ گئے۔ جن کے مانتھے ہم بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے ٹیکا لگا دیں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جائے، کس کا منہ جو یہ بات ہمارے منہ پر لائے۔ بامھن نے جل بھن کے کہا اگلے بھی اسی بچار میں تھے اور بھری سبھا میں یہی کہتے تھے۔ ہم میں اون میں کچھ گوت کا تو میل نہیں ہے۔ پھر کنور کی ہٹ سے کچھ ہماری نہیں چلتی، نہیں تو ایسی اوچھی بات کب ہمارے منہ سے نکلتی؟ یہ سنتے ہی مہاراج نے بامھن کے سر پر پھولوں کی چھڑی پھینک ماری اور کہا جو بامھن کے ہتیا کا دھڑکا نہ ہوتا تو تجھ کو ابھی چکی میں دلوا ڈالتا۔ اس کو لے جاؤ اور ایک اندھیری کوٹھری میں موند رکھو۔ جو اس بامھن پر بیتی سو سب کنور اودے بھان کے ماباپ نے سنتے ہی لڑن کی ٹھان اپنے ٹھاٹھ باندھ کر دل بادل جیسے گھر آنے ہیں چڑھ آیا۔ جب دونوں مہاراجوں میں لڑائی ہونے لگی رانی کیتکی ساون بھادوں کے روپ رونے لگی اور دونوں کے جی پر یہ آگئی۔ یہ کیسی چاہت ہے جس میں لہو برسنے لگا اور اچھی باتوں کو ترسنے لگا۔ کنور نے چپکے سے یہ لکھ بھیجا "اب میرا کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے دونوں مہاراجوں کو آپس میں لڑنے دو۔ کسی ڈول سے جو ہو سکے تو تم مجھے اپنے پاس بلا لو، ہم تم دونوں مل کے کسی اور دیس کو نکل چلیں، جو ہونی ہو سو ہو۔ سر رہتا ہے جاتا جائے"۔ ایک مالن جس کو پھول کلی کرکے سب پکارتے تھے اودن نے اوس کنور کی چھٹی کسی پھول کی پنکھڑی میں لپیٹ سپیٹ کے رانی کیتکی تک پہنچا دی۔ رانی نے اوس چھٹی سے آنکھیں اپنی ملیں اور مالن کو ایک تھال بھر کے موتی دیئے اور چھٹی کی پیٹھ پر اپنے منہ کی پیک سے یہ لکھا "اے میرے جی کے گاہک جو تو مجھے بوٹی بوٹی کر چیل کوے کو دے ڈالے تو بھی میری آنکھیں کو چین کلیجہ میں سکھ ہووے، پر یہ بات بھاگ چلنے کی اچھی نہیں، ڈول سے بیٹا بیٹی کے باہر ہے جی تجھ سے پیارا نہیں ایک تو کیا جو کروڑ جی جاتے رہیں پر بھاگنے کی کوئی بات ہمیں رہتی[1] نہیں"۔ یہ چھٹی پیک بھری جو کنور تک جا پہنچتی ہے وہ کئی ایک سونے کے ہیرے موتی پکھراج کے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھال نچھاور کرکے لٹا دیتا ہے اور چھٹی سے اس کی بیکلی[2] چوگنی پچگنی ہو جاتی ہے اور اس چھٹی کو اپنے گورے ڈنڈ پر باندھ لیتا ہے۔

(آنا جوگی مہندر گر کا کیلاس پہاڑ سے اور ہرن ہرنی کر ڈالنا

کنور اودے بھان اور اس کے ماباپ کا)

جگت پرکاس اپنے گرو کو جو کیلاس پہاڑ پر رہتا تھا، یوں لکھ بھیجتا ہے، کچھ ہماری سہائے[3] کیجیے مہا کٹھن ہم بپتا ماروں کو پڑی ہے، راجہ سورج بھان کو اب یہاں تک باوبھک نے لیا ہے جو انھوں نے ہم سے مہاراجوں سے ناتے کا ڈول کیا ہے۔ کیلاس پہاڑ اکڈال چاندی کا ہے، اوس پر راجہ جگت پرکاس کا گرو جس کو اندر لوک کے لوگ سب مہندر گر کہتے تھے، دھیان گیان میں کوئی نوے لاکھ اتیتوں[4] کے ساتھ ٹھاکر کے بھجن میں دن رات رہا کرتا تھا۔ سونا روپا تانبے رانگے کا بنانا تو کیا اور گٹکا منہ میں لے کے اڑنا ورے رہے، اس کی اور باتیں اس اس ڈھب کی دھیان میں تھیں جو کچھ کہنے سننے سے باہر ہیں۔ مینہ سونے روپے کا برسا دینا اور جس روپ میں چاہنا ہو جانا سب کچھ اس کے آگے ایک کھیل تھا اور گانے میں مہادیو جی چھٹ سب اوس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ سرسوتی جس کو ہندو کہتے ہیں آدھ شکتی، اون نے بھی اسی سے کچھ گنگنانا سیکھا تھا۔ اس کے سامنے چھ راگ چھتیس راگنیاں آٹھ پہر روپ بندھوں کا سا دھرے ہوئے اس کی سیوا میں ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی ہیں۔ وہاں اتیتوں کو یہ کہہ کر پکارتے تھے بھیر ونگر، بھسبھاس گر، ہنڈول گر، میگھ ناتھ کدار ناتھ دیپک داس، جوتی سروپ، سارنگ روپ اور بینتیاں[5] اس ڈھب سے کہلاتی تھیں، گوجری، ٹوڑی، اساوری، گوری، مالسری بلاول، جب چاہتا تھا ادھر میں سنگاسن پر بیٹھ اوڑائے پھرتا تھا اور نوے لاکھ اتیت گٹکے اپنے اپنے منہ لئے ہوئے گیرے بستر[6] پہنے جٹا بکھیرے اس کے

۱؎ (ن) نو اچھی۔ ۲؎ (ن) جلنی اُس کی بے کلی تھی۔ ۳؎ مدد۔ ۴؎ فقیروں، درویشوں۔

۵؎ (ن) اتیتنیں۔ ۶؎ لباس۔

ساتھ ہوتے تھے۔ جس گھڑی راجہ جگت پرکاس کی چٹھی ایک بھگوڑے[1] پہنچتا ہے جوگی مہندر گر ایک چنگھاڑ مار کر دل بادلوں کو تہلکا دیتا ہے۔ باگھمبر پر بیٹھ بھبوت اپنے منہ کو مل کچھ کچھ پڑھنت کرتا ہوا باو کے گھوڑے کی پیٹھ پر لاگا اور سب اتیت مرگ چھالوں پر بیٹھے ہوئے گٹکے منہ میں لئے ہوئے بول اوٹھے "گورکھ جاگا"، ایک آنکھ کی جھپک میں وہاں آن پہنچتا ہے جہاں دونوں مہاراجوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ پہلے تو ایک کالی آندھی آئی پھر اولے برسے پھر ایک بڑی آندھی آئی کسی کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی ہاتھی گھوڑے اور جتنے لوگ اور بھیڑ بھاڑ راجہ سورج بھان کی تھی کچھ نہ سمجھا گیا کدھر گئی اونھیں کون اٹھالے گیا اور راجہ جگت پرکاس کے لوگوں پر اور رانی کیتکی جی کے لوگوں پر کیوڑے کی بوندوں کی ننھی ننھی پھوار سی پڑنے لگی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو گرو جی نے اپنے اتیتوں سے کہہ دیا اودے بھان سورج بھان، لچھمی باس ان تینوں کو ہرن ہرنی بنا کے کسی بن چھوڑ دو اور جو ان کے ساتھی ہوں ان سبھوں کو توڑ پھوڑ دو۔ جیسا کچھ گرو جی نے کہا جھٹ پٹ وہی کیا۔ بپت کا مارا کنور اودے بھان جی اور اس کا باپ مہاراجہ سورج بھان اور اس کی ماں مہارانی لچھمی باس ہرن ہرنی بن بن کی ہری ہری گھاس کئی برس تک چگتے رہے اور اوس بھیڑ بھڑکے کا تو کچھ ٹھل بیڑا نہ ملا جو کدھر گئی اور کہاں تھی۔ یہاں کی یہاں ہی رہنے دو۔ آگے سنو اب رانی کیتکی کی بات۔ اور مہاراجہ جگت پرکاس کی سہتی[2] ان کے گھر کا گھر گرو جی کے پانوں پر گرا اور سب نے سر جھکا کہ کہا مہاراج یہ آپ نے بڑا کام کیا ہم سب کو رکھ لیا جو آپ آج آنہ پہنچتے تو کیا رہا تھا، سب نے مرمٹنے کی ٹھان لی تھی، ان پاپیوں سے کچھ نہ چلے گی یہ جان لی تھی۔ راج پاٹ سب ہمارا اب نچھاور کر کے جس کو چاہیے دے ڈالئے ہم سب کو اتیت بنا کے اپنے ساتھ لیجئے، راج ہم سے نہیں تھمتا، سورج بھان کے ہاتھ سے آپ نے بچایا اب کوئی ان کا چچا چندر بھان چڑھ آویگا تو کیونکر بچنا ہوگا، اپنے آپ میں تو سکت نہیں پھر ایسی راجہ کا پھٹے منہ، ہم کہاں تک آپ کو ستایا کریں گے۔ یہ سن کے جوگی مہندر گر نے کہا تم سب ہمارے بیٹا بیٹی ہو، انندیں کرو دندناؤ سکھ چین سے رہو، ایسا وہ کون ہے جو تمھیں آنکھ بھر اور ڈھب سے دیکھ سکے۔ یہ باگھمبر[3] اور یہ بھبوت ہم نے تمھیں دیا آگے جو کچھ ایسی گاڑھ[4] پڑے تو اس باگھمبر میں سے ایک رونگٹا توڑ کر آگ دھر کے پھونک دیجو، یہ رونگٹا پھونکنے نہ پاویگا جو ہم آن پہنچیں گے۔ رہا بھبوت سو اس لئے ہے جو ہم آن پہنچیں گے۔ رہا بھبوت سو اس لئے ہے جو کوئی چاہے جب اسے انجن کرے وہ سب کچھ دیکھ لے اور اسے کوئی نہ دیکھے، جو چاہے کرے۔ گرو مہندر گر جن کے پانوں پوجئے اور دھن مہاراج کہئے ان سے تو کچھ چھپاؤ نہیں، مہاراجہ جگت پرکاس ان کو مورچھل کرتے ہوئے رانیوں کے پاس لے گئے۔ سونے روپے کے پھول ہیرے موتی گود بھر بھر سب نے نچھاور کئے اور ماتھے رگڑے۔ انھوں نے سب کی پیٹھیں ٹھوکیں۔ رانی کیتکی نے بھی ڈنڈوت کی پر جی ہی جی میں بہت سی گرو جی کو گالیاں دیں۔ گرو جی سات دن سات راتیں یہاں رہ کے راجہ جگت پرکاس کو سنگھاسن میں بٹھا کر اپنے اس باگھمبر پر اسی ڈول سے کیلاس پہاڑ پر آ دھمکے۔ راجہ جگت پرکاس اپنے اگلے ڈھب سے راج کرنے لگے۔

(رانی کیتکی کا مدن بان کے آگے رونا پچھلی باتوں کا
دھیان کر کے ہاتھ جی سے دھونا اپنی بولی کی دھن میں)

رانی کو بہت سی بے کلی تھی   کب سوجھتی[5] وہ بری بھلی تھی
چپکے چپکے کراہتی تھی   جینا اپنا نہ چاہتی تھی
کہتی تھی کبھی اری مدن بان   ہے آٹھ پہر مجھے وہی دھیان

---

[1] بھاگا ہوا۔ پناہ گزیں۔ [2] سمیت۔ [3] (ن) باگھمبر۔ شیر کی کھال۔ [4] سختی، مشکل۔
[5] (ن) سوجھتی۔ [6] (ن) کچھ۔

یاں پیاس کسے بھلا کسے بھوکھ
ٹپکے کا ڈر ہے اب یہ کبھی
امربوں میں ان کا وہ اترنا
اور چپکے سے اُٹھ کے بھاگ جانا
ان کی وہ اتار انگوٹھی لینی
آنکھوں میں میری وہ پھر رہی ہے
کیوں کر انھیں بھولوں کیا کروں میں
اب میں نے سُنا ہے اے مدن بان
چرتے ہوں گے ہری ہری دوب
میں اپنی گئی ہوں چوکڑی بھول
پھولوں کو اٹھا کے یہاں سے لے جا
بکھرے جی کو نہ کر اکٹھا
ہریالی اسی کی دیکھ لوں میں
ان آنکھوں میں ہے پھڑک ہرن کی
جب دیکھئے ڈبڈبا رہی ہیں

دیکھوں ہوں وہی ہرے ہرے روکھ
چاہت کا گھر ہے اب یہ کبھی
وہ رات کا سائیں سائیں کرنا
اور تیری[1] وہ چاہ کا جتانا
اور اپنی انگوٹھی ان کو دینی
جی کا جو روپ تھا وہی ہے
ماں باپ سے کب تلک ڈروں میں
بن بن کے ہرن ہمیں اوڑے بجان
کچھ تو بھی پسیج سوچ میں ڈوب
مت مجھ کو سونگھا یہ ڈھڈہے پھول[2]
سو ٹکڑے ہوا میرا کلیجا
ایک گھاس کا لاکے رکھ دے گٹھا
کچھ اور تو تجھ کو کیا کہوں میں
پلکیں ہوئیں جیسی گھاس بن کی
اوسیں آنسو کی چھا رہی ہیں

یہ بات جو جی میں گڑ گئی ہے
ایک اوس سی مجھ پہ پڑ گئی ہے

اسی ڈول سے جب اکیلی ہوتی تھی تب مدن بان کے ساتھ ایسے ہی موتی پروتی تھی —

(بھبوت مانگنا رانی کیتکی کا اپنی ماں رانی کام لتا سے آنکھ مچول کھیلنے کے لئے اور روٹھ رہنا اور راجہ جگت پرکاس کا بلانا اور پیار سے کچھ کچھ کہنا اور وہ بھبوت دینا۔)

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا گرو گسائیں مہندر گرنے جو بھبوت باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا ہیں تیری دادی تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی آنکھ مچول کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے، ایسے لٹکے کسی برے دن کے سمھال لینے کو ڈال رکھتے ہیں۔ کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے اکیسی نہیں۔ رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اٹھ گئی اور دن بھر بن کھائے پئے پڑی رہی مہاراج نے جو بلایا تو کہا مجھے رچ[3] نہیں۔ تب رانی کام لتا بول اٹھیں اجی کچھ تم نے سُنا بھی، بیٹی تمھاری آنکھ مچول کھیلنے کے لئے اور بھبوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی، میں نے نہ دیا اور کہا لڑکی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی برے دن کے لئے گرو جی دے گئے ہیں۔ اسی پہ مجھ سے روٹھی ہے، بہتیرا بہلاتی

---

[1] (ن) تیرا۔ [2] شوخ رنگ کے پھول۔ [3] اشتہا

بھسلاتی ہوں، مانتی نہیں۔ مہاراج نے کہا بھبوت تو کیا مجھے تو اپنا جی بھی اس سے پیارا نہیں، اس کی ایک گھڑی بھر کے بہل جانے پر ایک جی تو کیا جو لاکھ جی ہوں تو دے ڈالیئے، رانی کیتکی کو ڈبیا میں سے تھوڑا سا بھبوت دیا۔ کئی دن تک آنکھ مچول اپنے ماں باپ کے سامنے سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی، سب کو ہنساتی رہتی، جو سو سو تھال موتیوں کے نچھاور ہوا کئے کیا کہوں ایک چہل تھی جو کئے تو کروڑوں پوتھیوں میں جیوں کے تیوں نہ آسکے۔

(رانی کیتکی کا چاہت سے بیکل ہوا پھرنا اور مدن بان کا ساتھ دینے سے نہیں کرنا۔)

ایک رات رانی کیتکی اسی دھیان میں اپنی مدن بان سے کہہ اٹھی اب میں نگوڑی لاج سے کٹ کرتی ہوں تو میرا ساتھ دے۔ مدن بان نے کہا کیوں کر، رانی کیتکی نے وہ بھبوت کا لینا اسے جتایا[1] اور یہ سنایا سب یہ آنکھ مچول کی چہلیں میں نے اسی دن کے لئے کر رکھیں تھیں۔ مدن بان کہنے لگی میرا کلیجہ تھرتھرانے لگا ہے[2] یہ مانا تم اپنی آنکھوں میں اس بھبوت کا انجن کر لوگی اور میرے بھی لگا دو گی تو ہمیں تمہیں کوئی نہ دیکھے گا اور ہم تم سب کو دیکھیں گے، پر ایسے ہم کہاں سے جی چلے ہیں جو بن لئے ساتھ جوبن ساتھ بن بن بھٹکا کریں اور ہرنوں کے سینگوں میں دونوں ہاتھ ڈال کے لٹکا کریں اور جس کے لئے یہ سب کچھ ہے سو وہ کہاں اور ہووے تو کیا جانے جو یہ رانی کیتکی جی اور یہ مدن بان نگوڑی بچی کھسوٹی ان کی سہیلی ہے چولہے اور بھاڑ میں جائے یہ چاہت جس کے لئے ماں باپ راج پاٹ سکھ نیند لاج کو چھوڑ کر ندی کے کچھاڑوں میں پھرنا پڑے سو بھی بے ڈول جو وہ اپنی روپ میں ہوتے تو بھلا تھوڑا بہت کچھ آسرا تھا۔ نہ جی یہ ہم سے نہ ہو سکے گا، مہاراج جگت پرکاس اور مہارانی کام لتا کا ہم جان بوجھ کر گھر اجاڑیں اور بہکا کے ان کی بیٹی جو اکلوتی لاڈلی ہے اس کو لے جاویں اور جہاں تہاں اسے بھٹکا بناس تپی کھلاویں اور اپنے چونڈے کو ہلاویں۔ اے جی اس دن تمہیں یہ بوجھ نہ آئی تھی جب تمہارے اور اس کے ماں باپ میں لڑائی ہو رہی تھی اس نے اس مالن کے ہاتھ تمہیں لکھ بھیجا تھا بھاگ چلیں تب تو اپنی منہ کی پپک سے اس کی چٹھی کی پیٹھ پر جو لکھا تھا سو کیا بھول گئی۔ تب تو وہ تاؤ بھاؤ دکھایا تھا اب جو وہ کنور اودے بھان اور ان کے ماباپ تینوں جنے بن بن کے ہرن ہرنی بنے ہوئے کیا جانئے کدھر ہوں گے کہ ان کی دھیان پر وہ کر بیٹھی جو کسی نے تمہارے گھرانے بھر میں نہیں کی۔ اس بات پر مٹی ڈال دو نہیں تو پچھتاؤ گی اور اپنا کیا پاؤ گی۔ مجھ سے تو کچھ نہ ہو سکے گا۔ تمہاری کچھ اچھی بات ہوتی ہو تو جیتے جی میرے منہ سے نہ نکلتی پہ یہ بات میرے پیٹ میں نہیں پچ سکتی۔ تم ابھی الھڑ ہو تم نے کچھ دیکھا نہیں جو اسی بات پر تمہیں سچ مچ ڈھلتا دیکھوں گی تو تمہارے ماں باپ سے کہہ کر وہ بھبوت جو موا نگوڑا بھبوت مچھندر کا پوت ابدھوت دے گیا ہے ہاتھ مروڑوا کے چھنوا لوں گی۔ رانی کیتکی نے یہ رکھائیاں مدن بان کی سن کر ہنس کے ٹال دیا اور کہا جس کا جی ہاتھ میں نہ ہو وہ ایسی ایسی لاکھوں سوچتی ہے[3] پر کہنے اور کرنے سے بہت سا پھیر ہے، یہ بھلا کوئی اندھیرا ہے، جو ماں باپ کو چھوڑ ہرنوں کے لئے پڑی دوڑتی پھروں[4]۔ پر اری تو بڑی باولی چڑیا ہے جو تو نے یہ بات ٹھیک ٹھاک کر جان لی اور مجھ سے لڑنے لگی۔

(رانی کیتکی کا بھبوت آنکھوں میں لگا کر گھر سے باہر نکل جانا اور سب چھوٹے بڑوں کا تلملانا)

دس پندرہ دن پیچھے ایک رات رانی کیتکی بن کہے مدن بان کے وہ بھبوت آنکھوں میں لگا کر باہر نکل گئی۔ اور کچھ کہنے میں نہیں آتا جو ماں باپ پر ہوئی۔ یہ بات ٹھہرا دی گرو جی نے کچھ سمجھ کر رانی کیتکی کو اپنے پاس بلا لیا ہوگا مہاراجہ جگت پرکاس اور مہارانی کام لتا راج پاٹ سب

۱۔ (ن) چتایا۔ ۲۔ (ن) ہیں۔ ۳۔ (ن) اسے ایسی لاکھوں سوجھتی ہے۔
۴۔ (ن) پیچھے دوڑتی کر چھال مارتی۔

کچھ اس بروگ[1] ہیں چھوڑ چھاڑ ایک پہاڑ کی چوٹی پر جا بیٹھے اور کسی کو اپنے لوگوں میں سے راج تھامنے کے لئے چھوڑ آئے[2]۔ تب مدن بان نے وہ سب باتیں کھولیاں۔ رانی کیتکی کے ماں باپ نے یہ کہا اری مدن بان جو تو بھی اس کے ساتھ ہوتی[3] تو کچھ ہمارا جی ٹھہرتا۔ اب جو وہ تجھے لے جائیں تو، تو کچھ ہچر مچر نہ کیجیو، ان کے ساتھ ہو لیجیو، جتنا بھبوت ہے تو اپنے پاس رکھ ہم کیا اس راکھ کو چولھے میں ڈالیں گے، گرو جی نے تو دونوں راجوں کا کھوج کھو دیا، کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ دونوں بے ٹھکانے[4] ہیں اور جگت پرکاس اور کام لتا کو یوں تلپٹ کیا۔ بھبوت نہ ہوتا تو یہ باتیں کاہے کو سامنے آتیں۔ مدن بان بھی ان کے ڈھونڈھنے کو نکلی، انجن لگائے ہوئے رانی کیتکی کہتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ بہت دنوں پیچھے کہیں رانی کیتکی بھی ہرنوں کی ڈاروں میں اودے بھان، اودے بھان، چنگھاڑتی ہوئی آنکلی۔ جو ایک نے ایک کو تاڑ کر یوں پکارا اپنی اپنی آنکھیں دھو ڈالو، ایک ڈبرے پر بیٹھ کر دونوں کی مٹ بھیڑ ہوئی، گلے مل کے ایسی روئیاں جو پہاڑوں میں کوک سی پڑ گئی۔

دوہا اپنی بولی کا

چھا گئی ٹھنڈی سانس جھاڑوں میں

پڑ گئی کوک سی پہاڑوں میں

دونوں جنیاں ایک ٹیلے پر اچھی سی چھاں تاڑ کے آ بیٹھیاں اپنی اپنی باتیں دہرانے لگیں۔

(بات چیت رانی کیتکی کی مدن بان سے)

رانی کیتکی نے اپنی بیتی سب کہی اور مدن بان وہی اگلا جھینکنا جھینکا کی اور ان کے ماں باپ نے ان کے لئے جو جوگ سادھا اور جو بروگ لیا تھا سب کہا۔ جب مدن بان یہ سب کہہ چکی تو پھر ہنسنے لگی۔ رانی کیتکی یہ دوہا لگی پڑھنے:۔

ہم نہیں ہنسنے کو رکتے جس کا جی چاہے ہنسے

ہے وہی اپنی کہاوت آ پھنسے جی آ پھنسے

اب تو اپنے پیچھے سارا جھگڑا جھانٹا لگ گیا

پاؤں کا کیا ڈھونڈھتی ہے جی میں کانٹا لگ گیا

مدن بان کچھ رانی کیتکی کے آنسو پونچھنے سے چلی۔ ان نے یہ بات ٹھہرائی جو تم کہیں ٹھہرو تو میں تمہارے اجڑے ہوئے ماں باپ کو چپ چاپ یہیں لے آؤں اور انھیں سے یہ بات ٹھہراؤں۔ گسائیں مہندر گر جس کے یہ سب کرتوت ہیں وہ بھی انھیں دونوں اجڑے ہوؤں کی مٹھی میں ہے۔ اب بھی جو میرا کہا تمہارے دھیان چڑھے تو گئے ہوئے دن پھر پھر سکتے ہیں، پر تمہاری کچھ بھاوے نہیں، ہم کیا پڑے بکتے ہیں۔ میں اس پر بیڑا اٹھائی ہوں۔ بہت دنوں میں رانی کیتکی نے اس پر اچھا کہا اور مدن بان کو اپنے ماں باپ کے پاس بھیجا اور چٹھی اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجی جو آپ سے کچھ ہو سکے تو اس جوگی سے یہ ٹھہرا کے آویں۔

(مہاراج اور مہارانی کے پاس مدن بان کا پھر
آنا اور چیت چاہی بات کا سنانا۔)

مدن بان رانی کیتکی کو چھوڑ کر راجہ جگت پرکاس اور رانی کام لتا جس پہاڑ پر بیٹھے ہوئے تھے وہاں جھٹ سے آ دیس[5] کر کے آ کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے لیجئے آپ کا گھر نئے سر سے بسا اور اچھے دن آئے رانی کیتکی کا ایک بال بھی بیکا نہ ہوا، انھیں کے ہاتھ کی یہ چٹھی لائی ہوں آپ

---

[1] جدائی۔ [2] رن) گئے۔ [3] رن) تو ایک سے دو بھلی تھی۔ [4] بے ٹھکانے۔ [5] جوگیوں کا سلام۔

پڑھ لیجئے آگے سو چاہے سو کیجئے۔ مہاراج نے اسی گھمبیر میں سے ایک رونگٹا توڑ کر آگ پر دھر دیا۔ بات کی بات میں گسائیں مہندر گر آ پہنچے اور جو کچھ یہ نیا سانگ جوگی اور جوگن کا آیا تھا آنکھوں دیکھا۔ سب کو چھاتی سے لگایا اور کہا بگھمبر اسی لئے میں سونپ گیا تھا جو تم پر کچھ ہووے تو اس کا ایک رونگٹا پھونک دیجیو۔ تمہارے گھر کی یہ گت ہو گئی اب تک تم کیا کر رہے تھے اور کن نیندوں سو رہے تھے۔ پر تم کیا کرو وہ کھلاڑی جو روپ چاہے سو دکھاوے، جو جو ناچ چاہے سو نچاوے، بھبوت لڑکی کو کیا دینا تھا۔ ہرن ہرنی اودے بھان اور سورج بھان اس کے باپ کو اور چھی باس کو میں نے کیا تھا، میرے آگے ان تینوں کو جیسے کا تیسا کرنا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ اچھا، ہوئی سو ہوئی، اب چلو اٹھو اپنے راج پر براجو اور بیاہ کا ٹھاٹھ کرو۔ اب تم اپنی بیٹی کو سمیٹو، کنور اودے بھان کو میں نے اپنا بیٹا کیا اور اس کو لے کے میں بیاہنے چڑھوں گا۔ مہاراج یہ سنتے ہی اپنے راج کی گدی پر آ بیٹھے اور اسی گھڑی کہہ دیا سارے چھتوں کو اور کوٹھوں کو گوٹے سے منڈھ لو اور سونے روپے کے روپہلے سنہرے سب جھاڑ اور پہاڑوں پر باندھ دو اور پیڑوں میں موتی کی لڑیاں گوندھو اور کہہ دو چالیس دن چالیس رات تک جس گھر ناچ آٹھ پہر نہ رہے گا اس گھر والے سے میں روٹھا رہوں گا اور جانوں گا یہ میرے دکھ سکھ کا ساتھی نہیں۔ چھ مہینے جدھر کوئی چلنے والا کہیں نہ ٹھہرے اور رات دن چلا جائے اس ہیر پھیر میں وہ راج سب کہیں تھا، یہی ڈول ہو گیا۔

(جانا مہاراج اور مہارانی اور گسائیں مہندر گر کا رانی کیتکی کے لینے کے لئے)

پھر گرو جی اور مہاراج اور مہارانی، مدن بان کے ساتھ وہاں آ پہنچے جہاں رانی کیتکی چپ چاپ سن کھنچی بیٹھی تھی۔ گرو جی نے رانی کیتکی کو اپنے گود میں لے کے کنور اودے بھان کا چڑھاوا چڑھا دیا اور کہا تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر سدھارو، اب میں اپنے بیٹے کنور اودے بھان کو لئے آتا ہوں۔ گرو جی گسائیں جن کو ڈنڈوت ہے سو تو یوں سدھارتے ہیں آگے جو ہو گی سو کہنے میں آوے گی، یہاں کی یہ دھوم دھام اور پھیلاوا دھیان کیجئے۔ مہاراجہ جگت پرکاس نے اپنے سارے دیس میں کہا یہ پکار دیں جو یہ نہ کرے گا اس کی بری گت ہو گی۔ گانوں میں آمنے سامنے ترپولئے بنا بنا کے سوہے[2] کپڑے ان پر لگا دو اور گوٹ دھنک کی اور گوکھرو روپہلی سنہری اور کرنیں اور ڈانک ٹانک رکھو اور جتنے بڑھ پیپل کے پرانے پرانے پیڑ جہاں جہاں ہوں ان پر گوٹوں کے پھولوں کے سہرے ہرے بھرے ایسے جس میں سر سے لگا جڑ تک ان کی ٹھلک اور جھلک پہنچے باندھ دو۔ پودوں نے رنگ کے سوہے جوڑے پہنے، سو پانوں ڈالیوں نے توڑے پہنے۔ بوٹی بوٹی نے پھول پھل کے گہنے، جو بہت نہ تھے تو تھوڑے تھوڑے پہنے، جتنے ڈھڈے ہیں اور ہر یاول میں لہلہے پات تھے اپنے اپنے ہاتھ میں چھپی مہندی کی چاوٹ سجاوٹ کے ساتھ جتنی سماوٹ میں سما سکی کر لی اور جہاں تک نول[3] بیاہی دلہن ننھی ننھی پھلیوں کے اور سہاگنیں نئی نئی کلیوں کے جوڑے پنکھڑیوں کے پہنے ہوئی تھیں، سب نے اپنی اپنی گود سہاگ پیار کے پھول اور پھلوں سے بھری اور تین برس کا پیسا جو لوگ دیا کرتے تھے اس راجہ کے راج بھر میں جس جس ڈھب سے ہو سکا کھیتی باڑی کر کے، ہل جوت کے اور کپڑا لتا بیچ کھونچ کے، سو سب ان کو چھوڑ دیا۔ اپنے گھروں میں بنا بنا کے ٹھاٹھ کریں اور جتنے راج بھر میں کوئیں تھے کھنڈ سالوں کی کھنڈ سالیں ان میں انڈیلیں گئیں اور سارے بنوں میں اور پہاڑتلیوں میں لالٹینوں کی بہار جھم جھماہٹ راتوں کو دکھائی دینے لگی، اور جتنی جھیلیں تھیں ان سب میں کسم اور ٹیسو اور ہار سنگار پڑ گیا اور کیسری بھی تھوڑی تھوڑی گھولنے میں آ گئی اور پھننگ سے لگا جڑ تک جتنے جھاڑ جھنکاڑوں میں پتے اور پتوں کے بندھے چھوٹے تھے ان میں روپہلے سنہرے ڈانک گوند لگا لگا کے چپکا دئے، اور کہہ دیا گیا جو سہی پگڑی اور سوہے باگے بن کوئی کسی ڈول روپ سے نہ پھرے چلے اور جتنے گوئیے نچوئے بھانڈ بھگتئے، ڈھاڑی، راس دھاری اور سنگیت ناچتے ہوئے ہوں سب کو کہہ دیا، جن جن گانوں میں جہاں جہاں ہوں

۱۔ جب۔ ۲۔ لال۔ ۳۔ نئی۔ ۴۔ (ن) نچائیے۔

اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر اچھے اچھے بچھونے بچھا کر گاتے بجاتے دھومیں مچاتے ناچتے کودتے رہا کریں۔

(ڈھونڈھنا گسائیں مہندر گر کا کنور اودے بھان
اور اس کے ماں باپ کو اور نہ پانا اور بہت بیا
کلملانا اور راجہ اندر کا اس کی چٹھی پڑھ کے آنا)

یہاں کی بات اور جھلیں جو کچھ ہیں سو یہیں رہنے دو اب آگے یہ سنو۔ جوگی مہندر گر اور اس کے نوّے لاکھ اتیتوں نے سارے بن کے بن چھان مارے کہیں کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ کا ٹھکانا نہ لگا، تب ان نے راجہ اندر کو چٹھی لکھ بھیجی۔ اس چٹھی میں یہ لکھا ہوا تھا۔ تینوں جنوں کو میں نے ہرن اور ہرنی کر ڈالا تھا اب ان کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کہیں نہیں ملتے اور میری جتنی سکت تھی اپنے سے کر چکا ہوں اور اب میرے منہ سے نکلا کنور اودے بھان میرا بیٹا اور میں اس کا باپ۔ سسرال میں سب بیاہ کے ٹھاٹھ ہو رہے ہیں اب مجھ پر نپٹ گاڑھ[1] ہے جو تم سے ہو سکے سو کرو۔ راجہ اندر گرو مہندر گر کے دیکھنے کو سب اندراسن[2] سمیت آپ آن پہنچا ہے اور کہتا ہے جیسا آپ کا بیٹا تیسا[3] میرا بیٹا۔ آپ کے ساتھ میں سارے اندرلوک کو سمیٹ کے کنور اودے بھان کو بیاہنے چڑھوں گا۔ گسائیں مہندر گر نے راجہ اندر سے کہا ہماری آپ کی ایک ہی بات ہے پر کچھ ایسی سو جھائیے جس میں وہ اودے بھان ہاتھ آویں یہاں جتنے گویّے اور گائنیں ہیں ان سب کو ساتھ لے کے ہم اور آپ سارے بنوں میں پھریں کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگ جائے گا ———

(ہرن اور ہرنیوں کے کھیل کا بگڑنا اور نئے سر
سے کنور اودے بھان کا روپ پکڑنا)

ایک رات راجہ اندر اور گسائیں مہندر گر نکھری ہوئی چاندنی میں بیٹھے راگ سن رہے تھے کروڑوں ہرن آس پاس ان[4] کے راگ کے دھیان میں چوکڑی بھولے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس میں راجہ اندر نے کہا کہ سب ہرنوں پر پڑھ کے میری سنگت کے گروؤں کے بھگت پھر منتر ایسری باچا[5]، ایک ایک چھینٹا پانی کا دو۔ کیا جانیے وہ پانی کیسا تھا پانی کے چھینٹے کے ساتھ ہی کنور اودے بھان اور ان کے ماں باپ تینوں جنے ہرنوں کا روپ چھوڑ کر جیسے تھے ویسے ہو جاتے ہیں۔ مہندر گر اور راجہ اندر ان تینوں کو گلے لگاتے ہیں اور پاس اپنے بڑی آؤ بھگت سے بٹھاتے ہیں اور وہی پانی کا گھڑا اپنے لوگوں کو دے کر وہاں پہنچوا[6] دیتے ہیں جہاں سر منڈواتے ہی اودے پڑے تھے۔ راجہ اندر کے لوگ جو پانی کے چھینٹے وہی ایسری باچ پڑھ کے دیتے ہیں جو جو مر مٹے تھے سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جو جو ادھموئے ہو کے بھاگ بچے تھے سب سمٹ آتے ہیں۔ راجہ اندر اور مہندر گر کنور اودے بھان اور راجہ سورج بھان اور رانی لچھمی باس کو لے کر ایک اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر بڑی دھوم دھام سے ان کے[7] اپنے راج پر بیٹھا کر بیاہ کے ٹھاٹھ کرتے ہیں۔ پسیریوں ہیرے موتی ان سب پر نچھاور ہوتے ہیں۔ راجہ سورج بھان اور اودے بھان اور ان کی ماں رانی لچھمی باس چت چاہی آس پا کر پھولے اپنے آپ میں نہیں سماتے اور سارے اپنے راج کو یہی کہتے جاتے ہیں جو نرسے[8] بھونرے کے منہ کھول دو اور جس جس کو جو جو اکت[9] سو جھے بول دو۔ آج کے دن سے اور کون سا دن ہو گا ہماری آنکھوں کی پتلیوں کا، جس سے چین ہے۔ اس لاڈلے اکلوتے کا بیاہ اور ہم تینوں کا ہرنوں کے روپ سے نکل کر پھر راج پر بیٹھنا۔ پہلے تو یہ چاہیے جن جن کی بیٹیاں بن بیاہیاں کنواریاں بالیاں ہوں ان سب کو اتنا کر دو کہ جو اپنی جس جس چاؤ چوچ سے چاہیں اپنی اپنی گڑیاں سنوار کے اٹھا دیں اور جب تلک جیتی رہیں ہمارے یہاں سے کھایا پیا پکایا ریندھا کریں اور سب راج بھر کی بیٹیاں سدا سہاگنیں بنی رہیں اور سوہے

---

۱ مشکل۔ ۲ اندر کا تخت۔ ۳ (ن) ویسا۔ ۴ (ن) آن۔ ۵ (ن) ایسرو باچ۔
۶ (ن) پہنچا۔ ۷ (ن) کو۔ ۸ کھنے۔ تہہ خانے۔ ۹ مشکل۔

راتے[1] چھپٹ کبھی کوئی کچھ نہ پہنا کریں اور سونے روپے کے کواڑ گنگا جمنی سب گھروں میں لگ جائیں بس سب کوٹھوں کے ماتھوں پر کیسر اور چندن کے ٹیکے لگے ہوں اور جتنے پہاڑ ہمارے دیس میں ہوں اتنے اتنے ہی روپے سونے کے پہاڑ آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں اور سب ڈانگوں[2] کی چوٹیاں موتیوں کی مانگ سے بن مانگے بھر جائیں اور پھولوں کے گہنے اور بندن واروں سے سب جھاڑ پہاڑ لدے پھندے رہیں اور اس راج سے لگا اس راج تک ادھر میں چھت سے باندھ دو چپا چپا کہیں نہ رہے جہاں بھیڑ بھڑکا دھوم دھڑکا نہ ہونا چاہئیے۔ پھول اتنے بہت سارے کھنڈ جائیں جو ندیاں جیسی سچ مچ پھول کی بھتیاں ہیں یہ سمجھا جائے۔ اور یہ ڈول کر دو جدھر سے دولھا کو بیاہنے چڑھیں سب لاڑلی اور ہیرے اور پکھراج کی ادھر ادھر کنول کی ٹٹیاں بن جائیں اور کیاریاں سی ہو جائیں، جن کے بیچوں بیچ سے ہو نکلیں اور کوئی ڈانگ اور پہاڑنی کا اتار چڑھاؤ ایسا دکھائی نہ دے جس کی گود پکھڑوں اور پھول پھلوں سے بھری جھتولی نہ ہو۔

(راجہ اندر کا ٹھاٹھ کرنا اودے بھان کے بیاہنے کیلئے)

راجہ اندر نے کہہ دیا وہ رنڈیاں چلبلیاں جو اپنے مدھ میں اڑ چلیاں ہیں ان سے کہہ دو سولہ سنگار بال بال گج موتی پرو، اپنے اپنے اچرج اور اچنبھے کے اڑن کھٹولوں کے اس راج سے اس راج تک ادھر میں چھت سی باندھ دو، پر کچھ ایسے روپ سے اڑ چلو جو اڑن کھٹولوں کی کیاریاں اور پھلواریاں سی سیکڑوں کوس تک ہو جائیں اور اوپر ہی اوپر مردنگ، بین جلترنگ، منہ چنگ، گھونگھرو، تبلے گٹ تال اور سیکڑوں اس ڈھب کے انوکھے باجے بجتے آئیں اور ان کیاریوں کے بیچ میں ہیرے پکھراج ان بندھے موتیوں کے جھاڑ اور لال ٹینوں کی بھیڑ بھاڑ کی جھم جھماہٹ دکھائی دے اور انہیں لال ٹینوں میں سے ہتھ پھول، پھلجھڑیاں جاہی، جوہیاں، کدم، گیندا، چنبیلی اس ڈھب سے چھوٹنے کو دیکھنوں کی چھاتیوں کے کواڑ کھل جائیں اور پٹاخے جو اچھل اچھل کے پھوٹیں ان میں سے ہنستی سپاری اور بولتے پکھروٹے ڈھل ڈھل پڑیں اور جب تم سب کو ہنسی آوے تو چاہیئے اس ہنسی کے ساتھ موتی کی لڑیاں جھڑیں جو سب کے سب ان کو چن چن کے راج راجے ہو جائیں ڈومنیوں کے روپ میں سارنگیاں چھیڑ چھیڑ سوہلے گاؤ، دونوں ہاتھ ہلاؤ، انگلیاں نچاؤ، جو کسی نے نہ سنے ہوں وہ تاؤ بھاؤ آؤ جاؤ راؤ چاؤ دکھاؤ۔ ٹھڈیاں گپکپاؤ اور ناک بھویں تان تان بھاؤ بتاؤ، کوئی پھوٹ کر رہ نہ جاؤ۔ ایسا بھاؤ جو لاکھوں برس میں ہوتا ہے، جو جو راجہ اندر نے اپنے منہ سے نکالا تھا آنکھ کے جھپک کے ساتھ وہی ہونے لگا اور جو کچھ ان دونوں مہاراجوں نے ادھر ادھر کہہ دیا تھا سب کچھ اسی روپ سے ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ جس بیاہنے کی یہ کچھ پھیلاوٹ اور جماوٹ اور رچاوٹ اوپر تلے اس جمگھٹے کے ساتھ ہو کہ اس کا اور کچھ پھیلاؤ کیا کچھ ہو گا یہ دھیان کر لو۔

(ٹھاٹھ گسائیں مہندر گر کا)

جب کنور اودے بھان اس روپ سے بیاہنے چڑھے اور وہ باہمن جو اندھیری کوٹھری میں مونڈا ہوا تھا اس کو بھی ساتھ لے لیا اور بہت سے ہاتھ جوڑے اور کہا باہمن دیوتا ہمارے کہنے سننے پر نہ جاؤ، تمہاری جو ریت ہوتی چلی آئی ہے بتاتے چلو۔ ایک اڑن کھٹولے پر وہ بھی ریت بتانے کو ساتھ ہوا۔ راجہ اندر اور گسائیں مہندر گر ایراوت[3] ہاتھی پر جھومتے جھامتے دیکھنے بھالنے سارا اکھاڑا لئے چلے جاتے تھے۔ راجہ سورج بھان دولھے کے گھوڑے کے ساتھ مالا جپتا ہوا پیدل تھا۔ اتنے میں ایک سناٹا ہوا سب گھبرا گئے۔ اس سناٹے میں سے وہ جو جوگی کے نوے لاکھ اتیت بنے تھے سب کے سب جوگی بنے ہوئے موتیوں کی لڑیوں کی سیلی گلوں میں ڈالے گاتیاں اسی ڈھب کی باندھے مرگ چھالوں اور بگھمبروں پر آ ٹپکے، انھوں[4] کے جیوں میں جتنی امنگیں چھا رہی تھیں وہ چوگنی پچگنی ہو گئیں سکھپال اور چنڈولوں پر اور رتھوں پر جتنی رانیاں مہارانی لچھمی باس کے پیچھے چلی آتی تھیں سب کو گدگدیاں سی ہونے لگیں۔ اس میں کہیں بھرتری کا سانگ آیا،

---

[1] سرخ - [2] پہاڑ کی چوٹی - [3] اندر کے ہاتھی کا نام - [4] (ان) لوگوں -

کہیں جوگی جے پال اکھڑے ہوئے، کہیں مہادیوجی اور پاربتی جی دکھائی پڑے، کہیں گورکھ جاگے، کہیں مچھندر ناتھ بھاگے، کہیں مچھ کچھ براہے، نرسنگھ ہوئے، کہیں پرسرام کہیں باون روپ کہیں ہرناکس اور نرسنگھ، کہیں رام لچھمن سیتا سامنے آئے، کہیں راون اور لنکا کا بکھیڑا سارے کا سارا دکھائی دینے لگا، کہیں کنہیا جی کا جنم اشٹمی ہونا اور باسدیو کا گوکل لے جانا اور ان کا اس روپ سے بڑھ چلنا اور گائیں چرانی اور مورلی بجانی اور گوپیوں سے دھومیں مچانی اور رادھا کا رس کبجا کا بس کر لینا، کہیں بنسی بٹ، چیر گھاٹ، بندرا بن، کریل کی کنج بندرا بن سیوا کنج برسانے میں رہنا اور اس کنہیلے سے جو جو کچھ ہوا تھا سب کا سب جیوں کا تیوں آنکھوں میں آنا اور دوارکا میں جانا اور وہیں سونے کے گھر بنانا اور پھر برج کو نہ آنا اور سولہ سو گوپیوں کا تلملانا سامنے آگیا۔ ان گوپیوں میں سے اودھو کا ہاتھ پکڑ کر ایک گوپی کے اس کہنے نے سب کو رولا دیا جو اس ڈھب سے بولی کے روندھے ہوئے جی کو کھو لتی تھی۔

کبت

جب چھاڑ کریل کی کنجن کون ہری دوارکا جیو ماں جاے بسے
مگدھوت[1] کے دھام بنائے گنے مہراجن کے مہاراج بھئے
تج مورمکٹ اور کامریا[2] کچھ اور ہی ناتے جوڑ لئے
دھرے روپ نئے کئے نیہہ نئے اور گیاں چرائیو بھول گئے

اچھا پنا گھاٹوں کا

جتنے گھاٹ دونوں راج کی ندیوں میں تھے کچی چاندی کے تھکے سے ہو کر لوگوں کو ہکا بکا کر رہے تھے۔ نواڑے، بھولئے، بجرے لچکے، مورپنکھی، سوناکھی، سیام سندر، رام سندر اور جتنی ڈھب کی ناویں تھیں ستھرے روپ سے سجی سجائی، کسی کسائی سو سو لچکیں کھاتیاں آتیاں جاتیاں لہراتیاں پڑی پھرتیاں تھیں۔ ان سب پر بھی گوییے، کنچنیاں، رام جنیاں، ڈومنیاں، کھچا کچھ بھری اپنے اپنے کرتب میں ناچتی، گاتی بجاتی، کودتی پھاندتی، دھومیں مچاتیاں، انگڑائیاں جمائیاں، انگلیاں نچاتیاں اور ڈھلی پھرتیاں تھیں اور کوئی ناؤ ایسی نہ تھی جو سونے روپے کے پتروں سے منڈی ہوئی اور اساوری[3] سے ڈھکی ہوئی نہ ہو اور بہت سی ناؤں پر ہنڈولے بھی اسی ڈھب کے، ان پر گائنیں بیٹھی جھولتی ہوئیں سوہلے، کہارے اور باگیسری کا نھڑے میں گا رہی تھیں۔ دل بادل ایسے نواڑوں کے سب جھیلوں میں بھی چھا رہے تھے۔

(آپہنچنا کنور اودے بھان کا بیاہنے کے ٹھاٹھ کے
ساتھ دلہن کی ڈیوڑھی پر)

اس دھوم دھام کے ساتھ کنور اودے بھان سہرا باندھے جب دلہن کے گھر تک آن پہنچا اور جو ریتیں ان کے گھرانے میں ہوتی چلی آتیاں تھیں ہونے لگیاں، مدن بان رانی کیتکی سے ٹھٹھولی کر کے بولی "اب سکھ سمیٹے بھر بھر جھولی، سر نہوڑائے کیا بیٹھی ہو۔ آؤ نہ ٹک ہم تم مل کے جھروکوں سے انھیں جھانکیں"۔ رانی کیتکی نے کہا "ارے ایسی نچی باتیں ہم سے نہ کر، ایسی ہمیں کیا پڑی جو اس گھڑی ایسی کڑی جھیل کر ریل پیل میں اٹھیں[4] اور تیل پھلیل میں بھری ہوئی ان کے جھانکنے کو جا کھڑی ہوں"۔ مدن بان اس رکھائی کو اڑن گھائی کے انٹیوں میں کر بولی۔ دوہے اپنی بولی میں —

۱ے (ن) کل دھوت۔ ۲ے (بھنی کملی)۔ ۳ے ریشمی کپڑا۔ ۴ے (ن) اس اپٹن۔

دوھا

یوں تو دیکھو وا چھڑے جی وا چھڑے جی وا چھڑے
ہم سے اب آنے لگی ہیں آپ یوں مہرے کڑے
چھان مارے بن کے بن تھے آپ نے جن کے لئے
وہ ہرن جوبن کے مدماتے ہیں ہیں بنے دولہ کھڑے
تم نہ جاؤ دیکھنے کو جو انھیں، کچھ بات ہے
جھانکتے اس دھیان میں ہیں ان کو سب چھوٹے بڑے
ہے کہاوت "جی کو بھاوے یوں ہی پر منڈیا ہلائے"
لے چلیں گے آپ کو ہم ہیں اسی دھن پر اڑے
سانس ٹھنڈی بھر کے رانی کیتکی بولی کہ سچ
سب تو اچھا کچھ ہوا پر اب بکھیڑے ہیں پڑے

(واری پھیری ہونا مدن بان کا رانی کیتکی پر اور
اس کی باس کا سونگھنا اور انیندے پن سے اونگھنا)

اس گھڑی کچھ مدن بان کو رانی کیتکی کے ماتھے کا جوڑا اور بھینا بھینا پن اور انکھڑیوں کا لجانا اور کھبرا کھبرا جانا بھلا لگ گیا تو رانی کیتکی کی باس سونگھنے لگی اور اپنی آنکھوں کو ایسا کر لیا جیسے کوئی کسی کو اونگھنی لگتی ہے سر سے لگا پاؤں تک واری پھیری ہو کے تلوے سہلانے لگی، رانی کیتکی جھٹ سے دھیمے سے ہنس کے لچکے کے ساتھ اٹھی۔ مدن بان بولی میرے ہاتھ کے ٹھوکے سے وہ ہی پاؤں کا چھالا دکھ گیا ہوگا جو ہرنوں کی ڈھونڈا ڈھونڈ میں پڑ گیا تھا۔ ایسی دکھتی چٹکی کی چوٹ سے مسوس کر رانی کیتکی نے کہا کانٹا اڑا تو اڑا اور چھالا پڑا تو پڑا پر نگوڑی تو کیوں میرا پھپھولا ہوئی۔

(سراہنا رانی کیتکی کے جوبن کا)

رانی کیتکی کا بھلا لگنا لکھنے پڑھنے سے باہر ہے۔ وہ دونوں بھوؤں کی کھچاوٹ اور پتلیوں میں لاج کی سماوٹ اور نکیلی پلکوں کے روندھاہٹ اور ہنسی کی لگاوٹ، دنتڑیوں میں مسیوں کے ادواہٹ اور اتنی سی رکاوٹ سے ناک اور تیوری چڑھا لینا اور سہیلیوں کو گالیاں دینا اور چل نکلنا اور ہرنیوں[1] کے روپ سے کرچھالیں[2] مار پرے اچھلنا کچھ کہنے میں نہیں آتا۔

(سراہنا کنور جی کے جوبن کا)

[3]کنور اودے بھان کے اچھے پن میں کچھ چل نکلنا کسی سے ہو نہ سکے۔ ہائے رے! ان کی ادبھار کے دنوں کا سہانا پن اور چال ڈھال کا اچھن پچھن، اٹھتی ہوئی کونپل کی پھبن اور مکھڑے کا گدرایا ہوا جوبن جیسے بڑے تڑکے ہرے بھرے پہاڑوں کی گود سے سورج کی کرن نکل آتی ہے، یہی روپ تھا ان کی بھیگی مسوں سے رس کا ٹپکا پڑتا اور اپنی پرچھائیں دیکھ کر اکڑنا، جہاں تہاں چھانو اس کا ڈول ٹھیک ٹھاک، ان کے پاؤں تلے جیسے دھوپ تھی۔

(دولہا اودے بھان کا سنگاسن پر بیٹھنا)

---

[1] (ن) ہرنوں - [2] کودنا اچھلنا - [3] حسن -

دولہا اودے بھان سنگاسن پر بیٹھا، اِدھر اُدھر راجہ اندر اور جوگی مہندر گر جم گئے۔ دولہ کا باپ اپنے بیٹے کے پیچھے مالا لئے کچھ کچھ گنگنانے لگا اور ناچ لگا ہونے اور ادھر میں جو اوڑن کھٹولے اندر کے اکھاڑے کے تھے سب کے سب اس روپ سے چھپت باندھے ہوئے ٹھر گا گئے۔ مہارانیاں دونوں سمدھنیں آپس میں ملیاں جلیاں اور دیکھنے دا کھنے کو کوٹھوں پر چندن کے کواڑوں کے اڑتلوں میں آبیٹھیاں۔ سانگ سنگیت بھنڈتال رہس[1] ہونے لگا۔ جتنے راگ اور راگنیاں تھیں ایمن کلیان، جھنجوٹی، کانڑا، کھماچ، سوہنی، پرج، بہاگ، سوہرٹ، کالنگڑا، بھیرویں، کھٹ للت، بھیروں، روپ پکڑے ہوئے سچ مچ کے جیسے گانے والے ہوتے ہیں اسی روپ سے اپنے اپنے سمے پر گانے لگے اور گانے لگیاں۔ اس ناچ کا جو بھاؤ تاؤ رچاوٹ کے ساتھ ہوا کس کا منہ جو کہہ سکے، جتنے وہاں کے سکھ چین کے گھر تھے مادھو بلاس، رس دھام، کشن نواس، مچھی بھون، چندر بھون سب کے سب لپے سے لپٹے[2] اور سچے موتیوں کے جھالریں اپنی اپنی گانٹھ میں سمیٹے ہوئے ایک چھبن کے ساتھ متوالوں کے روپ سے جھوم جھوم بیٹھنے[3] والوں کے منہ چوم رہے تھے۔ بیچوں بیچ ان سب گھروں کے ایک آرسی دھام[4] بنایا تھا جس کی چھت اور کواڑ اور آنگن میں آرسی چھٹ لکڑی اینٹ پتھر کی پٹ، ایک انگلی کے پورے بھر نہ تھی۔ چاندنی[5] کا جوڑا پہنے ہوئے چودھویں رات جب گھڑی چھ ایک رہ گئی، تب رانی کیتکی سی دلہن کو اس آرسی بھون میں بیٹھا کر دولہ کو بلا بھیجا۔ کنور اودے بھان کنہیا بنا ہوا سر پر مکٹ دھرے سہرا باندھے اسی تڑاوے[6] اور جمگھٹ کے ساتھ چاند سا مکھڑا لئے جا پہنچا، جس جس ڈھب سے باہمن اور پنڈت کہتے گئے اور جو مہاراجوں میں ریتیں چلی آتیاں تھیں اسی ڈول سے اسی روپ سے بھونری گٹھ جوڑا سب کچھ ہو لیا۔

دوہے اپنی بولی کے

اب اودے بھان اور رانی کیتکی دونوں ملے
آس کے جو پھول کمھلائے ہوئے تھے پھر کھلے
چین ہوتا ہی نہ تھا جس ایک کو اس ایک بن
رہنے سہنے سو لگے آپس میں اپنے رات دن
اے کھلاڑی یہ بہت تھا کچھ نہیں تھوڑا ہوا
آن کر آپس میں جو دونوں کا گٹھ جوڑا ہوا
چاہ کے ڈوبے ہوئے اے میرے داتا سب تریں
دن پھرے جیسے انھوں کے ویسے اپنے دن پھریں

وے اوڑن کھٹولے والیاں جو ادھر میں چھپت باندھے ہوئے تھرک رہی تھیں بھر بھر جھولیاں اور مٹھیاں ہیرے اور موتیوں سے نچھاور کرنے کے لئے اتر آئیاں اور اوڑن کھٹولے جوں کے توں ادھر میں چھپت باندھے ہوئے کھڑے رہے۔ دولہ دولہن پر سے ساتھ ساتھ واری پھیرے ہوتے ہی پیس پیس گیاں اور ان سبھوں کو ایک ہچکی سی لگ گئی۔ راجہ اندر نے دلہن کی منہ دکھائی میں ایک ہیرے کا اکڈالی چھپر کھٹ اور ایک پیڑھی پکھراج کی دی اور ایک پارجات کا پودا جس سے جو مانگے سو ہی ملے، دلہن کے سامنے لگا دیا اور ایک کامدھین گائے کی پٹھیا بھی اس کے نیچے باندھ دی اور اکیس لونڈیاں انھیں اوڑن کھٹولے والیوں میں سے چن کے اچھی سے اچھی ستھری گاتی بجاتیاں، سیتی پرونتیاں، سگھڑ سے سگھڑ سونپیں اور انھیں کہہ دیا "رانی کیتکی چھٹ ان کے دولہ سے کچھ بات چیت نہ رکھیو، تمہارے کان پہلے سے مروڑے دیتا ہوں،

---

[1] ہنسی، دل لگی۔ [2] (ن) لپیٹے۔ [3] (ن) جھام۔ [4] آئینہ خانہ۔ [5] (ن) چاندنی۔
[6] نمود و نمائش۔

نہیں تو سب کی سب پتھر کی مورتیں بن جاؤ گی اور اپنا کیا آپ پاؤ گی۔" اور گسائیں مہندر گر جی نے باون تولے پاؤ رتی جو سنتے ہیں اس کے اکیس مٹکے آگے رکھ کے کہا "یہ بھی ایک کھیل ہے جب چاہیئے تو بہت سا تانبا گلا کے ایک اتنی سی اس کی چھوڑ دیجئے گا کنچن ہو جائے گا" اور جوگی نے یہ سبھوں سے کہہ دیا جو لوگ ان کے بیاہ میں جاگے ہیں ان کے گھروں میں چالیس دن رات سونے کی ٹاڑیوں کے روپ میں ہن برسیں اور جب تک جئیں کسی بات کو پھر نہ ترسیں۔ نو لاکھ ننانوے گائیں سینے روپے کی سنگھوٹیوں کی، جڑاؤ گہنا پہنے ہوئے، گھنگرو، جھنجھناتیاں، بامھنوں کو دان ہوئیں اور سات برس کا پیسا سارے راج کو چھوڑ دیا۔ بائیس سے ہاتھی اور چھتیس سے اونٹ لدے ہوئے روپوں کے لٹا دیئے۔ کوئی اس بھیڑ بھاڑ میں دونوں راج کا رہنے والا ایسا نہ رہا جس کو گھوڑا جوڑا، روپوں کا توڑا، سونے کی جڑاؤ کٹوروں کی جوڑی نہ ملی ہو اور مدن بان چھٹ دولہا دولہن پاس کسی کا ہیاؤ[1] نہ تھا جو بن بلائے چلی جائے، بن بلائے دوڑی آئے تو وہی آئے اور ہنسا دے تو وہی ہنسائے۔ رانی کیتکی کے چھیڑنے کو ان کے کنور اودے بھان کو کنور کنور جی کہہ کے پکارتی تھی اور ایسی بات کو سو سو روپ سے سنوارتی تھی۔

دوہے اپنی بولی کے

گھر بسا جس رات انھوں کا تب مدن بان اس گھڑی
کہہ گئی دولہا دلہن کو ایسی سو باتیں کڑی
باس پا کر کیوڑے کی کیتکی کا جی کھلا
سچ ہے ان دونوں جنوں کو اب کسی کی کیا پڑی
کیا نہ آئی لاج کچھ اپنے پرائے کی اجی
تھی ابھی اس بات کی ایسی ابھی کیا ہڑبڑی

(دلہن نے اپنے گھونگٹ سے کہا)

جی میں آتا ہے تیرے ہونٹوں کو مل ڈالوں ابھی
بل بے اے رنڈی ترے دانتوں کی مسی کی دھڑی

---

[1] (ن) ہیاؤ، یعنی ہمت۔

حیدر بخش حیدری

طوطا کہانی

(سنہ ۱۸۰۱ء)

ستائیسویں داستان۔ عاشق ہونا ایک بادشاہ کا روم کی شہزادی پر اور حکم قتل دینا اس کے لڑکے کا۔

ایک بادشاہ روم کی بادشاہت کے قریب رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن اس کے وزیر نے کہا "اے جہاں پناہ! روم کا بادشاہ ایک خوبصورت لڑکی رکھتا ہے کہ۔ ؎

عجب طرح کا نور ہے جاں فزا
کہ مہ جبیں کے ہو روبرو تھک رہا

اگر وہ بیٹی اپنی جناب عالم پناہ کو بیاہ دے تو کیا خوب" بادشاہ نے اس سخن وزیر کے کو نہایت پسند کیا اور ایک ایلچی کے ساتھ مع سوغات اس لڑکی کی طلب کا پیغام روم کے بادشاہ کو بھیجا۔ جس وقت نامہ بر نے یہ پیغام اس بادشاہ سے کہا تو بادشاہ سن کر ایلچی پر خفا ہوا اور کہنے لگا "اے نامہ بر تیرے بادشاہ نے مجھ کو کیا سمجھا جو اس ڈھب کا پیغام بھیجا۔ اگر میں اپنی بات پہ آتا ہوں تو اس کی سلطنت خاک میں ملاتا ہوں۔ تجھے کیا کہوں۔ چل دور ہو، سامنے سے۔ بہتر یہی ہے۔ کہ پھر ادھر منہ نہ کرنا خبردار۔ خیر اسی میں ہے۔" وہ بیچارا اس کی خفگی سے تھرا گیا۔ اور وہاں سے ناامید پھرا۔ میر حسن۔

اسے غصّہ دیکھ وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

غرضیکہ پچھلے پاؤں بھاگ کر اپنے بادشاہ کے پاس آیا اور وہاں کی واردات بیان کی یہ بات بادشاہ کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ اسی گھڑی فوج قاہرہ اپنے ساتھ لے کر چڑھ گیا۔ اور اس کے ملک کو آن کی آن میں تاخت و تاراج کیا۔ جب وہ تنگ آیا۔ ناچار اپنی لڑکی بیاہ دی۔

غرض وہ بادشاہ اس شہزادی کو ہمراہ لے کر اپنے شہر کو گیا۔ اور اس سے عیش و عشرت کرنے لگا۔ بعد کئی دنوں کے شہزادی اپنے بیٹے کی جدائی سے جو کہ پہلے خاوند سے تھا۔ اور جسے نانا کے پاس چھوڑ آئی تھی۔ بے قراری ہوئی۔ اور روئی۔

آخر اس کے بعد یہ بات اپنے جی میں ٹھیرائی کہ کسی بہانہ سے اس کو اپنے پاس بلوائیے۔ اس خیال میں رہتی تھی کہ اتنے میں بادشاہ نے اپنا ایک نہایت بیش قیمت ڈبہ کہ جواہر سے بھرا ہوا تھا، دیا۔ تب بادشاہ سے کہنے لگی کہ آپ نے سنا ہوگا کہ میرے باپ کے پاس ایک ایسا غلام عقلمند ہے کہ جواہر کی خوب شناخت کرتا ہے اور اچھا بُرا بتا دیتا ہے۔ بادشاہ نے کہا: "اگر اس غلام کو تیرے باپ سے مانگوں تو وہ مجھے دے یا نہ دے؟"

اس نے کہا کہ باباجان نے اس کو بچپن سے فرزند کی طرح پرورش کیا ہے۔ اگر تم اس کی تمنا رکھتے ہو اور اسے بلوانا منظور ہے تو ایک سوداگر میں اپنی طرف سے بھیجوں اور کچھ اپنی نشانی بھی دوں اور بہتری کا امیدوار اس لڑکے کو کر دوں۔ تو شاید وہ انکار نہ کریں۔ بادشاہ نے ایک سوداگر کو اس سبب سے تجارت کے لئے روم کی طرف بھیجا۔ جس وقت وہ تاجر بموجب بادشاہ کے فرمان کے اپنا مال و اسباب لے کر روم کی طرف چلا۔ اس وقت شاہزادی بادشاہ سے چھپ کر سوداگر سے بولی "اے سوداگر وہ لڑکا غلام نہیں۔ بلکہ میرا بیٹا ہے۔ اور ایک خط میرا دینا اور بادشاہ روم سے یہ پیغام کہو کہ وہ لڑکے کی جدائی سے نہایت مغموم ہے۔ یہاں سے غلام کے نام کے ساتھ اس کو بھیجا دیجئے۔ جب وہ تیرے ساتھ آئے۔ بخوبی لے آئیو مگر یہ پردہ نہ کھولیو۔"

آخر کار وہ سوداگر گیا۔ اور کتنے دنوں کے بعد اس لڑکے کو لے آیا۔ اور بادشاہ کے حوالہ کیا۔ بادشاہ نے جو اس لڑکے کو خوبصورت اور ہنرمند پایا۔ تو نہایت خوش ہوا اور اس تاجر کو ایک خلعت عمدہ بخشا۔ اور اس غلام کو اپنے پاس رکھا۔ اور ماں اس کو روبرو سے دیکھ لیتی۔ اور سلام و پیام کے ساتھ اپنا جی خوش کرتی۔

اتفاقاً ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے گیا۔ شہزادی نے فرصت پا کر اس لڑکے کو محل میں بلوایا اور اپنے گلے لگایا۔ اور اس کا سر منہ چوما۔ اور گذشتہ جدائی کا غم اس سے کہا۔

یہ خبر پہرہ داروں نے اسی گھڑی بادشاہ کو پہنچائی کہ آج شہزادی نے جہاں پناہ کے پیچھے اس غلام کو محل میں طلب کیا۔ اور اپنے برابر بٹھایا ہے۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی بادشاہ نہایت آزردہ ہوا۔ اور کہنے لگا۔ ایسی عورت سے ڈریئے۔ کہ یہ ڈیوڑھی پر دیوار بناتی ہے۔ کیسا مکر کر کے اپنے یار کو روم سے بلایا ہے۔ اللہ رے۔ کلیجہ! پھر آپ جلد شکارگاہ سے محل میں داخل ہوا۔ اور کرسئ جواہرنگار پر متفکر ہو کر بیٹھ گیا۔ اس حالت میں شاہزادی نے بادشاہ کو دیکھا تو دریافت کیا۔ کہ آج مزاج مبارک ناساز معلوم ہوتا ہے۔ کیا سبب ہے؟

تب بادشاہ نے کہا "کیا خوب تم اپنے معشوق کو روم سے بلوا کر ہم بستر ہو اور مجھ سے بیوفائی کرو۔ کیا شوخی اور بے شرمی ہے" چاہتا تھا کہ اسے ہلاک کرتا پر عاشق معشوق کو کب مار سکے۔ پھر اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ بی بی کے بدلے غلام کو مارے۔

یہ ٹھیرا کہ ایک جلاد کو اشارہ کیا۔ اور کہا کہ اسی گھڑی اس کے سر کو جدا کیا جائے۔ یہ سنتے ہی اس لڑکے کو جلاد نے پکڑا اور قتل گاہ میں بٹھا کر پوچھا کہ اے اجل گرفتہ تو یہ نہ جانتا تھا کہ یہ بادشاہ کی بیگم ہے۔ اس سے دوستی کرونگا تو کیونکر بچوں گا۔ اور تیرا قدم کیونکر بڑھا جو تو محل شاہی میں گیا۔ اس نے کہا کہ تو ایسی بات نہ کہہ۔ وہ میری سگی ماں ہے۔ جب میرا باپ مرا تو اس نے اسے اپنا شوہر کیا۔ اور مارے شرم کے احوال اس سے نہ کہا۔ میں جھوٹ نہ کہونگا۔ مار دو یا چھوڑ دو۔ بیت:۔

قابو میں ہوں میں تیرے گو اب بچا تو پھر کیا
خنجر تلے کسی نے اک دم لیا تو پھر کیا

اس بات کو سنتے ہی جلاد کو رحم آیا اور اس کے قتل کا ارادہ نہ کیا۔ اور اپنے جی میں کہنے لگا کہ اگر یہ بات بادشاہ پر کھل کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔ اور شہزادے کی خاطر اس نے اس لڑکے کو مجھ سے طلب کیا۔ اور میں اس کو اس کے پاس جیتا نہ پہنچاؤں گا۔ تو میں بھی اسی طرح

دوسرے کے ہاتھ سے مارا جاؤنگا۔ اس اندیشہ کو دل میں جگہ دے کر بادشاہ سے عرض کی "جہاں پناہ اس کشتنی کو وہاں جاکر مارونگا جہاں پانی کا نام بھی نہ ہو"۔

غرض اس بہانہ سے وہ اس کو بادشاہ سے لے کر اپنے گھر گیا۔ اور چھپا رکھا۔ اور بعد دو دن کے بادشاہ کی جناب میں آکر عرض کی "عالم پناہ! سلامت اس کا سر قدم مبارک پہ نثار ہوا"۔ بارے اس بات کے سنتے ہی تھوڑی سی آتشِ غضب بادشاہ کی ٹھنڈی ہوئی مگر شہزادی کا اعتبار اُٹھ گیا۔ اور اس کی کوکھ میں اور بھی محبت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ میر حسن۔

کلیجہ پکڑ وہ تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے بکس رہ گئی

بے اختیار وہ رو کر اپنے جی میں کہنے لگی کہ یہ کیا ہوا۔ ادھر بیٹا جدا ہوا ادھر خاوند چھوٹا۔ قضائے کار ایک دن ایک بڑھیا نے جو اس کے محل میں رہتی تھی اس سے پوچھا کہ اے بی بی اس جوانی پر یہ غم کس کا کھاتی ہے جو اس طرح سے آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے اور منہ ڈھانکے آٹھوں پہر مسند پر پڑی رہتی ہے؟۔ تب شاہزادی نے سارا احوال اس سے کہا کہ یہ ماجرا مجھ پر گزرا ہے۔ یہ سُن کر اس نے عرض کی "اے شہزادی تو خاطر جمع رکھ۔ میں ایک بہانہ سے تیرے بادشاہ کو تجھ پر مہربان کر دوں گی۔ اور محل میں لے آؤں گی"۔ شہزادی نے کہا "اے مادرِ مہرباں! اگر اس درد کی دوا کرے گی۔ تو میں تیرے دامن اور جیب کو جواہرات سے بھر دوں گی"۔

آخر کار ایک دن اس پیر زال نے بادشاہ کو تنہا دیکھ کر پوچھا "اے شہنشاہ! میں تجھے اور دنوں سے کچھ آجکل متفکر دیکھتی ہوں۔ میں واری جاؤں خیر تو ہے"! بیت

تجھے خوش رکھے میرا پروردگار
تیری اس جوانی پہ بڑھیا نثار

بادشاہ نے کہا۔ کہ اے اماں نیک بخت میں وہ درد بے درماں رکھتا ہوں۔ کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ درد یہ ہے۔ کہ شاہزادی نے روم سے اس غلام کو بلایا۔ کہ جس پہ وہ عاشق تھی۔ اور میں نے اسے قتل کیا۔ پر شاہزادی کو مار نہیں سکتا۔ کیونکہ خدا جانے یہ بات جھوٹ ہے یا سچ ہے۔ اور وہ میری معشوقہ ہے۔ اگر بے تقصیر مار ڈالوں۔ اور پھر جھوٹ نکلے۔ تو بدنامی ہو۔ اور جی کی بے قراری اس کے علاوہ ہو۔ یہ عقدہ باعث دل بستگی کا ہے۔

یہ بات سُنتے ہی وہ پیر زال کہنے لگی۔ کہ بادشاہ سلامت! تم اس بات کا کچھ فکر مت کرو۔ میرے پاس ایک تعویذ ہے۔ کہ اس کو جس کسی کی چھاتی پہ رکھ دے۔ وہ اپنے دل کا سب احوال خود بخود کہہ دے سو وہ نقش میں تجھیں لکھ دیتی ہوں۔ تم اس کے سینہ پہ دھر دیکھیو۔ اس کے جی میں جو ہو گا۔ سو سب حال آپ سے کہہ دے گی۔

بادشاہ نے کہا "وہ تعویذ جلد لا"۔ بڑھیا نے اسی وقت وہ تعویذ بادشاہ کو لا دیا۔ اور آپ شہزادی کے پاس جا کر کہا۔ کہ آج تو سر شام سے جھوٹ موٹ سو رہیو۔ ملکہ جس وقت بادشاہ تیری چھاتی پہ تعویذ رکھے۔ تو اس وقت سوتوں کی طرح سے جو تیرا احوال ٹھیک ٹھیک ہو سو وہ بخوبی کہہ دینا۔ حاصل کلام جب پہر رات گزر گئی۔ بادشاہ نے اس وقت نقش کو شہزادی کے سینے پہ جو رکھا وہیں اس نے اپنے پہلے خاوند کا حال اور اس کے لڑکے کا احوال یک بیک کہہ دیا۔ بادشاہ نے جو یہ بات سُنی اسے جگا کر نہایت مہربانی کی۔ اور سینے سے لگا کر شہزادی سے کہا۔ کہ جانی! کس واسطے یہ راز مجھ سے پہلے ہی نہ کہا۔ وہ گھبرا کر بولی "میں نے کونسی بات چھپائی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ وہ تیرا سگا بیٹا تو نے غلام کیوں بنایا"؟

تب اس نے آنکھیں نیچی کر کے عرض کی۔ کہ مجھ کو شرم معلوم ہوتی تھی۔ کیونکر کہتی یہ سنتے ہی بادشاہ نے اُسی گھڑی جلاد کو بلا کر کہا۔ کہ بہت جلد اس لڑکے کو میرے پاس لے آؤ۔ اور اگر مار ڈالا ہے۔ تو اس کی قبر کہاں ہے۔ بتلا؟ اس نے کہا۔ کہ جہاں پناہ! میں نے اسے نا حال نہیں مارا ہے۔ وہ خدا کے فضل سے جیتا جاگتا ہے۔ اور موجود ہے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اور اُسی وقت لڑکے کو بلوا کر اس کی والدہ کے حوالہ کیا۔ اور اس ناامید نے لڑکے کو گود میں لے کر درگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

حیدر بخش حیدری

آرائشِ محفل

(سنہ ۱۸۰۱ء)

(حاتم کا کوہِ ندا کی خبر لانا)

صبح کو حاتم نے حمام کیا، کپڑے پہنے حسن بانو کی ڈیوڑھی پر آیا۔ چوبداروں نے خبر کی کہ حاتم آتا ہے۔ اس نے پردہ کے اندر بلایا اور ایک کرسی پر بٹھا کے کہا۔ اے حاتم سننے میں یوں آیا ہے کہ ایک پہاڑ سے ندا آتی ہے اس لئے اس کا نام کوہ ندا رکھا ہے اب خبر لا کہ وہاں آواز کرنے والا کون ہے اور پہاڑ کے اوپر کیا اسرار ہے۔ حاتم یہ سن کر وہاں سے رخصت ہوا اور کارواں سرا میں منیر شامی سے کہا کہ اب میں کوہ ندا کی خبر لینے جاتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو اس بات کی تحقیق کر کے پھر تجھ سے ملتا ہوں ورنہ مرضی خدا کی۔ تم کسی بات کا خطرہ نہ کرنا۔ غرض حاتم نے دو چار باتیں نصیحت آمیز منیر شامی سے کہہ کر جنگل کی راہ لی۔ جس بستی میں جاتا ان سے پوچھتا کہ اے عزیز اگر تم میں سے کوئی کوہ ندا کی راہ سے واقف ہے تو مجھے بتا دے۔ یہ بات سن کر لوگ حیران ہوتے اور کہتے کہ اتنی عمر ہوئی ہم نے نام بھی نہیں سنا۔ جوانمرد بن دیکھے راہ طے کرتا چلا جاتا تھا۔ ایک مہینے کے بعد کسی شہر کے نواح میں جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ مرد و زن اس شہر کے صحرا میں جمع ہوئے ہیں۔ یہ انہیں کی طرف چلا۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ایک شخص چلا آتا ہے وہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ مرحبا خوب آیا تو کہاں تھا۔ ہم تیرے منتظر ہیں۔ حاتم آگے گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہیں اور ایک جنازے کے گرد بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ اس مردے کو کیوں نہیں گاڑتے اور اس قدر کیوں روتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہماری قوم کی یہ رسم ہے کہ کوئی شخص کیا امیر کیا غریب مر جاوے تو ہم اس کے جنازے کو جنگل میں لے آتے ہیں اور کھانے بہت سے ستھرے پکا کر ایک دسترخوان پر چن کے مسافر کی راہ دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی مسافر اس عرصے میں آیا مردے کو گاڑ دیتے ہیں اور کھانا مسافر کو کھلا دیتے ہیں۔ سات روز ہوئے یہ مردہ اسی طرح پڑا ہے کوئی اب تک نہیں آیا۔ ہم عجیب مصیبت میں گرفتار تھے کہ ہر روز کھانا شام کے وقت عورتوں کو بھیج دیتے تھے اور آپ یوں ہی پڑے رہتے تھے۔ الحمد للہ سات روز کے بعد تیری صورت دیکھی اب دفن کریں گے۔ حاتم نے کہا اگر مہینہ بھر تک کوئی مسافر یہاں نہ آوے تو اس مردے کا کیا حال ہو اور تم کس صورت سے جیو۔ انہوں نے کہا ساتویں روز مسافر بالضرور آتا ہے۔ اگر پندرہ روز تک نہ آئے تو تمام دن روزہ رکھ کر شام کے وقت پانی پئیں اور ایک مردہ ایک ماہ تک نہیں سڑتا۔ حاتم نے کہا اگر اس سے زیادہ مدت گزرے اس وقت کیا کرو گے۔ وہ بولے ایسا ہو تو مردے کو دفن کریں اور تمام

مرد و زن چھ ماہ تک روزہ رکھیں۔ شام کو توبہ کریں اور روزہ افطار کریں اور بہت سی خیرات کریں۔ تب اپنے کام میں مشغول ہوں۔ یہ سن کر حاتم حیران ہوا اور انہوں نے اس مُردے کو تہ خانہ میں اتار کر فرش بچھا کر اس پر رکھا اور طرح طرح کے کھانے اور خوشبو کی بتیاں روشن کر کے سات بار اس کے گرد پھر کر قدمبوس ہو کر باہر نکل آئے اور دسترخوان پر جا بیٹھے۔ پھر حاتم سے کہا "اے مسافر پہلے کھانے میں تو ہاتھ ڈال اور پیٹ بھر کھا۔ یہ قبول ہوا اور تیری توجہ سے ہم بھی روزہ کھولیں۔" یہ سن کر حاتم کھانے لگا اور سب بھی شریکِ طعام ہوئے۔ اس کے بعد جو بچا ہر ایک نے اپنے اپنے گھر بھجوا دیا اور ان کی عورتوں نے کھا لیا۔ پھر وہ نہائے اور کپڑے پاکیزہ پہن کر چلے اور حاتم سے کہا "اے جوان اگر تیرا جی چاہے تو چند روز اور ہمارے گھر مہمان رہ۔" حاتم نے کہا "بہت بہتر۔ تمہاری خاطر اور دو چار روز رہ سکتا ہوں۔"

غرض وہ اس کو شہر میں لے گئے اور ایک مکان ستھرا سا اس کے رہنے کو خالی کر دیا اور خورد و نوش کے لوازم خوبصورت لونڈیوں سمیت بھجوا دیئے۔ حاتم نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں کی عجیب رسم ہے۔ اگر میں ان کاموں سے فراغت پاؤں اور خدا میرا مطلب پورا کرے تو میں بھی اپنے شہر میں جا کر اسی طرح مہمانداری کروں اور وہ عورتیں آرزومند تھیں کہ اس جوان کا جی ہم میں سے جس کو چاہے اس سے بشوق تمام ملے اور شرابِ وصل خوب پیئے۔ لیکن حاتم نے کسی طرف خواہش کی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ جب سات روز گزر گئے تب ان عورتوں نے اپنے سرداروں سے حاتم کی نیک ذاتی اور نیک نیتی کی خبر دی۔ حاکم شہر نے اس کو روبرو بلوایا اور عزت و حرمت سے مسند پر بٹھایا اور کہا کہ اگر شہر میں بود و باش اختیار کرو تو عین مہربانی ہے اور میں بھی اپنی بیٹی تیری خدمت میں دوں۔ حاتم نے کہا کہ مجھ کو ایک ضروری کام درپیش ہے اس سبب سے ناچار ہوں نہیں تو رہتا۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اگر ہم بھی اس کام سے مطلع ہوں تو تیری رفاقت کریں۔

حاتم نے التماس کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ساتھ تکلیف کھینچے۔ وہ بولا کہ اے جوان اگر ساتھ نہیں لیتا تو اتنا کہہ دے کہ وہ ایسا کام کیا ہے؟ حاتم نے کہا کہ "ایک عورت حسن بانو نامی سات سوال رکھتی ہے جو کوئی اس کا بخوبی جواب دے وہ اپنا نکاح اس کے ساتھ کرے۔ حاصل یہ ہے کہ شہزادہ منیر شامی اس پر عاشق ہوا ہے، نہ جدائی کی طاقت رکھتا ہے نہ وصال کی قدرت اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے سوال پورے کرے مگر اس کے فراق میں جنگل میں روتا پھرتا ہے۔ اتفاقاً ایک دن مجھ سے ملاقات ہوئی میں نے جو اس کو بحالِ تباہ آہیں بھرتا دیکھا نہایت غمگین ہوا بلکہ رو دیا۔ آخر کار میں تاب نہ لا سکا برائے خدا اس کے لئے مسافرت اختیار کی۔ خدا کے فضل سے اس کے چار سوال پورے کر چکا ہوں۔ اب پانچویں سوال کی باری ہے اور وہ یہ ہے کہ کوہِ ندا کی خبر لانا چاہئے اس تلاش میں چھ ماہ گزر گئے۔ جس سے پوچھتا ہوں کوئی نہیں بتاتا۔ اگر تجھ کو خبر ہو تو بتا۔"

یہ بات سن کر اس دیرینہ سال نے کہا "میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دکھن کی طرف طلسمات ہے اور بائیں طرف شہر عالیشان آباد ہے وہاں آج تک کسی نے مُردہ نہیں دیکھا نہ قبر دیکھی اور نہ کوئی کسی کو روتا ہے۔" یہ ماجرا سن کر حاتم نے کہا "مجھے اس سمت جانا ہے۔" وہ بولا "اے عزیز سنی ہوئی راہ کیسے طے کر سکتا ہے؟" حاتم نے کہا "جو مجھے یہاں لایا ہے وہ وہاں بھی پہنچائے گا۔" اس سخن کو سن کر اس دیرینہ سال نے بہت سا زر و جواہر اس کے سامنے رکھ دیا۔ حاتم نے اس میں سے خرچ راہ کے موافق لیا اور باقی فقیروں کو دے کر اسی طرف کا راستہ لیا۔ ایک مدت کے بعد ایک شہر کے قریب جا پہنچا اور اس کے گرد و پیش کوئی قبر نہ دیکھی، جانا کہ وہ شہر یہی ہے۔ اندر گیا وہاں کے رہنے والوں نے پوچھا کہ اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ حاتم نے کہا شاہ آباد سے آیا ہوں اور کوہِ ندا کو جاؤں گا۔ انہوں نے کہا کوہِ ندا کا راستہ یہاں سے بہت دور ہے تو نہ جا سکے گا۔ اس نے جواب دیا کہ جو مجھ کو یہاں لایا ہے وہ کریم کارساز وہاں بھی پہنچائے گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ تو آج کی رات یہیں رہ جا، ہمارا دال دلیا قبول کر۔ حاتم یہ بات سن کر ٹھہر گیا۔ وہاں ایک آدمی کئی دنوں سے بیمار تھا اس کے وارثوں نے لوگ جمع کر کے اسے ذبح کر کے آپس میں گوشت بانٹ لیا اور یہ شخص جس نے حاتم کو مہمان رکھا تھا اپنا حصہ پکا کر پانی کا ایک کوزہ دو چار روٹیاں حاتم کے پاس

شام کے وقت لے آیا اور کہنے لگا کہ اے مسافر اس کو کھا۔ حاتم کھاتے ہی کہنے لگا کہ میں نے کبھی ایسا گوشت نہیں کھایا۔ اس نے کہا البتہ تو نے جانوروں کا گوشت کھایا ہوگا۔ لیکن یہ آدمی کا ہے۔ ایسا نہ کھایا ہوگا۔ حاتم نے کہا کہ تم آدم خور ہو تم سے ڈرنا چاہیئے۔ شاید کسی مسافر کو تم نے مارا ہوگا اس کا گوشت کھانا چاہتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا یہی قاعدہ ہے کہ جو مسافر بھولا بھٹکا یہاں آنکلتا ہے تم اس کو ذبح کرکے گوشت بانٹ کر کھا لیتے ہو۔ وہ بولا: ”اے مسافر توبہ کر خدا سے ڈر مسافروں کو مار کر ہم نہیں کھاتے۔“ حاتم نے کہا: ”یہ تو طرفہ ماجرا ہے کہ آپ ہی تو کہتا ہے کہ گوشت آدمی کا ہے۔ پس کوئی ہم جنس کو ذبح کرکے نہیں کھاتا مگر غیر کو۔“ اس شخص نے جواب دیا ”تو غلط سمجھا ہے ہمارے ملک کی یہ رسم ہے کہ جو کوئی بیمار پڑتا ہے اس کے قبیلے کے لوگ اس کو ذبح کرکے آپس میں گوشت کے حصے کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سبب سے سارے شہر میں اپنی موت سے کوئی نہیں مرتا اور نہ قبر بنتی ہے۔“ اس ماجرے کو سن کر حاتم نے کہا: ”لعنت خدا کی تمہاری ایسی رسم پر اور تمہارے شہر پر۔ خدائے کریم اکثر بیماروں کو اچھا کرتا ہے اور اکثر اچھوں کو مار ڈالتا ہے۔ پس جو بیمار ہو تم اس کو ذبح کرکے کھا جاؤ۔ یہ فعل کس قوم میں درست ہے۔ یہ کیا ظلم ہے۔ اس حرکت سے سب کے سب گنہگار ہوتے ہیں اور ہزاروں خون تمہاری گردن پر ہوتے ہیں۔ تمہارا دیکھنا روا نہیں۔“ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جنگل کی راہ لی۔ دور جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک شیر مارے بھوک کے زمین پر تڑپ رہا ہے۔ یہ حالت دریافت کرکے اس نے ہرن کو شکار کیا اور شیر کے آگے ڈال دیا۔ اس نے بخوبی تمام پیٹ بھر کر کھایا اور سجدۂ شکر ادا کرکے جنگل کی راہ لی اور حاتم نے بھی کچھ کباب کرکے کھائے۔ ایک پرانے تالاب پر جا کر پانی پیا اور درگاہِ الٰہی میں سجدۂ شکر ادا کرکے آگے کا راستہ لیا۔ جب کسی جنگل میں میوہ و دانہ پاتا اسی طرح شکار کرکے گوشت کھاتا۔

چند روز کے بعد ایک آبادی نظر آئی اس کی طرف چلا۔ جب قریب پہنچا کیا دیکھتا ہے کہ بہت سے لوگ میدان میں آگ جلا کر اس کے گرد کھڑے ہیں۔ اس نے بڑھ کر پوچھا کہ اے یارو یہ کون سا ملک ہے اور تم کون ہو۔ اس جگہ اتنی لکڑی جمع کرکے آگ کیوں جلائی ہے؟ انہوں نے کہا اے فقیر تو اپنی راہ لے۔ تجھے اس کے دریافت کرنے سے کیا حاصل۔ یہاں کچھ رسوائی نہیں ہوتی جو ہم تجھے کہہ دیں ہماری قوم سے جو ایک شخص مر گیا ہے اس کی جورو اس کے ساتھ جلتی ہے۔ حاتم نے کہا اے یارو تم اس مُردے کو زمین میں کیوں نہیں گاڑ دیتے اور اس عورت کو جیتے جی کیوں جلاتے ہو۔ انہوں نے کہا اے عزیز معلوم ہوا کہ تو یہاں کا رہنے والا نہیں۔ یہ ملک ہندوستان ہے یہاں کی یہی رسم ہے۔ حاتم نے کہا یہ رسم نہایت بد ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہوا اور کسی گاؤں میں جا پہنچا۔ ایک شخص سے پانی مانگا۔ وہ ایک کٹورہ دودھ کا اور ایک میٹھے پانی کا لایا اور کہا ان دونوں میں سے جسے جی چاہے اسے پی لے۔ حاتم نے دونوں پیالے پیئے، پھر کہا اے مسافر اس وقت میرے گھر میں اچھے خوشبودار باسمتی کے چاول پکے ہیں بلکہ تیار دھرے ہیں۔ اگر تو کہے تو وہ بھی لے آؤں، اس کے ساتھ کھا نہایت مزہ پائے گا۔ حاتم بولا کہ نیکی کا پوچھنا کیا ہے۔ دل میں اس کی ہمت پر آفرین کرنے لگا۔

غرض وہ ہندو ایک تھالی میں مٹھائی اور ایک میں چاول لے آیا۔ حاتم نے بخوبی کھایا اور رات کی رات اسی گاؤں میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی اس ہندو کی جورو نے آکر رسوئی کی تیاری کی اور کہا کچھ اس میں سے کھاؤ اور دو چار دن یہیں رہو تاکہ راہ ماندگی دور ہو۔ یہ بات سن کر حاتم نے ان سے کہا کہ ہمت آفرین ہے۔ یہ بات سن کر انہوں نے نہایت عجز و نیاز سے کہا: ”ہم سے تمہاری خدمت کب ہوئی یہ کھانا معمولی لڑکوں کا موجود تھا وہی ہم بے تکلف لے آئے ہیں۔ اگر دو تین روز یہاں رہو تو البتہ ہم اپنے مقدور کے موافق کچھ خدمت بجا لائیں گے۔“ حاتم کے واسطے ایک پلنگ تکلف سے بچھایا اور اس کے آگے فرش بھی صاف ستھرا کر دیا۔ پھر اقسام اقسام کے کھانے پکوا کر اس کے سامنے رکھ دیئے اور کہا اس میں سے کچھ نوش جان فرمائیے تو عین احسان و مہربانی ہے۔ حاتم نے تو ایسے کھانے کبھی نہ کھائے تھے ان کو کھا کر بہت محظوظ ہوا اور بہت تحسین و آفرین کرکے کہنے لگا کہ یہ ہندوستان عجب گلستان ہے مگر یہاں کی رسم بد ہے کہ زندہ عورتوں کو موئے خصم کے ساتھ جلاتے ہیں یا اس کو

سُن کر انہوں نے کہا چونکہ زن وشوہر باہم الفت رکھتے ہیں یہ کہ آپس میں عاشق ومعشوق ہوتے ہیں اس لئے حیف ہے کہ خاوند مرے اور جورو جیتی رہے۔ ہم بزور نہیں جلاتے وہ اپنی خوشی سے آپ جلتی ہے۔

اتفاقاً وہاں کا رئیس بیمار ہو کر دو چار ہی دن میں مرگیا۔ اس کی چار جوروئیں اور پہلی بیوی کے ایک لڑکا بھی تھا۔ جب اس کی ارتھی بنا کر چلے تب وہ چاروں کمخواب کے لہنگے پہن کر لال تاش کی ساریاں باندھ کر گہنے پاتے سے آراستہ ہو کر پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر بالوں کو بکھیر کر ساتھ ہولیں۔ قبیلے والے لوگ ان کے پاؤں پر گر پڑے کہ تم بھری پُری ہو۔ تم کو جلنا مناسب نہیں۔ انہوں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ تب حاتم ان کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے پربزادو تمہیں شرم نہیں آتی جو اپنے گھر سے نکل کر نامحرموں میں آتی ہو اور ایک مُردے کے ساتھ جلا چاہتی ہو۔ وہ ہنس کر کہنے لگیں کہ اے جوان تجھے ہمیں دیکھنے سے حیا نہیں آتی۔ ہم تو مُردے ہیں، ہم کو تیرے پردے کی خبر نہیں۔ کیونکہ وہ کونسا دن تھا جو ہم نے اس مُردے کے ساتھ عیش و آرام کیا تھا۔ اب جو وہ مرگیا ہے تو ہم اس سے جُدا ہوں اور جیتی رہیں۔ یہ محبت سے اور مروّت سے دور ہے۔ اس کے سوا تمام عمر آتشِ غم میں جلنا پڑے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ ہی جل بجھیں جو تمام عمر کے غم سے چھوٹیں گے۔ پرمیشور جانے کیونکہ اس بات سے جی ڈرتا ہے کہ کہیں شیطان اپنے مکر سے وسوسہ نہ ڈالے کہ جن کے سبب اپنے سامی کو بھول کر کسی طرف بدنظر دیکھیں اور اس سے اپنی زندگی پر لعنت کی ہے۔ غرض انہوں نے حاتم کا کہنا نہ مانا اور دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی بھالتی وہاں تک پہنچیں۔ پھر اس مردے کو چتا میں رکھ کر اور آپ ہنستی ہوئی آئیں کسی نے اس کا سر زانو پر رکھا اور کسی نے پاؤں گود میں لئے۔ یکایک چتا کو آگ لگا دی۔ تب حاتم نے جانا کہ یہ اس آگ سے ڈر کر بھاگ اٹھیں گی۔ یہ گمان غلط ہوا اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئیں۔ حاتم یہ احوال دیکھ کر گھبرایا اور افسوس کرنے لگا جب وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے تب حاتم بھی ہندوؤں کے ساتھ آیا۔ اس نے کہا یہ عورتیں اپنی خوشی سے جلتی ہیں۔ کوئی ان پر زبردستی نہیں کرتا اور محبت کی شرط یہی ہے۔ حاتم نے کہا یہ سچ ہے اور وفاداری کا بھی یہی طریقہ ہے۔

غرضیکہ کئی روز کے بعد حاتم نے پھر کہا کہ اے یارو مجھے کوہِ ندا کی طرف جانا ہے رخصت کرو۔ یہ بات سُن کر ہندوؤں نے کہا کہ اے جوان کوہِ ندا یہاں سے بہت دور ہے تو نہ پہنچ سکے گا۔ حاتم نے پھر کہا اے عزیز مجھے رخصت کرو۔ یہ کہہ کر گاؤں گاؤں ملک ملک کی سیر کرتا ہوا اُتر کی طرف پہنچا۔ ایک شہر دکھائی دیا جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور شور و غل کرتے ہیں۔ اس نے جا کر پوچھا ارے یارو شور و غل کا کیا سبب ہے۔ کسی نے کہا "یہاں کے رئیس کی بیٹی مرگئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کے خاوند کو اس کے ساتھ جیتا گاڑ دیں۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا اسی واسطے یہ شور و غل ہے۔"

حاتم نے کہا "تمہارا رئیس کہاں ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس سے کچھ کہوں گا۔" یہ بات سُن کر وہ اس کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔

حاتم نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ "اے بزرگ تمہاری کیا رسم ہے جو جیتے کو مُردے کے ساتھ گاڑتے ہو اور اس پر یہ غضب کہ وہ غریب راضی نہیں۔ اس پر زبردستی کرتے ہو اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو۔"

سردار نے کہا "اے عزیز یہ جوان بھی تیری طرح مسافر اس شہر میں وارد ہوا تھا چند روز یہاں رہ کر میری بیٹی کو چاہنے لگا اور فوراً ہم لوگوں میں مل گیا۔ اس شہر کا دستور ہے کہ جب تک لڑکی یا لڑکا اپنی جوانی پر نہیں آتا تب تک ہم لوگ اپنی رغبت سے نہیں بیاہتے۔ جب تک کہ آپس میں عشق و محبت کی حد سے گذر جائے۔ یہاں تک کہ ہر ایک اپنی خوشی سے اقرار کرے کہ جو کوئی ہم میں سے مر جاوے تو اس کے ساتھ دوسرا گڑے گا۔ تب ہم دونوں کو بیاہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ جوان بھی رسم سے آگاہ ہو کر اس لڑکی پر عاشق ہوا تھا جب محبت کامل دیکھی تب اس کے ساتھ دفن کرتے ہیں یہ کیا ناانصاف امر ہے کہ ایک مدت تک چاچن کرتا رہا اور اس کے باغ جوانی سے گلِ مراد لوٹتا رہا۔ اب جو مرگئی تو یہ اپنی خوشی سے اس کے

ساتھ نہیں گڑتا اور اپنے اقرار پر ثابت قدم نہیں رہتا تمہیں بتاؤ کس کا قصور ہے ہم زبردستی کسی کو نہیں گاڑتے۔ اگر اس کو باندھ کر قبر میں رکھ دیں تو البتہ ظلم ہے۔ تو ہی پوچھ کہ اپنے قول سے یہ کیوں پھرتا ہے۔"

یہ بات سن کر حاتم اس کے پاس گیا اور کہنے لگا" اے جوان! تو کس لئے اپنے کہنے پر عمل نہیں کرتا۔ کب تک جئے گا آخر مرنا ہے بہتر ہے کہ جو کچھ کہا اس پر ثابت قدم رہ۔"

اس نے کہا" اے جوان تو بھی انہیں میں مل گیا۔ اپنے شہر کا دستور کیوں نہیں بیان کرتا؟"

حاتم نے کہا" میں کیا کہوں تو آپ ہی اقرار کر چکا ہے اب پھرنے سے تجھے شرم نہیں آتی؟"

اس نے کہا" یہ مجھ سے کبھی نہ ہوگا جو میں ان کا کہا مانوں اور جیتے جی مردے کے ساتھ گڑوں۔"

حاتم نے معلوم کیا کہ یہ سب اسے سب بے گاڑے نہ رہیں گے اور یہ بھی اپنی خوشی سے نہ گڑے گا۔ اس بات کا لحاظ کرکے اپنی بولی میں کہا "تو خاطر جمع رکھ میں تجھے رات کو نکال لوں گا پر اب ان کے سامنے گڑ۔"

اس نے کہا" میں تیرے نکالنے تک کیونکر زندہ رہوں گا؟"

حاتم نے تسلی کرکے لوگوں سے کہا کہ" یارو! یہ اجل گرفتہ اپنی بولی میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر کا یہ دستور ہے کہ قبر حجرے کے طور پر بناتے ہیں اگر تم بھی اسی طرح سے بناؤ گے تو میں اپنی خوشی سے گڑوں گا۔" اس سخن کو سن کر وہ کہنے لگے کہ یہ بات حاکم سے تعلق رکھتی ہے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جو وہ کہے گا وہی کریں گے۔

حاتم ان سبھوں کو ان کے حاکم کے پاس لے گیا اور کہنے لگا "خداوند یہ شخص گڑنے پر راضی نہیں اور کہتا ہے کہ جس طرح میرے ملک میں قبر بنتی ہے اگر اس ڈھب کی قبر بناؤ گے تو میں قبول کروں گا۔"

حاکم نے کہا" کس طرح کی بنتی ہے؟"

حاتم نے کہا" حضرت سلامت! کوٹھڑی کی طرح بہت بڑی کہ جس میں دس بیس آدمی اچھی طرح لیٹ جائیں۔"

یہ بات حاتم کی زبان سے سنتے ہی حاکم نے کہا" جس طرح یہ کہے بموجب اس کے کہنے کے کرو۔"

یہ سن کر وہ لوگ پھر آئے اور ایک قبر ایسی ہی بنوائی تب حاتم نے لوگوں کی آنکھ بچا کر اس سے کہا کہ اندیشہ نہ کر وقت شب تجھے نکال لوں گا۔

وہ اس کلمے سے راضی ہوا اور لوگوں سے کہنے لگا" اے یارو اب دیر نہ کرو کہ جو تم چاہتے ہو مجھے قبول ہے۔"

آخر انہوں نے ان دونوں کو گاڑ دیا اور ایک پتھر سے اس کے منہ کو بند کرکے مع حاتم شہر کو گئے۔ پھر اس کی مہمانداری کی اور ایک مکان ستھرا سا رہنے کو دیا۔ حاتم پھر رات ہونے کا منتظر تھا کہ کسی طرح اس شخص کو قبر سے باہر نکالے۔ جب رات ہوئی اور گھر والے سو رہے حاتم اپنے بچھونے پر سے اٹھا اور اس گور کی طرف چلا۔ اس ملک کا یہ دستور تھا کہ تین روز تک مردہ کی قبر پر ان کے وارث تمام رات جا کر جاگا کرتے تھے اور گھر نہ آتے تھے.... چنانچہ اسی سبب سے حاتم کو قابو نہ چلا چوتھے روز حاتم اس گور پر گیا اور وہ شخص جو اس میں دفن تھا حاتم کو بہت سخت سست کہہ رہا تھا۔ الغرض حاتم نے پکارا وہ نہ بولا۔ جانا کہ شاید مر گیا۔ پھر پکارا کہ اے جوان میں تجھے نکالنے آیا ہوں۔ اس نے جواب نہ دیا۔ حاتم نے پھر پکارا۔ پھر بھی نہ بولا حاتم کو یقین ہو گیا کہ بے شک مر گیا۔ کمال افسوس ہوا اور بے اختیار رونے لگا۔ چوتھی بار با آواز بلند پکارا" اے جوان اگر جیتا ہے تو جواب دے ورنہ میں اپنا وعدہ وفا کر چکا۔ تو قیامت تک یہیں رہے گا۔"

وہ یکایک چونک پڑا اور نادان کے پاس آکر کہنے لگا" اے شخص تو کون ہے؟"

حاتم نے جو اس کی آواز سنی سجدۂ شکر بجا لایا اور کہا کہ" میں وہی ہوں جو تجھ سے وعدہ کر گیا تھا۔" یہ کہہ کر خنجر سے قبر کھود کر نکالا اور بعد ایک ساعت کے

کھانا کھلا کر کہا کہ اب جدھر تیرا منہ اٹھے چلا جا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس خرچ نہیں۔ حاتم نے کئی درہم دے کر رخصت کیا اور اس قبر کو درست کر کے اپنی جگہ پر آکر سو رہا۔

صبح کو اٹھ کر لوگوں سے کہا کہ کوہِ ندا کا راستہ بتاؤ میں جاؤں انہوں نے کہا جاؤ یہاں سے قریب ہے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک دوراہا ملے گا اگر داہنی طرف جائے گا تو منزلِ مقصود کو پہنچے گا۔ حاتم ان سے رخصت ہوا اور دس روز تک رات دن چلا گیا۔ بعد طے منازل گیارھویں دن اسی دوراہے پر جا پہنچا اور ان کی نصیحت کو بھول کر بائیں طرف جا نکلا حیف ہے کہ جس راہ کو انہوں نے منع کیا تھا اسی پر جا پہنچا اور دو دن کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ تمام جانور درندے کیا گزندے بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہ ایک کونے میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی درندہ پیچھے پڑا ہے جو اپنا جی چھوڑے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ سمجھ کر درخت پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑے بڑے ہاتھی اور گینڈے بھی گھبرائے ہوئے بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں اور ان کے پیچھے ایک چھوٹا سا جانور مہیب صورت چراغ سی آنکھیں سر پر دم چھتر کئے ہوئے چلا آتا ہے۔ حاتم ڈرا کہ کوئی بلائے عظیم ہے کہ جس کے ڈر سے اتنے بڑے جانور درندے بھاگے چلے آتے ہیں میں غریب کس شمار میں ہوں مستعد ہو کر خنجر نکال لیا۔ اتفاقاً وہ جانور اسی درخت کے نیچے آیا اور آدمی کی بو پاتے ہی غرّا کر اچھلا۔ حاتم نے ایک خنجر ایسا مارا کہ دونوں ہاتھ قلم ہو گئے۔ گر پڑا اور پھر سنبھل کر نہایت غضب سے لپکا۔ حاتم نے پھر اس کے پیٹ میں ایک خنجر مارا کہ انتڑیاں نکل پڑیں۔ زمین پر گر پڑا اور گرتے ہی پیشاب کر کے دم کو اس میں بھگو کر ہلانے لگا۔ جہاں جہاں اس کی بوندیں پڑیں وہاں آگ لگ گئی۔ جب اس درخت کے پاس پہنچی حاتم جست کر کے ایک چشمہ میں جا پڑا اور وہ جانور مر گیا۔ جب وہ آگ بجھ گئی تب حاتم اس پانی سے نکل کر اس درخت کے نیچے آیا اور اس جانور کے دانت جو خنجر کے برابر تیز تھے اکھاڑ لئے اور دم کانوں سمیت کاٹ کر ترکش میں ڈال لئے اور چل نکلا۔

کئی دن کے بعد ایک قلعہ دکھائی دیا اسی طرف متوجہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا تو اس کے کنگرے آسمان سے لگے دیکھے اور بڑی بڑی عمارتیں آئینہ دار اس میں چمک رہی تھیں۔ وہ چوچڑ کا بازار نہایت ستھرا اور صاف آراستہ ہو رہا تھا۔ اور ہر شے دکانوں میں موجود تھی۔ مگر آدمی کا پتہ مفقود۔ یہ دیکھ کر حاتم حیران ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ کوئی دیو اس شہر میں آتا ہے کہ جس کے ذریعہ سے یہاں کے لوگ دکانیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ سوچ کر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ خاص قلعہ شاہی میں پہنچا۔

یہاں بادشاہ اپنے اہل و عیال اور اجناس سمیت رہتا تھا۔ دو چار نوکر بھی باہر دروازے کے دریچوں میں بیٹھے تھے۔ حاتم کو دیکھ کر بولے کہ مدت کے بعد ایک مسافر شہر میں آیا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کو پکارو کہ ادھر آئے۔ یہ بات سن کر ایک شخص نے پکارا۔ حاتم ایک دریچہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے کھڑکی میں سے سر نکال کر کہا کہ "اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟"

حاتم نے کہا کہ یمن کے رہنے والوں میں سے ہوں۔ شاہ آباد سے آیا ہوں۔ کوہِ ندا کو جاؤں گا۔

یہ بات سن کر بادشاہ نے کہا "اے جوان تو راہ بھول گیا جو دائیں طرف سے آیا۔ شاید تیری موت تجھ کو یہاں لائی ہے۔"

حاتم نے کہا "مرضیٔ حق پر راضی ہوں لیکن اے شخص تو اپنا ماجرا کہہ۔"

اس نے کہا "میں یہاں کا بادشاہ ہوں اور اس ملک میں چند روز سے ایک بلائے عظیم آتی ہے اس کے سبب سے کیا رعیت کیا سپاہ سب شہر چھوڑ کر چلے گئے اور شہر ویران ہو گیا لیکن وہ بھی بے قصور ہیں کیا کریں کیونکہ کسی کی طاقت نہیں جو عہدہ برآ ہو سکے اور میں اپنی شرم و حیا سے اہل و عیال سمیت قلعہ میں بند ہو گیا۔ طاقت نہیں رکھتا کہ اسے ماروں ناچار ہو کر گوشہ گیری توکل بخدا کی۔" حاتم نے کہا "اے بادشاہ وہ بلائے ناگہانی کیا کوئی دیو ہے یا کوئی درندہ عظیم ہے کہ کوئی اس کی تھاہ ہی نہیں۔"

بادشاہ نے فرمایا کہ "اس کا مسکن کوہِ قاف ہے مگر تھوڑے دنوں سے یہاں اس کا گزر ہونے لگا ہے۔ اسی کے باعث تمام ملک ویران ہو گیا۔

ہر روز اس کا ایک وقت آنا اور دو چار آدمیوں کو کھا کر چلے جانا۔ آج تک قدم قلعہ میں نہیں آیا۔ اس واسطے ایک خندق عظیم اس کے گرد پانی سے مدام بھری رہتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا ہے۔"

یہ سن کر حاتم بولا "اے بادشاہ تجھے مبارک ہو۔ میں نے فلاں جنگل میں اس کو مارا ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے کہ میں کوہِ ندا کی راہ بھول کر بائیں طرف آنکلا" حاتم نے پھر تمام ماجرا اس جانور کا اور اپنا بیان کیا۔ اس بات کو سنتے ہی بادشاہ اپنے قلعہ سے اترا اور حاتم کو اپنے گلے سے لگایا۔ اندر لے گیا۔ بہ عزت تمام مسند پر بٹھا کر انسام انسام کے کھانے منگوا کر اس کے سامنے چنوائے۔ حاتم نے بخوبی تناول فرمایا اور بادشاہ بھی اس کا شریک طعام رہا۔ پھر آپ خاصہ منگوا کر نوش جان کیا اور اس کو بھی کھلایا۔

اس کے بعد بادشاہ نے کہا "میں کیونکر باور کروں کہ وہ بلا ماری گئی؟"

حاتم نے اس کے دانت اور دم ترکش سے نکال کر دکھلائے بادشاہ ان کے دیکھتے ہی حاتم کے پاؤں پر گر پڑا اور بہت شکر گذاری کی۔ پھر ہر طرف لوگوں کو شقے پروانے بھیجے کہ وہ بلا دفع ہوئی۔ تم بے دھڑک آکر اپنے ملک میں بسو اور بخوبی اوقات بسر کرو۔

چند روز کے بعد حاتم نے رخصت چاہی اور عرض کی کہ ایک رہبر میرے ساتھ کرو کہ کوہِ ندا کا راستہ بتا دے۔ بادشاہ نے فرمایا "اے جوان یہ شہر خدا کے فضل سے آباد ہو جائے گا اسے اپنا ہی سمجھو۔ یہیں بود و باش اختیار کرو۔ میں اپنی بیٹی تمہاری خدمت میں دیتا ہوں۔ اس کو قبول کرو۔"

حاتم نے کہا "جب تک میں بندگانِ خدا کے کاموں سے فراغت نہیں پاتا عیش کو حرام جانتا ہوں۔"

بادشاہ نے یہ کلام سن کر کہا "آفرین تیری ہمت پر۔" ایک رہبر دے کر رخصت کیا۔ حاتم اس کے ساتھ ہوا۔

تھوڑی دور جا کر وہ کہنے لگا "اے حاتم! کوہِ ندا کی یہی سیدھی راہ ہے۔" حاتم ادھر متوجہ ہوا۔ پھر ایک شہر میں پہنچا وہاں کے لوگ اس کو حاکم کے پاس لے گئے۔ اس نے اٹھ کر تعظیم کی اور پوچھا کہ "اے مسافر تو کہاں سے آیا ہے اور اس شہر سکندر آباد میں کیونکر تشریف لایا ہے۔ اب آنکھوں دیکھا حال سچ کہہ۔"

حاتم نے کہا "مجھ کو حسن بانو بر زخ سوداگر کی بیٹی نے بھیجا ہے کہ تو جا کر کوہِ ندا کی ٹھیک ٹھیک خبر لا۔ حق تو یہ ہے کہ میں نے بہت رنج اٹھائے۔ اب امیدوار اس بات کا ہوں کہ اگر تم اس بھید سے واقف ہو تو عند اللہ کہہ دو عین بندہ نوازی ہے اور مسافر پروری۔ کیونکہ میرے نصیب راست سے مبدل ہو جائیں۔"

رئیس شہر نے کہا "کوہِ ندا کا ایسا راز نہیں جو سرسری بیان ہو سکے۔ اگر تو چند روز یہاں رہے گا تو معلوم ہو جائے گا۔" حاتم نے کہا بہت اچھا۔ حاکم نے اس کے رہنے کو مکان عالیشان دیا۔ اکثر آپ بھی شریکِ صحبت رہتا۔ ایک روز حاتم بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں کوہِ ندا کا ذکر آگیا تو بیان کرنے لگے۔ جس کے قلعہ کی ہر ایک دیوار آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور اس سے خود بخود ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔

یہ اسی گفتگو میں تھے کہ ایک آواز پہاڑ کی طرف سے آئی "یا اخی! یا اخی!" اس مجلس میں سے ایک جوان خوش رو دوڑا۔ لوگوں نے اس کے وارثوں سے جا کر کہا "فلاں شخص کی کوہِ ندا سے طلب ہوئی ہے۔" وہ اس بات کے سنتے ہی دوڑے دیکھا کہ اس کا تمام منہ سرخ ہو رہا ہے۔ لوگ اس کے گرد ہیں۔ وہ بے اختیار کوہِ ندا کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ حال دیکھ کر حاتم حیران ہو کر پوچھنے لگا اے یارو اس جوان کو کیا ہوا ہے کہ دوڑا جاتا ہے۔ نہ کچھ کہتا ہے نہ سنتا ہے۔ لوگوں نے کہا اس کو کوہِ ندا سے آواز آئی ہے شتابی آ۔ حاتم نے معلوم کیا کہ کس نے بلایا ہے جو دوڑا جاتا ہے اس بات کو سوچ کر اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ اے بھائی یہ مروت سے بعید ہے جو تو نہیں بتاتا۔ برائے خدا کہہ دے کہ کس کے بلانے پر ہم سب کو چھوڑے جاتا ہے۔ غرضیکہ حاتم نے ہر ممکن کوشش کی اور سر پٹکا اس نے کچھ جواب نہ دیا اور ہاتھ جھٹک کر بھاگا اور پہاڑ کے نیچے جا پہنچا۔ حاتم بھی جا لپکا۔ وہ نظروں سے پہاڑ پر غائب ہو گیا۔ اس نے ہر چند نظر کو دوڑا کر دیکھا پر کچھ پتہ نہ چلا صرف پتھر ہی پتھر نظر آئے۔ بہت حیران ہوا۔ آخر

سب کے ساتھ شہر میں آیا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کو آیا پر کوئی اس کے واسطے نہ رویا بلکہ بہت سا کھانا وغیرہ دیا۔ حاتم نے پوچھا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس پر کیا گذری۔ انہوں نے جواب دیا تو بھی موجود تھا جو تو نے دیکھا۔ یہ سُن کر حاتم چپ ہو رہا اور اس جوان کے واسطے آبدیدہ ہو کر کہنے لگا کہ افسوس دنیا ہیچ ہے۔ انہوں نے کہا اے جوان ہمارے ملک کی یہی رسم ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو نکالا جائے گا۔ حاتم کہنے لگا کہ حسن بانو کو کیا جواب دوں گا۔

غرض چھ مہینے حاتم کو اور گذر گئے اور اس عرصہ میں اسی طرح سے پندرہ آدمی پہاڑ کی طرف گئے۔ اتفاقاً ایک شخص حاتم نامی وہاں بھی تھا۔ حاتم میں اور اس میں نہایت دوستی تھی کہ ناگاہ کوہ ندا کے قلعہ سے آواز آئی "یا اخی! یا اخی!" اس بات کے سُنتے ہی وہ بے چارہ متوجہ ہوا اور اس کے خویش واقارب کو خبر پہنچی کہ حاتم بلایا گیا۔ وہاں سب آ کر جمع ہوئے اور اسے گھیر لیا۔ تب حاتم کہنے لگا کہ یہ بھی اسی طرح جائے گا افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ یہ بھی جُدا ہوتا ہے۔ میں اس کو ہرگز نہ چھوڑوں گا اس کا ساتھ دینا مجھ کو ضروری ہے جو ہونی ہو سو ہو۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں سے کوہ ندا کا مفصل حال معلوم نہ ہوا۔ یہ بات ٹھہرا کر کمر کس باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے پہاڑ کی طرف دوڑا۔ ہر چند کہتا تھا کہ بھائی یہ کیا احوال ہے؟ تجھے کون کھینچے لئے جاتا ہے۔ وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ آخر کار جھنجھلا کر بولا اے بے مروت یہ کیسی دوستی تھی۔ آخر ہم تو ایک مدت آپس میں رہے تیری زبان کیوں بند ہو گئی۔ سچ کہہ تجھے کون لئے جاتا ہے؟ وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا بلکہ حاتم کے ہاتھ سے اپنے آپ کو چھڑانے لگا اور اتنا زور کیا کہ اس کے ہاتھ چھوٹ گئے اور حاتم زمین پر گر پڑا۔ تب وہ چلا اور حاتم اس کے پیچھے چلا گیا اور دونوں آگے پیچھے پہاڑ کے نیچے جا پہنچے۔ حاتم نے اچھل کر زور سے اس کی کمر پکڑی۔ ہر چند اس نے چاہا کہ اس کو جُدا کرے لیکن جُدا نہ ہو سکا۔ اسی طرح دونوں گرتے پڑتے پہاڑ کے اوپر جا پہنچے۔

جونہی قلعہ کے نزدیک گئے ایک کھڑکی دکھائی دی۔ دونوں لپٹے لپٹائے اس کے اندر چلے گئے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہوئے۔ وہ ناچار وہاں سے حاتم کا افسوس کرتے ہوئے شہر میں آئے اور حاکم کو خبر پہنچائی کہ مسافر بھی حاتم کے ساتھ اسی پہاڑ پر چلا گیا۔ اس بات کے سنتے ہی حاکم غصہ میں آ کر کہنے لگا کہ نادان آج تک کوئی بے بلائے اس پہاڑ پر نہیں گیا تم نے اس کو کیوں چھوڑا؟ اور کس واسطے جانے دیا؟ یہ پاپ اس غریب کا تمہاری گردن پر ہے۔ انہوں نے عرض کی خداوند ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہاں نہ جا مگر ہمارا کہنا نہ مانا اور کہا کہ میرا یار جانی ہے میں ہرگز اس کو تنہا نہ چھوڑوں گا۔ بلکہ جو مصیبت اس پر پڑے گی میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔

غرض حاتم اور وہ جوان ایک میدان وسیع میں پہنچے۔ وہاں ایک سبزہ زار نظر آیا کہ نظر کام نہ کرتی تھی گویا فرش زمرّدین چاروں طرف بچھا ہے۔ تھوڑی سی زمین اس میں سے خالی تھی۔ وہ جوان اس پر پاؤں رکھنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی چت گر پڑا۔ حاتم نے چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھائے اتنے میں اس کا منہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہاتھ پاؤں سخت ہو گئے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر حاتم نے اپنے دل میں کہا یہ مر گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ بے اختیار رونے لگا۔ اس عرصہ میں وہ زمین "تڑق" گئی وہ جوان اس میں سما گیا اور وہ جگہ برابر ہو گئی۔

اس ماجرے کو دیکھ کر حاتم نے سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا کہ دنیا فانی ہے سب کو مرنا ہے۔ واقعی اب کوہ ندا کا حال کما حقہٗ معلوم ہو گیا۔ بس اب یہاں سے چلیے۔ یہ دھن باندھ کر روانہ ہوا اور تمام دن پھرا مگر اس کھڑکی اور قلعہ کا کھوج نہ پایا۔ خدا جانے کھڑکی کیا ہوئی اور قلعہ کدھر گیا۔ سات روز تک حیران و سرگرداں بے آب و دانہ رہا۔ غرض جینے سے مایوس ہو کر دل میں کہنے لگا کہ اے حاتم تیری یہاں موت آئی ہے جو تو بے بلائے آیا۔ کیونکہ نہ وہ قلعہ نظر آتا ہے نہ وہ پہاڑ نہ وہ شہر۔ اتنے میں ایک دریا کے پاس جا پہنچا۔

کیا دیکھتا ہے کہ وہ بڑے زور شور سے بہ رہا ہے اور چھور نہیں ملتا۔ یہ نہایت متفکر ہوا اور کہنے لگا کہ الٰہی اب اس سے کیونکر پار ہوں۔ تیرے سوا کون ہے جو بیڑا پار کرے۔ اتنے میں ایک ناؤ نظر آئی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے۔ اس نے جانا کہ کوئی ملاح لیے چلا آتا ہے۔ جب کنارے آ لگی تو

اس کو دیکھا کہ کوئی ملاح نہیں متعجب ہو کر شکر خدا کا بجا لایا۔ سوار ہوا کیا دیکھتا ہے کہ ایک دستر خوان میں کچھ لپٹا ہوا دھرا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی، فوراً ہاتھ بڑھا کر کھولا تو دو روٹیاں اور مچھلی کے کباب گرم تھے۔ چاہا کہ کھائے، ساتھ ہی دھیان آیا کہ شاید ملاح نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ اتنے میں ایک مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا اے حاتم یہ تیرا حق ہے بے اندیشہ کھا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار گئی۔ حاتم نے کھا کر پانی پیا اور شکر کیا۔

وہیں ایک آندھی ایسی چلی کہ تین دن میں کشتی کنارے پر جا لگی۔ حاتم اترا اور متوجہ شہر کا ہوا۔ حاتم نے چاہا کہ اگر شہر ملے تو ان کی حقیقت لوگوں سے بیان کرے۔ حتیٰ کہ سات شبانہ روز چلتے چلتے گذر گئے کہیں سراغ نہ ملا۔ سرگرداں چلا جاتا تھا کہ پہاڑ نظر آیا۔ تین دن کے بعد اس کے نیچے جا پہنچا اور جس پتھر کو اٹھا کر دیکھتا ہے اس کے نیچے لہو بہتا ہوا پایا۔ فکر کرنے لگا کہ کس سے پوچھوں کیا ماجرا ہے۔ ناچار پہاڑ پر چڑھ گیا اور بارہ دن کے بعد اس پر جا پہنچا تو ایک میدان کفِ دست دکھائی دیا کہ وہاں کی خاک اور جانور چرندے اور پرندے بیر بہوٹی کی طرح لال ہو رہے ہیں۔ حاتم بھوک پیاس بھول گیا اور قدم بڑھائے چھ کوس تک چلا ہی گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ لہو کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے اور اس میں جتنے جانور ہیں ایسے سرخ ہو رہے ہیں گویا لہو سے بنے ہیں۔ گھبرایا کہ اس دریا سے کیونکر پار ہوں گا۔ ناچار کنارے کنارے چلا۔ کہیں سے تو اترنے کا قابو ملے گا۔ جب بھوک لگتی تو شکار کر کے کھاتا جب پیاس لگتی تو مہرہ منہ میں رکھ لیتا۔ ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ یکایک اس جگہ پہنچا جہاں دریائے خون کے سوا زمین تھی نہ درخت نہ چرند نہ پرندے تھے۔ دل میں کہنے لگا اے حاتم ایک مہینہ تک تو نے یہ رنج سہے کہ پاؤں چلنے سے رہے پر گھاٹ نظر نہ آیا۔ اگر دس برس تک یونہی پھرے گا دریائے خون کے سوا کچھ نہ دیکھے گا۔ خدا کے کارخانہ میں دم مارنا آسان نہیں ہے اور جن جن چیزوں کو اس نے چھپایا ہے ان کا کھولنا آسان نہیں۔ اگر وہ فضل کرے تو یہاں سے صحیح سلامت منزلِ مقصود پر پہنچا دے ورنہ کچھ تدبیر نہیں ہو سکتی۔

اسی تفکر میں کوئی چیز دریا میں سے نمودار ہوئی حاتم اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اتنے میں وہ نزدیک آئی۔ دیکھا کہ ایک کشتی ہے۔ حاتم بسم اللہ کہہ کے سوار ہوا۔ پھر ویسی ہی روٹیاں اور کباب بدستور پائے۔ بے تامل انہیں کھا گیا اور خدا کا شکر و حمد بجا لایا۔ جب کشتی منجدھار میں پہنچی زور سے ہوا چلنے لگی اور لہریں مانند شعاع کے بلند ہونے لگیں۔ حاتم ڈرا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ آنکھیں بند کر کے ناؤ میں لیٹ رہا۔ قریب تھا کہ بے حواس ہو جائے اور خوف سے ڈوب جائے۔ غرض سات روز تک اس طرح گذرے آٹھویں روز کشتی کنارے پر لگی۔ حاتم اترا اور کشتی الٹی پھر گئی۔ یہ کنارے کنارے چلنے لگا اور افسوس کرتا تھا کہ یہ راز نہ کھلا کہ یہ کشتی کون لایا اور کباب روٹی کون دھر گیا۔ کئی روز تک اٹھتے بیٹھتے چلا گیا کہ دور سے ایک چیز نمودار ہوئی۔ حاتم حیران ہوا کہ یہ کیا چیز ہے۔ آگے بڑھ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک دریا نہایت شفاف لہریں مار رہا ہے اور ایسا چمکتا ہے کہ کسی نے چاندی گلا کر بہا دی ہے۔ حاتم تشنگی سے جاں بلب تھا کنارہ پر آ بیٹھا اور اس میں بایاں ہاتھ ڈالا۔ جس وقت پانی نکالا تو پانی نہ پایا مگر ہاتھ چاندی کا ہو گیا۔ ہر چند اس کو داہنے ہاتھ سے صاف کیا۔ لیکن وہ اسی طرح پر رہ گیا بلکہ بوجھ ہو گیا۔ حاتم نے کہا یہ عجب دریا ہے اگر غوطہ ماروں تو چاندی کا ہو جاؤں پھر چلنا مشکل ہو جائے۔

عالتِ اضطراب میں چاروں طرف دیکھا کہ ناگہاں اسی طرح ایک کشتی آئی۔ یہ بسم اللہ کہہ کر چڑھ گیا۔ پھر ایک طباق گرما گرم حلوے کا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ سے اپنی طرف کھینچ لیا اور خوب کھایا۔ پھر پاؤں پھیلا کر بآرام سو رہا۔ کئی دن کے بعد کشتی کنارے پر جا پہنچی۔ حاتم اتر کے آگے بڑھا۔ ہر وقت اپنا ہاتھ دیکھا کرتا تھا۔ چار دن کے بعد ایک پہاڑ نمودار ہوا۔ اس نے جانا کہ یہ نزدیک ہے حالانکہ وہ ایک مہینہ کی راہ پر تھا۔ غرض شکار کرتا ہوا اور کھاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ جب وہ تین دن کی راہ پر پہنچا تو سنگریزے رنگ برنگ کے اور طرح طرح کے جواہرات نظر پڑے۔ طمع دامن گیر ہوئی تھوڑے سے جواہرات جیب میں ڈال لئے، تھوڑی دور چل کہ اس سے زیادہ بیش بہا دیکھا۔ اس کو پھینک کر اس کو جیب میں ڈال لیا۔ تھوڑی دور جا کر خیال آیا کہ اگر یہ جواہر شہروں میں پہنچے تو ان کی قیمت کوئی نہ دے سکے گا۔ اسی خیال میں چلا گیا۔ آخر ان کے بوجھ سے تھک کر کسی جگہ بیٹھ گیا اور کئی لعل اور زمرد و الماس بیش قیمت جو سب سے بڑے تھے چن لئے باقی وہیں پھینک دئیے اور پھر راہی ہوا ایک چشمہ پر جا پہنچا۔ اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اپنے

ہاتھ پاؤں دھوئے۔ اتنے میں ایک دم بائیں ہاتھ پر جو نظر پڑی اس کو جیسا تھا ویسا ہی پایا مگر ناخن چاندی کے رہے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اُس دریا میں ہاتھ چاندی کا ہو گیا تھا اِس چشمہ میں حالتِ اصلی پر آگیا اس میں کیا بھید ہے۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ اسی جگہ پڑا رہا۔

یکایک دو شخص اس چشمہ پر آنکلے کہ ان کے سر آدمی کے سے تھے اور پاؤں ہاتھی کے اور ناخن شیر کے۔ رنگ نہایت سیاہ۔ حاتم دیکھ کر ڈرا اور اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اگر میں بھاگوں تو شرم دامن گیر ہے اور ٹھہروں تو ٹھہر نہیں سکتا۔ دیکھئے کہ تقدیر میں کیا ہے۔ یکایک حاتم نے تیر و کمان اٹھا کر ایک تیر مارا۔ ایک نے ان میں سے پکڑ لیا۔ چاہتا تھا کہ وہ دوسرا تیر مارے انہوں نے فریاد کی اے حاتم طائی تو اپنی جان کے ڈر سے ہمیں مارتا ہے۔ ہم خدا کے بندے ہیں کچھ تجھے ایذا دینے نہیں آئے۔ حاتم تیر و کمان ڈال کر بیٹھ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ ان کو مجھ سے کیا کام ہے جو ادھر آتے ہیں۔ تیر تو انہوں نے درمیان میں ہی پکڑ لیا۔ اگر دوسرا ماروں گا تو کاہے کو کارگر ہوگا۔ اتنے میں وہ نزدیک آکر کہنے لگے" اے حاتم تجھ کو شرم نہیں آتی جواہر کی طمع کی؟"

وہ بولا، "میں نے کس کا جواہر لیا؟"

انہوں نے کہا، "تو فلانے جنگل سے جواہر لایا ہے۔ اب تک تیرے پاس موجود ہیں۔"

یہ سُن کر حاتم نے جواب دیا کہ "تیرا تو نہیں لایا۔"

وہ بولے کہ "یہ اور خلقت کے واسطے اللہ نے رکھا ہے کہ وہ اپنے کام میں لائیں۔"

حاتم نے کہا۔ "میں خدا کی صنعت دکھانے کو اٹھا لایا ہوں۔"

یہ سُن کر دونوں نے کہا۔ "اگر سلامت جانا چاہتا ہے تو اس جواہر سے ہاتھ اٹھا۔"

یہ سنتے ہی حاتم نے سب پھینک دیا اور کہا۔ "تم لے جاؤ۔ حیف ہے کہ میں اس کو بہت دور سے لایا ہوں۔ تم نے بڑا ظلم کیا کہ اس کو مجھ سے لے لیا۔ میں کوئی چرا کر نہیں لایا۔"

انہوں نے کہا، "یہ کیا چلن ہے کہ بے کہے اس قدر مال اٹھا کر روانہ ہوا اپنے پاس رکھنا۔ یہ کب روا ہے بلکہ محنت کی گنہگاری دینی پڑتی ہے" حاتم یہ سُن کر سر جھکا کر چپکا ہو رہا۔ وہ ایک الماس اور ایک زمرّد اپنی اپنی قسم میں سے جو بیش بہا تھا اس کو دینے لگے اور کہا تجھے یہی بہت ہے۔ اس نے لے لیا اور کہا اے بندگانِ خدا مجھ کو راہ بتا دو جو میں کسی طرح ملک میں پہنچوں۔ وہ بولے" اے جوان غنیمت سمجھ جو تو صحیح و سلامت آیا اور جیتا جاگتا چلا کیونکہ اس حد سے آج تک کوئی جان سلامت نہیں لے گیا۔ اس قدر اندیشہ نہ کر کہ عمر بڑی ہے۔ اس کے آگے ایک جواہر کا دریا ملے گا اس کے بعد دریائے آتش آئے گا اگر اس سے صحیح و سالم اتر گیا تو مقرر اپنے ملک میں پہنچے گا۔ مگر کسی چیز کا لالچ نہ کیجیو اسی میں تیری سلامتی ہے۔ خدانخواستہ اگر کسی چیز پر دل دوڑائے گا تو اپنے کئے کی سزا پائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پانی میں اتر پڑے اور اس کی نظر سے چھپ گئے۔

حاتم اسی مقام پر تمام رات بیٹھا رہا۔ صبح کو تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک دریا دکھائی دیا۔ اس کو دیکھ کر بہت شاد ہوا۔ اس واسطے کہ بہت پیاسا تھا۔ جب اس کے پاس پہنچا اور نگاہ کی تو ہزاروں موتی بیش قیمت پڑے ہیں۔ لیکن ہر ایک انڈے کے برابر تھا۔ ان کی چمک سے آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ اور قیمت کا تو کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ حاتم نے لالچ میں آکر چاہا کہ دس بیس اٹھائے کہ اتنے میں ان دونوں کی نصیحت یاد آئی۔ ڈر گیا اور اس حرکت سے باز رہا۔ اور اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا پانی دودھ اور شہد کی مانند ہے۔ پیاسا تو تھا ہی خوب پیٹ بھر کر پیا۔ غرض اس سے بخوبی اتر گیا اور آگے بڑھا کہ دور سے ایک روشنی نظر آئی گویا سونے کا ایک تختہ ہوا میں چمک رہا ہے۔ اسی طرف چلا۔

ایک مہینے کے بعد جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک پہاڑ آسمان سے لگا ہوا ہے اور جگمگا رہا ہے یہ اس پر چڑھ گیا وہاں ایک درخت سونے کا پھلا پھولا دیکھا۔ متعجب ہوا۔ تین روز تک اسی پہاڑ پر چلتا رہا۔ ایک میدان نظر پڑا اس کی زمین پر ہزاروں درخت سونے کے چمک رہے تھے۔ حاتم

دیکھ کر حیران ہوا اور صانع کی صنعت دیکھنے لگا اور خدا کا شکر کرنے لگا۔ پھر تھوڑا میوہ توڑ کر کھایا۔ پھر آگے چل کر ایک حوض نظر پڑا۔ اس کا پانی مثل بلور کے صاف تھا۔ اس کے کنارے پر بیٹھا اور دل میں فکر کرنے لگا یہ باغ کس کا ہے۔ کس سے پوچھے۔ اتنے میں کئی پریاں پوشاک اور زیور سے آراستہ جلوہ گر ہوئیں اور حاتم کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوئیں۔ اِدھر حاتم ان کو دیکھ کر حیرت میں آیا کہ الٰہی یہ کیا حسن ہے۔ اس وقت ملکہ زرّین پوش یاد آئیں اور دل میں کہا خدا اسے ملائے۔

القصّہ ان سے کہا کہ تم کون ہو اور یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ انہوں نے کہا یہ محل پری نوش لب کا ہے۔ اتنے میں وہ آ پہنچی۔ حاتم اس کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا اور وہ اس کے سرہانے آ کر کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی "ارے کوئی ہے۔ جلد آ کر اس کے منہ پر گلاب چھڑک دو" وہیں ایک نازنین دوڑی گئی اور گلاب پاش لے کر اس کے منہ پر چھڑکنے لگی۔ حاتم ہوش میں آیا۔ پھر پری نوش لب ایک تخت مرصّع پر جا بیٹھی اور اس کو کرسی جواہر نگار پر بٹھا کر پوچھنے لگی "اے جوان سچ کہہ کہاں سے آیا ہے اور کس کام کے ارادہ سے یہاں تک پہنچا ہے اور کدھر جائے گا"۔ حاتم نے اپنا تمام احوال ابتدا سے انتہا تک اس کے سامنے بیان کر کے پوچھا اس مکان کا مالک کون ہے اور اس پہاڑ کا کیا نام ہے۔ پری نوش لب نے کہا کہ "اس پہاڑ کو کوہ زرّیں کہتے ہیں اور اس مکان کا مالک شاہ پال شاہ ہے اور اس کی بیٹی کا آسیا نام ہے۔ میں اس لڑکی کی ایک خواص ہوں چنانچہ ساتواں روز میری باری کا ہے۔ اس روز میں جلوہ گر ہوتی ہوں اور اس مکان کا کوہ قاف سے تعلق ہے۔ اگرچہ دنیا کی حد میں ہے اور یہ جو دور سے دکھائی دیتا ہے اسی قلعہ کا حصّہ ہے"۔ غرض چار روز تک حاتم وہاں رہا اور طعام ہائے خوش گوار سے ملذّذ ہوا۔ پانچویں روز کہا کہ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے تشریف لے جاؤ۔

حاتم اس پری سے رخصت ہو کر پہاڑی پر چلا اور دس روز کے بعد پہاڑی سے اتر کر کسی جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں سونے کا سا ایک دریا دکھائی دیا کہ اس کا پانی گلے ہوئے سونے کی طرح لہریں لے رہا ہے اور اس کی موجیں آسمان سے ٹکر کھا رہی ہیں۔ یہ دریائے فکر میں غرق ہو کر اس کے کنارے پر بیٹھ گیا کہ اس سے کیونکر پار اُترے۔ اتنے میں ایک ناؤ طلائی دور سے نظر آئی اور فوراً کنارے پر پہنچی۔ حاتم شکر کر کے اس پر بیٹھ گیا اور وہیں طباق حلوے سے ملبّب نظر آیا۔ بھوکا تو تھا ہی کمال رغبت سے کھایا۔ چاہتا تھا کہ دریا میں ہاتھ ڈال کر پانی پئے، ڈرا کہ یہاں ہاتھ سونے کا نہ ہو جائے، کھینچ لیا۔ پھر ایک کٹورا بغل سے نکال کر بھرا اور تھوڑا سا حلق میں ٹپکایا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ کٹورا اور چار دانت سونے کے ہو گئے۔ غرض چوتھے دن ایک کنارے پر پہنچا۔ حاتم نے اتر کر دوگانۂ شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھا۔ سات روز تک چلا گیا وہ عجائبات دیکھے کہ جو نہ سُنے تھے۔

آٹھویں روز پتھروں کے میدان میں پہنچا اور ہر ایک پتھر ایسا گرم تھا گویا آگ سے ابھی نکلا ہے۔ مشکل سے چند قدم چلا۔ طاقت نہ رہی بیٹھ گیا۔ گرمی کے سبب سے لب خشک ہو کر بدن جل اٹھا۔ بیقرار ہو کر مہرہ منہ میں رکھ لیا مگر کچھ فائدہ نہ دیکھا۔ نکال کر پھینک دیا۔ مثل ماہیٔ بے آب بیتاب ہو کر بیہوش ہو گیا۔ زبان باہر نکل پڑی۔ قریب مرگ پہنچا اتنے میں وہ دونوں شخص نظر آئے بولا اے یارو! آفریں ہے کہ وقت پر پہنچے اور بڑی مدد کی کہو اب کس طرح جاؤں، یہ گرمی کس وجہ سے ہے؟ انہوں نے کہا اس سے آگے دریائے آتش ہے یہ گرمی اس کے سبب سے ہے اور راستہ یہی ہے۔ چلا جا۔ خدا کی قدرت سے اپنے ملک کو پہنچ جائے گا۔ راہ بتانا ہمارا کام ہے وہاں یہ ممکن ہے کہ تمہاری آگ ہلکی ہو جائے گی۔ اس نے کہا جو ہو سکے وہ بہتر ہے۔ احسان سے خالی نہیں۔ تب انہوں نے ایک مہرہ نکال کر حاتم کو دیا اور کہا آگے دریائے آتشیں ہے۔ اگر اس کو منہ میں رکھے گا تو آگ تجھ پر کارگر نہ ہو گی۔ آرام سے چلا جائے گا۔ پر یہ یاد رہے کہ دریا کے پار ہوتے ہی یہ مہرہ پھینک دینا۔ یہ کہہ کر حاتم کی نظر سے غائب ہو گئے۔ وہ رات کی رات وہیں رہا۔ صبح کو اپنے منہ میں مہرہ رکھ کر آگے چلا۔ تین دن کے بعد سامنے سے آگ کے شعلے دکھائی دینے لگے۔ یہ ڈرا اور عظمۃ اللہ کہہ کر آگے بڑھا۔ جب کنارے پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ شعلے کی لہریں آسمان تک جاتی ہیں۔ اتنے میں ایک کشتی بھی کنارے پر آ گئی وہ دل میں خدا کی حمد کرنے لگا۔ اور کہا کہ دیدہ دانستہ آپ کو آگ میں ڈالنا ہے پر کیا کروں راہ یہی ہے۔ خدا آسان کرے گا۔ جو اس کی رضا ہے اس پر راضی رہنا چاہیئے۔ تن بتقدیر کشتی پر جا بیٹھا اور منہ میں مہرہ رکھ لیا۔ اتنے میں ایک طباق کباب سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کو بے اختیار کھینچا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ غرض ناؤ چلی جاتی تھی

یہ ڈر کے مارے کبھی آنکھیں نہ کھولتا جو کبھی آنکھیں کھل جاتی تھیں تو جان نکلنے لگتی تھی۔ وہیں آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

قصہ کوتاہ ناؤ منجھدھار میں پہنچی اور چکر کھانے لگی۔ حاتم کو یقین ہوا کہ اب ڈوبتی ہے۔ خدا کی یاد میں مشغول ہوا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کہ سر بہ زانو ہو گیا کہ اب نہیں بچتا۔ بارے فضلِ الٰہی سے تین دن کے بعد کشتی کنارے پر جا لگی۔ اتر پڑا۔ آنکھیں جو کھول کر دیکھتا ہے تو نہ وہ دریا ہے نہ وہ کشتی ہے، ایک سہانا جنگل نظر آتا ہے۔ مہرہ منہ سے نکال لیا اور آگے چلا۔ تھوڑی راہ طے کی تھی کہ سوادِ یمن سے کسی گاؤں کی طرف جا نکلا اور کھیت پر کھڑا ہو کر کسان سے کہنے لگا کہ نواح کس شہر کا ہے؟ اس نے کچھ جواب نہ دیا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے تکنے لگا۔

حاتم بولا کہ اے عزیز تو بہرا ہے کہ نہیں سنتا؟ اس نے عرض کی کہ تیری صورت میں اپنے بادشاہ کی سی جانتا ہوں۔ حاتم یہ سن کر کہنے لگا کہ تو کون ہے اور کہاں جاتا ہے۔ وہ بولا اے جوان یہ ملک یمن ہے اور حاتم شہزادہ ہے کہ اس کا باپ طے نام یہاں کا بادشاہ ہے لیکن شہزادہ کو سات برس ہوئے کہ اس ملک سے نکل گیا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی خبر ملکہ زرّیں پوش سے پہنچی تھی۔ اس سے ہر شخص کو تسکین ہوئی تھی۔ اب تو اس کے ماں باپ اور اقربا کا برا حال ہے کہ ہر ایک پر اپنی زندگی وبال ہے خصوصاً ملکہ زریں پوش کی تو جان پر آبنی ہے۔ دیکھئے اس کی ملاقات ہونے تک بیتے یا نہ جیے حاتم نے کہا چند روز ہوئے تمہارا شہزادہ مجھے راہ میں ملا تھا۔ وہ خیر و عافیت سے ہے۔ تو یمن میں جا کر سب کی خدمت میں دعا و سلام پہنچانا اور کہنا کہ حاتم شاہ آباد کی طرف گیا تھا۔ پھر کہا اے دہقان میں بہت سا پیاسا ہوں تھوڑا سا پانی پلا دے۔ وہ جلدی سے ایک پیالہ دودھ کا اور ایک چھاچھ کا لے آیا۔ حاتم نے نہایت مزے سے پیا اور کہا کہ ہزار شکر ہے کہ مدت کے بعد میں نے اپنے ملک کو دیکھا اور یہ نعمت کھائی۔

پھر اٹھ کر روانہ ہوا اور شاہ آباد کو چلا۔ تھوڑے دنوں میں وہاں جا پہنچا اور حسن بانو کو اپنے آنے کی خبر دی۔ اس نے پردہ کے اندر بلا لیا اور ایک سونے کی کرسی پر بٹھایا۔ کہا اے جوان صد آفریں ہے جو تو آیا۔ بارے کوہِ ندا کی خبر کہو اور وہاں کے بھید سے مجھے آگاہ کرو۔ حاتم نے سرے سے قصہ شروع کیا اور آخر تک کہہ سنایا۔ حسن بانو نے کہا سچ کہتا ہے کچھ نشان دکھلا۔ حاتم نے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن دکھلائے اور کہا ایک روز کسی چشمہ آبِ زلال پر پہنچا اور اس کو دھویا یہ اصلی صورت پر آگیا اور دوسری نشانی یہ ہے کہ چار دانت دریائے زرّیں کے پانی سے سونے کے ہو گئے ہیں۔ اور وہ تینوں رقمیں جواہر کی بھی دکھا دیں۔ تب حسن بانو نے بہت سی آؤ بھگت کی اور کھانا پر تکلف منگا کر کہا کہ کھاؤ۔ حاتم نے کہا اس کو میرے ساتھ کر دو میں کاروان سرا میں جا کر منیر شامی کے ساتھ کھاؤں گا۔ وہاں سے اٹھ کر کاروان سرا میں آیا اور منیر شامی کے ہمراہ کھانا کھایا اور اپنی سرگذشت مفصل سنائی۔

میر امن

باغ و بہار

(سنہ ۱۸۰۳ء)

سیر پہلے درویش کی

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیوپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کے گھر میں موجود تھے۔ ان کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے، ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے اور دوسرے ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی ایک شہر کے سوداگر بچے سے بیاہ دیا تھا، وہ اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ غرض اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ و پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چوہے سے ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا، سپاہ گری کا کسب و فن سوداگری کا بہی کھاتا روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گزری کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ یک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بڑا بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کے گزرے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے پس صبر کرو اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار رہو۔ تسلی دے کر وہ رخصت ہوئے، گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے کوٹھے نقد و جنس کے اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجئے۔

ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی طیاری کو حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلمنیں تکلف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمتگار دیدار و نوکر رکھے سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے پھانکڑے مفت بر کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے ان سے آٹھ پہر صحبت ہونے لگی۔ ہر طرح کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی ادھر ادھر کی کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کیتکی شراب یا گل گلاب کھنچوائیے، نازنین معشوقوں کو بلوا کر ان کے ساتھ پیجئے اور عیش کیجئے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہردم کے کہنے سُننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا پھر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ پڑا الگ کیا گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے کہاں سے آتا ہے اور کدھر جاتا ہے۔ مالِ مفت، دلِ بے رحم اس دم خرچی کے آگے اگر گنجِ قارون ہوتا تو بھی وفا نہ کرتا۔ کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی۔ دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے کافور ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمتگار بھیلے جلیٹ خاص بردار رتابتجانے سب چھوڑ کر کنارے لگے کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا سوائے غم و افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔ ناچار بے حیائی کا برقع منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے لیکن یہ شرم دل میں آتی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے ان کا جواب بھی اس خوابِ خرگوش میں نہ بھیجا اس شرمندگی سے جی تو نہ چاہتا تھا پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا جوں توں پاپیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے کئی منزل کاٹ کر ہمشیر کے شہر میں جا کر اس کے مکان پر پہنچا۔

وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل، کالے ماش، ٹکے مجھ پر سے صدقے کیے، کہنے لگی "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟"

اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وے کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوزیات حلوا سوہن پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی درگاہ میں ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گذرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی "اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں، تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے گھر میں بیٹھا رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر سیتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں خصوص اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ قصد سفر کا کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔"

یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا "اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو جو کہو سو کروں۔"

میری مرضی پا کر گھر میں جا کر پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں لوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو، ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے دستاویز پکی لکھواؤ اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو اپنا مال مع منافع سمجھ بوجھ لیجیو یا آپ بیچیو۔"

میں وہ نقدی لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری خرید کر کے ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر

سوار ہو کر روانہ ہوا اور فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی طیاری کی۔

جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سراپا بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنی سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوادی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا، دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی "سدھارو تمہیں خدا کو سونپا پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔"

میں نے فاتحہ خیر پڑھ کر کہا "تمہارا بھی اللہ حافظ ہے میں نے قبول کیا۔"

وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسا کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا غرض جب شہر کے دروازے پر گیا بہت رات جا چکی تھی، دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کیا تھا میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑ کھول دو تو شہر میں جا کر دانے گھانس کا آرام پاؤں۔ وہ اندر سے گڑک کر بولے "اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟" جب میں نے جواب صاف ان سے سنا شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اتر زین پوش بچھا کر بیٹھا۔ جاگنے کی خاطر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

جس وقت آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی سنسان ہو گیا دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے۔ شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا کہ کاٹھ کا صندوق ہے، لالچ سے اسے کھولا۔ ایک معشوق خوبصورت کامنی سی عورت جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے، گھائل لہو میں تربتر آنکھیں بند کئے کلبلاتی ہے آہستہ آہستہ ہونٹھ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے "اے کم بخت بے وفا اے ظالم پُر جفا بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا، بھلا ایک زخم اور بھی لگا میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا" یہ کہہ کر اسی بیہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سن ہو گیا۔ جی میں آیا کسی ظالم بے حیا نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا۔ کیا اس کے دل میں آیا اور ہاتھ اس پر کیوں چلایا۔ اس کے دل میں تو اب تلک محبت باقی ہے جو اس جان کندنی کی حالت میں اس کو یاد کرتی ہے۔ آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا کہ آواز اس کے کان میں گئی۔ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا کر مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں مجھے غش آنے لگا اور جی سنسانے لگا۔ بزور اپنے تئیں تھانبا۔ جرأت کر کے پوچھا "سچ کہو تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔" یہ سن کر اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی لیکن آہستہ سے کہا "شکر ہے میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے کیا خاک بولوں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ جب میری جان نکل جائے تو خدا کے واسطے جوانمردی کر کے مجھ بدبخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجیو تو میں بھلے بُرے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخلِ ثواب ہو" اتنا بول کر وہ چپ ہو گئی۔ رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس کا ہو سکے بمقدور اپنے کروں وہ تھوڑی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔

بارے خدا خدا کر کے صبح جب نزدیک ہوئی مرغ بولا آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجی میں کسا۔ جوں ہی دروازہ شہر کا کھلا میں شہر میں داخل ہوا ہر ایک آدمی دوکاندار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک مکان خوش قطع نیا فراغت کا بھاڑے لے کر جا اُترا۔ پہلے اس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پھاہوں پر ملائم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جرّاح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جرّاح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ایک شخص نے کہا "ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکتا ہے اور اس کام میں نپٹ پکا ہے اگر مُردے کو اس پاس لے جاؤ خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے

وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔"

میں یہ مژدہ سُن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتہ سے اس کے دروازے پر پہنچا۔ ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لئے کچھ پیس پاس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا "میں تمہارا نام اور خوبیاں سُن کر آیا ہوں۔ ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لئے چلا قبیلہ کو بسبب محبت کے ساتھ لیا جب نزدیک اس شہر کے آیا تھوڑی سی دور رہا تھا جو شام ہو گئی اَن دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا۔ میدان میں ایک درخت کے تلے اُتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکہ آیا جو کچھ مال و اسباب پایا لُوٹ لیا۔ گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی جوں توں کر کاٹی فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے پر لیا ان کو وہاں رکھ کر میں تمہارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمہیں یہ کمال دیا ہے اس مسافر پر مہربانی کر غریب خانہ پر تشریف لے چلو اس کو دیکھو اگر اس کی زندگی ہوئی تو تمہیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔"

عیسیٰ جراح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا۔ میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر میرے ساتھ اس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلّی کی بولا کہ خدا کے کرم سے اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے۔ غسل شفا کا کرا دوں گا۔ غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے انہیں سیا اور باقی گھاؤں پر اپنے کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں بتی رکھی اور کتنوں پر پھائے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا "میں دونوں وقت آیا کروں گا تو خبردار رہیو ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا بجائے غذا اس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجو جو قوت رہے" یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا "تمہارے تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ نہ سوجھتا نہ تھا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے" عطر و پان دے کر رخصت کیا۔

میں رات دن خدمت میں اس پری کی حاضر رہتا آرام اپنے اوپر حرام کیا خدا کی درگاہ میں روز رو رو اس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔ اتفاقاً سوداگر آپہنچا اور میرا مال امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اونے پونے بیچ ڈالا اور دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جراح ہمیشہ آتا جاتا تھوڑے عرصے میں سب زخم بھر کر انگور کر لائے۔ بعد کئی دن کے غسل شفا کا کیا عجب طرح کی خوشی حاصل ہوئی۔ خلعت اور اشرفیاں عیسیٰ حجام کے آگے دھریں اور اس پری کو مکلف فرش بچھا کر مسند پر بٹھایا۔ فقیر غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی اس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس فقیر کے ہاتھ لگی۔ اور اس پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کے مانند چمکنے لگا اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی کہ اس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بسر و چشم اس کے حکم کا منتظر رہتا۔ جو فرماتی سو بجا لاتا وہ اپنے حُسن کے غرور سے سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھی دیکھتی تو فرماتی "خبردار اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دخل نہ ماریو۔ جو ہم کہیں سو بلا عذر کئے بجا لائیو اپنا کسی بات میں دخل نہ کر یوں نہیں تو پچھتاوے گا۔"

اس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گذاری اور فرمانبرداری کا اسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا اس کا فرمانا بسر و چشم بجا لاتا ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی جو اس نے فرمائش کی وہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اس فقیر کے پاس جو کچھ نقد و جنس اصل نفع کا تھا سب صرف ہوا۔ اس بیگانے ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے آخر تکلیف روز مرے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے دل بہت گھبرایا فکر سے دُبلا ہوتا گیا۔ چہرے کا رنگ کلچھواں ہو گیا لیکن کس سے کہوں جو کچھ دل پر گذرتی سو گذرتی قہر درویش بجان درویش۔ ایک دن اس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا "اے فلانے تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔"

میں نے تب معلوم کیا کہ یہ کسی ملک کی بادشاہزادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے۔ فی الفور آگے قلمدان رکھ دیا۔ اس نازنین نے ایک شقہ

دستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا "قلعے کے پاس ترپولیا ہے وہاں اس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے اس کے مالک کا نام شیدی بہار ہے تو جا کر اس رقعہ کو اس تلک پہنچا دے۔" فقیر موافق اس کے فرمانے کے اسی نام و نشان پر منزل مقصود تک جا پہنچا دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی وہیں سنتے ہی ایک حبشی جوان خوبصورت ایک پھیٹا طرحدار سجے ہوئے باہر نکل آیا اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا نمک بھرا ہوا میرے ہاتھ سے خط لے لیا نہ بولا نہ کچھ پوچھا انہیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سر بمہر زربفت کے تورہ پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پہ دھرے باہر آیا۔ کہا اس جوان کے ساتھ جا کر جو گوشے پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر کر رخصت ہوا۔ اپنے مکان میں لایا آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا وہ کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گذرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا "یہ گیارہ بدری اشرفیوں کی لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے۔"

فقیر اس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی دل میں خلش رہی یا الٰہی یہ کیا صورت ہے۔ بغیر پوچھے گچھے اتنا مال ناآشنا صورت اجنبی نے ایک پرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا اگر اس پری سے یہ بھید پوچھوں تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا مارے ڈر کے دم نہ مار سکتا تھا۔ بعد آٹھ دن کے وہ معشوقہ مجھ سے مخاطب ہوئی کہ "حق تعالٰے نے آدمی کو انسانیت کا جامہ عنایت کیا ہے کہ نہ پھٹے نہ میلا ہو اگرچہ پرانے کپڑے سے اس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں پاتا۔ دو توڑے اشرفی کے ساتھ لے کر چوک کے چوراہے پر یوسف سوداگر کی دکان میں جا اور کچھ رقم جواہر کی بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔"

فقیر وہیں سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا دیکھا تو ایک جوان شکیل زعفرانی جوڑا پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لئے دکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر سلام علیک کر کے بیٹھا اور جو چیز مطلب تھی طلب کی۔ میری بات چیت اس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی اس جوان نے گرمجوشی سے کہا: "جو صاحب کو چاہیئے سب موجود ہے لیکن یہ فرمایئے کس ملک سے آنا ہوا اور اس اجنبی شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے اگر اس حقیقت سے مطلع کیجئے تو مہربانی سے بعید نہیں۔"

میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک اور قیمت اس کی دے کر رخصت چاہی۔ اس جوان نے روکھے پھیکے ہو کر کہا "اے صاحب اگر تم کو ایسی ہی ناآشنائی کرنی تھی تو پہلے دوستی اتنی گرمی سے کرنی کیا ضرور تھی۔ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا بڑا پاس ہوتا ہے" یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی کہ بے اختیار دل کو بھائی۔ بے مروت ہو کر وہاں سے اٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا اس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا "تمہارا فرمانا سر آنکھوں پر میں حاضر ہوں" اتنے کہنے سے وہ بہت خوش ہوا۔ ہنس کر کہنے لگا "آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجئے تو تمہاری بدولت مجلس خوشی کی سجا کر دو چار گھڑی دل بہلاویں اور کچھ کھانے پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔"

فقیر نے اس پری کو کبھی اکیلا نہ چھوڑا تھا اس کی تنہائی یاد کر کے چند در چند عذر کئے پر اس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ ان چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت دی میں دکان سے اٹھ کر جواہر اور خلعتیں اس پری کی خدمت میں لایا۔ اس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ میں نے احوال مول تول کا اور مہمانی کے لئے بضد ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی "آدمی کو اپنا قول و قرار پورا کرنا واجب ہے۔ ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدہ کو وفا کر ضیافت قبول کرنی سنت رسول اللہ کی ہے۔"

تب میں نے کہا "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں اور حکم یوں ہوتا ہے، ناچار جاتا ہوں جب تلک آؤں گا دل یہیں لگا رہے گا" یہ کہہ کر پھر اس جوہری کی دکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پہ بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا "آؤ مہربان بڑی راہ دکھلائی" وہیں اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے۔ میوے طرح بطرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہے تھے۔ رنگ برنگ کے جانور ان پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے اور ہر مکان عالیشان میں فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں لب نہر ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اٹھ کر چلا گیا۔ پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا۔ میں نے دیکھ کر کہا "سبحان اللہ چشم بد دور" سن کر مسکرایا اور بولا

"مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔" اس کی خاطر میں نے بھی دوسرے کپڑے پہنے۔

اس جوان نے بڑی ٹیپ ٹاپ سے طیاری ضیافت کی کی اور سامان خوشی کا جیسا چاہیے تھا موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ساقی صراحی و پیالہ بلور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی لا کر رکھی۔ نمکدان چُن دیئے دور شراب کا شروع ہوا جب دو چار جام کی نوبت پہنچی چار لڑکے امرد صاحب جمال زلفیں کھولے ہوئے مجلس میں گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا ایسا سماں بندھا کہ اگر تان سین اس گھڑی ہوتا تو اپنی تان بھول جاتا اور بیجو باورا سن کر باؤلا ہو جاتا اس مزے میں یکبارگی وہ جوان آنکھوں میں آنسو بھر لایا دو چار قطرے بے اختیار نکل پڑے اور فقیر سے بولا "اب ہمارے تمہارے دوستی جانی ہوئی پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسی مذہب میں درست نہیں۔ ایک بات بے تکلف آشنائی کے بھروسے پر کہتا ہوں اگر حکم ہو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اس کی جُدائی سے جی نہیں لگتا۔" یہ بات ایسے اشتیاق سے کہی کہ بغیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا۔ میں نے کہا "مجھے تمہاری خوشی درکار ہے اس سے کیا بہتر ہے۔ دیر نہ کیجئے، سچ ہے معشوق بن کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

اس جوان نے چلون کی طرف اشارت کی وہیں ایک عورت کالی کلوٹی بھتنی سی جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جائے جوان کے پاس آ بیٹھی فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا۔ لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔ اسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی چوتھی شب کو غلبہ نشہ اور نیند کا ہوا میں خواب غفلت میں بے اختیار سو گیا جب صبح ہوئی اس جوان نے جگایا کئی پیالے خمار شکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔ دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھے، میں نے رخصت مانگی خوشی بخوشی اجازت دی۔"

تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لئے اپنے گھر کی راہ لی اور اس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا مگر ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا کہ اسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں اور رہا ہوں۔ اس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا اور رقعہ ضیافت کا اور اس کے نہ رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی تبسم کر کے بولی "کیا مضائقہ اگر دوست کی خاطر رہنا ہوا ہم نے معاف کیا تیری کیا تقصیر ہے جب آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھا پی کر چپکے ہو رہو گے یا اس کا بدلا بھی اتارو گے۔ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آؤ اور اس سے دو چند ضیافت کرو اور اس بات کا کچھ اندیشہ نہیں۔ خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جائے گا اور بخوبی مجلس ضیافت کی رونق پائے گی۔"

فقیر موافق حکم کے جوہری کے پاس گیا اور کہا "تمہارا فرمانا میں تو سر آنکھوں سے بجا لایا اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو۔" اس نے کہا "جان و دل سے حاضر ہوں۔" تب میں نے کہا "اگر اس بندے کے گھر تشریف لے چلو عین غریب نوازی ہے۔"

اس جوان نے بہت عذر و حیلے کئے پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تک وہ راضی نہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا، اور اب میں اسے لئے جاتا ہوں دیکھئے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، بساول اور عصا بردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا دیکھا تو تمام حویلی میں فرش تکلف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں، پاندان، گلاب پاش، عطردان، پیکدان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھری ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں، گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ دہرے کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمعدانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد ہیں اور باورچی خانے میں دیگیں کھنکھنا رہی ہیں۔ آبدار خانے کی ویسی ہی

طیاری ہے کوری کوری بٹلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھی اور بجروں سے ڈھکی رکھی ہیں آگے چوکی پر ڈونگے کٹورے مع تھالی سرپوش دھرے برف کے آبخورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔ غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے اور کنچنیاں بھانڈ بھگیتے کلاونت قوال اچھی پوشاک پہنے ساز کے سُر ملائے حاضر ہیں۔ فقیر نے اس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یاالٰہی اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیونکر ہوئی۔ ہر طرف دیکھتا پھرا لیکن اس پری کا نشان نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا دیکھتا ہوں کہ وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کُرتی پاؤں میں نہ پوشی سر پر رومالی سفید اوڑھے ہوئے سادی خونادی بن گہنے پاتے بنی ہوئی ؎

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی ۔۔۔ کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبرگیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک بوباس درست رہے اس محنت سے وہ گلاب سا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا ہے۔ میں پاس جا کر تصدق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ وہ یہ خوشامد سُن کر تیوری چڑھا کر بولی یہ آدمی سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو اتنا حیران ہو رہا ہے۔ بس بہت باتیں بنانی مجھے خوش نہیں آتیں بھلا کہہ تو یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھلا کر ادھر اُدھر پڑے پھرتے ہو۔ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا جلد جا مجلس میں بیٹھ کر مہمان کی خاطرداری کر اور اس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اپنے پاس بٹھلا۔"

فقیر وہیں اس جوان کے پاس گیا اور گرمجوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام صاحبِ جمال صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لئے روبرو آ کے شراب پلانے لگے۔ اس وقت میں نے اس جوان سے کہا "میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں بہتر یہ ہے کہ وہ صاحبِ جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے تشریف لائے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بلانے کی خاطر جائے۔"

یہ سنتے ہی وہ خوش ہو کر بولا "بہت اچھا اس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔"

میں نے ایک خوجے کو بھیجا جب آدھی رات گئی وہ چڑیل خاصے چنڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔ فقیر نے ناچار خاطر سے مہمان کا استقبال کر کے نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لا بٹھایا۔ جوان اسے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی وہ بھتنی بھی اس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ مچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے جتنے مجلس میں آدمی تھے اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں داب نے لگے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی۔ جس کی نگاہ تھی اسی طرف تھی تماشا مجلس کا بھول کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔

ایک شخص کنارے سے بولا "یارو عشق اور عقل میں ضد ہے جو کچھ عقل میں نہ آئے یہ کافر عشق کر دکھائے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھئے۔"

سبھوں نے کہا "آمنّا یہی بات ہے۔"

یہ فقیر بموجب حکم کے مہمانداری میں حاضر تھا ہر چند جوان ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو مجوز ہوتا تھا پر میں ہرگز اس پری کے خوف کے مارے اپنا دل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرف رجوع نہ کرتا تھا اور عذر مہمانداری کا کر کے اس میں شامل نہ ہوتا اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گذرے چوتھی رات وہ جوان نہایت جوش سے مجھے بُلا کر کہنے لگا کہ اب ہم بھی رخصت ہوں گے تمہاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن سے تمہاری خدمت میں حاضر ہیں تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ اگر اس وقت کہنا اس کا نہیں مانتا تو آزردہ ہوگا پس شرطِ دوستی اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے۔"

تب یہ کہا "صاحب کا حکم بجا لانا منظور ہے کہ الامر فوق الادب۔"

سنتے ہی اس جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کہ تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔ جب صبح ہوئی آفتاب دو نیزے بلند ہوا تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں نے نہ وہ طیاری ہے نہ وہ مجلس نہ وہ پری فقط حویلی خالی

پڑی ہے مگر ایک کونے میں کمبل لپٹا ہوا دھرا ہے اس کو جو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہو گیا حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا۔ اتنے میں ایک خواجہ سرا جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا نظر پڑا، فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی، احوال اس واردات کا پوچھا۔

اس نے جواب دیا "تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل جو تو پوچھتا ہے؟"

میں نے بھی اپنے دل میں غور کیا سچ تو کہتا ہے، پھر ایک ذرا تامل کر کے میں بولا "خیر نہ کہو بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟"

تب اس نے کہا: "البتہ جو میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا لیکن تجھ سا آدمی عقلمند بے مرضی حضور کے دو دن کی دوستی پہ بے محابا بے تکلف ہو کر صحبت مے نوشی کی باہم کرے یہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟"

فقیر اپنی حرکت اور اس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا سوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا کہ "فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی معاف کیجئے۔"

بارے محلی نے مہربان ہو کر اس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ ان دونوں زخمیوں کے گاڑنے داہنے کی فکر میں رہا۔ میں تہمت سے اس فساد کی الگ ہوا اور اشتیاق میں اس پری کے ملنے کے لئے گھبراتا ہوا گرتا پڑتا ڈھونڈھتا شام کے وقت اس کوچے میں اسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ایک گوشے میں ساری رات تلپھتے کٹی۔ کسی کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پرساں میرا نہ ہوا۔ اسی بےکسی کی حالت میں صبح ہو گئی جب سورج نکلا اس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہ رو میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گذرا دل ہی جانتا ہے شکر خدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آ کر کہا "اسی مسجد میں تو جا کر بیٹھ شاید تیرا مطلب اس جگہ بر آئے اور اپنے دل کی مراد پائے۔"

فقیر اس کے فرمانے سے وہاں سے اٹھ کر اسی مسجد میں جا کر جا رہا لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے میں نے بھی وہ روز ویسے ہی بیقراری میں کاٹا بارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا ایک بارگی وہی خواجہ سرا آیا اس شفیق نے کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا نہایت تسلی دی۔ ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا یہاں رہو جب تک تمہاری آرزو بر نہ آئے اور آپ رخصت ہو کر شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گلبدن کا خیال آتا جب چاند پر نظر پڑتی تب اس ماہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اس کے دل کو مہربان کیا ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے جیسے چودھویں رات کا چاند بناؤ کئے گلے میں پیشواز بادلے کی سنجاب کی موتیوں کا دردامن ٹکا اور سر پر اوڑھنی جس میں آنچل پٹو لہر گوکھرو لگا ہوا سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی روش پر آ کر کھڑی ہوئی اس کے آنے سے تر و تازگی نئے سرے سے اس باغ کو اور اس فقیر کے دل کو ہو گئی ایک دم ادھر ادھر سیر کر کے شہ نشین میں مغرق مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی میں دوڑ کر پروانے کی طرح جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے تصدق ہوا اور غلام کے مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اتنے میں وہ خواجہ سرا میری خاطر بطور سفارش کے عرض کرنے لگا میں نے اس محلی سے کہا "بندہ گنہگار تقصیروار ہے جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے سو ہو۔"

وہ پری ازبسکہ ناخوش تھی بد دماغی سے بولی کہ اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے، اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سدھارے۔ میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ کا ہو گیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خدا کے اس وقت کسی کی توقع نہ رہی مایوس محض ہو کر اتنا بولا "بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمائیے اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا کیا یک بارگی حق خدمت گذاری اور جاں نثاری کا عالم سے اٹھ گیا جو

مجھ کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں معشوقوں کی بے وفائی سے بیچارے عاشقِ نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔"

یہ سن کر تنکیھی ہو تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی "چہ خوش آپ ہمارے عاشق ہیں مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بے وقوف اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں نہ بنا یہ خیالِ خام ہے چھوٹا منہ بڑی بات بس چپ رہ یہ نکمی بات چیت مت کر اگر کسی اور نے یہ حرکتِ بے معنی کی ہوتی پروردگار کسوں اس کی بوٹیاں کٹوا کے چیلوں کو بانٹتی پر کیا کروں تیری خدمت یاد آتی ہے اب اسی میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانہ پانی ہماری سرکار میں یہیں تلک تھا۔"

پھر میں نے روتے بسورتے کہا "اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو ناچار ہوں۔"

اس بات سے بھی دق ہو کر کہنے لگی "میرے تئیں یہ بسا ہندے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو اس سے جا کر کہو۔" پھر اسی خفگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی میں نے بہتیرا سر پٹکا متوجہ نہ ہوئی۔ ناچار میں بھی اس مکان سے مایوس اور ناامید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی جب شہر کی کوچہ گردی سے اکتاتا جنگل میں نکل جاتا جب وہاں سے گھبراتا پھر شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا نہ دن کو کھاتا نہ رات کو سوتا جیسے دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے آدمی اناج کا کیڑا ہے طاقت بدن میں مطلق نہ رہی اپاہج ہو کر اسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا میرے پاس سے ہو کر چلا میں یہ شعر ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا ؎

اس دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو ۔۔۔ قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں صورت میری بالکل تبدیل ہو گئی تھی چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جس نے مجھے پہلے دیکھا تھا وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے لیکن وہ محلی آوازِ درد کی سن کر متوجہ ہوا میرے تئیں بغور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔

میں نے کہا "اب تو جو ہوا سو ہوا مال سے بھی حاضر تھا جان بھی تصدق کی اس کی خوشی یوں ہوئی تو کیا کروں۔"

یہ سن کر ایک خدمتگار میرے پاس چھوڑ کر مسجد میں گیا نماز اور خطبے سے فراغت کر کے جب باہر نکلا فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ خدمت میں اس پری بے پروا کے لے جا کر چق کے باہر بٹھایا اگرچہ میری رونہت کچھ باقی نہ رہی تھی پر مدت تک شب و روز اس پری کے پاس اتفاق رہنے کا ہوا تھا جان بوجھ کر بیگانی ہو کر خوجے سے پوچھنے لگی "یہ کون ہے؟"

اس مرد آدمی نے کہا "یہ وہی کم بخت بدنصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے پر وہ دونی بھڑکتی ہے کچھ فائدہ نہیں ہوتا علاوہ اپنی تقصیر خجالت سے موا جاتا ہے۔"

پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا "کیوں جھوٹ بکتا ہے بہت دن ہوئے اس کی خبر وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے واللہ اعلم یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے۔"

اس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

فرمایا کہ "تیری جان تجھے بخشی۔"

خواجہ بولا "آپ کی ذات قدردان ہے واسطے خدا کے چلون درمیان سے اٹھا پہچان لیجئے اور اس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجئے ناحق شناسی خوب نہیں۔ اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کھائیے بجا ہے اور رجائے ثواب ہے آگے حدِ ادب ہے جو مزاج مبارک میں آوے سو ہی بہتر ہے۔"

اتنے کہنے پر مسکرا کر فرمایا "بھلا کوئی ہو اسے دار الشفا میں رکھو جب بھلا چنگا ہو گا تب اس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔"

خوجے نے کہا "اگر اپنے دستِ خاص سے گلاب اس پر چھڑکئے اور زبان سے کچھ فرمائیے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسہ بندھے ناامیدی بری چیز ہے دنیا بہ امید قائم ہے۔"

اس پر بھی اس پری نے کچھ نہ کہا یہ سوال وجواب سُن کر میں بھی اپنے جی سے اکتا رہا تھا ندھڑک بول اٹھا کہ "اب اس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا پاؤں تو گور میں لٹکا چکا ہوں ایک روز مرنا ہے اور علاج میرا شاہزادی کے ہاتھ میں ہے کریں یا نہ کریں وہ جانیں۔"

بارے پھر مقلب القلوب نے اس سنگدل کے دل کو نرم کیا مہربان ہو کر فرمایا "جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔"

وہیں طبیب آ کر جمع ہوئے۔ نبض وقارورہ دیکھ کر بہت غور کیا آخر تشخیص میں ٹھہرا کہ یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے سوائے وصل معشوق کے اس کا کچھ علاج نہیں جس وقت وہ ملے یہ صحت پاوے جب حکیموں کی زبانی بھی یہی مرض ٹھہرا حکم کیا۔ اس جوان کو حمام میں لے جاؤ، نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔ وہیں مجھے باہر لے گئے حمام کروا کر اچھی پوشاک پہنا خدمت میں پری کے حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی: "تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا اب اور کیا چاہتا ہے جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔"

فقیر کا اس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جاتے خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی شکر خدا کا کیا اور اس سے کہا۔" اس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مُردے کو ایک بات میں زندہ کیا دیکھو تو اُس وقت سے اِس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا۔" یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہوا — کہا "حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ۔"

میں نے کہا کہ بندے کو ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ ہے کہ غریب نوازی کر کے اس عاجز کو قبول کیجئے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجئے۔"

ایک لمحہ تو سُن کر غوطے میں گئی پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا۔ "بیٹھو تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے جو کچھ کہو سو پھبتی ہے اور اپنے دل پر بھی نقش ہے خیر ہم نے قبول کیا۔" اسی دن اچھی ساعت اور مبھو لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے خدا نے یہ دن دکھایا کہ میں نے اپنے دل کا مدعا پایا لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی ویسی ہی بے کلی اس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون اور وہ حبشی سالونا سجیلا جس نے ایک پرزے کاغذ پر اتنی اشرفیوں کی بدری میرے حوالے کی کون تھا اور طیاری ضیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پہر میں کیونکر ہوئی اور وے دونوں بے گناہ اس مجلس میں کس لئے مارے گئے اور سبب خفگی اور بے مروتی کا باوجود خود سنگدلی اور ناز برداری کے مجھ پر کیا ہوا اور پھر ایک بارگی اس عاجز کو یوں سربلند کیا۔ غرض اسی واسطے بعد رسم رسومات عقد کے آٹھ دن تک باوصف اس اشتیاق کے قصد مباشرت نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا دن کو یوں ہی اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غسل کے لئے میں نے خواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔

ملکہ مسکرا کر بولی: "کس برتے پر تتا پانی؟" میں خاموش ہو رہا لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی بلکہ چہرے پر آثار خفگی کے نمودار ہوئے — یہاں تک کہ ایک روز بولی: "تم بھی عجیب آدمی ہو یا اتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے اس کو کیا کہتے ہیں۔ اگر تم میں قوت نہ تھی کیوں ایسی کچی ہوس پکائی؟"

تب تو اس وقت میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔ "اے جانی منصفی شرط ہے آدمی کو چاہئے کہ انصاف سے نہ چُوکے۔"

بولی: "اب کیا انصاف رہ گیا ہے جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔"

فقیر نے کہا: "واقعی بڑی آرزو اور مراد میری یہی تھی سو مجھے ملی لیکن دل میرا دُبدھے میں ہے اور دو دلی آدمی کی خاطر پریشان رکھتی ہے اس سے کچھ ہو نہیں سکتا انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اس نکاح کے کہ عین دل کی شادی ہے بعضی بعضی باتیں جو خیال میں نہیں آئیں اور نہیں کھلتیں حضور سے پوچھوں گا کہ زبان مبارک سے اس کا بیان سُنوں تو جی کو تسکین ہو۔"

اس پری نے چیں بجبیں ہو کر کہا "کیا خوب ابھی سے بھول گئے یاد کرو بارہا ہم نے کہا کہ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کیجئو اور کسی بات کے معترض نہ ہو جیو خلاف معمول یہ بے ادبی کرنا کیا لازم ہے؟"

فقیر نے ہنس کر کہا، "جیسے اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے ایک یہ بھی سہی" وہ پری نظریں بدل کر تیہے میں آکر آگ بگولا بن گئی اور بولی "اب تو بہت سر پر چڑھا ہے اپنا کام کر ان باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے کہا، "دنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے کا واقف کار ہوتا ہے بس ایسی چیز دل پر روا رکھی تو اور کونسا بھید چھپانے کے لائق ہے؟"

میرے اس رمز کو وہ پری وقوت سے دریافت کر کر کہنے لگی "یہ بات سچ ہے پر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر مجھ نگوڑی کا راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔"

میں بولا "یہ کیا مذکور ہے بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے فرماؤ ہرگز ہرگز میں دل سے زبان تک نہ لاؤں گا کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے؟"

جب اس نے دیکھا کہ اب سوا کہنے کے اس عزیز سے چھٹکارا نہیں ناچار ہو کر بولی "ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں تو خواہ مخواہ درپے ہوا خیر تیری خاطر عزیز ہے اس لئے اپنی سرگذشت بیان کرتی ہوں تجھے اس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے؟"

غرض بہت سی تاکید کر کر کہنے لگی کہ میں بدبخت ملک دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی ماں باپ کے سایہ میں ناز و نعمت اور خوشی خرمی سے پلی جب ہوش آیا تب اپنے دل کو خوبصورتوں اور نازنینوں کے ساتھ لگایا چنانچہ ستھری ستھری پری زاد ہجولی امرا زادیاں مصاحبت میں اور اچھی اچھی قبول صورت ہم عمر خواصیں سہیلیاں خدمت میں رہتی تھیں تماشا ناچ اور رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی دنیا کے واسطے بھلے بُرے سے کچھ کام نہ تھا اپنی بے فکری کے عالم کو دیکھ کر سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے نہ نکلتا تھا اتفاقاً طبیعت خود بخود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسو کی بھاوے نہ مجلس خوشی کی خوش آوے سودائی سا مزاج ہو گیا۔ دل اُداس اور حیران نہ کسو کی صورت اچھی لگے نہ بات کہنے سُننے کو جی چاہے میری یہ حالت دیکھ کر دائی دوا چھو چھو انا سب کی سب متفکر ہوئیں اور قدم پر گرنے لگیں یہی خواجہ سرا نمک حلال قدیم سے میرا محرم و ہم راز ہے اس سے کوئی بات مخفی نہیں میری وحشت دیکھ کر بولا "اگر بادشاہزادی تھوڑا سا شربت ورق الخیال کا نوش جان فرمائیں تو اغلب ہے کہ طبیعت بحال ہو جائے اور فرحت مزاج میں آوے"۔ اس کے اس طرح کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا تب میں نے فرمایا جلد حاضر کر۔ محلی باہر گیا ایک صراحی اسی شربت کی تکلف سے بنا کر برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا میں نے پیا جو کچھ اس کا فائدہ بیان کیا تھا ویسا ہی دیکھا اس وقت اس خدمت کے انعام میں ایک بھاری خلعت خوجے کو عنایت کیا اور حکم کیا کہ ایک صراحی ہمیشہ بلاناغہ اسی وقت حاضر کیا کر اس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صراحی اسی چھوکرے کے ہاتھ لوا لاوے اور بندی پی جاوے جب اس کا نشہ طلوع ہوتا تو اس کی لہر میں اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاح کر کر دل بہلاتی وہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا تب اچھی اچھی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا اور چھچھے کی نقلیں لائے بلکہ آہ اوہ بھرنے اور سسکیاں لینے لگا صورت تو اس کی طرح دار لائق دیکھنے کے تھی بے اختیار جی چاہنے لگا میں دل کے شوق اور اٹھکھیلیوں کے ذوق سے ہر روز انعام بخشش دینے لگی پر وہ کم بخت ویسے کپڑوں سے جیسے ہمیشہ پہنے رہتا تھا حضور میں آتا بلکہ وہ لباس بھی میلا کچیلا ہو جاتا۔ ایک دن میں نے پوچھا "تجھے سرکار سے اتنا کچھ ملا پر تو نے اپنی صورت ویسی ہی پریشان رکھی۔ کیا سبب ہے تو نے روپے کہاں خرچ کئے یا جمع کر رکھے؟"

لڑکے نے یہ خاطر داری کی باتیں جو سنیں اور مجھے اپنا احوال پُرساں پایا آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا "جو کچھ آپ نے اس غلام کو عنایت کیا سب استاد نے لے لیا مجھے ایک پیسہ نہیں دیا کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں جو پہن کر حضور میں آؤں۔ اس میں میری تقصیر نہیں میں ناچار ہوں۔"

اس غریبی کے کہنے پر اس کے مجھے ترس آیا۔ وونہیں خواجہ سرا کو فرمایا آج سے اس لڑکے کو اپنی صحبت میں تربیت کر اور لباس اچھا تیار کرا کہ

پہنا اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کودنے نہ دے بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے خواجہ سرا موافق فرمانے کے بجا لایا اور میری مرضی جو اُدھر دیکھی نہایت اس کی خبر گیری کرنے لگا تھوڑے دنوں میں فراغت اور خوش خرمی کے سبب اس کا رنگ و روغن کچھ کا کچھ ہو گیا اور کینچلی سی ڈال دی میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس کا فر کی صورت جی میں ایسی کھُب گئی تھی یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جُدا نہ کروں۔ آخر اس کو مصاحبت میں داخل کیا اور خلعتیں طرح طرح کی اور جواہر رنگ برنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو سکھ کلیجے کو ٹھنڈک ہوتی ہر دم اس کی خاطر داری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر وہ ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنے سے جاتا تو چین نہ آتا۔

بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا مسیں بھیگنے لگیں چھب تختی درست ہوئی تب اس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا دربان اور روتیے میوڑے باربردار یساول چوبدار اس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اس کا آنا موقوف ہوا مجھے تو اس بغیر کل نہ آتی تھی ایک دم پہاڑ تھا۔ جب یہ احوال ناامیدی کا سُنا ایسی بدحواس ہو گئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ اس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا الٰہی کیا کروں عجب طرح کا قلق ہوا۔ مارے بے قراری کے اس محلی کو جو میرا بھیدی تھا بلا کر کہا کہ مجھے غور اور پرداخت اس لڑکے کی منظور ہے بالفعل صلاحِ وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر چوک کے چوراہے میں دکان جوہری کی کروا دو تو تجارت کر کے اس کے نفع سے اپنی گذران فراغت سے کیا کرے اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی رہنے کے لئے دلوا دو لونڈی غلام نوکر چاکر جو ضرور ہوں مول لے کر اور درماہہ مقرر کر کے اس پاس رکھوا دو کہ کسی طرح بے آرام نہ ہو خواجہ سرا نے اس کی بود و باش کی اور جوہری پنے اور تجارت کی سب طیاری کر دی تھوڑے عرصے میں اس کی دکان ایسی چمکی اور نمود ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر بیش قیمت سرکار میں بادشاہ کی اور امیروں کی درکار یا مطلوب ہوتے اسی کے یہاں بہم پہنچتے آہستہ آہستہ یہ دکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک ملک کا چاہیے وہیں ملے۔ سب جوہریوں کا روزگار اس کے آگے مندا ہو گیا غرض اس شہر میں کوئی برابری اس کی نہ کر سکتا بلکہ کسی ملک میں ویسا کوئی نہ تھا۔ اس نے کاروبار میں تو لاکھوں روپے کمائے پر جُدائی اس کی روز بروز نقصان میرے تن بدن کا کرنے لگی کوئی تدبیر ایسی نہ بن آئی کہ اس کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلّی کروں۔

ایک دن صلاح کی خاطر اسی واقف کار محلی کو بلایا اور کہا کوئی ایسی صورت بن نہیں آتی کہ ذرا اس کی صورت میں دیکھوں اور اپنی جان کو صبر دوں مگر یہ طرح ہے کہ ایک سرنگ اس کی حویلی سے کھدوا کر محل میں ملا دو۔ حکم کرتے ہی کئی دنوں میں نقب طیار ہوئی کہ جب سے سانجھ ہوتی چپکے ہی وہ خواجہ سرا اس جوان کو اسی راہ سے لے آتا۔ تمام شب شراب کباب عیش و عشرت میں کٹتی میں اس کے ملنے سے آرام پاتی وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا جب فجر کا تارا نکلتا اور مؤذن اذان دیتا محلی اسی راہ سے اس جوان کو اس کے گھر پہنچا دیتا۔ ان باتوں سے سوائے اس خوجے کے اور دو دائیوں کے جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔ ایک مدت اسی طرح سے گذری۔

ایک دن کا یہ ذکر ہے کہ موافق معمول کے خواجہ جو اس کو بلانے گیا دیکھے تو وہ جوان فکرمند سا چپکا بیٹھا ہے۔ محلی نے پوچھا "آج خیر ہے کیوں ایسے دلگیر ہو رہے ہو؟ چلو حضور نے یاد فرمایا ہے۔" اس نے ہرگز کچھ جواب نہ دیا زبان نہ ہلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا منہ لے کر اکیلا پھر آیا' احوال اس کا عرض کیا۔ میرے تئیں شیطان جو خراب کرے اس پر بھی محبت اس کی دل سے نہ بھولی اگر یہ جانتی کہ یہ عشق اور چاہ ایسے نمک حرام بے وفا کی آخر کو بدنام اور رسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب ٹھکانے لگے گا تو اسی دم اس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی پھر اس کا نام نہ لیتی نہ اپنا دل اس بے حیا کو دیتی پر ہونا تو یوں تھا اس لئے یہ حرکتِ بے جا اس کی خاطر میں نہ لائی اور اس کے نہ آنے کو معشوقوں کا چوچلا اور ناز سمجھا اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ اس سرگذشت سے بغیر دیکھے بھالے تو بھی واقف ہوا' نہیں تو میں کہاں اور تو کہاں خیر جو ہوا سو ہوا اس خرد ماغی پر اس گدھے کی خیال نہ کر دوبارہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ اگر تو اس وقت نہیں آوے گا تو میں کسو نکسو ڈھب سے وہیں آتی ہوں لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے۔ اگر

یہ راز فاش ہوا تو تیرے حق میں بہت بُرا ہے ایسا کام نہ کر جس میں سوائے رسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے جلدی چلا آ نہیں تو مجھے پہنچا جا۔ جب یہ سند لیا گیا اور اشتیاق بیرانپٹ دیکھا ٹھنڈی سی صورت بنائے ہوئے ناز نخرے سے آیا جب میرے پاس بیٹھا تب میں نے اس سے پوچھا کہ آج بناوٹ اور خفگی کا کیا باعث ہے اتنی شوخی اور گستاخی تو نے کبھو نہ کی تھی ہمیشہ بلاعذر حاضر ہوتا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں گمنام غریب حضور کی توجہ سے اور دامن دولت کے باعث اس مقدور کو پہنچا بہت آرام سے زندگی کٹتی ہے آپ کی جان و مال کو دعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر بادشاہزادی کے معاف کرنے کے بھروسے اس گنہگار سے سرزد ہوئی امیدوار عفو کا ہوں۔

میں تو جان و دل سے اسے چاہتی تھی اس کی بناوٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی بلکہ پھر دلداری سے پوچھا کیا تجھ کو ایسی مشکل کٹھن پیش آئی جو ایسا متفکر ہو رہا ہے اس کو عرض کر اس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔ غرض اس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ مجھ کو سب مشکل ہے اور آپ کے روبرو سب آسان ہے۔ آخر اس کے فحوائے کلام اور بیت کہاؤ سے یہ کھلا کہ ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارت عالی حوض و تالاب کنوئیں پختہ سمیت غلام کی حویلی کے نزدیک تاف شہر میں بکاؤ ہے اور اس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن کہ علم موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے لیکن یہ دونوں باہم بکتے ہیں نہ اکیلا باغ جیسے اونٹ کے گلے میں بلّی جو کوئی وہ باغ لیوے اس کنیز کی بھی قیمت دلیوے اور تماشا یہ ہے باغ کا مول لاکھ روپے اس باندی کا مول پانچ لاکھ، فدوی سے اتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے۔

میں نے اس کا دل بہت بے اختیار شوق میں اس کی خریداری کے پایا کہ اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا باوجودیکہ روبرو میرے بیٹھا تھا تب بھی اس کا چہرہ ملین اور جی اُداس تھا مجھے تو خاطر داری اس کی ہر گھڑی اور ہر پل منظور تھی اسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اس باغ کی لونڈی سمیت چکا کر قبالہ باغ کا اور خط کنیزک کا لکھوا کر اس شخص کے حوالے کرو اور مالک کو زر قیمت خزانہ عامرہ سے دلوا دو۔ اس پروانگی کے سنتے ہی وہ آداب بجا لایا اور منہ پر رونق آئی۔ ساری رات اسی قاعدے سے جیسے ہمیشہ گذرتی تھی ہنسی خوشی سے رہے فجر ہوتے ہی وہ رخصت ہوا خوجے نے موافق فرمانے کے اس باغ کو اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان ہمیشہ رات کو موافق معمول کے آیا جایا کرتا۔

ایک روز بہار کے موسم میں کہ مکان بھی دلچسپ تھا بدلی گھمنڈ رہی تھی بوندیاں پڑ رہی تھیں بجلی بھی کوند رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی غرض عجب کیفیت اس دم تھی جو میں رنگ برنگ کے حباب اور گلابیاں طاقوں پر چنی ہوئی نظر پڑیں دل للچایا کہ ایک گھونٹ پی لوں جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی دو میں خیال اس باغ نو خرید کا گذرا کمال شوق ہوا کہ ایک دم اس عالم میں وہاں کی سیر کرنی چاہیئے۔ کم بختی جو آوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک دائی کو ساتھ لے کر سرنگ کی راہ سے اس جوان کے مکان میں گئی وہاں سے باغ کی طرف چلی دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سرسبز پتوں پر جو پڑے ہیں گویا زمرّد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں اور سُرخی پھولوں کی اس ابر میں ایسی چھپی جیسے شفق پھولی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں غرض اس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چکا سیاہی شام کی نمود ہوئی اتنے میں وہ جوان ایک روش پر نظر آیا اور مجھے دیکھ بہت ادب اور گرمجوشی سے آگے بڑھ کے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دھر کر بارہ دری کی طرف لے چلا جب میں وہاں گئی تو وہاں کے عالم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بھلا دیا۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا جا بجا قمقمے سرو چراغاں کنول اور فانوس خیال شمع مجلس حیران اور فانوسیں روشن تھیں کہ شب برات باوجود چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتش بازی پھلجھڑی انار داؤدی بھچھنیا مردارید مہتابی ہوائی چرخی ہتھ پھول جاہی جوہی پٹاخے بتاشے چھٹتے تھے اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آ جاتا ہے بڑی کیفیت ہوئی۔

چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا اب چل کر باغ کے بالاخانے پر بیٹھیے میں ایسی احمق ہو گئی تھی کہ جو وہ نگوڑا کہتا سو میں مان لیتی اب یہ ناچ نچایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا وہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اس کے پائیں باغ تھے میں جو اس جوان کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے

خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی صورت نہ شکل چوٹے میں سے نکل شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے آ پہنچی۔ مجھے اس وقت اس کا آنا نپٹ بُرا لگا اور اس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہول اُٹھی۔ تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا "یہ طرفہ علت کون ہے تو نے کہاں سے پیدا کی" وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "یہ وہی لونڈی ہے جو اس باغ کے ساتھ حضور کی عنایت سے خرید ہوئی" میں نے معلوم کیا کہ اس احمق نے بڑی خواہش سے اس کو قبول کیا شاید اس کا دل اس پہ مائل ہے اسی خاطر سے پیچ تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی۔ لیکن دل اسی وقت سے مکدر رہوا اور ناخوشی مزاج پر چھا گئی تس پر قیامت اس ایسے تیسے نے یہ کی کہ ساقی اسی چھنال کو بنایا۔ اس وقت میں لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کوئی کوّے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے نہ جانے کی فرصت باقی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا قصہ مختصر وہ شراب بُوند کی بُوند تھی جس کے پینے سے آدمی حیوان ہو جاوے۔ دو چار جام پے در پے اسی تیزاب کے جوان کو دئیے اور آدھا پیالہ جوان کی منت سے میں نے بھی زہر مار کیا آخر وہ پلیشت بے حیا بھی بدمست ہو کر اس مردود سے بیہودہ ادائیں کرنے لگی اور وہ چیلہ بھی نشے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ غیرت آئی کہ اگر اس وقت زمین پھٹے تو میں سما جاؤں لیکن اس کی دوستی کے باعث میں ہلتی اس پر بھی چپ ہو رہی وہ اصل کا پاجی تھا۔ میرے اس درگذر کرنے کو نہ سمجھا نشے کی لہر میں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہنا سہتا ہوش جو تھا وہ بھی گم ہوا اور میری طرف سے مطلق دھڑکا جی سے اٹھا دیا......... دونوں میں چھما چاٹی ہونے لگی نہ اس بے وفا میں وفا نہ اس بے حیا میں حیا جیسی روح ویسے فرشتے۔

میری اس وقت یہ حالت تھی جیسے اوسر چوکی ڈومنی گاوے 'تال بے تال'، اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی جس کی یہ سزا پائی۔ آخر کہاں تک سہوں میرے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اس غصے اور طیش میں یہ کہاوت کہی 'بیل نہ کودا کودے گون' یہ تماشا دیکھے کون، کہتی ہوئی وہاں سے اٹھی وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا کہ اگر بادشاہزادی اس وقت ناخوش ہوئی تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیامت مچے گی اب بنے تو اس کا کام تمام کر ڈالوں یہ ارادہ اس غیبانی کی صلاح سے جی میں ٹھہرا کر گلے میں پٹکا ڈال میرے پاؤں آ کر گر پڑا اور پگڑی سر سے اتار کر منت و زاری کرنے لگا میرا دل تو اس پر لٹو ہو ہی رہا تھا جدھر لیے پھرتا تھا پھرتی تھی اور چکی کی طرح میں اس کے اختیار میں تھی جو کہتا تھا سو کرتی تھی جوں توں مجھے بہلا پھسلا کر پھر بٹھایا اور اسی شراب دو آتشہ کے دو چار پیالے بھر بھر آپ بھی پیئے اور مجھے بھی دئیے ایک تو غصہ کے مارے جل بھن کر کباب ہو ہی رہی تھی دوسرے ایسی شراب پی جلد بیہوش ہو گئی کچھ حواس باقی نہ رہے تب اس بے رحم نمک حرام کٹر سنگدل نے تلوار سے مجھے گھائل کیا بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اس دم میری آنکھ کھلی تو منہ سے یہی نکلا خیر جیسا ہم نے کیا ویسا پایا لیکن تو اپنے تئیں اس خون ناحق سے بچائیو

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

کسی سے یہ بھید ظاہر نہ کیجیو اور ہم نے تجھ سے جان تک بھی درگذر نہ کی۔ پھر اس کو خدا کے حوالے کر کر میرا جی ڈوب گیا مجھے اپنی سُدھ بُدھ کچھ نہ رہی شاید اس قصائی نے مجھے مردہ خیال کر اس صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار کے تلے لٹکا دیا سو تو نے دیکھا میں کسو کا بُرا نہ چاہتی تھی لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں مٹتی نہیں کہ جسم کی ریکھا ان آنکھوں نے سبب یہ کچھ دیکھا اگر خوبصورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ نے یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچا دیا اور تو سبب میرے زندگی کا ہوا۔ اب حیا جی میں آتی ہے کہ یہ رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں یا کسی کو منہ نہ دکھاؤں پر کیا کروں مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں خدا نے مار کر پھر جلایا آگے دیکھئے کیا قسمت میں بدا ہے ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی جو ویسے زخموں سے شفا پائی تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو کچھ اپنی بساط تھی حاضر کی ان دنوں تجھے خرچ سے دور لا دیکھ کر وہ شقہ شیدی بہار کو جو میرا خزانچی ہے لکھا اس میں یہی مضمون تھا کہ میں خیر و عافیت سے اب فلانے مکان میں ہوں مجھ بدطالع کی خبر والدہ شریفہ کی خدمت میں پہنچائیو اس نے تیرے ساتھ وہ کشتیاں نقد کی خرچ کی خاطر بھیج دیں اور جب تجھے خلعت اور جواہر خرید کرنے کو یوسف سوداگر بچے کی دکان

پر بھیجا تو مجھے یہ بھروسہ تھا کہ وہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے تجھے بھی اجنبی جان کر اغلب ہے کہ دوستی کرنے کے لئے اتنا کر دعوت اور ضیافت تیری کرے گا سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا جو کچھ میرے دل میں آیا تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ تو جب اس سے قول و قرار پھر آنے کا کر میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اس کا بجد ہونا مجھ سے کہا میں دل میں خوش ہوئی کہ جب تو اس کے گھر میں جا کر کھاوے پیوے گا تب اگر تو بھی اس کو مہمانی کی خاطر بلاوے گا تو وہ دوڑا چلا آوے گا۔ اس لئے تجھے جلد رخصت کیا۔

تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے روبرو عذر غیر حاضری کا شرمندگی سے لایا میں نے تیری تسلی کے لئے فرمایا کچھ مضائقہ نہیں جب اس نے رضا دی تب تو آیا لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا احسان اپنے سر پہ رکھئے اور اس کا بدلہ نہ کیجئے اب تو بھی جا کر اس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔ جب تو اس کے گھر گیا تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اسباب مہمانداری کا تیار نہیں اگر وہ آ جاوے تو کیا کروں لیکن یہ فرصت پائی کہ اس ملک میں قدیم سے بادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبار ملکی و مالی کے واسطے ملک گیری میں باہر رہتے ہیں دو چار مہینے موسم برسات کے قلعۂ مبارک میں جلوس فرماتے ہیں۔

ان دنوں دو چار مہینے سے بادشاہ یعنی ولی نعمت مجھ بدبخت کے بندوبست کی خاطر ملک گیری کو تشریف لے گئے تھے جب تک تو اس جوان کو ساتھ لے کر آوے شیدی بہار نے میرا احوال خدمت میں بادشاہ بیگم کے کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں عرض کیا پھر میں اپنی تقصیر اور گناہ سے خجل ہو کر ان کے روبرو جا کھڑی ہوئی اور جو سرگذشت تھی سب بیان کی ہر چند انھوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت دوراندیشی اور مہر مادری سے چھپا رکھی تھی کہ خدا جانے اس کا کیا انجام ہو ابھی یہ رسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں میرے بدلے میرے عیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا لیکن میری تلاش میں تھیں جب مجھے اس حالت میں دیکھا اور سب ماجرا سنا آنسو بھر لائیں اور فرمایا:

"اے کم بخت ناشدنی تو نے جان بوجھ کے نام و نشان بادشاہت کا سارا کھویا ہزار افسوس اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھویا کاش کہ تیرے عوض میں پتھر جنتی تو صبر آتا اب بھی توبہ کر جو قسمت میں تھا سو ہوا اب آگے کیا کرے گی جیوے گی یا مرے گی؟"

میں نے نہایت شرمندگی سے کہا "مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اس بدنامی اور خرابی میں ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر جیتی رہوں۔ اس سے مرنا ہی بھلا تھا اگرچہ کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگا پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماں باپ کے نام کو عیب لگے۔ اب یہ بڑا دکھ ہے کہ وے دونوں بے حیا میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں مناویں اور میں ان کے ہاتھوں سے یہ کچھ دکھ دیکھوں حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے۔ امیدوار ہوں کہ خانساماں کو پروانگی ہو تو اسباب ضیافت کا بخوبی تمام اس کم بخت کے مکان میں طیار کرے تو میں دعوت کے بہلانے سے ان دونوں بدبختوں کو بلوا کر ان کے عملوں کی سزا دوں اور اپنا عوض لوں جس طرح اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی دونوں کو پرزے پرزے کروں تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو نہیں تو اس غصے کی آگ میں پھنک رہی ہوں۔ آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی۔"

یہ سن کر انہوں نے مامتا کے درد سے مہربان ہو کر میری عیب پوشی کی اور سارا لوازمہ ضیافت کا اسی خواجہ سرا کے ساتھ جو میرا محرم ہے کر دیا سب اپنے اپنے کارخانے میں آ کر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تو اس موئے کو لے کر آیا۔ مجھے اس قحبہ باندی کا بھی آنا منظور تھا چنانچہ پھر تجھ کو تقید کر کر اسے بھی بلوایا۔ جب وہ آئی اور مجلس جمی شراب پی پی کر سب بدمست اور بیہوش ہوئے اور ان کے ساتھ تو بھی کیفی ہو کر مردہ سا پڑا! میں نے قلماقنی کو حکم کیا کہ ان دونوں کا سر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اس نے وہیں ایک دم میں شمشیر نکال دونوں کے سر کاٹ بدن لال کر دیئے اور تجھ پر غصے کا یہ باعث تھا کہ میں نے اجازت ضیافت کی دی تھی تو دو دن کی دوستی پر اعتماد کر کے شریک میخواری کا ہوا البتہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی اس واسطے کہ جب تو پی پا کر بیہوش ہوا تب توقع رفاقت کی تجھ سے کیا رہی۔ پر تیری خدمت کے حق ایسے میری گردن پر ہیں کہ جو تجھ سے ایسی حرکت ہوئی ہے تو معاف کرتی ہوں ——— لے میں نے اپنی حقیقت ابتدا سے انتہا تک کہہ سنائی اب بھی دل میں کچھ اور ہوس باقی ہے؟

جیسے میں نے تیری خاطر کر کے تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا تو بھی میرا فرمانا اسی صورت سے عمل میں لا۔ صلاح وقت یہ ہے کہ اب اس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں آگے تو مختار ہے۔"

یا معبود اللہ شہزادی اتنا فرما کر چپ ہو رہی فقیر تو دل و جان سے اس کے حکم کو سب چیز پر مقدم جانتا تھا اور اس کی محبت کے جال میں پھنسا تھا بولا جو مرضی مبارک میں آوے سو بہتر ہے یہ فدوی بے عذر بجا لاوے گا جب شہزادی نے میرے تئیں فرمانبردار و خدمتگار اپنا پورا سمجھا فرمایا دو گھوڑے چالاک اور جانباز کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں بادشاہ کے خاص اصطبل سے منگوا کر طیار رکھ۔ میں نے ویسے ہی پری زاد چار گرہ کے گھوڑے چن کر زین بندھوا کر منگوائے جب تھوڑی رات باقی رہی بادشاہزادی مردانہ لباس پہن کر اور پانچوں ہتھیار باندھ کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مرکب پر میں بھی مسلح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی جب شام ہوئی اور چرچا ہونے لگا تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے اتر کر منہ ہاتھ دھو جلدی سے کچھ ناشتہ کر کے پھر سوار ہو کر چلے۔

کبھو ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی اور یوں کہتی کہ "ہم نے تیری خاطر شرم و حیا ملک و مال ماں باپ سب چھوڑا ایسا نہ ہو کہ تو بھی اس ظالم بے وفا کی طرح سلوک کرے۔"

کبھو میں کچھ احوال ادھر ادھر کا راہ کٹنے کے لئے کہتا اور اس کا جواب دیتا کہ "بادشاہزادی سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے اس پاجی کے نطفے میں کچھ خلل ہوگا جو اس سے ایسی حرکت واقع ہوئی اور میں نے جان و مال تم پر تصدق کیا اور تم نے مجھے ہر طرح سرفرازی بخشی اب میں بندہ بے زر و داموں کا ہوں میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو میں آہ نہ کروں" ایسی ایسی باتیں باہم ہوتی تھیں اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو ماندگی کے سبب کہیں اترتے تو جنگل کے چرند و پرند شکار کرتے اور حلال کر کے نمکدان سے لون نکال چکمک سے آگ جھاڑ بھون بھان کر کھا لیتے گھوڑوں کو چھوڑ دیتے۔ وے اپنے منہ سے گھاس پات چر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک روز ایسے کف دست میدان میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نہ نظر آتی تھی۔ اس پر بھی بادشاہزادی کی رفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شب برات معلوم ہوتی تھی جاتے جاتے اچنبت ایک دریا کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو راہ میں ملا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تلک نگاہ نے کام کیا پانی ہی پانی تھا کچھ تھل بیڑا نہ پایا الٰہی اب اس سمندر سے کیونکر پار اتریں ایک دم اسی سوچ میں کھڑے رہے آخر یہ دل میں لہر آئی کہ ملکہ کو یہیں بٹھا کر میں تلاش میں ناؤ تو اڑی کے جاؤں جب تلک اسباب گذارے کا ہاتھ آوے تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے تب میں نے کہا "اے ملکہ اگر حکم ہو تو گھاٹ باٹ اس دریا کا دیکھوں" فرمانے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکی پیاسی ہو رہی ہوں ذرا دم لے لوں جب تئیں تم پار چلنے کی کچھ تدبیر کرو۔"

اس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا بڑا چھتر باندھے ہوئے کہ اگر ہزار سوار آئیں تو دھوپ میں اس کے تلے آرام پائیں وہاں اس کو بٹھا کر میں چلا اور چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر یا دریا میں نشان انسان کا پاؤں بہتیرا سر مارا کہیں نہ پایا آخر مایوس ہو کر وہاں سے پھر آیا تو اس پری کو پیڑ کے نیچے نہ پایا۔ اس وقت کی حالت کیا کہوں کہ مُرت جاتی رہی دیوانہ باؤلا ہو گیا۔ کبھی درخت پر چڑھ جاتا اور ڈال ڈال پات پات پھرتا کبھی ہاتھ پاؤں چھوڑ کر زمین میں گرتا اور اس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کبھی چنگھاڑ مار کر اپنی بے بسی پر روتا اور کبھی پچھم سے پورب کو دوڑ جاتا، کبھی اتر سے دکھن کو پھر آتا غرض بہتیری خاک چھانی لیکن اس گوہر نایاب کی نشانی نہ پائی جب میرا کچھ بس نہ چلا تب روتا اور خاک سر پر اڑاتا ہوا تلاش ہر کہیں کرتا ہوا دل میں یہ خیال آیا کہ شاید جن اس پری کو اٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا یا اس کے ملک سے کوئی اس کے پیچھے لگا چلا آتا تھا اس وقت اکیلا پا کر منا ونا کر پھر شام کی طرف لے ابھرا۔

ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک دے ننگا منگا فقیر بن کر شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈھتا پھرتا اور

رات کو کہیں پڑ رہتا سارا جہان روندمارا پر اپنی بادشاہزادی کا نام و نشان کسی سے نہ سُنا نہ سبب غائب ہونے کا معلوم ہوا۔ تب دل میں آیا کہ جب اس جانی کا کچھ پتہ نہ پایا تو اب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا تب اس پر چڑھ گیا اور ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ایک دم میں سر منہ پتھروں سے ٹکراتے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے گا۔ یہ دل میں کہہ کر چاہتا تھا کہ اپنے تئیں گرا دوں پاؤں بھی اٹھ چکے تھے کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اتنے میں ہوش آیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوار سبز پوش منہ پر نقاب ڈالے مجھ سے فرماتا ہے کہ کیوں تو اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے جب تلک سانس ہے تب تلک آس ہے اب تھوڑے دنوں میں روم کے ملک میں تین درویش تجھ سے ویسے ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے تجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے اس کو بھی ایک بڑی مشکل درپیش ہے جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے بخوبی حاصل ہوگی۔

بارے اس فقیر نے اپنے مولیٰ مشکل کشا کی بشارت سے خاطر جمع ہو قسطنطنیہ کا ارادہ کیا۔ راہ میں جو کچھ مصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں کھینچتا ہوا اس بادشاہزادی کی ملاقات کے بھروسے خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا

منظہر علی ولا و للو لال

بیتال پچیسی

(۱۸۰۴ء)

چھٹی کہانی

دھرم پر نام ایک نگر ہے وہاں کا راجہ دھرم سیل اوس کے منتری کا نام اندھک اوس نے ایک دن راجہ سے کہا "مہاراج ایک مندر بناؤ اوس میں دیبی کو بٹھا نت پوجا کیجیے کہ اس کا شاستر میں بڑا پن لکھا ہے تب راجہ ایک مندر بنوا، دیبی دھر، شاستر کی بدھ سے پرچار کرنے لگا اور بن پوجا کے جل بھی نہ پیتا تھا اسی طرح سے جب کتنی ایک مدت گذری تو ایک روز دیوان نے کہا. مہاراج مثل مشہور ہے کہ نپوتے کا گھر سونا مورکھ کا ہردے سونا اور دالدری کا سب کچھ سونا ہے یہ بات سن راجہ دیبی کے مندر میں جا ہاتھ جوڑ استت کرنے لگا کہ ہے دیبی تجھے برہما بشنو اور اندر اٹھ پہر سیوتے ہیں اور تو نے مہی کاسر چند منڈ کھینچ نے دیتوں کو مار پرتھوی کا بھار اتارا ہے اور جہاں تیرے بھگت بپر پیش پڑے تہاں تہاں جا تو سہائے ہوئے اور میں اس آس تیرے دوارے پر آیا ہوں اب میرے ہی من کی اچھیا پوری کر" اتنی استت جب راجہ کر چکا تب دیبی کے مندر سے آواز آئی کہ راجہ میں تجھ سے خوش ہوئی، راجہ نے کہا "مجھ کو پتر دے" دیبی نے کہا راجہ تیرے پتر ہوگا مہابلی اور بڑا پرتاپی" تب تو راجہ نے چندن گشت پھول دھوپ دیپ نیویدے کر پوجا کی اور اسی طرح سے ہر روز پوجا کرتا تھا.

غرض کتنے دنوں کے پیچھے راجہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا راجہ نے باجے گاجے سے کٹنب سمیت جا کے دیبی کی پوجا کی اس عرصہ میں ایک دن کا اتفاق ہے کہ کسی نگر سے ایک دھوبی اپنے دوست کو ساتھ لئے اس شہر کی طرف آتا تھا کہ دیبی کا مندر اسے نظر آیا اوس نے ڈنڈوت کرنے کا ارادہ کیا اس میں ایک دھوبی کی لڑکی اَت سندری آتے سامنے سے اُس نے دیکھی اوسے دیکھ موہت ہوا اور دیبی کے درشن کو گیا ڈنڈوت کر ہاتھ جوڑ اس نے اپنے من میں کہا "ہے دیبی! جو اس سندری سے میرا بواہ تیری کرپا سے ہو تو میں اپنا سر تجھے چڑھاؤں" یہ مانتا مان ڈنڈوت کر دوست کو ساتھ لے اپنے نگر کو گیا جب وہاں پہنچا تو اوس کے برہ نے یہ ستایا کہ نیند بھوک پیاس بسر گئی آٹھ پہر اوس کے دھیان میں رہنے لگا یہ بُری حالت اوس کے دوست نے دیکھ اوس کے باپ سے جا ست بیورے وار کہا اوس کا پتا بھی یہ سن کے بھچک ہو رہا اور اپنے جی میں چنتا کر کہنے لگا کہ اوس کی دسا دیکھ ایسا معلوم ہوتا ہے جو اوس کنیا سے اوس کی شادی نہ ہو گی تو یہ اپنا پران تیاگ کریگا اس سے بہتر یہ ہے کہ اوس لڑکی سے اوس کا بیاہ کر دیجئے کہ جس سے یہ بچے اتنا بچار کر پتر کے متر کو ساتھ لے اوس گاؤں

میں پہنچ لڑکی کے پتا سے جا کہ کہا کہ میں تیرے پاس کچھ جانچنے آیا ہوں جو تو دیوے تو میں کہوں اُس نے کہا کہ میرے پاس وہ پدارتھ ہوگا جو میں دوں گا کہا "تو اپنی لڑکی میرے پتر کو دے" یہ سن کہ اوس نے بھی اوس کی بات پرمان کر برہمن کو بلوا دن لگن مہورت ٹھیرا کہ کہا "تم لڑکے کو لے آؤ میں بھی اپنی لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دونگا" وہ وہاں سے اوٹھ اپنے گھر آ سامان شادی کا تیار کر بیاہنے کو گیا اور وہاں جاہ بواہ کر بیٹے بہو کو لے اپنے گھر پھر آیا اور دونوں آنند سے باہم رہنے لگے پھر کتنے دنوں کے بعد اوس لڑکی کے پتا کے یہاں کچھ سبھ کرم تھا۔ وہاں سے نیوتہ یہاں بھی آیا۔ یہ استری پرش بھی تیار ہو اپنے متر کو ساتھ لے اوس نگر کو چلے جب نگر کے نکٹ پہنچے تو دیبی کا مندر نظر آیا تو اوسے مانتا یاد آئی تب اون نے یہ بات جی میں بچار کہ کہا کہ بڑا اسست باذی ادھر میں ہوں کہ دیبی سے جھوٹ بولا اتنی بات اپنے من میں کہہ اوس دوست سے کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو۔ میں دیبی کا درشن کر آؤں اور استری سے کہا تو بھی یہاں ٹھیر یہ کہ مندر پاس پہنچ کنڈ میں اشنان کر دیبی کے سنمکھ جا کر ہاتھ جوڑ نمشکار کر کھڑک اوٹھا کہ گردن پر مارا کہ سر تن سے جدا ہوا بھوم میں گر پڑا غرض کتنی ایک دیر کے پیچھے اوس کے متر نے بچارا اسے گئے بڑی دیر ہوئی ہے اب تک پھرا نہیں چل کہ دیکھا چاہیئے اور اوس کی استری کو کہا "تو یہاں کھڑی رہو میں اسے شتابی سے ڈھونڈ کر لے آتا ہوں" یہ کہہ کر دیبی کے مندر میں گیا دیکھتا کیا ہے کہ دھڑ سے اوس کا سر جدا پڑا ہے یہ حالت وہاں کی دیکھ اپنے من میں کہنے لگا کہ سنسار بہت کٹھن جگہ ہے کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے سر دیبی کو چڑھا دیا ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ اوس کی ناری جوان سندری ہے اوس کے لینے کے لئے مار کر یہ مکر کرتا ہے اس سے یہاں مرنا اوچت ہے پر سنسار میں بدنامی لینی خوب نہیں یہ کہ تالاب میں نہا دیبی کے سامنے آ ہاتھ جوڑ پرنام کہ کھانڈا اوٹھا ایسا گلے میں مارا کہ رنڈ سے منڈ جدا ہو گیا اور وہ استری یہاں اکیلی کھڑی کھڑی اوکتا کہ راہ دیکھ دیکھ نراس ہو ڈھونڈتی ہوئی دیبی کے مندر میں گئی وہاں جا کہ دیکھتی کیا ہے کہ دونوں موے پڑے ہیں پھر ان دونوں کو موا دیکھ اون نے اپنے جی میں بچارا کہ لوگ تو نہ جانیں گے کہ یہ آپ سے دیبی کو بل چڑھے ہیں سب کہیں گے کہ رانڈ نشٹ تھی بدکاری کرنے کے لئے دونوں کو مار آئی ہے اس بدنامی سے مرنا اوچت ہے یہ سوچ کنڈ میں غوطہ مار دیبی کے سنمکھ آ سر نوا، ڈنڈوت کر تلوار اوٹھا چاہی کہ گردن پر مارے کہ دیبی نے سنگھاسن سے اوتر اوس کا ہاتھ آن پکڑا اور کہا "پتری بڑھ مانگ میں تجھ سے پرسن ہوئی" تب اون نے کہا "ماتا جو مجھ سے خوش ہوئی ہے تو ان دونوں کو جی دان دے" پھر دیبی نے کہا کہ ان کے دھڑوں سے سر لگا دے ان نے مارے خوشی کے گھبراہٹ میں سر بدل کر لگا دیئے اور دیبی نے امرت لا چھڑکا یہ دونوں جی کر اوٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں جھگڑنے لگے یہ کہے استری میری ہے وہ کہے استری میری اتنی کہہ بیتال بولا کہ ہے راجہ بکرماجیت ان دونوں میں وہ استری کس کی ہوئی؟ راجہ نے کہا "سن شاستر میں اس کا پرمان لکھا ہے کہ ندیوں میں گنگا اوتم ہے اور پربتوں میں سمیر پربت اور برکشوں میں کلپ برکش انگوں میں مستک اوتم ہے اس نیاؤ سے جس کا اوتم انگ ہے اوس کی استری ہوئی"

کاظم علی جوان و للو لال

سنگھاسن بتیسی

(۱۸۰۴ء)

(اکیسویں داستان۔ انرودھ متی پتلی کی زبانی)

مادھو نام ایک برہمن تھا بڑا گنی اُس کی تعریف نہیں ہو سکتی جو میں کروں جوگی ہو کر وہ تمام پرتھی میں پھر آیا کہیں ٹھہر کر رہنے نہ پایا۔ مادھو کام کا اوتار تھا استری اُسے دیکھتے ہی موہت ہو جاتی تھی وہ سب بدیا پڑھا تھا اتنی چتر تھا و بسیار مرت لوک میں منش کم پیدا ہوتا ہے جس راجہ کی سیوا کرنے جاتا وہاں دس دن اُس کا آدر ہوتا اور جب وہ اپنا گن پرکاش کرتا تب وہ راجہ اُسے وہیں نکال دیتا اس طرح سے دیس دیس بھٹکتا ہوا دکھ پاتا کاما نگری میں آن پہنچا۔ کام سین وہاں کا راجہ تھا اُس کے یہاں کام کندلا ایک پاتر تھی وہ گویا اُربسی کا اوتار تھی ہنر بدیا میں اتنی چتر تھی وہ راجہ کی سبھا میں نرت[2] کر رہی تھی مادھو بھی اسی راجہ کے دوار پر جا پہنچا۔ دوارپالوں سے کہا کہ راجہ کو ہمارا سماچار کہو کہ آپ کے درشن کو ایک برہمن آیا ہے ڈیوڑھی دار اُس کی بات سُنی اَن سُنی کر گئے وہ ہارا ماندہ وہیں بیٹھ گیا جوں جوں وہاں مردنگ کے آواز اور گانے کے شبد[1] آتی تھی توں توں یہ سر دھنکر کہتا تھا کہ راجہ بھی مورکھ ہے اور اُس کی سبھا بھی کوڑھ[3] ہے جو بچار نہیں کرتا یہی بات سات دفعہ کہی دوارپالی خفا ہو کر برہمن کو دیکھ راجہ کے ڈر سے کچھ تو کہہ نہ سکے پر راجہ کے سنمکھ جا ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوئے مہاراج نے جو ان کی طرف دیکھا اُنھوں نے بنتی کر کہا کہ ایک برہمن بدیسی اور بلی دوار پر آ بیٹھا ہے رہ رہ کر کہتا ہے کہ راجہ کی سبھا کے لوگ اتنے مورکھ ہیں جو گن بچار نہیں کرتے۔ تب راجہ نے اُن دوارپالوں سے کہا "جا کر اُس سے پوچھو کہ اُن کو مورکھ تو نے کس لئے کہا" اُنھوں نے راجہ کی آگیا پائی پر پرائے برہمن سے پوچھا کہ مہاراج نے آگیا کی ہے ان کی گُن میں کیا دوش ہے وہ تم بتاؤ تو ہم تمھاری بات سچ جانیں اس نے کہا کہ بارہ آدمی چار چار تین طرف میں کھڑے ہوئے مردنگیں بجاتے ہیں۔ ان میں پورب مکھ والے میں ایک مردنگی کا انگوٹھا نہیں ہے اس سے سُم پر تھاپ ہلکی پڑتی ہے اس سے میں نے سبھا کو کوڑھ کہا ہے نہ مانو تو تم جا کر دیکھ لو وے دوڑے ہوئے راجہ کے پاس آئے سب باتیں سُنائیں راجہ نے پورب مکھ کے چاروں مردنگیوں کو بلایا۔ ایک ایک کا ہاتھ دیکھا تو اُن میں ایک کا انگوٹھا موم کا بنا ہوا تھا۔ یہ تماشا راجہ دیکھ پرسن ہوا اور اُس برہمن کو بلایا وہ جا کر سنمکھ ہوا راجہ نے ڈنڈوت کی اور اس نے اسیس دی پھر سشٹاچار کر گدی پر بٹھلایا جیسے بستر[4] بھوشن آپ

---

۱ گانے کا فن۔ ۲ ناچ۔ ۳ بے وقوف۔ ۴ لباس

پہرے تھے ویسے ہی منگا برہمن کو پہنائے اور کام کندلا کو بُلا آ گیا کی کہ یہ مہاگُنی ہے اس کے آگے تم اپنا گُن پرکاش کرو جس میں یہ پرسن ہووے۔

کام کندلا راجہ کی آگیا پائی اپنا گن ظاہر کرنے لگی سنگیت نرت کا آرنبھ کیا شیشے رنگ کے بھرے ہوئے سر پر رکھ منہ سے موتی پروتی ہاتھوں بنے اُچھالتی ہوئی ناچنے لگی سب ساز سُر ملائے ہوئے ناچتی تھی اس میں پھولوں اور عطر کی خوشبو پا کر ایک بھونرا اُڑ تا ہُوا اُس کی کچ کی بٹھنی پر بیٹھا اور ڈنگ مارا اوس کے بدن میں پیڑ ہوئی تب اُس نے بچارا کہ جو کچھ بھی حرکت کرتی ہوں تو تال بھنگ ہوگا اور میرے گُن کی ہنسی ہو گی۔ اتنا جی میں سوچ بھنڈار بدّیا کر سانس روک کچ کی راہ نکالی پون لگتے ہی وہ بھورا اُڑ گیا مادھو اس گن کو دیکھتے ہی موہت ہؤا "دھن ہے تجھے اور تیرے کرتب کو" یہ کہ پرسن ہو کر بستر بھوشن جو راجہ نے دیئے تھے سب اُتار دیئے یہ دیکھ راجہ اور منتری آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو اس برہمن نے کیا مورکھتائی کی ہے کہ بیسیا کو کپڑے اور تمام جواہر ایک دن میں بخش دیا یہ ذات کا بھکاری ہمارے آگے سخاوت دکھاتا ہے راجہ نے خفا ہو برہمن سے پوچھا کہ اس کے کس گُن پر ریجھا وہ میرے آگے بیان کر۔ برہمن نے کہا سُن راجہ کوڑہ تو بھی ہے تری سبھا بھی کوڑہ ہے۔ تیری سبھا میں ایسا گن پرکاش کرے اور کوئی گن کا بچار نہ کرے اس کی کچ پر بھونرا آن بیٹھا تھا سو اُس نے اپنی سانس روک کچ کی راہ نکال اُسے اُڑا دیا یہ کام دیکھ میں نے سب کچھ بخش دیا۔"

مادھو نے جب یہ بات کہی تب راجہ لجت ہو رہ گیا اور کچھ راجہ سے بن نہ آیا کہا کہ اِسی وقت میرے نگر سے نکل جا جو سُنوں گا کہ تو اس نگر میں ہے تو بندھوا کر دریا میں ڈلوا دونگا تب مادھو نے کہا کہ مہاراج مجھ سے ایسا کیا اپرادھ ہؤا ہے جو آپ مجھے دیس نکالا دیتے ہیں؟ راجہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ تجھے دیا تھا سو تو نے میرے ہی آگے دان کر دیا۔ کیا میرے پاس دینے کو کچھ نہ تھا جو تو نے دیا؟ یہ سُن کر مادھو ملین ہو راج سبھا سے نکل باہر جا ایک درخت کے نیچے بیاکل کھڑا ہوا اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ ماتا بیٹے کو بکھ دے اور پتا پیڑ کو بیچے اور راجہ سربس لے تو کوئی سرن کس کی لے پھر کہنے لگا کہ راجہ نے تو مجھے نکالا اب میں کہاں رہوں۔ انیک انیک بھانت کی چنتا کر کام کندلا نام لے لے کے روتا تھا۔

اِدھر کام کندلا بھی راجہ سے بہانہ کر بدا ہوئی اور ایک آدمی دوڑایا کہ یہ برہمن جانے نہ پاوے اُسے لے جاکر میرے مکان میں بٹھا دو وہ آدمی گیا اور برہمن کو لے جا کر اُس کے مندر میں بٹھا دیا اُدھر سے یہ بھی ترت جا پہنچی دونوں آپس میں بیٹھ کر پریم کی باتیں کرنے لگے تب اُس برہمن نے کہا کہ مجھے راجہ نے دیس سے نکالا دیا ہے اور تو نے اپنے گھر میں بلا بٹھایا جو یہ بات راجہ سُنے گا۔ تو میرا پران جائیگا تو میں دُکھ سے چھوٹوں گا پر تجھے بھی راجہ ات کشٹ دے گا اس سے ایسی باتیں کرنی اچت نہیں ہے کہ اپنی جان جائے اور جگ ہنسائی ہو پریم جو ہے سو دُکھ کی کھان ہے۔ جس نے پریم کے پھندے میں پاؤں دیا اُس نے کبھی سُکھ نہ پایا۔ یہ باتیں مادھو کی سُن کر کام کندلا نے کہا۔ کہ اب تو میں اس پنتھ میں آئی جو کچھ کرے سو بھگوان۔ اتنا کہہ ساز ناچ منگوا اپنی بدّیا ظاہر کرنے لگی جتنی بدّیا اُسے یاد تھی۔ اتنی جب پرکاش کر چکی تب مادھو نے اُنھیں جنتروں کے ساتھ اپنا بھی گن سب کر دکھایا۔ جب رات تھوڑی سی رہ گئی۔ تب کام کندلا نے کہا کہ تم نے سرم بہت کیا چل کر آرام کیجیئے۔ یہ کہہ کر مادھو کو رنگ محل میں لے گئی اور جتنی خوشی کی باتیں تھیں سب کیں جب گجر بجا دونوں کے جی میں رات کی بات یاد آئی سُدھ بُدھ جاتی رہی۔ گھبرا کے مادھو نے کہا "سُن سندری رات تو آنند سے نباہی اور اب جو میں یہاں رہونگا تو دونوں کے پران جائیں گے۔ اس لئے کچھ جتن کیجیے جس میں نرددنداننہ سے رہیں میں ایک بات جی میں بچاری ہے۔ کہ اب میں یہاں سے جاؤں اور کچھ اُپائے کر کے تجھے بھی یہاں سے لے جاؤں۔ تو اپنا جی مضبوط رکھ میں ضرور آکر تجھ سے ملوں گا۔ یہ بچن میں تجھے دے کر جاتا ہوں۔ اتنی بات سُنتے ہی وہ تو مورچھا کھا کر گر پڑی۔ اور مادھو نے اپنی راہ لی وہاں سے نکل کر بَن میں پھرنے لگا اور ہائے

کام کندلا کرنے لگا۔" اِدھر اُسے بھی سکھیوں نے گلاب کا نیر چھڑک کر اُٹھایا جب کچھ ہوش آیا یہ بھی مادھو مادھو پکارنے لگی۔ کھانا پینا تیاگ کیا۔ بہت سکھیاں سمجھاتی تھیں۔ اُس کے جی میں ایک نہ آتی تھی۔ جوں جوں گلاب چھڑکتیں کپور چندن لا لا کر لگاتی تھیں توں توں چوگنی داہ بڑھتی تھی۔ کسی طرح سے سیتل نہ ہوتی تھی۔ جب کوئی مادھو کا نام اور گن سُناتا تھا تب اُسے ذرا آرام آتا تھا۔

اودہر مادھو بھی بھٹک بھٹک اپنے من میں بچارنے لگا۔ کہ اب سنسار میں کون ہے جس کے نکٹ[1] جائیے جو ہمارا دُکھ درد دُور کیجے اس میں یاد آیا کہ سُنتے ہیں۔ راجہ بیر بکرماجیت پر دُکھ نوارن ہے بھلا اُس کے پاس جائیے اور دیکھئے کہ لوگ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ یہ بچار کر اجین نگری کا رستہ لیا وہاں لوگوں سے پوچھا کہ یہاں راجہ سے بھینٹ آ ہنتی کیونکر ہوتی ہے۔ تب اُس نگری کا ایک باسی بولا۔ کہ داورمی ندی کے کنارے ایک شیو کا مٹھ ہے اس مٹھ میں راجہ شیو کے درشن کو نت آتا ہے وہاں تو جا جو تیرا منورتھ ہے سو تو کہہ تیری کامنا پوری ہوگی۔ یہ سُن کر وہ وہاں گیا۔ اور اُس مٹھ کے دروازے کی چوکھٹ پر لکھا کہ میں بدلیسی اَت دُکھی برہ سے بیاکل تمہارے نگر میں آیا ہوں یہ سن کر کہ راجہ پر دُکھ نوارن ہے۔ اور جو یہ دُکھ میرا جائے گا تو میں اپنے پران رکھوں گا۔ نہیں تو تیسرے دن گودادری ندی میں پران تیاگ کروں گا۔ یہ مقرر اپنے جی میں ٹھہرائی ہے۔ اُس میں تم راجہ ہو۔ اور ساگر اور برہمن کی رکشا کرتے آئے ہو۔ اور اب بھی کروگے۔ میں نے اپنے من کی بات سب پر کاش کر دی ہے۔ ...... راجہ بیر بکرماجیت کا یہ نیم تھا۔ کہ ان دُکھی دم دُکھی برہ دُکھی ورب دُکھی اور کسی طرح کا دُکھی نگر میں آتا۔ راجہ سُنکر جب تک اُس کا دُکھ نہ [illegible]تا تب تک اَن جل کا کیا ذکر ہے داتن بھی نہ چیرتا تھا۔

سویرے راجہ جب مہادیو کے درشن کو گیا درشن کر پرنام کرنے لگا۔ راجہ اونچی درشٹ کر دیکھے تو کوئی اپنے دُکھ کی اوستھا لکھ گیا ہے۔ راجہ مہادیو کو پانچ ڈنڈوت کر مندر میں آیا سب کو آگیا کی مادھو نام برہمن ہمارے نگر میں آیا ہے۔ جو کوئی اُسے ڈھونڈ لاوے تو منہ مانگا درب پاوے یہ بات سُن لوگ نگر میں ڈھونڈنے نکلے گھاٹ، باٹ، ٹولہ، محلہ، باغ، باغیچہ سب نگر ڈھونڈ پھرے اور کہیں ٹھکانا اس کا نہ پایا۔ تب راجہ نے ایک دوتی کو بلا کر کہا کہ جو تو اُسے ڈھونڈ لاوے تو منہ مانگا دھن پاوے۔ اُس نے کہا مہاراج یہ کیا کٹھن بات ہے میں ابھی جا کر ڈھونڈ لاتی ہوں یہ کہہ اُس نے وہاں سے سیدھی راہ مندر کی لی جہاں اُس میں لکھا تھا جا کر مندر کے پاس بیٹھ رہی۔ شام کے وقت مادھو بھی بھٹکتا آن پہنچا۔ اُس نے اُسے دیکھا من میں بچارا کہ ہو نہ ہو وہ برہی یہی ہے۔ اس لئے کہ منہ پیلا آنسو جاری تن چھین من ملین ہو رہا ہے یہ بچار کر رہی تھی کہ وہ برہمن وہاں آبیٹھا تب اُس نے جا اُس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میں تیرے ڈھونڈنے کے لئے راجہ کی آگیا پا کر آئی ہوں تو اُٹھ میرے ساتھ جلدی چل تیرا منورتھ پورا ہوگا۔ تیرے دُکھ سے راجہ نپٹ دُکھی ہے یہ سنتے ہی وہ اُس کے ساتھ ہو لیا۔

اُسے لئے ہوئے راجہ کے سنمکھ پہنچ کر کہنے لگی مہاراجہ وہی بیوگی ہے جس کے لئے آپ نے یہ دُکھ پایا ہے۔ تب راجہ نے اُس برہمن سے پوچھا۔ کہ تو کس کے بیوگ سے ایسا بیاکل ہو رہا ہے میرے آگے کہہ۔ تب اُس نے ایک آہ بھر کر کہا "مہاراج کام کندلا کے بیوگ میں میری یہ گت ہوئی ہے وہ راجہ کام سین کے پاس ہے۔ تو دھرم آتما ہے اور میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تو مجھے اُس کو دلا دے تو جی دان دے۔ یہ سُنتے ہی راجہ ہنس کر بولا کہ سُن بیر وہ بیشیا ہے۔ تو نے اُس کے پریم میں سب کرم دھرم چھوڑا یہ تجھی اُچت نہیں۔ مادھو نے کہا مہاراج پریم کا پنتھ نرالا ہے۔ جو پریم کرتے ہیں سوا بنا تن من دھن دھرم کرم سب پُن کرتے ہیں پریم کی اکتھ کہانی ہے۔ مجھ سے کہی نہیں جاتی۔" راجہ یہ باتیں سُن اور اُسے اپنے ساتھ مندر میں گیا اور سب رانیوں کو آگیا کی کہ تم سب بناؤ سنگار کر کے آؤ رانیاں سب سنگار کر آئیں اور اُس بیر سے راجہ نے کہا کہ جسے تمہاری اچھا ہو اُسے اُن میں سے لو اپنے من کا دُکھ بسارو اور سُکھ چین کرو۔ اُس نے جواب دیا کہ

---

[1] نزدیک۔ [2] حفاظت۔

مہاراج آپ کے آگے ست کہوں کہ میری آنکھوں میں وہ بس رہی ہے اس لئے میری درشٹ میں کچھ نہیں آتا۔ اتار ترشنا[۱] سوات کے بوند سے بجھتی ہے اور جل پر اُسے رُچ نہیں ہوتی۔ ایسے پریم کی ڈر تھا بیر کی دیکھ راجہ اپنے من میں بچارا کہ اسے ساتھ لے جا کر کام کندلا دلا دوں اِس کے بنا اس کے نہرتا نہ ہوگی یہ بات راجہ نے بچار بیر سے کہا دیوتا تم اشنان پوجا کر کچھ کھا لو تب تک میں بھی اپنے لوگوں کو بلا تمہیں ساتھ لے چلوں اور اُسے دلا دوں تم اپنے جی میں کسی بات کی چنتا نہ کرو میں نے تم سے یہ بچن کیا۔

بیر اپنے کھانے پینے میں لگا راجہ نے پردھان کو آگیا کی۔ کہ میرے ڈیرے نگر کے باہر نکالیں چار گھڑی کے بعد کاماتگری کی طرف میرا کوچ ہے سب لوگوں کو خبر دو اس میں کتنی ایک دیر کے پیچھے راجہ تیار ہو کر بیر کو ساتھ لے کر چکہ ڈیروں میں داخل ہوا۔ اور جتنے راجہ کے نوکر تھے سب رکاب میں حاضر تھے راجہ وہاں سے کوچ در کوچ جاتا تھا کتنی ایک منزلوں کے بعد کاماتگری سے دس کوس اُدھر ڈیرا کیا۔ اور اس راجہ کو پتر لکھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمہارے یہاں جو کام کندلا پاتر ہے اُسے بھیج دو نہیں تو جدھ[۲] کرنے کا ہم سے سامان کرو یہ پتر لکھ ایک دوست کے ہاتھ راجہ کے پاس بھیج دیا۔ راجہ کو خبر ہوئی کہ ایک دوست راجہ بیر بکرماجیت کا خط لے کر آیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجہ نے اُس کو بلایا۔ اُس نے جوہار کر خط راجہ کے ہاتھ دیا راجہ نے اُس چٹھی کو بانچ کر کہا " اچھا کہو اپنے راجہ سے چلے آویں ہم جدھ کرنے کو تیار ہیں دوست نے راجہ سے کہا " مہاراج وہ لڑنے پر تیار رہے " راجہ نے بھی اپنے لوگوں پر حکم دیا کہ ہمارا بھی دل تیار ہو۔

پھر راجہ کے جی میں آیا کہ جس کے واسطے ہم آئے ہیں اس کی بھی پریت کی پرکشا[۳] لینی چاہئیے اس طرح جی میں ٹھہرا بید کا سوانگ بن راجہ کاماتگری میں گیا لوگوں سے کام کندلا کا مکان پوچھ دوارے پر جا بید حکیم کرتا پکارا آواز سنتے ہی ایک داسی باہر نکل آئی پوچھا کہ تم بید ہو تو ہماری نایکہ کا علاج کرو۔ جو وہ اچھی ہوگی تو تمہیں بہت سے روپے ملیں گے یہ باتیں کر وہ داسی اُسے اپنے ساتھ لے کر کام کندلا کے پاس گئی راجہ نے دیکھا کہ نرجیو پڑی ہے راجہ نے اُس کی ناڑی دیکھ کر کہا۔ کہ اس کو اور کچھ روگ نہیں پریم کا بیوگ ہے جس سے یہ گت بنی ہے یہ بات سن کندلا نے آنکھیں کھول اُس کی طرف دیکھا اور کہا " اِس کا علاج تمہارے پاس ہو تو کرو تب اُس نے کہا علاج تو تھا پر اس وقت کچھ کہنے میں نہیں آتی تب وہ بولی کہ تمہارے پاس کیا علاج تھا وہ بتاؤ۔ راجہ نے کہا " مادھو نام ایک برہمن تھا اُسے ہم نے اجین نگری میں برہ بیوگی ات سوگی دیکھا سو وہ کہیا ہے مر گیا۔ یہ سنتے ہی اس نے بھی ہائے کر اپنا پران چھوڑ دیا جتنے داس داسی اُس کے گھر کے تھے یہ دسا دیکھ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگے تب راجہ نے کہا کہ تم کچھ چنتا اپنے من میں مت کرو اسے مورچھا آگئی ہے۔ کتنی ایک دیر کے بعد سُدھ آ دیگی تم اِس کی چوکسی کرتے رہو۔ میں اپنے گھر سے جا کر اوکھد لاؤں راجہ اُلٹا پھر اپنے دل میں آیا اور مادھو کے آگے اُس کے مرنے کی خبر کہی سنتے ہی ایک ہائے کے ساتھ اُس کی بھی جان نکل گئی یہ دیکھ راجہ اپنے جی میں پچھتا کر بچار کرنے لگا۔ کہ جس کے واسطے اتنی سیہنا ساز کر کے پردیس میں آیا اور اُسے اس طرح سے کھو دیا یہ دو ہتیا میرے اوپر ہوئیں۔ اب اپنا بھی پران رکھنا اُچت نہیں یہ بات اپنے جی میں ٹھہرا چندن بہت سا منگوا چتا بنوا راجہ جیتا جلنے کو تیار ہوا۔ وہاں پردھان نے جتنا منع کیا نہ مانا جو چاہا کہ چتا میں بیٹھ آگ لگا دے کہ بیتال نے آ ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ راجہ تو اپنا جی کیوں دیتا ہے تب اُس نے کہا کہ دو آدمی کی جان میں نے کھوئی اب میرا بھی جینا سنسار میں اُچت نہیں اِس بدنامی کے جینے سے مرنا اُتم ہے۔ بیتال نے کہا راجہ میں امرت لاتا ہوں تو دونوں کو جلائیے یہ کہہ جلد بیتال پاتال سے امرت لے آیا اُس برہمن پر چھڑکا وہ جی اُٹھا پھر لے جا کر کام کندلا پر چھڑکا وہ بھی جی اُٹھی اور مادھو پکارنے لگی راجہ کی صورت دیکھ کر کہا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو مجھ سے کہو تب راجہ نے کہا ہم بیر بکرماجیت ہیں مادھو کا برہ دور کرنے کے لئے اجین نگری سے یہاں آئے ہیں تو خاطر جمع رکھ تجھے ہم مادھو سے ملا دیں گے۔ یہ سنتے ہی وہ اُٹھ راجہ کے پاؤں پر گر پڑی اور کہا کہ یہ تم جی دان دو گے

---

۱ پیاس۔ ۲ جنگ۔ ۳ امتحان۔ ۴ دوام۔

اور جیسا تمھارا پرتاب سُنتی تھی سو درشٹ میں آیا اتنی بات سُن راجہ پہُر شکہ میں آیا۔ دوسرے دن اتنی فوج لے کاما نگری پر چڑھ دیا وہاں کے راجہ سے جُدھ کیا اُس راجہ نے ہار مانی اور قبول کیا کہ ہم کام کندلا کو بھیجدیں گے اور یہ جو ہم نے جُدھ کیا سو آپ کے درشن کے واسطے اور اس لئے کہ کسی طرح ہمارے نگر میں آپ کا چرن پڑے۔ آگے راجہ سے ملاقات کر کے وہ راجہ اپنے مندر میں لے گیا بہت بھینٹ آگے دہر کام کندلا کو بلا راجہ کے آگے کھڑی کی اور اس نے بھی مادھو کو بلا کام کندلا کا ہاتھ پکڑ حوالے کیا پھر وہاں سے کوچ کر اپنے نگر میں آئے مادھو کو بہت دھن دولت دے بدا کیا۔

محمد بخش مہجور

نورتن

(سنہ ۱۸۱۴ء)

پھر تو چار عورتیں ایک عورت کے لاشۂ بے سر پر اوس کے چشم و دندان و لب کا
بیان کرتی تھیں اون میں سے تین عورتوں نے اپنے کہے کا بادشاہ کو نشان دیا اور
اپنا رستہ لیا اور چوتھی عورت بادشاہ کی قید میں رہی اور ایک سال کے بعد جو
کہا تھا وہ کر دکھایا اور دانائی سے بھاگ کر بادشاہ کو خجلت دی۔

دانایانِ جہان اور عاقلانِ زمان بالائے کاغذِ فطرت یہ حکایت پُر فراست یوں رقم کرتے ہیں کہ ایک عورت بدخصلت کا سر کسی سردار باحیا نے کٹوا کے کہیں پوشیدہ دفن کیا اور اوس کے دھڑ کو چار سو بازار شہر غدار میں پھکوا دیا یہ خبر وحشت اثر جو بادشاہ عالم پناہ کو پہنچی تو کوتوال بدخصال کو ابلاغ حکم کیا کہ اس لاشۂ بے سر کے پاس جو اشخاص آ کر تیغِ زبان سے گل کتریں اوس کی خبر بہر دش ہمارے قریب خبر دہندان صبا رفتار کے ہاتھ جلد پہنچے۔

الحاصل ایک تجار عالی وقار کی چار بیٹیاں غیرت گلزار ایک رتھ پر سوار چار سوے بازار میں ہو کر نکلیں ایک ازدحام خاص و عام کا وہاں دیکھ کر وہ سبھی نظارہ کناں ہوئیں یہ ماجرا حیرت افزا وحشت انتہا دیکھ کر ایک جادو چشم اون میں سے بول اوٹھی کہ یہ عورت بدخصلت معلوم ہوتی ہے کہ سُرمہ خوب لگاتی ہو گی یہ کلام حیرت التیام دوسری رشک پری سن کر کہنے لگی "واقعی لیکن لالہ رو بد خو پان بھی انو پان سے افزوں کھاتی ہو گی" یہ بات عجائب نہایت مُنکر تیسری خجلت دہ کبک دری جواب دہ ہوئی کہ یہ تیرہ بخت مسّی بھی نہایت اچھی لگاتی ہو گی یہ سخن پر فن اوس کا گوش زد کر کے چوتھی یوں حرف زن ہوئی کہ "اس کمبخت بدبخت نے کیا اور کہ بجانا" اشعار

جو ہوتی اسے عقل تو یہ بلا — نہ ہوتی گرفتارِ رنج و بلا
دیا ہے خدا نے جنھیں کچھ شعور — نہیں اون سے ہوتا ہے ایسا قصور

یہ باتیں وہ نیک ذاتیں کہہ کر تو اپنے گھر کو روانہ ہوئیں اور یہ خبر وحشت اثر مخبران صادق اور محرران واثق کی زبانی بادشاہ کو پہنچی کہ فلانے سوداگر پری پیکر کی چار بیٹیاں، غیرت مہر درخشاں، رشک ماہ تاباں اس طرح کا کلام حیرت التیام کر گئی ہیں۔

المطلب بادشاہ عالی جاہ نے اون چاروں کو طلب فرما کر کہا کہ تم اپنے اپنے سخن کا جواب باصواب دو یعنی بے سر عورت کو تم نے کیونکر جانا کہ یہ مسّی اور سُرمہ خوب لگاتی ہو گی اور پان بہت کھاتی ہو گی یہ کلام بادشاہ عالی مقام کا گوش زد کر کے ایک جادو نگاہ سحر بیان جواب دہ ہوئی کہ

اس کنیز ناچیز کے شعور بے قصور نے اوس تیرہ بخت کے گوشۂ چادر میں سرمے کی سیاہی دیکھ کر دریافت کیا تھا اور دوسری رشک پری سے جو پوچھا کہ تجھ سرخ فام گل اندام نے کیونکر جانا تھا کہ وہ لالہ رو بہت پان کھاتی ہوگی وہ شعلہ خو جواب دہ ہوئی کہ پیرو مرشد اکثر جا پڑا اوس کے ڈوپٹے میں پیک کی افشاں نمایاں تھی اور تیسری خجلت دہ کبک دری سے بادشاہ جمجاہ نے پوچھا کہ تو نے کس طرح دریافت کیا کہ وہ سیاہ بخت مسّی خوب لگاتی ہوگی۔ وہ جواب دہ ہوئی کہ حضرت سلامت اوس کے ڈوپٹے کے آنچل میں جو دھڑی پوچھنے کا نشان بگمان تھا اوس نے میرے گوش ہوش میں خبر دی تھی اور چوتھی فتنی سے جو پوچھا کہ تو جو کہتی تھی کہ گیا اور کہ نجانا اوس کے کیا معنی ہیں سچ کہہ نہیں تو تیرا کہا تیرے آگے آئے گا، وہ زبان چالاک سفاک جوابدہ ہوئی کہ خداوند نعمت اگر اوس کو شعور و وقوف ہوتا تو اس بلا میں کیوں گرفتار ہوتی اور عقلمندی اور دانائی کے تو یہ معنی ہیں کہ کرے اور کر دکھائے یہ سخن پرفن بادشاہ نے اوس کا شکر اون تلینوں کو بصد بشاشت رخصت کیا اور اوسے ایک پختہ کوٹھری میں مقید کر کے یوں کہا کہ اے فتنی دیکھیں تو تو کیونکر کر دکھاتی ہے۔ نظم

اگر تجھ میں ہے کچھ فراست کا زور   تو پیدا یہاں کر کوئی اپنا زور

نہیں تو اسی قید میں تیری جان   کروں گا میں برباد اے بدزبان

القصہ اوس زن پرفن کو مقید کر کے ایک کوزہ آب دو پارچۂ نان اپنے ہاتھ سے دینا مقرر کیا اور گاہے یہ سخن بھی پوچھتا کہ کیوں ری فتنی جہان میں کون چیز لذیذ ہے تو وہ جگر کباب چشم پر آب جواب دہ ہوتی کہ خداوند نعمت جہاں بے نشان میں رنڈیوں کو مرد نہایت عزیز اور لذیذ ہیں تو بادشاہ جواب دہ ہوتے کہ اے فتنی سب رنڈیوں کو میسّر ہوگا لیکن تجھ ناکام تلخ کام کو نہ بہم پہنچے گا وہ کشتۂ یاس بلا وسواس کہتی کہ آپ سچ فرماتے ہیں لیکن اللہ کو سب قدرت ہے چنانچہ کہتے ہیں میر حسن۔ شعر

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو

کہ آیا ہے قرآں میں لاتقنطوا

الغرض اوس زن پرفن نے بہر صورت اپنے دوست نیک سیرت کو یہ پیغام بھیجا کہ اے یار جانی و اے مایۂ زندگانی یہ خانہ خراب جگر کباب اس عذاب منجلاب میں ہے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے لیکن میری رہائی اس دانائی سے ہوتی ہے کہ ایک سرنگ بہر رنگ حسب دلخواہ اے رشک ماہ میرے قید خانے سے اور اپنے مکان دلستان تک طیار کرا کے میں سمجھ لوں گی۔ المطلب اوس سوداگر خوش منظر نے ایک سرنگ بیدرنگ خاطر خواہ بنوائی غرض ایک روز وہ غم اندوز اوس سرنگ کی راہ اوس رشک ماہ کے قریب جا کر یہ گفتگو درمیان لائی کہ اے یار دمساز و اے غمخوار ہمراز بالفعل تو کچھ جواہر زواہر تحفہ و نادر بادشاہ عالی جاہ کو نذر گذران اور بعد صفائی آشنائی پیدا کر کے اپنے گھر میں بطریق ضیافت طلب کر پھر جو کچھ ہونا ہوگا ظہور میں آجائے گا الغرض وہ سوداگر پری پیکر یوں ہی عمل میں لایا مگر بادشاہ جمجاہ کو اوس سوداگر خوش منظر سے اس قدر محبت بہم پہنچی کہ اگر اوس کے متاع حسن کو دیدۂ میزان میں ایک روز نہ وزن کرتا تو جنس بے قراری کا نرخ بڑھ جاتا۔ بلکہ سودا پورا ہو جاتا اور آٹھ پہر ہنگامۂ بازار شوق مافوق کا گرم رہتا۔ نظم

غرض ایسی بڑھی دونوں میں الفت   رہنے تھے ہمیشہ بے کدورت

کبھی اوس پاس وہ شہ آپ جاتا   کبھی اپنے بھی گھر اوس کو بلاتا

الحاصل اس عرصے میں اوس زن پرفن نے اس سوداگر خوش منظر سے خفیہ خفیہ نکاح کر لیا بعد انقضائے چند ایام نیک انجام اوس زہرہ جبین لعبت چین کے ایک طفل رشک مہر درخشاں غیرت ماہ تاباں متولد ہوا لیکن وہ زن اوس طفل کو دائیوں کی آغوش میں دے کر آپ اپنے قید خانے میں آ بیٹھی اور جس وقت بادشاہ دیوان خاص میں رونق افروز ہوتے تو وہ سرنگ کی راہ گراہ سے پھر اپنے خانۂ مطلب میں جا کر

زینت بخش ہوتی اس عرصے میں جب چھٹی کا وقت عشرت اندوز جلوہ گر ہؤا تو وہ ماہ پیکر اوس سوداگر سے کہنے لگی کہ آج تو بادشاہ عالی جاہ کو مہمان خانے میں برائے ضیافت طلب کر اور میرے ہاتھ سے لڑکے پیدا ہونے کی نذر دلوا دیکھ تو لطف فطرت سے کیسا طفل حرفت پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اوس سوداگر خوش منظر نے بادشاہ عالی جاہ کو اپنے گھر میں بلوا کے اوس زن پُرفن کے ہاتھ سے نذر حرفت دلوائی اوس طفل کو بھی آغوش بادشاہ میں دیا اور یہ سخن زبان پر لایا کہ خداوند نعمت اس کنیز ناچیز کی نذر قبول بے عدیل ہو لیکن بادشاہ اوس عورت پر فطرت کو دیکھ کر نہایت متعجب ہو کر گرداب حیرت و سکوت میں مستغرق ہو گیا بعد شناوری بحر حیرانی ساحل گفتگو سے ہمکنار ہو کے یہ دل میں کہنے لگا کہ یہ تو وہی عورت پر فطرت صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس کو میں نے جید مقید کیا ہے۔ شعر

یہ نہیں معلوم کیا اسرار ہے

یا مری ہی عقل کج رفتار ہے

پھر سوچ کر کہنے لگا کہ میں نے تو اوس کو ایسی جا مقید کیا ہے کہ وہاں فرشتے کو بھی دخل نہیں اور اس کے سوا میں وہیں قید خانے میں اوس کو مقید چھوڑ آیا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت ماہ طلعت کی صورت اوس کی صورت سے نہایت ہم شباہت ہے لیکن یہ بات عجائبات بادشاہ کے دل میں گرہ ہوئی اس خیال کثیر الاختلال میں بادشاہ وہاں سے اوٹھ کر اپنے مکان دلستان میں رونق افروز ہؤا اور وہ زن پُرفن بھی سرنگ کی راہ سے جھٹ پٹ اپنے قید خانے میں آبیٹھی اور بادشاہ نے اوس کو جو اُسی قید خانے میں دیکھا تو وہیں بیٹھا پایا الغرض وہ زن پُرفن بھی فن کرتی رہی کہ جب بادشاہ سوداگر کے پاس جاتا تو آپ بھی سرنگ کی راہ گمراہ سے جا کر مقابلہ کرتی اور جب گھر میں وہ تشریف فرما ہوتا تو اپنے قید خانے میں آبیٹھتی لیکن بادشاہ اس احوال پُرملال پر نہایت حیران و ششدر رہتا پر سوداگر آئینہ رو کی آشنائی بصفائی نبھی جاتی تھی کبھی دل پر غبار نہ آتا تھا۔

الغرض ایک روز اوس زن پُرفن نے اپنے سوداگر سے کہا اے عزیز باتمیز آج تو بادشاہ جمجاہ کے پاس بلا وسواس جا کر یہ بات کہنا کہ میری ہمشیر زادی کی شادی کدخدائی کل کی تاریخ مقرر ہے لیکن وہ مکان رشک گلستان اس شہر مینو چہر سے دس منزل کا ہے اور میری طلب کو وہاں سے قاصد مہینے کے قریب ہؤا ہے کہ روانہ ہؤا مگر نامساعدی وقت سے اوس کمبخت کو ناگاہ راہ میں اس قدر بیماری ہوئی کہ وہ یہاں تک آنے کو وقت رہا بارے اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے جو شفا پائی تو وہ بے ہراس آج میرے پاس آیا ہے سو میں اب اس بات سے نہایت حیران و پریشان ہوں کہ کل کا روز دل افروز شادی کا معین ہے اور مجھ کو خبر فرحت اثر آج پہنچی۔ شعر

کیا کروں آہ سخت حیران ہوں

گر نہ واں جاؤں تو پشیمان ہوں

سوائے خداوند نعمت نیر حشمت میری عروس تجویز کو حنائے اجابت سے یوں رنگین کیجئے کہ حضور پُرنور میں جو سانڈنی سو کوس کے دھاوے کی ہے عنایت و کرامت فرمائیے تو میں وہاں ایک روز میں پہنچ کے مہمانوں کے ہم پہلو ہوں اور اگر خدانخواستہ میرا وہاں جانا نہ ہوگا تو حنا یگانگی ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اے عزیز باتمیز اگر تجھ کو وہ سانڈنی دیگا تو پھر میں اپنے توسن طبع کی چالاکی تجھ کو دکھا دوں گی"۔

المطلب وہ سوداگر عیار حسب ایمائے زن پُرفن بادشاہ کے پاس جا کر وہ قصہ پرفریب اور افسانۂ عجیب بیان کرنے لگا بادشاہ نے اوسکی گفتگو پر یاس و حسرت استماع کر کے داروغۂ اشتر خانہ کو طلب فرما کے ارشاد کیا کہ ہماری وہ سانڈنی لیلی نژاد کہ جو سو کوس تک جانے میں پہلو تہی نہیں کرتی اوسکی مہار سوداگر مجنوں شعار کے ہاتھ میں حوالہ کر دے بموجب ارشاد عالی وہ داروغہ ذہن سے خالی وہی سانڈنی جو اوس سوداگر فتنہ گر کو دینے لگا تو اوس کا ساربان پیر ناتوان بصد آہ و فغان کہنے لگا کہ اے داروغہ اگر یہ سانڈنی صبا رفتار رشک بہار کچھ حادثے

میں گرفتار ہو جائے گی تو پھر تجھ کو خار حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا کیونکہ ایسی سانڈنی رشک پری باغ جہان میں دوسری کوئی نہیں ہے غرض وہ داروغہ یہ مصلحت نیک دل میں سمجھ کر کہنے لگا سچ ہے سخن بزرگان راست ست الغرض داروغہ شتر خانہ نے اسّی کوس کی منزل کی سانڈنی اوس سوداگر بے خبر کو دی اوس سانڈنی خجلت دہ کبک دری پر وہ سوداگر مع زن فتنہ گر اور پسر رشک قمر سوار ہو کر فرار ہو گیا اس عرصے میں بادشاہ عالی جاہ کو دریافت ہوا کہ وہ سوداگر فتنہ گر زن فتنہ افروز سے شطرنج دغا کھیل کر کرامات عیاری سے میری بازی مات کر گیا اور مہرۂ ہوش کو چارخانہ ششدر میں زچ کر گیا۔ مثنوی۔

کوئی ایسی نہیں اب سوجھتی چال	جو اوس کا توڑ دوں فرزین بند فی الحال
نہ کوئی گھوڑا ایسا ہے نہ فیل	جو اوس کو مار لوں جا کر بہ تعجیل
پیادہ ہے نہ ایسا کوئی چالاک	کہ اوس تک رخ کرے اپنا وہ سفاک

الغرض وہ شہ شاطر زمان اوس آن داروغۂ شتر خانہ کو طلب فرما کے کہنے لگا کہ کوئی اور بھی سانڈنی رشک پری ہمارے شتر خانہ میں سو کوس کے دھاوے کی ہو تو جلد لا ہم تجھ کو انعام بے بہا دینگے یہ کلام بادشاہ عالی مقام کا سُنکر وہ کہنے لگا کہ سچ ہے بڑے بوڑھوں کا کہنا ماننا مصلحت نیک ہے وقت پر کام آرہتا ہے آخر اوس کی بات کام آئی اگر آج یہ سانڈنی اوس کے حوالے کر دی ہوتی تو نہایت پشیمانی کھینچنی پڑتی۔

المدعا وہ سانڈنی چالاک بادشاہ غمناک کے قریب لا کر حاضر کی وہ بادشاہ جمجاہ اوس پر سوار ہو کر مثل صبا فر فر روانہ ہوا اس عرصے میں جب بادشاہ عالی جاہ کی سانڈنی سوداگر اور زن پر فریب کے قریب پہنچی تو ایک بار بادشاہ عالی مقدار نے للکار کر کہا کہ اے زن پُرفن اب تو میرے ہاتھ سے جانبر کہاں ہو سکتی ہے یہ سخن دلشکن وہ زن پُرفن سُن کر کہنے لگی خدا خیر کرے ہماری سانڈنی پُر دغا ہے مگر کیا مضائقہ ہم اپنے طعام فطرت کا بادشاہ کو مزا چکھا دیں گے الغرض جب اوس سوداگر اور زن فتنہ گر کی سانڈنی اسّی کوس کی منزل پر پہنچی تو یکایک اوس کی طاقت نے پہلو تہی کر کے اوس صحرائے ہولناک میں مقام کیا وہ زن مکار اور سوداگر عیّار مع پسر رشک قمر اوس سانڈنی کی پشت پر سے اوتر کے سامنے ایک باغ پر فراغ تھا شکل نسیم سبک رو اوس کی طرف روانہ ہو کر دونوں اوس باغ کے دروازے کے ایک ایک پٹ کی اوٹ میں بزور بازوے دانائی جھٹ پٹ روپوش ہو گئے۔ اس میں بادشاہ جمجاہ نے جو آ کر ملاحظہ فرمایا کہ وہ دونوں ناپاک بیباک اوس باغ میں پوشیدہ ہیں اپنی سانڈنی پر سے اوتر کر باغ کے اندر بے تحاشا یہ کہتا چلا۔ شعر

اب کہاں ہاتھ سے جاتی ہے مری وہ ناپاک	ایک ہی ہاتھ میں تلوار کے کرتا ہوں ہلاک

یہ کہتے کہتے وہ بادشاہ تو باغ کے اندر مکانات عجائبات میں ڈھونڈھنے لگا اور یہ دونوں پُرفن پٹوں کی اوٹ سے جھٹ پٹ نکل کر بادشاہ کی سانڈنی پر سوار ہو کر وہ زن مکار پکار پکار کر یوں کہنے لگی کہ اے بادشاہ غفلت پناہ کیا اور کر دکھایا" اسے کہتے ہیں۔ مثنوی۔

یہ کہہ کر وہاں سے وہ زن نابکار	بہ شکل ہوا ہو گئی جب فرار
تو دست الم مل کے وہ بادشاہ	لگا کہنے میں بے اجل مر گیا
مرے پاؤں میں اب یہ طاقت کہاں	جو گھر تک پہنچ جاؤں بےخوف جاں
غرض بادشہ تو روتا رہا	مگر ہو گئی وہ وہاں سے ہوا
جو مجبور ہوتی نہ وہ باشعور	تو اوس وقت میں قتل ہوتی ضرور

رجب علی بیگ سرور

فسانۂ عجائب

(۱۸۲۴ء)

حکایت پسر مجسٹن۔ بیٹے کا پیدا ہونا سفر کی کیفیت جہاز کی تباہی شہزادی کا ملنا پھر مفارقت مجسٹن کا ساتھ جانا۔

ایک شخص تھا مجسٹن نام نہایت اہل دل، مرفہ حال، صاحب علم و فضل، جامع ہر کمال طبیب اور ادیب بے بدل۔ سخن سنج، لطیفہ گو بر محل کمالات میں یگانۂ روزگار، تجارت میں نامور ہر دیار۔ سو سو جہاز ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ نصیب ایسا تھا مٹی کو چھوتا سونا ہاتھ آتا تھا۔ کسی طرح کا حاجت مند بجز فرزند ارجمند نہ تھا شب و روز اسی کا خیال تھا۔ مدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش قسمتوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا حسب دلخواہ۔ صورت میں غیرت ماہ۔ بہت شاداں سرگرم پرورش تھا۔ جب بارہ برس کا ہوا بسبب طبع رسا و تعلیم استادان باذکا جمیع علوم اور فنون میں کامل ہوا درس دینے لگا۔ مطب کرنے لگا۔ چودھویں سال باپ سے سفر کی اجازت چاہی کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔ مجسٹن نے کہا اپنا ابھی یہی قصد تھا مگر چندے توقف شرط ہے۔ اس نے عرض کی حضور عمر طبعی کو پہنچے۔ مسن ہیں۔ فدوی کے سیاحت کے دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بقیہ حیات سفر کر جاؤں، جودت طبع دکھاؤں۔ آخر مجسٹن نے دس بارہ جہاز پُر متاع و مال پندرہ بیس رفیق قدیم دیانت دار امانت شعار ہمراہ کر رخصت کیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے دو مہینے کے بعد ہوائے جور گردوں سے جہاز تباہ ہو گئے۔ مجسٹن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوبا یاران ہمراہی عالم بقا کو راہی ہوئے۔ یہ ایک تختے پہ ڈوبتا اچھلتا بہ چلا۔ حیات مستعار باقی تھی ساتویں دن تختہ کنارے پر لگا۔ اس کو غش سے جو افاقہ ہوا تختے سے اترا اور گھانس کی رسی بنا وہ تختہ پتھر سے اٹکا دیا۔ پھر آپ تبلاش آب و دانہ روانہ ہوا۔ چند قدم بڑھا تھا کہ شہر نمودار ہوا آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجب سانحہ طرفہ ماجرا نظر آیا۔ دکان ہر ایک کھلی اشرفی روپیہ کا ڈھیر اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتہ مفقود اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنس بشر سے خالی ہے۔ شہر کا وارث ہے نہ والی ہے۔ پھرتا پھراتا قلعہ میں آیا دیکھا باغ سرسبز پُر میوہ، بیچ میں بنگلہ، زربفت کے نفیس پردے پڑے، پردہ اٹھا۔ بنگلے میں آیا۔ پلنگ جواہر نگار گستردہ، اس پہ کوئی بشکل مردہ، ڈوپٹہ تانے، نہ کوئی پائنتی نہ سرہانے، پڑا ہے۔ اس نے دوپٹہ سرکایا۔ عورت نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی صورت دیکھ کر کہا اے عزیز اپنی جوانی پہ رحم کر یہ مکان مہبط سیل فنا ہے، تو ناآشنا ہے۔ اس لئے درگذر و گرنہ آفت

کا مبتلا ہوگا۔ خدا جانے ایک دم میں کیا ہوگا اس نے کہا ایسا ماجرا کیا ہے۔ بیان تو کر عورت نے کہا تو پہلے اپنے آنے کا حال سنا کیونکہ آ پھنسا۔ اُس نے کہا سات دن سے بھوکا پیاسا ہوں جو کچھ کھاؤں تو داستان پریشان سناؤں۔ عورت بولی مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے۔ سو کھانا یہاں کہاں بجز غم کھانے اور پانی سوا اشک بہانے کے، آنسو پینے کا نام ہے۔ اس سے نہیں پیتی ہوں، اور کھانے کی قسم ہے قسم تک نہیں کھاتی ہوں۔ متحیر ہوں کیونکہ جیتی ہوں۔ مگر تنہائی میں ہاں خوف کھا کے روز دن بھرتی ہوں۔ ہر شب کہ شب اولین گور ہے جانکنی رہتی ہے۔ سخت جانی کی بدولت نہیں مرتی ہوں۔

تو اس باغ میں جا اور جس میوے پر رغبت ہو کھا۔ محسٹن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا۔ نہر سے پانی پیا گو نہ رنج فاقہ کشی سے افاقہ ہوا۔ پھر عورت کے پاس آ کے حسب و نسب اپنا اور باعث سفر اور جہاز کی تباہی مفصل سرگذشت سنائی۔ پھر اس کا ماجرا پوچھا وہ بولی اے شخص اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں۔ باپ میرا والی ملک تھا مجھ کو سوائے سیر و شکار کے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ ایک روز لب دریا مصروف تماشا بیٹھی تھی دفعتہً ایک سانپ نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے تیر مارا معلوم نہیں لگا یا خطا کر گیا۔ پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب بشکل عجیب پھنکارتا ہے۔ میں تو گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی۔ جو جو ہمراہ رکاب تھے وہ طعمۂ دہن مار خونخوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں۔ ساکنان شہر مع بادشاہ انسان سے تا حیوان کوئی نہ بچا۔ فقط میں سخت جان باقی ہوں اور یہ صحبت ہے کہ قریب شام وہ مار خون آشام آ کر اس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے اسی باغ سے میوہ کھا پانی پی لیتی ہوں۔ اس خرابی سے جیتی ہوں کوئی غمخوار بجز ذات پروردگار نہ تھا۔ آج تجھے دیکھا خوف خدا آیا مطلع کر دیا پسر محسٹن نے کہا خاطر پریشان جمع رکھ۔ اگر فضل الٰہی شریک حال ہے تو اس آفت سے جلد نجات ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر جہاں سانپ کے بیٹھنے کا نشان تھا، وہاں گڑھا کھودا۔ قلعے سے بارود لا کر اس میں بچھائی اور دور تک نقب سی بنائی۔ پھر گھاس بھری اس پہ جمائی۔ شہزادی نے کہا اب وہ آتا ہی ہوگا۔ یہ سُن کہ سر نقب جا پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا کہ دفعتہً وہ افعی پُر زہر خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اُس سبز قدم نے فرش زمردیں پایا۔ بہت خوش ہو کر بیٹھا۔ یہ تو تاک میں تھا پتھر سے آگ نکال اُس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھما کا پیدا ہوا۔ وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پہ پہنچا۔ دونوں نے شکر کا سجدہ بدرگاہ دافع البلیات کیا باہم بے اندیشۂ غم رہنے لگے سات برس تک دونوں ساتھ رہے اس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے ایک دن رنج تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔

کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ شہر آباد ہو خاطر غمگین شاد ہو وہ بولا کہ اگر وطن جاؤں اور محسٹن کو یہاں لاؤں تو یہ بستی بسے عورت نے کہا اکیلی میں کیونکر بسر کروں گی میں بھی ساتھ چلوں گی آخرش ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کے چل نکلے قضا را وہاں پہنچے جہاں تختہ بندھا تھا ذہن میں آیا اسی پہ سوار ہو کھلا دکھیں تو جا نکلو گے یہ سوچ کر دونوں سوار ہوئے وہ تختہ کھولنے لگا شہزادی بولی مال و اسباب تو اس قدر ہے کہ بیان قاصر ہے مگر ایک ناریل اکسیر سے بھرا ہے دولت لا انتہا ہے جو تو اجازت دے تو اُسے لے آؤں۔ مصرع

بدو نزد طمع دیدۂ ہوشمند۔

محسٹن کے بیٹے نے کہا اچھا وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یونہی رہا شہزادی لڑکا لیے اُتری اُس کے اُترتے ہی ایسی تند ہوا چلی کہ رسی تکان سے ٹوٹ گئی تختہ بہہ چلا ہر چند اس نے ہاتھ پاؤں مارے وہ ساحل مطلب سے کنارے ہوا کنارے پہ شہزادی بحال خراب دریا میں وہ بادل کباب ہو نکلا دل سے کہتا تھا دیکھئے مرضی ناخدائے کشتی بادبان شکستہ کیا ہے یہ حجونکا ہوا لئے قوم عاد کا ہے اس سوچ میں تھا کہ ایک جہاز نمودار ہوا اہل جہاز نے دیکھا تختے پہ کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لئے بہا جاتا ہے رحم کھا نپسوئی کو دوڑا جہاز پہ لیا اتفاق زمانہ مالک جہاز محسٹن کا دوست و مساز تھا اس کو پہچانا بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا برس روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا جہاز کا حاکم محسٹن کی ملاقات کو آیا بچھڑے بیٹے کو باپ

سے ملا یا یہاں جس دن سے جہاز کی تباہی محبسٹن نے سن پائی تھی غریق لجۂ غم تھا بارے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بدرگاہ باری کیا پوتا کھلانے ہیں ملا اور کلمات شکر یہ اُس سے کرنے لگا اُس نے کہا بندہ پرور خیر ہے دنیا اسی کا نام ہے جس کا کام جس سے نکلے وہ فخر و سعادت سمجھے بعد چند روز محبسٹن نے بیٹے سے روئداد سفر پوچھی اُس نے ابتدا سے انتہا تک سرگزشت سب بیان کی یہ سُنکر سمجھا مشکل پیچ پڑا مگر سہل سا یہ جواب الخیر فی ما وقع خیریت اسی میں تھی جو ہوا۔

مصرعہ

بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد

بیٹے نے کہا مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلئے ایسا ملک مالا مال یہ دولت لازوال ہاتھ سے نہ دیجئے محبسٹن نے کہا خیر ہے یہ بھی ایک فسانہ تھا جو میں نے سُنا اور خواب تھا جو تو نے دیکھا۔ لا اعلم

ایام وصال و صحبت سیم تناں

در عالم خواب احتلام شد و رفت

اُس نے کہا آپ سا عقلمند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے دنیا میں تین معرکے ہیں زر، زمین، زن یہ سب سامان جمع ہیں اگر آپ نہ جائیں گے فدوی تنہا جائے گا۔ محبسٹن نے کہا افسوس ہم تجھے دانا جانتے تھے الا ہماری نادانی تھی حمق کی مقتضی تمہاری جوانی تھی اے بھائی کوئی نادان سے نادان عورت کی بات کا دھیان نہیں کرتا یہ باتیں جب تک تھیں جو تم اور وہ باہم تھے وہ مونس تھی تم ہمدم تھے اب خیریت ہے۔ سعدی:-

زن دوست بود دلے زمانے | تا جز تو نیافت مہربانے
چوں در بر دیگرے نشیند | خواہد کہ ترا دگر نہ بیند

مصرعہ

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

ہر چند اُس نے مغز خالی کیا یہ مقدمہ اُس پر خالی کیا وہ بے مغز نہ سمجھا۔

مصحفی

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو | میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

ناچار محبسٹن نے کہا تم جب تک ذلت نہ اُٹھاؤ گے اور ہمیں خراب نہ کرو گے اس حرکت بیجا سے باز نہ آؤ گے نہ چین لو گے اُسی دن سامان سفر درست کیا بہت سے جہاز مع اسباب اور چند شمشیر خوش تدبیر ہمراہ لے روانہ ہوا چند روز میں وہ جزیرہ ملا جہاز وہیں کو لنگر ہوا محبسٹن کا بیٹا اُترا مگر جہاں ویرانہ بوم و غول کا آشیانہ تھا وہاں بستی دیکھی اور جس جگہ بیہڑ تھا اُسے ہموار پایا بلندی نظر آئی نہ پستی دیکھی آدمی ہر سمت سرگرم کار و شہر پناہ تیار اُسے تعجب ہوا سمجھا کہ میں بھول گیا کسی سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے والی ملک کونسا ہے وہ بولا مدت سے یہ ملک بسبب آفت آسمانی اجاڑ ہو گیا تھا رعایا برایا بلکہ بادشاہ بھی نہ بچا تھا فقط بادشاہ کی بیٹی باقی تھی اب برس دن سے اُس نے شوہر کیا ہے شہر از سر نو آباد ہوا مناظر نو ایجاد ہوا یہاں مفسد ہے نہ ڈنڈی ہے نام اس کا شہزادی منڈی ہے محبسٹن نے یہ ماجرا سُنکر بیٹے سے کہا خوش بہت ہوئے ہوگے لو سیدھے پھر چلو اُس نے کہا اتنی صعوبت سفر کی اُٹھائی اُس کی صورت بھی نظر نہ آئی دو باتیں کر لوں تو پھر چلوں محبسٹن نے کہا یہ مصیبت کچھ نہ تھی جو بات کرنے میں ایذا اُٹھے گی وہ کب مانتا تھا انھیں لوگوں سے پھر پوچھا شہزادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے وہ بولے روز غرضکہ سواری کا وقت دریافت کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے سر راہ کھڑا ہوا کہ شہزادی شبدیز کو مہمیز کرتی آ پہنچی یہ پکارا ہم نے ایفائے وعدہ کیا حاضر ہوئے اور لڑکا بھی فضل الٰہی سے سلامت موجود ہے کیا ارشاد ہوتا ہے اُس نے بیگانہ وار جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے ملاحظہ کیا مگر جواب کچھ نہ دیا چلی گئی

یہ خفیف گھر پھرا مجسٹن نے حال پوچھا بولا ملاقات نہ ہوئی کل پھر جاؤں گا اُس نے کہا صبح کا جانا روز الم شام غم دکھائے گا بہت پچھتائے گا اُس نے دوسرے روز بیٹے کو سکھایا کہ جب سواری قریب آئے گھوڑے سے لپٹ جانا اور یہ زبان پر لانا کہ دُنیا کا لہو سفید ہو گیا مہر مادری سے محبت پدری میں لطف زیادہ پایا کہ ہمیں ساتھ بآرام تمام لئے پھرتا ہے تم بات بھی نہیں کرتی ہو بلکہ پہچانتی نہیں جب سواری قریب آئی یہ تو بہت جلا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ کھیل تو بگڑ گیا کہا شہزادی باگ کو روکو وہ خود تو رکی تھی باگ بھی رک گئی پسر مجسٹن بولا۔

مؤلف

یاد ایام کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے ‏ ‏ ‏ ہوتی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے ‏ ‏ ‏ مکر تھا یاد خبر تھی نہ بہانے سے تجھے
بے دھڑک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا ‏ ‏ ‏ ہمیں ہم تھے تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا
کبھی چوٹی کی خبر تھی نہ تھا کنگھی کا خیال ‏ ‏ ‏ بارہا اُلجھے سے رہتے تھے ترے سر کے بال
پان کے لاکھے سے اور مسی سے ہوتا تھا ملال ‏ ‏ ‏ مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گذرا نہیں سال
ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم ‏ ‏ ‏ دفعتہً سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم
تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خلطا سب سے ‏ ‏ ‏ گرمجوشی کا بھلا کب تھا یہ ڈھب کا سب سے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے ‏ ‏ ‏ تجھ کو لگ چلتے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب سے
اجتو ٹی میں کیا چھید غضب تو نے کیا ‏ ‏ ‏ کھل گیا سب پہ ترا بھید غضب تو نے کیا
شکر صد شکر ہوئی جلد رہائی تجھ سے ‏ ‏ ‏ اب تو تا حشر مکدر ہے صفائی تجھ سے
وضع اپنی نہیں کیا کیجئے برائی تجھ سے ‏ ‏ ‏ نہ ملیں پہ جو کہے ساری خدائی تجھ سے
بخدا ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے ‏ ‏ ‏ خوش رہو تم کہ نہیں کھول کے دل رو بیٹھے
اب قسم کھاتا ہوں دل نہ لگاؤں گا کبھی ‏ ‏ ‏ ذلت و رنج نہ اس طرح اُٹھاؤں گا کبھی
گر طرحدار بھی اس دہر میں پاؤں گا کبھی ‏ ‏ ‏ رابطہ تو کیا ہے نہ میں پاس بٹھاؤں گا کبھی
موسم اب دل کے لگانے ہی کا جاتا نہ رہا ‏ ‏ ‏ ربط کیا خاک کریں ہم وہ زمانا نہ رہا
یہ زباں یاروں کے یہ ذکر رہے گا ہر بار ‏ ‏ ‏ گو کہ عاشق تھا مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
دیکھ بد وضع کیا دیکھئے ایسا انکار ‏ ‏ ‏ مر ٹپک مر گئے سب پہ نہ ملا وہ زنہار

کرے معشوق کسی سے تو دغا ایسی کرے
پچ کیسے بات کی عاشق تو بھلا ایسی کرے

یہ سن کر وہ شرمندہ ہوئی پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا بیچارہ نادان باتوں کا سود و زیاں کچھ نہ سمجھا جو کچھ باپ نے سکھایا تھا کہنے لگا جب کہہ چکا شہزادی نے تلنچہ قبور سے کھینچ لڑکے پر پھونک دیا وہ دھم سے گر پڑا دایہ اجل نے کنار عاطفت میں اُٹھا لیا اہل قبور سے ملا دیا پھر باگ اُٹھا چل نکلی مجسٹن نے بیٹے کے بہت خاک اُڑائی بیٹے کی لاش باپ کو دکھائی اُس نے کہا کیوں جو ہم نے کہا تھا وہی آگے آیا وہ بدنصیب بولا صبح اختتام ہے جو ہونا ہے ہو جائے گا مجسٹن نے کہا تو اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا دم سحر جب وہ چلا مجسٹن کا جی نہ رہ سکا ساتھ ہو لیا جس دم شہزادی کی سواری پاس آئی باگ پکڑی ہنوز زبان نہ ہلائی تھی شہزادی نے کہا اے مجسٹن ہم نے سُنا تھا کہ تو مرد جہاندیدہ و سرد و گرم روزگار

چشیدہ و تجربہ رسیدہ ہے مگر افسوس بایں ریش فش تو نے سنا نہیں ۔ لا اعلم

زحادثات جہاں بس ہمیں پسند آمد
کہ خوب و زشت و بد و نیک در گذر دیدم

اس پیرانہ سالی میں تجھ پہ ہزار سانحے گذرے ہوں گے کچھ الم و رنج کا مزا پایا فرحت و خوشی کا نشہ باقی ہے اے نادان دنیا میں کس بات کو یاد کیجئے کس کا غم کس سے خاطر شاد کیجئے اگر عقل رسا یا کچھ فہم و ذکا ہو تو دنیا میں کافی ہے یہ بات گذشتہ را صلوات ۔

مصحفی

اے مصحفی میں روؤں کیا پچھلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ کہہ کر گھوڑا چھچکارا کہ پھر بسلسلہ جنبائی اس امر بے معنی کی موجب حضرت جاننا مجسٹن نے بیٹے کو سلام کیا اور نہ کچھ کلام کیا وہ بھی نطفہ ضعیف کا پیدا بوڑھے باپ کا بیٹا تھا مجوب وطن پھر اجیتے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی ۔

الف لیلہ

سونے جاگتے کی حکایت

الف لیلہ کی داستانیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں اور کئی بار اُردو میں بھی، مختلف اہل قلم نے، زبان کے رد و بدل سے پیش کیں۔ پیش نظر داستان کی زبان ۱۸۴۴ء کی نہیں، بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں اسے حسن علی خاں کشمیری، جعفر علی، شدید الدین خاں نے پیش کیا تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں ایک سوداگر نہایت امیر و کبیر تھا۔ اور اس کے ہاں ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام ابوالحسن تھا۔ اس سوداگر کے مرنے کے بعد ابوالحسن اس کی تمام املاک کا وارث ہؤا مال و دولت لا انتہا تھی۔ جس کو اس نے نہایت بیدردی سے صرف کیا اور اپنے دوستوں کو بھی اس قدر دیا کہ وہ سب مال دار ہوگئے۔ پھر اس تمام روپیہ کو اس نے دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصّہ سے اس قدر جائداد خریدی۔ کہ جس کی آمدنی اس کے تمام اخراجات کے لئے کفالت کرتی تھی۔ اور دوسرے نقد حصّہ میں سے خرچ کیا کرتا بہت سے دوستوں کا مجمع اس کے ارد گرد رہتا۔ دن رات ناچ رنگ مجرے اور شراب خوری اور دیگر عیش و عشرت میں گذارتا یہاں تک کہ وہ تمام روپیہ صرف ہوگیا۔ اور ابوالحسن مفلس بن گیا۔ اس کی مفلسی دیکھ کر اس کے دوستوں نے بھی اس کے گھر آنا جانا بند کر دیا یہاں تک کہ اگر وہ راہ میں مل جاتا۔ تو وہ اس سے آنکھ چرا کر نکل جاتے ابوالحسن دوستوں کی بے مروّتی اور بے حمیّتی دیکھ کر سخت حیران ہوتا اور اپنے دل میں افسوس کرتا کہ جن لوگوں کے پیچھے میں مفلس و قلاش ہوگیا، ان کے اخلاق و سلوک کا یہ عالم ہے۔

ایک دن ابوالحسن اسی فکر میں تھا کہ اس کی والدہ نے اسے پریشان خاطر دیکھ کر پوچھا کہ بیٹا ابوالحسن آج پریشان کیوں ہو۔ مجھے تو تمہاری بے اعتدالیاں دیکھ کر پہلے ہی یقین تھا۔ کہ تم جلد مفلس ہو جاؤ گے۔ افسوس تم نے اپنا تمام زر و مال نالائق دوستوں کو کھلا دیا۔ جو آج تم سے صاحب سلامت کے بھی روادار نہیں ابوالحسن والدہ کی یہ بات سن کر رو پڑا اور اپنے ان دوستوں کے پاس گیا جن پر اسے کمال اعتبار اور حسن ظن تھا اور ان سے کچھ مدد کا بصورت قرض طلبگار ہؤا لیکن ان سب نے صاف انکار کر دیا غرضیکہ ابوالحسن والدہ کے پاس واپس آیا۔ اور کہا کہ والدہ جو تم نے کہا تھا بجا تھا۔ اب میں عہد کرتا ہوں کہ کسی بغدادی سے دوستی نہ کرونگا۔ پھر کچھ مال و اسباب فروخت کر کے کچھ تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا کیا اور نہایت احتیاط سے گھر رکھا۔ اور اپنا یہ دستور ٹھہرا لیا کہ ہر روز ایک نو وارد مسافر کو اپنے ساتھ گھر لے جاتا، اس کو کھانا کھلاتا۔ اور آدھی رات تک اس سے باتیں کرتا اور فجر ہوتے ہی اس کو رخصت کر دیتا۔ اور اس سے کہہ دیتا کہ پھر کبھی میرے گھر نہ آنا غرضیکہ زیادہ ملاقات سے گھبراتا اور یہ دستور بھی اس نے اپنی طبیعت سے مجبور ہونے

کی وجہ سے بنا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ عرصہ سے دوسروں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کا عادی تھا۔ اور بلا اس کے نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ابوالحسن کسی نووارد کی تلاش میں بغداد کے پل پر بیٹھا ہوا تھا۔ کہ خلیفہ ہارون الرشید سے ملا۔ خلیفہ نے اپنی ہیئت اور لباس کو بدلا ہوا تھا۔ اور کوئی شخص بھی اس کو پہچان نہ سکتا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کی عادت تھی کہ وہ ہر رات اپنا لباس تبدیل کر کے نکلتا تھا۔ تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ رعایا کس حال میں ہے اور حکام شہر اپنے فرائض کی ادائیگی میں تو قاصر نہیں ہیں۔ غرضیکہ اس دن خلیفہ موصل کے ایک سوداگر کے لباس میں تھا۔ اور اس کے ہمراہ ایک غلام تھا۔ ابوالحسن نے جھٹ سلام علیک کر کے کہا۔

"بندہ پرور ایک رات غریب خانہ پر تشریف لا کر تناول ماحضر سے مشکور کریں"

ہارون الرشید نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور ابوالحسن کے ساتھ اس کے گھر کی جانب چلا! ثنائے راہ میں ابوالحسن نے اپنا دستور ہارون الرشید سے کہا۔ ابوالحسن اس کی بھولی بھالی باتوں پر حیران تھا۔ اور کہتا تھا کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے اسے دریافت کرنا چاہیئے۔ ابوالحسن خلیفہ کو لے کر اپنے مکان پر پہنچا۔ اور نہایت پر تکلف کمرے میں بٹھایا۔ جو ہر طرح کے شیشہ و آلات وغیرہ سے آراستہ تھا۔ پھر خود اپنے ہاتھوں سے دسترخوان بچھایا اور اس پر نہایت پر تکلف کھانا چن دیا۔ دستور عرب کے مطابق دونوں کھانے کو بیٹھے اور کھانے کے دوران میں کسی قسم کی کوئی بات نہ کی ابوالحسن اچھی اچھی چیزیں اٹھا کر اپنے مہمان عزیز کے سامنے رکھتا۔ جب دونوں کھانے سے فارغ ہو چکے تو خلیفہ کے غلام نے دونوں کے ہاتھ دھلائے۔ جب کھانا وغیرہ اٹھا لیا گیا۔ تو ابوالحسن کی والدہ نے نہایت اعلیٰ قسم کی میوہ جات سنہری طشتریوں میں لا کر ان کے سامنے رکھے شام ہونے پر ابوالحسن نے تمام شمعیں روشن کیں اور شیشہ و ساغر و صراحی اور مے ناب وغیرہ لا کر سامنے رکھ دیئے۔ پھر خلیفہ اور ابوالحسن دونوں شراب نوشی کرتے رہے۔

ابوالحسن نے اپنی والدہ سے کہدیا تھا کہ غلام کو خوب اچھی طرح کھانا کھلانا جب ابوالحسن اور خلیفہ دونوں سرور میں آ گئے تو خلیفہ ابوالحسن کی بذلہ سنجیوں سے نہایت خوش ہوا اور اس کا حسب و نسب دریافت کیا ابوالحسن نے اپنی تمام کیفیت مع دوستوں کی بے وفائی کے بیان کی اور کہا۔

"میں نے عہد کر لیا ہے۔ کہ میں آئندہ اہل بغداد سے کبھی دوستی نہ کروں گا اور نہ ان سے ملوں گا۔ کیونکہ یہ لوگ سخت بے وفا ہیں بلکہ ان کی بجائے ایک نووارد آدمی کو لا کر اس سے دل بہلاؤں گا۔ اور صبح ہی صبح اسے رخصت کر دیا کرونگا۔ جیسا میں نے راستہ میں تم سے ذکر کیا تھا"

خلیفہ نے کہا "بیشک ایسے دوستوں سے نہ ملنا چاہیئے۔ اب تمہارا وقت اچھا گذرتا ہے کہ روز ایک نئے دوست سے دل بہلاتے ہو۔ اور فجر ہونے سے پیشتر اسے رخصت کر دیتے ہو تم بڑے اچھے مزاج کے آدمی ہو۔ مجھے تو تمہاری اس خوش اوقاتی پر رشک آتا ہے"

پھر دونوں دیر تک شراب نوشی اور نہایت خوش کن باتیں کرتے رہے جب رات کچھ زیادہ گذر گئی تو خلیفہ نے کہا۔

"بھائی اب تم بھی آرام کرو اور میں بھی آرام کرتا ہوں، کیونکہ صبح منزل پر چلنا ہے اور میری خواہش ہے کہ میں تمہارے اس حسن سلوک کا عوض بھی کچھ ادا کروں۔ میں بغدادی دوستوں کی طرح نہیں ہوں"

ابوالحسن نے کہا اے میرے عزیز مہمان جو کچھ تم نے کہا میں تمہاری اس جوانمردی پر تمہاری تعریف کرتا ہوں اور تمہارا مشکور ہوں مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں جو میں تم سے بیان کروں خدا گواہ ہے مجھے کسی قسم کی ہوس نہیں اور جو تم میرے احسان کے عوض کوئی خدمت کرنا چاہتے ہو تو تمہاری طرف سے یہ کافی بدلہ ہے۔ کہ تم نے میری دعوت قبول کی اور ماحضر تناول کر کے مجھے مشکور کیا۔ اور میں

تو تمہارے غلاموں کی حیثیت بھی نہ رکھتا تھا۔ محض تمہاری بندہ نوازی تھی کہ تم میرے غریب خانہ میں تشریف لائے۔ البتہ ایک امر ایسا ہے۔ جسے میں اپنے لئے تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ مگر تم مسافر پردیسی ہو اس لئے تمہارا اس معاملہ سے کوئی دخل نہیں۔ تم جانتے ہو کہ بغداد میں ہزاروں محلے اور گلی کوچے ہیں اور ہر محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں ایک مؤذن رہتا ہے جو پانچوں وقت لوگوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے اس محلہ کا مؤذن جس میں میں رہتا ہوں نہایت شریر بد باطن اور ریاپسند ہے اور لوگ اس کی مردم آزاری سے نہایت تنگ ہیں اس کے چار دوست یا مشیر ہیں وہ اسی کی طرح مردم آزار ہیں۔ تمام محلہ کے لوگ ان سے نالاں ہیں سب ان سے ڈرتے ہیں اور خاص کر مجھے ان سے شکایت اور تکلیف ہے"۔

خلیفہ نے کہا "تم نے ان کی نسبت کیا علاج تجویز کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "علاج کیا؟ خدا سے ڈرتا ہوں کہ فقط ایک دن کے لئے مجھے خلیفہ ہارون الرشید بنا دے"۔

خلیفہ نے کہا "اگر تم ایک دن کے لئے خلیفہ بن جاؤ تو کیا کرو؟"

"جو چار اس کے مشیر ہیں۔ سو سو درے ان کی پیٹھ پر لگواؤں اور چار سو درے صرف اس مؤذن کی پیٹھ پر بطور سزا کے لگوا دوں پھر میرے دل کی حسرت نکلے اور آئندہ دوسروں کو عبرت ہو کہ جو لوگ اپنے ہمسایوں کو تنگ کرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے"۔ ابوالحسن نے کہا۔

خلیفہ ابوالحسن کی اس خواہش سے نہایت خوش ہوا اور دل میں ارادہ کیا کہ اس فعل کو اس کے ہاتھوں سے پورا کرائے پھر ابوالحسن سے مخاطب ہوا اور کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خدا تمہیں تمہاری خواہش میں کامیاب کرے خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ ایک دن کے لئے تمہیں خلیفہ بنا دے۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ خلیفہ تمہاری لیاقت سے آگاہ ہو کر ایک دن کے لئے تمہیں اپنا قائم مقام بنا دے اور تم اس صورت میں ان مفسدوں کو سزا دے سکو۔ میں تو ایک اجنبی سوداگر ہوں ورنہ جو سزا تم نے تجویز کی ہے میں ضرور انہیں دیتا"۔

ابوالحسن نے کہا "تم میری اس بات پر تمسخر کرتے ہو اگر خلیفہ بھی ان باتوں کو سن لے تو یقیناً تمہاری طرح مجھ پر تمسخر کرے"۔

خلیفہ نے کہا "کیا مجال کہ میں تم جیسے محسن پر جس نے مجھے نہایت مزیدار کھانا کھلایا۔ شراب پلائی۔ ہنسوں یا اس سے تمسخر کروں۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ خلیفہ ایسا بیوقوف نہیں کہ تمہارے اس مقصد میں حائل ہو یا اس پر ہنسے یا تمسخر اڑائے اب آدھی شب گذر گئی ہے۔ سونا چاہیئے"۔

ابوالحسن نے کہا "یہ جو تھوڑی سی شراب باقی رہ گئی ہے اسے تم پی کر سو رہو اور ہاں ایک بات کا خیال رہے اور وہ یہ ہے کہ تم صبح جس وقت یہاں سے چلو تو دیوان خانہ کا دروازہ بند کر کے جانا"۔

خلیفہ نے کہا "ہاں اسی طرح کیا جائے گا"۔

پھر ایک گلاس شراب کا پہلے خلیفہ نے آپ پیا اور دوسرا بھر کر اس میں کچھ سفوفِ بیہوشی ملا ابوالحسن کو دیا اور کہا کہ یہ آخری جام میرے ہاتھ سے پی لو۔ ابوالحسن نے فوراً آداب بجا لا کے جام شراب پی لیا اور پیتے ہی اس پر آثار بے ہوشی طاری ہو گئے۔ اور پھر وہ غافل ہو گیا پھر خلیفہ نے غلام کو بلایا۔ جو غلام گردش میں کھڑا تھا اور کہا "اس آدمی کو اپنے کندھے پر اٹھا۔ اور اس کے گھر کو اچھی طرح پہچان لے کیونکہ جب میں کہوں گا تو اسے پھر یہیں لا کر چھوڑنا ہوگا"۔ غلام نے کہا "بہتر حضور" اور ابوالحسن کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور خلیفہ کے ہمراہ محلسرائے شاہی کو چلا۔ خلیفہ اس غلام کو لئے ہوئے اپنی خوابگاہ میں گیا۔ وہاں سب خواجہ سرائے اور لونڈیاں وغیرہ جن کی ڈیوٹی تھی خلیفہ کے تشریف لانے کے انتظار میں تھے۔ خلیفہ نے حکم دیا۔ کہ اس شخص کو میرے شب خوابی کے کپڑے پہناؤ۔ اور میرے پلنگ پر لٹاؤ۔ اور صبح جس وقت یہ بیدار ہو تو

جس طرح مجھے مخاطب کیا کرتے تھے اسی طرح امیر المومنین کے نام سے اسے مخاطب کرو اور اسے میرا قائم مقام جانو۔ پھر خلیفہ نے وزیر جعفر کو بلا کر کہا۔

"صبح ایک اور آدمی ہماری جگہ تخت پر جلوس کرے گا اس کو ہمارا قائم مقام سمجھنا۔ اور ہر طرح سے اس کے لئے آداب شاہی جو میرے لئے مخصوص ہیں بجالانا اور جس کسی کو وہ سزا دے اسے سزا دینا اور جسے وہ انعام دلوائے۔ فوراً اسے انعام دینا"

پھر مسرور خواجہ سرائے کو بلا کر کہا۔

"جس طرح تو مجھ کو صبح کے وقت نماز کے لئے جگایا کرتا ہے' اس شخص کو بھی ایسے ہی جگانا"

غرضیکہ خلیفہ تمام ہدایات جاری کرنے کے بعد دوسرے مکان میں جا کر سو رہا۔ اور صبح ایک ایسی جگہ پر چھپ کر بیٹھا جہاں سے ابوالحسن کی تمام حرکات دیکھ سکے۔ اور اس کو کوئی نہ دیکھے۔ صبح ہو گئی۔ تمام خواصیں، کنیزیں، لونڈیاں اپنی اپنی جگہ پر مودبانہ طریق سے کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں مسرور اور خواجہ سرا نے اسفنج کا ایک ٹکڑا سرکہ میں تر کرکے ابوالحسن کی ناک کے پاس لے جا کر سونگھایا۔ ابوالحسن کو سرکہ کی تیزی سے چھینک آ گئی۔ اور اس نے چاہا۔ کہ بلغم کو تھوکے کہ ایک کنیز نے بڑھ کر سونے کا اگالدان آگے کر دیا تاکہ قالین پر نہ گرے کیونکہ خلیفہ کو اس سرکہ کے اسفنج سے اٹھاتے تھے۔ ابوالحسن نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو ایک نہایت سجے ہوئے کمرہ میں پایا جس میں کئی قسم کی شمعیں روشن تھیں۔ اور جس کی چھت نہایت خوبصورت تھی پھر اس نے سامنے نہایت ہی حسین وجمیل کنیزوں کو صف بستہ دیکھا۔ بعض کے ہاتھوں میں مورچھل تھے اور بعض سونے کے اگالدان لئے ہوئے تھیں اور بعض کے ہاتھوں میں گانے بجانے کے آلات تھے اور کئی ایک خواجہ سرا لباس زرنگار میں نہایت مودبانہ طریق سے کھڑے ہوئے تھے۔ لحاف اور پلنگ پوش پر نگاہ کی تو انہیں بھاری کمخواب کا بنا ہوا پایا۔ جن کے گرد موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔

ابوالحسن یہ تمام ساز وسامان دیکھ کر نہایت حیران ہوا۔ اور دل میں خیال کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگر بیداری ہے تو کیا میں واقعی خلیفہ ہوں؟ رات کو اس مہمان سے باتوں باتوں میں خلیفہ ہونے کا ذکر آیا تھا۔ شاید کہیں وہی خیال میرے دماغ میں نہ سمایا ہوا ہو اور اصلیت کچھ بھی نہ ہو اسی خیال میں پھر آنکھیں بند کرکے سونے کا ارادہ کیا کہ ایک خواجہ سرائے نے بڑھ کر کہا۔

"یا امیر المومنین۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ نماز کا وقت ہو چکا ہے آفتاب طلوع ہوا چاہتا ہے"

ابوالحسن نے یہ سنکر خیال کیا کہ میں سوتا نہیں بلکہ بیدار ہوں سویا ہوا آدمی کسی کی بات کو نہیں سنتا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور جو چیزیں اسے شمعوں کی روشنی میں نظر آتی تھی انہیں دن کی روشنی میں دیکھا تو دل میں نہایت خوش ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ واقعی خدا نے مجھے خلیفہ بنا دیا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید یہ تمام حرکات دیکھ دیکھ نہایت خوش ہو رہا تھا اتنے میں ایک نہایت حسین وکمسن کنیز آگے بڑھی اور زمین بوس ہوئی اور گانے والیوں نے بانسلی بجا کر چھوٹے سُر میں سلامی دی شہنائی اور دیگر سازوں کی آوازوں نے ابوالحسن کو اس قدر حیران کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گیا یکایک پھر اس کو خیال آیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا بیداری ہے۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو مسرور خواجہ سرائے آگے بڑھا اور عرض کیا۔

"یا امیر المومنین آج کیا وجہ ہے کہ حضور نے نماز صبح ادا نہیں کی کیا کچھ خداوند کی طبیعت خراب ہے۔ یا یونہی سُستی تھی۔ اب بستر سے اٹھئے۔ اور دربار عام کو تشریف لے جائیے اور حکم احکام جاری فرمائیے۔ تمام اراکین دربار حضور کی تشریف آوری کے منتظر ہیں"

یہ سنکر تو ابوالحسن کو پختہ یقین ہو گیا کہ میں خلیفہ ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہے خواب نہیں۔ بلکہ عین حقیقت ہے۔ پھر ابوالحسن نے یہ خیال

کیا کہ مجھے یہ مرتبہ کیسے نصیب ہوا؟ اور اسی خیال سے مسرور سے کہا "تو یہ باتیں کس سے کہہ رہا ہے اور کس کو امیرالمومنین کے نام سے مخاطب کرتا ہے کسی اور کے دھوکہ میں تو مجھے امیرالمومنین نہیں کہہ رہا" مسرور نے جواب دیا "خداوند! آپ کیا کہہ رہے ہیں، شاید غلام کی آزمائش کرتے ہیں۔ خداوند! کیا امیرالمومنین نہیں اور کیا حضور نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں؟ مسرور خانہ زاد جو مدتوں سے حضور کی خدمت کا شرف حاصل کر رہا ہے کس طرح اپنے آقائے نعمت کو بھول سکتا ہے۔ خداوند! غریب پرور! اسی نظر عنایت رکھیں جو مدت سے غلام پر چلی آتی ہے۔ کیا خداوند نے رات کوئی خواب پریشاں دیکھا ہے جس کے اثر سے اس قسم کی گفتگو فرما رہے ہیں"۔

ابوالحسن مسرور کی اس بات پر بہت ہنسا خلیفہ بھی چاہتا تھا کہ ٹھٹھا مار کر ہنسے۔ لیکن ضبط سے کام لیا تاکہ کہیں ابوالحسن آواز نہ سن لے غرضیکہ ابوالحسن ان حالات کو دیکھ کر دیر تک ہنستا رہا۔ اور پلنگ پر ذرا دیر سست ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ اور پھر ایک خوردسال حبشی بچے کو لے کر کہا۔

"سچ بتا کہ میں کون ہوں؟" اس نے کہا "حضور خلیفہ امیرالمومنین ہیں۔ اور نائب سید المرسلین ہیں"۔

ابوالحسن نے کہا "تو سخت جھوٹا ہے اور اسی وجہ سے تیری صورت ایسی منحوس ہو گئی ہے"۔

پھر ابوالحسن ایک نہایت ہی حسین و جمیل کنیز کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا "ادھر آ۔ اور اپنے دانتوں سے ذرا میری انگلی کو کاٹ تاکہ میں دیکھوں کہ میں بیدار ہوں"۔ اس خواص نے سمجھ لیا کہ خلیفہ بھی کہیں پوشیدگی سے اس کو دیکھ رہا ہوگا۔ اس لئے ذرا زور سے ابوالحسن کی انگلی کو کاٹا ابوالحسن درد سے تلملا اُٹھا اور کہا میں واقعی خلیفہ بن گیا ہوں اور یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے پھر اس کنیز سے پوچھا "خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ۔ کہ میں واقعی امیرالمومنین ہوں اور تمہارا مالک ہوں" اس نے جواب دیا "واقعی ہمارے مالک و صاحب ہیں۔ اور ہم آپ کے غلام ہیں پھر جب ابوالحسن نے اُٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک خواجہ سرا نے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ اور تمام محل میں آداب و سلام کا شور مچ گیا تمام خواجہ سرائے اور خواصوں اور کنیزوں نے دعا دی کہ خدا امیرالمومنین کے اس دن کو بخیریت گذارے۔

ابوالحسن حیران تھا اور دل میں کہتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ کل تک تو میں ابوالحسن تھا۔ اور آج خلیفۃ المومنین بن گیا ہوں میرے وہم و فکر میں یہ معاملہ نہیں بیٹھتا کہ میں کس طرح اس عالی رتبہ پر فائز ہوا۔

پھر خواجہ سراؤں نے ابوالحسن کو خلیفہ کی پوشاک پہنائی اور دونوں طرف قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے اور مسرور آگے بڑھا۔ اور ابوالحسن کو دربار عام کی طرف لے گیا۔ ابوالحسن دربار میں پہنچ کر تخت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ کوئی بازو تھام کر اسے تخت پر بٹھا دے۔ اتنے میں دو امیر آگے بڑھے اور انھوں نے ابوالحسن کے بازوؤں میں ہاتھ دے کر تخت پر بٹھایا بمجرد تخت پر بیٹھنے کے چاروں طرف سے ملازموں کی آوازیں آداب و سلام کی بلند ہونے لگیں جسے سن کر وہ نہایت مسرور ہوا پھر ابوالحسن نے جب اپنے دائیں بائیں نظر کی تو بڑے بڑے سرداروں کو صف بستہ ایستادہ دیکھا پھر تمام لوگوں کے مقدمات سننے کی طرف متوجہ ہوا۔ وزیر اعظم جعفر بھی سامنے حاضر ہوا اور پائے تخت کو بوسہ دے کر دعا دی کہ "امیرالمومنین پر ہمیشہ خدا کا سایہ رہے۔ اور آپ لاکھوں برس سلامت رہیں۔ اور دین و دنیا میں مرتبہ بلند ہو۔ دوستوں کو مسرت نصیب اور دشمن ذلیل ہوں"۔ یہ تمام باتیں دیکھ کر ابوالحسن کو یقین ہو گیا۔ کہ میں واقعی خلیفہ ہوں اور جاگتا ہوں۔ یہ عالم خواب نہیں ہے۔ بلا کسی محنت کے خداداد نے مجھے بادشاہ بنا دیا ہے۔ پھر امور سلطنت کی سرانجام دہی میں مصروف ہوا۔ اور وزیر اعظم سے کہا۔

"تمہیں کچھ عرض کرنا ہے؟"

اس نے کہا "تمام امیر اور عہدہ داران افواج وغیرہ حضور کے سلام کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ اور باریابی چاہتے ہیں"۔ ابوالحسن نے کہا "روا

دربارِ عام کا دروازہ کھول دیا جائے اور ان سب کو پیش کیا جائے۔"

غرضیکہ وہ سب حاضر ہوئے اور نہایت مؤدبانہ طریق سے آداب شاہی بجالائے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر خاموش کھڑے ہو گئے پھر وزیر اعظم نے لوگوں کی درخواستیں پیش کیں اور ہر ایک کے مقدمہ کے متعلقہ حالات عرض کرنے لگا اس سے پہلے کہ وزیر ان مقدمات کو پیش کرے۔ ابوالحسن نے حکم دیا کہ کوتوال شہر کو پیش کیا جائے۔ کوتوال شہر حاضر ہوا ابوالحسن نے کہا کہ فلانے محلّہ کے امام مسجد اور اس کے مشیروں کو درّے لگائے جائیں اور پھر انھیں اونٹ پر الٹا سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جائے اور آگے آگے ان کے منادی کرائی جائے کہ یہ سزا اُن لوگوں کی ہے جو اپنے اہلِ محلہ کو ناحق تنگ کریں اور اُن پر جھوٹی تہمتیں لگائیں۔

غرضیکہ کوتوال شہر نے ابوالحسن کے اس حکم کی تعمیل کی کیونکہ خلیفہ نے بھی کوتوال کو اس پر عمل کرنے کے لئے اشارہ کر دیا تھا کیونکہ وہ امام مسجد اور اس کے مشیر درحقیقت نہایت شریر تھے اور لوگوں کو اُن سے سخت تکلیف تھی۔ جب کوتوال شہر نے عرض کیا کہ حضور اس پر عمل کیا گیا۔ تب ابوالحسن نے وزیر اعظم سے کہا کہ فلانے محلے میں ابوالحسن نامی ایک شخص رہتا تھا اس کی والدہ کو ایک ہزار اشرفیاں پہنچا دی جائیں اور کہا جائے کہ یہ خلیفہ نے تیرے لئے بھیجا ہے۔

وزیر جعفر نے ایک غلام کے ہاتھ ایک تھیلی ایک ہزار اشرفی کی ابوالحسن کی ماں کو پہنچا دی۔ وہ دیکھ کر نہایت خوش ہوئی اور حیران تھی کہ خلیفہ نے ہمارے حال پر کیوں اس قدر مہربانی کی۔ درحقیقت وہ اصلی معاملہ سے بے خبر تھی۔ کہ اس وقت خود اس کا لڑکا خلیفہ بنا ہوا ہے۔

جب تمام امور سے فراغت ہو چکی۔ تو ابوالحسن نے دربار برخاست کر دیا۔ تمام اراکین دربار رخصت ہو گئے اور صرف وزیر اعظم جعفر اور خواجہ سرائے مسرور اور خود ابوالحسن رہ گئے۔ اس وقت ابوالحسن وزیر اور مسرور کی مدد سے تخت سے نیچے اُترا اور محل کی جانب چلا۔ اسی اثنا میں اُسے جائے ضرور کی حاجت ہوئی۔ مہتر نے پائخانہ شاہی کے دروازے کھول دیئے۔ جس میں سفید سنگِ مرمر کے فرش بچھے ہوئے تھے اور ایرانی قالین اور نہایت اعلیٰ درجہ کے زربفت وغیرہ بھی بچھے ہوئے تھے۔ داروغہ جائے ضرور نے ایک سنہری جوتی کا جوڑا ابوالحسن کے سامنے رکھا۔ کیونکہ خلیفہ اسی جوڑہ کو پہن کر جائے ضرور میں جایا کرتا تھا۔ ابوالحسن اس بات سے بے خبر تھا اُس نے اس جوڑے کو اُٹھا کر اپنی کشادہ آستینوں میں رکھ لیا۔ وزیر اور مسرور اس کی اس حرکت پر ہنسے لیکن انھوں نے ضبط سے کام لیا اور کہا کہ خداوند اس جوتی کو پہن کر پائخانہ میں جایا کرتے ہیں۔ غرضیکہ ابوالحسن اس جوتی کو پہن کر پائخانہ میں گیا جب وہ اُس سے فارغ ہو چکا تو مسرور اُسے کھانا کھانے والے کمرہ میں لے گیا۔ وہاں دسترخوان بچھایا گیا طرح طرح کے لذیذ کھانے چنے گئے اور ساتھ گانے کے طائفے بھی حاضر ہوئے ابوالحسن کے کھانے پر بیٹھتے ہی انھوں نے گانا بجانا شروع کر دیا۔

پھر ابوالحسن خیال کرنے لگا کہ میں تمام ان باتوں کو خواب میں دیکھ رہا ہوں یا بیداری میں پھر خیال کیا کہ یہ بیداری میں ہی ہے۔ خواب نہیں ہو سکتا اور میں واقعی خلیفہ بن گیا ہوں ابوالحسن وہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر نہایت حیرت زدہ تھا۔ سات عدد نہایت حسین و جمیل لونڈیاں اس کے سامنے گانا گا رہی اور ساز بجا رہی تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کے جھاڑ فروزاں تھے اور سونے کی انگیٹھیوں میں عود سلگایا جا رہا تھا۔ کئی ایک نہایت ہی حسین و جمیل خواصیں جو نہایت نفیس پوشاک پہنے ہوئے تھیں مورچھل ہلا رہی تھیں ابوالحسن تمام اشیائ کو دیکھ دیکھ کر نہایت حیران تھا۔ اور بے حد خوش ہو رہا تھا اور اُن سب کو کہتا تھا۔ کہ ایک ایک باری باری مورچھل ہلائے۔ اور باقی میرے ساتھ دسترخوان پر بیٹھی رہیں اور دسترخوان پر اچھی اچھی چیزیں دیکھ نہایت خوش ہو رہا تھا مگر وہ لحاظ سے کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتی تھیں۔ ابوالحسن نے اُن کو کھانے میں شریک کیا اور ہر ایک سے ان کا نام دریافت کیا۔ ایک نے کہا میرا نام مرجان ہے دوسری

نے کہا کہ مرجان لب تیسری نے کہا کہ میرا نام مہتاب ہے چوتھی نے کہا میرا نام خورشید ہے، پانچویں نے کہا میرا نام نزہت ہے چھٹی نے کہا میرا نام فرحت ہے ساتویں نے کہا میرا نام مصری ہے پھر وہ ہر ایک کے نام پر مذاق کرتا رہا اور خلیفہ بھی ایک ساتھ کے مکان میں چھپا ہوا یہ حال دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ جب کنیزوں نے دیکھا کہ ابوالحسن کھانے سے فارغ ہو چکا ہے تو خواجہ سراؤں سے کہا کہ ہاتھ دھلانے کے لئے آفتابہ وغیرہ لایا جائے۔ پھر وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرہ کو گیا۔ اس کے جاتے ہوئے تمام کمرہ نغمہ و سرود کی آواز سے گونج اُٹھا۔ وہاں جواہر نگار قندیلیں روشن تھیں اور زریں و سبز خوان پر طرح طرح کے میوے چنے تھے اور سات عدد نہایت ہی حسین خواصیں ایستادہ تھیں۔ ابوالحسن دسترخوان پر بیٹھا اور اُن کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کا کہا اور ان سے بھی ان کے نام دریافت کئے جو انھوں نے پہلی خواصوں کی طرح بتلائے پھر ہر ایک کو میوے اُٹھا اُٹھا کر دینے لگا۔ اور کھلاتا گیا۔ پھر اس کمرہ سے اُٹھ کر بارہ دری میں گیا۔ وہاں بھی محفل رقص و سرود آراستہ تھی۔ اور سات عدد نہایت ہی خوبصورت و کمسن کنیزیں اپنے ہاتھوں میں طرح طرح کے پیالے جن میں قسم قسم کے شربت تھے، لئے کھڑی تھیں ابوالحسن کے شربت پیتے ہی انھوں نے گانا بجانا شروع کیا۔ ابوالحسن نے ان کے نام بھی دریافت کئے انھوں نے بھی سابقہ خواصوں کی طرح اپنے نام بتائے ابوالحسن سُنکر نہایت خوش ہوا۔ اور ہر ایک سے بے تکلفانہ گفتگو کرتا خلیفہ اس کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر نہایت خوش ہوتا۔

اب ابوالحسن یہاں سے ایک چوتھے کمرہ میں گیا۔ وہ بھی سابقہ کمروں کی طرح ہر ایک شئے سے آراستہ پیراستہ تھا۔ وہاں کافوری شمعیں بلوریں فانوسوں میں جل رہی تھیں اور جو نظارہ اس کمرہ میں تھا۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں نہ دیکھا گیا تھا۔ یہاں بھی کئی ایک طائفے گانے بجانے کے لئے تیار تھے۔ اور ان کی دلفریب ادائیں اور آوازیں بہشت بریں کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ وہاں سات عدد لونڈیاں اور بھی تھیں جو اپنے ہاتھوں میں طلائی طشتریاں لئے کھڑی تھیں جن میں شراب کے بعد کھانے کا سامان نہایت قرینہ سے لگا ہوا تھا اور اُسی کمرہ میں ایک جانب ساتھ طلائی صراحیاں شراب سے بھری رکھی تھیں اور ان کے گرد جام بلوریں مع طلائی دستوں کے موجود تھے۔ ابوالحسن نے ان تینوں کمروں میں سوائے پانی کے کچھ نہ پیا۔ کیونکہ شہر بغداد کی رسم تھی۔ کہ تمام بڑے بڑے لوگ رات کو مخفی طور پر شراب نوشی کرتے تھے اور دن کو اُس سے نہایت پرہیز کرتے تھے۔ جب ابوالحسن چوتھے مکان میں داخل ہوا۔ تو وہاں بھی سات عدد نہایت خوش رو خواصیں موجود تھیں جن کو دیکھ کر ابوالحسن حیران رہ گیا۔ اور جس قدر وہ پہلے کنیزوں کو دیکھ چکا تھا یہ ان سب سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ ابوالحسن انھیں دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ اور چاہا کہ ان سے گفتگو کرے۔ لیکن سازوں کی آوازیں اس قدر بلند تھیں کہ اُسے کچھ سُنائی نہیں دیتا تھا۔ ابوالحسن نے گانا بجانا بند کرنے کا حکم دیا۔ اور ایک نہایت ہی کمسن اور حسین و جمیل کنیز کو آگے بڑھنے کا حکم دیا جب وہ قریب آئی تو اُس سے پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے،" اُس نے کہا "یا امیرالمومنین میرا نام سِلک مروارید ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "تیرے دانت تو موتیوں سے بھی زیادہ آب و تاب رکھتے ہیں جس نے تیرا یہ نام رکھا ہے اُس نے سخت غلطی کی ہے۔ تیرا نام تو اس سے بہتر ہونا چاہیئے تھا۔ بھلا ایک جام تو شراب کا دے۔"

اس نے ابوالحسن کو ایک گلاس میں شراب ڈال کر دی وہ پی گیا پھر اُس کنیز نے ایک گلاس ابوالحسن کے حکم سے خود پیا اور پینے سے قبل ایک نہایت دلفریب گیت گایا۔ جس کو سُن کر ابوالحسن نہایت خوش ہوا۔

پھر ایک دوسری خواص کو بلایا اس سے پوچھا "تیرا نام کیا ہے" اُس نے کہا "میرا نام کوکب الصبح ہے۔" ابوالحسن نے کہا "تیری آنکھیں تو ستاروں سے بھی زیادہ روشن ہیں یہ نام درست نہیں اس سے بہتر ہونا چاہیئے تھا۔"

پھر ایک جام اس کے ہاتھ سے بھی پیا۔ پھر ایک تیسری خواص جس کا نام ضوءُ النہار تھا۔ اس کی طرف مخاطب ہوا اور اس کے ہاتھ سے بھی ایک جام پیا۔ ابوالحسن نے جب پے در پے کئی جام شرابوں کے پیئے۔ تو خلیفہ نے سلک مروارید کنیز کو اشارہ کیا کہ ایک جام میں سفوف بیہوشی ملا دے اُس نے بموجب حکم خلیفہ نے ایسا ہی کیا اور ایک جام سفوفِ بیہوشی آمیز ابوالحسن کو دیا۔ وہ اس کو بھی نہایت خوشی خوشی نوش کر گیا۔ پھر اس کنیز نے ایک گیت بانسلی کے ساتھ گایا۔ اور ابوالحسن سے کہا کہ یہ گیت میں نے آج صبح بنایا ہے! ابوالحسن اُسے سُنکر نہایت خوش ہوا اور حالت نشہ میں وجد کرنے لگا۔ جب اس خواص نے گیت ختم کر دیا۔ تو ابوالحسن نے چاہا کہ اس کی داد دے اور تعریف کرے لیکن سفوفِ بیہوشی اپنا اثر کر چکا تھا۔ تعریف کرنے کی غرض سے نصف منہ اُس نے کھولا ہی تھا کہ بیہوش ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے۔ اور وہی روزِ اوّل والی کیفیت ہو گئی۔ خلیفہ نے غلام کو حکم دیا کہ اس کے شاہی کپڑے اتار ڈالو اور اس کے اصلی کپڑے اس کو پہنا دو غلام نے حکم کی تعمیل کی۔

پھر خلیفہ نے کہا "اس کو لے جا کر اس کے مکان کے دیوان خانہ میں لٹا دو اور باہر نکلتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ دینا" غلام حسب الحکم اس کو اس کے گھر لے گیا۔ اور اس کے بستر پر لٹا دیا اور خود محل کو واپس چلا آیا۔ تاکہ خلیفہ کو اہتمام کار کی اطلاع دے پھر خلیفہ نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ ابوالحسن یہ دعا مانگتا تھا کہ خدا اُسے ایک دن کے لئے خلیفہ بنا دے۔ تو وہ اپنے محلّہ کے مؤذن مسجد اور اس کے چار مشیروں کو سزا دے کیونکہ ان کے ہاتھوں اہل محلہ سب کے سب تکلیف میں تھے۔ لہذا میں نے اُسے ایک دن کے لئے خلیفہ بنا کر اس کے ارمان کو پورا کر دیا تو اس نے بموجب اپنی خواہش کے ان کو سزا دی۔

اب ابوالحسن کی سنو کہ جب غلام اس کو اُس کے گھر چھوڑ آیا تو وہ تمام رات بیہوش رہا۔ صبح ہونے پر اُس نے آنکھ کھولی۔ اور اپنے گھر کو دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ سلک مروارید کوکب الصبح وغیرہ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کے نام لے لے کر آوازیں دیں اور کہا کہ تم کدھر ہو یہاں کیوں نہیں آتے۔ ابوالحسن کی ماں اس کی آواز سن کر دوڑی ہوئی آئی اور کہا۔

"بیٹا خیر تو ہے کیوں اس طرح کی باتیں کر رہے ہو"

ابوالحسن نے اپنی ماں کی طرف نہایت غرور سے دیکھا اور کہا "اے اچھی بی بی تو کسے اپنا بیٹا کہتی ہے"؟

اُس نے کہا "کیا تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم مجھے بھول کیوں گئے"

ابوالحسن نے کہا "اے نالائق عورت کچھ ہوش سے بات کر میں ہرگز ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہوں۔ تو نہایت جھوٹی ہے۔ ادب سے بات کر میں امیرالمومنین ہوں"

اُس کی ماں نے کہا "خاموش رہ ایسی بیہودہ گفتگو نہ کر ورنہ لوگ تجھے ابھی پکڑ کر لے جائیں گے"

ابوالحسن نے کہا "میں پاگل نہیں ہوں میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ میں فی الحقیقت امیرالمومنین ہوں۔ اور نائب رسولؐ ہوں جو دونوں جہاں کا مالک ہے"

اس کی ماں نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ تجھ پر کسی جنّ کا سایہ ہو گیا ہے یا کوئی شیطانی چیز تیرے جسم میں حلول کر گئی ہے" اور کہا "میں درحقیقت تیری ماں ہوں۔ اور تو میرا بیٹا ابوالحسن ہے" اور وہ تمام علامتیں جو ابوالحسن کے ابوالحسن ہونے میں ہو سکتی تھیں بتائیں۔ اور اسکی غلطی کو ثابت کیا اور کہا "دیکھ یہ گھر تیرا ہے۔ یا خلیفہ کا محل ہے اور کیا میں ہمیشہ سے تیرے ساتھ نہیں رہی اور جو کچھ میں نے تجھ سے کہا ہے اس پر غور کر اور اُس واہیات گفتگو کو چھوڑ دے یہ مرتبہ نہ تجھے حاصل ہے اور نہ کبھی حاصل ہو گا اور کبھی بھی اس قسم کا سخن زبان پر نہ لانا"

ابوالحسن یہ سُنکر کچھ سوچنے لگا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر آنکھیں کھولیں اور کہا "اماں جو کچھ تو نے کہا ہے یہ سب سچ ہے۔ اور میں اچھی طرح

جانتا ہوں کہ یہ میرا مکان ہے۔ اور میں ابوالحسن ہوں۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ باتیں میرے دماغ میں کیونکر پیدا ہوگئی ہیں۔"

اس کی ماں نے خیال کیا کہ اس کو شاید کوئی دماغی بیماری ہوگئی ہے۔ جس کے سبب سے اس قسم کی گفتگو کرتا ہے یہ خیال کر کے وہ کچھ مسکرائی اور کہا" شاید بیٹا تو نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

ابوالحسن نے ذرا پھر کچھ سوچ کے کہا" او نالائق عورت سوچ سمجھ کر بات کر میں ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہوں اور نہ تو میری ماں ہے یہ تیری کیسی بے ادبانہ باتیں ہیں جو تو مجھے اپنا بیٹا بناتی ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں۔ کہ میں امیرالمومنین ہوں۔ اور تمام مسلمانوں کا سردار ہوں۔"

اس کی ماں نے کہا بیٹا خدا کے لئے اپنی زبان بند کر۔ کیا تو نے اس محلہ کے مؤذّن اور اس کے چار مشیروں کا نہیں سُنا۔ جو اس محلّہ کے رہنے والوں کو تکلیف دیتے ہیں۔ کل کوتوال شہر نے ان پانچوں کو گرفتار کر لیا۔ اور سزائے تازیانہ دی۔ اور پھر تشہیر کر کے شہر بدر کر دیا مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیرا بھی ایسا ہی حال نہ ہو۔"

ابوالحسن کی ماں کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ مؤذّن وغیرہ کی سزا ابوالحسن ہی کے حکم سے ہوئی تھی۔ اُس نے تو محض ابوالحسن کو ڈرانے کے لئے یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ ابوالحسن نے اس قصّہ کو سُن کر کہا" اے مکّار بڑھیا۔ غور سے سُن کہ نہ تو میں تیرا بیٹا ہوں۔ اور نہ ابوالحسن ہوں بلکہ امیرالمومنین بادشاہ بحروبّر ہوں۔ اور تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے ہی کوتوال کو ان لوگوں کی سزا کے لئے حکم دیا تھا۔ اور اُس نے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اب تو تیری بات سے بھی میرا امیرالمومنین ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

ابوالحسن کی ماں یہ نہ سمجھ سکی کہ ابوالحسن امام مسجد کی سزا وغیرہ کا سُن کر اپنے دعوے میں اور مستقل کیوں ہوگیا ہے۔ مگر اُس نے پھر کہا" بیٹا خدا کیلئے عقل کو کام میں لاؤ۔ اور ایسی فضول باتیں نہ کرو۔"

ابوالحسن نے کہا" اے بے حیا خاموش رہ ورنہ ایسی سخت سزا دونگا۔ کہ قیامت تک یاد رہے گی میں نے تجھے ایک دفعہ کہہ دیا کہ میں امیرالمومنین ہوں بھلا تجھے اس بات کے ماننے میں کیوں پس و پیش ہے۔"

ابوالحسن کی ماں نے سمجھ لیا۔ کہ یہ دیوانہ ہوگیا ہے۔ اور اپنی محبّت کی وجہ سے جو اُسے اپنے بیٹے ابوالحسن کے ساتھ تھی۔ اس کی حالت پر رونے لگی۔ لیکن ابوالحسن اس کے رونے پر اور غصّہ میں آگیا۔ اور کہا۔

"اے ملعونہ سچ بتا کہ میں کون ہوں۔"

اس نے نہایت محبّت کے لہجہ میں کہا۔

" تو میرا پیارا بیٹا ابوالحسن ہے۔ جس کو میں نے جنا ہے۔ اور پرورش کیا ہے اور دودھ پلایا ہے۔ تو نے غلطی کی کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ امیرالمومنین کہتا ہے۔ بلکہ امیرالمومنین کا لفظ تو خاص ہمارے مہربان بادشاہ خلیفہ ہارون الرشید کے لئے ہے۔ جس کے ہم سب لوگ فرمانبردار اور وہ ہمارا خداوند نعمت ہے۔ اُس نے کل ہی ایک غلام کے ہاتھ ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بھیجی ہے۔ ہمیں چاہیئے۔ کہ ایسے امیرالمومنین کے لئے دعائے سلامتی مانگیں۔"

ابوالحسن کو یہ سُنکر اپنے امیرالمومنین ہونے کا اور زیادہ یقین ہوگیا۔ پھر اپنی ماں کو مخاطب کر کے کہنے لگا" او مکّار اب تک تجھے میرے امیرالمومنین ہونے کا یقین آیا"۔ . . . یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک لاٹھی اُٹھالی۔ اور اپنی ماں کو زور زور سے مارنے لگا۔ وہ غریب ضعیفہ اس کی اس بے رحمی پر چلانے لگی۔ اردگرد کے تمام لوگ جو اُس کے ہمسایہ تھے شور سُن کر اکٹھے ہو گئے اور ابوالحسن کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی اور کہا" تجھے کیا ہوگیا ہے کہ تو اپنی ماں پر ہاتھ اُٹھاتا ہے۔ سعادتمند بیٹوں کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنی ماؤں سے ایسا شرمناک سلوک روا رکھیں۔"

ابوالحسن یہ سُنکر اور غصّہ میں آگیا اور کہنے لگا" ابوالحسن کون گدھا ہے جس کا یہ نام تم نے مقرر کیا ہے۔"

ابوالحسن کی یہ باتیں سُنکر سب حیران ہو گئے۔ اور کہا "کیا یہ تیری ماں نہیں ہے۔ اور کیا یہ تیرا گھر نہیں ہے۔ جس میں تو اس وقت کھڑا ہے؟"
ابوالحسن اس کے جواب میں کہنے لگا "میں ہرگز ہرگز اس ذلیل اور بے حرمت عورت کو نہیں جانتا۔ اور نہ تمھیں پہچانتا ہوں۔ کہ تم کون ہو اور نہ میں ابوالحسن ہوں۔ بلکہ امیرالمومنین ہوں۔ اگر تم اس بات سے واقف ہو تو میں تم سب کو بتا دونگا کہ میں خلیفہ ہوں"

سب ہمسایوں نے اس کو دیوانہ سمجھا۔ اور خیال کیا۔ کہ جس طرح اس نے اپنی ماں کو مارا ہے ہم کو بھی ماریگا۔ اس خیال سے ایک شخص نے دوڑکر داروغہ پولیس کو خبر کی۔ اور پھر سب آدمیوں نے مل کر ابوالحسن کو پکڑ لیا۔ ابوالحسن نے کوشش کی کہ وہ ان لوگوں کے ہاتھ سے بھاگ جائے مگر نہ بھاگ سکا۔ داروغہ پولیس نے یہ حال دیکھ کر دو ایک ایسے اس زور کے کوڑے لگائے۔ کہ وہ تلملا اُٹھا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور جیل خانہ کی طرف لے چلا اب تو ابوالحسن کی آنکھیں کھلیں لوگ راستہ میں اُسے گھونسے مارتے تھے۔ کئی آدمیوں نے طمانچے لگائے۔ اور بہت سے لوگوں نے گالیاں دیں۔ گویا کہ ہر وہ فعل اس کے ساتھ کیا۔ جو دیوانوں کے لئے مخصوص ہے۔ جب اُس نے اس طرح ذلت اُٹھائی۔ اور مار کھائی۔ تو اُسے معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجھے دیوانہ خیال کر کے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے حالانکہ میں ہوش میں ہوں۔ پھر داروغہ اسے جیل خانہ میں لے گیا۔ اور ایک لوہے کے پنجرہ میں بند کیا۔ اور ہر روز اسے باہر نکال کر پچاس کوڑے لگاتا۔ اور پوچھتا کہ اب بھی تو اپنے ہوش و حواس میں آیا ہے۔ یا بدستور اپنے آپ کو امیرالمومنین تصور کرتا ہے۔ دو ہفتہ تک ابوالحسن اسی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اور ایک دن داروغہ سے کہا "یہ میری بدقسمتی تھی۔ کہ میں نے اس قدر ذلت اٹھائی۔ اور رسوا ہوا"

ابوالحسن کی ماں ہر روز جیل خانہ میں جاتی۔ اور ابوالحسن کو اس حال میں دیکھ کر روتی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ یہ دن بدن دُبلا ہو رہا ہے۔ اور تمام جسم اس کا مجروح ہو رہا ہے۔ تو یہ دیکھنے کے لئے کہ اب بھی اُس کے ہوش و حواس درست ہوئے ہیں یا نہیں۔ امتحاناً اس سے گفتگو کرنے لگی۔ ابوالحسن بھی اب ان تمام واقعات کو جو اُس نے خلیفہ کے محل میں دیکھے تھے۔ بھول گیا تھا۔ اور اُس نے سمجھ لیا کہ سب خواب و خیال تھا۔ اور یہ سوچا۔ کہ اگر یہ خواب نہ ہوتا تو میں بعد بیدار ہونے کے کس طرح اپنے گھر میں ہوتا۔ لیکن حیران تھا کہ مؤذن وغیرہ کو جو سزا ہوئی۔ اور میری والدہ کو ایک تھیلی اشرفیاں جو ملیں یہ سب کس طرح ظہور پذیر ہوا۔ یہی باتیں ہیں۔ جو میرے شک کا باعث ہیں کہ میں خلیفہ ہوں۔ اب حیران ہوں۔ کہ کس کو خواب سمجھوں اور کس کو نہ سمجھوں۔

ابوالحسن ایک دن انھیں باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کہ اس کی ماں اُس سے ملنے کے لئے آئی۔ اور دُبلا اور کمزور دیکھ کر رونے لگی۔ ابوالحسن نے ماں کو اسی طریق سے سلام کیا جیسے وہ ہمیشہ کرتا تھا۔ ماں نے پوچھا۔

"بیٹا اب تو تیرے دماغ میں وہ خیال نہیں۔ جس کی وجہ سے تو اس حال کو پہنچا"

ابوالحسن نے کہا "اماں میرا قصور معاف کرو۔ میں واقعی ایک غلط خیال میں مبتلا تھا۔ میں خلیفہ نہیں ہوں۔ ابوالحسن ہوں۔ اور تمھارا بیٹا ہوں"

ابوالحسن کی ماں اس کی یہ باتیں سن کر نہایت خوش ہوئی۔ اور کہا کہ اب میرا بیٹا اچھا ہو گیا ہے۔ پھر وہ ابوالحسن سے مخاطب ہوئی اور کہا "وہ مسافر جو سوداگر تھا۔ اور جو صبح کو دیوان خانے کے دروازے کھلے چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر شیطان تھا۔ جس نے تمھیں اس قدر بہکا دیا"

ابوالحسن نے کہا "واقعی وہ موصلی سوداگر ایک شیطان تھا۔ جس نے مجھے خراب کیا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اب میں اچھا ہو گیا ہوں۔ مجھ کو یہاں سے گھر لے چلیئے"

پھر ابوالحسن نے داروغہ سے کہا اس نے اُس کی والدہ کے کہنے پر اُسے چھوڑ دیا۔ ابوالحسن اپنے گھر آ گیا۔ اور کتنے روز کے بعد اس کے بدن میں طاقت آئی۔ پھر وہ حسب دستور سابق ایک نیا مہمان ہر روز اپنے گھر لے آتا۔ اور صبح اس کو رخصت کر دیتا ایک دن وہ پھر کسی مہمان

کی تلاش میں جب بغداد کے پل کے قریب گیا۔ تو اتفاقاً اس دن بھی خلیفہ ایک موصلی سوداگر کے بھیس میں گذر رہا تھا۔ ابوالحسن نے اسے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہی وہ سوداگر ہے جس کی وجہ سے میں نے اس قدر مصیبت اُٹھائی۔ اگر یہ میرا مہمان نہ ہوتا۔ تو مجھے اس قدر مصیبت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ یہ خیال کر کے وہ ڈرا۔ اور کہا کہ خدا مجھے ایسے منحوس آدمی سے بچائے۔ جب وہ قریب پہنچا تو اس کی طرف سے منہ پھیر کر دریا کو دیکھنے میں مشغول ہوگیا۔ اور اپنی طرز سے یوں ظاہر کیا کہ جیسے اُس نے اس کو دیکھا ہی نہیں۔ ادھر خلیفہ ابوالحسن کی تلاش میں تھا۔ کہ اگر پھر وہ مل جائے تو اُسے محل میں لے جاکر اس کی تمام تکالیف کی تلافی کر دے اور عمر بھر کے لئے مستغنی بنا دے۔ غرضیکہ خلیفہ نے بھی اُسے پہچان لیا۔ اور قصداً اس کے نزدیک جاکر کھڑا ہوگیا اور چاہا کہ ابوالحسن سے صاحب سلامت کرے لیکن ابوالحسن نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور کہا۔

"مجھے نہ تمھارے سلام اور نہ آداب کی ضرورت ہے۔ اپنی راہ لو۔" خلیفہ نے کہا "کیا تمھیں یاد نہیں۔ کہ میں تمھارا واقف ہوں اور تم نے ہی مجھے ایک مہینہ گذرا ہے۔ اس جگہ سے اپنے گھر لے جاکر نہایت پُرتکلّف کھانا کھلایا تھا۔" ابوالحسن نے کہا "مجھے یاد نہیں۔ کہ میں نے تمھیں پہلے کبھی دیکھا بھی تھا جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

خلیفہ نے خیال کیا کہ شاید یہ اپنے اس عہد کی وجہ سے جو اس نے کیا ہُوا ہے کہ سوائے ایک بار کھانا کھلانے کے پھر اس سے بات نہ کرونگا۔ یہ مجھ سے متنفر ہے پھر خلیفہ نے کہا "افسوس کہ تم نے مجھے فراموش کر دیا معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں اس عرصہ میں کوئی نہایت زبردست صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے تم اس قسم کی باتیں کر رہے ہو بخدا اگر تم مجھ سے اپنی تکلیف بیان کرو۔ تو میں حسب دلخواہ تمھاری مدد کروں۔"

ابوالحسن نے کہا "مجھے تم سے کسی مدد کی ضرورت نہیں مجھے تو یہ یاد ہے کہ محض تمھاری وجہ سے میں دیوانہ بنا ہوں۔ خدا کے لئے مجھ سے بات نہ کرو۔ اور اپنی راہ لو۔ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ اور مجھے نہ ستاؤ۔"

خلیفہ جھٹ ابوالحسن کے گلے لگ گیا اور کہا "یہ ناممکن ہے کہ میں اب تمھیں چھوڑ کر پھر دوسری جگہ جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمھیں دیکھا اب پھر مجھے اپنے گھر لے جاؤ اور پہلے کی طرح میری دعوت کرو۔ یہ میری تمنا ہے کہ میں پھر ایک دفعہ تمھارے سامنے سے نوشی کروں۔"

ابوالحسن نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں پھر ایسے شخص سے ملوں جس کی وجہ سے مجھے اس قدر تکلیف پہنچی ہو۔"

خلیفہ ابوالحسن کے گلے لگ گیا اور کہا "میرے پیارے دوست! خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ کہ وہ کونسی تکلیف ہے جو تمھیں میری وجہ سے پہنچی کیونکہ میری خواہش ہے کہ میں تمھارے دُکھ درد میں ہاتھ بٹاؤں اور تمھاری مدد کروں اور اگر مجھ سے کچھ قصور ہُوا ہو تو اس کی تلافی کروں۔"

ابوالحسن نے خلیفہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور شروع سے آخر تک تمام رام کہانی جو اس پر گذری تھی کہہ سُنائی خلیفہ پہلے بھی ان تمام باتوں کو جانتا تھا۔ ابوالحسن کی زبانی سُنکر خوب ہنسا اور زور سے قہقہہ لگایا ابوالحسن نے کہا۔

اے سوداگر موصلی میں جانتا تھا کہ تو میری داستانِ غم سُن کر مجھ سے اظہارِ ہمدردی کریگا۔ اور اپنے قصور پر نادم ہو کر مجھ سے اُس کی معافی چاہیگا۔ لیکن افسوس ان تمام باتوں کے خلاف تو میری باتوں پر ہنستا ہے اور مجھے بیوقوف بناتا ہے اگر تجھے میری باتوں پر اعتبار نہیں آتا۔ تو میری پیٹھ کو دیکھ کہ اس قدر ضربات کے اس پر نشان ہیں۔"

خلیفہ نے اس کے بدن پر داغ دیکھ کر اظہارِ افسوس کیا۔ اور اس کو پھر گلے سے لگایا اور کہا "بھائی مجھے تمھارے داغ دیکھ کر نہایت افسوس ہُوا ہے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کیا ہو سکتا ہے خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دو۔ اور مجھے اپنے ہمراہ گھر لے چلو۔ اور مجھے کھانا کھلاؤ۔ صبح کو میں دیوان خانہ کا دروازہ بند کر کے چلا جاؤنگا۔"

ابوالحسن اب خلیفہ کو اپنے گھر لے جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اور آخرالامر دونوں شہر کی جانب چلے اثنائے راہ میں خلیفہ نے ابوالحسن کو

اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

" دوست تم میرے جیسے ہمدرد اور یک رنگ دوست سے بدگمان نہ ہو جو ہر حال میں تمھاری بہتری اور بھلائی کا خواستگار ہے اور میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ ہرگز ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کروں گا!"

ابوالحسن نے کہا " جو تم کہتے ہو سب درست ہے لیکن آئندہ پھر کبھی میری دعوت کی امید نہ رکھنا۔ یہ جتنی تکلیفیں مجھے پہنچیں سب تمھاری وجہ سے تھیں!"

خلیفہ نے مسکرا کر کہا " بھائی تم بڑے بدگمان ہو باوجود اس قدر معذرت کرنے کے بھی تم مجھ پر بدگمانی کرتے ہو"

الغرض اسی طرح باتیں کرتے شام ہونے پر ابوالحسن کے گھر پہنچے ابوالحسن نے اپنی ماں سے طرح طرح کے کھانے پکوائے اور خلیفہ کے آگے رکھے پھر دستر خوان بچھایا۔ اور اس پر میوے وغیرہ رکھے۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں شراب نوشی میں مشغول ہوئے خلیفہ اور ابوالحسن نے متواتر کئی گلاس پیئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے ابوالحسن جب خوب نشہ میں آیا۔ تو خلیفہ نے پوچھا۔

" تم کبھی کسی پر عاشق بھی ہوئے ہو یا نہیں؟"۔

ابوالحسن نے کہا " میں کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوا"

پھر خلیفہ نے پوچھا " تمھیں کس چیز سے زیادہ رغبت ہے؟"

ابوالحسن نے کہا " مجھے اچھی شراب پینے اور دوستوں سے خوش گپیاں اڑانے کی بڑی خواہش ہے اور ہاں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میری شادی اس حسینہ کے ساتھ ہو۔ جو عالم خواب میں میرے ساتھ شراب پیتی تھی اور بانسلی بجاتی تھی۔ اور خوب مزے مزے کی باتیں کرتی تھی اور میں جانتا کہ اس خوبی و تعریف کی عورت سوائے شاہی محل کے اور کسی جگہ نہ ملے گی"

پھر ابوالحسن نے ایک جام بھر کر خلیفہ کو دیا۔ اور کہا " لو پیو۔ یہ آخری جام ہے"

خلیفہ نے لے کر پی لیا۔ پھر خلیفہ نے ایک جام بھر کر۔ اس میں سفوف بے ہوشی ملا کر ابوالحسن کو دیا۔ اور کہا " یہ جام اس بی بی کی یاد میں ہے، جسے تم نے خواب میں بانسلی بجاتے ہوئے دیکھا تھا"

ابوالحسن نے وہ جام بے ہوشی لے کر پی لیا۔ اور کچھ دیر کے بعد غافل ہو گیا۔ خلیفہ نے غلام کو اشارہ کیا کہ اس کو اٹھائے اور باحتیاط محل کو لے جاؤ اور خلیفہ ابوالحسن کے مکان کا دروازہ بند کر کے خود بھی ساتھ ہو لیا۔

پھر خلیفہ نے حکم دیا۔ کہ اس کو چوتھی بارہ دری میں لے جا کر میرے پلنگ پر لٹا دو۔ پھر خواجہ سراؤں سے کہا۔ اُسے میری پوشاک پہنا دو۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کی شب باشی والی پوشاک اسے پہنا دی۔

خلیفہ صبح ہوتے ہی ابوالحسن کی خوابگاہ کی جانب گیا۔ تاکہ وہاں چھپ کر تمام باتوں کو دیکھے غرضیکہ جب ابوالحسن صبح کو بیدار ہوا تو اس نے سونے کے اُگالدان اور سب ساز و سامان کو دیکھا کہ گانے بجانے والی کنیزیں باقاعدہ کھڑی ہیں اور اپنے سازوں کو ملا کر گا رہی ہیں ابوالحسن یہ حال دیکھ کر نہایت حیران ہوا اور اپنے اردگرد خواجہ سراؤں اور خواصوں کو دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اور گذشتہ تمام کیفیت اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور کمرہ کو بھی دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس میں ایک دفعہ پہلے بیدار ہوا تھا اور یہ سب ساز و سامان وہی ہے جو پہلے بھی تھا۔

خلیفہ نے گانے بجانے کو موقوف کرا دیا تاکہ وہ اپنے مہمان کی حرکات کو دیکھے اور اس کی باتوں کو سنے سب لوگ قرینہ سے اپنے اپنے مقام پر کھڑے تھے ابوالحسن نے کہا۔

• آج میں پھر اسی خوفناک خواب کو دیکھ رہا ہوں۔ جو میں نے پہلے دیکھا تھا اور اب پھر مثل سابق لوہے کے قفس میں قید ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی جائیں گی اور میرے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔ اور پھر کئی دن تک مجھ کو مار پڑے گی۔ بے شک وہ شخص جو کل شام میرے گھر آیا تھا نہایت بدمعاش ہے باوجود اس کے کہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں دیوان خانہ دروازہ بند کر جاؤنگا۔ لیکن اُس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور دیوان خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ شیطان کو موقع مل گیا اور وہ اندر آگیا اور اُس نے یقیناً میرے دماغ میں حلول کر لیا ہے جو اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے آپ کو خلیفہ خیال کرنے لگا ہوں اللہ مجھے ایسے خیالات فاسدہ سے محفوظ رکھے۔"

یہ کہہ کر ابوالحسن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک غور کرتا رہا تھوڑی دیر کے بعد پھر آنکھیں کھولیں اور وہ سب ساز و سامان دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اور دعا مانگی کہ "خدا تعالیٰ مجھے شیطان کے مکر و فریب سے بچا۔" پھر اپنے دل میں ارادہ کیا۔ کہ بالکل خاموش پڑا رہے شیطان دوپہر تک خود بخود تھک کر چلا جائے گا لیکن محل کے لوگوں نے اسے اس طرح نہ رہنے دیا۔ راحت جان نامی ایک خواص ابوالحسن کے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"یا امیر المومنین اب آرام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح ہو گئی پھر دن نکل آیا ہے اُٹھئے سب لوگ حضور کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ابوالحسن نے کہا "اے شیطان مردود اُٹھ میرے پاس سے دفع ہو جا کیوں مجھے خواہ مخواہ امیر المومنین بناتی ہے۔"

راحت جان نے کہا "آپ درحقیقت امیر المومنین ہیں اور تمام مسلمانوں کے حاکم ہیں اور میں حضور کی ایک ادنیٰ کنیز ہوں شاید آپ نے کوئی خواب بد دیکھا جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اگر آپ اچھی طرح دیکھیں، تو ضرور آپ کا شک رفع ہو جائے۔ آپ کے حیران ہونے کی وجہ نہیں۔"

غرضیکہ راحت جان کے اس طرح باتیں بنانے پر ابوالحسن اُٹھ بیٹھا۔ اور آنکھیں کھول کر سیاک مردار بیدار اور دیگر کنیزوں کو پہچانا۔ وہ سب پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ اور کہنا شروع کیا۔

یا امیر المومنین! اُٹھئے دن ہو گیا ہے۔"

ابوالحسن نے آنکھیں کھول کر کہا "میں تو عاجز ابوالحسن ہوں اور اپنے آپ کو خوب جانتا ہوں۔ مجھے امیر المومنین کیوں کہتے ہو۔"

انھوں نے کہا "یا امیر المومنین! ہم تو ابوالحسن کو نہیں جانتے کہ وہ کون ہے آپ کیوں اس کا نام لے رہے ہیں اب پھر خدا کے لئے ایسا نہ کہیے گا کہ میں امیر المومنین نہیں۔"

ابوالحسن نے کہا کہ یہ عجب طلسم بازی ہے کہ میں اپنے آپ کو اس بارہ دری میں دیکھتا ہوں جس میں پہلے تھا اور وہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جو پہلے دیکھا تھا۔ پھر ابوالحسن کے دل میں سزا و قید سے ڈر پیدا ہو گیا۔ اور آنکھیں بند کر کے چپکے سے لیٹ گیا راحت نے کہا۔

"یا امیر المومنین آپ بیدار ہو جئے۔ تمام درباری سلام کی خاطر در دولت پر حاضر ہیں۔"

پھر دونوں خواصوں نے ابوالحسن کے بازو تھام کے اُٹھایا اور بارہ دری کی درمیانی مسند پر بٹھا دیا۔ اور تمام خواصیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کے رقص کرنے لگیں اور تمام ساز بجنے لگے جب چاروں طرف سے گانے بجانے کا شور اُٹھا تو ابوالحسن دل میں خیال کرنے لگا کہ میں واقعی امیر المومنین ہوں اُس نے چاہا کہ کچھ باتیں کرے لیکن شور و غل میں کچھ سنائی نہ دیا۔ پھر اس نے کوکب الصبح کو اشارہ سے بلایا اور کہا۔

"تو سچ بتا کہ میں کون ہوں۔"

اس نے جواب دیا "یا امیر المومنین! آپ امیر المومنین ہیں اور بھلا آپ ہی بتائیں کہ آپ امیر المومنین نہیں ہیں تو کون ہیں آپ نے کیوں اتنی

جلدی اپنے آپ کو بھلا دیا اگر آپ اجازت دیں۔ تو ہم وہ سب باتیں آپ کے سامنے بیان کریں جو آپ نے کی تھیں"۔

کوکب الصبح کی اس تقریر کی تمام خواجہ سراؤں اور خواصوں نے تائید کی اور کہا "حضور آپ اُٹھیں اور نماز فجر ادا کریں"۔

ابوالحسن نے کہا "اے شعبدہ سازو۔ اگرچہ تم سب حسین ہو لیکن عقل و فکر سے خالی ہو پہلے میں نے اس خواب کو دیکھ کر نہایت تکلیف اُٹھائی تھی۔ قید خانہ میں قید کیا گیا تھا اور پچاس تازیانے روز میری پیٹھ پر پڑتے تھے جن کی وجہ سے میرے بدن کی کھال تک اُتر گئی اور تمام بدن پر سیاہ داغ پڑ گئے"۔

کوکب الصبح نے کہا "یا امیر المومنین یہ سب باتیں آپ نے خواب میں دیکھی ہوں گی حضور تو کل سے یہیں ہیں کہیں نہیں گئے تمام رات اسی بارہ دری میں موجود تھے"۔ ابوالحسن نے کہا "بے شک تم سچ کہتی ہو اور دل میں خیال کیا کہ میں جب سے محل میں آیا ہوں۔ کہیں بھی باہر نہیں گیا اور اس امر میں متعجب ہوا کہ آیا میں اس قید خانہ اور مار کی حالت کو سچ جانوں یا اس کو۔ اور ان دونوں میں سے خواب کس کو تصور کروں پھر کہنے لگا "اے خدا میں امیر المومنین ہوں یا ابوالحسن ہوں جو کچھ ہے مجھ پر روشن ہو جائے"۔

پھر ابوالحسن نے اپنا تمام بدن کھول کر دکھایا۔ اور کہا کہ دیکھو کہ ان داغوں میں آج تک درد ہوتا ہے اور یہ ایک روشن دلیل ہے کہ میں ابوالحسن ہوں امیر المومنین نہیں ہوں۔ پھر ایک خواص کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے کہا "تو میرے کان کو کاٹ تاکہ میں تمیز کروں کہ میں سو رہا ہوں یا جاگتا ہوں"۔

خواص نے اس زور سے کاٹا کہ ابوالحسن تلملا اُٹھا اور درد سے چلّا کر شور و غل مچایا۔ اس کے یکبارگی شور کرنے پر خواصوں نے تمام ساز بجانے شروع کر دیئے۔ اور خواجہ سرا بھی ناچنے لگے۔ ابوالحسن یہ دیکھ کر خود بھی ناچنے لگا اور کودنے لگا اور حالت جوش میں اپنے تمام کپڑے اُتار ڈالے اور صرف ایک پاجامہ رہنے دیا۔ اور خود ناچتا ناچتا اتنا دُوہرا ہو جاتا کہ زمین کے ساتھ اس کا سر لگتا۔ غرضیکہ مسخرہ پن کی کوئی حرکت باقی نہ چھوڑی۔ خلیفہ اس حال کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اور ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ اور بے ساختہ کہنے لگا۔

"اے ابوالحسن خدا کے لئے ان حرکات کو موقوف کر کیا مجھے ہنسا تے ہنسا تے مار ڈالے گا"۔ خلیفہ کی یہ بات سن تمام ساز بجانے والوں نے ساز بند کر دیئے اور ابوالحسن بھی اس وقت اس طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سے یہ آواز آتی معلوم ہوئی تھی ابوالحسن نے خلیفہ کو دیکھ کر پہچان لیا اور کہا "آنجناب ہی سوداگر موصل بنے ہوئے تھے۔ اور پھر سمجھ گیا کہ یہ بیداری ہے خواب نہیں ہے"۔ اور بادشاہ نے یہ جو کچھ کیا ہے محض خوش طبعی اور مذاق کے طور پر کیا ہے۔ پھر خلیفہ سے کہا "سبحان اللہ کہ حضرت ہی سوداگر موصل کے لباس میں تھے اور میری تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا باعث ہوئے"۔

خلیفہ نے کہا "اے ابوالحسن بیشک تو سچا ہے اور میں انشاء اللہ تیری تمام تکالیف کی تلافی کروں گا اور تیرے ساتھ وہ سلوک کروں گا۔ جو آج تک کسی کے ساتھ نہ کیا ہو۔ پھر خلیفہ نے مسرور سے کہا۔

کہ ابوالحسن کو ایک نہایت عمدہ جوڑا پہناؤ۔ جب ابوالحسن کو پوشاک پہنا دی گئی۔ تو خلیفہ نے اسے گلے لگا لیا اور کہا "میں تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ اب جو تو کہے گا وہی کیا جائے گا"۔

ابوالحسن نے کہا "خداوندا! میرے ساتھ اس طرح مذاق کرنے میں حضور کو کیا فائدہ تھا؟"

خلیفہ نے اسے تسلی کے لئے سب حال اوّل سے آخر تک کہہ سنایا۔ اور کہا "اب تو خاطر جمع رکھ انشاء اللہ سب باتوں کی تلافی ہو جائیگی"۔

ابوالحسن نے کہا "خداوندا! جو تکلیف جناب کے اس مذاق میں مجھ پر گزری ہے۔ وہ مجھے تمام عمر یاد رہے گی..... میری ایک آرزو ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے"۔

خلیفہ نے کہا "میں تیری اس ایک تمنا کو پورا کرتا ہوں اور تجھے ہر وقت یہاں آنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

پھر خلیفہ نے ابوالحسن کو ایک مکان عطا کیا اور ایک ہزار اشرفی نقد دیں اور اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر جب خلیفہ دربارِ عام کو تشریف لے گئے۔ ابوالحسن اپنے گھر پر آیا اور اپنی ماں سے تمام واقعہ بلاکم وکاست بیان کیا اور کہا کہ جو واقعہ مجھ پر تھا۔ وہ سب صحیح اور درست تھا۔ اور عین بیداری کی حالت میں تھا۔ خلیفہ نے فی الواقعی مجھے اپنا مصاحب مقرر کیا ہے۔

ابوالحسن اور خلیفہ کا یہ قصہ تمام بغداد میں مشہور ہو گیا اور پھر وہاں سے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا پھر ابوالحسن ہر روز خلیفہ کے پاس رہتا اور اُسے اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے خوش رکھتا ایک دن خلیفہ ابوالحسن کو اپنے ہمراہ زبیدہ خاتون کے محل میں لے گیا۔ اور اس کے تمام قصہ کو بیان کیا جسے وہ سُن کر نہایت محظوظ ہوئی۔ پھر ابوالحسن خلیفہ کے ہمراہ زبیدہ کی خدمت میں جایا کرتا ایک دن اثنائے گفتگو میں زبیدہ نے خلیفہ سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ نزہت کی شادی ابوالحسن سے کر دی جائے کیونکہ وہ اکثر اس کو دیکھتا رہتا ہے اور نزہت بھی اس امر میں راضی ہے۔"

خلیفہ نے کہا "تُو نے یہ بات تو میرے دل کی کہی ہے کیونکہ میں نے بھی ابوالحسن سے وعدہ کیا تھا کہ تجھے ایک نہایت خوبصورت بی بی دونگا۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے آج ہی دونوں کی شادی کر دینی چاہیئے تاکہ وعدہ وفائی ہو جائے۔"

جس قدر خلیفہ ابوالحسن کو چاہتا تھا اسی قدر زبیدہ نزہت سے پیار رکھتی تھی۔ خلیفہ نے ابوالحسن کی شادی نہایت دھوم دھام سے کی اور زبیدہ نے بھی نزہت کو نہایت بیش بہا جہیز دیا۔ اور خلیفہ نے بہت سا سونا موتی نزہت کو عنایت کیا ابوالحسن نزہت کو اس مکان میں لے گیا جو خلیفہ نے اسے پہلے دے رکھا تھا پھر تمام اہلِ محلہ کی نہایت پرتکلف دعوت بطور ولیمہ کے کی اور کئی روز تک راگ رنگ کی محفل رہی نزہت اور ابوالحسن دونوں آپس میں نہایت پیار و محبت سے رہنے لگے اور آپس میں کبھی جدا نہ ہوئے سوائے ان اوقات کے جس وقت ابوالحسن خلیفہ کی خدمت میں جاتا اور نزہت زبیدہ کی خدمت میں جاتی نزہت نہایت پسندیدہ خصلت والی عورت تھی اور ابوالحسن جانُ دل سے اس پر فدا تھا ابوالحسن اور نزہت فطرتاً سخی تھے اس لئے کھانا اچھا کھاتے کپڑے اچھے پہنتے شراب بھی نفیس پیتے اس کے علاوہ جو کوئی محفل کا خواجہ سرائے یا کنیز وغیرہ ملنے کے لئے آتے تو انھیں بغیر کھانا کھائے نہ جانے دیتے اور حسب استطاعت بعض کو خلعت اور انعام وغیرہ بھی دیتے علاوہ اس کے گانے بجانے کا بھی شوق رکھتے اور سوائے معمولی کھانوں کے مٹھائیاں وغیرہ بھی کھاتے اور خوب سیر کرتے ایک مدت انھیں اشتغال میں گذر گئی اور جس قدر روپیہ پیسہ تھا سب صرف ہو گیا ابوالحسن نے خلیفہ سے عہد کر لیا تھا کہ وہ اب کوئی رقم نہ مانگے گا ادھر نزہت کا زبیدہ سے بھی اقرار تھا۔ اب دونوں بموجب اپنے وعدوں کے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ ایک دن باورچی نے بھی اپنا بھی حساب وغیرہ دکھایا اور توشہ خانہ والے نے بھی نفیس پوشاکوں کی قیمت طلب کی اور کئی ایک سوداگروں کی رقم بھی واجب الادا تھی جو کچھ ابوالحسن اور نزہت کے پاس تھا وہ سب انھیں کو دے ڈالا۔ لیکن پھر بھی کئی ایک رقوم واجب الادا رہ گئیں اور بسر اوقات میں بھی تنگی درپیش ہوئی۔ اب ابوالحسن نے نزہت سے کہا۔

"اب سوائے مکاری اور فریب کے گذارہ نہیں میں نے ایک تجویز سوچی ہے جس کے باعث ہم دونوں کچھ نہ کچھ روپیہ خلیفہ اور زبیدہ سے لے کر رہیں گے۔"

نزہت نے ابوالحسن سے پوچھا "وہ کونسا حیلہ ہے جو تم نے تجویز کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "یہ ہے کہ ہم تم دونوں مریں۔"

نزہت نے کہا "میاں تم مرتے ہو تو مرو میں تو نہ مروں گی۔" ابوالحسن نے کہا "آخر تم عورت ہو نا کہ مرنے کا نام سُن کر گھبرا گئیں۔ لیکن ابھی

مرنے کی کیفیت نہیں سُنی کہ وہ مرنا کس قسم کا ہوگا میری مراد مرنے سے درحقیقت مرنا نہیں بلکہ ایک جھوٹ موٹ کا فریب ہوگا۔"

نزہت نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بتاؤ میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ ..... "میں سیدھا لیٹ جاؤنگا اور اپنے آپ کو مُردہ بنا لونگا تم مجھے ایک سفید چادر سے کفنا دینا جیسے کہ میں درحقیقت مرگیا ہوں پھر ایک پگڑی میرے سر پر باندھ دینا اور میرے مرنے کی خبر مشہور کر دینا اور اپنے سر کے بال نوچتی ہوئی کپڑے وغیرہ پھاڑ کر زبیدہ کے پاس جانا اور میرے مرنے کا حال بیان کرنا وہ میری تجہیز و تکفین کے لئے تمہیں بہت کچھ دے گی وہ لے کر چلی آنا جب تم آؤ گی تو میں اُٹھ کھڑا ہوں گا۔ پھر تم اپنے آپ کو مردہ بنا لینا اور میں تمہیں کفن وغیرہ پہنا کہ خلیفہ کے پاس جاؤنگا اور تمہیں مردہ بیان کر کے کچھ کچھ وصول کر لونگا۔"

نزہت نے یہ سُن کر کہا "یہ حیلہ اور فریب تو نہایت مزے کا ہے۔ اس صورت میں واقعی بہت کچھ ہمارے ہاتھ لگ جائیگا۔"

پھر ابوالحسن ایک کمرہ میں لیٹ گیا اور نزہت نے اسے کفنا دیا اور وہاں سے روتی پیٹتی محل میں گئی۔ اور زبیدہ سے جاکر ابوالحسن کے مرنے کا حال بیان کیا۔ زبیدہ سُن کر بہت روئی اور محل کے تمام خواصوں نے افسوس کیا رونے دھونے کے بعد نزہت سے زبیدہ نے کہا۔

"وہ بے چارہ تمہاری وجہ سے مرگیا۔ تمہاری ہر روز کی فرمائشوں نے اسے تنگ کر ڈالا تھا۔"

نزہت نے کہا "میں تو اسے دل سے پیار کرتی ہوں۔ میں نے کبھی بھی اس کو تنگ نہ کیا تھا۔"

پھر زبیدہ نے ایک ہزار اشرفی نقد اور ایک جوڑا کمخواب کا نزہت کو دیا اور کہا "اسے اچھی طرح فاتحہ درود میں صرف کرنا۔" نزہت یہ رقم وغیرہ وہاں سے لے کر گھر کو آئی اور اشرفیاں وغیرہ ابوالحسن کو لاکر دیں ابوالحسن دیکھ کہ نہایت خوش ہوا اور پھر اس نے نزہت سے کہا: "اب تم جلد اپنے آپ کو مردہ بنا لو اور دیکھو کہ میں پھر کیا کام کرتا ہوں۔ اور خلیفہ سے کس طرح رقم وصول کرتا ہوں۔" غرضیکہ نزہت نے اپنے آپ کو مردہ بنا لیا ابوالحسن وہاں سے روتا پیٹتا عین دوپہر کے وقت خلیفہ کے سامنے پہنچا خلیفہ نے اسے اس حالت میں دیکھ کر تمام توجہ اس کی طرف پھیرلی۔ اور پوچھا۔ "ابوالحسن تو کیوں روتا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "خداوند! میری عورت نزہت مرگئی ہے۔"

خلیفہ نے یہ سُنکر بہت افسوس کیا اور خود بھی رو دیا۔ جعفر اور دیگر اراکین بھی ابوالحسن کو اس حالت میں دیکھ کر رو دیئے خصوصاً خلیفہ کو نزہت کی فوتیدگی سے بہت رنج ہوا۔ اور پھر ایک ہزار اشرفی اور کمخواب کا تھان دے کر کہا "جاؤ نزہت کی تجہیز و تکفین نہایت اچھی طرح کرو۔" ابوالحسن وہاں سے اشرفیاں وغیرہ لے کر سیدھا گھر آیا۔ اور آکر نزہت کو دکھلائیں۔ نزہت خوش ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ اب ادھر کی سُنیئے خلیفہ کو نزہت کے مرنے کا نہایت رنج تھا اور زبیدہ کو ابوالحسن کے مرنے کا داغ تھا۔ خلیفہ نزہت کے مرنے کا افسوس کرنے کے لئے زبیدہ کے محل میں گیا اُسے نہایت مغموم دیکھ کر اُس کی تسلی وغیرہ کی اور کہا۔

"اگرچہ تمہاری کنیز نہایت اچھی اور وفادار تھی لیکن قضائے الٰہی کے آگے کچھ پیش نہیں چلتی۔"

زبیدہ یہ سُنکر حیران ہوئی۔ اور خیال کیا کہ شاید خلیفہ کو کچھ دھوکا ہو گیا ہے جو بجائے ابوالحسن کے مرنے کے نزہت کے مرنے کا نام لیتے ہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"خداوند! میری کنیز نزہت تو زندہ ہے۔ حضور کا مصاحب ابوالحسن چل بسا ہے۔" خلیفہ حیران ہو کر مسرور سے مخاطب ہوا کہ "زبیدہ نے جو کہا ہے۔ تم نے سُنا؟"

مسرور نے کہا "مجھے شاہزادی کی عقل پر تعجب ہے۔ کہ ایسا خلاف واقعہ قصہ بیان کیا۔"

خلیفہ نے کہا "تم میرے مصاحب ابوالحسن کے لئے آنسو نہ بہاؤ۔ وہ تو تندرست ہے۔ اپنی کنیز نزہت کا غم کرو۔ جو مرگئی ہے۔ ابوالحسن ابھی

تھوڑی دیر ہوئی ہے میرے پاس روتا ہوا آیا تھا۔ اور اُس نے نزہت کے مرنے کا حال بیان کیا تھا۔ میں نے اُس کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک ہزار اشرفی اور ایک تھان کمخواب کا دے دیا تھا۔ مسرور اس وقت موجود تھا۔ اُس نے ابوالحسن کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اگر تمھیں کچھ شُبہ ہو تو اُس سے پوچھ لو۔"

زبیدہ نے کہا "تم کو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ مرا تو ابوالحسن ہے تم تعزیت میری لونڈی کی کرتے ہو۔ ہمارا تمھارا فرض ہے کہ ابوالحسن کا غم کریں۔"

خلیفہ نے کہا "میں سچ کہتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا میرا مصاحب ابوالحسن جیتا ہے۔"

زبیدہ نے کہا "تم جھوٹ کہتے ہو۔ بلکہ میری بیوہ کنیز زندہ ہے ابھی تھوڑا ہی وقفہ گذرا ہے کہ وہ بے چاری میرے پاس روتی ہوئی آئی تھی۔ اور اُس کی حالت دیکھ کر میں بھی روئی۔ اور دیگر خواصیں بھی روئیں۔ پھر میں نے اسے ایک ہزار اشرفی اور ایک تھان کمخواب کا دیا۔ تاکہ وہ ابوالحسن کی تجہیز و تکفین اچھی طرح کرے اور میں ابھی اس خیال میں تھی۔ تم کو تمھارے مصاحب کے مرنے کی اطلاع کرتی کہ اتنے میں تم خود آ گئے۔"

غرضیکہ اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ خلیفہ کہتا۔ کہ ابوالحسن زندہ ہے اور نزہت مر گئی ہے۔ زبیدہ کہتی کہ نہیں۔ نزہت زندہ ہے اور تمھارا ابوالحسن مصاحب مر گیا ہے۔ آخر اس حیص بیص میں خلیفہ کو غصہ آ گیا۔ اور اس نے مسرور سے کہا کہ جلد جا کر دیکھ کہ دونوں میں سے کون مرا ہے۔ اور کون زندہ ہے۔ تاکہ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔ جب مسرور گیا تو خلیفہ نے کہا "ابھی پتہ چل جاتا ہے۔ کہ کون سچ کہتا ہے۔ اور کون جھوٹ کہتا ہے"۔ زبیدہ نے کہا "دیکھنا میں سچی ہوں گی" آخر دونوں کی شرط لگ گئی۔ کیونکہ دونوں کو اپنے سچے ہونے کا یقین تھا۔ خلیفہ نے کہا "اگر میں جھوٹا ہوا۔ تو تمھیں فلاں باغ دے دونگا۔ اگر تم جھوٹی ہوئیں تو تمھارا فلاں محل لے لونگا۔" زبیدہ بھی اس شرط پر راضی ہو گئی۔ اور دونوں مسرور کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ابوالحسن بھی سمجھتا تھا کہ اس معاملہ میں زبیدہ اور خلیفہ کی ضرور تکرار ہو گی۔ اس لئے اس نے بھی آگے کا انتظام سوچ رکھا تھا۔ اور اپنی بی بی نزہت سے اسی بارے میں مشورہ کر رہا تھا۔ اتنے میں کھڑکی سے جو جھانک کر دیکھا تو مسرور کو آتے ہوئے پایا اور اپنی بیوی نزہت سے کہا "تم جلد پھر اپنے کو مردہ بنا لو۔"

وہ ابوالحسن کے کہنے پر کفن پہن کر لیٹ گئی اتنے میں مسرور مکان میں داخل ہوا۔ اور دیکھا کہ نزہت کی لاش کمرہ میں کفنائی ہوئی رکھی ہے۔ اور ابوالحسن اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔ مسرور بھی اس کے ساتھ رو دیا اور دل میں خوش ہوا کہ شکر ہے بادشاہ کی بات سچی ہوئی۔ پھر مسرور نے کپڑا اُٹھا اس کا چہرہ دیکھا اور کہا "بہن نزہت بڑی اچھی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے قضا و قدر سے کچھ چارہ نہیں۔ ہم سب کے لئے یہی راستہ ہے اچھا اللہ اس پر رحم کرے اور تم کو صبر بخشے۔" پھر ابوالحسن سے کہا۔

"بھائی عورتیں بھی عجب ناقص العقل ہیں خواہ مخواہ ناحق بات پر تکرار کر بیٹھتی ہیں اور دوسرے کی بات کو سُنتی ہی نہیں۔ باوجود عقلمند ہونے کے زبیدہ بھی کہے جاتی ہے کہ ابوالحسن مر گیا ہے۔ اور نزہت زندہ ہے۔ اور خلیفہ کے ساتھ اس بات پر تکرار ہو رہی ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "خدا خلیفہ کو ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔ انھوں نے میری اس مصیبت میں کمال ہمدردی فرمائی ہے میں خود حاضر ہو کر تمام شک و شبہ کو دور کر دیتا۔ مگر کیا کروں۔ لاش اکیلی نہیں چھوڑ سکتا۔"

مسرور نے کہا "اگر مجھے واپس جانا نہ ہوتا۔ تو میں تمھارے ساتھ تمھارے اس حال میں شریک رہتا۔ لیکن کیا کروں۔ مجھے جلد واپس جانے کا حکم ہے۔" یہ کہہ کر مسرور واپس چلا گیا۔ نزہت اُٹھ بیٹھی۔ اب ابوالحسن نے کہا "دیکھنا کہ ابھی کوئی نہ کوئی زبیدہ کی طرف سے آیا چاہتا ہے۔" نزہت نے اپنا لباس پہن لیا۔ اور پھر دونوں میاں بیوی دروازہ میں بیٹھ کر کسی نئے آنے والے کا انتظار کرنے لگے مسرور جب محل میں داخل ہوا۔ تو نہایت خوش خوش تھا اور اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجاتا تھا۔ جس کا یہ مطلب تھا۔ کہ خلیفہ سچا ہے۔ اور شرط جیت گیا ہے۔ زبیدہ نے خفا ہو کر پوچھا۔

"او شریر سیاہ حبشی۔ سچ بتا کون زندہ ہے اور کون مرا ہے؟"

اس نے کہا "خداوند نزہت الاوداح مر گئی ہے۔ اور ابوالحسن اُس کے غم میں رو رہا ہے۔"

خلیفہ یہ سُنکر اُچھلا اور ہنسا اور زبیدہ سے کہا کہ اب میں نے فلاں محل جیت لیا ہے۔ پھر مسرور سے کہا کہ وہاں کا تمام واقعہ جو کچھ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تفصیل وار بیان کر۔ مسرور نے تمام واقعہ مفصل بیان کیا پھر خلیفہ نے زبیدہ سے کہا۔

"اب بھی تم کو یقین آیا ہے یا نہیں"۔ زبیدہ نے کہا یہ غلام کاذب اور منتری ہے میں ہرگز اس کی بات پر یقین نہ کروں گی"۔

مسرور نے بہتیرا کہا کہ بی بی تمہاری قسم اور خلیفہ کی عمر کی قسم ابوالحسن زندہ ہے اور نزہت الارواح مرگئی ہے زبیدہ لال پیلی ہوکر یہی کہتی رہی۔ "دیکھو میں ابھی تم سے سمجھتی ہوں"۔

پھر اُس نے اپنی تمام خواصوں کو بلایا۔ وہ سب آئیں۔ اُن سے پوچھا۔ کہ خلیفہ کے تشریف لانے سے پیشتر کون میرے پاس روتا ہوا آیا تھا۔ کنیزوں نے کہا۔ "نزہت الارواح آئی تھی"۔ پھر زبیدہ نے اپنی خزانچی خواص سے کہا کہ تو بھی بتلا۔ کہ میں نے کس کو تجھ سے تھان اور اشرفیاں دلوائی تھیں۔ اس نے جواب دیا۔ "نزہت کو"۔ پھر زبیدہ نے غصہ میں آکر کہا۔ "او مسرور شریر! تجھے جھوٹ بولنے میں کیا فائدہ ہے"۔

مسرور تو خاموش ہو گیا۔ خلیفہ نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جس نے عورت کی نسبت ناقص العقل کہا ہے، بالکل درست ہے"۔

زبیدہ نے کہا "بے ادبی معاف مسرور کی آپ سے سازش ہے۔ مجھے بھی اجازت دیں کہ میں کسی اپنے آدمی کو بھیجکر اصل معاملہ کی تحقیق کروں"۔

خلیفہ نے اجازت دی زبیدہ نے اپنی دایہ کو بلایا۔ جو نہایت ضعیف تھی اور اُس سے کہا کہ "والدہ تو جا کر تحقیق کر کہ نزہت الارواح مری ہے یا ابوالحسن۔ اگر تو آکر سچ سچ بتائے گی تو میں تجھے انعام دوں گی"۔

دایہ وہاں سے رخصت ہو کر ابوالحسن کے گھر کی جانب چلی ابوالحسن نے جب اسے آتے دیکھا تو سمجھ لیا۔ کہ یہ ضرور زبیدہ کی طرف سے آئی ہے فوراً اپنے آپ کو مُردہ بنا لیا۔ اور کفن پہن کر لیٹ گیا۔ نزہت نے اس پر کپڑا ڈال دیا۔ اور اپنے بال نوچ نوچ کر رونے لگی جب دائی اندر داخل ہوئی تو اس نے نزہت الارواح کو روتے ہوئے دیکھا۔ کہ وہ کہہ رہی ہے کہ "پیارے ابوالحسن میں تمہارے بعد اس دُنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ خدا نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کیا دایہ نے دیکھا کہ یہاں تو مسرور کے خلاف واقعہ ہے۔ لعنت ہو اس پر اُس نے خواہ مخواہ کا گھر میں ایک جھگڑا پیدا کر دیا ہے نزہت الارواح نے کہا "اماں جو مسرور نے کہا۔ کاش وہی سچ ہوتا۔ تو میں آج اس دُکھ میں نہ پڑتی اور بیوگی کی مصیبت نہ دیکھتی"۔ یہ کہہ کر رونے لگی۔ اور دائی کو بھی اُس کی حالت دیکھ کر رونا آ گیا پھر اس نے ابوالحسن کے مُنہ سے کپڑا اُٹھا کر دیکھا۔ اور کہا "اے ابوالحسن خدا تجھ پر رحم کرے" اور نزہت الارواح سے کہا "بیٹی اگرچہ میں چاہتی ہوں۔ کہ تیرے رنج میں شریک رہوں۔ لیکن کیا کروں۔ مجھے جلد واپس جانا ہے زبیدہ خاتون میری منتظر ہو گی اُس نمک حرام مسرور نے اپنی دروغ گوئی سے انھیں آپس میں ناخوش کر رکھا ہے"۔ یہ کہکر دایہ محل کو واپس لوٹ گئی۔

اس کے جانے کے بعد ابوالحسن بھی اُٹھ بیٹھا۔ اب دونوں میاں بیوی دروازہ میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ کہ دیکھئے اب کیا نیا شگوفہ پھوٹتا ہے

اس بڑھیا نے جو کچھ دیکھا تھا محل میں جا کر زبیدہ سے بیان کیا۔ زبیدہ نے بڑھیا سے کہا۔ کہ تو یہی سب کچھ خلیفہ کے پاس جا کر بیان کر۔ اس دایہ نے مسرور سے مخاطب ہو کر بیان کیا۔ "کہ تو نہایت دروغگو ہے۔ جو اپنے آقاؤں کے سامنے جھوٹ بولتا ہے۔ نزہت الارواح تو زندہ ہے۔ اور ابوالحسن مرگیا ہے۔ میں نے اُس کی لاش کو بچشم خود دیکھا ہے اور نزہت اُس کے سرہانے بیٹھی رو رہی ہے"۔

مسرور نے کہا۔ "او چھنالہ تو بڑی مکارہ ہے کہ دن دہاڑے ہماری آنکھوں میں خاک جھونکتی ہے۔ میں ابھی دیکھ کر چلا آ رہا ہوں۔ کہ نزہت مرگئی ہے اور ابوالحسن اُس کے سرہانے اس کی ماتم داری کر رہا ہے"۔

بڑھیا نے کہا۔ "مسرور تو بڑا بے حیا ہے اور کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتا ہے۔ میں خود ابوالحسن کو مرا ہوا دیکھ کر آئی ہوں"۔

مسرور نے کہا کیا تو مجھے فریب دینا چاہتی ہے"۔

زبیدہ نے خلیفہ سے کہا۔ "تم اپنے غلام کی باتیں سن رہے ہو کہ یہ کیسی بک بک کر رہا ہے۔ اور میری دایہ سے گستاخی کلام کر رہا ہے لیکن

تم اسے ذرا بھی منع نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر زبیدہ کھسیانی ہو کر رونے لگی۔

خلیفہ یہ تمام تماشہ دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ ادھر مسرور، دائی اور دیگر خواصیں سب حیرت زدہ ہو کر چپ ہو گئے کچھ دیر ٹھہر کر خلیفہ نے زبیدہ سے کہا "بی بی اس معاملہ میں ہم سب ایک دوسرے کے سامنے جھوٹے ہیں۔ اور اس طرح اس امر کا فیصلہ ہونا ناممکن ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم سب ابوالحسن کے مکان پر چلیں اور وہاں جا کر اس امر کی تحقیق کریں کہ کون مرا ہے۔ اور کون زندہ ہے۔" سب نے خلیفہ کی اس رائے پر اتفاق کیا اور خلیفہ مع زبیدہ، مسرور، دائی اور دیگر خواصوں کے ابوالحسن کے مکان کی جانب چلا۔ ابوالحسن کا مکان خلیفہ کے محل کے مقابل واقع تھا۔ راستہ میں بھی مسرور اور دائی ایک دوسرے سے بُرا بھلا کہتے رہے۔ حتٰے کہ ابوالحسن کے مکان کے قریب پہنچ گئے۔ جب ابوالحسن نے ان سب کو آتے دیکھا۔ تو نزہت سے کہا۔

"لو اب سب کے سب آ رہے ہیں۔" نزہت یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ کہ اب ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ لیکن ابوالحسن نے تسلی دی اور کہا "بالکل نہ گھبراؤ۔" پھر ابوالحسن اور نزہت دونوں اپنا اپنا کفن پہن کر اور تھان سے مُنہ ڈھانپ کر کمرہ میں مردہ کی طرح لیٹ گئے۔ جب یہ سب پارٹی مکان میں داخل ہوئی تو انہوں نے ابوالحسن اور نزہت دونوں کو مردہ پایا۔ سب حیران ہو گئے۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ زبیدہ نے کہا "کیسا غضب ہے کہ دونوں ہی چل بسے" پھر خلیفہ اور مسرور وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا" دیکھو تمہاری تکرار اور بار بار آدمی بھیجنے سے میری پیاری کنیز نزہت بھی فوت ہو گئی۔ ایک تو وہ اپنے خاوند کے مرجانے سے غم میں تھی دوسرے تمہارے تجسس نے اسے ہلاک کر دیا۔"

خلیفہ نے زبیدہ سے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح پر نہیں بلکہ ابوالحسن نزہت پر عاشق تھا۔ اس کی موت سے یقیناً اس کو صدمہ پہنچا۔ اور وہ بھی مر گیا۔ اب میں شرط جیت گیا۔ اور تم لازمی طور پر ہار گئیں۔ لہٰذا تمہارا محل میرا ہوا۔ زبیدہ نے کہا نہیں تم ہار گئے۔ اور وہ تمہارا باغ میرا ہو گیا۔ کیونکہ ابوالحسن پہلے مرا ہے۔ پھر ان باتوں میں خلیفہ اور زبیدہ کے درمیان تکرار ہونے لگی۔ اور ادھر دائی اور مسرور بھی آپس میں جھگڑنے لگے۔ خلیفہ کچھ سوچنے کے بعد ان دونوں جنازوں کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ اسے ابھی ایک ہزار اشرفی دونگا۔ جو مجھے یہ بتائے گا کہ پہلے کون مرا ہے۔"

ابوالحسن نے اپنے تابوت سے آواز دی۔

"پہلے میری موت ہوئی۔ مجھے ہزار اشرفی دیجئے۔" پھر ابوالحسن اُٹھ بیٹھا اور خلیفہ کے قدموں پر گر پڑا۔ ادھر نزہت اُٹھ بیٹھی۔ اور اپنی مالکہ کے قدموں پر گر گئی۔ زبیدہ ڈر گئی۔ کہ مُردے جی کر مجھے اور خلیفہ کو چمٹ گئے ہیں۔ جب زبیدہ کا وہم اور خوف کچھ دور ہوا تو کہنے لگی کہ اے کمبخت تجھے کیا ہو گیا تھا۔ تیری اس حرکت کی بدولت ہمارا تمام دن لڑنے جھگڑنے میں گذرا۔ خیر میں نے تیرا قصور معاف کر دیا۔ یہی غنیمت ہے۔ کہ تجھے زندہ و سلامت پایا۔ اسی طرح خلیفہ بھی ابوالحسن کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اور خوش ہوا۔ اور ابوالحسن سے کہا نالائق تجھے یہ کیا سوجھی تھی۔ کہ تو نے اس فریب سے مجھے تمام دن جھگڑے میں رکھا۔ اور کتنی آدمیوں کو پریشان کیا۔"

ابوالحسن نے کہا "خداوند اب میرا حال بھی سنئیے میں جب مجرد تھا۔ نہایت آرام سے رہتا تھا۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے کئی ایک قسم کے مصارف کی وجہ سے مقروض و زیر بار ہو گیا ہوں۔ آپ نے اور زبیدہ خاتون نے جو کچھ دیا تھا وہ سب خرچ ہو گیا قرضخواہوں نے سختی سے جب تقاضا کیا تو ہم نے جو کچھ باقیماندہ رہ گیا تھا سب دے ڈالا جب ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ تو ہم نے بہت سی تدبیریں سوچیں اور سوائے حیلہ و فریب کے جو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اور کچھ دماغ میں نہ آیا۔"

خلیفہ ابوالحسن کی صاف بیانی پر نہایت خوش ہوا۔ اور اُس کا قصور معاف کر دیا۔ اور پھر ابوالحسن اور اس کی بیوی کو ایک ایک ہزار اشرفی اور عنایت کیں۔ اور پھر ابوالحسن اور نزہت خلیفہ کی مہربانی سے اپنی تمام عمر نہایت اچھی طرح بسر کرتے رہے اور ہمیشہ شاد و خرم رہے۔

(۲)

ناولوں کا دور

مولوی نذیر احمد

بھروسا

کلیم شیخ چلّی کے سے منصوبے سوچتا۔ اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی۔ لیکن مرزا جیسے نکمّے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی۔ تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی۔ کہ شاید اُس کا نانا (وہ بھی حقیقی نہیں) ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار، دوسرے اعتبار منصب، اردلی کا جمعدار، تیسرے اُن دنوں کی بے عنوانی۔ اُس پر خود اُس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا، یہاں تک کہ اُس کا اعتداد دہلی کے زرداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے (باوجودیکہ دور کی قرابت تھی) حسبتہً للہ اُس کا تکفّل اپنے ذمّے لیا، جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اُس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اُس کے بیٹے۔ پوتے۔ نواسے کثرت سے تھے اُنھوں نے اعتنا نہ کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر اُن کے ورثا نے بہزار دقّت محلسرا کے پہلو میں ایک چھوٹا سا قطعہ رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینے کے کرایہ کی دو دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی تین آدمی۔ اور سات روپیہ کی کل کائنات۔ اُس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی اُن میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان۔ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا۔ اور وہ لوگ اس کے اِدّعائی رشتے ناتوں سے جلتے اور دِق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا۔ اُس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ اِن کی دیکھا دیکھی اُس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نبھے تو کیسے نبھے۔ دو دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہت بکی، مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کو جب دیکھو۔ پاؤں میں ڈیوڑھ حاشیہ کی جوتی۔ سر پر دُہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ہلکی تن زیب۔ نیچے کوئی طرحدار سا ڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات نگہ سات روپیہ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کاشانی مخمل کی آصف خانی۔ جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سُرخ نیفہ کا پائجامہ۔ اگر ڈھیلے پائچوں کا ہوا تو کلی دار۔ اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ موہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں۔ اور اوپر جلد بدن کی طرح مڑھا ہوا ریشمی۔ ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اور اُس میں بے قفل کی کنجیوں کا گُچھا۔ غرض دیکھا۔ تو مرزا صاحب اِس ہیئت کذائی سے چھیلا بنے سر بازار چھم چھم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ اب چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی کہ گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی۔ لیکن صبح کو بلا ناغہ آتے۔ اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا سب ترکہ مرزا کو ملا اور جمعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔ اور اِسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا۔ تو سیدھا جمعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کے کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں۔ اور اُن میں سے ایک نے پوچھا کہ "کون صاحب ہیں؟ کون صاحب ہیں؟ اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟"

کلیم - جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی - کون مرزا؟

کلیم - مرزا ظاہر دار بیگ، جن کا یہ مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی - یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کہ قریب تھا کہ لونڈی کواڑ بند کرے۔

کلیم - کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محلسرائے نہیں ہے؟

لونڈی - ہے کیوں نہیں۔

کلیم - پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے؟ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی - جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ مرزا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہے۔؟

دوسری لونڈی - اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بنایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نہ جن کی رنگت زرد زرد ہے؟ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم - ہاں ہاں! وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی - تو میاں اس مکان کے پچھواڑے اُپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اُس میں رہتے ہیں۔

کلیم نے وہاں جا آواز دی۔ تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب۔ ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے

اور بولے آہا آپ ہیں! معاف کیجیئے۔ میں سمجھا، کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں۔ تو آپ کے ہمرکاب چلوں۔

کلیم ۔ چلیئے گا کہاں؟ میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا۔

مرزا ۔ پھر اگر کچھ دیر تشریف رکھنا منظور ہو۔ تو میں اندر پردہ کرا دوں۔

کلیم ۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا ۔ بسم اللہ تو چلئے اِسی مسجد میں تشریف رکھیئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے، میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا، تو معلوم ہؤا کہ ایک نہایت چھوٹی سی مسجد ہے، وہ بھی ویران، وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے، نہ مُلّا، نہ طالب علم، نہ مسافر۔ ہزارہا چمگادڑیں اُس میں رہتی ہیں کہ اُن کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار ناچار اُسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اِتنی دیر کرکہ جب کلیم مایوس ہوچکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفعِ دخلِ مُقدّر فرمانے لگے "کہ بندہ کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے، خفقان کا عارضہ، اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا۔ تو اُن کو غشی میں پایا۔ اِس وجہ سے دیر ہوئی" پہلے تو یہ فرمائیے کہ اِس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سُنایا۔

مرزا ۔ پھر اب کیا اِرادہ ہے؟

کلیم ۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا ۔ خیرِ نیتِ شب حرام۔ صبح تو ہو۔ آپ بے تکلّف اِستراحت فرمائیے، میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں، اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اُس کی علالت میں اِشتداد ہے۔

کلیم ۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دُہری محلسرائیں۔ متعدد دیوان خانے، کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی مِلک نہ بنایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک مُتنفّس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ مُیسّر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے۔ اُن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تم جمعدار کے تمام ترکہ پر قابض اور مُتصرّف ہو۔ لیکن میں اُس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمّہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا ۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدّت مجھ سے آپ سے محبّت رہی۔ مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں اُس کی ایک وجہ ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنّیٰ کیا تھا۔ اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف و آگاہ ہیں۔ اُن کے انتقال کے بعد لوگوں نے اِس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہوگیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ۔ بند و بست کا حوصلہ نہیں۔ اُسی روز سے واویلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منالے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپنے اِس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔
مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا۔ تو استقلالِ مزاج سے بے بہرہ اور غیرت وحمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجیے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔
کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔
مرزا۔ چراغ کیا! میں نے تو لمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہوجیئے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرمی شروع ہوں گی۔ اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گی۔ تھوڑی دیر صبر کیجیئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اُس نے کھانے کی مطلق پروانہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہدوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا۔ کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اُس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا، اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہونا چاہتا ہے۔ تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ "سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا"

مرزا۔ سچ کہتے ہو! نہیں۔ جھوٹ بہکاتے ہو۔
کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔
مرزا۔ مردِ خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اِتنی رات گئے کیا ہوسکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ ویسے اشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے بھنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کے مجھ کو تم کو دونوں کو کافی ہوں گے۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اُٹھ باہر گئے۔ اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے۔ ہاتو کم کے لائے۔ یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے! اس واسطے کہ کلیم کے روبرو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔
مرزا۔ یار! ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ذرا واللہ، ہاتھ تو لگاؤ۔ دیکھو تو کیسے جھلکس رہے ہیں! اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن ہو۔ کمال بھی کیا چیز ہے! دیکھئے اتنی تو رات ہو گئی ہے۔ مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سُنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھیئے۔ کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور ہے۔ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے۔ کوئی پستئی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں

صدہا قسم کے غلّے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذّت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے۔

کلیم۔ فرمائیے۔

مرزا۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں۔ جن کو ارزاقِ عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریادی کر گیا۔ کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ کہ جوں میں نے زمین سے سر نکالا ہر متنفس چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں۔ کسی پر نہیں ہوتے نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں۔ اور مجھے کچّے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بارور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آدمی بکری بن کر لاکھوں مَن بوٹ چر جاتے ہیں۔ اِس سے نجات ملی۔ تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکّا تو شاخ، برگ۔ بھُس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ۔ اُس کو چکّی میں دلیں۔ گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں۔ گھنگنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیلؑ کے دربار میں اِس طرح بیباکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اِس قدر ناخوش ہوئے۔ کہ ہر شخص اُسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر چنا بے انتظارِ حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذّت کے بنے ہیں۔ کہ فرشتوں کے دندان آز بھی اِن پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اِس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا، ورنہ میر مُدّہ کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھاپن کہاں!

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اُس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا۔ اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی۔ جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا۔ تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی؛ نہ مونس، نہ غم خوار۔ نہ نوکر، نہ خدمت گار، مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا، جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار۔ یا قفس میں مرغِ نو گرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اُسی وقت نہیں تو سویرے گجر دم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور ہی مضمون سوجھتے تھے۔ اُس نے رات بھر میں ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں طیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے آنکھ لگ گئی۔ تو نہیں معلوم مرزا یا محلہ کا کوئی عیّار۔ ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ۔ دری۔ یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے مُنفک اور اُس کے جسم سے جُدا تھی لے کر چمپت ہوا۔ یوں ہی کلیم بہت دیر کو سو کر اُٹھتا تھا اور آج تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پَہر سوا پہَر دن چڑھے جاگا۔ تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھُپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلبِ ماہیت ہو کر میں بھُتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اُس میں پانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ اِدھر کو آ نکلے۔ تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اِس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے! ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جونہی زینہ پر چڑھا کہ کلیم عرضِ مطلب کے لئے لپکا وہ لڑکا اُس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے اُس نے اُس کو بھوت سمجھا۔ یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اُس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی۔ اور جب اندھیرا ہوا۔ تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی۔ تو یہ جواب مِلا کہ وہ بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کرے ممکن ہو۔ تو منہ دھونے

کو پانی مانگے۔ اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اُس نے کہا۔ "کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں"۔ اندر سے آواز آئی کہ "ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔"

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے۔ اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بہت دوستی ہے۔ بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھر والے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے۔ جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ اور دری کا نام سُن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا۔ کہ اندر سے آواز آئی: "مرزا زبردست بیگ دیکھنا! یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ اور دری تو اس سے لے لو۔ کلیم یہ بات سُن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جا لیا۔ ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوقِ معرفت ظاہر کیے۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پر۔ اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سُنا۔ اور کلیم سے اُس کا حسب اور نسب پوچھا۔ ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھینپتا تھا مگر چار و ناچار اُس کو بتانا پڑا۔ لیکن اُس کی حالتِ ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اُس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوتوال نے سُن کر یہی کہا کہ "میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو۔ میں اُن کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے۔ کہ اُن کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے۔ جو تم نے اپنا بیان کیا۔ محلہ کا پتا گھر کا نشان جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اُس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمہاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں۔ بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی۔ مجھ کو باور نہیں ہوتا۔ اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے۔ جُرم سنگین ہے۔ ان کو حوالات میں رکھو۔ صبح ہو۔ میں اِن کے والد کو بلواؤں۔ تو اِن کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سُن کر رو دیا۔ اور کہا میں وہی بدنصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سُنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو۔ تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں۔ چنانچہ کل سب کہ جو کچھ مسجد اور مرزا کی شان میں کہا تھا سُنایا۔ اُس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے۔ اور اُن کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ اِن کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا۔ ورنہ واپس لا کر حوالات میں قید رکھنا۔

کلیم پر، اِس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا، جیسا کچھ شاق گزرا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ سپاہی اُس کو کشاں کشاں لے ہی گئے۔ محلّہ کی مسجد جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا۔ اُس کے گھر سے بہت قریب تھی۔ صحن میں ایک شاداب چمن تھا۔ اور چمن کے بیچوں بیچ ایک مرتفع چبوترہ عجیب تفریح کا مقام تھا۔ نصوح بیشتر نمازِ عشا کے بعد خصوصاً چاندنی راتوں میں اُس چبوترہ پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خداوند تعالیٰ کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اُس کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور نصوح کو وعظ و پند کے طور پر اُن کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔

نصوح اور اُس کے مستمعین مسجد کے چبوترہ پر جمع ہو چلے تھے کہ کوتوالی چبوترے کے سپاہی کلیم کو لئے ہوئے آ پہنچے۔ بہ اتفاق منجانب اللہ شاید اِس وجہ سے پیش آیا۔ کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اِس وجہ سے ذلیل تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے۔ اُن کے سامنے اُس کی گردن نخوت نیچی ہو۔ اب وہ انھیں نماز و ذلیلوں اور مردہ شوہوں اور بھک منگوں اور ٹکڑ گداؤں کے روبرو اِس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی طرح دو سپاہی اُس کی گردن پر سوار تھے۔ نہ سر پہ ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ دو وقت کے فاقے سے مُنہ سوکھ کر فدی سا نکل آیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ حال تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہوتا۔ تو بہتر تھا۔

جوں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی۔ گویا اک تیر سا کلیجے میں لگ گیا۔ اگر پہلا سا نصوح ہوتا۔ تو نہیں معلوم عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر روتا یا سر پیٹنے لگتا۔ یا دوڑ کر بیٹے کو لپٹ جاتا۔ یا سپاہیوں سے بے پوچھے گچھے دست و گریبان ہو پڑتا۔ خدا جانے اضطراب جاہلانہ میں کیا کرتا۔ مگر اب اُس کی جملہ حرکات و سکنات مُعلّم دینداری کی مطیع اور مؤدّب خدا پرستی کی تابع تھیں۔ اُس نے ایک دم سرد بھر کر انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون تو کہا اور اُف بھی نہ کی۔ سپاہیوں نے اُس سے کلیم کی نسبت پوچھا تو اُس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا کہ "جب حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو ڈوبتے دم تک بیٹا بیٹا پکارے گئے تو میں اِس کے فرزند ہونے سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں" سپاہی تو اِتنا سُن کر رخصت ہوئے اور کلیم کو رفقائے نصوح میں سے کسی نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔

نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ کیوں کلیم! میں نے ایسا کونسا قصور کیا تھا۔ کہ تم کو میری طلعتِ منحوس تک دیکھنی گوارا نہ ہوئی۔ تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ شفقت اولاد ماں باپ کی طینت میں مُخمّر اور اُن کی جبلت میں داخل ہے۔ وہ شفقت جو اِس وقت مجھ کو اِس بات کی مُحرّک ہوئی کہ میں سپاہیوں کے پنجے سے تمہاری نجات کا باعث ہُوا۔ وہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی تھی اور کرتی ہے اور کرے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں۔ جو تمہاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو۔ میں نے تم سے نہیں کہا۔ کہ میرے لئے کمائی کرو۔ میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اُٹھاؤ۔ اگر میں ایسا کہتا بھی۔ تو مجھ کو اُس کا منصب اور حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا۔ وہ تمہارے ہی کام آوے گی اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمہیں کو آرام دے گی۔ اگر کسی بیمار کا طبیبِ مہربان سے پرہیز کرنا۔ کسی سیّاح کا بدرقہ خیر خواہ سے گریز کرنا روا ہے۔ تو بیشک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم؟ کیا ہمیشہ تمہاری خوشی مجھ کو منظور تمہاری رضا جوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی اب جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اپنا عدو ٹھہرایا۔ تو دشمنی کا سبب؟ عداوت کا موجب؟

میں نے سُنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنوں اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو۔ سو میں اِس تشخیصِ صحیح اور تجویزِ درست اور اِس فراستِ صائب پر جرح نہیں کرتا۔ میں باؤلا اور سڑی اور پاگل سہی۔ لیکن اگر کوئی باؤلا تمہاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے۔ تو کیا اُس کی بات نہ سُننا۔ اُس کی نصیحت کو نہ ماننا۔ اُس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا، شیوۂ دانشمندی ہے؟ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیئے تھا اور چاہیے کہ آیا میں اکیلا اِس جنوں میں مبتلا ہوں۔ یا اور بندگانِ خدا بھی میری ہی سی رائے، میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں۔ کلیم! میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ جتنے بزرگانِ دین ہو گزرے ہیں (خدا اُن کی پاکیزہ اور مطہّر روحوں پر رحمتِ کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا اُن کی حیات میں برکت دے) کوئی اِس جنون سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو۔ جتنا یہ جنون زیادہ۔ اُسی قدر برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔ کیا اس بات کا اقرار کرنا جنون ہے کہ ہم بندے ہیں اور اُس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے۔ جس نے ہم کو پیدا کیا۔ جو ہم کو روزی دیتا ہے۔ جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لئے آبِ شیریں و خوشگوار کی سوتیں زمین میں جاری کر رکھی ہیں۔ اور ہماری روحوں کے انبساط کے لئے ہوا کا ذخیرہ کافی مُہیّا فرما دیا ہے۔ جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں۔ تاکہ کام کرنے کے لئے دن ہو اور آرام لینے کے لئے رات۔ جس نے دنیا کے قوی ہیکل اور زبردست جانوروں کو ہمارا مُطیع و مُنقاد بنا دیا ہے کہ اُن سے ہم سواری لیتے اُن پر ہم اپنا بوجھ لادتے اُن کے گوشت اور پوست اور دودھ سے مستفید ہوتے ہیں۔ جس نے انسان کو گویائی اور بیان کی قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا ما فی الضمیر اپنے ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے۔ جس نے انسان ضعیف البنیان کو عقل کی قوّت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے۔ جس نے کائنات میں سے ہر موجود کو اُس کی مناسب حالت پر خلق کیا ہے۔ اگر دُنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کر دیئے جائیں۔ اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ میں

کام لایا جائے اور پڑھے لکھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آیندہ پیدا ہونے والے ہیں۔ سب کے سب مل کر اُس کی تعریف اُس کے احسانات۔ اُس کے انعامات روزِ قیامت تک بیٹھے لکھا کریں۔ تو گھِستے گھِستے درخت ہو چکیں۔ سمندر سوکھ جائیں۔ لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں۔ مگر اُس کے حق واجب کا ایک عشر عشیر بھی ادا نہ ہو۔ کلیم! فنا ایک ایسی بدیہی بات ہے۔ کہ دُنیا میں کوئی اُس کا منکر نہیں۔ اور نہ اُس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضہ کی وبا دفع ہوئے برس نہیں گذرے۔ تمہارے دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ ہٹے کٹے۔ توانا۔ اچھے نچھے۔ چلتے پھرتے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل۔ بھلے بُرے۔ سبھی طرح کے صدہا ہزارہا۔ ہدفِ تیرِ قضا ہو گئے۔ سارا ہے نام اللہ کا۔ دنیا پر کیا منحصر ہے۔ وعدے سے دم زیادہ نہ کم۔ مرنا برحق۔ اچھا پھر مرے پیچھے کیا ہوگا۔ وہی عقیل ہے۔ وہی فہیم۔ وہی زیرک۔ دانشمند۔ جو اِس سوال کا جواب معقول دے۔ جو اِس معمّے کو حل کرے۔ جو یہ پہیلی بوجھے۔ کلیم! انسان کی خاص طرح کی خلقت۔ یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اِس بات کا مُقتضی ہے کہ ضرور اُس سے کوئی بڑی خدمت متعلق۔ اور اُس کے ذمّے زیادہ جواب دہی ہے۔ اگر اُس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سو رہے اور گرمی سردی سے اپنے تئیں بچائے تو اُس کے لئے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی۔ جانور اپنے بڑے بڑے جُثّوں کی پرداخت پر بخوبی قادر ہیں۔ حالانکہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں۔ پس اِس خدمت اور ذمہ داری کو دریافت کرنا شرطِ انسانیت ہے۔

نصوح کا وعظ سُن کر اُس کے ہمراہیوں کے دلوں میں دینداری کے ولولے اور خدا پرستی کے جوش تازہ ہو گئے۔ حاضرین میں کلیم کے سوائے کوئی مُتنفّس نہ تھا۔ کہ جس پر تھوڑی یا بہت رقّت طاری نہ ہوئی ہو۔

رتن ناتھ سرشار

(پانچواں دور)

شام کے وقت رئیس زادۂ گردوں مدار مع مصاحبین بدکردار ولایتی بیش بہا فٹن پر سوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھانے گئیں اُڑاتے، قہقہے لگاتے تھے اور سمند خوش خرام و تیز گام نوخیز معشوقوں کے مزاج کی طرح بل کرتے جاتے تھے، بجلی بھی ان کے مقابل میں گردتھی چھل بل میں ہرن کی گرمئی بازار سرد تھی۔

جھمن نے کہا حضور! خدا چشمِ زخم حوادث سے بچائے، اس وقت تو واللہ ریل گاڑی کے بھی انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں۔ دونوں گھوڑیاں چوکڑیاں بھرتی جاتی ہیں۔ اوہو ہو ہو۔ اے صلّ علیٰ ابھی پرسوں ہی کا ذکر ہے۔ بڑے حضور کی خواصی میں بندہ بھی بیٹھا تھا۔ پلٹن کے جو جنڈیل ہیں۔ کوئی تیس ہزار روپے مہینا طلب پاتے ہیں بس بس حضور ان کی مشکی جوڑی اور دونوں دبلا۔ کوئی پانچ پانچ ہزار کے گھوڑے سامنے سے جوڑی آئی اور ہماری گاڑی کے آگے نکال لے گیا۔ اے حضور یقین مانئے بس پھر تو گھوڑیاں آگ بھبوکا ہو گئیں۔ اور وہ ذق بھر کہ اس طرح چھٹیں کہ میری اَنڈیل گرتے ہی دو گولی کے ٹپّے پر ہو رہی۔ اور کوچ مین کے حواس بلا اجازت تشریف لے جا چکے تھے۔ مگر وہ غلط مشہور ہے کہ زبان میں ارادے سے بلا اجازت شرح وہ۔ راس کو لاکھ کڑا کرتا ہے مگر تو بہ ہی بھلی۔ کہ وہ دوڑ کر جتن کئے ایک نہ چلی، جنڈیل کی گاڑی تو منزلوں دور رہ گئی۔ اور انھوں نے جل کے جھنٹ پھر دم لیا۔ سو وہ بھی بہزار خرابی۔ خدا دندا اس وقت کنوتیاں دیکھنے کے قابل نہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ کھائی کا باپ بھی اس وقت سامنے آتا تو یہ پھاند جاتیں۔ اور ہماری کھوپڑی کے بھی ماتھے جاتی مگر حضور اس وقت میاں گھسیٹے نے بھی وہ کام کیا کہ لاٹھ صاحب کے کوچوان سے بھی نہ ہو سکتا۔ اور ابلا تو منہ کے بل زمین پر آ رہتا۔ قسم بس یہ کیفیت تھی کہ جیسے ریل کا انجن ڈبل چال جائے۔

رئیس۔ کیوں جی گھسیٹے تم نے ہم سے یہ واردات بیان ہی نہ کی۔ وہ کون فرنگی تھا۔

گھسیٹے۔ (کوچ مین) حضور کوئی پلٹن کا تھا۔ کل مجھے دکھائے۔ وہ جو چشمہ لگاتا ہے۔

رئیس۔ پھر تم گاڑی نکال لے گئے تھے۔

گھسیٹے۔ اے حضور نکال لینا کیسا خدا نے جان بچائی اس دن۔ نہیں تو ہم اپنے حساب کوچ ہی کر چکے تھے۔ جوں جوں روکتا ہوں دوں دوں

وہ اور بھی تیزی کرتی ہیں۔ فیض آباد کی سڑک ناک ناکوں دم آگیا۔ ایک بڑھیا کچلتے کچلتے بچی۔

رفیق۔ ہاں اوہ؟ ارے تو یہ خدا نے بڑی خیر کی ورنہ بُرے پھنسے تھے۔

چھمن۔ (جھلّا کر) بُرے کیا خاک پھنسے تھے، ہماری سرکار سے صاحب لوگوں سے تپاک بڑھا ہوا ہے۔ واللہ بڑھیا مردار کے چاہے پرخچے پرخچے اُڑ جاتے۔ مگر حضور کے نوکروں پر آنچ نہ آنے پاتی۔

رفیق۔ خدا خدا کر بندے۔ ہونہہ۔ اے تیری قدرت۔ آپ اور ہم کو سکھائیں۔ میں نے تو یہ بات کہی کہ بوڑھی عورت بیچاری مفت میں کچل گئی ہوتی۔

رئیس زادے نے کوچ مین سے کہا کہ میاں گھسیٹے جب جانیں کہ اسی دن کی طرح جوڑی کو تیز کرو گھوڑیاں ہوا ہو جائیں اور بات کرتے وہاں پہنچ جائیں۔ کوچ مین نے انعام کی طمع سے جوڑی کو تیز کیا تو ہوا سے باتیں کرتی چلیں۔ راستے میں جو دیکھتا ہے۔ کہتا ہے بگھی کیا بھونچال ہے۔ آندھی ہے روگ ہے۔ جوڑی زوروں پر تھی۔ چلتے چلتے موڑ پر ایک کمہار برتنوں کی کھانچی لئے ملا۔ کوچ مین نے للکارا۔ سائیسوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا۔ ہائبرٹ ہائیٹ آئی یو جانے والا۔ موڑ پر سے ہٹ جانا آئی یو کمہار ارے موڑ پہ سے ہٹ!

کمہار قوتِ سامعہ سے بے بہرہ اور مارے بوجھ کے پسا جاتا تھا۔ قدم اٹھانا دوبھر اور گھوڑیاں بگٹٹ چلی جاتی تھیں۔ موڑ پہ پہنچتے ہی کمہار جھپٹ میں آگیا۔ برتنوں کی کھانچی سر سے گری۔ ادھر ادھر سب برتن چکنا چور ہو گئے۔ چوطرفہ تماشائیوں کا ہجوم۔ کسی نے کہا ہائے ہائے کمہار بے چارہ مر گیا۔ دوسرا بولا ٹانگ پاش پاش ہو گئی۔ تیسرے نے کہا۔ بدھا تھا پکارنے تو جاتے تھے۔ ہٹا کیوں نہیں۔ دو کوس سے تو بگھی کے گھڑ گھڑانے کی آواز آتی تھی۔

کمہار کا گھٹنے کا ٹکھنے اُٹھا تو ٹانگ میں خفیف سی چوٹ بتائی۔ ادھر کوچ مین نے کمہار کے گرتے ہی راس جو اُٹھائی تو منڈ یاؤں ہو رہا۔ رئیس زادہ باوقار اور مصاحبین حماقت شعار پیچھے پھر پھر کے دیکھتے جاتے کہ کوئی گرفتار کرنے والا تو نہیں آتا۔ رئیس زادے کا چہرہ زرد اور رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں پھولے باد بتانِ طنازہ بجھولے۔ میاں چھمن کانپتے ہیں۔ رفیق کا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ اور کوچ مین کی بس یہ کیفیت تھی کہ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

جب منڈ یاؤں پہنچے تو فٹن کو روک کر کوچ مین نے پوچھا۔ حضور کیا حکم ہوتا ہے۔

رئیس۔ یہاں ہوش کس نامعقول کے ٹھکانے ہیں جو تم کو حکم دے۔ اُف بس اب مارے پڑے۔ غضب ہی ہو گیا۔ اس کمہار کی تو خبر لاؤ۔

چھمن۔ حضور بھلا اس وقت تازی تازی واردات ہوئی ہے۔ کس کو جان بھاری ہے جو سانپ کے منہ میں اُنگلی دے۔

رفیق۔ جو جائے وہی عزت گنوائے۔

رئیس۔ گھسیٹے! تم جا کے دیکھ آؤ۔

گھسیٹے۔ اور حضور جوڑی کو یہاں کون سنبھالے گا، اس وقت گھوڑیاں بدی پہ ہیں۔

رئیس۔ کھول ڈالو اور جاؤ مگر کتے کی چال جاؤ اور بلی کی چال آؤ۔

گھسیٹے۔ وہ کتے بلی کی تو حضور نے ٹھیک کہی مگر ماتھے تو غلام کے جائے گی۔ راس تو میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جاؤں تو اسی دم دھرا جاؤں۔

رئیس۔ اچھا کسی چاکر کو بھیج دو۔

ایک چاکر۔ نا صاحب ہم کا ساڑھے تین روپے کی نوکریاں بہت مل رہی ہیں۔

دوسرا چاکر۔ ہاں ہجور چاکر ہی تو پھانستو ہیں۔

رئیس۔ پھر اب ہونا کیا ہے۔ چودہ چودہ برس کو سب جائیں گے۔ ہم تو قانون وانون جانتے نہیں۔

جھمن نے کہا "حضور ایک تدبیر غلام کو سوجھی ہے قربان جاؤں جو کبھی پٹ پڑے۔ پوچھا "وہ کیا؟" کہا "حضور تو یہاں اسی جگہ بستر جما دیں۔ اور غلام تراب علی کو لے کر لپکتا ہوا جائے۔ کسی فرنگی کونسلی کے ہاں اور جو رائے وہ دے اس کے بموجب کارروائی ہو۔ فرمایا واللہ خوب سوجھی، دیکھو جتنی بات ہو گی اتنی کہیں گے۔ لگی لپٹی سے یہاں نفرت ہے۔ لے بس اب تم جاؤ۔ تراب علی تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ تراب علی بولا حضور اسی دم توپ کے مہرے پر کہیئے چلا جاؤں۔ میں تو نمک پروردہ قدیم ہوں۔ غلام کو عذر کیا چلو بھئی جھمن۔

رئیس زادے نے کہا "دیکھو راستے میں کہیں لڑ نہ بیٹھنا دونوں۔ کہیں باہم گلخپ تکرار جوتی پیزار ہو تو اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے۔" کہا "اے حضور کیا طاقت اس طرح رہیں جس طرح شیر و شکر۔ اس وقت جاں نثاری کا موقع ہے یا گلخپ کا۔ لاحول ولا قوۃ چاہے جان جاتی رہے۔ مگر معاملہ ٹھیک ٹھاک کئے بغیر ملک الموت کبھی بتّے بتائیں گے۔

میاں جھمن اور تراب علی لپ قدمے چلے تو راستہ میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

جھمن۔ گھرے ہیں استاد گھرے۔

تراب علی۔ اجی ہماری پانچوں گھی میں اور تمہارا سر کڑھائی میں۔

جھمن۔ ایک جگہ بیٹھ کر معاملہ کی باتیں تو کرو۔

تراب علی۔ اجی تم تو واہی ہو۔ کون بڑا لمبا چوڑا معاملہ ہے۔ چلو چل کے امین آباد والی سافن کی دوکان پر دم لگاؤ۔ پھر ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔

جھمن۔ واللہ کیا کہی ہے۔ ارے یار آؤ آج تاڑی پئیں۔

تراب علی۔ بس اسی کو وحشت کہتے ہیں۔ تاڑی واڑی نہیں۔ چلو کسی وکیل کے ہاں چلیں کوئی حقیقت کا اعلیٰ مقدمہ تو ہے نہیں۔ لاکھ دو لاکھ کی جائداد کا مقدمہ ہے نہیں۔ نہ خون کیا نہ قتل کر کے آئے ہیں۔ ہم تو جانتے ہیں کہ دس پانچ روپے جرمانہ ہو جائیں گے۔ تراب علی نے کہا۔ بس اور کیا۔ بلکن (بلکہ) اس سے کم۔ بہت جرمانہ ہوا آٹھ آنے ایک روپیہ۔ تدبیر وہ کہ جس سے یاروں کے ہاتھ گرمائیں۔ اور خوب وارے نیارے ہوں۔

تراب علی۔ ہم جا کے اس کمہار کی خبر تو لائیں۔

جھمن۔ خدا کرے ضرب نشہ بد آئی ہو۔

تراب علی۔ ہاں مزہ تو جب ہی ہے ورنہ کیا۔ مگر ہم اس کو خوب بھرّے دیں گے۔ کہ اے کچھ تو لے مرنے کا موقع ہے۔

جھمن۔ تم الگ بہکاؤ میں الگ پٹی پڑھاؤں۔

تراب علی۔ اجی ہم تو جانتے ہیں کہ اگر اس مقدمے میں سال سال بھر کے کھانے کو بھی نہ ملا تو کیا۔

جھمن نے کہا ملے اور پھر ملے۔ کیونکہ میاں کی سٹی بھولی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔

تراب علی اور میاں جھمن باتیں کرتے آہستہ آہستہ قدم دھرتے امین آباد میں دن سے داخل ہوئے۔ اور سیدھے چلے ساقن کی دوکان پر۔

جھمن بولے بی ساقن دموں کی خیر۔ اس نے کہا "ہائے جاتے ہوئے ہیں سارے بتولے۔ ایک ذری سی بات نہ ہو سکی نکھٹو" جھمن نے کہا "اللہ جانتا ہے اگر اپنے پر آتا تو یہی دوکان کوٹھی ہو جاتی۔ وہ بولی اونہہ اونہہ۔ جو میری بکری کر جائے شیر کو پچھاڑ دے"۔ کہا "اچھا اب جس دن چھوٹے حضور خوش ہوں گے اس دن ہم شیشہ ضرور لٹائیں گے" اس نے تنک کر جواب دیا "بس نچے دور۔ جب باوا مریں گے تو بیل بٹیں گے۔ لے اب تو دم لگواؤ۔ وہ بولی کوڑی نہ پیسہ گئے ملے ہوٹ۔

تراب علی مسکرائے "کوڑی نہ پیسا" لے یہی اشرفیاں موجود ہیں۔ ساقن نے کہا منہ دھو آؤ۔ باباراج بھی کبھی اشرفیاں دیکھی تھیں آنکھوں سے سوائے ڈینگ کے اور کوئی بات نہیں۔

الغرض میاں جھمن اور تراب علی دونوں نے چرس کے دم لگائے۔ وہ دھواں دھار کہ سوا آسمان کی خبر لائے۔ کہ دمہریہ کو کوہ نار بنائے جب دونوں گرمائے تو دُور کی سوجھنے لگی۔

جھمن۔ کہو یار پے اب کدھر کی سیدھیاں ہیں۔

تراب علی۔ بس اب دیا ٹے بھر کے کونسلی کے ہاں چلتے ہیں۔

جھمن۔ پیدل۔

تراب علی۔ پیدل نہیں تو کیا تمھارے لئے کسی دھوبی کے ہاں سے گدھا منگواؤں۔

جھمن۔ تم بھی وہ باتیں کرتے ہو بے تکی کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔ ارے میاں ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں۔ چلو چل کے بگھی کرایہ کریں مزے سے بیٹھے ہوئے چلیں۔ کہہ دینا جلدی کی غرض سے بگھی کر لی تھی۔ کچھ گرہ سے تھوڑی جائے گا۔ ہے کہ نہیں ؟

تراب علی۔ اچھا پھر بگھی کرایہ کرو۔

جھمن۔ وہ کیا اڑ گڑا ہے ارے میاں کوئی بگھی ہے۔ کونسلی تک جائیں گے۔

گاڑی والا۔ چلئے ٹپ ٹپ فسٹ کلاس ہے۔ پہلے گھنٹے کے بارہ آنے۔ پھر چھ آنے گھنٹہ۔

جھمن۔ جو حساب ہو گا وہ دے دیں گے۔

تراب علی۔ جان کیوں کھسکی جاتی ہے۔ یہ لو پیشگی۔ ایک روپیہ لو۔ کہہ پایا۔ یہ کھ لو۔ ہاں نئے گھن کا ہے۔ دودھ کا دھویا۔

گاڑی تیار ہوئی اور میاں جھمن اور تراب علی کونسلی کے ہاں چلے۔

تراب علی۔ اجی گیا کمہار اپنی ایسی تیسی میں۔ چلو کونسلی کے ہاں چلیں۔

جھمن۔ وہ بھی اپنے دل میں ہنسے گا کہ عجیب قطع کے آدمی ہیں۔ کمہار کا پاؤں ذرا کچل گیا۔ اور چلے وکیل کے پاس۔

تراب علی۔ اب کونسلی سے تو آپ کچھ کہئے گا نہیں۔ میں بھگت لوں گا۔

جھمن۔ بہتر ہے۔

تراب علی۔ ذرا تم سُنتے رہنا کس ترکیب سے گفتگو کرتا ہوں۔ واللہ وہ داؤں پیچ یاد ہیں کہ ماروں چاروں شانے چت۔ پٹ تو پڑتا ہی نہیں۔ اجی یہ یاروں کے ہتھکنڈے ہیں، بائیں ہاتھ کے کرتب۔

جھمن۔ فرنگی ہیں نہ وہ کونسلی۔

تراب علی ۔ وہ ۔ اصل فرنگی ۔ ولایت زاد خاص الخاص لندن کے ۔

جھمن ۔ رہتے کہاں ہیں ۔؟

تراب علی ۔ سلیمان باغ کے سامنے لال جھیل کے پاس کوٹھی ہے ۔

جھمن ۔ چھوٹے حضور اس وقت بڑے بیاکل ہوں گے ۔ نہ ہم ہیں نہ تم ہو نہ مصاحب الدولہ ہیں ۔ بالکل سناٹا اور ہو کا عالم ۔ لے بھلا منڈیاؤں کی چھاؤنی میں اس وقت کون ہوگا ۔ پرندہ تو پر مارتا نہیں اور ہوا سن سن چل رہی ہوگی معاذ اللہ ۔

تراب علی ۔ واللہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی ۔ سر منڈاتے اولے پڑے ۔

جھمن ۔ اب دیکھئے بھرے ہیں آتے ہیں یا نہیں ۔ ہتّے ہی پر ٹوک دیئے گئے ورنہ پو بارہ تھے ۔

تراب علی ۔ اب کی یہ پلّہ پار ہو جائے تو سمجھئے کہ بیڑا پار ہے ۔ ورنہ وہی ملّا پن ......

الغرض گاڑی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو گئی ۔ اور تراب علی نے بیرا کو بلایا ۔

صاحب کو اطلاع ہوئی بلائے گئے اور سلام کیا ۔

تراب علی ۔ حضور آج نٹن پر ہمارے مالک جاتے تھے چنانچہ ایک کہار روپے لینے کے لئے بہانہ کر کے لیٹ رہا ۔ اور غل مچایا کہ کچلا کچلا ۔ حضور کچلا نہیں ۔ کچھ جھوٹ موٹ غل مچا دیا ۔ گھوڑیاں جو اس کے غل سے دوڑیں تو ہوا ہو گئیں بس زمین پہ قدم ہی نہیں رکھتی تھیں ۔ لاکھ لاکھ سمجھایا ۔ غل مچایا ۔ للکارا ۔ ہائیٹ ہائیٹ کرتے رہے مگر سنتا کون ہے ۔ وہاں آخر کار گر پڑا ۔

صاحب ۔ کیا مر گیا ...... ہاتھ پاؤں کچھ ٹوٹ گیا تھا ۔ کچھ چوٹ آیا ۔

تراب علی ۔ سچ تو یوں ہے کہ ہم لوگ گاڑی تیز بڑھا کر چل دیئے تھے ۔ خدا جانے اس کی کیا کیفیت ہوئی ۔

صاحب ۔ ول تم سب پر سو سو روپے جرمانہ ۔

تراب علی ۔ (مسکرا کر) واہ حضور اچھا فیصلہ کر دیا ۔

جھمن ۔ (تراب علی کے کان میں) اجی صاحب فقط ہنسی میں کہتے ہیں ۔

تراب علی ۔ ہاں واللہ ! اجی نہیں ۔ عجب نامعقول آدمی ہو ۔ بھئی یہاں اتنا بڑے ہوئے ۔ صدہا مقدمے لڑائے ۔ آپ ہم سے مشیخت کی لیتے ہیں ۔ یہ کونسلی ہیں ۔ پیرو کاران کو جرمانے اور سزا سے کیا سروکار ۔

تراب علی ۔ گاڑی کو گھر پہ لے جائیں یا نہیں ۔

صاحب ۔ ہاں لے جاؤ ۔ پولیس اگر کوچ مین کو مانگے بھیجو ۔ چالان ہوگا اور روپیا دو روپیا جرمانہ بس ۔

جھمن اور تراب علی نے زمین دوز ہو کر فرشی سلام کیا اور چلے ۔ تراب علی اور جھمن ایسے لنگوٹیے یار بن گئے گویا وانت کاٹی روٹی تھی ۔ یہ ان پہ جان نثار کریں ۔ وہ ان کا دم بھریں ۔ مگر دونوں گون کے یار دونوں پرلے سرے کے کائیاں ۔ دنیا بھر کے نیار ہیے ، چکمہ بازی میں طاق ۔ جعل سازی میں شہرہ آفاق ۔ سب گنوں پورے انھیں کون کہے لنڈورے ۔ الغرض دونوں کونسلی سے رخصت ہو کر چلے تو راستے میں بگھی پر :

جھمن ۔ مانتا ہوں استاد تو بھی اپنے فن میں استاد کامل ہے ۔

تراب علی ۔ میاں ابھی دیکھتے تو جاؤ ۔ رقم بھرنی ہے ۔

جھمن ۔ یار چنگ پر تو چڑھ گیا ۔ مگر یہ بھی افتاد پڑی ۔

تراب علی ۔ بس ہم میں تم میں یہی تو فرق ہے، یہاں سہمنا تو جانتے ہی نہیں اُستاد نے یہ سبق ہی نہیں پڑھایا ۔ ع

ہر چہ باد آباد ما کشتی در آب انداختیم

اور اتنا تو سمجھ یار عزیز کہ وہ بات ہی کیا ہے ۔ جس سے ہم سہمنے لگیں ۔ ابھی یہی نہ کہ گاڑی کے پہیئے کے تلے ایک شخص کا پاؤں آ گیا ۔ پھر خوف کا کون سا مقام ہے ۔ اگر پاؤں کچل بھی جاتا تو کون بات تھی ۔ دو روپے نہیں، دس جرمانہ ہوتے ۔ دس نہیں بفرضِ محال سو جرمانہ ہوتے تو کیا یہ بھی کوئی رقم ہے ۔

جھمن ۔ ارے یار تیرا بہت بڑا پیٹ ہے ۔

تراب علی ۔ میاں اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ ع

خاک از تودۂ کلاں بردار

جب مارے روپے مارے کو ۔ غریب کے پلّے کیا ہے ۔ جو دیگا امیر سے البتہ اینٹھنے کا موقعہ ملتا ہے ۔ ہزار دو ہزار کی رقم مکمشت چھیرے تو البتہ بات ہے ۔ ورنہ سو دو سو روپے کے لئے جعلسازی کرنا اپنے مذہب کے تو خلاف ہے ۔ درخت کا ایک پھل رکھوالے کی چوری سے کھایا ۔ تو کیا یہاں جڑ سے پھنگی تک چٹ کر جائے تو ٹھو کا زنگ نہ لے تب تو آدمی ورنہ جانور ۔ . . . . . دیکھئے تو حضرت سے کیا کیا جاگے کہتا ہوں واللہ وہ سبز باغ دکھاؤں کہ میاں کی آنکھیں کھل جائیں اور ان لونڈوں کو اُلّو بنانا تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے . . . . . تمہارے ایسے لونڈے میری جیب میں پڑے ہیں ۔ اب ایک بات کا خیال ضرور ہے ۔ اُستاد کہ چھوٹے حضور کو جتنا ڈرایا جائے اتنا ڈرانا مگر آن بان کے ساتھ یہ نہیں کہ باتوں ہی سے وہ بھڑک جائیں ۔ . . . . .

جھمن ۔ وہ تو اپنے نزدیک پھانسی پہ چڑھ چکے . . . . . مگر میں جاتے ہی وہ کبھڑے دونگا کہ بخدا ریشہ خطمی ہو جائیں ۔ یہ بھی اتنا صاف صاف بتا دو کہ ہمارے ہتھے کیا چڑھے گا ۔ یہاں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے ۔ مُردہ چاہے دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں ۔ ارے یار ایک مکان گروی رکھ دیا ہے ۔ کچھ ایسا کرو کہ اس کو چھوڑا سکوں . . . . .

الغصہ میاں جھمن اور تراب علی اپنے اپنے اڑھائی چاول پکاتے باتیں بناتے منڈ پاؤں پہنچے . . . . . اتنے میں تراب علی نے پکارا "ارما گھسیٹے" ! رئیس نے خوش ہو کر کہا "آ گئے" ! "آؤ آؤ" گھسیٹے بولا ۔ لپک آیئے ۔ تراب علی اور جھمن جا پہنچے ۔ تراب علی نے کہا "حضور فتح ہے" ۔ جھمن بولا "خداوند مبارک ہو" ۔ رئیس نے پوچھا خوف تو نہیں ہے ۔ یہ بتاؤ مختصر طور پہ کہا "ایک کونسلی کو کہہ دیا ہے ۔ حضور خاطر جمع رکھیں ۔ خداوند چلتے چلتے کا مچیاں درد کرنے لگیں ۔ . . . . . رئیس زادے نے پوچھا ۔ "اس کمہار کا کیا حال ہے ۔ کہا "پنلا ہڈی میں چوٹ آ گئی ۔ پڑا سسک رہا ہے" . . . . . اے خداوند چودہ روپے پیر بخش نیچے والے سے قرض لے کہ جرّاح کو دے آیا ہوں اس کے پلّے کیا ہے دو جوتیاں اور وہ تو چاہتا ہی ہے کہ ٹانگ زخمی ہے ۔ جس میں سرکار سے آپ کے نام ڈگری ہو جائے، کہ عمر بھر اس کو روٹیاں دیئے جاؤ، ہم کونسلی کے ہاں گئے ۔ حضور اللہ رے دماغ ۔ خدا جانے فغفور چین اپنے کو سمجھتے ہیں یا شہنشاہ روس کا سمجھتے ہیں اُف رے تیرے دماغ سیدھی بات ہی نہیں کرتے ۔ تب تو میں جھلا کر چلا گیا ۔ لالہ ہیرا لال اور ٹھنٹھی لال کی کوٹھی ۔ ان کے منیب جی ایک جسبھالئے پہلے تو کہا کہ نواب صاحب یا چھوٹے حضور کے نام سے روپیہ قرض لو تو دیں ۔ پھر جب میں نے ڈانٹ بتائی تو دو سو روپیہ دے دیا . . . . . جھمن کو کونسلی کے پاس بٹھا آیا تھا ۔ جاتے ہی روپیہ میز پہ ڈال دیا اور نوٹ ہاتھ میں دیئے ۔ بس پھر کیا تھا ۔ روپے کی بھی کیا بڑی چوٹ ہے ۔ حضور کل باتیں سُنیں ۔ پہلے تو کہا مقدمہ ذرا پیچیدہ ہے ۔ شاید کوئی کہہ دے کہ راس نواب صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی ۔ مگر سوچ ساچ کر بولے "اچھا ہم سمجھ لیں گے

جاندار تو ہے مقدمہ اور جو ہار گئے تو اپیل میں دیکھ لیں گے۔ حضور کو سلام کہلا بھیجا ہے۔ اور کہا تشفی کہ دینا۔ کہ اس میں کچھ ہونا نہیں ہے۔ خفیف مقدمہ ہے، ہزار دو ہزار پہ تو البتہ پانی پھر جائے گا۔

رئیس زادہ ۔ واہ جی عزت بچی یہی غنیمت ہے۔ ہزار دو ہزار روپیہ گیا چولھے کی جھڑ میں اب تو آبرو پر بن آئی ہے۔

گھسیٹے ۔ بھلا میاں تراب علی ۔ ہم پر تو آنچ نہ آئے گی؟

تراب علی ۔ کیوں گھبرائے جاتے ہو۔ خواہ مخواہ کے لئے۔

گھسیٹے ۔ ارے صاحب ہم غریب آدمی پانچ چھ روپے کی اوقات کہیں گھن کی طرح پس نہ جائیں۔

تراب علی ۔ اور آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔

رئیس زادہ ۔ آج تم بڑے کام آئے۔

تراب علی ۔ قربان جاؤں پیر و مرشد جہاں حضور کا پسینہ گرے وہاں غلام کا خون گرے۔ اور کیا۔

جھمن ۔ حضور کونسلی سے انھوں نے وہ تقریر کی ہے کہ ہوش اڑا دیئے۔ جو خداوند وہاں ہوتے تو انعام ضرور دیتے۔

...... تراب علی نے کہا...... "خداوند حضور کی بدولت بہت کچھ پیدا کیا۔ برسوں سے نمک کھا رہے ہیں۔ اسی سرکار کے ساختہ پرداختہ" ہیں خانہ زاد۔ رگ و ریشہ میں اسی سرکار کا نمک پیوست ہے۔ خدا کرے جاہ و حشم روز بروز ترقی پائے۔ ہر صبح کو دولت آستاں بوسی کو آئے۔ اقبال قدم قدم پہ ساتھ ہو۔ رحمتِ خدا کے ہاتھ میں ہاتھ ہو۔ عزت بڑھے رتبہ بڑھے۔ اور اسی سرکار کی بدولت تراب علی فیل نشین ہو ہاتھی پہ چڑھے۔

جھمن ۔ اب چلئے حضور۔

رئیس زادہ ۔ اسی فٹن پر۔؟

تراب علی ۔ ہاں ہاں حضور اسی فٹن پر۔

رئیس زادہ ۔ اب تو اس فٹن پر بندہ سوار نہ ہونے کا۔

تراب علی ۔ فٹن سڑک پر لاؤ میاں گھسیٹے۔ حضور سوار ہوں۔ غلام کا ذمہ ہے۔ ایسی بات ہے۔ بھلا۔

الغرض بعد خرابی بسیار فٹن پہ سوار ہو کر ؎

آہستہ خرام بلکہ مخرام ——— زیر قدمت ہزار جان ست

گھسیٹے ۔ حضور کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔

تراب علی ۔ اور کیوں جی اگر وہ مر جاتا۔

گھسیٹے ۔ واہ چھوڑ چھاڑ کر فٹن گنگا پار ہو رہتا۔

تراب علی ۔ کیا خوب ان کو بھی شاہی کی باتیں یاد ہیں۔ نادان ہو کون؟ ارے گنگا پار کیا ہے پاگل۔ وہاں بھی سرکار کمپنی بہادر کی عملداری ہے۔

فٹن ذرا تیز چلی اور رئیس زادے نے غل مچایا۔ "آہستہ آہستہ آہستہ آہستہ تیز نہ چلو" گھوڑوں نے ذرا کنوتی بدلی اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب چاکروں کو للکار رہے ہیں کہ اُتر پڑو۔ اُتر پڑو۔ ساتھ ساتھ چلو۔ کئی مقام پر خود اُتر پڑے۔ لوگوں کی ناک میں دم۔ تراب علی نے لاکھ سمجھایا۔ میاں جھمن نے دلاسا دیا مگر بے سود۔ ہزار خرابی کہیں فٹن درِ دولت پہ پہنچی اور دروازہ

پہ ایک دفعہ ہی غل مچا کہ آ گئے آ گئے۔ اجی وہ اجی بڑے حضور کو اندر اطلاع کر دیجئے کہ سرکار آ گئے۔

فوراً دربان نے کہا "یہاں کنوؤں میں بانس پڑ گئے۔ بڑے حضور گھبرا اُٹھے تھے آج خلافِ معمول اتنی دیر کہاں ہوئی۔ چہار طرفہ آدمی دوڑے محل بھر میں کہرام مچ گیا۔ بارے شکر ہے کہ حضور آ گئے۔ بسم اللہ"۔ رئیس زادہ اُتر پڑا۔ ددا فرخندہ اندر سے دوڑی آئیں۔ چٹ چٹ بلائیں لے کر کہا کہ حضور بس جلدی اندر چلئے۔ بیگم صاحب کی آنکھیں روتے روتے لال بیر بہوٹی ہو گئی ہیں۔ اور بڑے حضور بھی بیدم ہیں نصیب اعدا یہ اتنی دیر آپ رہے کہاں۔ یہاں گھر بھر ہیں، دشمنوں کے کان بہرے، کہرام سا مچ گیا۔ ہوش اُڑے ہوئے تھے سب کے۔ رئیس زادے نے جیسے ہی دہلیز پر قدم رکھا گھر بھر کی ماما اصیلیں مغلانیاں خوش خوش ہشاش بشاش لپکیں چھوٹے حضور آئے چھوٹے حضور آئے مبارک سلامت کی صدا چرخ ہفتم تک پہنچی۔ بڑی بیگم رئیس زادے کی مادر مہربان کی جان میں جان آئی اور فرطِ محبت سے لڑکے پر خفا ہوئیں۔

بڑی بیگم۔ اے غضب خدا۔ اتنا بھی خیال نہ رہا کہ بڑھیا کڑھ کڑھ کے اتنی دیر میں مر تو نہ جائے گی۔ بوڑھے باپ کی خدا نہ کرے جان پر تو نہیں بن آئیگی۔ غرض یہ اتنی دیر جو غائب غلہ رہے تو دل میں سمجھے کیا تھے۔ ایک آدھ کی لاش گھر سے نکلوانے کا مقصد تھا شاید پہلے اوپر باپ کے پاس۔

بڑے نواب۔ بیٹا اب تک تم کہاں تھے۔

رئیس زادہ۔ قبلہ کہیں نہیں ہوا کھانے گیا ہوا تھا۔

بڑے نواب۔ اے تو اتنی دیر۔ اتنی دیر میں تو آدمی جھنڈ کے تین چار پھیرے کر آئے۔

رئیس زادہ۔ گرمی کے سبب سے منڈیاؤں نکل گیا تھا۔

بڑے نواب۔ معقول۔ بے انگریزی پڑھے ہی وحشت کی لینے لگے۔ تو ہماری تشفی کے لئے ایک آدمی یہاں دوڑا دیا ہوتا بس پھر چاہے آدھی رات تک نہ آتے۔ ہمارے قلب کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔

رئیس زادہ۔ بہت خوب۔ مگر قبلہ و کعبہ یہ تو بڑی مصیبت ہوئی کہ جہاں کسی دن ذرا دیر ہو گئی اور گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ کنوؤں میں بانس پڑنے لگے۔ اصیلیں مغلانیاں گھر میں، نوکر چاکر مصاحب باہر، غل مچانے لگے۔ اتفاق ہے کسی روز ہوا کھانے صدر نکل گئے۔۔۔۔۔۔

ادھر جھمن اور امام الدین خاں مصاحبوں میں یوں چپکے چپکے گفتگو ہونے لگی۔۔۔۔

امام الدین۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹو مگر ہماری بھی فکر رکھنا۔

جھمن۔ تم تو شریک حال ہوئے پہلے پھر اور کوئی۔

امام الدین۔ ہاں صاحب تو منڈیاؤں ہی ٹھہرے پھر سیدھے گھر چلے آئے یا کہیں اور گئے تھے۔

جھمن۔ وہاں نواب کو چھوڑا فٹن پہ ہم اور تراب علی چلے کونسلی کے ہاں۔

امام الدین۔ (چٹکی لیکر) ارے ستم! یہ تو کہئے بالکل اُلّو کی دُم فاختہ ہی ہے۔ بھلا اس میں کونسلی کا کون سا کام تھا۔ اچھے رہے۔ کونسلی کے ہاں گئے بھی تھے۔ یا یوں ہی فقرہ چست کر دیا۔ ساقن کے ہاں دم لگایا ہوگا۔ اور چھوٹے حضور سے آ کے کہہ دیا ہوگا کہ ہو آئے۔ یہ کہا اور وہ کہا۔ خوب سبز باغ دکھایا ہوگا۔

کہا؟ تیرے سر کی قسم ساقن کے وہاں بھی گئے تھے مگر وہاں سے پلٹ کر پہنچے کونسلی کے ہاں اس سے تراب علی کی بات چیت ہوئی۔

اس نے کہا ہم ایسے چھوٹے مقدمے میں وکالت نہیں کرنا چاہتے۔ مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ کورٹ مین کو جب کوئی تلنگا یا برق انداز بلانے آئے تو بھیجدینا۔ دو ایک روپیہ جرمانہ کی سزا ہو جائے گی۔ بس یہاں آ کر تراب علی نے وہ اڑن گھاٹیاں بتائیں کہ کچھ نہ پوچھیے کہا کہ پیر و مرشد کمہار کا حال دیکھا تو ٹانگ میں انتہا کا درد پایا۔ اس نے تو آسمان سر پہ اٹھا یا ہوا ہے نالش کر دوں گا اور لندن تک لڑوں گا۔ اور بڑے صاحب کے ہاں عرضی دونگا۔ آخر میں نے ایک دوکاندار سے چودہ روپے قرض لے کر اس کے حوالے کر دیئے...... پھر میں کونسلی کے پاس گیا۔ وہ اچھی طرح مخاطب نہ ہوا۔ مگر ایک مہاجن کی کوٹھی سے دو سو روپے قرض لئے جب جاکے کونسلی کو دیئے۔ اور اس کی رائے لی اور خدا جانے کیا کیا جھوٹ بولے۔ بس یہ سمجھئے کہ جھوٹ کے چھپر اُڑا دیئے۔

امام الدین نے کہا چلو رادی چین لکھنا ہے۔ ایک تو یہ بیہودہ دن والا مقدمہ تھا ہی۔ دوسرا اس پر طرہ ہوا۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ لے ہی مریں گے۔

جھمن ۔ دو سو چودہ تو دودھ پی رہے ہیں۔

اب رات بھیگی تو چھٹ چھٹا کے تراب علی اور میاں جھمن اور امام الدین خاں اور نواب صاحب اور ایک افیمی مصائب الدولہ بہادر رہ گئے۔

رئیس زادے نے کہا میاں خاں صاحب ہم تو بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ ایک آدمی دب کے مر گیا۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے تشفی دی "پیر و مرشد کچھ نہ ہو گا" کہا "نہیں خاں صاحب بڑی بلا سے مقابلہ کرنا ہے"۔

تراب علی ۔ لاحول ولا قوۃ۔ بلا سے حضور کے دشمنوں کا مقابلہ ہو۔ حضور سے اس مقدمے سے کیا واسطہ۔ غلام تو اپنا اور گھسیٹے کا نام لکھوا آیا۔

رئیس زادہ ۔ واللہ ؟

تراب علی ۔ حضور کے قدموں کی قسم۔

امام الدین ۔ اے وہ بات ہی کیا ہے۔ چار پانچ سو روپے کا تو خرچ ہے۔

رئیس زادہ ۔ اجی خرچ ہونے کو چاہے ہزار بارہ سو خرچ ہو جائیں۔ مگر عزت پر حرف نہ آئے۔

امام الدین نے کہا کیا مجال۔ جھمن بولا کیا حقیقت ہے کسی کی" رئیس زادے نے کہا۔ ابھی دیکھو تو اونٹ کس پہلو بیٹھتا ہے۔ ابھی تو مقدمہ ہی در پیش ہے۔ پھر سمجھا جائے گا۔ ابھی ہم نہ جانے کے" جھمن بولا "خداوند! رئیس لوگ عالی ہمت ہوا کرتے ہیں۔ اور حضور تو پوتڑوں کے رئیس ہیں۔ سارے شہر میں ڈگی پھر جائے گی کہ مقدمہ کر کے پھر تشریف نہ لے گئے۔ چلئے اور ضرور چلئے۔ ایسے ایسے خفیف معاملوں سے تو آپ کو واسطہ ہی نہ رکھنا چاہیئے، چھوٹے نواب پر نئی نئی مصیبت پڑی تھی۔ ایسی افتاد کبھی کاہے کو پڑی تھی۔ مگر مصاحبوں نے پھڑک مٹانا شروع کیا۔ ایک نے کہا حضور اب تو مقدمہ تراب علی اور گھسیٹے کے سر پڑا۔ حضور تو تلوہ بچ گئے۔ اب حضور سے واسطہ ہی کیا رہا۔ وہ اپنے سمجھ لیں گے۔ حضور پر ذرا آنچ نہ آنے پائے گی۔ بلا کو تو ہم لوگوں نے اپنے سر لے لیا۔

تراب علی ۔ ہاں روپے کی فکر البتہ کرنی چاہیئے۔ مرے پلّے کفن کو ٹکا بھی نہیں ہے اور بے زر کارروائی معلوم۔

نواب ۔...... کس قدر روپیہ چاہیئے۔

تراب علی ۔ حضور کوئی بیس بائیس سو۔ کیوں جی جھمن ؟

جھمن ۔ سب ملا کر تین ہزار رکھ لو۔

نواب۔ (جھمن سے) تین ہزار روپیہ لالہ سے لے کر الگ رکھو اور جب تراب علی مانگیں بے دریغ دو۔ اب رات بھی زیادہ آ گئی ہے۔ اور تم لوگوں کو تکان بھی بہت ہوا ہے۔ اب برخاست کل ملاقات ہو گی۔ شب بخیر۔

صبح کو دربان نے آ کر دست بستہ ایک وحشت ناک خبر سنائی شامت کی صورت مجسم نظر آئی۔ یعنی ایک برق انداز جوان طنانہ خاکی گھٹنا کالی وردی ڈالے، سر خاسرخ پگڑی باندھے ایک رومال ہاتھ میں لئے ہوئے آن کھڑا ہوا۔ اور نواب نامدار کو جھک کر سلام کیا۔ نواب صاحب کے حواس غائب ہوش پران، مصاحب فرحاں خنداں۔ کوئی وظیفہ خواں سوا کسی کو نادِ علی یا سورۂ جن وردِ زبان ہوا۔

نواب۔ اللّٰھم احفظنا من کل البلیات۔

تراب علی۔ کہاں سے آنا ہوا بھئی جوان۔

برق انداز۔ چوکی پر سے آیا ہوں۔

تراب علی۔ کیوں۔

برق انداز۔ وہی جو گاڑی سے کہار کچل گیا تھا، نہ اسی لئے ...... کوچوان کا چالان ہو گا۔ اس کے تئیں ساتھ کر دیں۔

میاں گھسیٹے سے جو چوبدار نے جا کر کہا کہ چلئے سپاہی آیا ہے اور آپ کے چالان کا پیغام لایا ہے تو ہوش فقرہ ہو گئے۔ چہرے پر مردنی چھائی۔ سمجھے کہ بس قیامت ہی آئی۔ چوبدار کے ہاتھ جوڑے کہ بھئی للہ سپاہی سے اتنا کہہ دے کہ گھسیٹے یہاں نہیں ہے۔ میں اسی وقت کی ریل پر سوار ہو کر کانپور چل دونگا۔ گنگا اُس پار۔ چوبدار نے سمجھایا کہ کیسے نادان ہو بھلا بھاگ کے جاؤ گے کہاں۔ اور کیا کہیں توپ لگی ہے۔ گولہ چلتا ہے۔ مورچے پر کوئی بھیجتا ہے۔ قضا کے منہ میں جاتے ہو۔ آخر ماجرا کیا ہے یہ تو بتاؤ یہی نہ کہ کچھ جرمانہ ہو گا؟ پھر حضور دے دیں گے۔ تم کو کیا فکر ہے۔

گھسیٹے۔ بھئی بُرا سامنا ہے آج .....

چوبدار۔ اے ہے بس جاتے ہی پھانسی کا حکم سُنایا جائے گا۔

گھسیٹے۔ اُف بُری ہو گی۔

چوبدار۔ کیا گلا گھونٹ کے کوئی مار ڈالے گا۔

گھسیٹے۔ دیکھئے کیسی گذرتی ہے۔

چوبدار۔ خدا ہی مالک ہے۔ کام تو پھانسی ہی کا کیا ہے۔ چور بے ایمان۔

گھسیٹے۔ ذرا سا ٹھنڈا پانی پلا دُو۔

چوبدار۔ (خدمتگار سے برف کا پانی منگوا کر) لو پیؤ۔

گھسیٹے۔ خدا سلامت رکھے۔ اُف۔

چوبدار۔ یار کہنا مانو۔ اُٹھو۔ خدا گواہ ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔

گھسیٹے۔ خبر کیا جانے کیا حال ہو گا۔

چوبدار۔ اُلٹے ٹانگے جاؤ گے۔ عدالت کے دروازے پر۔ گو دکھا کہیں کا۔

گھسیٹے۔ ہاں بھئی بگڑے کا کوئی دوست نہیں۔

چوبدار ۔ اب چلتے ہو یا مچلتے ہو ؟

گھسیٹے ۔ ہم تو نہ جائیں گے چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے ۔

چوبدار ۔ تو پھر ہم زبردستی لے چلیں گے ۔

ادھر نواب صاحب نے تراب علی کو حکم دیا کہ بھئی دیکھو سپاہی کھڑا ہے ۔ کوچ بین کو بلا دو ۔ چوبدار بھی مرگیا جا کے ۔ تراب علی لپکے ہوئے میاں گھسیٹے کے پاس گئے " ارے میاں گھسیٹے ہوت ۔ چلو سپاہی آیا ہے بیٹھے کیا کرتے ہو " چوبدار نے کہا ۔ اجی وہ تو .... اس وقت جانے کیا واہی تباہی بک رہے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ بس اب پھانسی ہوئی ۔ بچوں کی طرح مچل رہے ہیں .....

میاں گھسیٹے افتاں وخیزاں چوبدار اور تراب علی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے بہزار خرابی چلے ۔ جب نواب زادہ نامدار کے حضور میں پیش کئے گئے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ۔

نواب ۔ تم بالکل نادان ہو ۔

گھسیٹے ۔ آپ کے دربار میں جو دانا ہو اسی کو حضور میری عوض بھیج دیں ۔

نواب ۔ واہ ۔ بڑے بزدل ہو ۔

گھسیٹے ۔ حضور یہ جھمن تو ڈنڈ پیل ہیں ۔ انھیں کو بھیج دیجئے ۔

جھمن ۔ میں کہوں گا کہ مجھے تو نگھی ہی نہیں ہانکنا آتی ۔

گھسیٹے ۔ اور میں کہوں گا کہ اسی لئے تو آدمی کھل گیا ۔

جھمن ۔ گنوار پن کی نہ لو ۔ اب چلے جاؤ ۔

گھسیٹے ۔ آپ تو شہر کے ہیں پھر آپ ہی میری جگہ پہ تشریف لے جائیں ۔

نواب ۔ ہم برق انداز سے کہہ دیں گے وہ ایک دور دل جما کر کشاں کشاں لے جائے گا ۔

گھسیٹے نے کہا حضور میرا استیفا (استعفا) ۔ تراب علی بولا کہ پھر اس سے کیا بچ جاؤ گے ۔ برق انداز نے قہقہہ لگایا ، جانو توپ لگی ہے " گھسیٹے بولا ۔ ہاں بھئی ہنسو ہنسو تم ۔ وقت ہی ہم پر ایسا آن پڑا ہے ۔ اس فقرے کو کوچ بین نے ایسی بے کسی سے کہا کہ حاضرین و مصاحبین سب نے زور سے قہقہہ لگایا اور گھسیٹے کو خوب ہی بنایا ۔

برق انداز نے دنی ہو کر پوچھا اب چلیے گے یا میں چوکی پر رپٹ بولوں ۔ تھوڑی دیر میں صاحب اجلاس پر آجائیں گے ہم پہ خفگی ہو گی ۔ نو بج گئے ہیں "

گھسیٹے نے پوچھا ۔ بھلا نہ چلنے کی بھی کوئی تدبیر ہے ۔

برق انداز نے کہا بس تدبیر و بیر یہی ہے کہ تم کو گھدیڑتے لے چلے ۔ (نواب صاحب سے) غریب پرور اب ہمیں کیا حکم ہوتا ہے ۔ انھیں زبردستی پکڑ لے جائیں گے ہم ۔

نواب صاحب نے حکم دیا ۔ تراب علی ، گھسیٹے کو زبردستی لے جاؤ ۔ گھسیٹے نے کہا " سپاہی بھیا ! یہاں سے کوس بھر پہ میرا گاؤں ہے میں جا کے جورو اور لڑکوں سے تو مل آؤں ۔ ان سے تو کہوں کہ میں اب جاتا ہوں (رو کر) ابھی آجاؤ نگا ۔

برق انداز نے پھر قہقہہ لگایا ۔ اخاہ یہ تو جیسے جانے مرے جاتے ہیں ۔

میاں گھسیٹے کو تراب علی نے گھسیٹ گھساٹ کر بہزار دقت ایک ڈولی پہ لادا اور باندھ کر لے چلے ......

گھسیٹے ۔ دہائی بڑے صاحب کی۔ دُہائی بڑے صاحب کی ۔

برق انداز۔ کیا بیہ پڑ رہے ہیں ۔

گھسیٹے ۔ یہ سارا فساد تراب علی اور جھمن کمبخت کا ہے ۔

جھمن ۔ بس صاف صاف کہہ دینا کہ حضور ہم نے غل مچایا مگر کمہار نے ایک نہ سُنی ۔

گھسیٹے ۔ اجی دیکھیئے تو کیسا صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ بھی یاد کریں ۔

جھمن ۔ کیا۔ آواز تو نکلے گی نہیں۔ کہنے لگے یاد کرو گے ۔ ہونہہ ۔

میاں گھسیٹے گھسٹتے ہوئے عدالت کے دروازے تک پہنچے ۔ تراب علی نے ایک درخت کے سایہ میں لے جا کر ان کو بٹھایا اور سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کونسلی بڑا خرانٹ ہے ۔ تم کو بلوہ بچا لانا کوئی بڑی کرامات نہیں۔ دو چار روپے جرمانہ ہو جائے گے بس نرے سے بنائیں گے ۔

گھسیٹے کا دم خفا تھا۔ مبتلائے رنج و بلا تھے ۔ لب پہ آہ و فغاں قضا کا نوحہ خواں ۔

جھمن ۔ میاں گھسیٹے کس سوچ پہ ہو ۔

میاں کیا بتائیں کس سوچ میں ہیں ...... بھئی ایسا نہ ہو کہ صاحب ہم پہ جرمانہ کر دیں ۔ اور تم لوگ دل لگی باز تو ہو ہی اپنے اپنے گھر چل دو اور ہمارا مکان گانسا جائے ۔ ہم کو نقد روپیہ دے دو کہ صاحب ادھر جرمانہ بولے ۔ ادھر تڑ سے چہرہ شاہی گن دیئے ۔

تراب علی نے دس روپے گھسیٹے کو دے دیئے ۔ گھسیٹے کے ہوش پران کہ خدا خانے آج کس بلا میں مبتلا ہوں ۔ کیا معلوم کمہار کمبخت کی ٹانگ ٹوٹی ۔ ہاتھ ٹوٹا ، سر پھوٹا ۔ کیا آفت نازل ہوئی ۔ حاکم کیا حکم سُنائے ۔ کبھی تراب علی سے باصرار کہتے تھے کہ بھائی جان ہم کو ذرا گھر تو ہو آنے دو ۔ معقول ! گویا کالے پانی جانے تھے ۔ کبھی درخت کے سائے میں بیٹھ کر سوچتے تھے کہ بھاگ جاؤں یا دیوانہ بن جاؤں ۔ کروں تو کیا کروں ۔

جھمن ۔ (مسکرا کر) سُنا وہ کمہار مر گیا ۔

تراب علی ۔ نہ جی تم اور ڈرائے دیتے ہو ۔

گھسیٹے ۔ ارے میاں ادھ مرے کو کیا مارتے ہو ۔

اتنے میں ایک بگھی گاڑی آئی اور صاحب مجسٹریٹ بہادر اس میں سے برآمد ہوئے ۔

جھمن ۔ انھیں کے اجلاس پہ مقدمہ ہے ۔

گھسیٹے ۔ (اُٹھ کر) ہاں بھلا یہ پلٹن کے صاحب تو نہیں ہیں ۔

جھمن ۔ یہ کیوں ۔ اس کے کیا معنی ۔

تراب علی ۔ اجی انصاف کریں گے ۔ ضرور ی صاحب لوگوں کے مزاج میں انصاف ہوتا ہے ۔

گھسیٹے ۔ ارے بھئی یہ سب نقدیر کے کھیل ہیں ۔ بچنے والا بچ ہی جاتا ہے ......

اتنے میں چپراسی نے پکارا ۔ گھسیٹے کو چیان حاجیر ہے ۔

تراب علی ۔ حاضر ہے ۔

جھمن۔ چلو بھیا۔

گھسیٹے۔ یا خدا یا میرے اللہ مالک میرے بچائیو۔ میرے مولا۔

تراب علی۔ اب چپکے چپکے چلو۔ اور جو کچھ دعا مانگنی ہو تو دل ہی دل میں مانگو۔ ہلّڑ مچاتے نہ چلو۔ گھسیٹے آبدیدہ ہو گیا۔ اگر کوئی ذرا چھیڑتا تو رو دیتا۔ چلا تو قدم اُٹھانا دوبھر ہو گیا۔ پاؤں ڈگمگانے لگے۔ رنگ فق۔ چہرے سے وحشت برسنے لگی چلتے چلتے صاف مجسٹریٹ کی بگھی کی طرف گیا۔ اور کوچ مین سے یوں پوچھنے لگا۔

گھسیٹے۔ بھائی مالیکم سلام۔

کوچ مین۔ سلام بھیا۔

گھسیٹے۔ ہم کو پہچانا۔

کوچ مین۔ ہاں وہاں نواب صاحب کے ہہاں ہو۔ سمندر جوڑی کی نٹن پر۔

گھسیٹے۔ ہاں بھئی۔ ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ پہیئے کے تلے ایک کہار کا ہاتھ دب گیا۔

راوی۔ اس وحشت کے صدقے کمہار کا کہار اور پاؤں کا ہاتھ بنالیا۔

کوچمین۔ میاں یہ کار بڑا ناجک (نازک) ہے۔ جری (ذری) چوک اور تلوار کی دھار پہ دم آٹھوں گانٹھ کمیت رہے۔ جب جاکے بنے۔

گھسیٹے۔ تمھارے صاحب کا مجاز کرڑا تو نہیں ہے۔

کوچمین۔ نہیں کسو سے بولتے چالتے نہیں۔ سبب ہے انگریز ہیں بچارے میم صاحب کبھی کبھی کچھ کہتی بھی ہیں۔ یہ بچرے تو بولتے تک نہیں۔

گھسیٹے۔ دیکھئے ہمیں کیا حکم ہوتا ہے۔

کوچمین۔ اونہہ ہونا کیا ہے۔ رُوپیہ دو روپیہ جرمانہ اور کیا۔

کانسٹیبل نے للکارا کہ چلو جھٹ پٹ صاحب خفا ہو رہے ہیں۔

تراب علی نے بھی ڈانٹ بتائی۔ کہ اب چلتے ہو یا دکھڑا لے کے بیٹھے ہو۔ خفگی کا لفظ جو سُنا تو میاں گھسیٹے کی رہی سہی عقل بھی جاتی رہی۔ بارے بہزار خرابی اجلاس پہ پہنچے تو دونوں ہاتھ باندھ کر چور کی طرح کھڑے ہوئے۔ مگر بدن تھر تھر کانپ رہا ہے اور پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔

صاحب۔ تمھارا نام۔

گھسیٹے۔ حضور بال بچوں والا ہوں۔ دو ننھے ننھے لڑکے ہیں ایک بٹیا پائی ہے۔ اور قبیلہ ہے حضور اور دو مسیاں ہیں۔

صاحب۔ اوہ۔ ول۔ یہ مجرم ہے۔ گھسیٹے۔ باپ کا نام؟

گھسیٹے۔ حضور میرا نام کاغذ پر چڑھا لیں مگر باپ کا نام نہ لکھیں۔ مرے ہوئے مُردے کیوں اکھیڑئیے۔

سررشتہ دار۔ (شاعر آدمی) مرے ہوئے مُردے نہیں گڑے ہوئے مُردے۔

تراب علی۔ یہ کوچوانی ہی خوب جانتا ہے۔ منطق نہیں پڑھا ہے۔

صاحب۔ باب کا نام گڑا مُردہ۔

راوی۔ صاحب مجسٹریٹ کا قاعدہ تھا کہ جو کچھ لکھتے تھے اس کو زبان سے بھی ادا کرتے جاتے تھے۔ حضرت نے جو میاں گھسیٹے کے باپ کا نام گڑا مُردہ لکھا تو اجلاس پر حاضرین کو بے اختیار ہنسی آئی۔

سررشتہ دار۔ حضور۔ ابھی اس نے باپ کا نام نہیں بتایا۔
صاحب۔ ول تمھارے باپ کا نام کیا ہے۔
گھسیٹے۔ حضور میرے بال بچے بھوکوں مرجائیں گے۔ (ہاتھ جوڑ کر) حضور میں مرمٹوں گا۔
صاحب۔ یہ پاگل ہے۔ کون ہے تم کون ہے۔
گھسیٹے۔ حضور پاگل ہوں۔
صاحب۔ اچھا کانسٹیبل اس کو پاگل خانے لے جاؤ۔ (مسکرا کر) جاؤ پاگل خانے تم۔
گھسیٹے۔ حضور دن بھر گاڑی چلاؤں گا۔ نوکری بجاؤں گا۔ رات کو پاگل خانے میں سو رہا کروں گا۔
صاحب۔ (ہنس کر) باپ کا نام۔
سررشتہ دار۔ بتاتا نہیں۔ نامعقول۔ گنوار۔
گھسیٹے۔ ہائے گجب۔ (غضب)
صاحب۔ باپ کا نام ہائے گجب۔
سررشتہ دار۔ نہیں خداوند۔
صاحب۔ چپ رہو۔ باپ کا نام ہائے گجب۔ دادا کا نام۔
گھسیٹے۔ وہ تو عمر بھر مرغ لڑایا کئے۔
صاحب۔ دادا کا نام مرغ۔ ول عمر کتنا۔
گھسیٹے۔ نصیرالدین حیدر جب گدی پر بیٹھے تو میں پاؤں پاؤں چلتا تھا۔
صاحب۔ سررشتہ دار۔ اس کا عمر کتنا۔
سررشتہ دار۔ خداوند ہماری طرح یہ بچپن کے پیٹے میں آگیا۔
صاحب۔ عمر ۵۵ سال۔ رہنے والا کہاں کا ہے۔
گھسیٹے۔ اچھی کس مپرسی ہے۔
صاحب۔ رہنے والا کرسی کا۔ تم نے گاڑی بے کابو (قابو) چلایا۔
گھسیٹے۔ حضور راس جھمن کے ہاتھ میں تھی۔
صاحب۔ (سُرخ ہوکر) کیا!
سررشتہ دار۔ ارے مردِ خدا جو ہوا ہو بتا دے۔ کوئی کھا نہیں جائے گا۔
جھمن۔ بتا دو۔ بتا دو۔
تراب علی۔ کہہ دو صاف صاف ڈرتے کیوں ہو۔
گھسیٹے۔ تمھیں بڑے باپ کے بیٹے ہو تو کہہ دو کہ راس ہمارے ہاتھ میں تھی۔
صاحب۔ مجرم نے اقبال کیا کہ راس ہمارے ہاتھ میں تھی۔
گھسیٹے۔ حضور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا کہ ہیٹ ہیٹ۔ (بہت زور سے) موڑ پر سے بھاگ کر چل ہٹ۔ بچ ہٹ۔ دور ہٹ۔ ایک نہ

سُنی اور ہم کو پھانسی دلوائی۔

کمہار۔ گوسیّاں جب کلتے پہ گاڑی آگئی تب پکارے کہ چل ہٹ سرا مجادے۔ جب پاؤں کچیل گیا تب کہس ہمار گوڑ کاٹ ڈاریں۔

گھسیٹے۔ حضور اس سے مجھے لاگ ڈانٹ ہے۔ یہ لئے مرتا ہے۔ حضور میرے بال بچے ننھے ننھے ہیں۔ کمہارن تو بھولے بھالے کھلونے بنا کے بیچ بھی لے گی۔ میری جورو تو سینا پرونا بھی نہیں جانتی۔

صاحب۔ ہم کو تمھاری جورو سے کچھ مطلب نہیں۔

گھسیٹے۔ تو خدا حضور کو سلامت رکھے۔ مجھ کو تو اس سے مطلب ہے اس بوڑھوتی وقت میں جورو اور امّاں سب کچھ وہی ہے۔

صاحب۔ (ہنس کر) تم مسکھری (مسخراپن) کرتا ہے۔

گھسیٹے۔ مسکھری؟ اے حضور جان پہ بن آئی۔ مسکھری کس کی جورو ہے۔

کمہار۔ گوسیّاں ہمارا گوڑ کچیل ڈالس ہے۔

صاحب۔ بولو۔ ول تم نے گاڑی تیز کیوں دوڑایا۔

گھسیٹے۔ حضور جھمن نے کہا تھا۔

جھمن۔ ارے چپ بیوقوف بڑا شریر ہے بھئی۔

گھسیٹے۔ حضور۔ میں حضور کی صورت دیکھے ڈرتا ہوں۔

صاحب۔ ول تم ہم کو دولف سمجھتا۔ کیا سمجھتا۔ ہم کو وولف جانتا۔

گھسیٹے۔ میں نہیں سمجھا لدف کیا۔

سر رشتہ دار۔ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ کیا تم ہم کو بھیڑیا سمجھتے ہو۔

گھسیٹے۔ اللہ کرے اس کمہار کو بھیڑیا لے جائے۔

صاحب۔ گھسیٹے پر دو روپے جرمانہ۔

الغرض بڑی دیر تک روبکاری رہی۔ اور آخرکار دو روپے میاں گھسیٹے پہ جرمانہ ہوئے۔ حضرت نے دو روپے چپکے سے میز پہ رکھے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے۔

تراب علی۔ کہو پھانسی تو نہیں دی گئی۔

جھمن۔ جی چاہتا ہے کہ ایک گڑا دوں پاجی کو۔ ہر سٹے ہمارا ہی نام لیتا تھا۔ راس بھی جھمن ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور گاڑی بھی جھمن ہی کے کہنے سے دوڑائی۔ اور کمہار بھی کچلا تو جھمن ہی کے سبب سے۔ اس مردود کی شیطنت تو دیکھئے۔

تراب علی۔ اس تو تو میں میں کو جانے دو مطلب کی دو باتیں سُن لو...... گھسیٹے۔ جو کچھ مل رہے تو کیسا۔

گھسیٹے۔ مل رہے؟ مل کیا رہے؟

تراب علی۔ اجی روپیہ مل رہے تو کیسا۔

گھسیٹے۔ ہم سمجھے ہی نہیں۔ روپیہ کیا چھت پھاڑ کے ملے گا۔ کہیں ڈاکا واکا ڈالنے کی نیت تو نہیں ہے۔ اے ہاں کہ پھر کچہری آنا پڑے اور اب کی بڑا گھر ہی دیکھیں بھیّا۔ اب خدا یہاں نہ لائے۔ باپ کا نام بتاؤ۔ دادا کا نام بتاؤ۔ حلف اٹھاؤ......

تراب علی۔ کتنا کوڑھ مغز آدمی ہے۔ ارے میاں اگر نواب سے جھوٹ بول کے روپیہ ملے تو لوگے کہ نہیں۔

جھمن۔ تم کہنا کہ ایک انگریز کونسلی ہماری طرف سے تھا۔ اس نے خوب خوب تقریر کی۔

تراب علی۔ اور کہنا کہ کمہار نے بھی ایک ڈبلو کیا تھا۔

گھسیٹے۔ ابھی ہم کہہ دیں گے۔ کہ راڈن صاحب اس کی طرف سے تھے۔

تراب علی۔ ارے کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ راڈن تو ولایت گئے ہیں۔

جھمن۔ مروا ہی دیا تھا۔

تراب علی۔ نہیں جی۔ وہاں کس کو یہ فکر ہے۔ کہ راڈن کون ہے اور کیا۔

گھسیٹے۔ تو پھر ہم کو کیا دلواؤ گے۔ ہم پندرہ سے کم نہ لیں گے۔

تراب علی۔ (جھمن کے کان میں) اچھا گو کھا پھنسا۔

جھمن۔ بھئی پندرہ دیں گے مگر اس شرط سے کہ ایک روپیہ کے یار لوگ دم لگائیں۔

مولانا عبدالحلیم شررؔ

دل دینا

عشاق ہر صورتِ زیبا کو دل دے دیتے ہیں، شعرا کا دل ہمیشہ کسی کی زلف گرہ گیر میں رہا کرتا ہے۔ داستان گو دل دینے اور دل لینے کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زورِ قلم اس کوشش میں صرف ہوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؛ خلاصہ یہ کہ دل دینا ایک نہایت ہی آسان مشغلہ سمجھ لیا گیا اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دل دیا، نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دل دیتے ہیں۔ صدہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دلدہی اور دلبری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرونِ وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دل دینے اور لینے کا سچا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے ہم اس واقعے کو ان کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے در پیش تھے اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ اٹھا چلا آتا تھا فرانس میں نواب شیمپین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کوسی، جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین و زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتابِ رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ

دکھایا کہ لارڈ کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور نا جائز الفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کرتا مگر کچھ زور نہ چلتا۔

اسی اثناء میں نواب شاہپین تیار ہوا کہ ارض مقدس میں جا کر مسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے جو مجاہدین فرانس اس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے ان کے زمرے میں لارڈ کوسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اس ارادہ کی اطلاع جب اس نے لیڈی فائل کو کی تو معشوقۂ دل نواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رُلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دل میں کہا "اچھا ہے۔ لارڈ کوسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتش رقابت ٹھنڈی پڑ جائے گی اور شاید ان کی بدگمانیاں دور ہو جائیں"

اس کے بعد ہنسی خوشی عاشق دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں، کچھ جواہرات تھے اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا اور اس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں یورپ کے بانکوں اور فرنگی مرداروں کی دھج تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوبصورت ڈوری سے خود میں اٹکایا کرتے، اور اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی۔ الغرض بصد حسرت واندوہ عاشق و معشوق جدا ہوئے اور لارڈ کوسی نے شاہپین کے نواب کے ہمراہ ارض مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ ۵۸۵ھ کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکّہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقت عظیم چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

لارڈ کوسی نے نئے مجاہدین فرنگ کے ساتھ ساحلِ فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور شور سے دھاوے کرنے لگا اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں، پتھروں اور آتش بازی کے قمقموں کو ڈھال پر لیتا ہوا عکّہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر سر نکالا ہی تھا کہ کسی مسلمان نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آ رہا اور لوگ فوراً خیمے میں اٹھا لے گئے۔

خیمے میں لیٹ کر لارڈ کوسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی محبوبۂ جاں نواز یاد آئی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے ان باقی ماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا "میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری دلدار محبوبہ کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اس نے مجھے یادگار محبت کے طریقے سے دی تھیں اسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مر چکوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکالنا اور اس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے، اور اس کو بھی لے جا کر اسی آفتِ جاں کی نظر کر دینا۔"

یہ وصیتیں کر کے لارڈ کوسی مر گیا اور وفادار ملازم نے ان پر پورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس میں پہنچا اور لارڈ فائل کے قصر کے قریب جا کر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اس کی محبوبہ کے حوالے کرے۔ اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کوسی کا ملازم ہے اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اس کے سر پر جا پہنچا اور کہا "سچ سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے، ورنہ تیری جان کی خیر نہیں۔ ملازم نے قسمیں کھا کر کہا "میرے مالک تو ارض مقدس میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اب پیام دینے والا کون ہے؟" لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اس کے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا "بتا ورنہ سر زمین پر پڑا لوٹتا ہوگا" خادم سہم گیا، ہوش و حواس جاتے رہے اور جان کے خوف سے

ساری باتیں قبول دیں۔ جو چیزیں ساتھ لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیں اور لارڈ کوسی کا خط بھی اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصے کی انتہا نہ تھی اور جوشِ غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا انتقام لے۔ فوراً قصر میں آکر اپنے باورچی کو بلایا اور وہ لارڈ کوسی کا دل اس کے ہاتھ میں دے کر کہا اس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ۔ کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر ان کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا "تمہارے شوق کے مطابق ان کو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے۔" بیوی نے ان کبابوں کو بڑے شوق سے لیا، مزے لے لے کر کھایا اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہر خند کے ساتھ پوچھا "کیسے پکے ہیں؟" جواب ملا کہ بہت اچھے پکے ہیں اور مجھے بہت مزا آیا۔ کہا "ہاں مزا آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اس کو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوسی کا دل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟" لیڈی فائل کو اس کا یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگزشت من وعن بیان کر دی اور بیوی کے دیئے ہوئے یادگارِ محبت کے تحفوں کے ساتھ لارڈ کوسی کا خط بھی نکال کر سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اس کے خون شدہ دُکھے دل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہوا مگر ضبط کیا اور استقلال کے تیوروں سے بولی "ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دل کا مقبرہ بن گیا ہے لہٰذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی نہ اس اچھے دل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کروں گی۔" یہ کہتے کہتے پُرحسرت زبان رُک گئی۔ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی۔ دوستوں، عزیزوں، ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اسی رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز ملکِ عدم کی راہ لی۔

مرزا محمد ہادی رسوا

شریف زادہ

مرزا عابد حسین جب اودھ کے ایک ضلع میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے، سرائے میں اُترے۔ صاحب کی ملاقات کی۔ کار سرکاری سپرد ہوا۔ اس عرصے میں اُس بستی کے بہت سے لوگ ان کو پہچاننے لگے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چھوٹی بستیوں میں بہ نسبت بڑے شہروں کے بہت جلد شہرت ہو جاتی ہے۔ دو ایک صاحب شریف صورت اس بستی کے رہنے والے جو اپنے ذاتی منافع کے باب میں بڑے خوش فکر اور دور اندیش ہوتے ہیں۔ اُن سے سرا ہی میں آ کے ملے۔ ایسے لوگوں کو خواہ مخواہ فکریں رہتی ہیں کہ فلاں عہدے پہ کون شخص مقرر ہوا۔ کس کی تبدیلی ہوئی۔ کس کی ترقی ہوئی۔ کس کا تنزل ہوا۔ غرضکہ یہ لوگ زندہ گزٹ ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ نہ کہیں نوکر نہ چاکر۔ نہ کوئی ذاتی معاملہ نہ مقدمہ مگر ان باتوں سے بڑے بڑے مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکام رسی۔ اہل عملہ سے حسب حیثیت رسم و راہ۔ یہ خاص اوصاف ہیں جو منجملہ فضائل سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب سے جو لوگ آ کے ملے اُن میں سے ایک صاحب فدوی میاں خاندانی رئیس اس بستی کے تھے۔ مگر بہ شرف انقلاب روزگار یا موروثی غفلت اور اسراف یا خود اُن کی اولوالعزمی یا شرکاء کے تنازع قانونی یا کارندوں کی چالاکی کی وجہ سے اب صرف اضافی رہ گیا تھا۔ اگرچہ زمانہ سابق میں اُن کے بزرگ زمیندار تھے۔ مگر اب صرف برائے نام ایک موضع کا نمبر آپ کے نام سے رہ گیا تھا۔ اگرچہ اُس پر بھی تصرف مالکانہ ان کے ایک کارندہ مسمی شبو رتن کا تھا۔ جو کہ در حقیقت اسی گھر کا ساختہ پرداختہ تھا مگر اب خود ان سے بدرجہا متمول اور ان کی کل موروثی جائداد کا اصلی مالک تھا۔ مگر بلحاظ اخلاق ظاہری جو کہ اکثر کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے وہ ابھی تک ان سے بمراعات پیش آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ موضع بھجی پور جہاں کا وہ اصلی باشندہ تھا۔ اُسی کے یہ برائے نام نمبردار تھے۔ تحصیل وصول شبو رتن کے پاس تھی۔ مگر رعایا ابھی تک انھیں کا رعب و داب مانتی تھی۔ آسامیوں سے دبا کے کبھی کبھی کچھ انہیں بھی وصول ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اور وجہ شبو رتن کی ان سے دبنے کی یہ تھی کہ شبو رتن ایک چھوٹے درجہ کا آدمی تھا اور بستی کے لوگ بسبب ان کی قدیمی ریاست کے ان کو مانتے تھے اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے حکام اور اہل عملہ تک انکی رسائی بسہولت ہو سکتی تھی۔ شبو رتن کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ اس لئے کہ اکثر مقدمات میں سعی۔ سفارش۔ کہنا۔ سننا جو کچھ ہوتا تھا وہ انھیں کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ یہ دوا دوش اور تملق و چاپلوسی جو اکثر موقعوں پر کرنا پڑتی تھی اُس کا تمام فائدہ شبو رتن کو حاصل ہوتا تھا۔ آپ کا منشا صرف

اس قدر تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ فدوی علاقہ دار ہے اور فدوی کے قبضے میں ابھی کل مواضع ہیں اور شبور تن صرف ایک کارندہ ہے۔ صرف اسفدر تفاخر کے تحفظ کے واسطے آپ ہر طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں گوارا کرتے تھے۔ بستی میں جس قدر مکانات آپ کے بزرگوں کے تھے وہ اب شبور تن کے قبضے میں تھے اور اُن میں اکثر اہل عملہ رہا کرتے تھے۔ اُس کا کرایہ شبور تن ماہ بماہ وصول کر لیتا تھا۔ از لبسکہ کرایہ لینا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہذا اگر کبھی اس کا ذکر کسی موقع پر آیا تو آپ اُس سے تحاشی فرماتے تھے اور شبور تن کو غائبانہ کلمات نالائم سے یاد فرماتے۔

اسم مبارک آپ کا فدا علی تھا۔ مگر اس نام سے لوگ بہت کم واقف تھے۔ لوگ آپ کو اکثر فدوی میاں کے نام سے جانتے تھے۔ آپ کا خود یہ بیان تھا کہ فدوی تخلص ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدائے سن میں آپ اس لفظ کو اپنی نسبت بہت استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً "فدوی حاضر ہوا تھا" اور "فدوی غائب ہوا" اور "عرض فدوی کی یہ ہے" اور "فدوی آپ کا قدیمی نیاز مند ہے"۔ اس لفظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے لوگوں نے آپ کا نام فدوی میاں رکھ لیا۔ پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ اسی اسم سے موسوم ہو گئے۔ آپ نے مصلحتاً یہی تخلص اپنا قرار دے لیا۔ کیونکہ آپ کے تخلص کی دجواب کسی کو یاد بھی نہ تھا) شہرت نہ ہونے پائی کہ یہ لقب مشہور ہو گیا۔ ایسی حالت میں اُس تخلص کو بٹہ کھاتے میں ڈال کر وہم نقد یہ تخلص اختیار کر لینا عین مصلحت تھی۔

مرزا عابد حسین کے تقرر کی خبر ضلع میں اُن کے آنے سے پہلے آپ کو مل گئی تھی۔ جس دن آپ تشریف لائے اُس کے دوسرے ہی دن آپ سرا میں پہنچ گئے۔ پھر ملاقات کر لینا کتنی بڑی بات تھی۔

مرزا صاحب چار بجے کے بعد سرا میں آ کے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نازل ہوئے اور بھٹیاری سے دریافت کر کے بے تکلف مرزا صاحب کے پاس چلے آئے۔

فدوی:۔ فدوی آداب عرض کرتا ہے۔

مرزا صاحب:۔ تسلیم۔

مرزا صاحب بہت دیر آشنا تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وضع تہذیب کے پابند نہ ہوں۔ جب ایک شریف صورت اس طرح تعارف کرے تو اس سے بے رُخی کریں۔

آئیے تشریف لائیے۔

اُس وقت اتفاق سے بھٹیارہ اُس طرف کسی ضرورت سے آ نکلا۔ اُس نے کہا "فدوی میاں سلام" اسی طرح کئی شخصوں نے آپ کو سلام کیا۔ چلیے نام بتانے کی ضرورت بھی نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کو معلوم ہو گیا کہ آپ اس لقب سے ملقب ہیں۔ اس پر بھی مرزا صاحب نے ازراہِ احتیاط اسم مبارک دریافت کیا۔

فدوی میاں:۔ بس یہی "فدوی"

مرزا صاحب:۔ (کسی قدر تعجب سے) درست!

فدوی میاں:۔ جی ہاں۔ وہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نام تو میرا فدا علی ہے مگر فدوی تخلص ہے۔ یہی زبان زد ہر خاص و عام ہو گیا

مرزا صاحب:۔ بہت مبارک!

فدوی میاں:۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر میں بہت مشتاق تھا کہ آپ سے ملوں اس لئے کہ یہاں حکام اور اہل عملہ میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب:۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کو اس قسم کا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں :۔ جی ہاں شوق کیا۔ ایک لت سی ہے۔ آپ جانئے بارہ باشی ہیں تو وہ مزا ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب :۔ صحیح ہے جس کو جس بات کا شوق ہو جائے اگر اُس میں تضیعِ اوقات بھی ہو۔ مگر انسان سے بمشکل ترک ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے ان بلیغ فقروں کا مطلب یا تو فدوی میاں سمجھے ہی نہیں یا سوجھ بوجھ کے تجاہل عارفانہ فرمایا۔ اس لئے کہ مرزا صاحب تو کچھ ایسے گُھرّے تھے بھی نہیں۔ آپ تو ایسے ایسے حکام اور اہلکاروں سے مل چکے تھے جو رکھائی میں شہرہ آفاق تھے۔ اور فدوی کو اس بات کا فخر تھا۔ مرزا صاحب کیا چیز تھے۔ جیمیس صاحب جو بے ہودہ ملاقاتوں سے اس قدر نافر اور ہارب تھے کہ جو کوئی بلا وجہ ان کی ملاقات کو جاتا تھا ڈنڈا لے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ اُن سے بھی فدوی میاں مل چکے تھے اور جب تک وہ اس ضلع میں رہے برابر ہر دو شنبہ کو سلام کے لئے جایا کئے۔ علیٰ ہذا القیاس ڈپٹی تہور حسین خاں صاحب جنہوں نے اپنے بنگلے پر تختی لکھ کے لگا دی تھی کہ کوئی میری ملاقات کو نہ آئے۔ وہاں بھی فدوی پہنچ گئے اور آخر اس قدر رسم بہم پہنچایا کہ اُن کا پیچوان پیا۔ اُن کے خاصدان سے پان کھایا۔

فدوی میاں :۔ (مرزا عابد حسین سے) یہاں سرا میں تو آپ کو تکلیف ہوگی۔

مرزا صاحب :۔ جی ہاں۔ ابھی کل تو آیا ہوں۔ مکان تلاش کر کے اٹھ جاؤں گا۔

فدوی میاں :۔ فدوی کے مکانات لاتعد ولاتحصٰی ہیں۔ خالی پڑے ہیں۔ جو پسند آئے اُس میں اُٹھ چلئے۔

مرزا صاحب :۔ (کسی قدر تامل کے بعد) کس کرائے کے مکانات ہوں گے۔

فدوی میاں :۔ (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں دیہات میں اس بات کا عیب ہے۔

مرزا صاحب :۔ مگر میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان میں رہوں۔

فدوی میاں :۔ مگر جب کسی غیر کا مکان ہو نہ۔ مرزا صاحب اس کا جواب دینے ہی کو تھے کہ میرے آپ کے کب کی شناسائی ہے مگر اسی اثنا میں ان سے ایک اور صاحب ملنے کو آگئے۔

پنڈت جانکی پرشاد صاحب ان کے ہم مکتب دوست جو اس ضلع میں تھانہ دار تھے، مرزا صاحب اُن سے مخاطب ہو گئے۔ فدوی میاں سے اُن سے حسب معمول بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ بلکہ کچھ مذاق بھی فیمابین ہوتا تھا۔ مکان کا تذکرہ پنڈت صاحب کے سامنے بھی ہوا۔ پنڈت صاحب نے بھی یہی کہا کہ فدوی کے کئی مکان خالی ہیں کوئی ان میں سے پسند کر کے اُٹھ جائیے۔ ایک عہدہ دار پولیس کے کہنے سے مرزا عابد حسین کو یہ تو اطمینان ہوا کہ فدوی میاں قابل اعتماد شخص ہیں۔ مگر۔

مرزا صاحب :۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ میں کرایہ نہ دوں گا۔

پنڈت صاحب :۔ اچھا اُٹھ جائیے۔ حساب دوستاں در دل والا معاملہ ہو جائے گا۔

مرزا صاحب اس معمّے کو نہ سمجھے۔ مگر چپ ہو رہے۔ اس اثنا میں فدوی میاں کسی ضرورت سے اُٹھ گئے۔

پنڈت صاحب نے اصل حقیقت مرزا صاحب کے ذہن نشین کر دی۔ معلوم ہوا کہ مکان کا اصل مالک شیو زتن ہے وہ آپ کے گھر کا کارندہ تھا۔ اس لئے آپ اُس کو مال مملوک سمجھ کے اپنا مال سمجھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین :۔ مگر یہ تو کہئے۔ یہ حضرت میرے اوقات میں تو ہارج نہ ہونگے کیونکہ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت صاحب :۔ کچھ ایسے ہارج نہ ہوں گے۔ مکان میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے بڑا مکان جو آج کل خالی ہے اُس میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے۔ آپ کی قسمت سے اُن کی تبدیلی ہو گئی۔ فوراً لے لیجئے نہیں تو کوئی نہ کوئی لے لے گا اور آپ کو افسوس ہوگا۔ ان کے ہارج ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے لوگ جو بہت لوگوں سے ملتے رہتے ہیں، وہ کسی قدر مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ وہ آئیں گے ضرور خواہ

اُن کے مکان میں رہیئے خواہ نہ رہیئے۔ مگر جب آپ منہ نہ لگائیں گے دو چار منٹ ٹھہر کے چلے جایا کریں گے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہوگا۔ دوسرے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس چیز کی ضرورت ہو (مسکرا کے) خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو یہ مہیا کر دیتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ بہ کفایت، مرزا صاحب پنڈت جی کے اس موقع پر مسکرانے سے کسی قدر بدظن ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی نے اپنی تقریر کو اس طرح جاری کیا۔

پنڈت جی:۔ مثلاً اب فی الحال تو آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہوگی۔ وہ آپ کی معرفت بہت جلد اور کفایت سے مل سکے گا۔ ماہواری غلہ۔ گڑ۔ گھی راب جس شے کی ضرورت ہوگی۔ ان کی معرفت مل جایا کرے گی۔ اسباب ضروری مثل پلنگ۔ میز کرسیاں۔ دریاں۔ برتن باسن یہ سب انھیں سے منگوا لیجئے گا۔

مرزا صاحب:۔ مگر ان سب کا معاوضہ کیا دینا ہوگا۔

پنڈت صاحب:۔ کوئی معاوضہ نہیں صرف وہی چند منٹ ہرج اوقات جو اُن کے آنے سے ہوگا یا اگر کچھ کمیشن وغیرہ لیتے ہوں تو اُس کا علم نہیں

مرزا صاحب:۔ اچھا اگر کمیشن لے کے عمدہ شے بہم پہنچا دیتے ہیں تو یہ کچھ ایسا معیوب نہیں۔

پنڈت صاحب:۔ ہاں بس یہی سمجھ لیجئے۔ میرا جہاں تک خیال ہے آپ کو ان کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ فائدہ ہو جائے

مرزا صاحب:۔ باہم فائدہ رسانی تمدن کا اصل اصول ہے۔ اس کا میں منکر نہیں ہوں۔ مگر وہ معاملات جن میں طرفین سے غیر کافی معاوضہ پہ کوئی شے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کی جائے یا کوئی کام کیا جائے ہیں اُس کو ناجائز سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی:۔ یہ دقیق منطق تو میری فہم سے باہر ہے۔ میرے کہنے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان لے لیجئے پھر جس طرح چاہئے اُن سے معاملت رکھئے گا۔

مرزا عابد حسین:۔ پنڈت صاحب اصل امر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی معرفت مکان لینا بھی کسی قدر مسلکِ احتیاط سے دور ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اور کوئی مکان نہیں مل سکتا اور اصل معاملہ ایک شخص ثالث سے ہے کہ جس کا نام آپ نے لیا تھا۔

پنڈت جی:۔ شیو رتن۔

مرزا صاحب:۔ شیو رتن سے۔ لہٰذا مکان لئے لیتا ہوں۔ مگر ان کے اس عجیب اخلاق کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ ایک قسم کا تعلق خاطر ہو گیا۔ لکھنؤ جو کہ میرا اصل وطن ہے۔ وہاں کے عامیانہ اطوار و اوضاع سے مجھے نفرت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ باہر جا کے ایسے لوگوں سے دور رہوں گا۔ مگر یہاں بھی وہی سامنا ہوا۔

پنڈت جی:۔ جی ہاں کیا کیا جائے "باہمیں مردماں بباید ساخت" اس کے بعد پنڈت جی رخصت ہونے کو تھے کہ فدوی میاں پھر نازل ہو گئے اور آتے ہی کہا۔

فدوی میاں:۔ پھر مکان دیکھ لیجئے۔ مرزا صاحب نے پھر ذرا تامل کیا۔ مگر پنڈت جی بھی فدوی کے ہم زبان ہو گئے۔ لہٰذا مرزا صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے پنڈت جی کی ٹمٹم سرا میں موجود تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی داہنے بائیں اور عقب میں فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ تھا بیٹھ لئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں فدوی میاں اور حوالدار میں بڑے تپاک سے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جس قدر حوالدار پنڈت جی کی ہمراہی کی وجہ سے لحاظ کرتا تھا۔ اُسی قدر فدوی میاں بیباک تھے۔

اثنائے راہ میں بلا مبالغہ سو دو سو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہوگا۔

فدوی میاں سلام! فدوی میاں سلام! یہ صدائیں دس دس بارہ بارہ قدم کے فاصلے سے سنائی دیتی تھیں۔

سلاموں کی ترتیب یہ تھی کہ جو ملا اُس نے پہلے تھانہ دار صاحب کو سلام کیا۔ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے اور بہت مودبانہ جھک کے۔ یہ اول درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو کیا مگر وہ بھی بلا صورت و صدا۔ تیسرا سلام۔ ان لفظوں کے ساتھ حوالدار صاحب سلام۔ ماتھے پہ

ہانتھا ابھی تک رہتا تھا۔ چوتھا سلام آوازِ بلند کے ساتھ فدوی میاں سلام!

فدوی میاں کا جواب بھی خصوصیت کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھیّا سلام۔ بھتو سلام۔

اس درمیان میں کئی دیہاتی رنڈیوں نے بھی سلام کیا۔ فدوی میاں ہر ایک کا نام لے کے جواب دیتے تھے۔ بلیاجان سلام۔ رسولن سلام۔ ہر سلام کے بعد فدوی میاں مزاج پُرسی کو بھی واجب سمجھتے تھے۔ اور ہر شخص کے ساتھ طرزِ پرسش میں جدّت ہوتی تھی۔

گاڑی اُس مکان تک پہنچی جسے دیکھنا منظور تھا۔ واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ دو منزلہ باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکہ (بہ تشدید قاف) کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول۔ اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اُس میں ایک طرف کچی کھپریلیں تھیں۔ گاڑی گھوڑے اور رئیس۔ خدمت گار وغیرہ کے رہنے کے لئے، جابجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے۔ مگر بہت ہی بے ڈھنگے پن سے۔ کچھ بیلا چنبیلی کے جھنڈ۔ کچھ مہندی کی روشیں۔ بانس کا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ غرضکہ مکان مرزا صاحب کے پسند آیا۔ شیو رتن بھی اس موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ایک سیاہ فام سا آدمی۔ دھوتی بندھی ہوئی۔ اُودی چھینٹ کی مرزئی پہنے۔ اُسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی۔ پاؤں میں چمڑ ودھا جوتا۔ گلے میں ایک بٹوا پڑا ہوا۔ یہ آپکا درباری لباس تھا کیونکہ اس وقت آپ براہِ راست کچہری سے تشریف لائے تھے۔ تھانہ دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سُن کے دوڑے چلے آئے۔ شیو رتن سے کرائے کے بارے میں گفتگو ہوئی اس موقع پر فدوی میاں ذرا ٹل گئے۔

سات روپے ماہوار پر وہ مکان لے لیا گیا اور اُسی شب کو مرزا صاحب کا اسباب سفر داں آگیا۔

دو پلنگ۔ تین کرسیاں۔ فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں۔ اور طوعاً وکرہاً مرزا صاحب کو رکھنا پڑیں۔

دریاں اور قالین مرزا صاحب کے ہمراہ تھے۔ کھانا پکانے کے برتن بھی کافی موجود تھے۔ مکان کی صفائی اور مختصر سامان کی آراستگی میں فدوی میاں کی دخل در معقولات ہوتی رہی۔ ایسے لوگ جو ہر کسی کام میں خواہ مخواہ دخیل ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک خاص وصف ہوتا ہے جسے کسرِ نفس کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یعنی اس قسم کے لوگوں کو دوسروں کی اختلاف رائے سے چنداں ملال بھی نہیں۔ اگر چہ وہ اختلاف بڑے تیوروں سے کیا جائے مثلاً۔ اگر ان کی یہ رائے ہوئی کہ دری اس طرح بچھانا چاہیئے اور پلنگ یوں لگانا چاہیئے۔ اور میز کا رُخ یوں رہے اور دیوار گیریوں کا وہ موقع ہے اور دوسرے شخص کی آسائش کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر تجویز کو بلا دلیل یا یہ الفاظ کہہ کے "صاحب آپ نہیں جانتے" مسترد کر دیا۔ یا ہر ایک میں ترمیم کر دی۔ تو اُن کو نہ کچھ خفت ہو گی نہ ملال۔ ایسے ہی ہمارے سادہ دل رئیس موضع سمجھن پور۔ فدوی میاں صاحب تھے۔

جب گھر کی صفائی اور آراستگی سے فراغت ہوئی اور ہر چیز اپنے اپنے موقع سے لگا دی گئی۔ فدوی میاں نے یہ فرمایا۔

لیجئے اوورسیر صاحب آپ کا مکان سج سجا گیا۔ اب اور جس چیز کی ضرورت ہو۔ وہ بھی حاضر کر دی جائے۔ کیونکہ خدا کے فضل سے سب کچھ ممکن ہے۔ فقط آپ کے اشارے کی دیر ہے......

مرزا صاحب:۔ آپ کی عنایت کافی ہے۔ یہ سامان بھی میری ضرورتوں سے زیادہ ہے اور جو کچھ ضرورت ہو گی عرض کر دیا جائے گا یہ آخری جملہ مرزا صاحب نے اس خیال سے کہا تھا کہ تھانہ دار صاحب نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھوڑا فدوی میاں کی کوشش سے بہت جلد اور کفایت سے مل جائیگا مگر فدوی میاں کو سلسلۂ کلام کو طول دینے کا شوق تھا۔

فدوی میاں:۔ اسے تو فرما دیجئے تاکہ اُس کی ابھی سے فکر کی جائے۔ مرزا کے پاس اتفاق سے روپیہ نہ تھا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ ابھی کہنا کیا ضرور ہے پہلے روپے کی فکر ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب:۔ عرض کر دوں گا۔

فدوی میاں :۔ تو آپ فرماتے کیوں نہیں اور چارپائیوں کی ضرورت ہو تو بھجوا دی جائیں۔ چینی کے برتن۔ پتیلیاں۔ لوٹے۔ گھڑے۔ مٹکے غرضکہ جس طرح لڑکے کے یہاں بھجوانے ہیں۔ یہ ایک ایک چیز کا نام لئے جاتے تھے اور مرزا نہیں نہیں کہتے جاتے تھے۔ ان کی سخاوت اور سفاہت پر اگر کوئی اور ہوتا تو کھل کھلا کے ہنس دیتا۔ مگر مرزا بہت ہی مہذب اور متین آدمی تھے اس پہ بھی متبسم ہو گئے۔ مرزا صاحب کے تبسم سے فدوی میاں بقول

۶۔ فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ مزاج کے سادے بے تکلف فرمانے لگے۔

فدوی میاں :۔ اچھا تو پھر اس میں تکلف کیا ہے۔ کوئی پتریا بلا دی جائے کیونکہ اس میں حرج کیا ہے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں اور پھر لکھنؤ کے رہنے والے مرزا کے کان اس قسم کی گفتگو سے آشنا نہ تھے۔ یہ ایک خشک آدمی تھے۔

مرزا صاحب :۔ جناب آپ نے میرے اخلاق کا غلط اندازہ کیا۔ میں اس قسم کے مذاق کا آدمی نہیں۔ آپ کی خواہ مخواہ عنایتوں کا میں مجبوراً ممنون ہوں۔ آئندہ مجھ کو ایسے مذاق سے معاف رکھئے گا۔

فدوی میاں :۔ (بظاہر جھینپ کے اور خجلت زدہ صورت بنا کے دو تین طمانچے زور زور سے اپنے گالوں پہ لگا کے اور دونوں کان مروڑ کے) توبہ! توبہ! خطا ہوئی۔ معاف کیجئے گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ مولوی آدمی ہیں۔

مرزا صاحب :۔ نہیں آپ کا کچھ قصور نہیں۔ یہ اس زمانے کی تہذیب کا قصور ہے۔ شاید آپ کو اسی طرح کے لوگوں سے زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا ہو گا جو بیہودہ دل لگی مذاق یا چوسر۔ گنجفہ وغیرہ میں اپنے اوقات کو ضائع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میں مولوی نہیں۔ مگر طالب علم ضرور ہوں۔

مرزا اپنی نیک نفسی سے فدوی میاں کی اس بات کو دل لگی سمجھے تھے۔ حالانکہ فدوی میاں کا مافی الضمیر حقیقت کا مشعر تھا۔ نہ مجاز کا۔ کیونکہ آپکی ذات والاصفات سے یہ فیض اکثر ملازم پیشہ لوگوں کو پہنچتا رہتا تھا۔ تاہم اپنی نیک نیتی سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی منفعت ذاتی از قسم نذر فدوی کو نہ تھی بلکہ ان کا مذاق طبیعت اسی قسم کا واقع ہوا تھا۔ ضلع کی کون سی پتریا ایسی تھی جو آپ کی ممنون منت اور مطیع فرمان نہ ہو۔ ایک تو اس لئے کہ زمانۂ ثروت میں آپ نے بالتخصیص اس فرقے کے ساتھ بہت سلوک کیا تھا۔ اکثر باغات اور اراضی آپ کی عطیہ رنڈیوں کے قبضے میں موجود تھیں۔ چار ہی دن کا ذکر ہے چھوٹے صاحبزادے چھٹن میاں کی تقریب ختنہ میں دس بیگہ زمین بی دفاتن کو۔ بیس درخت آم کے مع اراضی بی رسولن کو دے ئے تھے۔ اسی تقریب میں موضع سہجن پور رہن ہوا تھا۔ یہ سب اوصاف فدوی میاں کے مرزا صاحب کو معلوم ہوتے رہے اور اُسی قدر تنفران کے اخلاق سے بڑھتا گیا۔

اگرچہ گھوڑے کی خرید میں فدوی میاں کی رائے شریک رہی۔ اور اسی طرح اور معاملات میں خواہی نہ خواہی ان کا دخل رہا۔ لیکن مرزا ہر امر میں حتی الامکان ان سے دُور بھاگتے تھے۔ لیکن فدوی میاں کی وضع داری سے بعید تھا کہ آپ مرزا صاحب کے پاس جانا ترک کرتے۔ بلکہ ان کو ایک طرح کی محبت مرزا سے ہو گئی تھی اور کچھ ایسا اخلاقی دباؤ پڑ گیا تھا کہ ان سے کسی قدر ڈرتے تھے۔

فدوی میاں کو کئی مرتبہ مرزا کے سامنے اپنے منہ پر طمانچے مارنے اور کان مروڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے کہ یہ موقع بے موقع پہ بول اُٹھتے تھے۔ اور جو امر مرزا کی شان کے خلاف ہوتا تھا۔ اُس پر ان کو ڈانٹتے رہتے تھے۔ مثلاً

فدوی میاں کو یہ مسئلہ مرزا کی ذات سے تحقیق ہوا کہ وہ چیز جو عموماً بالائی آمدنی کہلاتی ہے اُس کا لینا بالکل حرام ہے۔

فدوی میاں صوم صلوٰۃ کی پابندی اور ناجائز کھانے پینے کی چیزوں سے اجتناب کرنے کو مولویت اور زہد و ورع خیال کرتے تھے۔ ناجائز طریقوں کے اکتساب منفعت کرنے کو یہ گناہ ہی نہ جانتے تھے بلکہ حرام سمجھتے تھے۔

مرزا عابد حسین سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی بیاہ میں ناچ رنگ یا عید۔ بقر عید مجرا دیکھنا یا بغیر مجرا دیکھے پتریوں کو انعام دینا گناہ ہے فدوی میاں کو مرزا عابد حسین کی صحبت سے اکثر ایسے امور معلوم ہوئے جن کو یہ نیکی سمجھتے تھے مگر درحقیقت وہ بدی تھے۔ رفتہ رفتہ فدوی میاں کو مرزا صاحب سے وہ اعتقاد

ہوگیا جو مقلد کو اپنے مجتہد سے یا مُرید کو اپنے پیر سے ہونا چاہئیے۔ مگر فدوی میاں کی عادتیں اس حد تک خراب ہو چکی تھیں کہ اُن کی اصلاح محال تھی۔ اہل عملہ کی خوشامد بے جا سعی و سفارش۔ جھوٹ بولنا۔ جھوٹی قسمیں کھانا۔ فحش اور بے تکا مذاق۔ راتوں کو رنڈیوں کا دربار۔ جھوٹے مقدموں کی اطاعت۔ بدمعاشوں کی حمایت۔ اور اسی قسم کے لاکھوں معائب ان میں موجود تھے۔ مگر ان سب معائب کے ساتھ ایک وصف بھی تھا وہ یہ کہ خاندانی شرافت نفس کی وجہ سے طمع ان میں نہ تھی۔ اگرچہ اس وصف کے ساتھ ایک عیب بھی تھا یعنی اسراف جس کو لوگ جہالت سے اولوالعزمی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب ان کے اس وصف کو پہچان گئے تھے۔ مرزا کا خیال تھا کہ ان کی یہ عادتیں کسی حد تک ترک ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ کسی خاص اخلاقی قوت سے ان کے نفس پر اثر ڈالا جائے۔

مرزا نے تجویز کیا کہ مذہبی جوش اگر آپ کی طبیعت میں پیدا کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کی اولوالعزمی ان کو اُس طرف متوجہ کر دے۔

فدوی میاں کے دو لڑکے تھے۔ ایک نثار علی جس کا سن چودہ برس کا تھا۔ دوسرا احمد حسن جس کا سن سات آٹھ برس کا تھا۔

نثار علی آوارگی کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر ایک خاص صفت جو قصبات اور دیہات کے لڑکوں میں پائی جاتی ہے۔ یعنی شرم۔ اگرچہ وہ حدِّ اعتدال سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن وہی ان کی درستی کا باعث ہوئی

فدوی میاں اپنے لڑکوں کی تعلیم سے غافل نہ تھے۔ ایک مولوی صاحب برسوں سے ورواز سے پر نوکر تھے۔ مگر لڑکا گلستان کا باب اوّل پڑھتا تھا۔ کئی سال ہو چکے تھے مگر اُس کے ختم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اور چھوٹا بغدادی قاعدہ سامنے لئے بیٹھا رہتا تھا۔ مرزا صاحب نے رفتہ رفتہ فدوی میاں کے معاملات خانگی میں دخل دینا شروع کیا۔ اور جس قدر مرزا صاحب اُن کے معاملات میں دخیل ہوتے جاتے تھے۔ فدوی میاں اپنی ذمہ داریاں مرزا کے سپرد کرتے جاتے تھے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ فدوی میاں کا ہر کام مرزا نے اپنے ذمہ لے لیا۔ فدوی میاں کی وہ اس طرح محافظت اور نگرانی کرتے تھے جو نابالغ یا مجنون کے ولی کو کرنا چاہئیے۔ اور فدوی میاں روز اوّل سے کچھ ایسا دباؤ مرزا صاحب کا مان گئے تھے کہ بغیر ان کی صوابدید کے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جس قدر مرزا صاحب فدوی میاں پر توجہ کرتے جاتے تھے۔ شیو رتن کو مرزا صاحب سے خوف پیدا ہوتا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کو فدوی میاں اور شیو رتن کے معاملات میں کچھ گنجلک اور غبن معلوم ہوئی اور درحقیقت ایسا ہی تھا۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ راز مجھ پر شیو رتن کی چشم ابرو سے ظاہر ہو گیا تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے شیو رتن کی نگاہیں فدوی میاں کے سامنے جھینپی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اُس نے کسی قسم کی چالاکی ان کے معاملات میں ضرور کی ہے۔ اور وہ فدوی میاں سے کسی قدر دبتا بھی تھا۔ اس سے اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ ابھی تک اُس کی چالاکی کا تدارک فدوی میاں کے اختیار میں ہے۔

فدوی میاں کا اہل عملہ کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا اس سے بھی مجھے ایک قسم کا شبہ سا پیدا ہوتا تھا کہ شاید فدوی میاں اُن معاملات کے تدارک کی فکر میں ہیں۔ مگر ان کی بے پروائی نے اس شبہ کو رفع کر دیا تھا۔

مرزا صاحب فدوی میاں کو خفیف العقل سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنے خیالات کو اُن سے ظاہر کرنے میں انہیں تامّل تھا۔ اس لئے کہ شاید وہ اس راز کو ظاہر کر دیں کہ مرزا کو ان کے معاملات کی درستی کی غیر معمولی فکر ہے۔ ان اُمور پر نظر کر کے مرزا نے خفیہ تحقیقات کرنا شروع کی۔ شیو رتن ایک بڈھا آدمی تھا۔ وہ فدوی میاں کے والد کے زمانے میں ان کے کسی موضع کا ضلعدار تھا۔ جس زمانے میں فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد صاحب نے انتقال کیا۔ فدوی میاں جن کا اصلی نام شیخ فدا علی تھا، بہت ہی کم سن تھے۔ تولیت جائداد کی ان کے ماموں شیخ احمد کے سپرد ہوئی تھی۔ شیخ احمد ایک مشہور جعلیہ تھا۔ شیخ احمد کی تولیت کے زمانے میں بھی شیو رتن کارکن رہا۔ بعد تحقیقات کے معلوم ہوا کہ شیخ احمد اور شیو رتن کی سازش سے اس معاملے میں کوئی جعل ہوا ہے۔ مگر یہ پتہ نہ لگتا تھا کہ کیونکر اور کیا جعل ہوا ہے۔ مرزا کا خود بیان ہے کہ اس مقدمے کی تحقیقات کا مجھے ایسا شوق ہو گیا تھا کہ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں کو علمی مشاہدات کے طور پر جانچتا اور پرتالتا تھا۔ شیو رتن کے تمام حرکات و سکنات پر شب و روز میری نظر رہتی تھی۔ اگرچہ اُس سے مہینہ میں شاید ہی دو ایک مرتبہ میرے اُس کے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی چند منٹ کے لئے مگر میرا خیال ہر وقت اُس کے ساتھ

رہتا تھا۔ فدوی میاں اگرچہ بہت ہی سفیہ اور خفیف الحرکات آدمی تھے۔ مگر اپنی آبائی جائداد کو اپنے والد کے ایک ادنیٰ ملازم کے قبضے میں دیکھ کر ایک قسم کی حسرت جو اُس کے بشرے سے بہ ظاہر ہوتی تھی اُس پہ مجھے کمال تاسف ہوتا تھا اور جب سے میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس مقدمے میں شیورتن نے یقیناً جعل کیا ہے اُس وقت سے میرا بس نہ تھا کہ اُس کو علاقے سے بیدخل کر کے فدوی میاں کو اُس کی جگہ قابض کرا دوں۔ مگر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ ظاہرا یہ امر محال معلوم ہوتا تھا اور سب سے زیادہ اہم ان خیالات کی رازداری تھی۔ اس لئے کہ افشائے راز میں ناکامیابی کا اندیشہ ایک طرف۔ شماتت کا خیال دوسری طرف دامنگیر حال تھا۔ آخر بڑی مشکل سے بعض واقعات کا پتہ لگا۔ پھر تو پیچ در پیچ مشکلیں آسان ہونے لگیں۔ اور برسوں کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھ گئیں۔

معلوم ہوا کہ شیخ قربان علی فدوی میاں کے والد نے لکھنؤ میں وفات پائی تھی۔ سبب وفات مرض وبائی مشہور تھا۔ شیخ فدا علی کی والدہ اپنے شوہر کے سامنے مر چکی تھیں۔ شیخ احمد ان کا سوتیلا بھائی تھا۔

شیخ قربان علی کے لکھنؤ جانے کا سبب ایک مقدمۂ اپیل تھا۔ مقدمہ کی روئداد یہ تھی کہ کسی راجپوت مسمّی ماندھاتا نے بندوبست کے زمانے میں شیخ قربان علی کے علاقے پہ دعویٰ کیا تھا۔ سرسری مقدمہ حاکم بندوبست نے خارج کر دیا۔ اُس نے نمبری نالش کی۔ وہ بھی خارج ہوئی۔ پھر اُس نے اپیل کی۔ اپیل بھی خارج ہوئی۔ پھر اُس نے اپیل ثانی کی۔ یہاں وہ تمام لوگوں کے خلاف امید جیت گیا۔ جس دن عدالت العالیہ سے مقدمہ اُس کے حق میں فیصلہ ہوا۔ وہی دن شیخ قربان علی کی وفات کا تھا۔ بلکہ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ شیخ خودکشی کر کے مر گئے۔ اپیل سے جیتنے کے بعد چاہیئے تھا کہ قابض جائداد ماندھاتا یا اُس کے وارث ہوتے مگر بخلاف اس کے قابض جائداد شیخ احمد اور شیورتن ہوئے۔ شیخ احمد لاوارث مر گیا۔ اُس کے بعد شیورتن بلا مزاحمت احدے اور بے مشارکت غیرے تمام علاقے پہ قابض اور متصرف رہا۔ فدوی میاں کے ساتھ اُس کا سلوک اس طرح کا ہے جیسے کسی نمک حلال قدیم نوکر کو جو کسی وقت میں ملازم تھا اپنے آقا زادہ کے ساتھ ہونا چاہیئے جو اب مفلس ہو۔ مگر اس سلوک میں ظاہرداری کسی طرح کھل جاتی تھی۔ جائداد پدری سے ایک بسوہ زمین شیخ فدا علی کو نہیں ملی موضع سہجن پور جس کا نمبر اب تک اُس کے پاس ہے اور جو شیورتن کے پاس کئی سال پیشتر رہن ہو چکا ہے وہ موضع ان کی والدہ کا تھا۔ کل جائداد کا مالک بالفعل شیورتن تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مکانات بھی اُس کے نام رہن ہیں۔ مگر وہ بطور مایحتاج شیخ فدا علی کو گذارہ دیتا ہے۔ اور موضع سہجن پور کے آسامیوں سے جو کچھ چھین جھپٹ کے وصول ہو جاتا ہے وہ گویا بالائی آمدنی ہمارے عنایت فرما شیخ فدا علی صاحب کی ہے۔ مرزا کو یہ واقعات جو اوپر بیان کئے۔ کئی برس کی تحقیق کے بعد معلوم ہوئے۔ یہ تو ان پہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں کسی قسم کی چالاکی ہوئی ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ قابل تدارک ہے یا نہیں۔ اسکا فیصلہ تفصیلی حالات کے معلوم ہونے کے بعد ہو سکتا ہے۔ منہ سے کوئی بات نکالنا .... ایک تو اس مقدمے کے لئے متفکر تھا۔ جس کا سبب اوپر بیان ہوا اور مرزا کا استقلال بھی اسی کا مقتضی تھا کہ جب تک کوئی صورت یقینی کامیابی کی نہ پیدا ہو ایسی باتوں کا منہ سے نکالنا سفاہت پہ محمول کیا جائے گا۔ اُن کا یہ منصوبہ تھا۔ کیا خوب ہو۔ اگر میں اس معاملے کا پورا پتہ لگا کے اور تدارک کی کافی تدبیر کر کے اس کو زبان سے نکالوں۔ پانچ برس تک اس معاملے سے مرزا کو تعلق خاطر رہا۔ فدوی میاں تو روز ہی مرزا کے پاس موجود رہتے تھے اور شیورتن بھی کبھی کبھی آ نکلتا تھا۔ مگر دونوں کو ان کے کسی اشارے کنائے سے یہ نہ ثابت ہوا کہ وہ ان کے حق میں کیا کرنے والے ہیں۔ اس اثنا میں کئی بار ان کو لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا جوڈیشل کے محافظ خانے میں دن دن بھر گذر گیا۔ کل مقدمہ کی روداد سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی۔

جب تحقیقات کماحقہ کر چکے تو اس راز کو ایک خاص مطلب کے لئے راقم الحروف (مرزا رسوا) پہ ظاہر کیا۔ اور بعض اُمور مجھ کو تعلیم کئے جس کا حال ناظرین کو آئندہ بیان سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لئے مجھ کو مرزا کے پاس ضلع .... جانا پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ مرزا دیوان خانہ (بیٹھکہ) میں تشریف رکھتے ہیں۔ فدوی میاں اور مجھ سے مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں کہ مرزا نے اپنے اردلی کے چپراسی کو بلا کے کہا۔ شیورتن کو بلا لاؤ۔ شاید اس سے پہلے مرزا نے کسی موقع پہ شیورتن کو یاد نہ کیا ہوگا۔ میں تو اس معاملے سے واقف تھا۔ مگر فدوی میاں کو البتہ تعجب ہوا ہوگا۔ کہ آج شیورتن خلاف معمول کیوں بلایا جاتا ہے۔

شبو رتن حسب الطلب سامنے آکے کھڑا ہوا۔ مرزا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ مرزا نے اُس سے چند معمولی غیر ضروری باتیں کر کے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔

مرزا :۔ ہاں تو ولایت علی خاں مر گیا۔

میں نہیں بیان کر سکتا کہ اِس نام کے سُننے کے بعد شبو رتن کے دل پر کیا گذری اور اُس کے چشم و ابرو سے کس قسم کے آثار پائے گئے۔

میں :۔ جی ہاں مر گیا۔ اُس کو مرے ہوئے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔

مرزا :۔ آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھا؟

رسوا :۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کٹاری ٹولہ کے متصل وہ گلی جو کالکن کی طرف جاتی ہے۔ نیم کے درخت کے سامنے۔

مرزا :۔ آپ خوب جانتے ہوں۔ مگر آپ نے سُنا ہو گا کس بُری گت سے مرا ہے۔

رسوا :۔ جی ہاں بندگان خدا کی حق تلفی کا یہی انجام ہوتا ہے۔

مرزا :۔ سنتے ہیں لاوارث تھا۔ مرنے کے بعد کل اسباب پولیس میں اُٹھ گیا ہو گا اور یقین ہے کہ پولیس ہی نے اُسے دفن کیا ہو۔

رسوا :۔ جی ہاں یہی ہوا۔ اور ہونا ہی کیا تھا۔

مرزا :۔ اور وہ تکیہ جو اُس کے سرہانے رہتا تھا۔

رسوا :۔ اُس کا حال پھر عرض کروں گا۔

اس گفتگو کے بعد ہم اور مرزا اِدھر اُدھر کا ذکر کرنے لگے۔ شبو رتن کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا نے گاڑی کسوانے کا حکم دیا۔ مرزا صاحب اور میں دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے ——————— مرزا صاحب نے فدوی میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گاڑی پر سوار ہوئے راستہ میں سوائے اس جملہ کے جو مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا،

"کیوں دیکھا آپ نے ہم نہ کہتے تھے" جس کا میں نے یہ جواب عرض کیا تھا۔ جی ہاں آپ کا خیال بہت صحیح تھا، اور کوئی گفتگو اس مقدمہ کی نہیں ہوئی۔ دُوسرے دن معلوم ہوا کہ شبو رتن رات ہی کو لکھنئو گیا۔

اِس واقعے سے ہمارے خیالات اور پختہ ہو گئے۔ کئی دن کے بعد لکھنئو سے واپس آیا۔

مرزا کا مؤکل شکرم میں شبو رتن کے ساتھ ساتھ تھا۔ شکرم لکھنئو پہنچی۔ مؤکل ساتھ تھا شبو رتن امین آباد کی سرا میں اُترا۔ وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ گول دروازے کے قریب بان والی گلی کی طرف سے ولایت علی خاں کے مکان پر پہنچا۔ جس دُکان میں ولایت علی خاں رہتا تھا۔ وہاں اب شوالہ بن گیا ہے۔ شبو رتن وہاں کے دکانداروں سے کچھ پتہ دریافت کر کے اُس چھتہ کی طرف چلا۔ جہاں تیرہ و تاریک گلیاں بہت دُور تک چلی گئی ہیں۔ اُس کے بعد ایک نالہ ملتا ہے پھر ایک ٹیکرا سا ملا۔ اُس پر گیا۔ وہاں ایک شخص کو آواز دی وہ گھر سے نکلا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ولایت علی خاں کو مرے ہوئے دوسرا مہینہ تھا۔ بہ ٹھیک پولیس کی معرفت دفن ہوا تھا مگر تکیہ کا پتہ نہ ملا۔ اس کے بعد مؤکل اور شبو رتن دونوں امین آباد کی سرا میں آئے۔ اُس نے حلوائی کی دُکان سے پوریاں لے کے کھائیں۔ مؤکل نے بھی اُسی حلوائی سے پوریاں لیں۔ اُس کے بعد شبو رتن نظر آباد کی طرف چلا۔ اس کے بعد اُس نے دو دن تک کچہریوں کی خاک چھانی۔ آخر مایوس ہو کر . . . . ضلع کو واپس چلا۔ مؤکل اُس سے ایک دن پہلے ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔

وہ تکیہ جس میں شبو رتن کی جان تھی ہمارے قبضے میں کئی مہینے پیشتر آ چکا تھا۔ اُس میں چند کاغذات تھے اور وہ کاغذات سب فدوی میاں کے علاقے کے متعلق تھے۔

اب ہم اس جعلسازی کو کھولے دیتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہُوا کہ ماندھاتا عدالت العالیہ سے مقدمہ ہار گیا تھا۔ جیسی کہ توقع تھی۔ مگر اسی کے دُوسرے یا تیسرے دن شیخ قربان علی نے بعارضۂ فصلی بخار انتقال کیا جیسا کہ ظاہراً ثابت ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شیبو رتن اور شیخ احمد جو شیخ مرحوم کے ہمراہ تھے، ان دونوں نے سازش کر کے شیخ کو کچھ کھلا پلا دیا ہو۔ مگر اس قدر عرصے کی بات تھی۔ اس کا ثبوت دشوار بلکہ محال ہے۔ علاقے کے باب میں یہ چالاکی کی گئی کہ اصلی فیصلہ محافظ خانہ سے اڑوا کے اور بجائے اُس کے ایک فیصلہ بحق ماندھاتا ولایت علی خاں کی معرفت بنوا لیا گیا۔ پھر ماندھاتا اور شیخ احمد اور شیبو رتن میں کچھ ایسا سمجھوتا ہو گیا کہ ماندھاتا کچھ رقم معتدبہ لے کے علیحدہ ہو گیا۔ اور اُس سے ایک رہن نامہ بنام شیبو رتن ہو گیا۔ شیخ احمد کے نام رہن نامہ ہوتا مگر اُس کی حیثیت اس لائق نہ تھی۔ اور شیبو رتن شیخ قربان احمد کے زمانہ ہی میں لین دین کرتا تھا اور بڑا روپیہ والا مشہور تھا۔ اصل فیصلہ عدالت جو ولایت علی خاں کو بطور نمونہ کے دیا گیا تھا وہ اس نے دبا رکھا۔ اور اُس کے ذریعے سے وہ شیبو رتن کو وقتاً فوقتاً دبا کر کچھ لے لیا کرتا تھا۔

آخر میں ولایت علی خاں نابینا ہو گیا تھا۔ جب وہ خرچ سے تنگ ہوتا تو ایک خط دباؤ ڈالنے کے لئے شیبو رتن کو لکھ بھیجتا۔ وہ کچھ نہ کچھ بھیجد یا کرتا تھا۔ مگر قلیل مقدار۔ اس لئے کہ شیبو رتن خوب جانتا تھا کہ ولایت علی وہ کاغذات پولیس یا عدالت میں داخل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ خود مجرم ہے مگر پھر بھی احتیاطاً کچھ دے نکلتا تھا۔ جب مرزا اس مقدمے کی تحقیقات میں مصروف ہُوئے۔ ایک دن شیبو رتن کے نام کا ایک پوسٹ کارڈ مرزا کی ڈاک کے ساتھ چلا آیا۔ اس پوسٹ کارڈ میں اگرچہ کوئی امر تفصیلی طور سے نہ لکھا تھا مگر ولایت علی خاں کو مرزا اچھی طرح جانتے تھے ولایت علی خاں کا نام پوسٹ کارڈ پر دیکھتے ہی گویا تمام مقدمہ کا پتہ چل گیا۔

پوسٹ کارڈ کا مضمون یہ تھا کہ شیبو رتن کو معلوم ہو کہ ہمارا آخری وقت ہے۔ کچھ ہماری مدد کرنا چاہئے۔ کاغذات ہم سے لے لو۔ اور جو کچھ تم سے ہو سکے ہم کو دے دینا۔ ورنہ مرتا کیا نہ کرتا۔

اس پوسٹ کارڈ کو مرزا نے دبا رکھا۔ اور ایک متوکل شیبو رتن کی طرف سے ولایت علی خاں کے پاس گیا۔ اور پچاس روپے دے کے وہ کاغذات اُس سے حاصل کر لئے۔ اس کے چند ہی روز بعد ولایت علی واصل جہنم ہوا۔ واقعی بہت بُری طرح سے مرا چاہئے بے ایمانوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہئے ان واقعات کے مفصل ذکر کے بعد اب اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شیبو رتن کس قدر سہولت کے ساتھ تمام جائداد سے دست بردار ہونے پر راضی ہو گیا ہو گا۔ باہمی فیصلہ کر لینا مناسب وقت تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ جعل کا ثبوت قطعی ہاتھ آ گیا تھا اور شیبو رتن واقعی مجرم تھا۔ اسلئے وہ بہت ہی خائف تھا۔ مگر بہت عرصے کی بات ہے۔ اس لئے مرزا کی احتیاط اسی کی مقتضی ہوئی کہ یہ مقدمہ عدالت تک نہ جائے اور شیبو رتن بھی یہی چاہتا تھا۔ ——— لہٰذا شیبو رتن نے کل جائداد کا بیعنامہ فدوی میاں کے نام کر کے صرف ایک موضع اپنے نام چھوڑ والیا اور اس فیصلے کے چند ہی روز کے بعد تیرتھ کو چلا گیا جہاں سے اس وقت تک واپس نہیں آیا۔

اب فدوی میاں کا حال نہ پوچھئے، پورے رئیس بن گئے۔ مگر مرزا کو ابھی تک اُسی طرح مانے جاتے ہیں۔ اور کوئی کام بغیر ان کی صلاح مشورے کے نہیں کرتے۔

راشد الخیری

بھنور کی دلہن

بادشاہی باغ جس نے صاحبقران ثانی جیسے جلیل القدر شہنشاہ سے لیکر بیچارے بہادر شاہ تک کے جلوس اپنی آنکھ سے دیکھے تھے خواتین مغلیہ کے قدم اپنے سر آنکھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل شاہدرہ اسٹیشن کے قریب واقع ہے متواتر پانچ ساڑھے پانچ صدی تک بادشاہی باغ نے جو عیش کئے ہیں اس کی نظیر پردۂ دنیا پر مشکل سے ملے گی برسات کے موسم میں باغ کا اندھیری حصہ ایک طلسم کدہ تھا آم اور جامن کے گنجان درخت زمین میں اس طرح جھول رہے تھے کہ مالی اور باغبان تو درکنار بہتر سے بہتر صناع دنگ رہتے تھے ڈھائی تین فرسنگ درختوں کی یہ دورویہ قطار اس طور پر چھائی ہوئی تھی کہ چھاجوں پانی پڑ جائے مگر ایک قطرہ زمین تک نہ پہنچے۔ اندھیری حصہ کی مشرقی سمت پر جمنا لہریں لیتی تھی ساون بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن مغل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب اودی اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر چھا جاتی تھیں بجلی کوندتی تھی بادل گرجتا تھا تو یہ سیر کے رسیا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے۔ گنگا جمنی ڈوریوں میں روپہلی سنہری پٹریاں پڑ جاتی تھیں۔ قلعۂ معلّی کی پریاں لال سبز جوڑے پہن پینگیں چڑھاتی تھیں اور جھولنے والیوں کی بھنبیری آوازیں زمین سے اٹھ کر کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدا سے ٹکراتی تھیں۔

آج باغ کی کل کائنات چند درخت ایک ٹوٹی ہوئی محلسرا اور شکستہ دیواریں ہیں۔ بیگم پور کنواں تو زندہ ہے مگر کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جہاں آدمیوں کی کثرت سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی وہاں اب دن دہاڑے گیدڑ پھرتے ہیں۔ وسط باغ میں فیروز خاں تاتاری بلوچ کی جھونپڑی ہے جو ان درختوں کی رکھوالی کرتا ہے اور اپنی جوان لڑکی فیروزہ کو لئے ہوئے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

۲

شمع آفتاب جھلملا جھلملا کر دم توڑ رہی تھی رونہ روشن کا جنازہ دفن کے قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں لٹکائے کھڑے تھے اپنے دورِ شباب کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پتوں کی موسیقی اور پرندوں کا نغمہ شام کا گجر بجا رہا تھا کہ فیروزہ اپنے میلے دوپٹے کے بائیں آنچل کو کندھے پر ڈالتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی اس کی کٹیا مصنوعی دنیا کے جھوٹے تکلفات اور ان سامانوں سے جو امیر زندگی کا جزو

ہو گئے ہیں، پاک تھی مگر اطمینان کی ایک خاموش مسرت گھاس پھونس کے اس ڈھیر پر برس رہی تھی۔ شباب کا یہ مجسّمہ جس پر حُسن قربان ہو رہا تھا۔ زندگی کے تمام آلام و افکار سے صاف تھا وہ جوانی کے جذبات سے قطعی نا آشنا تھی۔ مگر ایک نامعلوم طاقت اس کے دل میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا؟

۳

حسین علی زمیندار کا لڑکا احسن صبح سے جمنا کے کنارے شکار کھیل رہا تھا۔ قازوں اور مرغابیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے وہ کہہ چکا کہ دوست احباب آٹھ دس آدمی اور پانچ چھ بندوقیں ہمراہ تھیں احسن اپنی کامیابی پر خوش اور مصاحب نشانہ کی داد دینے میں سرگرم تھے وہ دولت کے نشہ میں جھوم رہا تھا۔ اور کتاب عمر کا ہر ورق بتا رہا تھا کہ ناکامی کا وجود اس دنیا میں صرف مفلسوں کے واسطے ہے دوپہر کا دستر خوان انواع و اقسام کی نعمتوں سے لبریز تھا کچھ بہشتی کچھ بھنگنیں کچھ کہار کچھ چمار ہجر رہجوہ کہہ کہ پیٹ بھر رہے تھے۔ اُن کلیوں کی طرح جن کے شگفتہ ہوتے ہی شہد کی مکھیاں اور بھنورے ہر وقت بھنبھناتے رہتے ہوں، جنہوں نے کبھی بھُول کر بھی گلچیں کی صورت نہ دیکھی ہو احسن کے دولتمند کان خوشامد سے بھرے ہوئے تھے جوانی کی رعونت رگ رگ میں موجود تھی، اس پر دولت کی افراط دن عید تھا رات شب برات۔ زمیندار گاؤں کا خدا ہوتا ہے آسامیاں رعیت نہیں بندے ہوتے ہیں ان کی دولت ان کا گھر ان کی عزت ان کا مال و متاع ملکیت ہوتا ہے زمیندار کی۔

احسن نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور ان ہی خیالات میں پرورش پائی۔ سچ پوچھو تو باپ کی زندگی ہی میں گاؤں کا بادشاہ بن چکا تھا! اکلوتا بچہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اُس کا حکم ٹالے۔ ابھی پندرہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ اُس نے محض اپنے حکم سے ایک دھوبی کا مکان اپنے داروغہ کو دلوا دیا۔

۴

شام ہونے لگی تو احسن نے منہ ہاتھ دھویا۔ شکاری لباس تبدیل کیا۔ چارپی اور ایک مصاحب سے کہا "میر صاحب، جلینٹ صاحب شکار کو گئے اور خاک نہ ملا۔ منجھلے میاں تین دن حیران رہے اور چڑیا کا بچہ نہ لائے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ خالی ہاتھ کس طرح آتے ہیں۔ ہم کو تو ہمیشہ اتنا ملتا ہے کہ ڈھویا نہ جائے۔ یہ دیکھیئے۔ پرے کے پرے لگے ہوئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا فیر آج تک خالی ہی نہیں گیا"۔

میر صاحب :۔ سرکار آپ کی بات آپ کے ساتھ ہے حضور کا تو ارادہ ہی شکار کے واسطے ملک الموت ہے ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دو شخص ہیں ایک نواب حیدر آباد اور ایک حضور جن کا نشانہ خطا ہی نہیں ہو سکتا۔

احسن :۔ مجھے تو انگریزوں پر تعجب ہے کہ وہ بھی میرے نشانہ کی تعریف کرتے ہیں۔

میر صاحب :۔ جی ہاں کلکٹر صاحب کے خانساماں نے مجھ سے خود کہا کہ صاحب تعریف کرتے تھے۔

احسن :۔ یہ لوگ اصل میں ہیترے کے قدردان ہیں پچھلے موقعہ پر صاحب کے ساتھ میں نے بھی کئی فیر کئے یہ اتفاق تھا کہ سب خالی گئے مگر صاحب نے ہیترا بہت پسند کیا۔

میر صاحب :۔ حضور یہ تو حکومت ہی ہیترے کی کرتے ہیں۔ یہ جو دن رات قواعد اور پریڈ ہوتی ہے یہ ہے کیا؟ بس ہیترا۔

احسن :۔ میر صاحب! ہاں وہ دھوبی کا کیا ہوا۔

میر صاحب :۔ بھلا حضور کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے۔ رعیت کی کیا مجال ہے کہ اُف کر سکے۔

احسن :- یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مکان دھوبی ہی کا تھا۔ مگر اُس کے اکڑنے پر مجھے غصہ آ گیا۔

میر صاحب :- حضور نے اس کو بہت اچھی سزا دی اب ایک درخت کے نیچے بال بچوں کو لے کر پڑا ہے بس عمر بھر کو ٹھیک ہو گیا۔

احسن :- ان کمینوں کو اسی طرح درست کرنا چاہئے۔

میر صاحب :- آؤ ذرا بادشاہی باغ کی سیر کریں۔

۵

آسمان کی بساط اور زمین کا دامن دونوں آفتاب و ماہتاب کے ظاہری اثرات سے پاک تھے درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہلکی ہوا سرسبز پتیوں کو گدگدا رہی تھی۔ جامن کی خاموش پھلنگ پر بیٹھا ہوا ایک طائر شاہی باغ کے انقلاب کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ رات چودھویں تھی اور کائنات کی آنکھیں قمر چہاردہم کے واسطے آسمان پر لگی ہوئی تھیں کہ شاہی باغ کی کٹیا سے زمینی چاند برآمد ہوا۔ حسن کی مجسم تصویر فیروزہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی چاروں طرف دیکھا۔ بادشاہ پسند کنوئیں پر آ کر پانی بھرا اور پانی کے دو گھڑے لے کر کیاری میں آئی۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے تھے اور ہوا نے باغ کو معطر کر رکھا تھا چمبیلی کے درختوں میں پانی دیا جوئی اور موتیا کو ٹھیک کیا۔ گلاب کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ ایک شاخ کے دو پھول ہوا میں جھوم جھوم کر گلے مل رہے ہیں۔ فیروزہ ابھی اس جذبہ سے جو اس سلسلے میں کام کر رہا تھا قطعاً نا آشنا تھی مگر فطرت نے پھولوں کی اس حرکت پر اس کے قلب میں ایک آگ لگا دی وہ جھک گئی ہوا کا جھونکا زور سے آیا پھولوں نے ایک دوسرے کے منہ چومے اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کو آنکھ سے لگانے میں باغ کا ایک تیسرا پھول فیروزہ شریک ہو گئی وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی مگر بے خبر تھی کہ کیوں اور ناواقف تھی کہ کیا؟

فیروزہ کی خاموش انگلیاں پھولوں سے کھیل رہی تھیں وہ کبھی پھولوں کو ہونٹوں سے لگاتی کبھی سر پر رکھتی اور پھر چھوڑ دیتی۔ پھول ہوا کے دریا میں تیرتے اور وہ اُن سے لپٹ جاتی اُس کا حسن تصنع سے پاک تھا۔ اس کی آنکھیں سرمہ اور کاجل سے صاف تھیں اس کا چہرہ پاؤڈر سے اس کا لباس لونڈر سے اُس کے ہاتھ چوڑیوں سے اس کا سینہ زیور سے ہزاروں کوس دور تھا۔ لیکن وہ اس پر بھی ایک مجموعہ تھی ان خوبیوں کا جن پر قدرت خود فخر کر رہی تھی سیاہ اور گھونگھر دار بال حسین چہرہ کی کروٹوں میں آ پڑے تھے اور اس کو مطلق خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اور کیا کر رہی ہے۔ پھولوں کی نازک پنکھڑیاں اپنی کامیابی پر نہال تھیں۔ آم کا درخت سر پر چھایا ہوا تھا کہ بلبل کے نالۂ رقابت نے اس کو چونکا دیا۔ پریشان بال درست کئے سامنے دیکھتی ہے تو ایک نوجوان گم صم ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ تاتاری خون رنگ لایا غیر نظریں دیکھتے ہی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں مگر خون کا یہ دورہ طیش و غضب میں بجھا ہوا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک متضاد جذبہ نے یہ بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی کی۔ بلند آنکھیں نیچی ہوئیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ شوق نے نیچی نگاہیں پھر بلند کیں اور آناً فاناً یہ تین مختلف کیفیتیں فیروزہ کے قلب پر گذر گئیں۔ جذبۂ غیض جل بجھ کر تلاش سے بدلا۔ تلاش نے شوق کی ہیئت اختیار کی اور آخری طاقت جس نے دوبارہ آنکھیں جھکا دیں نسوانیت تھی۔ یہ سب کچھ ہوا، اور ہو چکا، مگر فیروزہ اب تک یہ نہ سمجھ سکی کہ کیا ہوا!!

۶

"تم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تین روز سے مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں یہ تمام عمر میں پہلا اتفاق ہے کہ مجھ کو اس قسم کی تکلیف ہوئی تم سب فضول باتیں کر رہے ہو اور اتنا نہیں ہوتا کہ اس کو یہاں تک لاؤ۔ وہ عورت نہیں حور ہے جو بادشاہی باغ کی جنت میں رہتی ہے۔ ایک ہیرا ہے جو گلاب کی کیاری میں چمک رہا تھا۔ ایک چاند ہے جو باغ میں اتر آیا تھا تم لوگ نمک حرام ہو اور باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں جانتے" (احسن)

"غریب پرور اس بدنصیب فیروزہ خاں کے سر پر تو قضا سوار ہے کہ نمک حرام نے بل بھر آ کھا اُجڈ گنوار ہے۔ اکڑ گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ کجا وہ اور کجا سرکار۔ اس کے سر پہ موت کھیل رہی ہے۔ اس کی ہستی کیا ہے کہ دم مار سکے اپنی اصلیت کو نہیں دیکھتا فقط حضور کے حکم کی دیر ہے ہم تو فیروز کو جان سے مار ڈالیں۔" (ایک مصاحب)

"مگر وہ لڑکی بہت خوش ہے بی مغلانی کہہ رہی تھیں کہ مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی پٹھان تو بگڑتا رہا اور وہ ہنستی رہی۔" (دوسرا مصاحب)

بھئی بہت ٹھیک۔ (۱)

بے شک۔ (۲)

بے شک بے شک (۳)

بس پتہ چل گیا۔ (۴)

"ہاں یہ کون کہہ رہا تھا کہ بڑے سرکار حکم دیں تو اسی وقت کام ہو جائے" (پہلا)

"اور اس میں کلام ہی کیا ہے" (دوسرا)

"سرکار نے بلوایا تھا اس نے انکار کر دیا" (تیسرا)

"یہ تو حد ہو گئی" (چوتھا)

۷

احسن اور اس کے مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا منت خوشامد کی زبردستی کی، ڈرایا دھمکایا سمجھایا بجھایا، مگر فیروزہ کا دل نہ پگھلا سکے۔ بلوچ تھا تو ایک ٹانگ کا آدمی لیکن غیر تمند قوم کا جری فرد، وہ کھری کھری سنائیں کہ سب منہ تکتے رہ گئے فیروزہ صبح کیوقت ایک ہندو رئیس کے جمنا پار روزانہ ڈالی لیکر جاتی تھی اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ گھنٹوں پہلے کنارہ دریا پر آبیٹھتا۔ اور فیروزہ کی صورت دیکھ لیتا اس نامعلوم کیفیت سے جو اندر ہی اندر فیروزہ کو زیر و زبر کر رہی تھی اب پردہ اُٹھنے لگا۔ اور وہ اتنا سمجھ گئی کہ جس بے باکی سے میری آنکھیں آج کائنات کی ہر شے کا مطالعہ کرتی تھیں احسن کی طرف جانے میں اس بے باکی کے ساتھ کوئی اور چیز بھی شامل ہے جو وقتاً فوقتاً رنگ بدل رہی ہے۔ کبھی حیا دامنگیر ہوتی ہے کبھی شوق کبھی تعجب اور کبھی تلاش ایک مہینہ سے زیادہ اسی طرح گزر گیا اور اب فیروزہ کا معصوم قلب محبت کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ وہ جب علی الصبح اُٹھتے ہی رائے صاحب کے ہاں جانے کی تیاری کرتی تو ادائگی فرض کے ساتھ ہی احسن کو دیکھنے کی بھی ایک مسرت پاتی جون کا دوسرا ہفتہ تھا گرمی شدت سے پڑ رہی تھی جمنا پایاب ہو گئی تھی اور پاٹ بہت مختصر ایک روز جب فیروزہ بیچ دریا میں تھی اس کا پاؤں اُٹھا اور گر گیا۔ رنگ برنگ کے پھول اور پودینہ کی سبز پتیاں پانی میں تیرنے لگیں۔ شلجم۔ چقندر اور بینگن ڈوب گئے احسن ایک چٹان پر بیٹھا یہ دیکھ رہا تھا فیروزہ کے گرتے ہی وہ بیتاب ہو گیا مدد کو دوڑا اور ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا۔

صبح کا وقت تھا جنگل اور دریا سنسان اور چند آبی پرندوں یا آبی جانوروں کے سوا ان چار آنکھوں کا تماشہ کسی اور آنکھ نے نہ دیکھا۔ احسن بہتے ہوئے پھول پکڑ پکڑ کر لایا ڈوبی ہوئی ترکاریاں ٹٹول ٹٹول کر نکالیں اور وہیں کھڑے کھڑے ڈالی سجائی۔ فیروزہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ محسن کا شکریہ ادا کرے۔ مگر بہت سی طاقتیں ایسی غالب تھیں کہ وہ کہہ تو کچھ نہ سکی مگر اتنا ضرور ہو سکی کہ چلتے وقت اس کی آنکھوں نے مسکرا کر احسن کو دیکھا اور اس مسکراہٹ میں بہت کچھ پنہاں تھا۔

۸

دریا کی لہریں جنہوں نے فیروزہ کے گرنے پر قہقہے لگائے خاموش تھیں اس صبح کو جب دروداں سے ناآشنا حسینہ خاموش کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور احسن کی صورت نظر نہ آتی تھی آج اس کو معلوم ہوگیا کہ دل جن گتھیوں کو سلجھا رہا تھا جذبات جن سانپوں سے کھیل رہے تھے اور خواہشیں جس تخیل میں ڈوب رہی تھیں اس کی کیا حقیقت ہے اور احسن کا انتظار اور ناکامی یہ معنی رکھتا ہے کہ۔

"اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی"

اسی حالت میں پارہ گئی اور مارا مارا واپس آئی تو پھر سناٹا تھا۔ دیر تک کھڑی رہی مایوس ہوئی تو باغ پہنچی دن تڑپ تڑپ کر اور رات کروٹیں لے لے کر ختم کی ابھی آفتاب طلوع ہی ہوا تھا کہ باہر نکلی پھول توڑے ترکاری اکٹھی کی امرتا لی سجا کر دریا پر آئی۔

۹

پرندوں کا نغمہ فضائے آسمانی میں گونج رہا تھا۔ چمن زارات کی نیند ختم کر چکی تھی اور لہریں چاندی میں ڈھلی ہوئی بہہ رہی تھیں۔ کہ فیروزہ کی منتظر آنکھوں نے احسن کی صورت دیکھی مگر انتظار و اشتیاق غصہ سے بدلا اس کی رسیلی آنکھوں میں بلوچی حرارت پیدا ہوگئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے اور اس نے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

آج پہلا دن تھا کہ احسن اس کے قریب پہنچا۔ ہر چند ہمت کی کہ اس کے قدموں کو ہاتھ لگائے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملے مگر یہ تمام جذبات جو رفتار کے ساتھ ترقی کر رہے تھے قریب پہنچتے ہی فنا ہو گئے۔ اور اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اس کے سوا کچھ کہہ سکتا۔

"کل پاؤں کا درد زنجیر بن کر پاؤں میں پڑ گیا"

فیروزہ نے یہ الفاظ خاموشی سے سنے اور اتنا کہہ کر پانی میں اتر گئی۔

"میں تو اس باپ کی بیٹی ہوں جو صرف ایک پاؤں سے دنیا کا مقابلہ کر رہا ہے"

۱۰

"اس سے پہلے کہ میں آپ کی درخواست کا جواب دوں میں آپ کی اس جھونپڑی میں تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، افسوس ہے کہ اس گھاس پھوس کے سوا یہاں آپ کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ میں نے آپ کا ارشاد سُنا اس کے جواب میں عرض ہے کہ آپ مجھ کو اس خیال سے نہ دیکھئے جو جھوٹی شرافت فانی دولت اور لغو امارت نے آپ کے دماغ میں پیدا کیا۔ میں بہادر و جری قوم بلوچ کا ایک فرد ہوں لیکن میں ہندوستان میں بھیک مانگنے نہیں آیا میں گھوڑوں کی تجارت کے واسطے آیا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی گھوڑے سے گر کر میری ٹانگ ٹوٹی لیکن وطن کی واپسی میں یہ حارج نہ تھی فیروزہ میری پیاری بچی یہیں پیدا ہوئی مگر میری واپسی وطن میں اس کا وجود بھی رخنہ انداز نہ ہو سکتا تھا مجھے جس چیز نے ہندوستان میں روکا وہ اس فیروزہ کی ماں اور میری عزیز بیوی کی یہ سامنے والی قبر ہے جس کی میں پرستش کر رہا ہوں میں اس باغ اور باغیچہ کا رکھوالی نہیں میں ان ہڈیوں کا نگہبانی کر رہا ہوں جن کی عصمت کا میں مالک تھا۔ ہم بہادر ہیں جنگجو ہیں لیکن دغا باز نہیں تم دولت مند لوگ تم ہندوستان کے مسلمان تم رئیس اور امیر ہمارے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ تم نے عورت کی مٹی پلید کی اور اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کے خیال سے انسانیت لرزتی ہے تمہارا ایمان یہ ہے کہ جھوٹے وعدوں اور غلط امیدوں سے ایک معصوم عورت کو نکاح میں لاؤ اور جب تمہاری بدولت تمہارے مظالم کے طفیل وہ

تمہارے کچھ بچوں کو دودھ پلا کر یا انکار میں گھل گھلا کر صورت سے بے صورت ہو جائے تو تم اس کو اُدھر میں چھوڑ کر دوسری عصمت کو تاکو اور اسلام کی آڑ میں مزے اُڑاؤ مجھے معلوم ہے کہ خود آنجناب کی تین بیویاں موجود ہیں آپ کو حق نہیں کہ کسی معقول آدمی سے اس قسم کی درخواست کریں، مجھے معاف کیجئے۔ میری رائے میں آپ سے زیادہ جفا شعار مشکل سے ہوگا، افسوس یہ ہے کہ آپ کے ان افعال پر آپ کی سوسائٹی یا برادری آپ کا کنبہ یا قوم خوش ہے اور اس لئے وہ بھی آپ سے کم سنگ دل نہیں ضرورت تھی کہ مسلمان آپ کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے۔ اور اگر ان میں ایمان ہوتا تو آپ کی صورت نہ دیکھتے آپ سڑکوں کے قریب جنگل کے وسط میں باغوں کے مابین نہروں کے کنارے ہماری خانہ بدوش قوم کی ہم فقیروں کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں میں جہاں عصمت کے جواہرات جگمگاتے ہیں اس صنف نازک کے وہ قدردان دیکھیں گے جن پر آسمانی فرشتے مرحبا کہتے ہیں ہم نے اس پھول کی جو عورت کی حیثیت میں قدرت نے ہم کو عطا کیا سچی قدر کی اور سر آنکھوں پر رکھا۔ ہمارے پھٹے ہوئے کپڑوں اور ٹوٹی راوٹیوں میں مسرت کے وہ خزانے دمک رہے ہیں جن کا عشر عشیر بھی تمہارے قالینوں اور غالیچوں محلوں اور دو محلوں میں موجود نہیں۔

کثرتِ ازدواج کے مسئلہ کو ہم تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ گو میں حافظ نہیں مگر آپ سے اور اس تمام جماعت سے جو آپ کے ہمراہ ہے بہتر اور زیادہ قرآن اور حدیث مجھے یاد ہے لیکن آپ نے تو اس سلسلہ میں اسلام کو اُلٹی چھری سے ذبح کیا نص کے خلاف میں کیا کوئی مسلمان نہیں جا سکتا مگر فروعات میں ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر ضرورت خواہ وہ کسی عنوان کے تحت میں ہو حالات کے اعتبار سے مکمل ہونی چاہیئے۔ شکم پری جس کی ضد خودکشی ہوگی انسان کی بہترین عبادت ہے اس کی تکمیل کسی وقت جنگلی پھلوں پہاڑی جانوروں سے ہو رہی تھی مگر آج گو مقصود وہی ہے لیکن حالات نے سامان بدل دیا اور غذا بالکل مختلف ہوگئی میں پھر کہتا ہوں کہ نص کی مخالفت کفر ہے لیکن نص کو دھوکا دینا کفر سے بھی زیادہ ہے قرونِ اولے کی ضرورتیں اور تھیں اس وقت کے حالات اور تھے۔ میں نے آپ حضرات کو اور بالخصوص آنجناب کو کبھی سر منڈاتے ہوئے تہمد باندھتے ہوئے کھجوروں سے پیٹ بھرتے ہوئے اور پتھر ڈھوتے ہوئے نہیں دیکھا ہاں آپ کے نکاحوں کی خبریں میرے کانوں میں برابر پہنچتی رہیں آپ ہم کو اقوام جرائم پیشہ میں شمار کرتے ہیں مگر گریبان میں منہ ڈالئے اور فرمائیے آپ سے زیادہ عادی مجرم کون ہو سکتا ہے۔ کہ شب و روز آپ بدبخت عورت پر سوکنیں لا رہے ہیں۔ آپ خوش ہیں۔ آپ کی ستم گر سوسائٹی آپ کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے! اس باغ میں میری حیثیت محافظ کی ہے کہ میں ان پھلوں کو اور میووں کو پرندوں اور جانوروں سے محفوظ رکھوں یہی میرا رزق اور میری زندگی کا سہارا ہے یہ سامنے دیکھیے میری غلیل اور گوپیا اسی مرض کی دوا ہیں مگر شام کے وقت جب اندھیرے کی چادر اس چار دیواری پر پھیلتی ہے اور قدرت آفتاب جہانتاب کی رونق فنا کرتی ہے اس وقت طوطے کا ایک جوڑا اس اونچی ٹہنی پر آ کر بیٹھتا ہے میری کیریوں کے گرنے کی آواز ان کی آمد کا غلغلہ بلند کرتی ہے میرے ہاتھ گوپیا اُٹھاتے ہیں لیکن میری آنکھیں جب یہ دیکھتی ہیں کہ فضائے آزادی میں مٹھی بھر پروں کا یہ جوڑا زندگی کا لطف اُٹھا رہا ہے۔ اور ہوا کے جھونکے اس کی سچی محبت پر قربان ہو رہے ہیں تو میرے ہاتھ رک جاتے ہیں میرا دل کانپ جاتا ہے اور اب مجھے ایک دوسرا سماں دکھائی دیتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ محبت کے انتہائی جذبے سے مغلوب ہو کر نر مادہ سے لپٹ گیا اس نے اپنا روشن چہرہ چمکدار منہ مادہ کے پروں میں رکھ دیا، مادہ اس کے پاکیزہ جذبے کے استقبال کو آگے بڑھی منہ سے منہ ملایا اور ان کے گلوں سے موسیقی کی وہ صدائیں بلند ہوئیں۔ جن پر کائنات نثار ہو تو میرا گوپیا گر پڑتا ہے غلیل ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور میں از سر تا پا انکی محبت میں محو ہو جاتا ہوں۔ مجھ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے والا سماں آپ کے ایک اشارے میں ختم ہوتا ہے۔ اور آپ کے ایک فیر میں دونوں دم توڑتے ہوئے نیچے آ پڑتے ہیں۔

دُور ہو جائیے آپ میرے سامنے سے اس لئے کہ آپ کافر کہیں گے، چلے جائیے یہاں سے اس واسطے کہ مشرک فرمائیں گے، مگر آپ مجبور ہیں اور قطعاً محروم اس دولت سے جس سے میرا دل مالا مال ہے۔

میری زندگی اور زندگی کا نصب العین یہ ہے؟

اتنا کہہ کر بلوچ کھڑا ہوا بیوی کی قبر پر سجدہ میں گر اس کی خاک آنکھوں پہ رکھی اور کہا "دنیا آپ کے واسطے پڑی ہوئی ہے بہتر سے بہتر اور امیر سے امیر اور حسین سے حسین لڑکیاں موجود ہیں مجھے معاف فرمایئے اور آئندہ ادھر کا رُخ نہ کیجئے گا"

وہی جمنا کا کنارہ ہے اور صبح صادق کا سہانا وقت۔ فیروزہ اپنی ڈالی ہاتھ میں لئے خاموش کھڑی ہے۔ احسن کچھ کہہ رہا ہے۔ اور آنکھ سے زاروقطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں وہ اپنی داستان غم ختم کر چکا تو فیروزہ مسکرائی اور کہا "میرے باپ نے جو کچھ کہا وہ تم لوگوں کو کتنا ہی ناگوار ہو لیکن اس کا حرف حرف صحیح تھا میں اُن کی مرضی یا اجازت کے خلاف ہرگز نکاح کے واسطے تیار نہیں اس لئے تم کو اس سے قطعاً مایوس ہو جانا چاہیئے۔

تم نے اپنی محبت میرے سامنے پیش کی یہ میرا فرض انسانیت ہے کہ میں اس کا جواب محبت سے دُوں اس لئے جس زبان سے یہ لفظ ادا ہو رہے ہیں کہ میں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف یا اجازت کے بغیر نکاح نہ کروں گی اسی سے یہ وعدہ بھی کرتی ہوں کہ اگر تمہارا دل محبت کے اسی مرکز پر قائم رہا تو میں کبھی دوسرے شخص سے بھی نکاح نہ کروں گی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں نے باپ کے ارشاد کی بھی تعمیل کر دی اور محبت کا بھی جواب دے دیا" اتنا کہہ کر فیروزہ اپنی ڈالی لئے آگے بڑھی اور احسن منہ تکتا رہ گیا۔

۱۲

آج صبح کے وقت بادشاہی باغ جہاں دو آدمیوں کے سوا کوئی نہ ہوتا تھا بیسیوں آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ پولیس کے لوگ ہیں کچھ ہسپتال کے اور زخمی فیروز ایک چارپائی پر اس طرح پڑا ہے کہ اس . . . . کے کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ کوتوال اور تھانہ دار اسکے اظہار لکھ رہے تھے کہ اس کی حالت بگڑی اور اُس نے طیش میں آکر کوتوال سے کہا:۔

"سوتے آدمی پہ حملہ کرنا بہادر کا کام نہیں، ہمت تھی تو میرے سامنے آکر مقابلہ کیا ہوتا، چھری کا قریب قریب تمام حصہ میرے پیٹ میں گُھسا اور رات تک خون بند نہیں ہؤا مگر مجھے اپنی موت کی مطلق پرواہ نہیں قلق یہ ہے کہ اس وقت میری قوم کا کوئی بچہ تک موجود نہیں جسکو وصیّت کرتا"۔

فیروز نے یہ کہہ کر اپنی بچی کو پاس بلایا اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا "میں دُنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور تجھ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں کے فریب سے محفوظ رکھے۔ افسوس ہے کہ بلوچ قوم کا کوئی متنفس اس واقع سے باخبر نہیں جو ان سیدوں کو کافی سزا دیتا۔ میں قدرت کے قانون اور فطرت نسوانی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ دنیا بہت جلد بے گناہ باپ کے قتل کو تیرے دل سے محو کر دے گی مگر تجھ کو وصیّت کرتا ہوں کہ لباس عروسی تیرے جسم پر اس وقت تک حرام ہے جب تک تو میرے خون کا بدلہ احسن سے نہ لے لے"

یہ کہہ کر فیروز نے کلمہ طیبہ پڑھا اور دنیا سے رخصت ہؤا۔

۱۳

باپ کے دفن کے بعد فیروزہ باغ سے اُٹھ کر برابر کے گاؤں میں چلی گئی۔ آٹھ دن میں گاڑھے کا تھان تیار کرتی اور ہر منگل کو شام کے وقت شہر میں جا کر بیچ آتی۔ شہر اور گاؤں میں دریا حائل تھا برسات کا موسم تھا دو پیسہ دے کر ناؤ میں بیٹھتی اور پار چلی جاتی اور دو پیسہ دے کر لوٹ آتی۔

احسن کی حالت روز بروز ردی ہو رہی تھی اُس نے اس کے عزیزوں اور مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا، ہر قسم کا لالچ دیا، مگر سب بیسود تھا اب احسن کے واسطے صرف یہ ایک صورت تھی کہ وہ تڑپ تڑپ کر ہفتہ گذارے اور منگل کو کنارے پہ آجائے۔ کچھ روز اسی طرح گذرے یکایک بڑی مصیبت یہ ہُوئی کہ فیروزہ نے اس سے بات چیت ترک کر دی وہ ہرچند سب کچھ کہتا مگر وہ جواب نہ دیتی مجبوراً احسن نے ایک ناؤ تیار کی اور اس اُمید پہ ہر منگل کو دریا پہ موجود رہا کہ شاید وہ وقت بھی آجائے جب فیروزہ کو پار پہنچانے میں میری خدمات کام آئیں لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہُوئی۔

۱۴

بارش نے شاہدرے کے قرب و جوار میں قیامت بپا کر رکھی تھی جمنا پوری طغیانی پر تھی اور بیسیوں گاؤں اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے ریلوے لائن اکثر جگہ سے بیکار ہو گئی۔ پل نصف سے زیادہ پانی میں ڈوب گیا اور ہر طرف سے الامان والحفیظ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں خدا معلوم کتنے آدمی اور جانور دریا میں بہہ گئے۔ گائیں بھینسیں بھیڑ بکریاں تنکوں کی طرح بہاؤ میں جا رہی تھیں۔ ستمبر کی چھٹی تاریخ کی شام کو وہ بارش ہو رہی تھی جس کے خوف سے ہزار ہا بندگان خدا بھرے گھر چھوڑ چھاڑ جنگلوں میں بھاگ گئے جمنا کے دونوں پاٹ ایک ہو گئے تھے اور پانی پل کے اُوپر بہہ رہا تھا۔

بادل گرج رہا تھا بجلی چمک رہی تھی اور بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔ احسن ایک درخت کے نیچے خاموش بیٹھا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کے کان میں یہ آواز پہنچی:۔

"احسن کیا تم مجھ کو پار پہنچا سکتے ہو؟"

اس آواز نے احسن کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو فیروزہ بناؤ سنگار کئے سامنے کھڑی ہے۔ یہ پہلا روز تھا کہ احسن نے فیروزہ کو کارستہ دیکھا وہ قریب پہنچا اور کہا۔

"مجھے تعمیل میں عذر نہیں، ناؤ موجود ہے مگر اس وقت دریا میں قدم رکھنا موت کے منہ میں جانا ہے۔"

"ہاں میں بھی جانتی ہوں مگر میں نے تھان کا وعدہ آج ہی کا کیا ہے۔"

احسن:۔ ایک تھان کے بدلے ہزار اور لاکھ تھانوں کی قیمت قربان کرنے کو حاضر ہوں مگر اس وقت پار جانا مصلحت نہیں۔

فیروزہ:۔ مجھے آپ سے قیمت لینے کا کوئی حق نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں اور پورا کروں گی۔

احسن:۔ اگر یہ حالت ہے تو میں قربان ہونے کو اور تعمیل کرنے کو تیار ہوں۔

فیروزہ:۔ "بسم اللہ"

فیروزہ ناؤ میں بیٹھ گئی۔ احسن نے رسّے کھولے۔ ناؤ کھینی شروع کی۔ پانی غضب ڈھا رہا تھا آناً فاناً ناؤ بھنور میں پہنچ کر ہچکولے کھانے لگی۔ احسن کے ہاتھ سے بلیاں چھوٹ گئیں وہ فیروزہ کے قریب آیا اور کہا "بس ناؤ ڈوب رہی ہے" فیروزہ مسکرائی۔ اُس نے گلاب کا ایک پھول احسن کے سر پہ رکھا "یہ وہ رسم ہے جو بلوچوں میں نکاح کے وقت دُلہن کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری محبت کے جواب میں میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اب موت سر پہ ہے۔ میں نے باپ کی وصیت بھی پوری کر دی۔ احسن اس بھنور میں ہمارا نکاح ہے!"

یہ کہہ کر فیروزہ نے اپنے ہاتھ احسن کے گلے میں ڈال دیئے اور ناؤ جمنا میں ڈوب گئی۔

---

(۳)

ترجموں کا دور

مولانا ظفر علی خان

تولہ بھر ریڈیم

کچھ دن ہوئے لندن کے چند بے فکروں نے ایک جگہ جمع ہو کر یہ سوچنا شروع کیا کہ تفریح و دلچسپی کا ایسا کون سا مشغلہ ہو سکتا ہے کہ وقت بھی بڑے مزے میں گذرے اور گرہ سے بھی خرچ نہ ہو۔ یہ لوگ انگریزی سوسائٹی کا خلاصہ اور انگلستان کی شرافت کا عطر تھے۔ ان میں سے کوئی ڈیوک تھا، کوئی بیرن۔ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور کوئی فوجی افسر۔ سب کے سب مجرد تھے اور اس آزادی کے صدقے میں جس کے لحاظ سے انگلستان کے مرد و عورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ سبھی طرح کے گلچھرے اڑا چکے تھے۔ کوئی ایسی ہوس نہ تھی جو انہوں نے پوری نہ کی ہو اور کوئی ایسا پاپڑ نہ تھا جو انہوں نے بیلا نہ ہو۔ زندگی کا لطف خاص طور پر حاصل کرنے کے لئے اب انہیں کسی ایسے مشغلہ کی ضرورت تھی جو بڑا ہی انوکھا ہو۔

سوچتے سوچتے آخر ایک کی طبیعت لڑ گئی اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم لوگ ایک انجمن نقب زنی قائم کریں جس کی رکنیت کی نیس یہ ہو کہ ہر رکن سال میں ایک دفعہ لندن کا کوئی گھر جسے صدر انجمن صاحب تجویز کریں پھوڑا کرے، اس تجویز پر سب نے با اشتیاق تمام صاد کیا اور ایک باقاعدہ انجمن نقب زنی قائم ہو گئی جس کے ارکان کی تعداد ایک رکن کی تحریک کی بنا پر الف لیلہ کے مشہور علی بابا اور چالیس چوروں والے قصہ کی مناسبت سے چالیس تھی۔

ایک دن جب بعض ضروری امور پر غور کرنے کے لئے اس انجمن کا باقاعدہ اجلاس ہوا تو صدر انجمن نے پہلے تو بلا کسی تمہید کے حاضرین سے یہ کہا کہ ریڈیم جیسی نایاب چیز بہ مقدار کثیر موجود ہو گئی، اور اس کے بعد جیب میں سے ایک اخبار نکال کر حسب ذیل عبارت پڑھنی شروع کی:

"کچھ عرصہ ہوا کہ آدھ سیر ریڈیم کی قیمت آٹھ لاکھ چھیانوے ہزار پاؤنڈ (ایک کروڑ چوبیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ) بتائی گئی تھی۔ جن جن لوگوں کے پاس اس نادر الوجود عنصر کی کوئی مقدار بہ غرض فروخت موجود ہو انہیں ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اسے علیحدہ کر ڈالیں کیونکہ پروفیسر بلتھ نے اس عنصر کے بمقدار کثیر بہم پہنچانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ کے مطابق پروفیسر موصوف نے تولہ بھر ریڈیم جس کی قیمت بازار کے بھاؤ سے تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپے ہوتی ہے، تیار کر لی ہے اور چند خاص خاص ماہرین علم کیمیا نے پروفیسر بلتھ کے کارخانہ میں جا کر اس کی اصلیت کے متعلق اپنی تشفی کر لی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب ریڈیم نظری دنیا سے عملی دنیا میں آجائے گی اور اس کا شمار قدرت کی بڑی قوتوں میں ہونے لگے گا چونکہ اس عجیب و غریب عنصر کے چھوٹے سے ٹکڑے میں اتنی تاثیر موجود ہے کہ ایک متوسط الحال شخص کے آتش دان کو دو ہزار سال تک کوئلہ کی احتیاج سے مستغنی رکھ سکے۔ لہٰذا ظاہر ہے شہروں میں دھوئیں کی وجہ سے آج کل جو تکلیف ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہے گی۔ دخانی جہازوں کو کوئلہ کی کانوں کے بیکار رہنے کی وجہ سے کوئی دس لاکھ مزدوروں کو معاش کی کوئی دوسری شکل نکالنی پڑے گی۔"

ایک رکن: ہوگا تو بڑے مزے کا زمانہ۔

دوسرا رکن: لیکن اسے ہماری آج کی کارروائی سے کیا تعلق؟

صدرِ انجمن: مجھے بات پوری تو کر لینے دی ہوتی۔ اس کے بعد ٹوکا ہوتا۔

دوسرا رکن: ارشاد ہو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

صدرِ انجمن: ہمارے سیکرٹری صاحب نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر جیرلڈ براؤن کا چندہ بابت سال گذشتہ ابھی تک وصول نہیں ہوا۔ لہٰذا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میجر براؤن یہ تولہ بھر ریڈیم مالیتی تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ پروفیسر بلبنتھ کے مکان سے لا کر انجمن کے اجلاس آئندہ میں پیش کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس معزز انجمن کی رکنیت کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ جیسی ہیچ میرز رقم اس کے برقرار رکھنے کا کافی معاوضہ ہو سکے۔

اس فیصلہ کی تعمیل کے خیال سے گذشتہ ماہ اپریل کی پہلی تاریخ کو آدھی رات کے وقت میجر جیرلڈ براؤن پروفیسر بلبنتھ کے مکان واقع لڈگیٹ سرکس کے پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مکان کے اندر داخل ہوئے، میجر صاحب کا طرزِ عمل وہی تھا جو ایک معمولی چور کا ہوتا ہے۔ آپ کھڑکی توڑ کر کمرہ میں گھسے، یہ کمرہ پروفیسر کا معمل یا دار التجربہ تھا۔ چونکہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لہٰذا میجر براؤن نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی برقی لالٹین نکال کر روشنی کی اور ہر طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا۔ ایک چٹخنی کھول کر وہ آگے بڑھا۔ کچھ دور جا کر داہنے ہاتھ کی طرف ایک دروازہ اور دیکھا جس کے پٹ بالکل کھلے تھے۔ دروازہ میں سے اسے جو کچھ نظر آیا وہ اسے محوِ حیرت و استعجاب کرنے کے لئے کافی تھا۔ کمرہ کے وسط میں میز پر ایک چمکدار چیز رکھی ہوئی تھی، مقابل والی دیوار پر کوئی ایک فٹ مربع جگہ اس چمکدار چیز کے عکس کی وجہ سے نورانی ہو رہی تھی۔ یہ ریڈیم تھا۔ میجر کو تعجب ہوا کہ پروفیسر نے ایسی بیش بہا چیز کو کیوں اس طرح سے کھلا چھوڑ دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ پروفیسر نے سائنس دانوں کے دکھانے کے لئے اسے یہاں رکھا تھا لیکن تین لاکھ چونسٹھ ہزار کا مال کھلے کمرہ میں میز پر رکھ دینا ایسی لغویت تھی جس کا ارتکاب پروفیسر کے سوا کوئی دوسرا کرتا تو اوّل درجہ کا پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن یہ ایسا وقت نہ تھا کہ میجر براؤن پروفیسر کے قوائے ذہنی کی صحت و عدمِ صحت پر کھڑا ہوا غور کیا کرتا۔ چنانچہ وہ میز کی طرف بڑھا لیکن دہلیز کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے پٹ بڑے زور سے بند ہوئے۔ میجر حیران ہوا کہ دروازہ کیسے بند ہوا۔ کیونکہ نہ ہوا تھی نہ کوئی شخص موجود تھا جس نے دروازہ بند کیا ہو۔ کچھ دیر تک محوِ حیرت رہنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف بڑھا کہ پٹ پھر کھول دے اور گھنڈی گھما کر کھینچا لیکن معلوم ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس نے گھنڈی کو ہر طرف گھمانا دبانا شروع کیا مگر بے سود۔ چٹخنیوں کو ٹٹولا کہ بند ہونے کے دھماکے سے نیچے والی چٹخنی تو کہیں گر نہ گئی ہو لیکن چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کو پھر اچھی طرح سے دیکھنا شروع کیا۔ سوا اس گھنڈی کے جسے وہ ہر طرف گھما چکا تھا اور اس چٹخنی کے جسے وہ دیکھ چکا تھا کہ چڑھی ہوئی ہے اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے دروازہ بند ہو سکتا۔ نہ کنجی کا سوراخ تھا نہ حلقے۔ جن سے معلوم ہو کہ دروازہ مقفل ہے۔ میجر نے خیال کیا کہ ضرور ہے کہ کمرہ سے نکلنے کا کوئی دوسرا رستہ ہو۔ اس خیال سے اس نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ مگر کوئی کھڑکی یا دروازہ یا روشندان نظر نہ آیا۔

تب تو میجر بہت ہی سٹپٹایا اور دل میں کہنے لگا "بُرے پھنسے! خدا ہی ہے جو یہاں سے رہائی دے اور یہ سب میری بے وقوفی ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ دروازے کی طرف سے اطمینان کر لیتا تب اندر گھستا۔ افسوس کہ مجھ جیسا آدمی جو شاہی گارد کا میجر ہو اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو وہ معمولی چوروں کی طرح

اقدامِ نقب زنی میں چالان کیا جائے۔

اس خیال سے اس کا دماغ چکرانے لگا اور بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ اس پر اسے اور غصہ آیا اور دل میں سوچنے لگا کہ میں اس سے زیادہ خطروں میں مبتلا ہو چکا ہوں لیکن کبھی مجھے ایسی گھبراہٹ نہ ہوئی جیسی اس وقت ہے۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ دفعتہً گھنٹی بجی جسے سنتے ہی وہ چونک پڑا۔ پیچھے پھر کے دیکھا تو کمرہ کے کونے میں ٹیلیفون لگا ہوا پایا جس کی گھنٹی بج رہی تھی اس سے اس کے رہے سہے اوسان اور جاتے رہے۔ جب گھنٹی بجنی موقوف ہی نہ ہوئی تو مجبوراً ٹیلیفون کے پاس گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ آواز آئی "کون ہو؟" میجر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوبارہ آواز آئی "کون ہے؟" میجر پھر بھی چپ ہی رہا۔

آواز: اگر جواب نہ دو گے تو ابھی پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں گرفتار کرا دیا جائے گا۔

میجر: (یہ دیکھ کر کہ اگر جواب نہ دیا تو پولیس کا سپاہی آ کر حقیقت میں ہتھکڑی ڈالے گا) کہو کیا کہتے ہو؟

آواز: خوب! کہو کیسے ہو؟

میجر: بڑے مزے میں ہوں۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟

آواز: تمہارا نام کیا ہے؟

میجر: (یہ خیال کر کے کہ صحیح نام بتانا ٹھیک نہیں) رچرڈ مارکھم۔

آواز: آپ کی عمر کتنی ہے؟

میجر: (یہ یقین کر کے کہ یہ ضرور کوئی بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر ہے جو اسے پروفیسر بلنتھ کا نائب سمجھ کر یہ باتیں پوچھ رہا ہے) میری عمر تو جو کچھ ہے وہ ہے مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ آدھی رات کے وقت آپ کو اپنی معلومات میں اس اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟

آواز: (میجر کے سوال پر مطلق التفات نہ کر کے) آپ کی عمر؟ جلدی کیجئے۔

میجر: پینتیس سال۔ (اپنے دل میں) ایسے آڑے وقت میں سچ کے سوا چارہ نہیں۔

آواز: رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ؟

میجر: سپہ گری۔

آواز: بہت ٹھیک۔ رچرڈ مارکھم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہ گری۔ ابھی تک ملازمت میں ہیں یا پنشن ملتی ہے؟

میجر: پنشن پاتا ہوں۔

آواز: اچھا تو سنئے۔ رچرڈ مارکھم عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہ گری۔ حال پنشن یاب مگر آپ کس درجہ بے وقوف ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے پیشہ کو دھبہ لگاتے ہیں اور پنشن سے ہاتھ دھوتے ہیں۔

میجر: (شرمندہ اور متحیر ہو کر) کیا کہا؟

آواز: میں نے یہ عرض کیا کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر آپ اپنی پنشن کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟

میجر: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بک کیا رہے ہو؟

آواز: بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گا کہ زیادہ وضاحت سے کام لوں۔ جناب والا آپ چور ہیں۔ آیا خیال شریف میں؟ آپ ریڈیم چرانے گئے تھے لیکن پروفیسر بلنتھ کے مکان میں بند ہو گئے۔

میجر: (گھبرا کر) ایسے تو ہے کون؟

آواز: پروفیسر بلنتھ!

میجر: لعنت بہ کارِ شیطاں۔

پروفیسر: نہیں جناب بہ کارِ پروفیسر کہئے۔

میجر: آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟

پروفیسر: میں برآمدہ کے پہلو والے کمرہ میں ہوں۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے آپ کے کمرہ کا دروازہ نظر آتا ہے اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔

میجر: آپ چاہتے کیا ہیں؟

پروفیسر: میری منشا کا انحصار آپ کے طرزِ عمل پر ہے۔

میجر: وہ کیسے؟

پروفیسر: وہ ایسے کہ آپ چاہیں تو آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور چاہیں تو مجھے سائنس کے اکتشافات میں مدد دیں۔ کہئے کیا صلاح ہے؟

میجر: یہ سائنس کے اکتشافات کیا بلا ہوتے ہیں؟

پروفیسر: آپ ایک بارہ فٹ مربع کمرہ میں مقید ہیں جس میں ایک تولہ بھر ریڈیم رکھا ہوا ہے۔

میجر: اچھا پھر؟

پروفیسر: پھر یہ کہ آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں جو اتنی قلیل الحجم جگہ میں اتنے کثیر المقدار ریڈیم کے ساتھ بند ہوئے اس لئے آپ کے محسوسات سائنٹیفک دنیا میں بہت گراں بہا سمجھے جائیں گے اس لئے اگر آپ اس وقت تک جب تک آپ کے ہوش و حواس بجا رہیں اپنے محسوسات سے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے رہنے کا وعدہ کریں تو خیر ورنہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ ان دونوں میں سے آپ کون سی بات پسند کرتے ہیں؟

میجر: آپ کی توجہات کہ آپ نے یہ معاملہ میری رائے پر چھوڑا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے محسوسات بیان کر کے آپ کے علم میں اضافہ کروں۔

پروفیسر: جناب رچرڈ مارکھم صاحب میں آپ کا نہایت ہی شکر گذار ہوں لیکن آپ کو پہلے سے متنبہ کئے دیتا ہوں کہ آپ کو جسمانی تکلیف بہت کچھ برداشت کرنی پڑے گی۔ میرا تجربہ کئی گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوگا اور چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف محسوس کیوں نہ ہو نا ممکن ہے کہ دورانِ تجربہ میں کمرہ کھول کر آپ کو نکل جانے دوں۔ کہئے آپ راضی ہیں یا پولیس......

میجر: (جلدی سے بات کاٹ کر) میں تو کہہ چکا کہ پولیس کے مقابلہ میں مجھے آپ کی سائنس زیادہ عزیز ہے۔

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ ہاں یہ تو فرمائیے آپ کا قلب کیسا ہے؟

میجر: نہایت زبردست۔ گھنٹہ کی طرح آواز دیتا ہے۔

پروفیسر: نہایت ہی خوب۔ اس قسم کے تجربہ کے لئے دل چاہئے بھی ایسا ہی۔

میجر: (دل میں) یا اللہ! بُرے پھنسے۔ (پروفیسر سے مخاطب ہو کر) آپ کو مجھ سے کچھ اور پوچھنا ہے؟

پروفیسر: بہت کچھ۔ گھڑی ہے؟

میجر: ہاں ہے۔

پروفیسر: آپ ضرباتِ نبض بتا سکتے ہیں؟

میجر: بے شک!

پروفیسر: جناب والا! آپ تو سونیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں کہ آپ نے آدھی رات کو غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کمرہ میں آپ کو بند ہوئے ۱۵ منٹ ۲۰ سیکنڈ ہو چکے ہیں۔ اب بتائیے آپ کی نبض کی رفتار کیا ہے؟

مینیجر: نہتر!

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ کیا آپ مقیاس الحرارت کا استعمال جانتے ہیں؟

مینیجر: بیشک!

پروفیسر: بہت خوب ٹیلیفون کے ڈھکنے پر کاغذ کے پاس ایک نلکی رکھی ہے اس میں سے مقیاس الحرارت نکال لیجئے اور نہایت احتیاط سے بتائیے کہ پارہ کس درجہ پر ہے؟

مینیجر: ستانوے۔

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ بہت بہت شکریہ مجھے خیال نہیں تھا کہ فرج میں ایسے سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اخبار بھی لوگوں کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں کہ اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ مقیاس الحرارت کو دو منٹ تک اپنی زبان کے نیچے رکھئے اور اس کے بعد مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ اوپر چڑھا۔

مینیجر: دو منٹ کے بعد 'ننانوے۔

پروفیسر: بہت بہت مہربانی۔ آپ رسالہ میں ہیں یا پیدلوں میں؟

مینیجر: رسالہ میں۔

پروفیسر: رسالہ میں؟ بہت بہت مہربانی۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

مینیجر: نہیں۔

پروفیسر: تب تو کیا ہی کہنے ہیں۔ آپ کو دردِ سر کی شکایت تو نہیں؟

مینیجر: ابھی تک تو نہ تھی لیکن آپ کے مسلسل سوالات کی عنایت سے تھوڑی دیر میں ضرور ہو جائے گی۔

پروفیسر: آپ مہربانی فرما کر صرف علامات ہی بتائے جائیے تشخیص کا کام اس خاکسار کے سپرد کر دیجئے۔ آپ کے قلب کی حرکت کی کیا کیفیت ہے؟

مینیجر: خوب زور سے دھڑک رہا ہے۔

پروفیسر: ابھی کیا آگے چل کر دیکھئے گا کہ کیسا دھڑکتا ہے تنفس کیسا ہے؟

مینیجر: دم گھٹا جاتا ہے۔ اگر آپ مجھے تازہ ہوا کھانے کے لئے ایک منٹ کو باہر آنے دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

پروفیسر: نہ حضرت تازہ ہوا کو ابھی اپنے تنفس سے زیر بار فرمانے کا خیال دل میں نہ لائیے۔ تجربہ ختم ہونے سے پہلے آپ کا باہر تشریف لانا ناممکنات میں سے ہے۔ فرج والوں کے ذی ہوش ہونے کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ غلط ثابت ہو۔ کوئی عقلمند شخص دورانِ تجربہ میں اس قسم کی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اچھا بالفعل کچھ دیر کے لئے میں اپنے سوالات ملتوی کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں پھر گھنٹی بجاؤں گا۔ اگر آپ کو مجھ سے کچھ ارشاد کرنا ہو تو میں یہیں حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں آپ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔

مینیجر ٹیلیفون کے پاس سے ہٹ گیا۔ کمرہ کی ہوا بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ریڈیم کی شعاعیں زیادہ تیز اور چمکدار ہو چلی تھیں۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو اسے ایک فوری بے چینی محسوس ہوئی۔ جس طرح دہکتی ہوئی آگ کے سامنے جسم کو برہنہ کرنے سے جلن معلوم ہوتی ہے اسی طرح اسے ریڈیم کی طرف بڑھتے وقت ایسا معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے سامنے کا حصہ آگ میں جھلس گیا ہے۔ سانس بھی رک رک کر آنے لگی۔ دردِ سر بھی معلوم ہونے لگا۔ وہ فوراً پیچھے ہٹ کر دیوار کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ ریڈیم سے علیحدہ جا کھڑے ہونے سے ان علامتوں کی سختی کم ہو گئی۔ اتنے میں گھنٹی پھر بجی اور پروفیسر کی آواز آئی:

"مناسب ہوگا کہ میں آپ کو متنبہ کر دوں کہ اگر آپ ریڈیم کو ضائع کرنے کی کوشش کریں گے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اگر آپ نے ریڈیم

کے ٹکڑے کو توڑ دیا یا کچل ڈالا تو اور بھی مضر ہوگا۔ کیونکہ اس حالت میں اس کے ذرّات منتشر ہو کر آپ کے جسم میں نفوذ کر جائیں گے۔ اس وقت جو کیفیت آپ کو محسوس ہوگی وہ نہایت ہی دلچسپ ہوگی۔ بشرطیکہ آپ اس کا تجربہ کرنا چاہیں لیکن نتیجہ کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔ بہر حال اتنا میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں کہ آپ اس نئے زبردست عنصر سے اس حالت میں کسی طرح بچ نہیں سکتے جبکہ آپ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ کمرہ صرف بارہ فیٹ مربع ہے۔"

بیچارے میجر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ٹیلیفون کے تار کے دوسرے سرے پر پروفیسر رابرٹ ملبتھ فیلو آف دی رائل سوسائٹی، ڈاکٹر آف سائنس کھڑے تھے جن کی تحقیقات و اکتشافات نے علمی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ عام طور پر پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھا اور اپنے اندرونی جذبات کو کبھی شکل سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دوست کہا کرتے تھے کہ پروفیسر کے چہرہ پر سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کوئی تجربہ کامیابی کے ساتھ کر رہا ہو خوشی کے آثار اور کبھی نہیں پائے جاتے۔ یہ قول بالکل صحیح تھا کیونکہ اس وقت وہ رچرڈ مارکھم سابق ملازم رسالہ شاہی و حال مقید کمرہ، پروفیسر موصوف کے بیان کردہ تجربوں کو (جسے انہوں نے قلم بند کر لیا تھا) پڑھ پڑھ کر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ سائنس کی دنیا میں کس قدر اضافہ ہوا، اور جوشِ مسرت میں پھر پڑھتے تھے:

"نبض کی رفتار ۳۰، حرارت غریزی ۹۹۔ قلب کی حرکت بے قاعدہ۔ نہایت ہی عمدہ نتائج ہیں! سانس رُک رُک کر آتی ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اسے مقید ہوئے ۱۲ منٹ گذر چکے۔ جسم مضبوط ہے اسی لئے ابھی تک کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے جناب رچرڈ مارکھم۔ آج تو آپ بے طرح پھنسے۔ اگر آپ مجرم نہ ہوتے تو میں آپ کو اس بلا میں پھنساتے ہوئے جھجکتا لیکن بحالت موجودہ تو آپ کو اس سائنس کی راہ میں ضرور ہی یہ مصیبت جھیلنی چاہئے۔ اگر آج کا تجربہ آپ کے ذہن عالی سے اُتر نہ گیا تو عمر بھر پھر چوری نہ کیجئے گا۔

"حقیقت میں یہ بات عجائباتِ قدرت سے ہے کہ عقل ہمیشہ مادہ پر غالب آتی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ رچرڈ مارکھم جیسا قوی ہیکل اور زبردست آدمی مجھ جیسے ضعیف و نحیف شخص کے ایک اشارہ سے برابر والے کمرہ میں اس طرح بند ہو جائے جس طرح چوہا چوہے دان میں بند ہو جاتا ہے میں نے اپنی تحقیقات کا اشتہار اخباروں میں دے کر اپنی کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ آج کل جتنے جرائم پیشہ لوگ ہیں سب اخبار پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال صحیح تھا کہ اس اشتہار پر ضرور کسی چور کی نظر پڑے گی۔ اس کے بعد میں نے ریڈیم کو کمرہ کے وسط میں رکھ دیا اور مقابل والی دیوار پر سلفائڈ آف زنک مل دیا تاکہ چور کو ریڈیم ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت نہ ہو۔ ایک ایسی دہلیز کا تیار کرنا جس میں سے گذرتے ہی دروازہ کھٹ سے بند ہو جائے، میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اب اس کا انتظار تھا کہ چور آئے اور جال میں پھنسے، جو ہو کر رہا۔"

اس وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر فوراً آرام کرسی پر سے اٹھا اور ٹیلیفون کے پاس جا کر کہنے لگا:

"و ہچرڈ مارکھم صاحب! کیا آپ کی بے چینی بڑھنے لگی؟ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟"

میجر: کیا تم خداوند یسوع مسیح کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہو؟

پروفیسر: کہنے تو ایسا ہی ہیں۔ مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟

میجر: جو شخص مسیح پر ایمان رکھتا ہو اور بہشت میں جانے کا آرزومند ہو کیا وہ ایسی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کمرہ میں بند کر کے دوزخ کی آگ کا ایک ٹکڑا میرے سامنے رکھ دے، کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس آگ میں کباب ہوا جا رہا ہوں اس کا زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ اس کے انجرے میرا دم گھونٹ رہے ہیں۔ اس کا اثر میرے دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ اگر تم عیسائی ہو تو کمرہ کھول دو اور مجھے باہر نکلنے دو۔

پروفیسر: یہ آپ اپنے دماغ کو بے فائدہ تکلیف کیوں دے رہے ہیں۔ آپ کا کوئی حق نہیں ہے کہ تجربہ ختم ہونے سے پہلے باہر نکلنے کا نام لیں چونکہ آپ چور ہیں اس لئے آپ کو قرار واقعی سزا بھگتنی چاہئے، اور آپ تو فوج میں ملازم رہ چکے ہیں۔ بیسیوں لڑائیاں لڑی ہوں گی۔ خون کے نالے بہتے گولوں

کے مینہ برستے دیکھے ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ وہی ہنگامہ بپا ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوعِ انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ میں آپ کی اس تکلیف کا حال نمک مرچ لگا کر برٹش میڈیکل جرنل میں شائع کر دوں گا اور مجھے یقین کامل ہے کہ آپ کے خویش و اقارب جب اسے پڑھیں گے تو آپ کی ذات پر فخر کریں گے۔

میجر: میں خویش و اقارب سب کو پانی دے چکا ہوں اور اگر کوئی ہوتا بھی تو تیری اس بکواس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دروازہ کھولتا ہے تو کھول نہیں تو میں کوئی ایسی بات کر گذروں گا کہ تو عمر بھر پچھتائے گا۔

پروفیسر: حضرت اس کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی طرف سے خدشہ ہو۔ ریڈیم ہے سو اس کے توڑنے سے آپ کی جان پر ہی بن جائے گی۔ رہا ٹیلیفون، اس کے ضائع کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بیرونی دنیا سے جو رہا سہا تعلق آپ کا ہے وہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ آپ ہمت کیوں ہارے جاتے ہیں۔ کلکتہ کے بلیک ہول والے واقعہ کا ذکر تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ ان بے چاروں کی حالت تو آپ سے زیادہ خراب تھی۔

میجر: تیری اور تیرے بلیک ہول کی ایسی تیسی۔ رہ تو جا ملعون، خبیث، پاجی۔ اگر جیتا بچا تو تیری ہڈیاں چُور چُور نہ کر دی ہوں تو نام نہیں۔

پروفیسر: جنابِ عالی! آپ اس قدر گرم کیوں ہوتے ہیں۔ مزاج درست رکھئے۔ کمرہ میں چہل قدمی کیجئے۔ انشاء اللہ طبیعت جلد بحال ہو جائے گی۔ ہاں تھرمامیٹر پھر زبان کے نیچے رکھ کر مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ پر ہے۔ سائنس کی کچھ نہ کچھ خدمت بجا لاتے رہئے۔ بیکار رہنا ٹھیک نہیں (دل میں) بچا لو اب تو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ اگر پانچ سنٹی گرام کلورائڈ سے ۸ چوہے تین دن میں مر جاتے ہیں تو ایک تولہ ریڈیم برومائڈ ایک مضبوط آدمی کو کتنی دیر میں بیہوش کر سکے گا۔ ارلبعہ متناسبہ کا یہ سوال کئی دن سے حل طلب تھا اب وہ وقت آ گیا کہ کوئی شخص اس کو حل کرے اور وہ شخص پروفیسر بلنتھ ہوگا۔

کچھ دیر میں گھنٹی بجی اور آواز آئی:

میجر: حرارتِ غریزی ۱۰۲، نبض ۱۰۰۔ ابے او پاپی پروفیسر خدا کے لئے اب تو مجھ پر رحم کر۔ اگر مسیح کی خاطر نہیں تو کم از کم اس خیال سے چھوڑ دے کہ تو بھی بال بچوں والا ہے۔

پروفیسر: (میجر کی بات سُنی اَن سُنی کر کے) نبض ۱۰۰ اغلباً ناہموار ہوگی۔

میجر: اپنی ہی کہے جاتا ہے میری ایک نہیں سُنتا۔

پروفیسر: رچرڈ مارکھم صاحب از برائے خدا انصاف کیجئے کہ جو قرار داد مجھ میں آپ میں ہوا تھا اس کے لحاظ سے آیا یہ مناسب ہے کہ ایسی حالت میں جبکہ تجربہ سے خاطر خواہ نتائج مستنبط ہو رہے ہیں آپ اپنی رہائی کے لئے زور دیں اور تجربہ کو آخر تک پہنچانے سے پہلو تہی کریں۔ اگر علمی دنیا پر احسان نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم ایفائے عہد ہی کے خیال سے اپنی بات پر قائم رہئے۔ ہاں تو کیا آپ کی نبض ناہموار ہے؟

میجر: ہاں ہے تو لیکن میرے ہاتھ بھی کھجلا رہے ہیں کہ تیری چاند گنجی کر دیں۔ پروفیسر بلنتھ یاد رکھ اگر آج میرا دم نکل گیا تو خبیث بن کر تجھے اور تیرے گھر بھر کو پانچویں پشت تک کھا جاؤں گا۔ دیکھ لینا تو پاگل ہو کر بھونک بھونک کر کتے کی موت مرے گا۔

گالیاں سن کر پروفیسر ٹیلیفون سے ہٹ گیا اور اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا:

"ادنےٰ درجہ کے اراذل و انفاز کی خاص خصوصیت ہے کہ سختی کے وقت گندہ دہان ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ آ پڑے ممکن کیا کہ پایۂ تہذیب اور درجۂ ثقاہت سے گرا ہوا کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو۔ شرافتِ خاندانی اور اعلیٰ تعلیم کے یہی تو جوہر ہیں لیکن رچرڈ مارکھم نے میرے استفسارات کا جواب جس تسلی بخش طریقہ سے دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اچھی پائی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں

شرافت خاندانی بازی سے جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے بڑے فخر سے پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر گذرنے کے بعد پروفیسر نے اس خیال سے کہ اس کے قیدی کی حالت ضرور متغیر ہونی شروع ہوئی ہو گی۔ گھنٹی بجائی لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ پروفیسر نے دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ۳۵ سال کا جوان سپاہی ایسی جلدی میں بے ہوش ہو گیا ہو۔ ضرور ہے کہ وہ کمرہ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس دفعہ آہستہ سے جواب آیا جسے سُن کر پروفیسر نے کہا:

"جناب آپ نے جواب کیوں نہ دیا؟"

میجر: جیسے میں تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو میرے ہاتھ آجائے تو تجھے کن عذابوں سے ماروں۔ اے مُنتا ہے کہ نہیں؟ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پھوٹ چلیں۔ اب تو میری روح تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس وولیس کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جی چاہے تو گرفتار کرا دے۔

پروفیسر: جنابِ عالی آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہے مجھے آپ کے اس اشتعالِ طبع پر رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑے اور بڈھوں کی طرح چڑے۔ اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تجربہ ختم تک پہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے۔ اب کہئے نبض کی رفتار کیا ہے؟

میجر: ایک سو بیس ہے۔ گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر آگے چل کر گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے۔

پروفیسر: ہمت نہ ہارئیے۔ آپ کے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے؟

میجر: نیلی تو نہیں سبز ہے۔

پروفیسر: سبز ناممکن ہے۔

میجر: ممکن ہے کہ حقیقت میں نیلی ہو کیونکہ میری نگاہ خراب ہے رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

پروفیسر: سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو سخت تعجب ہے۔ شاید آپ کے ہاتھ میلے ہوں گے۔ اس وجہ سے نیلاہٹ میں ہریالی معلوم ہوتی ہو گی۔ آپ کی انگلیوں میں درد تو نہیں ہوتا؟

میجر: صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی انگلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔

پروفیسر: مرحبا اور حرارتِ عزیزی؟

میجر: ۱۰۲۔ ارے میں گرمی کے مارے بھنا جاتا ہوں۔ کیا تو نے مجھے مار ہی ڈالنے کی ٹھانی ہے؟

پروفیسر: ابھی کلھم سوا گھنٹہ ہوا ہے اس پر یہ شور برپا کر دیا کہ الامان ابھی تو تجربہ کی ابتدا ہی ہے۔ یہ کہہ کر پروفیسر برآمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا:

"کاش اکٹرپ یہاں موجود ہوتا۔ میں ثابت کر کے اس سے منوا لیتا کہ اس کی یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ریڈیم کے اثر سے خون کے کارپسل آکسیجن سے خالی ہو کر بیہوشی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میں علمی دنیا کے سامنے اب یہ اصول پیش کر سکوں گا کہ ریڈیم کے فعل سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور معمولی فالج ہو جاتا ہے۔ کٹرپ بیوقوف ہے اپنی بات پر اڑا رہا۔ اب اسے میری بات ماننی پڑے گی۔"

اتنے میں پھر گھنٹی بجی اور میجر کی آواز آئی:

"پروفیسر بلتھا اچھی طرح سُن اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں یہ ریڈیم نگل جاؤں گا اور تو تاپا رہ جائے گا۔ ریڈیم نگل لینے سے میری حالت اس سے تو خراب ہونے سے رہی جیسی اس وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد میرا دم نکل جائے اچھا ہے۔"

پروفیسر: آپ احمق نہ بنیئے جو تکلیف آپ کو اس وقت ہو رہی ہے؛ اس میں بہت زیادتی ہو جائے گی۔
میجر: کچھ پروا نہیں ہیں ......
پروفیسر ٹیلیفون بند کر کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا اور دل میں کہنے لگا:
"اس شخص نے تو مجھے مایوس کر دیا۔ خدا ہی ہے جو تجربہ حسب مراد ختم ہو۔ یہ شخص تو جلدی ہمت ہار گیا۔ آخر ذلیل ہے نا۔ محض گوشت و خون کا تودہ کیا کر سکتا ہے جب تک شرافت و علم نہ ہو۔"
کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے پھر گھنٹی بجائی لیکن اس دفعہ جو جوابات اسے ملے ان سے معلوم ہوا کہ قیدی کا دماغ چل گیا۔ جو آوازیں پروفیسر کے کان میں رُک رُک کر آئیں وہ یہ تھیں:
"بلبھ کے سر پر بلی ناچی۔ او سوار گھوڑا دوڑائے کدھر جاتا ہے۔ برف گر رہی ہے۔ بلبھ پیا بنا ہوا سڑک پر لٹک رہا ہے۔"
پروفیسر: مارکھم صاحب! خدا کے واسطے حواس بجا رکھئے۔ مجھے ابھی بہت دیر تک تجربہ کرنا ہے۔ آپ کے اختلاطِ حواس سے میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔
میجر: اہاہا اوہو ہو۔ سوار و تلواریں کھینچ کر بڑھو اور دشمن کو کاٹ دو۔ بور جاپانی اور روسی گلے مل رہے ہیں۔ شاباش میرے بہادرو۔ گھر کو پلٹ چلو ...... واہ رے میں! تلوار سے ایک سارجنٹ میجر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔
اس کے بعد ٹیلیفون میں قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سن کر پروفیسر نہایت افسردہ ہوا۔ تجربہ کے اس طرح رُک جانے سے اس کی خوشی خاک میں مل گئی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی لیکن جواب نہ ملا۔ آخر پروفیسر نے غمزدہ آواز میں کہا:
"اب تو دروازہ کھولنا ہی چاہیئے۔ یہ شخص بیہوش پڑا ہوا ہے اور اس حالت میں اگر دیر تک ریڈیم کی شعاعوں کے سامنے رہا تو ممکن ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو۔"
یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر سخت متعجب ہوا اور دل میں کہنے لگا:
"یہ ریڈیم کہاں غائب ہو گیا؟ کہیں حقیقت میں نگل ہی تو نہیں گیا؟" آگے بڑھ کر اس نے چاہا کہ بٹن دبائے تاکہ کمرہ میں بجلی کی روشنی ہو جائے اس نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ دروازہ بڑے زور سے بند ہو گیا۔ پروفیسر نے کمرہ روشن کر کے چاروں طرف نظر ڈالی مگر نہ قیدی تھا نہ ریڈیم۔ اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی:
"کیا جناب اندر تشریف رکھتے ہیں؟"
پروفیسر: (محوِ استعجاب ہو کر) مارکھم تم ہو؟
میجر: جناب والا ہاں خاکسار حاضر ہے۔ آپ کی عمر کیا ہے؟
پروفیسر: تمہارا سر ہے۔
میجر: جناب پروفیسر صاحب برہم نہ ہوجیئے۔ آپ کی حرارت غریزی کتنے درجہ ہے؟ مقیاس الحرارت ٹیلیفون کے پاس ہے۔ براہ کرم زبان کے نیچے لگائیے اور جیب سے گھڑی نکال کر نبض کی رفتار بھی بتائیے۔
پروفیسر: نابکار۔ ملعون۔ چور۔ بدمعاش! تو ہمارا مذاق اڑاتا ہے؟
میجر: جناب عالی! آپ کی گفتگو پایۂ ثقاہت اور درجۂ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔

پروفیسر: ابے او پاجی سنتا ہے کہ نہیں اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں تجھے پولیس کے حوالہ کر دوں گا۔

مینیجر: جنابِ عالی پولیس یہاں کہاں۔ سوائے اس خاکسار کے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔

پروفیسر: ابے تو نے میرا ریڈیم کیا کیا؟

مینیجر: جنابِ والا! ریڈیم نہایت حفاظت سے میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کے حالات خوب اچھی طرح پڑھ لئے تھے۔ ایک سیسہ کی چھوٹی سی ڈبیا جس کے اندر سیسہ ہی کی ایک اور ڈبیا بند تھی اور دونوں فصل میں پارہ بھرا ہوا تھا میں اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ جب آپ نے مجھے مقید فرمایا ہے تو اس کے کچھ دیر بعد میں نے ریڈیم کو اس ڈبیا میں بند کر لیا تھا۔ اس ڈبیا کے باہر نہ اس کی شعاعیں نکل سکتی ہیں نہ حرارت اثر کر سکتی ہے۔ میرا وقت آپ سے باتیں کرنے میں نہایت عمدہ طور پر صرف ہوا۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ جناب کی خوشگوار باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی۔

پروفیسر: مارکھم تو اوّل درجہ کا چھٹا ہوا بدمعاش، بے ایمان اور گستاخ ہے۔ مجھے جلد حراست سے نکال ورنہ.....

مینیجر: جنابِ عالی ناراض نہ ہوجئے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوعِ انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ برٹش میڈیکل جرنل میں آپ کا جو مضمون طبع ہوگا میں اسے ضرور پڑھوں گا اور اس کی تردید میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالوں گا۔ اگرچہ میری نبض کی رفتار ۹۰ سے نہیں بڑھنے پائی اور حرارتِ غریزی ننانوے درجہ سے زیادہ نہ ہوئی۔ اگر میں آپ سے شرفِ مکالمت حاصل کرنے کی بجائے ریڈیم کو فوراً ڈبیا میں بند کر لیتا تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ لیکن جناب سے ایک فروگذاشت ضرور ہوئی کہ دروازہ کھلتے وقت جناب نے یہ خیال نہ فرمایا کہ جس بوتل کا آپ کاگ کھول رہے ہیں اس میں اُڑ جانے والا جوہر بند ہے۔ براہِ کرم کلکتے کے بلیک ہول کا تصور اپنے ذہنِ عالی میں رکھئے اور مجھے الوداع کہنے کی اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

(ترجمہ)

مولوی عنایت اللہ دہلوی

نجمُ السّحر

شہزادہ کوش اور سردار عمیس کی لڑائی

آج کل طیبی کے شہر میں دور دور کے نوجوان رئیس اور امیرزادے بڑی بڑی ریاستوں کے مالک فرعون کے مہمان ہیں۔ ان میں ہر ایک بادشاہ کی بیٹی نیطرطیہ سے عقد کی امید میں آیا ہے۔ یہ شہزادی وہی ہے جو نجم السحر، قرصِ خورشید، جمالِ حاسر، دختِ عمون کے خطابوں سے مشہور ہے۔ جلسوں اور ضیافتوں کا سلسلہ ایک مہینے سے جاری ہے۔ ہر ضیافت میں ان معزز مہمانوں میں سے صرف ایک مہمان خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے اور نیطرطیہ ملکۂ مصر وہاں موجود ہوتی ہے۔

ہر ضیافت کے ختم ہونے پر فرعون اور اس کے مشیرانِ سلطنت ملکہ کے پاس آتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ جس مہمان کو آج خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اس سے آپ اپنا عقد کرنا پسند کرتی ہیں یا نہیں۔ نیطرطیہ ہوشیار ہے۔ کسی کی نسبت صاف جواب نہیں دیتی اور اس طرح امیدواروں کی فہرست سے نام کٹتے چلے جاتے ہیں۔

نیطرطیہ حکم دیتی ہے کہ وہ تحریر جس میں اس کی والدہ احورہ کا خواب درج ہے ہیکل عمون سے طلب کر کے اس کے سامنے پڑھی جائے۔ جس وقت یہ تحریر پڑھی جاتی ہے تو اس جملہ پر کہ اس کا عقد صرف ایسے شخص سے ہو سکتا ہے جو شاہی خاندان سے ہو، سب کو توجہ دلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اب تک جس قدر امیدوار ضیافتوں میں اس کے سامنے پیش ہوئے چونکہ ان میں کوئی کسی شاہی خاندان کی یادگار نہ تھا اس لئے وہ رب عمون کے حکم کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔

مہمانوں میں بعض بڑے بڑے بادشاہوں کے ایلچی تھے۔ یہ بادشاہ اپنی سلطنتیں چھوڑ کر مصر میں نہ آسکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے سفیر شادی کا پیغام دے کر بھیجے تھے۔ ان کی نسبت نیطرطیہ نے جواب دیا کہ جب میں نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے کسی کو قبول کر لوں۔ جب تک وہ دربارِ مصر میں حاضر نہ ہوں میں ان کے پیغام کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔

آخر کار کم ہوتے ہوتے صرف ایک مہمان رہ گیا جس سے ملکہ واقف تھی۔ خود بادشاہِ مصر اور اس کے ندیموں کی مرضی تھی کہ اس مہمان سے نیطرطیہ کی شادی ہو جائے۔ یہ مہمان ولایتِ کوش کا شہزادہ اماثل نامی تھا۔ اس کے پیرانہ سال باپ کا تخت گاہ نباطہ کا شہر تھا جو طیبی سے جنوب میں واقع تھا جس ملک

میں یہ شہر تھا اس کی شکل ایک جزیرہ کی سی ہو گئی تھی۔ کیونکہ دریائے نیل نے اس کو تین سمتوں سے گھیر رکھا تھا۔ مشہور تھا کہ مصر کے بعد نباطہ اس وقت تمام دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز و شاداب خطہ ہے اور سونا وہاں اس کثرت سے ہوتا تھا کہ تانبے اور لوہے سے بھی ارزاں سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے جواہرات کی کانیں بھی وہاں بہت تھیں اور غلہ بکثرت پیدا ہوتا تھا۔

بہت قدیم زمانہ میں فراعنہ کا ایک خاندان جس کی اصل اسی شہر نباطہ سے تھی مصر کا بھی مالک رہ چکا تھا لیکن ایک مدت گذرنے کے بعد مصر کے لوگوں نے اس خاندان کو اس بنا پر کہ اس کی اصل ایک غیر ملک سے ہے اور وہ نوبیہ کی رسم و رواج مصر میں جاری کرنا چاہتا ہے، سلطنتِ مصر سے معزول کر دیا اور ایک فرمان بھی اس مضمون کا شائع کر دیا کہ اس نباطی خاندان کے کسی شخص کے سر پر کبھی مصر کا تاج نہ رکھا جائے۔ اسی معزول فرعونی خاندان کا سب سے آخری اور صحیح النسب رکن نیطرطیبہ کے ساتھ بچپن کا کھیلا ہوا رعمیس تھا۔

مصر کے لوگوں نے گو اس خاندان کو معزول کر دیا تھا لیکن دل میں ہمیشہ افسوس ہی کرتے رہے کیونکہ اس معزولی کے بعد نباطہ کا زرخیز ملک سلطنتِ مصر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ جب مصر سے یہ خاندان معزول ہوا تو نباطہ کے لوگوں نے مصر کی حکومت سے اپنے تئیں آزاد کرا لیا اور اس پرانے شاہی خاندان نے بھی بے تعلق ہو کر ایک نئے خاندان کو نباطہ کی سلطنت سپرد کر دی۔ اس نئے خاندان کا وارث اب اماثل شہزادۂ کوش تھا جس کا ذکر اوپر ہوا۔

اہلِ مصر کو اس کھوئی ہوئی دولت کا پھر خیال آیا اور انہوں نے سوچا کہ اگر ملکہ نیطرطیبہ کا عقد شہزادہ اماثل سے ہو جائے تو نباطہ کا ملک پھر سلطنتِ مصر کے قبضہ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ جب سے نیطرطیبہ پیدا ہوئی تھی، اس وقت سے تمام وزراء اور ہوا خواہانِ دولت یہاں تک کہ خود فرعون بھی اسی فکر میں رہا کرتا تھا۔ فرعون کو اس کا افسوس تھا کہ صرف لڑکی رکھتا ہے اگر لڑکا بھی ہوتا تو مصرِ قدیم کے رواج کے مطابق بھائی بہن کا عقد کر کے سلطنت کو اپنے ہی خاندان میں قائم کر دیتا۔ بہرکیف جس وقت نیطرطیبہ کا جشنِ تاجپوشی ہوا تو خفیہ خط و کتابت کر کے شہزادہ اماثل کو اس موقع پر مدعو کیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ اگر طیبی میں مستقل طور پر سکونت رکھنے کی شرط منظور ہے تو نیطرطیبہ کا اس سے عقد کر دیا جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اور لوگ بھی ملکہ سے شادی کا پیغام دے کر فرعون کے ہاں مہمان ہوئے تھے لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ ہم سب بساطِ شطرنج پر پیادے ہیں، بادشاہ اور فرزین کوئی اور ہی ہے۔

غرض جس شہزادہ کی نسبت تصفیہ ہو چکا تھا کہ ملکہ نیطرطیبہ کو اپنے دامِ محبت میں اسیر کرے وہ اماثل تھا۔ نیطرطیبہ کو اس کا علم تھا۔ آمشتی[1] اس کو پہلے سب باتوں سے آگاہ کر چکی تھی اور یہی وجہ ہوئی تھی کہ اماثل کے اندیشہ اور رعمیس کے عشق سے مجبور ہو کر اس نے عمون کو آسمان سے بلا کر اپنی قسمت کا حال پوچھنا چاہا تھا اور اس طرح حالتِ بے قراری میں عمون کی جناب میں بے ادبی کی مرتکب ہوئی تھی لیکن فرعون نے اماثل کا ذکر ابھی تک نیطرطیبہ سے نہیں کیا تھا اور نہ نیطرطیبہ نے ابھی تک اس شہزادے سے ملاقات کی تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ملکہ کے جشنِ تاجپوشی کے وقت اماثل بھیس بدل کر اسے دیکھنے آیا تھا کیونکہ اس کا قول تھا کہ ایک ملکہ نہیں ہزار ملکہ ہوں اگر میری پسند کی چیز نہ نکلی تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ بہرکیف اس موقعہ پر ضروری ہوا کہ وہ شادی سے پہلے نیطرطیبہ کو دیکھ کر پسند کرلے۔

اب چونکہ ملکہ مصر کو اس کی پوری جوانی اور حسن کی شان میں دیکھا تو اماثل نے اپنا اطمینان ظاہر کیا۔ کہنے کو فقط اطمینان تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ گرم ملک کا آدمی تھا، ملکہ کے حسن نے اس کے خون میں ایک آگ لگا دی اور اب سوائے اس کے کوئی آرزو نہ رہی کہ نیطرطیبہ اس کی ملکہ بنے۔

قصہ مختصر یہ طے پایا کہ شہزادہ اماثل اپنی آئندہ عروس نیطرطیبہ سے ملاقات کرے۔ چنانچہ شب کو ایک ضیافت غیر معمولی ساز و سامان کے ساتھ ایک بڑے عالیشان اور پرفضا باغ میں قرار پائی۔ اس باغ میں ہزارہا مشعلیں روشن کی گئیں اور ہر طرف میزیں بچھا کر ان پر پرتکلف اور خوش ذائقہ کھانے چنے گئے۔ نیطرطیبہ آئی مگر اپنے بشرہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس ضیافت کی غرض اسے معلوم ہے۔ ہر طرف تکلفات دیکھ کر فرعون سے پوچھنے لگی "بابا جان! وہ کون سا مہمان ہے جس کے لئے اس درجہ اہتمام ہوا ہے۔ وہ انسان ہے یا کوئی دیوتا؟"

---

[1] ملکہ نیطرطیبہ کی دایا۔

فرعون نے جواب دیا۔ ”بیٹی! یہ مہمان کوش کا شہزادہ ہے۔ اس کی رعایا بھی اسے اسی طرح خدا مانتی ہے جیسے ہماری رعایا ہم کو خدا سمجھتی ہے۔ یہ شہزادہ اس وقت اپنے ملک کا ولی عہد ہے لیکن جب وہ تخت پر بیٹھے گا تو دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہوگا۔“

نیطرطیبہ نے کہا۔ ”بابا جان! آپ نے کوش کا نام لیا۔ اس ملک پر تو اس زمانے میں ہم بادشاہی کرتے تھے۔“

فرعون نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا۔ ”بیٹی! ایک زمانہ میں یہ ملک ہمارا تھا۔ یا یہ کہو کہ کوش کے بادشاہ مصر پر بھی بادشاہی کرتے تھے لیکن میرے پردادا کے باپ کو جس وقت مصر کا ملک ملا تو اس وقت جو خاندان کوش پر مسلط تھا اس کو زوال ہو گیا اور اب اس خاندان میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ ایک مرتیس، ہیکل عمون کی فوج کا سردار، دوسرے اس کی بیوی آشتی جو ساحرہ ہونے کے علاوہ اب عمون کی کاہنہ بھی ہے اور تیسرا نوجوان رمیس تمہارا دودھ شریک بھائی، جو ہماری فوج میں ملازم ہے اور جو کسی زمانے میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور تمہیں یاد ہوگا کہ تالاب والے مگر مچھ سے اس نے تمہاری جان بچائی تھی۔“

نیطرطیبہ نے کہا۔ ”بابا جان خوب یاد ہے لیکن اگر یہی بات تھی تو پھر آج مرتیس کوش کا بادشاہ کیوں نہیں ہے؟“

فرعون نے جواب دیا۔ ”اس لئے نہیں ہے کہ نباطہ کے لوگوں نے ایک دوسرے خاندان کو کوش کا بادشاہ بنا لیا تھا اور اس خاندان کا وارث اب اماثل ہے۔“

نیطرطیبہ نے کہا۔ ”تو پھر یہ فرمائیے کہ اگر خون اور نسل کوئی چیز ہے تو یہ اماثل ایک غیر مستحق اور غاصب خاندان کا آدمی ہوا۔“

فرعون نے کہا۔ ”اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر آج مرتیس ہماری جگہ مصر میں فرعون ہوتا۔ بیٹی یہ باتیں منہ سے نکالنے کی نہیں ہیں۔“

نیطرطیبہ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور جب باغ میں باپ کے قریب تخت پر بیٹھنے لگی تو بہت بے پروائی سے پوچھا۔ ”کیا یہ کوش کا شہزادہ بھی ان لوگوں میں ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“

فرعون نے کہا۔ ”ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا خواہش رکھ سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس کا علم نہیں؟ دیکھو ان کے ساتھ مہربانی اور اخلاق سے پیش آنا۔ کیونکہ یہ طے پا چکا ہے کہ تمہاری شادی اس سے کی جائے گی۔ بس خاموش رہو۔ جواب کی ضرورت نہیں، شہزادہ آ رہا ہے۔“

فرعون کے اتنا کہتے ہی باجے اور تاشوں کی آواز باغ کے دوسرے سرے سے آنی شروع ہوئی اور آدمیوں کا ایک گروہ زرق برق لباس پہنے نظر آیا۔ ان میں کوئی ہاتھی دانت کا قرنا اور کوئی پیتل کے بڑے بڑے جھانج اور کوئی ڈھول جن پر منقش کے غلاف چڑھے تھے بجاتا تھا۔ یہ سب قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے باجے اور طبل بدستور بجاتے رہے۔ ان کے پیچھے پیچھے بیس حبشی جوانوں کا ایک دستہ تھا جو چوڑے چوڑے پھلوں کے برچھے اور کندھوں پر گینڈے کی کھال کی ڈھالیں جن پر طرح طرح کا کام بنا ہوا تھا لئے تھے۔ سب قبائیں پہنے تھے اور سروں پر چیتے کی کھال کی ٹوپیاں تھیں۔

ان سب کے بعد کوش کا شہزادہ آیا۔ یہ ایک بہت مضبوط، پستہ قد، چوڑے چکلے سینے کا جوان آدمی تھا۔ چہرے کا نقشہ موٹا اور بھدا تھا، اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں جن میں پتلیاں ہر وقت پھرتی تھیں۔ لباس بہت پرتکلف تھا اور خالص سونے کے توڑے اور ہار موتی موٹی لڑیوں کے جن کے قبضے اور قفل جواہرات کے تھے۔ بہت سے گلے میں پڑے تھے اور سر کی اونچی ٹوپی میں سیمرغ کا ایک بہت بڑا سفید پر لگا تھا۔ پیچھے پیچھے چند خادم تھے جو مورچھل جھلتے تھے اور عبا کے لمبے لمبے دامن دو نہایت کریہہ منظر سیاہ قوم کے بونے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ پوری عمر کے آدمی تھے مگر ان کا قد آٹھ برس کے بچے سے زیادہ نہ تھا۔

شہزادہ ابھی کچھ فاصلہ پر تھا نیطرطیبہ نے ایک نظر دیکھتے ہی اس کی طبیعت کا اندازہ کر لیا اور اس درجہ اسے نفرت پیدا ہوئی کہ کبھی کسی چیز سے نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد شہزادی کی نگاہ بلند شہ نشین سے جہاں تخت پر بیٹھی جلوس کرتی تھی شہزادہ اماثل کے سر کے اوپر سے گذرتی ہوئی ایک جگہ پر جمی اور یہاں شہزادہ اماثل کے پیچھے مصری سپاہ کا ایک بڑا خوبرو نوجوان افسر کھڑا تھا۔ نہایت سادے لباس پر فولاد کی زرہ پہنے تھا۔

کمر میں سنہرے قبضہ والی تلوار جو فرعون نے دی تھی، لگائے تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ رعمیس کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی رعمیس جو نیطرطیبہ کا دودھ شریک بھائی اور بچپن میں ساتھ کھیلا ہوا لڑکا تھا اور جس سے اب جوانی میں ملکہ کو عشق تھا۔ اس شریف و درازقامت جوان کا سیاہ فام شہزادۂ کوش سے مقابلہ کرکے نیطرطیبہ کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سُرخ ہو گیا۔ فرعون نے نیطرطیبہ کی یہ کیفیت دیکھی مگر اور درباریوں کی طرح وہ بھی یہ سمجھا کہ چہرہ پر رنگ کا تغیّر محض اس وجہ سے ہے کہ نیطرطیبہ نے آج پہلی ہی مرتبہ شہزادہ اماثل کو دیکھا ہے جو اس کا نوشہ بننے والا ہے۔

نیطرطیبہ کو اس وقت یہ حیرت تھی کہ رعمیس شہزادہ اماثل کے پیچھے ایک خدمتگار کی طرح کیوں کھڑا ہے۔ وہ کون بشر ہے جس نے رعمیس کو بھرے دربار میں ایک خادم کی حیثیت سے حاضر رہنے کا حکم دیا ہے۔ سمجھ گئی کہ بادشاہ کے حکم سے ایسا نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کو ان باتوں کی کیا خبر ہو سکتی تھی۔ یہ کارروائی کسی وزیر یا دربار کے ملازم کی ہے جس نے رشوت لے کر شہزادۂ کوش کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ رعمیس ایک قدیم تر خاندانِ شاہی کا رکن ہے اور انصاف سے دیکھا جائے تو اس وقت اس کو نہ صرف کوش کا بلکہ مصر کا بھی بادشاہ ہونا چاہیے تھا۔ پس رعمیس کو ذلیل کرنے کے لئے اس موقع پر اس کو اماثل کا خدمتگار بنایا گیا ہے۔

علاوہ اس کے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ملکہ اس رعمیس پر نظرِ الفت رکھتی ہے اور اس کی ماں کا دودھ بھی اس نے پیا ہے اس لئے ملکہ کی نگاہ میں رعمیس کو ذلیل کرنے کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ اماثل کے جلو میں رعمیس ایک معمولی سپاہی کی طرح اس کی جان کا محافظ ملازم بن کر ساتھ رہے۔

نیطرطیبہ نے یہ معمّہ ایک آن میں حل کر لیا اور فوراً دل ہی دل میں خدائے عمون کے سامنے اس کی قسم کھائی کہ جن لوگوں نے رعمیس کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے ان سے کبھی نہ کبھی سخت بدلہ لوں گی۔ نیطرطیبہ اپنی اس قسم کو کبھی نہ بھولی۔

اب شہزادہ اماثل نے شہ نشین پر پہنچ کر فرعون اور ملکہ کو تعظیم دی اور دونوں کے جواب کا متوقع ہوا۔ فرعون نے چند منتخب اور برمحل جملے اماثل کے خیر مقدم میں کہے اور جس قدر القاب و آداب وہ رکھتا تھا ان سب کو بیان کرکے اس سے خطاب کیا اور تقریر میں ان تعلقات کی طرف بھی اشارہ کیا جنھوں نے سلطنتِ مصر اور کوش کو قدیم زمانہ میں متحد و وابستہ کر رکھا تھا، اور امید ظاہر کی کہ وہی دیرینہ تعلقات ان دونوں سلطنتوں میں اب اور بھی زیادہ قرابت پیدا کر دیں گے۔

فرعون نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی نیطرطیبہ کی طرف دیکھا۔ ملکۂ مصر ہونے کی وجہ سے اس کو بھی اس موقع پر کچھ کہنا ضروری تھا۔ چنانچہ ایک تقریر پہلے سے لکھ کر شہزادی کو پیش کر دی گئی تھی اور اس وقت وہ کاغذ اس کے سامنے تھا۔ ملکہ کو یہ بھی یاد تھا کہ اس کو پڑھ کر سُنانا ہے لیکن اس نے نہ اس کاغذ کو اٹھایا اور نہ اس کو پڑھا بلکہ منہ پھیر کر ایک خواص کو حکم دیا "ہماری الماس کی پنکھیا حاضر کرو۔"

اماثل نے کچھ دیر انتظار کیا کہ ملکہ کچھ کہے گی لیکن جب اس کو خاموش اور بے توجہ پایا تو اپنا جواب شروع کر دیا جسے ازبر کر رکھا تھا۔ پہلا ہی فقرہ اس جواب کا یہ تھا کہ "جس طرح بارانِ رحمت صحرا میں پھول کھلا دیتا ہے اسی طرح ملکہ نیطرطیبہ کے شیریں الفاظ نے اس کے دل کو اس وقت ایک گلزار بنا دیا ہے۔" لیکن واقعہ یہ تھا کہ نیطرطیبہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔ اب جو ملکہ نے اپنی پنکھیا کی اوٹ سے دور نگاہ کی تو رعمیس کے چہرے پر ایک تبسّم دیکھا اور دربار کے چند معززین بھی اماثل کے بے محل فقرے پر بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن فوراً ہنسی چھپانے کو سر نیچے کر لئے۔

اماثل کوئی جملہ غصّہ کا منہ ہی منہ میں کہہ کر اپنے ملازموں کی طرف متوجہ ہوا اور حکم دیا کہ جو تحائف ہم ساتھ لائے ہیں وہ پیش کئے جائیں۔ ملازموں نے فوراً تحائف حاضر کئے، ان میں نہایت نادر صنعت کے خوبصورت سونے کے ظروف، شیروں اور ہاتھیوں کی نہایت وزنی خالص سونے کی مورتیں، عود روشن کرنے کے مرصّع برتن تھے۔ شہزادے نے یہ نادر چیزیں اپنی طرف سے اور اپنے بادشاہِ کوش کی طرف سے پیش کیں اور بہت ہی غرور اور نخوت کے لہجہ میں کہا کہ "ان چیزوں کا شمار ہمارے ملک میں بہت معمولی چیزوں میں ہے۔ ایسے ہی اور بہت سے تحائف میں اپنے ساتھ لانے والا تھا مگر خواہ مخواہ وزن بڑھانے کے خیال سے نہیں لایا۔"

فرعون نے اماثل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مصر بھی مفلس ملک نہیں ہے۔ چنانچہ کل آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا۔ اس کے بعد شہزادے نے ملکہ نیطرطیبہ کو خاص طور پر چند تحائف اپنی طرف سے پیش کئے۔ ان میں مرصّع گلوبند، جس میں الماس، یاقوت اور زمرّد جڑے ہوئے تھے، اور قیمتی موتیوں کے ہار تھے اور ان کے علاوہ ایک بے نظیر صنعت کا خوبصورت چنگ تھا جس پر سونے کے تار کھچے ہوئے تھے اور جس کی مجموعی شکل ایک نہایت خوش رو عورت کی سی بنائی تھی۔ یہ تحفہ شہزادے نے نیطرطیبہ کو اس خیال سے نذر میں پیش کیا کہ موسیقی کے ساز بجانے اور خوش نوائی میں ملکۂ مصر کا ہمسر کوئی نہ تھا۔ اور یہ کمال ربِ عمون کے خاص عطیات میں سے تھا جو اس حسین ملکہ کو ملے تھے۔ اس عجیب و غریب چنگ کے ساتھ شہزادے نے دو حبشی لونڈیاں بھی پیش کیں۔ یہ نہایت قیمتی زیور پہنے تھیں اور مشہور تھا کہ نباطہ کے ملک میں ان سے بہتر گانے والا نہ تھا۔

فرعون نے ان تحفوں کو ملاحظہ کرکے بیٹی سے کہا کہ موتیوں کے ہاروں میں سے کوئی اچھا سا ہار اپنے گلے میں ڈال لو۔ نیطرطیبہ نے عذر کیا کہ میں اس وقت سپید لباس پر کاسنی رنگ کے پھول پہنے ہوں۔ ان ہاروں کا رنگ اس لباس پر نہیں کھلے گا۔ غرض نیطرطیبہ نے کوئی ہار اپنے گلے میں نہ ڈالا اور بجائے اس کے شہزادۂ کوش کا شکریہ بہت پُرتکلف الفاظ میں جن میں سرد مہری شامل تھی ادا کیا اور تمام تحفوں پر ایک نظر ڈال کر آشتی سے کہا کہ ان سب چیزوں کو ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا جائے کیونکہ خوشبوئیں جو ان چیزوں پر چھڑکی گئی ہیں ان سے دماغ پریشان ہوا جاتا ہے۔ جب تحفے وہاں سے ہٹائے جانے لگے تو ملکہ نے بہت بے اعتنائی سے کہا کہ وہ چنگ البتہ جہاں رکھا ہے وہیں رہنے دیا جائے۔ ضیافت جو بہت ہی نامبارک ساعت میں شروع ہوئی تھی، جاری رہی اور اماثل نے قبرص کی شیریں شراب کثرت سے پینی شروع کردی۔ رعمیس کو جو اس کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا، بار بار حکم ہوتا تھا کہ جامِ شراب خالی نہ رہنے پائے۔ معلوم نہیں یہ فرمائش محض اس وجہ سے تھی کہ رعمیس اس کے پاس کھڑا تھا یا نیت یہ تھی کہ اسے حکم دے کر اس مجمع میں اسے ذلیل کیا جائے۔ نیطرطیبہ کو اس کا مطلق علم نہ تھا کہ اماثل رعمیس سے کیا خدمت لے رہا ہے۔ مگر رعمیس کو سوائے حکم برداری کے کوئی چارہ نہ تھا۔ گو بھرے دربار میں شراب کے پیالے بھر بھر کر دوسرے کو دینے ایسے شخص کا کام نہ تھا جو مصر میں رئیس اور نواب کا خطاب رکھتا ہو اور فرعون کی محافظ فوج کا خصوصی سردار ہو۔

جس وقت خواصیں زرق برق لباس اور سونے کے جوڑے ہاتھوں میں پہنے، دسترخوان اٹھانے کو آئیں تو بڑے بڑے بھان متی دربار میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ ایک تماشہ یہ دکھایا کہ ایک بڑے خوبصورت اونچے ظرف کے منہ سے ملکہ نیطرطیبہ کی تصویر برآمد ہوئی جس کی پیشانی پر ایک چمکتا ستارہ اور سر پر تاجِ شاہی رکھا تھا۔

اب ان بازیگروں نے جس طرح ملکہ نیطرطیبہ کی تصویر ظرف سے نکالی تھی اسی طرح شہزادۂ کوش کی تصویر بھی نکالنی چاہی لیکن خاتون آشتی جو جادو میں ان کی بھی استاد تھی ملکہ کی کرسی کے پیچھے کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اس نے فوراً اپنے جادو کے زور سے ان بازیگروں کو غلطی میں ڈال دیا۔

چنانچہ ظرف کے منہ سے بجائے شہزادہ کی تصویر کے جس کا نام لے کر یہ بازیگر زور زور سے کہتے تھے کہ "اے تصویر نکل" ایک بندر کی صورت برآمد ہوئی جس کے سر پہ تاج رکھا تھا اور تاج میں سیمرغ کا ایک بہت بڑا پر لگا تھا۔ بندر کی صورت بھی ایسی تھی جو شہزادہ اماثل سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اب یہ بندر کی شکل مٹکے کے منہ پر بیٹھی کچکیاں باندھ باندھ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ پھر دفعتاً مٹکے کے منہ سے نیچے گر کر غائب ہو گئی۔ اس تماشے کو دیکھ کر بعض لوگ ہنسے اور بعض چپ رہے لیکن فرعون کی پیشانی پر بل آگئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا یہ حرکت کسی انسان کی پیش بندی کا نتیجہ ہے یا خداؤں کی طرف سے کوئی نحس علامت ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ پریشان ہو کر اماثل کی طرف دیکھنے لگا لیکن اماثل کثرت سے شراب پی کر نیطرطیبہ کی صورت دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ اس کو کسی بات کا بھی ہوش نہ ہوا۔ اماثل کی نظر نیطرطیبہ کی طرف تھی اور نیطرطیبہ اس طرح اونچی نگاہ کئے ہوئے تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھ رہی ہے۔ بازیگروں نے جب دیکھا کہ ان کا کام بگڑ گیا تو وہ جان کے خوف سے بھاگے اور حیرت میں تھے کہ وہ کون ساحر یا دیو تھا جس نے آکر ان کے تماشے کی صورت بدل دی۔

جب بھان متی اور بازی گر اٹھ کر بھاگے تو ناچنے والیوں کا طائفہ آیا۔ اماثل کوش کا شہزادہ نیطرطیبہ کی طرف اسی طرح نظر جمائے دیکھ رہا تھا کہ ملکہ گھبرائی

جاتی تھی۔ آخر کار اس نے ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ حبش کی جو گانے والیاں تحفہ میں پیش ہوئی ہیں ان کو بلایا جائے۔ سنا ہے کہ وہ بہت ہی خوش آواز ہیں۔ عورتیں فوراً ہی اپنے اپنے سازلے کر حاضر ہوئیں اور بہت خوبی سے گانے بجانے لگیں۔ جب ان کا گانا ختم ہوا تو نیطرطیبہ نے کہا "ہم تمہارا گانا سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس کا انعام یہ دیا جاتا ہے کہ آج سے تم دونوں آزاد ہو۔ اگر ہمارے پائے تخت طیبی میں تم لوگ سکونت اختیار کرو تو کبھی کبھی دربار میں حاضر ہو کر گانا سنانے کی خدمت پر تم کو مامور کرتے ہیں۔"

اتنا سن کر وہ دونوں گانے والیاں پیشانی زمین پر رکھ کر ملکہ کو ہزاروں دعائیں دینے لگیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ غلامی سے نجات پاکر وہ اپنے فن سے بہت دھن دولت کما لیں گی۔ حاضرین دربار نے جب ان کے گانے کی تعریف ملکہ کے منہ سے سنی تو اپنے گلوں سے قیمتی ہار اور ہاتھوں سے جواہرات کی انگوٹھیاں اتار اتار کر ان گانے والیوں کی طرف پھینکیں اور تھوڑی سی دیر میں ان عورتوں نے جو اب تک لونڈیوں کی حیثیت رکھتی تھیں، اتنی دولت پیدا کر لی کہ اس سے پہلے ان کے خواب وخیال میں بھی نہ آسکتی تھی لیکن اماتل کو نیطرطیبہ کی اس بات پر کہ ان لونڈیوں کو آزاد کر دیا، غصہ آیا اور وہ کہنے لگا:

"کوئی اور ہوتا تو اس نادر تحفے کو کہ دنیا کی بہترین گانے والیاں پیش کی گئی ہیں کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا۔"

یہ فقرہ سن کر نیطرطیبہ نے پہلی مرتبہ اماتل سے مخاطب ہو کر کہا "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان خوش آواز عورتوں سے بہتر گانے والیاں دنیا میں نہیں ہیں؟ آپ کے اس خیال سے جرأت ہوتی ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت مجھے آتا ہے سناؤں تاکہ مجھے معلوم ہو کہ دنیا کی بہترین گانے والیوں سے میں کس بات میں کم ہوں۔" اتنا کہتے ہی نیطرطیبہ نے چنگ اٹھایا۔ تاروں کو الماس کی مضراب سے چھیڑا اور پھر اس کی کھونٹیوں کو مروڑ کر سُر ملائے اور اس مصروفیت میں اپنی نگاہیں شہزادے کی طرف متوجہ رکھیں۔ یہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ "ہماری مثل کوئی دوسرا صاحبِ کمال ہو تو بتایئے۔"

فرعون نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا "نورِ چشم! یہ نہایت سبک حرکت ہوگی کہ تم ملکۂ مصر ہو کر مجمع عام میں گانا سناتے بیٹھو۔"

نیطرطیبہ نے جواب دیا "بابا جان! اس میں کوئی بات خفیف ہونے کی نہیں ہے۔ آج ہم بادشاہِ کوش کے فرزند اور ولی عہد کی تعظیم وتکریم کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ فرعون اس کی خاطر ومدارات میں مصروف ہے۔ فرعون کی بیٹی اس کے تحائف قبول کر چکی ہے۔ جملہ اعیانِ دولت اس کی خدمت میں گردو پیش حاضر ہیں۔" اتنا کہہ کر نیطرطیبہ کچھ رکی مگر پھر بہت صاف آواز میں کہا "اور ایک شخص جو شرافتِ نسب کے اعتبار سے شہزادہ اماتل سے بھی قدیم تر خاندانِ شاہی کا رکن ہے، اس کو بادہ بردار بنا کر شہزادہ کے پیچھے ایک خدمتگار کی طرح کھڑا کیا گیا ہے اس کے بزرگوں نے ایک زمانے میں وہ سلطنت قائم کی تھی جس پر شہزادۂ کوش کا باپ آج مسلط ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رمیس کی طرف اشارہ کیا جو اماتل کے قریب جامِ شراب لئے ایک ادنیٰ نوکر کی طرح حاضر تھا۔ ملکہ نے پھر کہنا شروع کیا "جب یہ کیفیت ہو تو پھر ملکۂ مصر ایسے مہمان کو خوش کرنے کے لئے جو تکلیف بھی گوارا کرے وہ محلِ اعتراض نہیں، میرے پاس تو کوئی اور تحفہ بھی سوائے اپنی خوش گلوئی کے پیش کرنے کو نہیں ہے۔"

اس دلیرانہ اور صاف تقریر پر سب دم بخود رہ گئے۔ ہر شخص اس گفتگو کا مطلب سمجھ گیا اور ملکہ نیطرطیبہ نجم السحر اپنے تخت سے اٹھی اور چنگ کو اپنے زرخیز سینے سے لگا کر اس پر جھکی۔ سر پر مصر کا تاج تھا جس میں سونے کا سانپ اس طرح پھن اٹھائے تھا کہ اب کسی کو ڈسا۔ ملکہ نے چنگ بجانا شروع کیا۔ انگلیوں میں اس غضب کا جادو بھرا تھا کہ ایک آن میں حاضرین کو سوائے چنگ کی آواز کے اور کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ شروع میں آواز ہلکی اور کمزور تھی پھر بتدریج اس کی گمک اور گونج بڑھتی گئی یہاں تک کہ سریلی صدائیں تمام فضا میں گونجنے لگیں۔ جب راگ پوری قوت پر آیا تو آواز ملائی۔ کبھی لحنِ لطیف شیریں میں اور کبھی نوائے مستانہ وزالہ بار میں اس طرح محوِ ترنم ہوئی کہ آسمان کے ستارے بھی متوجہ معلوم ہونے لگے اور زمین سے نغمہ بلند ہو کر ماہ وانجم کے دلوں پر نشتر کا کام کرنے لگا۔

ملکہ نے جو کچھ گایا تھا وہ عشق ومحبت کی ایک داستان تھی جس کا مضمون صرف اتنا تھا کہ ربۃ حاسر کے بت خانے کی ایک بڑی عالی مرتبہ نوجوان کاہنہ کو ایک غریب خطاط سے عشق ہو گیا ہے اور یہ مرد بھی اس کی محبت میں دیوانہ ہے ـــــــــ لیکن دونوں کی حالت میں ایسا تفاوت ہے کہ وہ

شادی نہیں کر سکتے۔ رفتہ رفتہ عاشق پر محبت کا ایسا جنون سوار ہوتا ہے کہ رات کے وقت ٹھوکریں کھاتا ہوا معشوقہ کی تلاش میں بت خانے کے حرم میں داخل ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کی صورت دیکھنی نصیب ہو جائے۔ ربّہ حاسر اس کی یہ جسارت دیکھ کر اس قدر برہم ہوتی ہے کہ فوراً اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اتفاق سے اسی وقت وہ نوجوان کاہنہ بھی حرم میں یہ دعا مانگنے آتی ہے کہ کسی طرح ضبطِ عشق کی قوت اس میں پیدا ہو جائے۔ چلتے چلتے یکایک عاشق بے جان کی لاش سے ٹھوکر کھا کر فوراً اس کی صورت پہچان لیتی ہے اور عاشق کو مُردہ دیکھ کر خود بھی وہیں جان دے دیتی ہے۔ ربّہ حاسر جو عشق کی دیوی تھی اس منظر حسرت ناک کو نہ دیکھ سکی، دل میں رحم آیا۔ مُردہ عاشق و معشوق کو دوبارہ زندگی بخشی مگر یہ منظور نہ کیا کہ وہ اس دنیا میں رہیں، فوراً ان کو تحت الثریٰ میں بھیج دیا جہاں یہ دونوں موت کی نیند سے بیدار ہو کر بغل گیر ہوتے ہیں اور اب تک نہایت خوش و خرم دوسرے عالم میں زندہ ہیں۔

اس پُرانے قصّے کو سب لوگ بار بار سن چکے تھے مگر گانے میں، وہ بھی اس خوش الحانی کے ساتھ کسی نے نہ سُنا تھا۔ جس وقت ملکہ کی صاف ستھری پیاری آواز ہلکی موجوں کی طرح ہوا میں حرکت کرتی ہوئی سامعین کے سروں پر سے گذری تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ عاشقِ زار خوف سے لرزاں مگر امید کی دست گیری سے بت خانے کے حرم میں قدم رکھتا ہے اور ربّہ حاسر عاشق کی اس بے ادبی پر غضب ناک ہو کر کس طرح اس کو چشم زدن میں ہلاک کر کے سرد کر دیتی ہے۔ اس نور کے گلے نے تصویر کھینچ دی کہ کس طرح خوبصورت کاہنہ ہاتھ میں چراغ لئے عاشقِ بے جان کو دیکھتے ہی گر کر اس کے ماتم میں اپنی جان کھو دیتی ہے اور اب چنگ کی نوائے روح پرور کو سنتے سنتے سامعین کی آنکھوں میں یہ نقشہ بندھتا ہے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر عاشق و معشوق کی لاشوں کو کندھوں پر اٹھائے دنیا کی سرحدوں سے گذر رہے ہیں۔

چنگ کی دلآویز صدائیں نہایت تیزی سے یکایک بلند ہوئیں۔ سُننے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے مضمون نے ان کی آنکھوں کے سامنے بہشتِ بریں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں اور چشمِ تصوّر نے دیکھا کہ عاشق و معشوق موت کی نیند سے جاگے ہیں اور ایک فوری تحیّر کے مٹتے ہی فرطِ مسرت سے ایک دوسرے کو لپٹ گئے ہیں کہ اتنے میں نور کی ایک شعاعِ گلگوں نے ان دونوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اور اس پردۂ نور سے اب عشق کی ماتی کاہنہ نے خدا کی تعریف شروع کی ہے۔ اس نوائے جانفزا نے سب پر ایک محویت طاری کر دی۔ اس حالت میں کچھ دیر کے بعد ملکہ کی آواز رفتہ رفتہ نحیف و ناتواں ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس روحانی عالم کی فضائے ساکت میں اس کی آخری صدائے بازگشت بھی معدوم ہو گئی۔ بنطرطیہ نے نغمہ بند کیا۔ چنگ جس کے تار ابھی تک لرز رہے تھے ایک طرف رکھ دیا اور خود خستہ حال ہو کر ہاتھ پاؤں پر لرزہ تختِ زرنگار کی پشت سے سہارا لے کر آرام کرنے لگی۔ زرد مہتاب سے چہرہ پر نیلگوں آنکھیں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ کل دربار سکوت کے عالم میں تھا۔ نغمہ کا اثر سننے والوں کے دلوں پر ابھی تک باقی تھا۔ نہ کوئی لب ہلا سکتا تھا، نہ کسی میں تابِ جنبش تھی۔ سب جانتے تھے کہ بنطرطیہ رب عموں کی لختِ جگر ہے جو گانا اس وقت سُنا وہ ملکہ کا نہیں ہے بلکہ عرش کی کوئی دیوی آکر اپنا نغمہ سُنا گئی ہے۔

اہلِ دربار اس طرح بیٹھے تھے کہ گویا عالمِ خواب ان پر طاری ہے۔ لیکن ان کی نگاہیں ملکہ کے زرد چہرے اور روشن آنکھوں کی طرف جمی تھیں۔ اماثل بھی ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ شراب اور عشق دونوں کے نشے میں چُور ہے۔ لیکن جن خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے وہ کسی اور طرف متوجہ ہیں اور اماثل سے ایسی بے پروا ہیں گویا وہ انسان نہیں پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔ ملکہ کی شعاعِ نظر نے اس سے گذر کر کسی اور ہی کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔

اماثل نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ملکہ کی نظر کس طرف ہے، گردن پھیری، فوراً معلوم ہو گیا کہ جو نوجوان افسر اس کی بادہ برداری کی خدمت پر حاضر ہے ملکہ کی نظر اسی کی طرف ہے اور یہ افسر وہی ہے جس کی نسبت ملکہ کہہ چکی ہے کہ نسل و خاندان کے اعتبار سے وہ اماثل سے زیادہ شریف اور قدیم ہے اور اس کے بزرگ ایک زمانے میں اس سلطنت کے مالک تھے جس پر آج اماثل کا باپ حکمراں ہے۔ اماثل کو یہ بھی معلوم ہوا کہ عمیس بھی ملکہ کی طرف اسی طرح دیکھ رہا ہے کہ گویا کسی سحر اور افسوں نے اس بات پر مجبور کر رکھا ہے۔ عمیس کے چہرے پر جو کیفیت اس وقت تھی وہ ایسی تھی کہ اماثل جیسے

شرابی اور خونخوار حبشی نے بھی اسے پہچان لیا۔

رعمیس سونے کا ساغر بادۂ سُرخ سے لبریز ہاتھ میں لئے اماثل کے قریب کھڑا تھا۔ اماثل نے اپنی کرسی دفعتاً اس طرح کھسکائی کہ اس کی پشت ساغر میں لگی۔ ساغر رعمیس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس طرح چھوٹا کہ سُرخ شراب شہزادے کے لباس پر گری اور وہ سر سے پاؤں تک خون میں رنگا ہوا معلوم ہونے لگا۔ یہ دیکھتے ہی اماثل جھلّا کر کرسی پر سے اٹھا اور کہنے لگا:

" اے کتّوں کی نسل کے غلام زادے! مادۂ خنزیر کے خوک صورت بھائی! کیا بادشاہوں کی خدمت میں حاضر رہنے کا یہی طریقہ ہے؟" یہ کہہ کر رعمیس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور اس کو قتل کرنے کے لئے تلوار سونت لی۔

رعمیس بھی کمر میں تلوار باندھے تھا اور یہ تلوار وہی سونے کے قبضہ والی تھی جس پر مگرمچھ کی شکل بنی ہوئی تھی اور جو فرعون نے اسے انعام میں دی تھی۔ اور جسے دیکھ کر ساحرہ آشتی نے کہا تھا کہ اس پر کسی بادشاہ کے خون کی بوندیں نظر آتی ہیں۔ اس توہین پر رعمیس دیوانہ ہو گیا اور اس نے بھی فوراً تلوار کھینچ لی۔ اماثل نے وار کیا۔ رعمیس اس سے پہلے ہی شہ نشین سے کود کر نیچے کھلی جگہ میں آ گیا جو ناچ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ اماثل اس کو نامرد اور بزدل کہتا ہوا خود بھی نیچے آیا اور اب دربار کے اس عالیشان کمرے میں نغمہ و سرود کی جگہ فولاد ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔

حاضرینِ دربار خوف و حیرت سے فرعون کی طرف دیکھنے لگے اور منتظر ہوئے کہ دیکھئے بادشاہ کیا حکم دیتا ہے۔ لیکن فرعون اس خوفناک منظر کو دیکھ کر یا تو غش کھا گیا یا تخت کی پشت سے کمر کو سہارا دے کر آنکھیں بند کئے اس طرح بیٹھا کہ گویا سو گیا۔ جب بادشاہ کی یہ کیفیت سب نے دیکھی تو لوگ ملکہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ شاید وہ کوئی حکم دے لیکن وہ بھی خاموش رہی۔ لب سے لب جُدا تھا اور حیرت میں تھی کہ دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔

رعمیس کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہ تھا، بجز اس کے کہ اہلِ سیف اور شاہانِ سلف کی یادگار ہو کر وہ ایک بدخو سیاہ رو حبشی کے ہاتھ سے طمانچہ کھانا کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔ رعمیس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور اب اس کی آنکھوں نے جن میں خون اُتر آیا تھا ایک بار خونی رنگ میں نیطرطیبہ کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھا کہ فتح و فیروز مندی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ملکہ کی نگاہ دیکھتے ہی رعمیس نے اماثل کی گردن پر جھپٹ کر ایسا وار کیا جیسے جنگل کا شیر جست کر کے شکار پر اپنا چنگل چلائے۔ لیکن ہاتھ گردن سے اونچا پڑا اور اماثل کے تاج کا ایک پر کٹ کر اڑتا ہوا زمین پر گرا۔ اماثل بھی تلوار کا دھنی تھا اور اس وقت طاقت بھی اس میں حالتِ جنون کی سی پیدا ہو گئی تھی اور تلوار بھی اس کی رعمیس کی تلوار سے زیادہ لمبی تھی۔ اماثل کا وار رعمیس کی زرہ نے روکا اور وہ پیچھے ہٹا۔ اماثل کی دوسری ضرب رعمیس کے شانہ پر پڑی اور شانہ سے اچٹ کر گھٹنے پر آئی۔ اماثل نے تیسرا وار کیا جس نے رعمیس کی ران پر زخم پہنچایا اور خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کہ رعمیس کے دستۂ فوج کا ایک سپاہی للکارا تاکہ اپنے افسر کی ہمت بڑھائے۔ اس پر اماثل سے اس کے حبشی سردار چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ اس دشمن سوّر کا گلا کاٹ دیجئے۔

رعمیس زخم کھا کر ہوشیار ہوا۔ جھک کر ایک دفعہ دشمن پر جھپٹا۔ تلوار کا ایک ہاتھ لگایا۔ وار ٹھیک پڑا تھا لیکن اماثل کی زرہ نے اسے بے کار ثابت کیا۔ رعمیس نے پھر طیش میں آ کر ایک ہاتھ مارا اور اب اماثل کا خون بہتے ہوئے سب نے دیکھا۔ اماثل نے بھی وار کیا۔ رعمیس جھک گیا اور وار خالی گیا اور اسی حالت میں یک لخت اچھل کر پوری طاقت سے دشمن کے سینے میں اپنی تلوار بھونک دی، اس طرح کہ اس کی نوک پشت سے باہر نکل آئی۔ ایک لمحہ کے لئے اماثل کھڑا رہا۔ پھر دفعتہً زمین پر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

اتنا دیکھتے ہی حبش کے فوجی سردار ہاتھوں میں برچھے تول تول کر اپنے شہزادے کے خون کا بدلہ لینے رعمیس کی طرف بڑھے۔ رعمیس مجبور رہا، دوڑ کر اپنے دستۂ فوج میں چلا گیا۔ حبشی فوراً اس دستہ پر ٹوٹ پڑے اور اب شدت سے ہنگامۂ قتل برپا ہوا۔ حبش کے سپاہیوں اور فرعون کے فوجیوں میں باپ دادا کے وقت سے جانی دشمنی چلی آئی تھی۔ فریقین میں کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا نہ تھا۔ فوج محافظ کے سرداروں کے سوا باقی اہلِ دربار میں کوئی مسلح نہ تھا۔ خوں ریزی سخت ہوئی۔ حبش والوں کا اب کوئی سردار نہ تھا اور رعمیس کے ساتھ اس وقت طیبی کے مشہور جنگ آزما موجود تھے۔

آخر کار حبشیوں میں کوئی کاری زخم کھا کر یہاں گرا کوئی وہاں، آخر میں صرف تین آدمی زندہ بچے اور انہوں نے ہتھیار پھینک کر امان طلب کی۔ اب رعمیس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا کیا۔ سر جھکائے خون آلودہ تلوار ہاتھ میں لئے شہ نشین کی سیڑھیوں پر چڑھا اور تخت فرعون کے سامنے زمین بوس ہو کر عرض کیا:

"شاہا! میں نے اپنی بے عزتی اور دولتِ مصر کی توہین کا انتقام لیا۔ اب میرے قتل کا حکم ہو۔"

لیکن بادشاہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس پر ابھی تک غشی کی حالت طاری تھی۔ یہ دیکھ کر رعمیس ملکہ نیطرطیبہ سے مخاطب ہو کر عرض کرنے لگا۔

"ملکہ عالم! میرے قتل کا حکم صادر فرمائیں۔"

نیطرطیبہ اس وقت تک پتھر کی مورت بنی یہ کل حالات دیکھتی رہی تھی۔ رعمیس کی درخواست سن کر قالبِ بے جان میں کچھ جان آئی۔ شروع سے جس بات کا خوف تھا وہ دور ہوا اب کون اس کو اس کالے حبشی سے شادی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ رعمیس نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا' سامنے شاہی لباس میں اس کا مردہ جسم پڑا تھا اور گرد اس کے حبشی سرداروں کی لاشیں جیسے جنگل میں درخت کٹے پڑے ہوں' پھیلی تھیں۔ مقتضائے بشریت یہی تھا کہ نیطرطیبہ ایک مصیبت سے نجات پانے پر رعمیس کو دل میں دعائیں دینے لگی۔

(ترجمہ)

خواجہ منظور حسین

شام کا جھٹپٹا، گیلی برف کے بڑے بڑے گالے بازار کے لیمپوں کے جو ابھی جلائے گئے ہیں، ارد گرد دھیمی رفتار سے گھوم رہے ہیں، چھتوں پر گھوڑوں کی پیٹھ پر، بازوؤں پر، ٹوپیوں پر برف کی نرم تہ جمی ہوئی ہے۔ گاڑی بان ایونا، بھوت کی طرح سفید براق، کوچ بکس پر بے حس و حرکت گٹھڑی بنا بیٹھا ہے۔ اس سے زیادہ جھکنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر برف کے تودے کے تودے اس پر آ پڑیں تب بھی انہیں جھٹکنا ضروری نہیں سمجھے گا۔ اس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی، سفید و ساکت ہے۔ اس کے مسکوت جسم کے پیچ و خم اور بانس کی سی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اس پٹکے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس غریب کو ہل کھرے، ان ٹیالے مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں، زبردستی چھڑا کر اس جنجال میں پھنسا دیا جائے جہاں ڈراؤنی روشنیاں، غل غپاڑہ، لوگوں کی لگاتار ان تھک دوڑ دھوپ ہو، وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے۔

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہلے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دوپہر سے پہلے نکلے تھے اور اب تک ایک سواری نہیں ملی۔ شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے، بازار کے لیمپوں کی دھندلی روشنی تیز ہو رہی ہے اور سڑک کا شور و شغب بڑھ رہا ہے۔

"وائی برگ اسکایا کے لئے گاڑی!" ایونا کے کان میں آواز آتی ہے "گاڑی!"

ایونا چونک پڑتا ہے اور اپنی برف سے ڈھکی ہوئی پلکوں میں سے ایک افسر کو دیکھتا ہے جو بڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے "وائی برگ اسکایا کو۔"

افسر پھر کہتا ہے "سو رہے ہو؟ وائی برگ اسکایا کو۔"

افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے۔ برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور پٹھوں پر سے ہوا میں اڑتے ہیں۔ افسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاڑی بان گھوڑے کو للکارتا ہے، بط کی طرح گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں ہے مگر عادت کے مطابق چابک چٹخاتا ہے۔ گھوڑی گردن آگے کو نکالتی ہے، اپنی بانس کی سی ٹانگیں سکیڑتی ہے اور بادلِ ناخواستہ چلنے لگتی ہے۔

تاریکی کے انبار میں سے جو اس کے سامنے ادھر سے اُدھر گردش کر رہا ہے۔ ایونا کے کان میں چیخوں کی آواز آتی ہے "یہ شیطان کہاں گھسا چلا آتا ہے، کدھر بلا پڑتا ہے۔ د—— دائیں کو چل۔"

"تمہیں چلانا نہیں آتا۔ دائیں کو چلاؤ" افسر بگڑ کر کہتا ہے۔

ایک کوچوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے، اسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک راہ گیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے رگڑ کھاتے ہیں وہ اس کی طرف غصہ کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہے۔ ایونا کبس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے جیسے کانٹوں پر ہے۔ کہنیاں ہلاتا ہے اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ کہاں ہوں اور جہاں ہوں کیوں ہوں۔

"یہ سب لوگ کتنے بدمعاش ہیں" افسر ازراہ تمسخر کہتا ہے۔ "پوری کوشش کرتے ہیں کہ تمہارے راستے میں حائل ہوں یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں۔ ضرور جان بوجھ کر یہ شرارت کرتے ہیں"

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہے۔ بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر سوائے سوں سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

"کیا کہا؟" افسر پوچھتا ہے۔

ایونا کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے اور گلے پر زور ڈال کر روکھی آواز سے بمشکل یہ لفظ ادا کرتا ہے "میرا لڑکا...... میرا لڑکا اس ہفتے گذر گیا حضور!"

"ہوں! کیا شکایت تھی؟"

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے:

"خدا جانے بخار ہوگا۔ تین دن ہسپتال میں پڑا رہا۔ اس کے بعد گذر گیا۔ جو خدا کی مرضی"

"شیطان مڑ کر دیکھ!" اندھیرے سے آواز آتی ہے "کتے باؤلا ہو گیا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھ، کدھر چلا جا رہا ہے؟"

"چلے چلو، چلے چلو" افسر کہتا ہے "اس رفتار سے کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے، تیز چلو"

گاڑی بان پھر گردن آگے کو نکالتا ہے۔ اپنی جگہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چابک گھماتا ہے، کئی بار پھر کر افسر کی طرف دیکھتا ہے۔ افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں اور بات چیت کرنا نہیں چاہتا۔

وائی برگ اسکایا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک قہوہ خانے کے پاس گاڑی کھڑی کرتا ہے اور پھر سکڑ کر کبس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گذرتا ہے، پھر دوسرا......

تین نوجوان دو کشیدہ قامت اور دبلے پتلے، ایک پستہ قد اور کبڑا ایک دوسرے پر فقرے کستے، اپنے برساتی جوتے پہنے، کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اس طرف آتے ہیں۔

"گاڑی بان! پولیس کے پل کو چلو" کبڑا جھرجھری آواز میں چلاتا ہے "تینوں کے بیس کوپک" ایونا باگ کھینچتا ہے اور گھوڑی کو للکارتا ہے۔ اصل کرایہ بیس کوپک سے زیادہ ہوتا ہے مگر اسے اس کا خیال نہیں، ایک روبل ہو یا پانچ کوپک، اس کی پروا نہیں، بس سواری مل جائے۔

تینوں آدمی ایک دوسرے کو دھکیلتے، بدزبانی کرتے گاڑی کی طرف آتے ہیں اور تینوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں۔ تصفیہ طلب سوال یہ ہے کہ کون سے دو بیٹھیں اور کون کھڑا رہے۔ لمبے چوڑے بحث مباحثے، تو تو میں میں، گالی گلوچ کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کبڑا کھڑا رہے کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے۔

"چلو!" کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے "فروٹ ہو جاؤ دوست! تمہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے۔ اس سے ردی ٹوپی سارے پیٹر برگ میں ڈھونڈے نہیں ملے گی"

"ہی ہی ہی ہی!" ایونا ہنستا ہے "بس گذارے کے لائق ہے"

"خیر جناب گذارے کے لائق، ذرا تیز چلیے۔ تمام راستے اسی چال سے چلو گے۔ کیوں؟ دوں تان کر ایک چانٹا"

"میرا سر پھٹا جاتا ہے۔" کشیدہ قامت نوجوانوں میں سے ایک کہتا ہے۔ "ووڈکا سوف کے ہاں کل واسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا تم اتنی بکواس کیوں کرتے ہو؟" دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا ہو کر کہتا ہے۔ "وحشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو۔"

"اپنی جان کی قسم سچ کہتا ہوں۔"

"یہ ایسا ہی سچ ہے جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے۔"

"ہی ہی ہی۔" ایونا ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔"

"مردود!" کبڑا غصے میں آ کر چیختا ہے، چلاتا ہے۔ "ملعون، نہیں، گاڑی یوں چلائی جاتی ہے؟ چلانے کا یہ طریقہ ہے؟ لگا ایک چابک، کم بخت کی چابک سے خبر لے۔"

ایونا کو اپنے پیچھے کبڑے کے ہلنے جلنے اور کانپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سنتا ہے کہ مجھے گالیاں دی جا رہی ہیں۔ لوگوں کو دیکھتا ہے اور تنہائی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ کبڑا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے لچھے دار گرم گرم فقروں سے اس کے گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے اور کھانسی اس کی زبان بند کر دیتی ہے۔ اس کے کشیدہ قامت رفیق نداہنروا پتروو ایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ ایونا ایک طرف دیکھتا ہے تھوڑی دیر انتظار کر کے جب وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں تو پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

"اس ہفتے میرا لڑکا گزر گیا۔"

"سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔" کبڑا ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے اور کھانس کر ہونٹ پونچھتا ہے۔ "خیر تیز چلاؤ تیز۔ یارو مجھ سے یہ چیونٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی، نہ معلوم کب پہنچائے گا۔"

"ذرا اس کی ہمت بڑھاؤ..... لگاؤ گردن پر ایک ہاتھ۔"

"ملعون! سنتا ہے، مزا چکھا دوں گا۔ تم لوگوں کا لحاظ کرنے سے پیدل چلنا اچھا۔ بھتنے سنتا ہے، یا جو کچھ ہم لوگ کہہ رہے ہیں تیری جوتی کی نوک سے؟"

ایونا کی پیٹھ پر تھپڑ پڑتا ہے جس کا تڑاخا اسے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہے۔

"ہی ہی!" وہ ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں خدا آپ صاحبان کو سلامت رکھے۔"

"گاڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" ایک کشیدہ قامت نوجوان پوچھتا ہے۔

"میری؟ ہی ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ اب گیلی مٹی ہی میری دلہن بنے گی..... ہو ہو یعنی خیر..... ذرا سوچو میرا بیٹا چل بسا اور میں ہٹا کٹا موجود ہوں۔ عجیب معاملہ ہے۔ موت اٹکل پچو زنجیر کھٹکھٹاتی ہے۔ میرے پاس آنے کے بجائے میرے لڑکے کو آ دبوچا۔"

ایونا مڑ کر انہیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سناتا ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر کبڑا ہلکی سی آہ بھر کر کہتا ہے۔ "شکر ہے منزل مقصود پر آ پہنچے۔" اپنے بیس کوپک لے کر ایونا دیر تک ان اوباشوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایونا کے لئے پھر وہی تنہائی، وہی ہو کا عالم چھا جاتا ہے۔ جو صدمہ گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا تھا، وہ پھر ابھر آتا ہے اور اس کے دل پر انتہائی شدت سے ٹوٹتا ہے۔ اس کی نظروں سے غم واندوہ ٹپکتا ہے۔ وہ بے چین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں دوڑاتا ہے۔ کیا اس ہزاروں کے مجمع میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں، جو اس کی دکھ بھری کتھا سنے؟ لوگ اس سے، اس کے غم سے غافل گزرتے چلے جاتے ہیں..... اس کا غم بے انتہا سخت، اندازے سے باہر ہے اگر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کا غم اس میں سے پھوٹ پڑے تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے۔ پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس نے ایک ایسے حقیر خول میں چھپنے کو جگہ نکالی ہے کہ دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ دکھائی دے۔

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے۔ وہ اس سے بات چیت کرنے کی ٹھانتا ہے۔

"بھئی کیا وقت ہوگا؟"

"دس بجا چاہتے ہیں ...... یہاں کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو۔"

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اتنا جھکتا ہے کہ دوہرا ہو جاتا ہے اور اپنے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی امید رکھنا بے فائدہ ہے۔ پانچ منٹ نہیں گذرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے جیسے سخت درد میں مبتلا ہے اور باگ کھینچتا ہے۔ اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

"واپس اصطبل کو" اپنے دل میں کہتا ہے "اصطبل کو"

گھوڑی اس کے خیالات کو تاڑ کر دُلکی چلنے لگتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایونا ایک غلیظ بڑے آتشدان کے پاس بیٹھا ہے۔ آتشدان پر، فرش پر، بنچوں پر لوگ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا بُو میں بسی ہوئی اور کثیف ہے۔ ایونا سونے والوں کی طرف آتا ہے۔ اپنا بدن کھجاتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ "ناحق اتنے سویرے گھر واپس آیا۔ مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے۔" سوچتا ہے "یہی وجہ ہے کہ میں اتنا غمگین ہوں، جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے، جسے پیٹ بھر کر کھانے کو میسر ہے، جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے وہ ہمیشہ چین سے رہتا ہے۔"

ایک کونے میں سے ایک نوعمر گاڑی بان اٹھتا ہے، کچھ سوتے کچھ جاگتے کھنکھارتا ہے اور پانی کی بالٹی کا رُخ کرتا ہے۔

"کچھ پیوگے؟" ایونا پوچھتا ہے۔

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"خدا راس لائے۔ بھئی دیکھو میرا بیٹا گذر گیا ...... سُنتے ہو؟ اس ہفتے ہسپتال میں ...... عجیب معاملہ ہے۔"

ایونا دیکھتا ہے کہ اس کے لفظوں کا اثر کیا ہوا۔ مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ نوجوان اپنا منہ لپیٹ کر سو جاتا ہے۔ بڈھا آہ بھرتا ہے اور اپنا بدن کھجاتا ہے ...... جیسے نوجوان کو پانی کی پیاس تھی اسی طرح وہ بات چیت کا پیاسا ہے۔ اس کے لڑکے کو مرے عنقریب ہفتہ بھر ہو جائے گا اور اب تک اسے کسی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اس بارے میں ٹھکانے سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرا بیٹا کس طرح بیمار پڑا۔ اس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، مرتے دم کیا کہا، کیونکر مرا ...... وہ چاہتا ہے کہ جنازے کا حال سنائے اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے ہسپتال گیا۔ اس کی لڑکی انیسیا دیہات میں رہتی ہے ...... وہ چاہتا ہے کہ اس کا بھی ذکر کرے ...... ہاں اب اسے بہت کچھ کہنا سننا ہے۔ جس سے وہ باتیں کرے اسے چاہیئے کہ ٹھنڈی آہیں بھرے، تعجب کا اظہار کرے اور اس کے سوگ میں شریک ہو ...... اگر عورتیں بات کرنے کو مل جائیں اور بھی اچھا ہو۔ گو بے وقوف ہوتی ہیں اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسورنے لگتی ہیں —— "چلیں، گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں۔" ایونا سوچتا ہے "سونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے نیند کہیں نہیں گئی۔"

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے۔ اسے دانے، چارے، موسم کا خیال آتا ہے ...... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا ہے ...... کسی اور سے اس کا ذکر کر سکتا ہے ...... مگر اس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا، یہ اذیت اس کی برداشت سے باہر ہے ......

"دانہ چبا رہی ہو؟" اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے۔ "اچھا جگالی کئے جاؤ ...... کئے جاؤ ...... دانے کے لئے کافی مزدوری نہیں ملی تو نہ سہی، گھاس پر گذارہ کر لیں گے ...... ہاں میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی، اب میرا نہیں میرے لڑکے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا ...... وہ پورا گاڑی بان تھا ...... اسے کچھ دن اور جینا تھا۔" ایونا تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا ہے پھر کہتا ہے "یہی بات یہ ہے ...... کزما ایونچ چل بسا ...... مجھ سے رخصت ہو گیا۔ بلاوجہ، اچانک جان دے دی ...... اچھا یوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچھیرا ہے اور تم اس ننھے سے بچھیرے کی ماں ہو ...... اور یکایک وہ بچھیرا مر جائے ...... تو تمہیں اس کا رنج ہوگا کہ نہیں؟"

گھوڑی منہ چلاتی ہے، سنتی ہے اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی ہے، ایونا کا دل بھر آتا ہے اور وہ اس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔

(ترجمہ)

منصور احمد

کیڈور کا مصوّر

لڑکے کی آنکھیں ان پھولوں کے قلوب کی طرح سیاہ تھیں جن کا ایک انبار وہ اٹھائے ہوئے تھا، اور وہ مشتاقانہ اس سوار پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے گھوڑے کو شاہراہ پر اڑائے لئے جا رہا تھا۔

اس نے کہا "کیٹرینا ذرا دیکھنا! یہ شخص شہر کو جا رہا ہے، حیرت انگیز شہر کو۔"

کیٹرینا نے اپنے بھائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کی بات نہیں سمجھی۔ اس سڑک پر جو ان کے گاؤں سے جنوب کی طرف جاتی تھی، بہت سے قصبے آباد تھے جنہیں یہ پہاڑی لڑکی کافی بڑا سمجھتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے بھائی کی طرح انہیں حیرت انگیز کبھی خیال نہ کیا تھا۔

لڑکی نے کہا "حیرت انگیز شہر؟ ٹیزیانو! حیرت انگیز شہر کہاں ہے؟"

اس نے متعجب ہو کر کہا "کیوں تمہیں معلوم نہیں؟ اور کیا سینٹ مارک کے عظیم الشان شہر وینیس کے علاوہ بھی کسی شہر کو حیرت انگیز کہا جا سکتا ہے؟"

مگر وینیس کے نام نے سیاہ چشم کیٹرینا پر کچھ زیادہ اثر نہ کیا۔ وہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑی تھی اور اس کی طرح موہوم باتوں کے خواب نہ دیکھا کرتی تھی۔ اس نے سنا تھا شہر میں اکثر خوفناک واقعات رونما ہو جایا کرتے ہیں اور بعض اوقات لوگوں کو وہاں فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس اس پہاڑی علاقہ میں کھانے پینے کا سامان کافی سے زیادہ تھا اور اگرچہ کوئی بھی یہاں اتنا امیر نہ تھا جس کے قبضے میں خوبصورت محلات اور پرتکلّف ساز و سامان ہو، لیکن بہت غریب بھی کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنے کندھوں کو ذرا سا سکیڑ کر جواب دیا "وینیس! میں نہیں جانتی تم کیوں اسے حیرت انگیز کہتے ہو۔ گمبریا نو جولاہا بہت دفعہ وہاں گیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس میں ہمارے کیڈور سے آدھا حُسن بھی نہیں ہے۔ نہ وہاں پہاڑ ہیں اور نہ مرغزار جہاں پھول کھلتے ہیں۔ ٹیزیانو! کیا تم یہاں سے تنگ آ گئے ہو؟"

"آہ! نہیں! یہ نہیں! لیکن شہر میں مصوّر رہتے ہیں اور اگر میں وہاں جا سکوں تو ان کے فن کا مطالعہ کروں اور بعض ایسی تصویریں بناؤں جن کی آرزو میرے دل میں ہے۔"

کیٹرینا ایک عملی دیہاتی لڑکی تھی جس کا خیال تھا کہ اگر کسی کے پاس کھانے اور پینے کے لئے کافی ہو تو اسے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اسی لئے جب وہ بولی تو اس کا لہجہ ملامت آمیز تھا اور ذرا تیز بھی۔

"یہ جو تم ہر وقت مصوری کی باتیں کرتے رہتے ہو اور ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہو جنہیں اور کوئی بھی نہیں دیکھتا تو لوگ کہتے ہیں کہ جب تک تم یہ دن دہاڑے خواب دیکھنے نہ چھوڑ دو گے تم کوئی کام نہیں کر سکو گے۔ اسی لئے والد تمہیں لوئگی موچی کے پاس شاگرد کرانے کا دھیان کر رہے ہیں۔ کم از کم وہ تمہیں اپنے فن میں ماہر تو بنا سکتا ہے اور یہ تمہارے لئے ہر وقت وینس کے متعلق سوچتے رہنے سے بدرجہا بہتر ہو گا۔"

ٹیزیانو نے اپنے سر کو جنبش دی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اسے اپنے مقصد کے سامنے کسی دوسری بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اکثر راتوں کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے وہ اپنے بستر میں جاگ جاگ کر سوچا کرتا کہ کس طرح وہ اپنے باپ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اسے مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جانے کی اجازت دے دے۔ گاؤں میں سب جانتے تھے کہ وہ تختوں، پتھروں اور ہر اس چیز پر جو اس کے سامنے آجاتی، تصویریں بنانے میں گھنٹوں صرف کر دیا کرتا ہے، اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کا نیک دل پادری اس کے کام کی تعریف کیا کرتا ہے لیکن اس کی ان کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ کیڈور کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرح تصویریں بناتے تھے اور انہیں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ آخر اسے کیوں شہر بھیجا جائے، صرف اس لئے کہ وہ ایک پہاڑ کا نقشہ خیال سے اتار سکتا ہے، یا جنگل کی تصویر کسی حد تک بنا لیتا ہے؟ ان کی اس بے توجہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح بھی انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا کہ رنگ وہ چیز ہے جس نے اس کی روح میں ایک آگ لگا رکھی ہے اور سرمے کے قلم سے اس کا اظہار ناممکن ہے۔

نیچے سڑک پر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی اور کیٹرینا نے دیکھا کہ اس کا بھائی فرانسسکو انہیں جلد اپنے پاس بلا رہا ہے۔

کیٹرینا نے کہا "وہ شاید ہار گوندھنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں گاؤں کی سرائے کی طرف دوڑ پڑے۔

کوہستان اطالیہ میں یہ جون کا روشن اور عطر بار مہینہ تھا۔ جب ڈولومی کی زرخیز وادی کے ٹیلے اور میدان رنگا رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ بن جاتے ہیں کل پھولوں کا میلہ آ رہا تھا۔ اسی لئے آج انہوں نے پھول چننے میں کئی گھنٹے گذار دیئے تھے اور اب کہ غروب ہوتا ہوا آفتاب چوٹیوں کو ارغوانی رنگ دے رہا تھا وہ اپنی تاخت و تاراج کو لے کر واپس جا رہے تھے تاکہ اس سے اپنے عیش و مسرت کی تیاری میں مدد لیں۔

ذرا سی دیر میں وہ اپنے ذخیرہ ساتھیوں سے جا ملے۔ سب نے ہار بنانے شروع کر دیئے اور کل کے کھیلوں کے متعلق تجویزیں سوچنے لگے۔ کیڈور کا گاؤں ان دنوں ذرائع آمد و رفت کی کمی کے باعث دنیا سے بہت دور تھا اور جب کبھی کوئی تہوار آتا تھا تو وہاں کے باشندے اپنے سیدھے سادے کھیلوں میں اتنے ہی خوش ہوتے تھے جتنے کہ وینس کے رہنے والے اپنے نئے نئے تماشوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں، ہر طرف سے گیتوں اور قہقہوں کی آوازیں آتی تھیں اور مشتاق سامعین کے لئے چھوٹی سچی دلچسپ باتیں کہی جاتی تھیں۔

ایک لڑکی نے جس کی زبان اس کی چالاک انگلیوں سے بھی تیز چلتی تھی، کہا "کچھ تم نے سُنا، چکی والے کا لڑکا سالوٹیر سنگ تراشی کا فن سیکھنے کے لئے وینس جا رہا ہے۔ جب سے اس کا باپ امیر ہو گیا ہے، اس نے اس سے اپنا کاروبار کرانے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ پہلے تو سالوٹیر نے اس طرف دھیان ہی نہ کیا لیکن جب اسے بتایا گیا کہ ایک سنگتراش کسی بہت بڑے نواب کا مقرب بھی ہو سکتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اگر وہ ایک بڑا آدمی بن گیا اور ایک نفیس مکان میں رہنے لگا تو یہ کیسی شاندار بات ہو گی۔ پھر ہم کہا کریں گے، ہاں ہاں وہ ہمارے ہی گاؤں کا آدمی ہے۔"

سیبسٹیانو جس کا چچا برگیمو میں کسی وکیل کا منشی تھا اور جو شہر کی باتوں سے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ واقف تھا، بولا "میں تو نہیں سمجھتا کہ اسے سنگتراشی کا کچھ شوق ہو۔ میرے خیال میں صنّاع بننے کے لئے امیر باپ کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔"

باتونی لڑکی نے اپنے سر کو ہلایا پھر بولی "یہ سچ ہے! اگر روپیہ بھی نہ ہو اور استاد بھی نہ ملے تو بتاؤ کوئی کیسے کچھ کر سکتا ہے؟"

کیٹرینا نے کہا "سو اب اگر ٹیز بانو نے مصوری سیکھنے کے لئے شہر جانے کا نام لیا تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ والد اتنے امیر نہیں ہیں کہ تمہارا خرچ برداشت کر سکیں اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ تم لوگی سے موچی کا کام سیکھنے کا خیال نہ کرو۔"

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کسی نے کہا "ٹیز بانو! اس نے تو کبھی کسی سے ایک دفعہ اصلاح نہیں لی۔ وہ تو بنیاد اٹھائے بغیر قلعے کے برج بنانے شروع کر دیتا ہے۔"

ٹیز بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ سچ تھا کہ اسے کبھی استاد میسر نہ آیا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو اس قابل ثابت کر دے گا کہ اس کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اس نے دل میں سوچا "کاش مجھے کچھ رنگ مل جائیں! ممکن ہے پھر یہ لوگ مجھے وہمی نہ سمجھیں، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ان سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصویر بنا سکوں گا اور پھر شاید میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے وینس جا سکوں۔"

لیکن رنگ کمیاب اور بیش قیمت تھے اور گو اس کا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا، تاہم وہ ایک ایسے لڑکے کے لئے رنگ خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جسے کبھی ان کا استعمال نہ سکھایا گیا ہو۔

دوسرے دن نوخیز مصوّر کو راستے کے پتھروں پر کچھ داغ نظر آئے جو پھولوں کے روندے جانے سے وہاں پڑ گئے تھے۔ یہ داغ ایسے صاف اور روشن تھے جیسے کسی مصوّر نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا ہو۔ ان کو دیکھ کر اسے ایک خیال سوجھا۔ اس نے یہ خیال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ وہ اس میں اتنا محو تھا کہ سبزہ زار پر رنگ برنگ کے لباس پہن کر رقص کرنے والے دیہاتی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ چپکے سے ان میں سے نکل کر پھولوں کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔

کیٹرینا نے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ حیران تھی کہ اس مسرت و انبساط کے مجمع میں سے کون سی چیز اسے لے جا رہی ہے۔ جب اس کی حیرت تفریح کی خواہش سے بڑھ گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا تھا جسے پھولوں نے روشن کر رکھا تھا۔

وہ بولی "ٹیز بانو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

لڑکے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شک جھلک رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ گو میری بہن کو میری بلند پروازیوں پر اعتراض ہے پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے راز کو فاش نہیں کرے گی۔

اس نے جواب دیا "میں ایک رنگین تصویر بنا رہا ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے وہ کھڑی اسے دیکھا کی۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ اسے بہکا رہا ہے، کہنے لگی "ہاں کیوں نہیں، رنگوں کے بغیر!"

لیکن اس کا متین چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔

اس کی آنکھیں ایک عجیب روشنی سے چمک رہی تھیں۔ جب اس نے کہا "میں رنگوں کی جگہ پھولوں کا استعمال کروں گا۔ دیکھو ان میں سب رنگ موجود ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام میں لائے جا سکتے ہیں میں نے ان کے نشان راستے کے پتھروں پر دیکھے ہیں۔"

کیٹرینا اپنے بھائی کی طرح موہوم خیالات میں کھو نہیں جایا کرتی تھی اور کہیں رنگ کے ایک دھبّے کو دیکھ کر اسے تصویریں نظر نہیں آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس نے سمجھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے خود بھی ——— پتھروں پر رنگ کے نشانات دیکھے تھے۔ اب اسے یہ بھی خیال آیا کہ اس کا بھائی ضرور ایک ہشیار اور زیرک لڑکا ہے۔ کیونکہ عام لڑکوں کو یہ بات ذرا بھی نہیں سوجھی اور اس نے سوچا کہ شاید اس کی وینس جانے کی خواہش کوئی بے سروپا خیال نہیں ہے۔ اگر چکّی والے کے بیٹے سالوٹیر کے لئے سنگتراش بن جانا ایک شاندار بات ہو سکتی ہے تو کیا ٹیز بانو کا ایک

مصور بن جانا شاندار تر نہیں؟ اور کیا کیٹڈرا اس پر فخر نہیں کر سکتا؟ پادری کو اس نے اکثر کہتے سُنا تھا کہ کوئی کام ایسا نہیں جس کی دھن انسان کو لگی ہو اور پھر اسے صبر، حوصلے اور استقلال سے کیا جائے اور ناکامی ہو۔ اور یہ کہ مدد ہمیشہ ان کو ملتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں چنانچہ اس نے ٹیزیانو کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا خواہ وہ اسی قدر رکیوں نہ ہو کہ اس کے راز کی حفاظت کی جائے اور اس کے کام کے لئے ضروریات مہیا کی جائیں۔ سو مہکتے ہوئے خطوں میں سے وہ رنگ رنگ کے پھول اکٹھے کرتے پھرے۔ سُرخ، گلابی، نیلے، ارغوانی جیسے کوہستان کی شفق کا رنگ ہوتا ہے اور پیلے اور سنہری جیسے وہ اپنے تصور میں دیکھا کرتے تھے۔ پھر وہ اس پرانے پتھر کے بنے ہوئے مکان کی طرف اٹھ بھاگے جو ان کے باپ کی ملکیت تھا۔ یہ بالکل خالی رہتا تھا۔ ان کے اپنے گھر والے لوگ بھی یہاں شاذ و نادر ہی آیا کرتے تھے اور گاؤں کے رہنے والے تو اس میں کبھی داخل ہی نہ ہوتے تھے ––– اور یہیں ہر دست اندازی سے محفوظ ہو کر اسے وہ تصویر بنانی تھی جس کے متعلق دونوں بہن بھائیوں کو امید تھی کہ وہ اسے وینس لے جانے کا ایک ذریعہ ثابت ہوگی۔

کیٹرینا پاس رہ کر تصویر کو بنتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ٹیزیانو کو اس پر اعتراض تھا۔ اس نے کہا "جب تک یہ ختم نہ ہو لے میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اسے دیکھو۔ کیونکہ اوّل اوّل اس کی شکل تصویر جیسی نہیں ہو گی۔"

چنانچہ وہ اسے کوئلے کے ایک ٹکڑے سے خاکہ بناتے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی۔

کئی دن تک لوگوں سے چھپ چھپا کر وہ اس مکان میں جاتا رہا اور پھولوں کے رنگوں سے تصویریں بناتا رہا۔ کیٹرینا پرندوں کی طرح اڑتی ہوئی گلزاروں میں جاتی اور پھر اِدھر اُدھر نگاہ ڈال کر کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اس کھڑکی میں سے پھول اپنے بھائی کے حوالے کر دیتی جس کے قریب بیٹھ کر وہ کام کر رہا تھا اور اگرچہ پھول کی ہر پتی تصویر پر صرف ایک ننھا سا دھبّہ بنا کر خشک ہو جاتی اور اگرچہ ٹیزیانو ایک ملہم غیبی کی سی تیزی کے ساتھ تصویر پر رنگوں کو پھیلاتا جاتا لیکن اسے ایک مرتبہ بھی پھولوں کے انتظار میں ہاتھ روکنا نہ پڑا۔

تصویر اس کے سحر آسا قلم کے نیچے بتدریج نمایاں ہوتی گئی اور اس نے اور کیٹرینا نے اپنے راز کی خوب پاسداری کی۔ صرف ڈھوروں کے گلے مہکتی ہوئی چراگاہوں میں چرتے ہوئے کبھی کبھی اس سنسان مکان تک جا پہنچتے۔ چنانچہ کسی کو بھی علم نہ ہو سکا کہ یہاں وہ لڑکا مصروفِ کار ہے جو اٹلی کے نام کو چار چاند لگا دے گا۔ گاؤں کے لوگوں کو خواب و خیال بھی نہ تھا کہ یہ پھول جو کیٹرینا چُن رہی ہے، ایک غیر فانی کام میں استعمال ہو رہے ہیں۔

ایک شام جب سورج پہاڑ کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا اور گھروں کو واپس جاتے ہوئے گڈریوں کی خوشی سے لبریز آوازیں بلندیوں سے نیچے گونج رہی تھیں، ٹیزیانو نے اس مکان کے دروازے سے باہر قدم رکھا اور بہن کو اپنے پاس بُلا کر کہا:

"کیٹرینا! تصویر ختم ہو گئی اور یہ میری بہترین تصویر ہے۔"

وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی اندر گئی۔ لیکن جب وہ تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تو مسرت اس کے چہرے سے رخصت ہو گئی اور وہ احترام آمیز لہجے میں بولی "اوہ ٹیزیانو! یہ تو مقدس مریم کی تصویر ہے۔"

اس نے کہا "ہاں مریم اور بچے کی۔ اور ایک میری طرح کا لڑکا تحفہ پیش کر رہا ہے۔ کیٹرینا یہی تصویر میرے دل میں تھی۔"

چند لمحوں کے لئے وہ تصویر کے حُسن میں ایسی محو ہوئی کہ اسے اور کوئی بات یاد نہ رہی۔ پھر یہ خیال کر کے کہ گاؤں والوں کے لئے اس حیرت انگیز کارنامے کا علم اس کے بھائی کے حق میں کیسے کیسے شاندار نتائج پیدا کرے گا۔ وہ اس خبر کو پھیلانے کی خاطر باہر نکلی۔

اور جب وہ لونگی کے گھر کے پاس سے جلد جلد گذر رہی تھی اس نے کہا "آؤ دیکھو! ٹیزیانو نے ہمارے پُرانے مکان کی دیوار پر مقدس مریم کی تصویر رنگوں سے بنائی ہے۔"

کوئی خبر جب دیہاتیوں کی زبانوں پر چڑھ جاتی ہے تو بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ایک مجمع اس مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں ٹیزیانو ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا باپ جو تمام دن پہاڑوں میں شکار کرتا پھرا تھا، اب گھر واپس آ رہا تھا۔ جب اس نے لوگوں کو

اس جگہ جمع ہوتے دیکھا تو حیران ہو کر وہ بھی اسی طرف چل کھڑا ہوا مگر اس کے پہنچنے تک ہجوم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ تصویر اس کو نظر نہ آئی۔

ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں "۔ اس نے یہ تصویر کیسے بنائی؟ ——— اس نے یہ رنگ کہاں سے لئے؟" اور ہر شخص میں اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ اس کے باپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیوں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ پھر اس نے ٹیزیانو کی آواز سنی "میں نے اس تصویر کو پھولوں کے رس سے بنایا ہے۔ کیٹرینا ان کو جمع کرتی رہی اور میں کام کرتا رہا۔"

ہر طرف سے تعریف کا اظہار ہونے لگا اور گاؤں کے پیشوا نیک دل پادری نے پُر احترام انداز سے کہا "پھولوں کے رس سے! مقدّس ٹیزیانو کو دیکھو۔"

انٹونیو ویسلی سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا کیونکہ جو کچھ وہ سن رہا تھا اس پر اسے یقین نہ آتا تھا۔ ایک دیہاتی سے جو پاس ہی کھڑا تھا اس نے پوچھا "کیا میں پاگل ہو گیا ہوں یا پادری نے سچ مچ میرے بیٹے کو مقدس کہا ہے؟"

اس نے جواب دیا "نہیں تم پاگل نہیں ہو۔"

اور جب انہوں نے سارا ماجرا اس سے کہہ سنایا اور ہجوم نے اسے راستہ دیا کہ وہ بھی تصویر کو دیکھ سکے، تو وہ حیران رہ گیا۔

چکّی والے کا لڑکا سالو ٹیر سنگ تراشی سیکھنے گیا یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا لیکن ٹیزیانو گیا اور کیڈور کا یہ لڑکا بعد میں وینس کا عجوبہ بنا۔ وہاں بیلینی کی استادانہ اصلاح نے اس کی رہنمائی کی اور ان مو قلموں کو جو اس سے قبل تقریباً اسّی سال تک مصروف کار رہے تھے، اس نے خوب چلایا اور ان سے وہ تصویریں بنائیں جن کے شگفتہ رنگوں کی نظیر پھر کبھی نہ مل سکی۔ اس نے اپنے وطن کے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ خیال پرستی کچھ بری چیز نہیں کیونکہ خیال پرستی کے ساتھ جب محنت مل جاتی ہے تو اس سے حیرت انگیز باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

جب گاؤں کے لوگ اس عالی پایہ مجسمہ کے پاس آکر کھڑے ہوتے ہیں جس کا رُخ پھولوں کے ان کھیتوں کی طرف ہے جن میں کیٹرینا اپنے بھائی کے لئے رنگ رنگ کے پھول توڑ کر لاتی تھی، تو وہ اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں "دیکھو! مقدّس ٹیزیانو کو دیکھو!"

(ترجمہ)

جلیل قدوائی

بلّی کے بچّے

صبح سورج کی کرنیں خواب گاہ کی شیشہ دار کھڑکیوں سے چھن کر کمرے کے اندر اور بستر پر آ رہی ہیں۔ دانیا ایک چھ سال کا لڑکا جس کے بال برابر سے ترشے ہوئے ہیں، اور بٹن کی سی ناک ہے اور اس کی بہن نینا ایک چھوٹی، پھولے گالوں والی، گھونگھر یالے بالوں والی، چار سال کی لڑکی، سو کر اُٹھے ہیں اور بستر پر پڑے پڑے چارپائی کی جالی سے ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔

"اُٹھو۔ او۔ او۔ لڑکو۔ ان کی انّا انہیں دیکھ کر کہتی ہے۔ اچھے لڑکے کب کے ناشتہ کر چکے اور تمہاری آنکھ نہیں کھلنے آتی!"

سورج کی کرنیں کھیلیں، دیواروں اور رانا کے سایہ کے دامنوں پر پھیلتی اور تھرکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کو اپنے کھیل میں شریک کرنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ مگر بچے اس دعوت کو رد کر رہے ہیں۔ وہ سو کے اُٹھے ہیں تو ان کا مزاج بگڑا ہے اور تیوریاں چڑھی ہیں۔ نینا انگڑائی لیتی ہے اور رانا سے کہتی ہے۔

"نا۔۔۔ ہم شتہ۔۔۔۔۔۔۔ بوا، ناشتہ!"

دانیا اپنی آنکھیں چبا جاتا ہے اور شور کرنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں تلملانا اور منہ کھولنا شروع کر دیا ہے لیکن اسی وقت ماں کی آواز ڈرائنگ روم سے سنائی دیتی ہے۔ بلی کو دودھ دینا نہ بھول جانا اس نے بچے دئے ہیں۔

لڑکوں کے بگڑے ہوئے چہرے پھر اصلی حالت پر آجاتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ پھر دونوں ایکدم چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے بستر سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور اپنے شور و بکا سے فضا میں جھنکار پیدا کرتے ننگے پیر دوڑتے، رات کا لبادہ پہنے باورچی خانہ پہنچتے ہیں۔

باورچی خانہ میں ایک تپائی کے نیچے ایک چھوٹا ڈبہ رکھا ہے۔ جس میں اسٹفن آگ جلانے کے لئے کوئلے لاتا تھا۔ بلی اس ڈبے میں سے جھانک رہی ہے۔ اس کے اُترے ہوئے چہرے پر ناتوانی ہے۔ اس کی سبز آنکھوں سے جن کے گرد تنگ و تاریک حلقے ہیں۔ کمزور شفقت میں ڈوبی ہوئی نظریں نکل رہی ہیں۔۔۔۔۔

"وہ میاؤں کرنا چاہتی ہے اور اپنا منہ کھولتی ہے لیکن اس کے حلق سے صرف ایک ناتواں، ہلکی، بے صدا سانس نکلتی ہے۔ بلی کے بچے گل بل گل بل کر رہے ہیں۔ ان کے کلبلانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دونوں لڑکے ڈبے کے سامنے اینڈی کے بل کو دتے ہیں اور اپنی سانس روکے بالکل بے حرکت بلی کو دیکھتے ہیں...... وہ متحیر اور خوش ہیں اور نانا کے بکنے ڈانٹنے کی آوازوں کو نہیں سنتے۔ دونوں کی آنکھیں بے انتہا سچی خوشی سے چمک رہی ہیں۔

بچوں کی تعلیم اور زندگی سدھارنے میں پالتو جانوروں کا بھی کتنا زیادہ حصّہ ہے۔ اس کو مشکل سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے کون طاقتور اور بھاری کتوں، سست اور مری کتیوں، پنجرے میں محبوس چڑیوں، کم عقل مگر جوشیلی مرغیوں، حلیم، نیک دل، بڑھی بلیوں کو نہیں یاد کرتا۔ جنھوں نے، اگر ہم نے کھیل میں ان کی دُم پہ پیر رکھ دیئے ہیں اور انہیں تکلیف پہنچائی ہے، ہمیں معاف کر دیا! بلکہ میں تو بعض وقت فی الواقع یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صبر، رحم، شفقت، وفاداری اور اخلاص جو ان پالتو جانوروں میں ہوتا ہے، بچوں کے ذہن پر کسی بڈھے فلسفی یا ماؤں اور اُستادوں کی تربیت اور تعلیم سے کہیں زیادہ مفید و دیرپا اثر ڈالتا ہے۔

"کیسے ننھے ننھے ہیں۔" نینا اپنی آنکھیں اچنبھے میں خوب کھول کر ہنستی ہوئی کہتی ہے۔ "جیسے چوہے ہوں۔"

ایک دو تین۔" دانیا گنتا ہے۔ "تین بچے ہیں۔ اچھا تو ایک تمہارا، ایک میرا اور ایک کٹی کے لئے بھی۔

"ہائیں، ہائیں۔ ماں کہتی ہے ہائیں......

بلی کے بچوں کو خوب اچھی طرح دیکھ کے دونوں لڑکے انہیں بلی کے نیچے سے اُٹھا لیتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں میں انھیں ملنا شروع کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے بھی نہ مطمئن ہو کر انہیں اپنے فراک کے لبادہ کے دامنوں میں رکھ لیتے ہیں۔ اور دوسرے کمروں میں دوڑ کر جاتے ہیں۔

"امی! بلی نے بچے دیئے۔" وہ چلّاتے ہیں۔

امی ڈرائنگ روم میں کسی اجنبی سے باتیں کر رہی ہیں۔ لڑکوں کے بغیر منہ دھوئے، بغیر صاف کپڑے پہنے رات کے لبادے کے دامن اٹھائے دیکھ کر وہ گھبراتی ہے۔ اور انہیں خفگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

"دامن گراؤ، بدتمیز کہیں کے۔" وہ کہتی ہے۔ کمرے سے باہر جاؤ۔ نہیں تو پیٹے جاؤ گے۔" لیکن لڑکے نہ ماں کی خفگی کی پروا کرتے ہیں نہ اجنبی کی موجودگی کی۔ وہ بلی کے بچوں کو چٹائی پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اپنے شور سے کان پھاڑے ڈالتے ہیں۔ بلی ان کے چاروں طرف رحم کی طالب نظروں سے میاؤں کرتی ہے۔ جب تھوڑی دیر بعد لڑکے کپڑے بدلنے کے لئے۔ منہ دھونے کے لئے یا ناشتہ کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں، انکی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ غیر دلچسپ فرائض جلد ختم ہوں کہ وہ بلی کے بچوں کے پاس پھر بھاگ کر جائیں

ان کے روزانہ کے کھیل اور دلچسپیوں کا پروگرام بالکل بالائے طاق ہے۔ بلی کے بچوں نے دنیا میں آکر ہر کام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی دلچسپی کا باعث ہوئے ہیں۔ اگر نینا یا دانیا کو چالیس پونڈ مٹھائی یا دس ہزار کا چیک فی بچہ دیا جاتا تو وہ بغیر پس و پیش کے ایسے سودے کو رد کر دیتے۔ باوجود نانا اور باورچن کی سخت تاکید کے لڑکے مصر ہیں کہ باورچی خانہ میں کھانا کھانے کے وقت بلی کے ڈبے کے پاس بیٹھے رہیں۔ ان کے چہروں سے شوق اور جستجو اور انہماک ظاہر ہوتا ہے وہ بچوں کے حال کے لئے اتنے فکرمند نہیں، جتنا ان کے مستقبل کے لئے۔ وہ طے کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک بچہ تو گھر میں اپنی بڈھی ماں کی خبرگیری کے لئے رہے گا اور دوسرا ان کے گرمی کے مکان میں بھیج دیا جائے گا۔ اور تیسرا مودی خانہ میں رہے گا۔ جہاں چوہے اتنی کثرت سے ہیں۔

"مگر وہ ہماری طرف دیکھتے کیوں نہیں ہیں؟" نینا کو تعجب ہوتا ہے۔ "ان کی آنکھیں بھکاریوں کی طرح اندھی ہیں۔"

دانیا کو بھی یہی تشویش ہے۔ وہ ایک بچہ کی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دیر تک اس کے چہوترے کو پھونکتا اور ہوا دیتا ہے

لیکن اس کی کوشش بے کار جاتی ہے ۔ اور اس پر بھی دونوں بہت متحیّر ہوتے ہیں کہ بچے جو گوشت یا دودھا نہیں دیا جاتا ہے، اسے لینے سے انکار کرتے ہیں۔ ماں کے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے، وہ ان کی ماں کھا لیتی ہے ۔

”اچھا ان کے نئے گھر بنائیں ۔“ دانیا رائے دیتا ہے ۔ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ گھروں میں رہیں گے ۔ اور بلی ان سے ملنے آیا کرے گی ......“

دفتی کی ٹوپی کے ڈبے باورچی خانے کے مختلف کونوں میں رکھ دئے جاتے ہیں ۔ اور بچے ان میں بٹھائے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ تقسیم ناکام ثابت ہوتی ہے ۔ بلی اب بھی رحم کی طالب اور محبت بھری نظریں لئے سب ڈبوں کے گرد جاتی ہے ۔ اور اپنے بچوں کو پہلی جگہ لے آتی ہے ۔

”بلی ان کی ماں ہے ۔“ دانیا نے کہا، ”لیکن ان کا باپ کون ہے ؟“

”ہاں ان کا باپ کون ہے ؟“ نینا دہراتی ہے ۔

”کوئی ان کا باپ ضرور ہونا چاہئے ۔“

دانیا اور نینا دیر تک سوچتے رہتے ہیں ۔ کہ ان کا باپ کسے ہونا چاہئے ۔ اور آخر میں ان کی نظر انتخاب ایک گہرے رنگ کے گھوڑے پر پڑتی ہے ۔ جس کے دُم نہیں ہے ۔ اور جو میز کے نیچے کباڑ خانے میں دوسرے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر میں پڑا ہے ۔ وہ وہاں سے اسے باورچی خانہ میں گھسیٹ کر لاتے ہیں ۔ اور اسے ڈبے کے پاس کھڑا کرتے ہیں ۔

”سنتے ہو ؟“ وہ اس سے تاکید کرتے ہیں ۔ ”یہاں کھڑے رہو اور دیکھو کہ بچے کوئی بدتمیزی تو نہیں کرتے ۔“

یہ سب بڑی سنجیدگی سے کیا جاتا ہے ۔ دانیا اور نینا، سوا بچوں کے ڈبوں کے کہیں اور دنیا کے وجود سے انکار کرتے ہیں ۔ ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے ۔ لیکن انہیں تکلیف دہ اور رنجیدہ لمحوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے ۔

کھانے سے پہلے دانیا اپنے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں خواب آلودہ نظروں سے میز کو دیکھ رہا ہے ۔ لیمپ کے نزدیک چھپے ہوئے نوٹ پیپر پر ایک بلی کا بچہ رینگ رہا ہے ۔ دانیا اس کی حرکات کو خوب غور سے دیکھ رہا ہے ۔ اور اس کے منہ میں پہلے ایک پنسل پھر دیا سلائی دے رہا ہے ۔ ایک دم جیسے زمین کو پھاڑ کے نہ معلوم کہاں سے اس کا باپ میز کے پاس نمودار ہوتا ہے ۔

”یہ کیا ہے ؟“ دانیا ایک غصہ کی آواز میں سنتا ہے ۔

”...... یہ ابا جان بلی کا بچہ ہے ......“

”مار تو نہیں کھاؤ گے ۔ دیکھو ۔ تم نے کیا کیا ۔ میرا تمام کاغذ خراب کر ڈالا !“

دانیا کے استعجاب کی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا باپ اس شوق میں کوئی حصہ نہیں لیتا جو دانیا کو بچے کے ساتھ ہے اور بجائے خوش ہونے کے وہ دانیا کے کان کھینچتا ہے اور چلّاتا ہے ۔

”اسٹفن ! اس شریر کو یہاں سے لے جاؤ ۔“

کھانے پر دوسرا منظر پیش ہوتا ہے ...... دوسرے دَور کے درمیان ایک تیز میاؤں کی آواز دفعتہً سنائی دیتی ہے ۔ وہ اس آواز کا مخرج تلاش کرتے ہیں ۔ اور نینا کے کپڑوں میں ایک بلی کا بچہ چھپا پاتے ہیں ۔

”نینا بس میز پر سے اٹھ جاؤ ۔“ اس کا باپ خفا ہو کر کہتا ہے ۔ ”بچوں کو موری میں پھنکوا دونگا ۔ میں ان گندی چیزوں کو گھر میں نہیں رکھونگا ۔“

دانیا اور نینا خوف زدہ ہو جاتے ہیں ۔ موری میں پڑے پڑے بچوں کی موت علاوہ بے رحمی کے بلی اور گھوڑے کو جانکاہ صدمہ پہنچائے گی بچوں کے ڈبوں کو سونا کر جائے گی ۔ ان کے مستقبل کے ارادوں پر پانی پھیر دے گی ۔ وہ روشن مستقبل جب کہ ایک بچہ ماں کے آرام کیلئے اس کے پاس رہے گا، دوسرا دیہات پر رہے گا ۔ اور تیسرا کوٹھڑی میں چوہے پکڑے گا ۔ لڑکے رونے لگتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں ۔

کہ بچوں کی جانیں بخش دی جائیں۔ ان کا باپ مان لیتا ہے۔ مگر اس شرط پہ کہ وہ دونوں باورچی خانہ میں نہ جائیں۔ اور بچوں کو نہ چھوئیں۔

کھانے کے بعد دانیا اور نینا کمرے کمرے ایک بے کلی اور اداسی کے ساتھ پھرتے ہیں۔ باورچی خانہ جانے کی ممانعت نے انہیں بے دل کر دیا ہے۔ وہ مٹھائی نہیں لیتے۔ منہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ اور ماں سے بگڑے ہوئے ہیں۔ جب ان کا چچا پیٹر وشا شام کو آتا ہے، وہ اُسے علیحدہ لے جا کر اس سے اپنے باپ کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو نالی میں پھنکوائے دیتے تھے۔

"چچا جان امّی سے کہہ دو کہ بلی کے بچوں کو ہمارے کمرے میں منگا دیں۔" لڑکے چچا سے خوشامد کرتے ہیں۔ "کہہ دو۔ کہہ دو۔"

"ہاں، ہاں اچھا،" چچا جان انہیں چمکار کر کہتے ہیں "اچھا۔"

چچا پیٹر وشا کبھی اکیلے نہیں آتے۔ ان کے ساتھ ان کا نیرو ایک بڑا سیاہ کتا بھی جس کے کان جھکے ہوئے ہیں اور جس کی لکڑی کی طرح سخت دم ہے، آتا ہے۔ کتا خاموش، غمگین اور اپنے وقار کو لئے رہتا ہے۔ وہ لڑکوں کو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ جب ان کی طرف سے گذرتا ہے تو ان کے دم مار جاتا ہے۔ جیسے وہ کاٹھ کی کرسیاں ہوں۔ لڑکے اس سے بڑی نفرت کرتے ہیں۔ لیکن وقتی ضرورتیں جذبات پہ غالب آتی ہیں۔

"سنو نینا" دانیا اپنی آنکھیں خوب پھیلا کر کہتا ہے۔ "نیرو کو ان کا باپ بنا دو۔ گھوڑے کو نہیں۔ گھوڑا بے جان ہے۔ اور یہ جاندار ہیں۔ سمجھے۔"

پوری شام وہ اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب اباجان تاش کھیلنے بیٹھیں گے [illegible] نیرو کو [illegible] کے دیکھے ہوئے باورچی خانے لینا ممکن ہوگا...... آخر کار اباجان تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ امی سماوار گرم کرتی ہے۔ اور لڑکوں کو نہیں دیکھ رہی ہے۔

وہ مبارک وقت آجاتا ہے۔

"آؤ" دانیا چپکے سے نینا کے کان میں کہتا ہے۔

لیکن اس وقت اسٹفن اندر آتا ہے اور خبر سناتا ہے۔

"بیگم صاحبہ۔ نیرو نے بچے کھائیے۔"

"سچ کہتا ہوں اُس نے کھا لئے...... نوکر ہنستا ہے۔ "وہ ڈبوں کے پاس گیا اور ہڑپ کر گیا۔"

لڑکے منتظر ہیں کہ گھر بھر بدحواس ہو جائیگا۔ اور بدمعاش نیرو کو سزا ملے گی۔ لیکن سب اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اس بیہودہ کتے کی بھوک پہ صرف حیرت ظاہر کرتے ہیں۔ امی اور اباجان ہنستے ہیں۔ نیرو میز کے پاس چکر لگاتا ہے۔ دم ہلاتا ہے اور اپنے ہونٹ مزے سے چاٹتا ہے...... بلی ہی ایک ہے جسے چین نہیں ہے۔ اپنی دُم ہوا میں اٹھائے وہ کمرے کمرے بھٹکتی ہے۔ اور لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور درد سے کراہتی ہے۔

"لڑکو! نو بج چکے۔ امی کہتی ہے اب سونے کا وقت ہے۔"

دانیا اور نینا بستر پہ جاتے ہیں۔ آنسو گراتے ہیں۔ اور بڑی دیر تک بیمار اور نڈھال بلی اور بے رحم و بدتمیز نیرو کے حال پہ جسے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ کفِ افسوس ملتے ہیں۔

(ترجمہ)

حامد علی خان

مصوّر کا راز

چند سال گذرے میں نے چارلسٹن سے نیویارک جانے کے لئے ڈاک کے ایک جہاز میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرائی۔ جہاز کے کپتان کا نام ہارڈی تھا۔ موسم کی مساعدت کی صورت میں جہاز پندرھویں جون کو روانہ ہونے والا تھا۔ تاریخِ روانگی سے ایک دن قبل میں اپنے سفر کے متعلق بعض انتظامات کے لئے جہاز پر گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جہاز پر کثیر التعداد مسافر جانے والے تھے جس میں خواتین کی تعداد معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ مسافروں کی فہرست پر نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے کئی میرے شناسا تھے۔ دوسرے ناموں میں مجھے کارنیلیس وائٹ کا نام بھی نظر پڑا جسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ یہ ایک نوجوان مصوّر تھا جس سے میری بہت پُرخلوص دوستی تھی۔ کالج میں ہم دونوں نے ایک ساتھ تعلیم پائی تھی اور ایک دوسرے کی صحبت میں گھڑیاں گذار چکے تھے۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مالک تھا۔ اس قسم کے لوگ بالعموم انسانی صحبت سے متنفر، ذکی الحس اور جوشیلے ہوتے ہیں۔ یہی حالت کارنیلیس وائٹ کی تھی لیکن ان صفات کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک انتہا درجہ کا وفاشعار اور محبت بھرا دل تھا۔

میں نے دیکھا کہ جہاز کے تین کمروں پر اس کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ مسافروں کی فہرست پر دوبارہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اور دو بہنیں بھی اس کے ساتھ جا رہی تھیں۔ جہاز کے کمرے زیادہ تنگ نہ تھے اور ہر کمرے میں سونے کے لئے اوپر تلے دو دو خواب گاہیں تھیں جن میں سے ہر ایک پر بمشکل صرف ایک آدمی سو سکتا تھا۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ان چار نفوس کے لئے تین کمرے کیوں مخصوص کئے گئے تھے۔ اس وقت میری دماغی کیفیت کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی جس میں انسان غیر متعلق باتیں معلوم کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ متجسّس بن جاتا ہے اور میں بہ ندامت اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت میں زائد کمرے کے متعلق طرح طرح کے لغو اور احمقانہ قیاسات دوڑانے میں مصروف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اس معمّے کو حل کرنے میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ آخر میں ایک نتیجہ پر پہنچا اور مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہ سمجھ لی۔ تیسرا کمرہ غالباً کسی ملازم کے لئے تھا۔ میں نے دل میں کہا میں بھی عجیب احمق ہوں کہ اتنی کھلی ہوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بعد میں نے پھر ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ کوئی ملازم ان کے ساتھ نہ جا رہا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ پہلے وہ کسی ملازم کو

ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ فہرست میں "بہ معیت ملازم" کے الفاظ پہلے لکھے گئے تھے۔ پھر میں نے دل میں کہا غالباً یہ کمرہ زائد سامان رکھنے کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز ہوگی جسے بغرضِ حفاظت وہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ یہ کوئی تصویر ہوگی اور غالباً وہی جس کی فروخت کے متعلق وہ اطالوی یہودی نکولینو سے بات چیت کرتا رہا تھا۔ اس خیال نے میرا اطمینان کرا دیا اور اس وقت کے لئے میں اپنے تجسس سے کنارہ کش ہو گیا۔

وائٹ کی دونوں بہنوں کو تو میں جانتا تھا وہ دونوں بہت ذہین اور زندہ دل لڑکیاں تھیں۔ البتہ اس کی بیوی سے مجھے واقفیت نہ تھی جس سے ان دنوں وہ نیا نیا بیاہا گیا تھا۔ میرے سامنے بھی وہ اپنی بیوی کا ذکر کئی مرتبہ اپنے مخصوص پُرجوش انداز میں کر چکا تھا۔ وہ اس کے حیرت انگیز حُسن، اس کی فراست اور اس کی شائستگی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کا تعارف حاصل کرنے کے لئے بیتابی سے منتظر تھا۔

جس دن میں جہاز پر گیا (چودہ جون کو) اسی دن وائٹ اور اس کے ہمراہی بھی جہاز پر آنے والے تھے، یہ بات مجھے کپتان سے معلوم ہوئی اور میں نے دلہن سے متعارف ہونے کی امید میں اپنے مجوزہ وقت سے ایک گھنٹہ زائد جہاز پر گذار دیا۔ آخر معذرت کا ایک رقعہ پہنچا کہ مسز وائٹ کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور وہ کل روانگی کے وقت سے پہلے جہاز پر نہ آ سکیں گی۔

دوسرے دن صبح اپنے ہوٹل سے نکل کر میں بندرگاہ کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کپتان ہارڈی سے میری مڈبھیڑ ہو گئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ "بعض وجوہ کی بنا پر (ایک مہمل لیکن آسان بہانہ) میں نے جہاز کی روانگی ایک دو دن کے لئے ملتوی کر دی ہے۔ تیاری مکمل ہونے پر میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔" یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ اس دن تیز جنوبی ہوا چل رہی تھی جو ہمارے سفر کے لئے ہر طرح سازگار تھی۔ لیکن چونکہ میرے متواتر اصرار کے باوجود "بعض وجوہ" کے چہرے سے نقاب نہ اٹھ سکا اس لئے میں مجبوراً واپس چلا آیا اور صبر کے ساتھ جہاز کی روانگی کی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔

پورا ایک ہفتہ گذر گیا لیکن مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ آخر سخت انتظار کے بعد اطلاع آئی اور میں فوراً جہاز پر پہنچا۔ جہاز مسافروں سے لدا ہوا تھا۔ ہر طرف اس گہما گہمی اور چہل پہل کے آثار نمایاں تھے جو جہاز کے روانہ ہونے کے وقت نظر آیا کرتی ہے۔ وائٹ اور اس کے ہمراہی میرے پہنچنے کے دس منٹ بعد آئے۔ میں نے دونوں بہنوں، دلہن اور مصوّر پر نظر ڈالی۔ آخر الذکر کے چہرے سے اس وقت سخت بیزاری اور بے دلی کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ یہ اس کی فطرت کا خاصہ تھا اس لئے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نے اپنی بیوی سے میرا تعارف بھی خود نہ کرایا بلکہ یہ فرض مجبوراً اس کی بہن میرین کو ادا کرنا پڑا جو ایک بہت خوش اخلاق اور ذہین لڑکی ہے۔ مسز وائٹ کے چہرے پر گہرا نقاب پڑا ہوا تھا اور جب اس نے میرا آداب قبول کرتے ہوئے اخلاقاً اپنا نقاب اٹھایا تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ یہ تعجب اور بھی زیادہ ہوتا اگر مجھے تجربہ سے یہ بات معلوم نہ ہو چکی ہوتی کہ میرے مصوّر دوست کے پُرجوش بیانات اس وقت بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے جب وہ عورت کے حُسن کی تعریف کر رہا ہو۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ جب کبھی گفتگو کا موضوع حُسن ہو تو میرے دوست کا دماغ خالص مثالی حُسن کی جنتوں میں پہنچ جایا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسز وائٹ کو میں نے شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل سیدھی سادھی عورت پایا، بلکہ شاید بدصورت کا لفظ بھی اس پر صادق آ سکتا تھا۔ ہاں اس کے لباس سے بلاشبہ غیر معمولی سلیقہ نمایاں ہو رہا تھا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ میرے دوست کو غالباً دل و دماغ کی مقابلتاً زیادہ پائدار خوبیوں نے مسحور کیا ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد مسز وائٹ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میرا پرانا تجسس پھر مجھ پر غلبہ پانے لگا۔ کسی ملازم کی ہم سفری کا تو شائبہ تک نہ رہا تھا اس لئے میں زائد سامان کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد بندرگاہ پر ایک گاڑی آ کر رُکی جس میں صنوبر کا ایک مستطیل صندوق رکھا تھا۔ اسی کا انتظار تھا، اس کے پہنچنے پر جہاز نے فوراً لنگر اٹھا لیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم بندرگاہ سے نکل کر سمندر میں پہنچ گئے۔

یہ مستطیل صندوق جس کا میں نے ذکر کیا ہے طول میں چھ فٹ اور عرض میں ڈھائی فٹ تھا۔ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا اس لئے میں اس کی ٹھیک ٹھیک پیمائش بتا سکتا ہوں۔ بلاشبہ اس صندوق کی ہیئت انوکھی تھی اور اس کو دیکھتے ہی مجھے اپنے قیاس کی صحت پر فخر ہوا۔ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ

مصوّر کا زائد سامان ضرور ایک یا زیادہ تصاویر پر مشتمل ہوگا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ تصویر کے متعلق ہفتوں نکولینو سے گفتگو کرتا رہا ہے۔ صندوق کی صورت دیکھ کر میرا یہ گمان غالب تھا کہ اس میں لیونارڈو کی مشہور تصویر "عشائے ربّانی"[1] کی نقل ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسی تصویر (عشائے ربّانی) کی ایک اور نقل فلارنس کے ایک مشہور مصوّر کے ہاتھ کی بنی ہوئی نکولینو کے پاس پہلے بھی موجود ہے۔ بس مجھے اپنے موجودہ قیاس کی صحت میں بھی کوئی شبہ نہ رہا اور میں اپنی دقیقہ رسی کا خیال کر کے بہ طمانیت زیرِ لب متبسم ہوا۔ وائٹ نے غالباً اب تک اپنی تصویروں کے متعلق کوئی راز مجھ سے نہ چھپایا تھا لیکن اب وہ مجھ سے کنیا رہا تھا اور میری آنکھوں میں مُسلسل جھونک کر ایک نفیس تصویر کو مجھ سے بالا بالا نیویارک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی چپکے چپکے اسے جی بھر کر ستانے اور دِق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک بات اب بھی میرے لئے بہت پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ یہ کہ مستطیل صندوق زائد کمرے میں نہ رکھا گیا بلکہ وائٹ نے اسے اپنے کمرے میں رکھوایا۔ صندوق کمرے کی تقریباً تمام سطح پر چھا گیا اور مجھے یقین تھا کہ مصوّر اور اس کی بیوی کے لئے بہت کچھ باعثِ تکلیف بن رہا ہوگا۔ بالخصوص اس لئے کہ تارپین یا جس روغن سے اس صندوق پر بڑے بڑے حروف لکھے گئے تھے اس سے نہایت تیز اور ناگوار بلکہ میرے نزدیک ایک حد تک کریہہ بُو پیدا ہو رہی تھی۔ ڈھکنے پر یہ الفاظ لکھے گئے تھے: "مسز ایڈیلیڈ کرٹس، البنی، نیویارک۔ بہ تحویل مسٹر کرنیلیس وائٹ۔ بہ جانب اوپر۔ بہ احتیاط اٹھایا جائے۔"

مجھے یہ معلوم تھا کہ مسز ایڈیلیڈ کرٹس مصوّر کی بیوی کی والدہ ہیں لیکن میرے نزدیک یہ پتہ وغیرہ محض ایک فریب تھا جو خاص طور پر میرے لئے کھیلا گیا تھا۔ اس لئے مجھے پورا یقین تھا کہ اس صندوق اور اس کی اشیا کا آخری ٹھکانا نیویارک میں میرے دوست کے تصویر خانے کے سوا اور کوئی نہیں۔

اگرچہ ہوا جہاز کی روانگی کے بعد ہی مخالف سمت اختیار کر چکی تھی مگر پہلے دو چار دن تک موسم اچھا رہا۔ تمام مسافر خوش تھے اور اپنے وقت کا بہت سا حصہ ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے میں گذارتے تھے۔ البتہ وائٹ اور اس کی بہنوں کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ وائٹ کی حالت تو تعجب کے قابل نہ تھی اگرچہ وہ بھی معمول سے زیادہ خاموش بلکہ اندوہ گیں نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی بہنوں کی روش بہت تعجب انگیز تھی کیونکہ باوجود میرے اصرار کے وہ دوسرے مسافروں سے دلچسپی نہ لیتی تھیں اور انہوں نے بھی سفر کا زیادہ حصّہ اپنے کمروں کی تنہائی میں گذارا۔

مسز وائٹ کا طرزِ عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ خوب باتیں کرتی تھی اور جہاز کی خواتین سے بہت جلد گھُل گئی۔ بلکہ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ اسے مردوں سے لگاوٹ کرنے میں بھی کسی قسم کا باک نہ تھا۔ اس نے ہم سب کو بہت محظوظ کیا۔ میں نے "محظوظ کیا" کہا ہے، اس لئے کہ اس سے زیادہ موزوں لفظ مجھے نہیں ملتا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مسز وائٹ دوسروں سے مل کر ہنسنے کے بجائے ان کو اپنے آپ پر ہنساتی تھی۔ مرد اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے لیکن عورتوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایک سیدھی سادھی، نیک دل، تربیت یافتہ اور بے انتہا گنوار عورت ہے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ وائٹ کس بات پر گرا ہے۔ اس عقدے کا عام حل دولت ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی صحیح نہ تھا کیونکہ وائٹ نے مجھ سے خود کہا تھا کہ "مجھے اس شادی سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں پہنچا، نہ اس کی توقع ہے۔ میں نے خالص محبت کے لئے شادی کی ہے اور میری بیوی کی غیر معمولی خوبیوں کے مقابلہ میں میری محبت ایک بالکل حقیر معاوضہ ہے۔" یہ الفاظ یاد کر کے میری عقل چکرا گئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میرے دوست کے ہوش و حواس معطل ہو چکے ہیں۔ بھلا مجھے اور کیا خیال آتا؟ اس جیسا نفیس مزاج، اس جیسا ذکی الفہم، اس جیسا بلند خیال جس کی نگاہیں عیب کو بھانپنے اور حُسن کو پہچاننے میں مہارتِ تامہ رکھتی تھیں، اس عورت کو اپنی زندگی کا مالک بنا چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کی بہت گرویدہ معلوم ہوتی تھی بالخصوص اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی محبت کا اظہار اور بھی زیادہ کرتی تھی۔ وہ بار بار اس قسم کی باتیں کہہ کر دوسروں کی تضحیک کا ہدف بنتی کہ "میرے پیارے شوہر وائٹ نے فلاں موقع پر چنال کہا اور فلاں موقع پر چنیں۔" لفظ شوہر اسی کے اندازِ بیان کے مطابق اسے ہر وقت نوکِ زبان رہتا تھا۔ اسی اثنا میں تمام اہلِ جہاز نے یہ محسوس کیا کہ وائٹ

---

[1] ایک مشہور تصویر جس میں حضرت مسیحؑ آخری مرتبہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک لمبی میز پر مصروفِ طعام نظر آتے ہیں۔

اپنی بیوی کی صحبت سے عمداً گریزاں رہتا تھا وہ زیادہ اپنے کمرے میں تنہا بند رہتا تھا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا اور اس کی بیوی کو پوری آزادی حاصل تھی کہ حسب منشا جہاز کے مسافروں کی مجالس میں اپنا دل بہلاتی رہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بیچارہ مصوّر قسمت کے کسی اَن بوجھے پھیر میں آکر یا فریب انگیز جذبات کی کسی جنونی کیفیت کا شکار ہو کر اپنے سے ہر طرح ادنیٰ درجہ کی عورت سے نادانستہ طور پر وابستہ ہو گیا ہے اور اس قسم کی وابستگی کا قدرتی نتیجہ صریح اور قطعی نفرت کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ مجھے اس کی حالت سخت قابلِ رحم معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں "عشائے ربانی" کے معاملہ میں اس کی خاموشی کو پوری طرح قابلِ معافی نہ سمجھ سکتا تھا اور اس کے لئے میں اس سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک دن وہ جہاز کے عرشے پر آیا میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کا بازو تھام کر ادھر اُدھر چکّر لگانے شروع کئے۔ اس کی افسردہ دلی جسے میں ان حالات میں بالکل بجا سمجھتا تھا، ذرا بھی کم نہ ہوتی تھی۔ اس نے بہت سخت کوشش سے ایک آدھ بات کی۔ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے ہنسی مذاق کی کچھ باتیں کیں اور اس نے بے دلی سے مسکرانے کی کوشش بھی کی لیکن جب میں نے اس کی بیوی کا خیال کیا تو اس بے چارے پر سخت رحم آیا اور مجھے تعجب ہوا کہ وہ مسکراہٹ کے یہ برہم آثار بھی کیونکر اپنے چہرے سے ظاہر کر سکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے آخر کار چھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا ارادہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مستطیل صندوق کے متعلق مرموز اشارات و کنایات کا ایک سلسلہ شروع کروں گا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ میں بالکل اس کی اس پُرلطف فریب کاری کا شکار ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے میں نے پردے پردے میں اس پر وار کرنے شروع کئے۔ چنانچہ میں نے "اس صندوق کی عجیب و غریب ہیئت" کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں عیارانہ ہنسی ہنسا اور پھر شرارت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے داہنے ہاتھ کی انگلی سے اس کی پسلی کو چھوا گویا مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

میرے اس بے ضرر سادہ مذاق پر وائٹ کی جو کیفیت ہوئی وہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بالکل پاگل ہو چکا ہے۔ پہلے وہ اس طرح ٹکٹکی لگا کر میری طرف دیکھنے لگا گویا وہ میرے مذاق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد بظاہر میرے مذاق کا صحیح مفہوم بتدریج اس کے دماغ پر روشن ہونے لگا اور اسی نسبت سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کنڈریوں میں سے نکل کر باہر آنے لگے۔ اس کے بعد اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور پھر خوفناک طور پر زرد۔ پھر اس نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ گویا میرے مذاق سے وہ بہت خوش ہوا ہے۔ لیکن یہ قہقہہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور غالباً دس منٹ تک قہقہوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر وہ جہاز کے فرش پر زور سے چت گر گیا۔ جب میں اسے اٹھانے کے لئے دوڑ کر پہنچا تو وہ بظاہر بالکل مردہ ہو چکا تھا۔

میں مدد کے لئے چلّایا اور سخت جد و جہد کے بعد ہم اسے آپے میں لائے۔ ہوش آنے پر بھی وہ کچھ دیر تک خفقانی باتیں کرتا رہا۔ آخر فصد کھول کر ہم نے اس کا لہو لیا اور اسے بستر پر ڈال دیا۔ دوسرے دن اس کی جسمانی صحت اچھی نظر آتی تھی۔ البتہ اس کی دماغی کیفیت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کپتان کے حسب ہدایت میں اس کے بعد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کے ہوش و حواس کے تعطل کے متعلق کپتان مجھ سے پوری طرح متفق تھا لیکن اس نے مجھے جہاز کے دوسرے مسافروں کے سامنے اس قسم کا ذکر کرنے سے محترز رہنے کی تاکید کر دی۔

اس واقعہ کے بعد جلد جلد متعدد ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے میرے تجسّس کو اور بھی بڑھا دیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ مقدار میں سبز چائے پینے سے بے خوابی کی شکایت ہو گئی اور دو راتیں تو میں نے تقریباً آنکھوں میں گذار دیں۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ کھانے کے بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ وائٹ کے تینوں کمرے اس بڑے کمرے کے پیچھے تھے جنہیں ایک ہلکا پھلکا دروازہ بڑے کمرے سے جدا کرتا تھا۔ یہ دروازہ رات کو بھی کبھی مقفل نہ کیا جاتا تھا چونکہ ہوا مسلسل جہاز کے مخالف ہی رہی اور رہتی بھی خوب تیز اس لئے جہاز کا ایک پہلو ہوا کی سمت مخالف میں خاصا دبا رہتا۔ چنانچہ جب کبھی جہاز کا سیدھا پہلو ہوا کے بہاؤ کے مقابل ہوتا وہ ہلکا پھلکا دروازہ خود بخود کھل جاتا اور اسی طرح کھلا رہتا کیونکہ کوئی شخص اٹھ کر اسے بند کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ اب میرا کمرہ ایسے مقام پر تھا کہ جب اس طرف کا دروازہ کھلا ہوتا اور یہ گرمی کی وجہ سے میں ہمیشہ کھلا رکھتا تھا، تو ہلکے پھلکے کھلے دروازے میں سے مجھے

جہاز کے اس حصّے کی بھی جھلک نظر آجاتی تھی جہاں وائٹ کے کمرے واقع تھے۔ جو دو راتیں میں نے بیداری کی حالت میں گذاریں ان میں میری توجہ ایک نئی بات کی طرف منعطف ہوئی۔ وہ یہ کہ رات کے تقریباً گیارہ بجے مسز وائٹ اپنے شوہر کے کمرے سے نکل کر باحتیاط زائد الگ کمرے میں چلی جاتی جہاں رات کا باقی حصّہ گذارتی اور علی الصباح وائٹ کے بلانے پر وہ پھر اس کمرے میں چلی آتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں فی الحقیقت جدا ہو چکے ہیں اور یہ علیحدہ کمرے ان کی مستقل علیحدگی اور طلاق کا پیش خیمہ ہیں۔ اس طرح آخر کار زائد کمرے کا راز بھی کھل گیا۔

ایک اور واقعے نے بھی مجھے متوجہ کیا۔ میرے مذکورہ دو رتجگوں میں مسز وائٹ کے الگ کمرے میں جانے کے بعد اس کے شوہر کے کمرے سے مجھے دھیمی دھیمی دبی دبی سی آہٹ سنائی دیتی۔ کچھ دیر تک اس آہٹ کو بغور سننے کے بعد میں اس کی اصلیت سمجھ گیا۔ یہ مصوّر کی چوبی مستطیل صندوق کھولنے کی آواز تھی جو اس کے ہتھوڑے وغیرہ سے پیدا ہوتی تھی۔ ہتھوڑے کا سر اس نے آواز کو دبانے کے لئے غالباً کسی نرم اونی یا سوتی چیز میں لپیٹ رکھا تھا۔

اس طرح مجھے اپنے قیاسات پر اتنا اعتماد ہو گیا گویا میں ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہوں کہ کس وقت وہ صندوق کا ڈھکنا علیحدہ کر چکتا ہے، کس وقت اسے اٹھاتا ہے اور کس وقت پلنگ پر رکھتا ہے، آخری بات مجھے اس طرح معلوم ہوتی کہ جب لکڑی کا ڈھکنا پلنگ کے چوبی کناروں سے مَس کرتا تو خفیف سی آواز نکلتی۔ فرش پر صندوق کا ڈھکنا رکھنے کے لئے بالکل گنجائش نہ تھی اس لئے وہ بہ احتیاط تمام اسے پلنگ ہی پر رکھتا تھا۔ اس کے بعد اس کے کمرے میں سکوتِ مزار چھا جاتا اور گجر تک یہی حالت رہتی۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض وقت مجھے دھوکا سا ہوتا کہ میرے کان سسکیوں کی آواز سن رہے ہیں لیکن یہ بھی اتنی دبی ہوئی ہوتی کہ میں اسے محض اپنے واہمۂ خلاق کا کرشمہ قرار دے سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ آواز سسکیوں اور آہوں سے مشابہ تھی لیکن دراصل یہ اتنی موہوم تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ میرے کان بج کر مجھے دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وائٹ کو اس کا مصوّرانہ ذوق اشتیاق مالا یطاق بن کر صندوق کھولنے اور بیش بہا تصویر کے نظارے سے بھوکی نگاہوں کی تسکین کا سامان فراہم کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ پھر بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات تھی؟ پس میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کپتان ہارڈی کی سبز چائے کے صدقے میں یہ فریبِ سماعت میری اپنی ہی پریشان دماغی کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو راتوں میں میں نے آہٹ ہی سے واضح طور پر معلوم کر لیا کہ وائٹ صبح کے قریب صندوق پر ڈھکنا رکھ کر اپنے بے آواز ہتھوڑے سے پہلے ہی سوراخوں میں دوبارہ کیلیں لگا دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے دن کے لباس میں کمرے سے باہر نکلتا اور جا کر مسز وائٹ کو اس کے کمرے سے بلا لاتا۔

جہاز کے سفر کا ساتواں دن تھا کہ جنوب مغرب سے تند ہوا کا ایک خوفناک طوفان اٹھا۔ ہم ایک حد تک اس کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ عناصر ہمیں پہلے ہی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے لگا دی گئی اور جب ہوا رفتہ رفتہ زیادہ تیز ہوئی تو ہم نے بادبان لپیٹ کر نیچے کر دئیے۔ ۴۸ گھنٹے تک ہم اسی طرح بہ حفاظت جاتے رہے لیکن اس کے بعد غضب کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا جس نے پچھلے بادبان کے پرنچے اڑا دئیے۔ اب جہاز میں پے بہ پے پانی کی کئی موجیں آنی شروع ہوئیں جن کی وجہ سے جہاز کا مطبخ اور عرشے کے کٹہرے کا بایاں حصہ سارا گر گیا اس کے ساتھ ہی تین آدمیوں کی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔ ابھی ہم اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ سامنے کے بادبان کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس کے بعد ہم نے ایک چھوٹا سا مضبوط طوفانی بادبان لگایا جس نے چند گھنٹوں تک بہت اچھا کام دیا۔

ہوا کا وہی زور شور تھا اور اس کے تھمنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جہاز کے مستول وغیرہ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئے اور ان پر ہوا کی شدّت کا بہت اثر پڑا۔ طوفان کے تیسرے دن پچھلا مستول ہوا کے ایک زوردار ریلے کے ساتھ جہاز کے ایک پہلو پر آرہا اور جہاز بُری طرح ڈگمگانے لگا۔ متواتر ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ہم اس مستول سے خلاصی پانے میں کامیاب ہوئے لیکن اس وقت نجّار دوبالہ جہاز کی طرف آیا جس نے اطلاع دی کہ جہاز کے زیریں حصّے میں چار بالشت پانی جمع ہو چکا ہے۔ مصیبت پر مصیبت یہ پڑی کہ جہاز کے آب کش درست حالت میں نہ تھے بلکہ تقریباً بے کار ہو چکے تھے۔

اب ہر طرف سخت بدحواسی اور ناامیدی پھیل گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے جہاز کا بار ہلکا کرنے کے لئے سامان سمندر میں پھینکنا شروع کیا اور باقیماندہ دو مستول بھی کاٹ کاٹ کر پھینک دیئے۔ آب کش اب بھی کوئی کام نہ دے سکے۔ بلکہ اس اثنا میں پانی اور بھی سرعت کے ساتھ رسنا شروع ہو گیا۔

غروبِ آفتاب کے وقت طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور ہمیں کچھ موہوم سی امید تھی کہ شاید ہم کشتیوں کی مدد سے اپنی جانیں بچا سکیں گے۔ رات کے آٹھ بجے بادل کھل گئے اور چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ یہ ہمیں اپنے لئے ایک اچھا شگون معلوم ہوا۔ چنانچہ ہمارے پژمردہ دلوں میں نامعلوم طور پر مسرت جھلکنے لگی۔

سخت جدوجہد کے بعد ہم نے کوئی حادثہ پیش آئے بغیر بڑی کشتی سمندر میں اتاری جس میں تمام ملاح اور اکثر مسافر سوار کئے گئے۔ یہ لوگ فوراً روانہ ہو گئے اور تین دن کی جانکاہ تگ و دو کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

اب کپتان کے علاوہ چودہ مسافر جہاز میں تھے جو دنبالے والی چھوٹی کشتی کے بھروسے پر زندگی کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ اس کو ہم نے بآسانی سمندر میں اتار لیا۔ اس میں کپتان اور اس کی بیوی، وائٹ اور اس کے متعلقین، ایک فوجی افسر کی بیوی اور چار بچے اور میں مع ایک حبشی ملازم کے سوار ہوا۔ کشتی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چند ضروری اوزار اور کھانے پینے کا کچھ سامان رکھنے کے بعد اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی اور کوئی دوسری چیز بچانے کا کسی کے دل میں بھی خیال نہ آ سکتا تھا۔ پھر آپ جانتے ہم سب کی حیرت کی کیا انتہا رہی ہوگی جب کشتی جہاز سے دس ہیں ہاتھ کے فاصلہ پر پہنچی اور وائٹ نے دنبالہ کشتی میں کھڑے ہو کر نہایت اطمینان سے کپتان سے مطالبہ کیا کہ میرا مستطیل صندوق لانے کے لئے کشتی واپس لے جائی جائے۔

کپتان نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا، "مسٹر وائٹ بیٹھ جائیے، اگر آپ بالکل بے حرکت اور خاموش نہ بیٹھے رہیں گے تو کشتی کو الٹ کر ہم سب کو ڈبو دیں گے۔ کیونکہ کشتی بوجھ سے پہلے ہی دب رہی ہے اور پانی اس کے کناروں تک پہنچ رہا ہے۔"

وائٹ نے اسی طرح کھڑے کھڑے، بلند آواز سے کہا، "صندوق! مسٹر ہارڈی، میرا صندوق! آپ میری درخواست کو کس طرح رد کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں، اس کا بوجھ تو بالکل برائے نام ہے۔ وہ تو بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ آپ کو اپنی والدہ مرحومہ کی قسم، آپ کو خدا کی محبت کا واسطہ، اپنی نجات کی امید کے صدقے میں میری درخواست کو نہ ٹھکرائیے اور صندوق لانے کے لئے واپس چلئے۔"

اس کی یہ درد بھری التجائیں سن کر کپتان کا دل بظاہر کچھ دیر کے لئے پسیج گیا، لیکن جلد ہی اس نے پھر وہی ترش روئی اختیار کر کے جواب دیا، "مسٹر وائٹ آپ دیوانے ہیں۔ میں آپ کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں کر سکتا۔ بیٹھ جائیے میں کہتا ہوں۔ آپ کشتی کو الٹ کر سب کو ڈبو دیں گے ——— ٹھہرئیے ——— پکڑو اسے روکو ——— وہ چھلانگ لگا رہا ہے، وہ! مجھے یہی اندیشہ تھا ——— بس گیا۔"

ابھی یہ الفاظ کپتان کے لبوں ہی پر تھے کہ وائٹ نے فی الحقیقت چھلانگ لگا دی اور چونکہ شکستہ جہاز کی اوٹ میں ہوا کا زور کم تھا وہ فوق الانسانی ہمت کے ساتھ جہاز سے لٹکے ہوئے ایک رسے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ طرفۃ العین میں وہ عرشۂ جہاز پر نظر آیا اور پھر دیوانہ وار نیچے اپنے کمرے کی طرف اتر گیا۔

اس اثنا میں موجیں ہماری کشتی کو جہاز کی اوٹ سے نکال کر دور لے گئی تھیں اور اب ہم ہیبت ناک سمندر کی طوفان خیز موجوں کا بازیچہ بنے ہوئے تھے۔ ہم نے واپس جانے کی پوری کوشش کی لیکن دہشت ناک طوفانی ہوا کے سامنے ہماری کشتی ایک تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ قضا نے بد انجام مصور کی موت کے پروانے پر مہر لگا دی ہے۔

ہم بسرعت تمام دور دور ہو رہے تھے مگر ہم نے دیکھا کہ جہاز کے بغلی زینہ میں دیوانہ شخص (یہی اسے ہم کہہ سکتے تھے) نمودار ہوا۔ وہ ایک دیوزاد کی قوت کے ساتھ پورا صندوق کا صندوق گھسیٹتا ہوا زینے پر چڑھ رہا تھا۔ ہم اس کی طرف فرطِ حیرت سے بغور دیکھ رہے تھے کہ اس نے تین انچ موٹا ایک رسہ پہلے جلدی سے صندوق کے گرد لپیٹا اور پھر جلد جلد اس کو کئی چکر اپنی کمر کے گرد دے لئے۔ اس کے بعد دفعتہً صندوق اور اس سے بندھا ہوا آدمی دونوں سمندر میں تھے اور چشم زدن میں دونوں ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہ میں غائب ہو گئے۔

فرطِ تاسف سے کچھ دیر کے لئے ہمارے چپو رک گئے اور ہماری آنکھیں اس جگہ پر جم گئیں۔ اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔ ایک گھنٹے تک ہم بالکل چپ چاپ رہے۔ اس کے بعد میں نے خاموشی کا سلسلہ توڑنے کی جرأت کی "کپتان صاحب! آپ نے دیکھا وہ دونوں کس طرح دفعتہً ڈوب گئے کیا

آپ کے خیال میں یہ عجیب بات نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ اپنا جسم صندوق سے باندھ کر سمندر میں کودا تو مجھے اس کی زندگی کی خفیف سی امید ہو گئی تھی۔"

کپتان نے کہا "یقیناً وہ گولی کی طرح تہ کی طرف گئے ہیں مگر نمک کے گھل جانے کے بعد وہ پھر ابھریں گے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا "نمک کیا معنی؟"

کپتان نے متوفی کے پس ماندہ عزیزوں کی طرف دیکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ کسی مناسب موقع پر پھر یہ باتیں ہوں گی۔

ہزار قسم کی صعوبتیں جھیل کر چار دن کے بعد آخر ہم بمشکل اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے اور ایک مشہور جزیرے تک پہنچے لیکن ہم سب نیم جان ہو رہے تھے۔ جزیرے کے باشندے ہم سے ہمدردانہ طور پر پیش آئے اور وہاں پورا ایک ہفتہ گذارنے کے بعد ہم ایک جہاز میں نیویارک کو روانہ ہو گئے۔

جہاز کو غرقاب ہوئے ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ ایک دن اتفاقاً ایک تفریح گاہ میں کپتان ہارڈی سے میری ملاقات ہو گئی۔ جہاز کی تباہی اور بالخصوص بیچارے وائٹ کا المناک انجام قدرتاً ہمارا موضوعِ گفتگو بنا اور اس سلسلے میں مجھے حسبِ ذیل واقعات معلوم ہوئے:

مصور نے اپنے لئے، اپنی بیوی کے لئے، دو بہنوں کے لئے اور ایک ملازمہ کے لئے جگہ محفوظ کرائی تھی۔ اس کی بیوی جیسا کہ وہ خود کہتا تھا، بے انتہا حسین، بے انتہا سلیقہ مند اور بے انتہا مہذب تھی۔ جون کی چودھویں کی صبح کو (جس دن میں جہاز پہ گیا) یہ خاتون دفعتہً علیل ہو کر جاں بحق ہو گئی۔ نوجوان شوہر غم سے دیوانہ ہو گیا۔ لیکن ناگوار وجوہ سے نیویارک کے سفر کا التوا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی لاش اس کی ماں کے پاس پہنچانا ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن ایک مشہور عام وہم جہاز میں لاش کو علانیہ طور پر لے جانے سے مانع آتا تھا کیونکہ غالباً نوّے فی صدی مسافر ایک لاش کی ہم سفری پر ترکِ سفر کو ترجیح دیتے۔

اس مشکل کا حل کپتان ہارڈی نے یہ تجویز کیا کہ لاش کو خوشبودار مسالہ لگا کر کثیر المقدار نمک کے ساتھ ایک بڑے صندوق میں بند کر کے تجارتی سامان کی طرح جہاز پر پہنچایا جائے۔ مسز وائٹ کی وفات کو پردۂ راز میں رکھا گیا اور چونکہ مصور اپنی بیوی کے لئے جہاز میں جگہ محفوظ کرا چکا تھا اس لئے ضروری ہوا کہ کوئی دوسری عورت اس کے نام سے جہاز میں سفر کرنے کے لئے آمادہ کی جائے۔ متوفی خاتون کی خادمہ بلا دقت اس فرض کی بجا آوری پر رضامند کر لی گئی۔ زائد کمرہ جو مصور کی بیوی کی زندگی میں اس ملازمہ کے لئے مخصوص کیا گیا تھا، بحال رہا۔ بناوٹی بیوی ہر شب اس کمرے میں سوتی تھی۔ دن بھر وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنے مقدور کے مطابق بہ تصنع اپنی مرحوم مخدومہ بنی رہتی جس سے جہاز کے مسافروں میں سے کوئی بھی روشناس نہ تھا۔ اس بات کے متعلق کپتان اور مصور پوری طرح اطمینان کر چکے تھے۔ میری اپنی غلط فہمیوں کا ماخذ قدرتاً میری بے حد غیر محتاط، بے حد متجسس اور بے حد ذکی الحس طبیعت تھی۔ لیکن اب ایک مدت سے رات کی نیند میں کبھی آرام سے نہیں سویا۔ ایک آفت زدہ چہرے کا ہولناک تصور ہر وقت میری آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے اور ایک جنونی قہقہے کی وحشت ناک آواز ہر وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

(ترجمہ)

فضل حق قریشی

دلہن کی پوشاک

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مکان دیکھے ہیں۔ چھوٹے بڑے، جدید وقدیم، سنگین اور چوبی ...... لیکن ایک مکان کی یاد بہت واضح طور پر میرے دل میں باقی ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مکان نہیں بلکہ ایک جھونپڑا تھا۔ وہ تین کھڑکیوں والی ایک منزلہ عمارت تھی اور ایک ضعیف کوز پشت کے مانند جس کی کمر پہ ایک ٹوپی رکھی ہو ــــــــــ عجیب وغریب معلوم ہوتی تھی۔ اس کی استرکاری کی دیواریں، ٹائل کی چھتیں اور خستہ حال دود کش پہ سرسبز بیلیں اس طرح چھائی ہوئی تھیں گویا مکان کاہی کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔

شہتوت، کیکر اور چنار کے درخت جو گھر والوں کے آباؤ اجداد نے لگائے تھے، اس قدر گھنے ہو گئے تھے۔ کہ مکان بالکل روپوش ہو گیا تھا۔ وسیع صحن دو سرسبز جھنڈوں کی قطار میں تھا۔ وہ دراصل ایک سڑک کا حصّہ تھا۔ لیکن اس راستے پہ کوئی گاڑی وغیرہ نہیں چلتی تھی۔ اور شاذ و نادر ہی کوئی شخص اس راہ سے گذرتا دکھائی دیتا تھا۔

اس مختصر مکان کے دروازے ہمیشہ بند رہتے۔ اس کے اندر رہنے والے دھوپ کی مطلق پرواہ کرتے۔ اور نہ صاف روشنی سے مستفید ہوتے۔ کھڑکیاں بھی کبھی نہ کھلتیں۔ کیونکہ وہ تازہ ہوا حاصل کرنے کے متمنی نہیں تھے۔

ان لوگوں میں قدرت پرستی کے جذبات مطلق نہیں ہوتے جو عموماً کیکر، چنار اور شہتوت کے درختوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں صرف موسم سرما میں سفر کرنے والے سیاحوں کو خدا نے وہ آنکھیں عطا کی ہیں جو مناظر قدرت کی دلچسپیوں سے کامل طور پہ لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ باقی نوع انسان ان حسین نظاروں کے وجود سے غافل رہ کر قعر مذلت میں پڑی رہتی ہے۔

لوگ عموماً اس چیز کی قدر نہیں کرتے جو نہایت افراط سے پائی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے "جو چیز ہم آسانی سے حاصل کر سکیں اسے جمع کرنیکی ضرورت نہیں"۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ہم اس کی طرف راغب بھی نہیں ہوتے۔ یہ چھوٹا سا مکان سبز درختوں کی فردوس میں واقع ہے جس کے اندر چہچہانے والے پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ لیکن مکان کا اندرونی نقشہ ناقابل بیان ہے۔ موسم گرما میں بند رہنے کے باعث اندرونی حصّہ مثل تنور اور سرما میں ترکش حمام کی طرح گرم۔ جس میں نہ ہوا کی رمق ہوتی ہے نہ روشنی کا شائبہ۔

عرصۂ دراز ہوا کہ میں کارووباری سلسلہ میں اس چھوٹے مکان کے اندر پہلی مرتبہ داخل ہوا۔ میں کرنل کا جو مالک مکان تھا۔۔۔ ایک پیغام لے کر اس کے بیوی بچوں کے پاس گیا تھا۔ مجھے وہ پہلی ملاقات بہت واضح طور پر یاد ہے اس کو فراموش کر دینا میرے لئے ناممکن ہے۔

ذرا اپنے تصورات سے کام لے کر غور کیجئے کہ ایک کمزور اور پستہ قد عورت ۔۔۔ جس نے اپنی زندگی کی چالیس منزلیں طے کر لی ہیں۔ خوف و اضطراب کی حالت میں آپ پہ نظر جمائے ہوئے ہے۔ جب کہ آپ ملاقاتی کمرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ آپ ایک اجنبی ہیں۔ ایک ملاقاتی اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک نوجوان مرد۔ بس یہ احساس اس غریب عورت کو خوف زدہ اور پریشان حال کر دینے کے لئے کافی ہے خواہ آپ کے ہاتھ میں کوئی خنجر، کلہاڑی یا پستول وغیرہ نہ ہو۔ اور آپ نہایت خندہ پیشانی سے ملیں۔ پھر بھی آپ کو مخدوش سمجھا جائے گا۔

"مجھے کس شخص سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہے؟"

پستہ قد خاتون نے کپکپاتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ میں نے خود ہی اپنا تعارف کرا دیا اور اپنے جانے کی غرض و غایت بھی بیان کر دی اس کا خوف و اضطراب فوراً ایک خوشی کی چیخ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس نے اپنی نظر اٹھا کہ چھت کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز تمام کمرے میں گونج گئی۔ اور صدائے بازگشت کی طرح صدر دالان سے ملاقاتی کمرے اور ملاقاتی کمرے سے باورچی خانے میں اور باورچی خانے سے گودام میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ غرض تھوڑی دیر میں وہ آواز مختلف سروں میں تمام مکان کے اندر پھیل گئی۔

پانچ منٹ بعد میں بیٹھک کے اندر ایک بڑی اور نرم آرام کرسی پہ لیٹا ہوا اس آواز کو سن رہا تھا جو اس وقت تمام مکان پہ گونج رہی تھی۔

فضا میں مچھر مارنے کے سفوف اور تازہ چمڑے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسی کھال کا بنا ہوا ایک جوتا رومال میں لپٹا قریب کی کرسی پہ رکھا تھا۔ کھڑکیوں میں گلدستے سجے تھے۔ اور ململ کے پردے آویزاں تھے۔ جن پہ بے حد مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں پہ پادریوں کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں جن کو وارنش اور تیل وغیرہ سے بنایا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کے شیشے کناروں کے قریب سے شکستہ ہو گئے تھے۔ پادریوں کے بعد چوکھٹوں میں خاندان کے بزرگوں کی قطار تھی۔ جن کے چہرے بادیہ گرد قبائل کے طرز پہ زرد رنگ ہو گئے تھے۔ میز پر ایک انگشتانہ پیچک اور ایک نصف بنی ہوئی جراب رکھی تھی۔ نیز کاغذ کے کترے ہوئے چند خاکے کالی نیم آستینوں کے ساتھ لپٹے فرش پر پڑے تھے۔ ملحقہ کمرے میں دو گھبرائی ہوئی پریشان ضعیف عورتیں جلدی جلدی اسی جیسے کاغذ کے خاکے اور درزیوں کے استعمال میں آنے والی کھریا مٹی کے ٹکڑے فرش سے اٹھا رہی تھیں۔

"جناب آپ ہمیں معاف فرمائیں" پستہ قد خاتون نے کہا۔ ہمارے مکان میں بہت زیادہ بدنظمی رہتی ہے۔ دوران گفتگو میں خاتون نے اپنی نگاہیں ایک حالت کشمکش میں دوسرے کمرے کی طرف ڈالیں جہاں اس وقت تک کاغذ کے خاکے میز پہ سے چنے جا رہے تھے۔ دروازے کے کواڑ بھی کسی قدر پریشان معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک یا دو انچ کے قریب کھلے اور پھر فوراً بند ہو گئے۔

"آخر کیا بات ہے؟" پستہ قد خاتون نے دروازے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرے میں سے ایک دلکش نسوانی لہجے میں کسی نے جواب دیا۔ لیکن میں اس زبان کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ یا تو جرمنی تھی یا فرانسیسی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک دراز قد چھریرے بدن کی خوبصورت لڑکی جس کی عمر تقریباً انیس سال ہوگی، میری نظر کے سامنے تھی۔ وہ باریک ململ میں ملبوس گلٹ کی ایک پٹی اپنی کمر میں باندھے ہوئے تھی۔ جس کے اندر مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔۔۔ سیپ کا ایک نازک سا پنکھا لٹک رہا تھا۔

اُس نے اندر داخل ہو کر خوش اخلاقی سے سلام کیا۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی کہ ایک غیر مرد کمرے میں موجود ہے اس کا چہرہ موسم بہار کی شفق کی مانند سُرخ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کی لمبی ناک جس پر چیچک کے ننھے ننھے داغ تھے، سُرخی میں تبدیل ہوئی اس کے بعد اس کی آنکھوں اور پیشانی میں چمک کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"یہ میری لڑکی ہے۔ خاتون نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔" اور مریم یہ نوجوان اس غرض سے آئے ہیں ..... " وغیرہ وغیرہ میرا بھی تعارف ہو گیا۔ میری نظر کاغذی خاکوں کے انبار پر دوبارہ پڑی۔ اور یہ دیکھ کر دونوں ماں بیٹیوں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔

"ہمارے مکان کے قریب ایک میلہ ہوتا ہے۔" خاتون نے کہا۔ "ہم اپنی ضروریات کی چیزیں میلے میں سے خرید لیتے ہیں۔ ہمارا تمام سال سینے پرونے میں گزر جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ میلے کا دوسرا ثانی سر پر آجاتا ہے۔ ہمارے پاس کبھی کوئی غیر تیار شدہ چیز باقی نہیں بچتی۔ میرے خاوند کی تنخواہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے ہم کو فضول خرچی سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تمام چیزیں خود تیار کر لیتے ہیں۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی ساری چیزیں کون استعمال کرے گا؟ کیا آپ دونوں کے علاوہ اس مکان میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟"

"خوب! کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم ان کو پہن لیتے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتے کیونکہ یہ جہیز کی چیزیں ہیں۔"

"نہیں ——! امی جان آپ کیا فرما رہی ہیں"، حسین لڑکی نے محجوب ہو کر کہا۔ اور شرم سے اس کا چہرہ دوبارہ سُرخ ہو گیا۔ "ہمارے ملاقاتی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ حالانکہ میں شادی کے لئے رضامند نہیں ہوں۔ اور نہ کبھی ہو سکتی ہوں"

اس نے یہ جملہ ادا کیا۔ لیکن لفظ شادی پر اس کی آنکھوں میں ایک بہت نئی لہر دوڑ گئی۔

چائے بسکٹ مکھن اور مربہ وغیرہ منگایا گیا۔ رس بھری اور بالائی بھی ان کے ساتھ تھی۔ سات بجے رات کو ہم نے کھانا کھایا۔ جو چھ مختلف قسم کا تھا۔ میں نے دوران طعام میں جمائی لینے کی ایک اونچی آواز سنی جو دوسرے کمرے سے آرہی تھی۔ میں نے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ایسی جمائی کی آواز تھی جو ایک انسان کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ میرا دیور یوسف سمیع ہے"، خاتون نے میرے تعجب کو رفع کرنے کی غرض سے کہا۔ "وہ گزشتہ سال سے ہمارے ساتھ مقیم ہے۔ جناب معاف فرمائیں وہ .... عموماً ہر اجنبی کے سامنے آتا ہوا شرماتا ہے۔ اس کا ارادہ کسی خانقاہ میں داخل ہو جانے کا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں افسروں نے غیر منصفانہ طور پر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اس وجہ سے اس کے دماغ میں فتور آگیا ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر خاتون نے ایک خلعت دکھایا جس کو یوسف سمیع نے گرجا میں پیش کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ مریم نے تھوڑی دیر کے لئے حیا کو خیر باد کہہ دیا۔ اور مجھے ایک تمباکو دانی دکھائی جس پر وہ اپنے باپ کے لئے نقش و نگار بنا رہی تھی۔ جب میں نے کسی قدر چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے اس کی کاریگری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور خوب تعریف کی تو اس کا پیارا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اُس نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا۔ فوراً اس کا رنگ بھی سُرخ ہو گیا۔ اور مجھ سے سامان رکھنے کے کمرے میں چلنے کی درخواست کی میں نے دیکھا کہ وہاں پانچ عدد بڑے اور بہت سارے چھوٹے ٹرنک رکھے ہوئے ہیں۔

"یہ میری بیٹی کا جہیز ہے ——" اس کی ماں نے میرے کان میں کہا۔ "یہ سب ہم نے خود تیار کیا ہے"

اس سامان کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اپنے مہمان نواز میزبانوں سے رخصت کی اجازت طلب کی انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ ان سے پھر کبھی روز آکر ملوں گا۔ اور اکثر ملاقات کرتا رہوں گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ میں اپنا وعدہ وفا کرنے میں کامیاب رہا۔

اپنی پہلی ملاقات کے سات سال بعد میں دوبارہ اس چھوٹے سے قصبہ میں گیا۔ کیونکہ مجھے ایک مقدمے میں گواہی دینی تھی جس کی کاروائی اسی جگہ ہو رہی تھی۔

جونہی میں اندر داخل ہوا۔ وہی سابقہ آواز..... جو پہلی ملاقات کے وقت تمام کمروں میں گونجی تھی .... دوبارہ سنائی دی انہوں نے فوراً مجھ کو پہچان لیا۔ میری پہلی ملاقات ان کی زندگی میں ایک حادثہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ اور جب حوادث تعداد میں بہت کم ہوں تو ان کو عرصۂ دراز تک یاد رکھا جا سکتا ہے۔ میں ملاقاتی کمرے میں گیا۔ خاتون فرش پہ بیٹھی ہوئی ایک نیلے کپڑے کو تراش رہی تھی۔ اس عرصہ میں وہ کسی قدر طاقتور ہو گئی تھی۔ لیکن پیرانہ سالی کے باعث اس کا سر بگلے کے پروں کی طرح سفید ہو گیا تھا۔ اس کی بیٹی ایک پلنگ پہ بیٹھی ہوئی کوئی چیز کاٹ رہی تھی۔ فضا میں اسی سفوف کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ پچھلی دفعہ کی طرح کاغذی خاکے زمین پہ پھیلے ہوئے تھے۔ اور ٹوٹے شیشوں کی تصویریں دیوار پہ لٹک رہی تھیں لیکن پھر بھی میں نے ایک تبدیلی محسوس کی۔ پادری کی شبیہہ کے قریب کرنل کی تصویر آویزاں تھی۔ اور گھر کی تمام عورتیں ماتمی لباس میں تھیں کرنل کو انتقال کئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اور حال ہی میں وہ ترقی کر کے جرنیل کے اعلیٰ عہدے پہ مامور ہوا تھا۔

ایام رفتہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو گئی۔

بیوہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری تھا۔ "ہمیں ایک انقلاب عظیم برداشت کرنا پڑا ہے۔" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور تم کو معلوم ہو گا کہ میرا خاوند مر چکا ہے۔ اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں۔ اور کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہے۔ یوسف سمیع زندہ ہے لیکن میں اس کے متعلق کچھ اچھی خبر نہیں سنا سکتی۔ اس کو بادہ نوشی کے باعث خانقاہ میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں ملی۔ وہ ناکامیابی کے غم کو دور کرنے کے لئے اب اور بھی زیادہ پیتا ہے۔ .... میں عدالت میں ایک دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ وہ کئی دفعہ میرے ٹرنک کا قفل توڑ کر مریم کا جہیز لے گیا۔ اور فقیروں میں کپڑے وغیرہ تقسیم کر دیئے۔ اس نے یہ حرکت کئی بار کی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میری مریم کے جہیز میں ایک چیز بھی باقی نہ رہے گی۔"

"اماں جان آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" مریم نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملاقاتی کو یقین ہو جائے گا کہ میری شادی ہونے والی ہے۔ حالانکہ میں کوئی رشتہ قائم کرنا نہیں چاہتی۔"

مریم نے اپنی نظر چھت کی طرف اٹھائی اس کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔

ایک گنجے سر والی مردانہ شکل، بھورا کوٹ اور جوتوں کی جگہ جرابیں پہنے ہوئے دکھائی دی۔ جو چوہے کی طرح راستہ پہ کودتی ہوئی سامنے آئی اور غائب ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ یوسف سمیع ہے۔"

میں نے ماں بیٹی پہ نظر ڈالی وہ دونوں کافی ضعیف العمر معلوم ہوتی تھیں۔ اور ان کے چہروں میں غیر معمولی تبدیلی ہو گئی تھی۔ ماں کے بال..... سفید ہو گئے تھے۔ لیکن لڑکی اس قدر زرد اور پژمردہ معلوم ہوتی تھی گویا وہ اپنی ماں کی چھوٹی بہن ہے۔ اور ان کی عمر میں پانچ سال سے زیادہ فرق نہیں۔

"میں نے عدالت میں دعویٰ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔" خاتون نے وہی بات دوبارہ کہی۔ گویا ابھی تک اس امر کا تذکرہ مجھ سے نہیں کیا گیا تھا۔ "میرا مطلب دعویٰ دائر کرنے سے ہے۔ ہم جو چیز تیار کرتے ہیں۔ یوسف سمیع اس پہ ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ اور اپنی روح کو

ثواب پہنچانے کی غرض سے غربا میں تقسیم کر دینا ہے۔ میری مریم جہیز سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔"

مریم کے چہرے پر بدستور سرخی کی لہر نمودار ہوئی۔ لیکن اس دفعہ اُس نے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

"ہم کو نئے سرے سے اس کی تیاری کرنی ہے۔ کیونکہ اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں"۔

"اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں"، مریم نے بھی انہی الفاظ کو دہرایا۔

ایک سال کا عرصہ ہوا کہ قسمت تیسری بار مجھے پھر وہاں لے گئی اس مختصر ملاقات کے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے بڑھیا خاتون کو دیکھا جو سیاہ ماتمی کپڑوں میں ملبوس ایک پلنگ پر بیٹھی سینے پرونے میں مشغول تھی۔ اس کے قریب ہی ایک ٹھنگنا معمر آدمی بیٹھا تھا۔ وہ بھورا کوٹ اور جوتوں کی جگہ چمڑے کی جرابیں پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھلا اور کمرے کے باہر بھاگ گیا۔

میرا استقبال کرنے کی غرض سے بڑھیا خاتون مسکرائی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دریافت کیا "آپ کیا بنا رہی ہیں"؟

"یہ دلھن کی پوشاک ہے۔ اس کو تیار کرنے کے بعد میں گرجا کے پادری کو دے آؤں گی تاکہ حفاظت سے رہے۔ ورنہ یوسف سمیع اس کو بھی چرا لے گا۔ اب میں ہر چیز تیار کر کے پادری کے سپرد کر دیتی ہوں"۔ اس نے آخری فقرہ نہایت آہستہ سے کہا۔

پھر اس نے اپنی بیٹی کی تصویر پر نگاہ ڈالی جو چوکھٹے میں لگی ہوئی سامنے کی میز پر رکھی تھی۔ اور ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔

"اب میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں"۔

مریم کہاں ہے؟ میں نے دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اس غم نصیب ماں سے ایسا سوال کروں۔ جبکہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ماتم میں سیاہ لباس پہنے بیٹھی ہے اور اس کی شادی کی پوشاک تیار کر رہی ہے۔

میں کافی دیر تک کمرے میں رہا اور تصورات کی دنیا میں مریم کے حسین نقوش اپنی لوحِ قلب پر اُجاگر کرتا رہا۔ مجھے نہ تو اس کی نغمہ زا آواز سنائی دی اور نہ طاؤس صفت رفتار کی چاپ۔

میں اصل بات کو اچھی طرح سمجھ سکا تھا۔ میں نے اپنے دل کی گہرائی میں ایک شدید قسم کا درد سا محسوس کیا ...... اس درد کی لذت ابھی تک باقی ہے۔ اور لگا ہوں میں "دلھن کی پوشاک" پھر رہی ہے۔ جس کو ماں اس وقت سی رہی تھی جب کہ بیٹی کا کفن بھی میلا ہو چکا ہوگا۔

تیرتھ رام فیروزپوری

ہڈیوں کا پنجر

(۱)

جب میں درسی کتابیں پڑھ چکا تو میرے باپ نے مجھ کو فن طبابت سکھانا چاہا اور اس کام کے لئے ایک عالم بید کو استاد مقرر کیا۔ میرا نیا استاد صرف دیسی طبابت ہی میں ماہر نہ تھا۔ بلکہ ڈاکٹری بھی جانتا تھا۔ اور اس نے انسانی جسم کی بناوٹ سمجھانے کی غرض سے میرے لئے ایک انسان کا ڈھانچہ یعنی ہڈیوں کا پنجر منگا دیا تھا۔ جو اس کمرہ میں جہاں میں پڑھتا تھا رکھا گیا۔ عام لوگ جانتے ہیں کہ مُردہ خصوصاً ہڈیوں کے ڈھانچہ سے کمسن بچوں کو جب وہ اکیلے ہوں کس قدر خوف آتا ہے۔ قدرتاً مجھ کو بھی ڈر لگتا تھا۔ اور شروع شروع میں مَیں کبھی اس کمرہ میں تنہا نہ جاتا تھا۔ اور اگر کبھی کسی ضرورت کی وجہ سے جانا بھی پڑتا تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا تھا ایک اور طالب علم بھی سبق میں میرا شریک تھا۔ جو بہت نڈر رہتا۔ وہ کبھی اس ڈھانچہ سے خوف نہ کھاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس مشت استخوان کی بساط ہی کیا ہے۔ جس سے کسی زندہ آدمی کو تکلیف پہنچ سکے؟ ابھی ہڈیاں ہیں۔ چند روز بعد خاک ہو جائیں گی۔ مگر میں نے اس بارہ میں کبھی اس سے اتفاق نہ کیا اور ہمیشہ کہتا رہا کہ گو روح ان ہڈیوں سے جُدا ہو گئی ہے۔ تاہم جب تک یہ موجود ہیں وہ وقتاً فوقتاً آکر اپنے پُرانے مکان کو دیکھا کرتی ہے۔ میرا یہ خیال بظاہر عجیب اور ناممکن معلوم ہوتا ہے اور کبھی کسی نے یہ دیکھا نہیں ہوگا۔ کہ روح پھر اپنی ہڈیوں میں واپس آگئی ہو لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میرا خیال درست تھا اور درست نکلا۔

(۲)

چند دن کا ذکر ہے کہ ایک رات خانگی ضروریات کی وجہ سے مجھے اس کمرہ میں سونا پڑا۔ چونکہ میرے لئے یہ نئی جگہ تھی۔ اس لئے نیند نہ آئی اور میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ پاس کے گرجا نے بارہ بجا دیئے۔ لیمپ جو میرے کمرہ میں روشن تھا۔ مدھم ہونا شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ گل ہو گیا۔ اس وقت مجھے اس روشنی کی نسبت خیال آیا کہ ایک لحظہ پیشتر وہ روشنی تھی مگر اب ہمیشہ کے لئے تاریکی میں بدل گئی ہے دُنیا میں انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ جو کبھی رات کو کبھی دن کو ابدی زندگی میں جا ملتی ہے۔

رفتہ رفتہ میرا خیال ہڈیوں کے ڈھانچہ کی طرف منتقل ہونا شروع ہؤا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ ہڈیاں اپنی زندگی میں کیا کچھ نہ ہوں گی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہؤا۔ گویا کوئی متحرک چیز میرے پلنگ کے اِدھر اُدھر تاریکی میں پھر رہی ہے۔ پھر لمبی سانسوں کی آواز۔ جیسے کوئی غمزدہ شخص سانس لیتا ہے۔ میرے کانوں میں پڑی اور پیروں کی آہٹ بھی آئی۔ مگر میں نے خیال کیا یہ میرا وہم ہے۔ اور بدخوابی کی وجہ سے خیالی آوازیں آرہی ہیں۔ مگر پاؤں کی آواز پھر آئی۔ اس پر میں نے رفع شک کی خاطر زور سے کہا "کون ہے؟"

یہ سُنکر وہ نامعلوم شکل میرے پلنگ کے نزدیک آئی اور بولی "میں ہوں۔ میں اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں"۔

میں نے خیال کیا میرا کوئی واقف مجھ سے ہنسی کر رہا ہے۔ اس لئے کہا "یہ کونسا موقعہ ہڈیوں کے دیکھنے کا ہے۔ اصل مدعا کہو"۔

آواز آئی "مجھے وقت بےوقت سے کیا غرض۔ میری چیز ہے۔ میں جس وقت چاہوں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آہ! کیا تم نہیں دیکھتے۔ وہ وہ میری پسلیاں ہیں۔ جن میں مدتوں میرا دل رہا ہے۔ میں پورے ۲۶ سال اس آشیانہ میں مقیم رہی ہوں۔ جس کو اب تم ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتے ہو۔ اگر میں اپنے پرانے گھر کو دیکھنے چلی آئی۔ تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہؤا؟"

میں ڈر گیا۔ اور روح کو ٹالنے کے لئے کہا "اچھا تم جاکر اپنی ہڈیاں دیکھ لو۔ مجھے نیند آئی ہے۔ میں سوتا ہوں"۔

میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ جس وقت وہ یہاں سے ہٹی۔ میں فوراً بھاگ کر باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹلنے والی آسامی نہ تھی اور کہنے لگی۔ "کیا تم یہاں تنہا سوتے ہو؟ اچھا آؤ کچھ باتیں کریں"۔

اس کا اصرار میرے لئے آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مگر چارہ و ناچار جواب دیا "اچھا تو بیٹھ جاؤ اور کوئی مزے دار بات سُناؤ"۔

آواز آئی "لو سُنو۔ ۲۵ سال گذرے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح انسان تھی اور انسانوں میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتی تھی۔ لیکن اب مرگھٹ کے ویرانہ میں پھرتی رہتی ہوں۔ آج میری خواہش ہے کہ میں پھر اس قدر عرصہ دراز کے بعد انسانوں سے باتیں کروں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بھی میری باتیں سُننے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ کیوں تم باتیں سُننا چاہتے ہو یا نہیں"؟

یہ کہہ کر وہ اور آگے کی طرف آئی اور مجھے معلوم ہؤا کہ کوئی شخص میری پائینتی پر بیٹھ گیا ہے اور اس سے پہلے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکالوں۔ اس نے اپنا قصہ سُنانا شروع کیا۔

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے کہا "اچھا کوئی عمدہ کہانی سُناؤ"۔

(۳)

وہ بولی "اے صاحب، جب میں انسانی جامہ میں تھی۔ تو صرف ایک شخص سے ڈرا کرتی تھی۔ اور وہ شخص میرے حق میں گویا موت کا فرشتہ تھا وہ میرا خاوند تھا۔ جس طرح ایک شخص مچھلی کو کانٹا لگاکر پانی سے باہر نکال لاتا ہے۔ یہ شخص مجھ کو میرے والدین کے گھر سے لے آیا تھا۔ اور وہاں مجھ کو جانے نہیں دیتا تھا۔ شکر ہے کہ اس کا کام جلد تمام ہو گیا۔ یعنی شادی کے دوسرے مہینہ ہی وہ دُنیا سے چل بسا۔ میں نے لوگوں کی دیکھا دیکھی نالہ و شیون کیا۔ لیکن دل میں بہت خوش تھی۔ کہ کانٹا نکل گیا۔ اب مجھ کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت مل جائے گی۔ اور میں اپنی پرانی سہیلیوں سے جن کے ساتھ میں کھیلا کرتی تھی۔ ملوں گی۔ لیکن ابھی مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ ہوئی تھی کہ ایک دن میرا خُسر گھر میں آیا اور میرا چہرہ غور سے دیکھ کر اپنی اہلیہ سے کہنے لگا۔ مجھ کو قیافہ سے یہ لڑکی ڈائن معلوم ہوتی ہے۔ اپنے خسر کے الفاظ اب تک مجھ کو یاد ہیں۔ اور میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس کے چند دن بعد مجھ کو اپنے باپ کے گھر چلے جانے کی اجازت مل گئی باپ کے گھر پہنچ جانے پر مجھ کو جو خوشی حاصل ہوئی وہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔ میں وہاں ہنسی خوشی رہنے اور اپنی جوانی کے

دن گذارنے لگی۔ میں نے ان دنوں بارہا اپنی نسبت لوگوں سے سُنا۔ کہ میں خوبصورت نازنین ہوں مگر تم کہو تمھاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا" میں نے تمھیں زندگی کی حالت میں دیکھا نہیں۔ میں کیسے رائے دے سکتا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا۔ درست ہوگا"

وہ بولی" میں کس طرح یقین دلاؤں کہ ان دو خانوں میں دو سرمگیں آنکھیں دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتی تھیں! افسوس تم میرے اصلی تبسم کا اندازہ ان ہڈیوں کے کھلے مُنہ سے نہیں لگا سکتے۔ ان ہڈیوں کے گرد جو خوبصورتی تھی۔ اب اس کا نام تک نہیں ہے۔ میری زندگی کے ایام میں کوئی لائق سے لائق ڈاکٹر بھی گمان نہ کر سکتا تھا کہ میری ہڈیاں تشریح جسم انسانی کے کام آئیں گی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب میں چلا کرتی تھی۔ تو نور کی شعاعیں میرے بال بال سے نکل کر ہر سمت کو منور کیا کرتی تھیں۔ میں اپنے بازوؤں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ آہ! یہ وہ بازو تھے۔ کہ جس کو میں نے دکھائے اپنا فریفتہ کیا۔ شاید سہارا کو بھی ایسے گول اور سڈول بازو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ میری چھوٹی نازک انگلیاں پنجہ مرجان کو شرماتی تھیں۔ افسوس۔ میرے اس برہنہ ڈھانچہ نے تمھیں میرے حسن و جمال کی نسبت غلط رائے قائم کرنے کا موقعہ دیا۔ تم مجھ کو ایام شباب میں دیکھتے۔ تو آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی اور علم تشریح کا سودا دماغ سے حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتا"

میں نے جواب دیا" یقین جانو تمھاری اس گفتگو سے بھی طب کے سارے معلومات میرے دماغ سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور تمھاری دلکش خوبصورتی میرے دل میں نقش ہو گئی۔ اچھا آگے کہو"

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھ کر کہا" میرے بھائی نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ شادی نہ کروں گا۔ اس لئے گھر میں صرف میں ہی ایک عورت تھی۔ میں شام کو اپنے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھتی۔ تو ستارے مجھ کو گھورا کرتے۔ اور ٹھنڈی ہوا جب میرے پاس سے گذرتی تو میرے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی تھی۔ میں اپنے حسن کے غرور میں بارہا سمجھا کرتی کہ جس زمین پر میرا قدم پڑتا ہے۔ اگر اس میں محسوس کرنے کی قوت ہوتی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ کبھی کہتی کہ دُنیا کے سارے عاشق مزاج نوجوان گھاس کے بھیس میں میرے قدموں پر غلطاں پڑے ہیں۔ اب یہ تمام خیالات بار بار مجھ کو پریشان کرتے ہیں کہ آہ! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کا ایک دوست ستیش کمار تھا۔ جس نے میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمارا بھی خانگی ڈاکٹر تھا۔ گو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا۔ مگر میں نے ایک روز اس کو دیکھ لیا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس کی خوبصورتی نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ میرا بھائی عجیب قسم کا شخص تھا۔ وہ زمانہ کے سرد و گرم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اور کبھی گھر کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموشی پسند تھا اور تنہائی میں رہتا تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ دُنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین بن گیا اور عارفانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ہاں تو وہ نوجوان ستیش کمار اکثر ہمارے گھر آتا تھا۔ اور یہی ایک نوجوان تھا جس کو اپنے گھر کے مردوں کے سوا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ جب میں باغ میں تنہا ہوتی۔ اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے نیچے ملکہ کی طرح بیٹھتی تو ستیش کمار کا خیال اور بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتا لیکن تم کس فکر میں ہو۔ تمھارے دل میں کیا گذر رہا ہے؟"

میں نے آہ سرد بھر کر جواب دیا" میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ کاش میں ہی ستیش کمار ہوتا"

وہ ہنس کر بولی" اچھا پہلے میری کہانی سُن لو۔ پھر عشق بازی کر لینا۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ مجھے قدرے بخار تھا کہ ڈاکٹر یعنی میرا پیارا ستیش کمار مجھے دیکھنے آیا یہ پہلا موقعہ تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بالمقابل دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ڈاکٹر کو سکتہ سا ہو گیا۔ اگرچہ میرے بھائی کی موجودگی نے اس کو ہوش سنبھالنے پر مجبور کیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ میں ان کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو دوشالہ سے باہر نکالا۔ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کہ کسی ڈاکٹر نے معمولی بخار

کی تشخیص میں اس قدر تامل کیا ہو۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں سخت جد و جہد کے بعد اس نے میرے بخار کا اندازہ لگایا۔ لیکن میرا بخار دیکھتے دیکھتے ہی بذات خود بیمار ہو گئے۔ کیوں تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں؟

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہاں بالکل مانتا ہوں۔ آدمی کی حالت میں تغیر پیدا ہونا کیا مشکل ہے"

وہ بولی "چند روز امتحان کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ میرے دل میں ڈاکٹر کے سوا اور کسی نوجوان کا خیال تک نہیں۔ میرا معمول تھا۔ کہ شام کے وقت بسنتی رنگ کی ساری پہن کر اپنے بالوں میں کنگھی کر کے پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر شیشہ ہاتھ میں لے۔ باغ میں چلی جاتی اور پہروں دیکھا کرتی۔ کیا شیشہ دیکھنا معیوب ہے؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا "نہیں تو"

اس نے سلسلۂ حکایت کو جاری رکھ کر کہا "شیشہ دیکھ کر میں محسوس کرتی تھی۔ گویا میری دو زندگیاں ہو گئی ہیں۔ یعنی میں خود ہی ستیش کمار بن جاتی اور خود ہی اپنے عکس کو معشوق سمجھ کر اس پر تن من دل نثار کیا کرتی۔ یہ میری بڑی مرغوب تفریح تھی۔ اور میں گھنٹوں اس میں گزار دیا کرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ دوپہر کو پلنگ پر بستر بچھا کر سو گئی۔ اور ایک بازو کو بستر پر لاپروائی سے پھینک دیا۔ ذرا آنکھ جھپکی۔ تو خواب میں دیکھا۔ کہ ستیش کمار آیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر چلا گیا...... بس اب میں کہانی ختم کرتی ہوں تمہیں تو نیند آ رہی ہے"

میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لئے میں نے منت کے لہجہ میں کہا "نہیں تم کہے جاؤ۔ میرا شوق بڑھتا جاتا ہے"

وہ کہنے لگی "اچھا تو سنو۔ تھوڑے دنوں میں ستیش کمار کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ اور اس نے ہمارے مکان کے نچلے حصہ میں اپنا مطب کھول لیا۔ جب اس کو مریضوں سے فرصت ہوتی تو میں اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور ہنسی ٹھٹھے میں مختلف دواؤں کے نام پوچھتی رہتی۔ اس طرح مجھے کئی ایسی دوائیں بھی معلوم ہو گئیں۔ جو زہر قاتل تھیں۔ ستیش کمار جو کچھ میں اس سے دریافت کرتی۔ بڑی محبت اور متانت سے بتایا کرتا۔ اس طرح ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا۔ کہ ڈاکٹر مفقود الحواس رہتا ہے۔ اور جب کبھی میں اس کے سامنے جاتی ہوں۔ تو اس کے چہرہ پر مردنی چھا جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکٹر نے میرے بھائی سے گاڑی مانگی۔ میں پاس بیٹھی تھی۔ میں نے بھائی سے پوچھا۔ ڈاکٹر اس وقت رات میں کہاں جائیگا؟ میرے بھائی نے جواب دیا۔ تباہ ہونے کو۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھ کو ضرور بتاؤ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بھائی نے کہا وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یہ سنکر مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بھائی سے پھر پوچھا۔ کیا سچ مچ وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یا مذاق کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا درست ہے۔ آج ڈاکٹر دلھن لائے گا۔

میں نہیں بتا سکتی۔ مجھے یہ بات کس قدر شاق گذری۔ میں نے اپنے دل سے بار بار پوچھا۔ کہ ڈاکٹر نے کیوں مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی؟ کیا میں اس کو روکتی۔ کہ شادی مت کرو۔ ان مردوں کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔

"سہ پہر کو ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر مطب میں آیا۔ اور میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا یہ درست ہے کہ آج آپ کی شادی ہے؟ یہ کہہ کر میں بہت ہنسی۔ اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ میں اس کو ہنسی میں اڑا رہی ہوں نہ صرف شرمندہ ہوا۔ بلکہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ پھر میں نے یکایک پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو کیا آپ پھر بھی لوگوں کی نبض دیکھا کریں گے؟ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی نسبت مشہور ہے وہ جسم کے تمام اعضا کا حال جانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ ڈاکٹر ہو کر کسی کے دل کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کہ وہ کس حالت میں ہے۔ حالانکہ دل بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔

میرے الفاظ ڈاکٹر کے دل میں تیر کی طرح لگے۔ مگر وہ خاموش رہا۔"

(۴)

"لگن کی مہورت بڑی رات گئے مقرر ہوئی تھی۔ اور برات کو دیر سے جانا تھا اس لئے ڈاکٹر اور میرا بھائی حسب معمول شراب پینے بیٹھ گئے اس شغل میں ان کو بہت دیر ہو گئی۔ گیارہ بجنے کو تھے کہ میں ان کے پاس گئی۔ اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب گیارہ بجنے والے ہیں۔ آپ کو شادی کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ وہ کسی قدر سرور میں ہو گیا تھا۔ بولا۔ ابھی جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور میں نے موقعہ پا کر زہر کی پڑیا جو میں نے دوپہر کو ڈاکٹر کی غیر حاضری میں اس کے صندوق سے نکالی تھی شراب کے گلاس میں جو ڈاکٹر کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈال دی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر نے اپنا گلاس ختم کیا اور دولہا بننے کو چلا گیا۔ میرا بھائی بھی اس کے ہمراہ روانہ ہوا۔

میں بالائی کمرہ میں گئی۔ اور اپنا نیا بنارسی ڈوپٹہ اوڑھا۔ ماتھے پر سیندور لگایا اور پوری سہاگن بن کر باغ میں نکلی۔ جہاں روز شام کو بیٹھا کرتی تھی۔ اس وقت چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ہوا میں خنکی تھی اور چنبیلی کی خوشبو نے باغ کو مہکا دیا تھا۔ اب میں نے پڑیا کی باقیماندہ دوا نکالی اور منہ میں ڈال کر چلو بھر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں میرے سر میں چکر آنے لگا اور آنکھوں میں غنودگی چھا گئی چاند کی چاندنی مدھم ہونے لگی اور زمین و آسمان، بیل بوٹے میرا گھر جہاں میں نے اس قدر عمر گذاری تھی، رفتہ رفتہ غائب ہوتے معلوم ہوئے۔ اور میں میٹھی نیند سو گئی۔

ڈیڑھ سال کے بعد خواب راحت سے چونکی تو میں نے دیکھا کہ تین لڑکے میری ہڈیوں سے علم تشریح سیکھ رہے ہیں اور ایک استاد میری چھاتی کی طرف بید سے اشارہ کر کے لڑکوں کو مختلف ہڈیوں کے نام بتا رہا ہے اور کہتا ہے۔ یہاں دل رہتا ہے جو شادی و غم کے وقت دھڑکا کرتا ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں اٹھتی جوانی کے وقت شگوفے نکلتے ہیں۔"

"اچھا اب میری کہانی ختم ہے اور رخصت ہوتی ہوں۔"

(ترجمہ)

عبدالرزّاق ملیح آبادی

شاعر کی وصیّت

مولانا کا کوئی ترجمہ ہمیں بروقت نہ مل سکا۔ اس مجبوری کی بنا پر اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ فہرست میں مولانا کو اپنے مرتبے کے اعتبار سے جگہ دی گئی ہے۔ (مرتب)

"اوگسٹ نیلیپوف" نام کا ایک نوجوان روسی شاعر پیرس میں مقیم تھا۔ بیوی اور بچے بھی رکھتا تھا۔ موجودہ عالمگیر تنگ دستی نے اس پر بھی رزق کے دروازے بند کر دئے تھے۔ سب ہی جتن کئے، سب ہی سے دعا مانگی مگر کسی نے کوئی مدد نہ کی۔ آخر نا امید ہو کر اور مصائب سے گھبرا کر اس نے خودکشی کر لی۔ اس کی لاش کے پاس ذیل کا وصیّت نامہ ملا۔ جس کے شائع ہوتے ہی فرانس میں ایک ہل چل پڑ گئی۔ اب دنیا کو معلوم ہوا کہ یہ مرنے والا کتنا بڑا شاعر تھا۔ مگر اس وقت جبکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں اپنی کہانی دل کی گہرائیوں سے لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میری کہانی بالکل سچی ہے۔ کیونکہ دل کی گہرائیوں میں نیکی اور پاکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کروں؟ زندگی کا جامہ جن رنگ برنگ تاروں سے بُنا گیا ہے۔ ان میں کس تار کو پہلے چھوؤں؟ میرے سامنے سفید تار بھی ہیں، سرخ بھی نیلے بھی، سیاہ بھی۔ اور ایسے تار بھی ہیں جن کا کوئی رنگ نہیں۔ گویا کسی جادو کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مضبوط تار بھی ہیں، اور کمزور بھی۔ ایسے کمزور کہ چھوتے ہی ہاتھ میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان تمام بوقلموں تاروں سے زندگی نے اپنا جامہ تیار کیا ہے۔

میرے دل میں ایسی خوشیاں ہیں، جن کی کوئی حد نہیں۔ بہار کی خوشبوؤں جیسی جبکہ ہر چیز نباتات، حیوان، انسان سب تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میری خوشیاں محبت کی خوشبوؤں سے بھی زیادہ بڑی اور مالا مال ہیں۔ میری خوشیاں موسیقی کے ساحرانہ نغموں سے لبریز اور مست ہیں۔ میں ان کا رقص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس درجے محسوس ہیں، کہ میں اُنہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا ہوں۔

اور میرے دل میں غم کے طوفان اُمنڈتے ہیں۔ ایسے غم جو جوانوں، بہادروں اور عروسِ نو کی موت کے غم سے بھی زیادہ وزنی ہیں۔ اُن کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ آنسوؤں کا سیلاب کبھی نہیں رُک سکتا۔ حتیٰ کہ آنکھیں روتے روتے سفید ہو جاتی ہیں۔

میرے دل میں آرزوئیں ہیں بے حد و حساب۔ ایسی آرزوئیں جن کی انتہا نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے، نہ عقل سمجھ سکتی ہے۔ خیال نے انہیں پیدا کیا ہے۔ مگر اب خود خیال بھی ان کے سامنے حیران و درماندہ ہے۔ دماغ انہیں دیکھ کر سناٹے میں آجاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کیا یہ ممکن ہے۔ پھر ٹھٹک کر اور

عاجز ہو کر کہہ دیتا ہے۔ نہیں۔ ناممکن بالکل ناممکن۔

میرے دل میں نا امیدیاں ہیں۔ سیاہ اور کڑوی نا امیدیاں۔ وہ اس طرح باہم لپٹی ہوئی بل کھایا کرتی ہیں گویا ہندوستانی اژدہے ہے جو ہاتھی پر جھپٹتا اور چلتے آدمی نگل جاتا ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں اندھے ہو جانے والے کی نا امیدی اور بھٹکتے ہوئے بیابان میں گم ہو جانے والے گونگے بہرے کی نا امیدی سے بھی زیادہ تاریک اور المناک نا امیدیاں میرے سینے میں اپنے ہیبت ناک پھن اٹھائے بیٹھی ہیں۔

میرے دل میں خوف ہیں۔ زندگی سے خوف اور موت سے خوف۔ تندرستی سے خوف اور بیماری سے خوف۔ مفلسی سے خوف اور تونگری سے خوف۔ جو جانتا ہوں اس سے خوف۔ اور جو نہیں دیکھتا اس سے خوف۔ محبت سے خوف اور عداوت سے خوف۔ دوست سے خوف اور دشمن سے خوف وفاداری سے خوف اور بے وفائی سے خوف۔ اپنے ہوش و بیداری سے خوف۔ اور اپنی مدہوشی اور نیند سے خوف۔

میرے دل میں نیکی ہے۔ بغیر کسی دلیل کے نیکی۔ عقل و منطق کو اس میں ذرا دخل نہیں۔ گویا آسمان سے یہ نیکی اُتر کر میرے دل میں سما گئی ہے۔ لیکن میں اُسے محسوس کرتا ہوں۔ پوری طرح محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھ میں شجاعت و ہمت پیدا کرتی اور ایک بہت ہی پرانے اجاڑ پیڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی جڑیں زمین نے اُگل دی ہیں اور جس کی شاخیں تری سے خالی ہو چکی ہیں۔ تمام پتے پیلے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں سبزی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عجیب و کمیاب سبزی جو خزاں کے آخر میں بوڑھے درختوں ہی کا حصہ ہے۔ باغبان نے جس کی پوری عمر اس پیڑ کے چھانٹنے میں بیت چکی ہے۔ جو اپنی قدامت و بوسیدگی میں کسی دیوتا کا اُجڑا ہوا مندر معلوم ہوتا ہے۔ ایسے دیوتا کا جو اپنے پجاریوں کی دعائیں نہ قبول کر سکنے کی وجہ سے بھاگ چکا ہو۔ ہاں اسی ڈراؤنے درخت کا نام خراٹ۔ مالی نے اپنے مرتعش ہاتھ سے بھدّے حرفوں میں لکھ دیا ہے "صبر"

یہ سب بوجھ میں اپنے دل میں اٹھائے ہوں۔ اور شہر میں پھرتا ہوں۔ دوست دشمن سب سے ملتا ہوں۔ ہنستا بولتا ہوں۔ شادی غمی میں شریک ہوتا ہوں۔ ہر سوال کا جواب دیتا ہوں۔ ہر شخص کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہوں۔ ان کی ہنسی پر ہنستا اور اُن کے غم پر کڑھتا ہوں۔ گویا انہیں میں سے ایک ہوں!

لیکن ان سب کے باوجود میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بہت زور سے دھڑکن اٹھتی ہے۔ مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ میرا دل نہیں بلکہ بجلی کا پنکھا ہے جسے پوری قوت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔ تب میں اسے اس طرح بغور دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا وہ میرے سینے میں نہیں۔ کسی اور کے سینے میں ہے۔ پھر تعجب سے چلّا اٹھتا ہوں۔ اس عجیب آلے کی اتنی تیز گردش۔ کتنی مدت تک جاری رہ سکتی ہے؟ صانع اوّل نے بلاشک اس کے بنانے میں کمال کر دکھایا ہے۔ مگر وہ کب اتنی سخت حرکت کو برداشت کر سکے گا۔ کیا وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہیں ہو جائے گا۔ ہر مشین کو کچھ دیر ستانے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ کیا ہے۔ اس مشین کے لئے ایک لحظہ بھی آرام کا نہیں؟ اس کے لئے وہ روغن کہاں ہے جو فولاد کو فولاد سے ملنے پر نرم کر دیتا ہے۔ زہر کے تمام انبار کہاں چلے جاتے ہیں۔ غموں اور مصیبتوں کا وہ زہر جو آنکھ، ناک، کان، زبان، دماغ کے راستے میرے اندر ہر وقت اترتا رہتا ہے۔ یہ چھوٹی سی مشین جو میرے سینے میں اتنی مدت سے چل رہی ہے۔ کیونکر اس تمام زہر کو خارج کرتی ہوگی؟ وہ کون ہوشیار انجینئر ہے جو اس بے حساب زہر کے موریچے سے مشین کو صاف کرتا ہوگا؟

میری کہانی! کیا میں اسے شروع سے لکھ دوں۔ اس وقت سے لکھوں جب پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے معنی سمجھے اور یہ بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھایا۔ یا اس آخری گھڑی سے شروع کردوں، جب میں زندگی کو سلام کے ساتھ رخصت کرنا اور اس کا بوجھ اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔ اپنے اس کاندھے سے اتار پھینکنا چاہتا ہوں جو بوجھل گاڑی میں جُتتے ہوئے گھوڑے کے کاندھے کی طرح بن چکا ہے۔ جسے تسموں نے زخمی کر ڈالا ہے۔ اور جب وہ گاڑی میں زور لگاتا ہے۔ زخم گہرا ہوتا جاتا ہے۔ مگر کوئی آنکھ اُسے دیکھتی نہیں۔ کیونکہ انہیں تسموں کے اندر وہ چھپا ہوتا ہے۔ جنہوں نے اسے پیدا کیا اور اتنا گہرا کر دیا ہے۔

میرا قصہ انسانیت کو بدنام کرنے والا۔ بے نقاب کرنے والا۔ اس کی تمام آلائشیں کھول دینے والا۔ اور اسے خود اس کی نظر میں ذلیل کر ڈالنے والا قصہ ہے۔ انسانیت ان عورتوں کی طرح ہے۔ جو عالیشان محلوں اور مسرت آمیز نعروں کی گونج میں بچوں کو دودھ پلانے کے لئے ان کی ماؤں سے لیتی ہیں۔ اور تاریک کمین گاہوں میں بیٹھ کر انہیں مار ڈالتی ہیں۔ یہ مجرم عورتیں پاگل ہوتی ہیں۔ مگر معصوم بچوں کے قتل کا شوق انہیں صرف اتنی دیر کے لئے بہت ذہین بنا دیتا ہے۔ جتنی دیر بچے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اچھے کپڑے پہن کر جاتی ہیں۔ اور میٹھی میٹھی باتیں بنا کر ماؤں کی گودیں خالی کرا لیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال مکار، دغاباز، جھوٹی، بدبخت، پاگل انسانیت کا بھی ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کی کنیز اور نفس کی پجاری ہوتی ہے۔ انسانیت دراصل بدصورت، بداخلاق چڑیل ہے جو اپنی مدہوشی کی وجہ سے اپنے افعال سے بے خبر اور جنون وجہالت کی وجہ سے اپنی زندگی کے معنی سے ناواقف ہے۔ بدترین ماں ہے۔ یہ ہماری دنیا جس کے دل میں ماں کا نام کو نہیں۔

میں اس دنیا اور انسانیت کے کس جھوٹ سے اپنا قصہ شروع کروں؟ کیونکہ میں اس کے تمام جھوٹوں کا شکار بن چکا ہوں۔ یہ دیکھو میرے تمام بچے بیمار پڑے ہیں۔ اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔ کسی کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ کوئی گلے کے ورم میں مبتلا ہے۔ کوئی پیدائشی لنجا ہے۔ نہ کوئی غذا اُسے قوت دیتی ہے۔ نہ کوئی دوا فائدہ پہنچاتی ہے۔

میری بیوی اس طرح روتی پیٹتی پھرتی ہے گویا اسے پھانسی کا حکم مل چکا ہے اور جلاد سامنے کھڑے ہیں۔ اسے روپے کی، آرام کی، کھلی ہوا کی، لمبے سفر کی ضرورت ہے۔ خدا سے رحم کی طالب ہے۔ حالانکہ نہ کبھی رحم سے آشنا ہوئی نہ کسی پر رحم کھا چکی ہے۔ میرے لئے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت مصیبت یہ ہے کہ وہ بکتی رہتی ہے۔ اور میری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ عقلِ کل ہونے کا دعوٰی کرتی ہے۔ حالانکہ کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ ان مصیبتوں سے روتی اور فریاد کرتی ہے، جو اس نے اپنی بے وقوفی، نیک نیتی سے خود ہی پیدا کر دی ہیں۔ نیک نیتی کا ذکر یہاں خوب موقع سے آیا۔ کیونکہ انگریزوں کی مثل ہے "جہنم کا راستہ نیک نیتی نے تیار کیا ہے"!

اے شخص انصاف کر، اس سے بڑھ کر تیرے لئے سوہانِ روح اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی مشکل سامنے آجائے جس کا کوئی حل تجھ سے ممکن نہیں ہے۔ ایسی خرابی جس کی درستگی اختیار سے باہر ہے۔ ایسی بیماری جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایسی تنگی جسے دور کرنا تیرے بس میں نہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ مشکل، خرابی، بیماری، تنگی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ تیرا لڑکا جسے بیماری نے ہڈیوں کا ڈھانچ بنا دیا ہے۔ جس کی آواز بھوک سے بھرا گئی ہے وہ گھسٹ کر تیری طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ اپنے ننھے ننھے لاغر ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اپنی کملائی آنکھوں سے تجھے ہزاروں امیدوں کے ساتھ دیکھتا ہے اور اپنی غمناک آواز میں روٹی کا ٹکڑا بس ایک ٹکڑا مانگتا ہے۔ مگر تو اسے یہ ٹکڑا بھی نہیں دے سکتا۔ تو اس معصوم کے سامنے بے حس وحرکت اس طرح بیٹھا ہے جیسے کوئی بت کسی مندر میں رکھا ہو۔ ٹکر ٹکر اپنے لختِ جگر کو دیکھتا ہے۔ بولنے کا ارادہ بھی کرتا ہے۔ بڑھ کر اُسے سینے سے بھی لگا لینا چاہتا ہے۔ مگر تیرا تمام جسم اس طرح ہو جاتا ہے جیسے سُن ہے یا فالج کا مارا ہُوا۔

یہ دیکھو دنوں پر دن اور ہفتوں پر ہفتے ایک ہی حالت اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ کون رنگ، گھرا ٹیالا رنگ غم وحسرت کا رنگ۔ گویا یہ زندگی جس کا ہم شکار ہوئے ہیں موسیقی رکھتی ہے۔ وہ موسیقی جو صرف قبروں کے درمیان مترنم ہوتی ہے۔ جس کے راگ غم لاتے اور مایوسی پیدا کرتے ہیں۔ گویا شوپنہار نے اپنی قاتل ناامیدی ہیں۔ بہتوں نے اپنے مہلک غم ہیں۔ چیکووسکی نے اپنی درد انگیز حیرانی میں ایک ہی سُر الاپا تھا۔ ایسا سُر جو ہر مرتبہ دل کی ایک رگ کو کاٹتا اور روح کے ایک تار کو توڑ ڈالتا ہے۔

یہ دیکھو قرضخواہ، ابدی حقوق کے مالک دروازے پر کھڑے ہیں اور اپنے حق مانگ رہے ہیں۔ گویا انہوں نے باہم مشورہ کر کے طے کر لیا ہے کہ ایک ساتھ اور ایک ہی جگہ مطالبہ کریں گے۔ قرض دیتے وقت یہ لوگ جتنے ہنس مکھ، ملنسار، خوش اخلاق تھے۔ اب قرض واپس لیتے وقت اتنے ہی کرخت بے مروت، بداخلاق بن گئے ہیں

اُنہوں نے گویا فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی دکانوں پر میری آؤ بھگت بھول جائیں گے۔ اور خود میرے دروازے پر میری توہین میں باہم بازی لے جائیں گے۔ میں اُن کی نگاہ میں ایسا مقروض ہوں جو وعدہ خلاف ہے نہ وہ مقروض جس سے زمانے نے بے وفائی کی ہے۔ ان میں کسی ایک آدمی کو بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو اس اندیشے سے ڈرتا ہو کہ کل شاید اس کی حالت بھی میری جیسی ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے عارضی دولت انسان کو زمانے کی گردش سے بے خبر کر دیتی اور تونگری ظلم و تکبر کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔ شاید اپنی قوت اور دولت پر بھروسہ آدمی کو اس وہم میں مبتلا کر دیتا ہے کہ فقر و فاقہ کی مصیبت اس کے لئے بنی ہی نہیں۔ میں اپنی غربت و مصیبت پر بھی ان لوگوں کے لئے عذر تلاش کرتا ہوں۔ مگر وہ اپنی تونگری و بے فکری پر بھی میرا کوئی عذر قبول نہیں کرتے۔ بلکہ شب و روز ہر لحظہ اپنے قرض کا مطالبہ جاری رکھتے ہیں۔ اب ان قرضخواہوں کی وجہ سے میری حالت جنرل ولنگٹن کی سی ہو گئی ہے۔ جو "واٹر لو" کے معرکے سے ذرا پہلے بار بار چِلّا اٹھتا تھا۔ رات یا بلوچر۔ اُسی طرح میں بھی بار بار اپنے دل میں پکارتا ہوں۔ الٰہی رات یا دولت"

لیکن بعض قرضخواہ چمگادڑوں کی طرح رات کو بھی میرے گھر پر منڈلایا کرتے اور بار بار دستک دیا کرتے ہیں۔

جب رات بھیگ جاتی ہے اور ہر طرف سنّاٹا چھا جاتا ہے تو میں کسی ایسے آنے والے کا انتظار شروع کرتا ہوں۔ جو پرانے زمانے میں ناگہاں نمودار ہو کر دولت و مسرّت سے مالا مال کر دیا کرتا تھا۔ ہر لمحہ مجھے گمان گزرتا ہے جیسے کسی پکارنے والے کی آواز یا دستک سُن رہا ہوں۔ فوراً اپنی سانس روک کر اور کان کھڑے کر کے آہٹ لیتا ہوں۔ مگر وائے افسوس! دروازے پر سناٹے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ میری رات اسی طرح بیت جاتی ہے جس طرح تمہارے لازوال شاعر الفرڈ دی موسیہ نے کہا ہے:-

Jui sonne ? peronne !

O! solitude! O! Pauvrete

کون دستک دے رہا ہے؟ کوئی نہیں! اُف تنہائی! اُف غربت"

(ترجمہ)

---

(۷)

افسانوی مضامین کا دور

خواجہ حسن نظامی

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے کا ذکر ہے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پرواہی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں، فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لئے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر بیٹھی خدا کی یاد کی تسبیحیاں پڑھ رہی تھیں، غلّے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آن نکلا اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام عرض کیا "میاں صاحبزادو! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو، انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ان کے بھی جان ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں سے محبت اور مہربانی برتنی چاہئے۔ یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شانِ بادشاہی سے دور نہیں۔" بڑے شہزادے نے جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی۔ مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جا رے جا، دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا، سیر و شکار سب کرتے ہیں ہم سے کون سا گناہ ہوگیا؟" فقیر بولا "صاحب عالم ناراض نہ ہوں، شکار ایسے جانور کا کرنا چاہیئے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے، ان ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ؟ بیس بھی مارو گے تب بھی ایک آدمی شکم سیر نہ ہو سکے گا۔" نصیر میرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلّہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بیچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی۔" فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑی خدا تیری بھی ٹانگیں توڑے اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو!"

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں۔ گولے برس رہے تھے زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے، شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا کہ لال قلعے سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دھاوے کرتے چلے آتے تھے انہوں نے ان نوعمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور

یہ سب شہزادے فرشِ خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا کہ دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے اس زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا۔ گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرچیں آگئی تھیں اور دہشت کے سبب غشی طاری ہو گئی تھی۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دئے گئے اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ہاتھ کمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں۔ اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھسنے لگا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو گئے۔ تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہو گیا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے۔ اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

اس دار و گیر میں پہاڑی کے کیمپ میں میرزا نصیر الملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ جائیے میں نے آپ کی رہائی کی اجازت صاحب سے حاصل کر لی۔ جلدی بھاگ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بے چارے پیدل چلنا کیا جانیں، حیران تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لئے۔ چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوں گے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے، زبان خشک ہو گئی، حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سایہ میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں کدھر ہمارا ٹھکانا ہے۔ اوپر نگاہ اٹھانے سے درخت پر نظر گئی۔ دیکھا فاختہ کا ایک گھونسلا بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ اس کی آزادی و آسائش پر شہزادے کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے۔ میرے لئے تو آج زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی۔ ہمت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے۔ مگر اُفتاں و خیزاں گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے۔ اور چبوترہ پر ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کان لہو لہان ہو رہے تھے۔ اور دہقانی اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بے چاری نے مرزا کو دیکھا دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ میرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ سے قطب صاحب چلی گئی تھیں۔ میرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گی۔ پوچھا "ملکہ تم یہاں کہاں؟" رو کر بولی "آغا جی گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا۔ نوکروں کو مار ڈالا۔ اماں جان کو دوسرے گاؤں والے لے گئے اور مجھ کو یہ یہاں لے آئے۔ میری بالیاں انہوں نے نوچ لیں۔ اور دیکھو انہوں نے میرے طمانچے ہی طمانچے مارے ہیں"۔ اتنا کہہ کر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی۔ اور پھر کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔

بے کس شہزادہ نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اس کو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے ارے جا، آیا بڑا بے چارا۔ ایک گنڈاسا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں، لا دام دے جا اور لے جا۔ مرزا نے کہا کہ چودھریو! میں دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں۔ دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے۔ آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دیں گے۔ یہ سُن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے ادہو آپ بادشاہ سلامت ہیں، تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے۔ اور یہ چھوکری نواب ہمارے گاؤں کی ٹہل کیا کرے گی۔ جھاڑو دے گی، ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی۔ گوبر

اٹھائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا۔ اور چودھریوں کو اور ان دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر دہلی لے گئی۔

(۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ اور جس کو انگریز افسر کہہ دیتے کہ یہ قابلِ دار ہے اس کو پھانسی مل جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے۔ گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اس خونریزی سے تھلکہ تھا۔ میرزا نظام الملک اور اُن کی ٹڑی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ اور صاحب نے ان دونوں کو خُردسال دیکھ کر بے قصور سمجھا اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پاکر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گئے۔ لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی۔ اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف کرتے تھے۔ چند روز کے بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اور میرزا کچھ دن ادھر ادھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخر سرکار نے ان کی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی اور نوکری کے وبال سے سبکدوشی ہو گئی۔

(۵)

ایک برس کا ذکر ہے۔ دہلی کے بازار چتلی قبر۔ کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا کولہوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں شاید فالج سے بے کار ہو گئے تھے اس لئے ہاتھوں کو ٹیک کر کولہوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حیرت سے دیکھتے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام میرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گزارہ ہے۔ مجھ کو ان کے حال سے بڑی عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا تھا یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا۔ جس کی ٹانگ میں انہوں نے غلّہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتے پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے جی کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

آغا حیدر حسن دہلوی

اوکھلے کی سیر

اللہ محمدؐ کے چھیتے، صاحب عالم نے محلسرائے میں آنا شروع کر دیا۔ کیا ایک برایک ہے مقلب القلوب کی تسبیح۔ اب اس کی سنہ نہیں کہ ساون سوکھے جائیں۔ سَیل ہونی چاہئے اور وہ بھی اوکھلے کی۔ باغ تو اپنے ہی ہیں۔ جب چاہا چلیں گے اور آج کل جھڑاں ناسپاتیاں ہی ہوں گی یا امرود اور نبیبو قطب صاحب پھر کبھی سہی۔ شرف النساء یہ تمہارا درس سخن کون رہا ہے کہ دماغ اپنی جگہ سے جاتا ہے۔ تم اپنا سن دیکھو اور یہ چونپ۔ بہو بیگم یہ خوب رہی کہ بڑھیا حال سے گئی احوال سے گئی کیا اب دل کے خیال سے بھی جائے۔ رابعہ خانم نے کہا۔ دلہن بیگم اللہ جانے رُت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ بھلا اس چار دیواری میں کیا مزا۔ یہ قہقہہ دیواریں اور یہ ذرا سا انگنائی اس پر اس کالی گھٹا کی چھت نے تو پورا محل بھونرا بنا دیا ہے، اللہ جانے وحشت ہونے لگی۔ آپ ذرا سا بڑی سرکار کے سامنے ذکر چھیڑ دیں۔ وہ کبھی انکار نہ کریں گی —— آبادی خانم سارا انتظام کرلیں گی اور انتظام کیا آخر اللہ رکھے سیر سوا سیر کا پکنا ہی ہے یہاں نہ پکا وہیں سہی۔ یہاں نہ کھایا وہاں کھالیا۔ جو وہاں کی بھبڑ میں پکنا ریندھنا دوبھر ہو جائے گا تو سب یہاں سے ہی پکا پکایا ساتھ لے لیا جائے گا۔ کوئلوں کی بوریاں اور انگیٹھیاں رکھ لیں گے۔ بیسن، مصالحہ، گھی، کڑھائیاں لے لیں گے تو اب رہا کیا۔ یوں چٹکی بجاتے ہیں سب ہو جائے گا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مرد سب نماز کو جائیں گے وہاں کوئی جمی جم ہوگا۔ صاحب عالم ساتھ ہوئے تو کوئی کھٹکا نہیں وہ چوبدار کافی ہیں۔ دونوں بڈھوں کو لے لیں گے۔ لال خان اور محب اللہ خان ہیں بھی خوش دل۔ اس موئے عبداللہ خان کو نہ لیجئے گا۔ نگوڑا بڑا زشت رو ہے۔ اور ولایت بیگ بھی نرا جانگلو ہے۔ اجبک کھتوں کا ہمیشہ تیوری پر تین بل رہتے ہیں۔ صبح ہی صبح صورت دیکھ لو تو سارے دن کھانے کی خیر سلّا۔ ہاں فرمائیے تو جا کے عرض کیاؤں بڑی سرکار سے۔ انکار تو کسی ترلوں کریں گی ہی نہیں۔ اللہ انہیں سوا سو سال سلامت رکھے وہ بھی اُداس اُداس سی رہتی ہیں۔ جب سے منجھلی بیگم اصل خیر سے سدھاری ہیں۔ جی بہل جائے گا اچھا جی، جاؤ، توبہ ہے تم لوگوں نے میرا دماغ چاٹ لیا۔ خوب دل ہیں دھپٹ جھپٹ بلائیں لے کر، صدقہ گئی زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ مُردہ دلوں کا کیا خاک جینا اور اللہ ہماری مزے کرانے والی سرکار کو قیامت توڑی رکھے یہ کہہ جھپ جھپ سا، صدر دالان میں بیگم صاحبہ کو بہو کا پیام سُنا دیا۔ وہ کہنے لگیں کہ سچ مچ دلہن بیگم کا سیر کو جی چاہا۔ اس پر کنیجہ جان نے کہا کہ یہ سر سفید دھوپ میں نہیں ہوا۔ انہیں بٹر چٹنیوں کا اشغلا اٹھایا معلوم ہوتا ہے۔ دلہن بیوی نے کدھی نہ کہا ہوگا۔ دلہن بیگم یہ انہیں لنکا لیریوں کی پٹی

پڑھائی ہے۔ ہاں دداجی، کیا ہے، بچے ہیں، کوئی ہرج نہیں۔ کہہ دو چلیں گے جمعہ کو۔ مگر اتنا کرنا کہ ایک آنکھ انتظام دیکھ لینا۔ میں ابھی آتون جی
سے کہہ دیتی ہوں وہ باہر داروغہ جی کو کہلوا دیں گی اور بڑی داروغن کو میں حکم دے دیتی ہوں وہ سب سامان مہیا کر دیں گی۔ چلے گی ساری محلسرائے۔
عمدہ کے طائفے کو بلوا لو۔ پیا اس کی بیٹی ضرور آئے اور کہنا نقلیں بھی ہوں گی ہوا خوری کو جا رہے ہیں۔ فرنگی کی نقل ضرور کرے، ڈرے نہیں، باہر نقلیں
نہیں ہوں گی کالے صاحب سے بنگلے کی اجازت منگوا لی ہے۔ جاؤ سب تیاریاں کرو۔ مجھے نفل پڑھ لینے دو ابھی تسبیاں بھی باقی ہیں۔ سارے محل
میں ایک ادھم مچ گئی سب نے مہندیاں لگائیں جن کی مہندیاں پھیکی ہو گئی تھیں انہوں نے اور رچائیں۔ سرخ سبز جوڑے پہنے لال سبز ے ڈانک
کے لاکھی جوتے پہنے سب بن سنور گئیں کل سامان لیس ہو گیا۔ اندھیرے منہ سب اٹھ کے تیار ہو گئے۔ بیڑے کے دربان پھاٹک کے باہر ہوئے، زنانہ
پہرہ بیڑے میں آ گیا۔ عنابی روغن کا گھٹا ٹوپ انگریز کی ولایت کا بنا۔ دروازوں کی مٹھیاں گنگا جمنی ولائتی چار تیلیا۔ کمیت گھوڑے جتے۔ ہاتھی کے
بچے، اونچائی میں ٹوپ اور ڈھے فرنگی سے بھی دو مٹھی نکلتے۔ ان کا ساز و یراق گنگا جمنی، کلغی میں سارس کے گچھے دار پر سبز رنگے لگے۔ بڑی سرکار،
بہو بیگم، صاحب عالم اور بچے اس میں بیٹھے۔ پانوں کی ڈبیا کاکسنا، چھاگل اور تھالی جوڑ کٹورا ساتھ رہا۔ کیجا جان بھی اسی میں ٹھسیں، سیج گاڑیوں
اور پالکی گاڑیوں میں خاندان والیاں اور معزز مصاحبیں بیٹھیں۔ رتھوں میں سر چڑھی مغلانیاں اور اصیلیں، بہلیوں، مجھولیوں میں خوگیر کی بھرتی۔ بہلیوں
چھکڑوں پر سامان لد کر پہلے ہی روانہ ہو گیا تھا۔ کوچبانوں نے مجرا عرض کرایا۔ روانگی کا حکم چاہا۔ ادھر کہا ہوں! اور ادھر انہوں نے بسم اللہ مجریہا و
مرساہا کہا اور کچھ پڑھ داہنی بائیں دم کر ذرا باگ تان کے ڈھیلی کی کہ لگے گھوڑے پوں منہ لینے اور ہوا سے باتیں کرنے۔ سائیسوں کی کرتیاں
لال بانات کی اور اس کے گھٹنے لال سبز بلیوڑے کی منڈیلیں سروں پر سفید چونریاں ہاتھوں میں ہٹیو بچیو کا شور مچاتے۔ کوچوانوں کی لال بانات کے
گول پردے کی وردیاں، کلابتونی ساز لگے، سفید سیدھے پاجامے، سفید پگڑیاں، کالی گرگابیاں، روپہلی موٹے نکل لگے، ایک خاص دھج سے
بیٹھے، سفید رستمال سے باگوں کو پکڑے۔ ایک ہاتھ سے کبھی کبھی چابک کا نڑا کھا ہوا میں اڑاتے گھوڑے طرارے بھرتے آناً فاناً میں چھ سات
کوس کی منزل ایک سانس میں کر آ پہنچے۔ ابھی عملہ والیاں سلطان جی میں آدھے رستے میں سستا رہی تھیں۔ غنیمت ہے کہ پیش خدمتوں کو رات کو ہی روانہ
کر دیا تھا ورنہ کیسی کام کی تکلیف ہوتی۔ بنگلہ کی اجازت صاحب کلاں سے مل گئی تھی۔ فراشوں نے دریاں بچھا، چاندنیوں کا فرش کر مسند تکیہ لگا دیئے
اشراق کی نماز پڑھ کے خاصے کی سواریاں نکلی تھیں۔ اوکھلے پہنچ کر چاشت کی نماز پڑھی بچے چمنوں میں کھیلتے کودتے پھر رہے تھے مگر حکم تھا نگاہ کے
روبرو رہیں، آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائیں کہ اتنے میں سیج گاڑیاں اور پالکی گاڑیاں آ پہنچیں اور چرخ چوں چرخ چوں کرتی بہلیاں اور ہڑ بڑ جاڑ کرتی رتھیں
بھی آ گئیں۔ ماما اصیلیں، لونڈیاں، باندیاں اپنی پنڈلیاں سہلاتی اور پاؤں جھٹکتی اتریں کہ اتنی دیر میں ٹھس کے بیٹھنے سے آدھے دھڑ سن ہو گئے تھے۔
بعض بچاریوں کو تو سواریوں میں جگہ نہ ملی تو منہ لپیٹ خالہ جمانیوں کی گودوں میں چڑھ بیٹھیں۔ پرانے شیشموں اور پیپل، بڑوں کے موٹے موٹے مضبوط گدوں
میں اور کہیں آموں کے موٹے ٹہنوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ دس بارہ جھولے تھے۔ جمنا کا کنارا اوکھلا پرانا گاؤں بڑے موسیٰ خان نواب حسب الدولہ
غلام رسول خان کی جاگیر ہے۔ خانپور سناپڑہ، کنڈا کے گاؤں بھی اسی جاگیر میں شامل تھے ان کے بیٹے نواب ولاور الملک دلیر الدولہ محمد علی خان، فیروز جنگ
کا زمانہ تھا کہ ۱۸۲۶ء میں کمپنی بہادر نے جاگیروں کی ضبطی کے احکام صادر کئے اور یہ علاقہ ضبط ہو گیا۔ بڑی سرکار ان کی پوتی اور نواب نصیر الملک احتشام الدولہ
علی محمد خان رفعت جنگ کی بیٹی تھیں۔ سن ستاون میں ان کے باوا کو اور خاندان کے سترہ مردوں کو پرانی عیدگاہ میں باڑھ مار کر کہتے ہیں ڈال دیا۔ جو شاہ
اوکھلے کا نمبردار تھا۔ سن کر دوڑا آیا، مجرا عرض کرایا اور روپیہ نذر گذرانے اور دعوت دی۔ بیگم صاحبہ وسیع الاخلاق اور قدیم الخدمتوں کی قدردان
قبول کیا اور آنے کا وعدہ کیا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا اور وہاں سے کچھ کمیرے کام کاج کو بھجوائے۔ ہرے ہرے دودھیا بھٹے، ایک کوری ہنڈیا میں
گاڑھی گاڑھی چھاچھ، صحنک میں پیزاں شکر اور مکھن سے چپڑی ٹھیکرے کی پکی مکئی اور باجرے کی روٹیاں بھجوائیں۔ چولائی کی بھجیا بھی آئی۔ یہ سب چیزیں
خاصے پر چنی گئیں۔ من سکھیا اس کی جورو لکڑی ٹیکتی، بہوؤں بیٹیوں کو ساتھ لئے آئی۔ جمردی کے لہنگے باندھنو کی چندریاں، بہوؤں کے گھونگھٹ،

شاہ عالمی روپوں کے چاندی کے گہنے میں گوندنی کی طرح لدی۔ بڑھیا کے ہاتھ ہیں، شاہی میں اچھیدیاں تھیں تو اب بھی خالی کڑے لٹتے گلے ہیں جگتی پڑی جوڑے کی چمپا کلیاں۔ ادھوڑی کے کھونسڑے جن پر سوت کی مکڑیاں اور چڑی پنجے پڑے ، وہ اتار ننگے پاؤں سامنے آئی۔ پالا گن کی بہوؤں بیٹیوں کو پاؤں پڑوایا۔ اپنی پرانی مالکانی کو دیکھ دھارم دھار رونے لگی اور اگلے پچھلے زمانوں کے ذکر کرنے لگی۔ لونڈیاں باندیاں آئیں ان کے برساتی رنگین جوڑے خواص پورے کی دروغن نے بڑے سلیقہ سے پہنوائے تھے جو رنگ جس کے چہرے اور سج پر کھلتا تھا وہی پہنایا اندر سبھا کا رنگ خوب گھٹا ہوا تھا اور نقشہ تھا کھڑا کھڑا، اس کو گلناری جوڑا پہنایا۔ نرگس ہمیشہ کی روگن تھی، رنگ تھا یا ملتانی مٹی، نقشہ پھڈا پھڈا، اس کو شوخ فیروزی پہنایا۔ صورت ہی بے بدل ہو گئی۔ اچھی طرح دار معلوم ہونے لگی۔ اسی پتیا پھری ناک میں فیروزے کی کیل جو پہنائی تو خاصی اونچی اونچی معلوم ہونے لگی۔ شام برن کا سانولا رنگ، تیکھا نقشہ، شفقی جوڑا پہن ارونا نظر آنے لگی۔ مبارک قدم کا سپیی رنگ تھا، اس پہ نافرمانی جوڑا خوب پھبا۔ چمپی سرخ سفید تھی، سبز دوپٹہ کھائے جاتا تھا۔ کلیجہ گلگوتھا سی، رنگ گیہواں، اس پر شنگرفی خوب کھلا۔ غرض دروغن کو خوب شاباشی ملی عمدہ اور اس کی بیٹی پرپیا اور پورا طائفہ خوب بن سنور کر آیا تھا۔ جھولے کی اجازت ملی سب نے جھولنا اور لہک لہک کے گانا شروع کیا مولسری کی چھتر گھنیری چھاؤں میں تین کتل کے پتھر رکھ کر چولھا بنایا۔ کڑھاؤ چڑھا اور جھیکر لیں کے لئے خرچی کا پکوان تلا جانا شروع ہوا۔ انگیٹھیوں پر کڑھائیاں چڑھیں۔ خاصے کا پکوان تلنا شروع ہوا۔ گرم گرم اترتا جاتا ہے اور بھجواتے جاتے ہیں۔ عمدہ اور پرپیا نے کیا پنچم کے سروں میں ملہار گایا ہے کہ کوئل کوکتے کوکتے چپ ہو گئی اور پپیہا سناٹے میں آ گیا۔ ٹیٹری کی رٹ رکی جھونٹے وہ لمبے لمبے کہ درختوں کے ٹہنے چرچر کرنے لگے۔ شہر کی طرف سے وہ کالی گھٹا اندھیری دے کر اٹھی کہ جمعہ مسجد کے مینار اور سفید گنبد اس میں اور بھی براق سے نظر آنے لگے۔ چمر بگلے جو پچھڑ پیپل کے ٹھنٹ پر بیٹھے تھے قطار میں اڑے، پر جو کھلے تو رام بگلے معلوم ہونے لگے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیری میں ان کی ہوا میں قطار تھی یا کپٹی راون کی گود سے مچلتی ستونتی سیتا نے اپنی موتی مالا پھینکی تھی جو کسی راچھس کے بل سے بیچ ادھر ہی میں رہ گئی تھی موروں نے وہ مست ہو کے جھنکارا ہے کہ بکھر راگ مجسم آ گئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جمنا جی پر تختوں کا بند باندھا ہے کوئی کوس بھر کا پاٹ ہو گا۔ تختوں پر سے پانی کی چادر چھٹتی۔ جگہ جگہ قرینے سلیقے سے چمن بندی مرغزار، جو یہاں سے نہریں نکالی گئی ہیں ان کے پھاٹک فولادی سرخ روغن چڑھے، ان کی درزوں میں سے پانی ایک خاص قسم کی آوازیں نکالتا گرتا چلا جاتا چھوٹے چھوٹے پل مختلف چمن بند حصوں کو ملائے، نہروں کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے سایہ دار درخت ایک سے ایک ملا۔ ٹھنڈی گپھا بناتا۔ صاحب عالم اور دلہن بیگم چرخی دار چھڑیں لے کر نوکروں سے ذرا اوٹ میں بیٹھے مچھلی کا شکار کر رہے ہیں۔ دلہن بیگم پہ ساس کا تقیہ ہے کہ ماما اصیلوں لونڈیوں میں خلا ملا کرنے سے خفت بھی ہوتی ہے اور سرکاری موجودگی ان کی بے تکلفی اور مزے میں کھنڈت ڈال دے گی اس لئے ایک رسمی طرح دے دی گئی ہے اور وہ سب آسمان سر پر اٹھائے ہیں۔ بہو بیگم کا دل چاہتا تھا کہ ہم سن سہیلیوں کو دعوت دے کے بلائے اور ساتھ لائے۔ بڑے افسروں کی لڑکیاں۔ ان کے رقعوں پہ صاحبزادی لکھا بڑی سرکار کو پسند نہ آیا۔ کہا کہ اگر ملازم پیشوں کی لڑکیاں صاحبزادی ہوئیں تو جو صاحبزادیاں ہیں وہ کیا شہزادیاں ہو جائیں گی؟ اور پھر جو شہزادیاں ہیں ان کو کیا لکھا جائے؟ ان کے لئے دختر لکھنا کافی ہے۔ بہو بیگم ان میل جول کی نزاکت کے الجھاوؤں سے گھبراتی تھیں۔ خاندان کی مرجاوا کے خلاف کیا نہ جاتا۔ ان قدیم روایات کا باقی رکھنا جزو ایمان۔ اس لئے نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ آج کل کی بیویاں شاید تحقیراً گھر گھستی کہیں، لیکن وہ تو اس استہزا کو سمجھ بھی نہ سکتیں کیونکہ گھر ہوتا ہی ہے گھسے رہنے کے لئے۔ موٹی موٹی بوندیں جمنا کے پانی میں پڑیں اور پڑ کر اچھلیں۔ سفید سفید بلبلے بنے اور پھوٹے۔ جلدی سے چرخی پر ڈور دونوں میاں بیوی چڑھا، چھڑیں سنبھالتے بنگلے کی طرف بھاگے۔ لونڈیاں باندیاں، ساری محل والیاں اسی طرح جھولوں پر ٹنگی رہیں وہ موسلا دھار بارش ہوئی کہ تو چل میں آیا۔ جن کے جوڑے پڑیا کے رنگ کے تھے وہ تھتے کچے۔ بھیگ کے رنگ چھوٹ کے عجیب ان کی بھگل بن گئی اور جن کے

کسوم کی زمین پر تھے وہ ایسے پکے کہ پانی کا کچھ اثر نہ ہوا آخر مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے۔ لوٹتے میں دوسرے رستے سے چلے سلطان جی اور پرانے قلعہ کی دیوار بن رہی تھی۔ گاڑیاں روڑیوں اور بچھوا پتھروں میں نہ چل سکیں۔ گھوڑے اڑے گھبرا کے سب اتر پڑے اور کوئی پاؤ کوس پیدل چلنا پڑا۔ مگر وہ پاؤ کوس کیا تھا رستم کے ہفت خواں تھے۔ لیجیو، پکڑیو، جانے نہ پائے، وہ چلا کی آوازیں بھی آنے لگیں اور بڑے بڑے منڈاسے باندھے گنوار لٹھ لئے لوٹتے آتے بھی دکھائی دینے لگے ——— بہو بیگم جو گھبرائیں، سارا زیور محل میں بڑھا کر آئی تھیں، بے خیالی میں ہیرا تراش کے توڑے پاؤں میں پڑے رہ گئے جلدی سے اتار وہیں سڑک پر گھبراہٹ میں ڈال دئے۔ توشہ خانے کی داروغن کو خیال آیا۔ وہ اسفندیار بن کر بیس گز پیچھے اکیلی گئیں اور اٹھا کر لے آئیں برسوں ان کی جرأت کے فسانے ہوتے رہے۔ اس گھبراہٹ اور افراتفری میں جو جو باتیں اور خفیف حرکتیں ہوئیں وہ آج تک اس محفل میں نقلِ محفل ہیں۔ اللہ حافظ!

سیّد ناصر نذیر فراقؔ دہلوی

جہان آباد

جواب کا ہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

ایک روز امیر تیمور صاحب قِران اپنے مرکب پر سوار دار السلطنت بخارا کی گلی کوچوں میں چکّر لگا رہا تھا۔ جمعدار رکاب تھامے ساتھ تھا اور امیر پوچھتا جاتا تھا کہ اس گلی کا کیا نام ہے، اس کوچہ کو کیا کہتے ہیں، یہ کون سا محلّہ ہے۔ جمعدار جواب دیتا تھا۔ یہ پستہ شکن محلّہ ہے۔ یہ گلی سراجوں کی کہلاتی ہے۔ یہ کوچہ روشن آباد ہے، جو چلتے چلتے ایک تنگ کوچہ میں پہنچا اور اس نے یہ دیکھا کہ بانسوں کے پھاٹک کے آگے چند نوجوان ایک دری کے فرش کو چاروں طرف سے پکڑے جھاڑ رہے ہیں اور دھول اُڑ رہی ہے۔ امیر نے پوچھا "جمعدار یہ کیا جگہ ہے؟" جمعدار نے کہا "حضور یہ کوچہ حضرت سیّد خواجہ بہاؤالدین نقشبند کا ہے۔ یہ بانسوں کے پھاٹک والی آپ کی خانقاہ ہے۔ اس میں آپ تشریف فرما ہیں۔ مرید خانقاہ کی شطرنجی کو جھاڑ رہے ہیں۔" امیر کو دیکھ کر نوجوانوں نے شطرنجی جھاڑنے سے اپنا ہاتھ روک لئے تھے اور امیر ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

امیر: (نوجوانوں سے) تم ہمارا اصلا لحاظ نہ کرو۔ شطرنجی بدستور جھاڑے جاؤ۔

آپ جانتے ہیں مرید اور طالب علم الھڑ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں نے دری کو اس زور سے پٹخارا کہ دھول کے مارے امیر کا ساز و یراق اور امیر کا چہرہ، تاج، گھوڑا وغیرہ سب اٹ گئے۔ امیر نے اڑتی ہوئی دھول کو دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر مل کر کہا "غبار المدینۃ شفاء" اور گھوڑے کو مہمیز کیا اور یہ جا وہ جا۔

مریدوں نے خانقاہ میں آکر امیر کا سارا حال حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت خواجہ سیّد بہاؤالدین نقشبند نے کہا۔ لڑکو! کیا کہتے ہو کہ امیر تیمور ہماری درگاہ کی خاک منہ پر مل گیا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیر اپنی عاقبت سنوار گیا۔ الٰہی اس ترک بچہ نے جس طرح تیرے رسول کی ذریات کا ادب کیا ہے اسی طرح اس کے بدلے میں اس کا نام شرق سے غرب تک شمال سے جنوب تک روشن کر دے۔ اس کی اولاد در اولاد کو پشتوں تک سلطنت بخش دے۔ چنانچہ امیر تیمور سے میراں شاہ، سلطان ابو سعید میرزا، سلطان محمد میرزا، عمر شیخ میرزا، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہان تک

گیارھویں سلطنت تھی۔

شاہجہان کو تعمیر کا دلی شوق تھا۔ نئی دلی بسانے کی تدبیر شروع کی۔ لال قلعہ اور اس کی اندرونی عمارتوں اور جامع مسجد اور نئے شہر کے نقشے بنوائے گئے۔ شہنشاہ نقشوں میں بذاتِ خاص اصلاح دیتے تھے۔ میر عمارت نے ہر مکان ہر محل کی لاگت کا تخمینہ تیار کیا اور ملکوں ملکوں سے سنگِ مرمر، سنگِ سرخ، سنگِ سیاہ، سنگِ باسی اور ہزار ہزار قسم کا مصالحہ اور سامان آنے لگا۔ میر عمارت نے چنیا اینٹ کا پیمانہ ایک ٹھیکیدار کو دے کر کہا۔ ایسی اینٹ تیار کرو۔ مگر اینٹ کچی نہ رہے، لاکھوری ہو۔ بادشاہی کام ہے، دھیان سے کرنا۔ ٹھیکیدار نے کہا۔ پیشگی نقد دلوائیے۔ میر عمارت نے لاکھ روپے کی چٹھی لکھ دی۔ خزانہ سے فوراً روپیہ پٹ گیا اور ٹھیکیدار کام میں مشغول ہو گیا۔ اینٹوں کا پزاوہ چڑھ گیا۔ کچھ مدت بعد میر عمارت کے پاس ٹھیکیدار بسورتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ "میں تو برباد ہو گیا۔ پزاووں کی آنچ تیز ہو گئی۔ اینٹوں کا کھنگر بن کر رہ گیا۔ بادشاہ اس بندہ کا زن بچہ کولھو میں پلوا دے گا۔ اس لئے میں بھاگتا ہوں۔ دیکھئے یہ کھنگر ہے۔"

میر عمارت: "گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

اور قلم اٹھا کر اس نے ایک عرضی لکھ کر بادشاہ کے حضور میں بھیجی کہ لال قلعہ اور جو شاہی عمارتیں دریا کے کنارے بنائی جائیں گی ان کی بنیادوں میں بجائے سنگِ خارہ کے کھنگر بھرا جائے گا۔ کیونکہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے اور بنیاد مضبوط رہتی ہے اور بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ اوپر کی عمارت کا مضبوط ہونا شرط ہے۔ کھنگر کا نمونہ ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ لاگت اس پر دوگنی آتی ہے، منظوری دی جائے۔

جواب آیا کہ کھنگر کا بنوانا مناسب ہے۔ دوگنی لاگت منظورِ بادولت ہے۔

میر عمارت نے ٹھیکیدار سے کہا۔ "ایک لاکھ پہلے کھنگر کے نقصان کا لو اور اب لاکھ کے بدلے دو لاکھ لیتے رہو اور نرا کھنگر پکاتے رہو۔"

میر عمارت کی یہ عنایت اور بادشاہ کی یہ پرورش دیکھ کر ٹھیکیدار خوش ہو گیا اور دل سے کام کرنے لگا۔ جب لال قلعہ کی نیو رکھنے لگے تو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبہ کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور گچ کے ساتھ بنیاد میں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی ماش کا آٹا مردار سنگ، گوڑ، السی کا تیل، سن مقرض ڈال کر بیل گری کا پانی چھان کر دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مصالحہ تھا اور بڑھیا مصالحوں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ سفیدی جو در و دیوار پر لگا کر مہرہ کی جاتی تھی وہ احمد آباد۔ گجرات کے ایڈر نام پہاڑ کی کان سے آتی تھی۔ اس سفیدی کا یہ خاصہ تھا کہ جب اس کی گھٹائی کی جاتی تھی تو بلا مبالغہ چمک دمک میں حلبی آئینہ بن جاتی تھی اور اس کے اندر آنکھوں کا سرمہ دکھائی دیتا تھا۔ دو سو برس تک آبدار رہتی تھی۔ لال قلعہ اور اس کے اندرونی مکان، قصر و ایوان بن رہے تھے۔ تختِ طاؤسی کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے۔ جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں مزدور معمار کاریگر خیموں میں، چھولداریوں میں، جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ دور دور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ سنگتراشوں کی چھینیوں اور ٹانکیوں کی دھڑا دھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سو قدم کے فاصلہ پر ایک خیمہ خزانہ کا بپا تھا۔ ایک ہندو خزانچی اور تین محرر۔ دس سپاہی روپیہ کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ روپیہ، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں پیسے اور کوڑیاں رکھی رہتی تھیں۔ کام امانی میں زیادہ اور ٹھیکہ میں کم ہوتا تھا۔ شام کے چار بجے روزانہ چٹھہ بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پسینہ واجب الادا مل جاتا تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے فرضی لاہوری دروازہ تک اردو بازار ٹٹیوں اور جھونپڑیوں کی دوکانوں میں لگا دیا گیا تھا جس میں جو، گیہوں، جوار، باجرہ کے آٹے سے لے کر قسم قسم کی جنس، کپڑا، ترکاری، کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے۔ آگرہ سے حکم پر حکم چلا آتا تھا کہ اردو بازار میں ہر شے کی دوکانیں اضافہ ہوتی رہیں تاکہ غیر ملکوں کے کاریگر جو اپنا دیس چھوڑ کر پردیسی بنے ہیں، تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی اشیاء اور غذا انہیں میسر ہو۔ شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصہ حصہ کر دئے گئے اور شاہجہان نے ان حصوں کو اپنی اولاد پر بانٹ دیا تھا اور فرما دیا تھا کہ لاگت

سب خزانہ سے ملے گی۔ اپنے اپنے حصہ میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل بنواؤ تاکہ نیا شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے چنانچہ دکن کا حصہ اور نگ زیب کے اہتمام سے زیبائش پانے لگا۔ کشمیری دروازہ کے قلعہ کو دارا شکوہ نے فلک شکوہ قصر و ایوان سے سنوارا۔ چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا تھا باغ اور گلشن اور حماموں سے رشکِ فردوس بنایا۔ نٹوں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار ہے۔

جامع مسجد کی تعمیر نواب سعد اللہ خاں وزیر کو سپرد تھی اور اس کی نیویں بھری گئی تھیں۔ وہ انجینئر جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا یکا یک مع نقشہ کے غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام اینڈ ہو کر رہ گیا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے، حکم صادر ہوا کہ جو شخص اس کافر منش مسلمان کو جس نے خانۂ خدا کی تیاری میں روڑا اٹکایا ہے پکڑ کر لائے گا تو اسے اس قدر انعام دیا جائے گا۔ مگر وہ خدا کا بندہ ایسا اوپ ہوا کہ تین برس تک کسی نے اس کی جھلک بھی نہ پائی۔ تین سال بعد وہ یکا یک دربارِ شاہی میں حاضر ہو گیا۔ حضورِ والا نے فرمایا "کم بخت یہ حرکت کیا تھی؟" اس نے ہاتھ باندھ کر کہا "جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہو گی۔ نئی بنیاد پر ایسی اونچی عمارت کا لیجانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیو میں مرتا اور اس کے در و دیوار نیچے کھسکتے اور ڈاٹیں، کمانیں، محرابیں جھک جاتیں۔ سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی پھر جاتا اور میری آبرو کے ساتھ ساتھ جان بھی جاتی۔ نیک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا۔ تین برساتیں کھا کر نیو لوہا لاٹ ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ عمارت کھڑی ہو گی صدیوں تک کھڑی رہے گی۔ حضور کو اختیار ہے کہ فدوی کی جاں بخشی ہو یا سزا دی جائے۔"

بادشاہ نے انجینئر کے عذر کو غور سے سن کر اس کی خطا معاف فرمائی اور خلعت سے سرفراز کیا اور جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں صاحب کے اہتمام سے تیار ہونے لگی۔ جو نواب صاحب کو قولنج ہوا اور وہ جنت کو سدھارے۔ بہر حال جامع مسجد اور لال قلعہ اور شہر بن گیا۔ حضورِ والا نے دیوانِ خاص میں تختِ طاؤسی پر جلوہ افروز ہو کر جشنِ ماہتابی منایا اور ایک فرمان جاری فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ فخر البلاد جہان آباد عرف شاہجہاں آباد میں جو رعایا آباد کی گئی ہے۔ اس میں خوش حال کم اور اہلِ حاجت زیادہ ہیں۔ پھر ان میں کاروباری ہیں، مزدور ہیں، بیمار ہیں، عورتیں ہیں، پردہ نشین جو برقعہ اوڑھ کر بھی باہر نہیں نکلتی ہیں اور بغیر سودے سلف کے کام نہیں چلتا ہے۔ اس واسطے میں حکم دیتا ہوں کہ ترکاری فروش، گوشت فروش، میوہ فروش، پارچہ فروش، کسیرہ، گندی، تانبے کے برتن فروش، موچی، مٹی کے مٹکے، ٹھلیاں، صراحیاں بیچنے والے، اوپلہ ایندھن بیچنے والے، سادہ کار، چاندی سونے کے زیور بیچنے والے، حلوائی، بساطی اپنے اپنے سامان خوانچوں میں لگا کر، گٹھڑیوں میں کندھے پر رکھ کر، بہنگیوں میں کہاروں کے کندھے پر لاد کر گلی گلی، کوچہ کوچہ، محلہ محلہ پھریں اور اپنی اپنی جنس کا نام لے کر آواز لگائیں۔ بزاز کہے "نینو، لٹھا، ڈوریہ، ململ" مچھلی والا "مچھلی دریاؤ کی، لو مچھ"۔ کھٹ بنے، بڑھئی، لوہار اپنے اپنے پیشہ کا نام لے کر پکاریں۔ یہاں تک کہ موری دہانے والے پکار کر کہیں "موری دھلوا لیجئے" تاکہ گھر بیٹھے اہلِ حاجت کی ضرورت رفع ہو جائے۔ چونکہ اس حکمِ تازہ کی تعمیل مشکل سے پیشہ ور کریں گے اس لئے کوتوالی کے برق انداز لوگوں کے ساتھ رہیں اور شہر میں گشت کروائیں تاکہ گاہک اور سودا بیچنے والے اس طور کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو نفع ہو اور مول لینے والوں کو بازار جانا نہ پڑے اور ہر قسم کی چیزیں اپنے دروازہ پر لے لیں۔ جیسی نیت ویسی برکت۔ شاہجہان بادشاہ کی یہ تدبیر ایسی راست آئی کہ آج اس اجڑے دیار میں لینے والی بیٹی کا سارا جہیز اپنے گھر کے دروازہ پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر مول لے لیتی ہے۔ شاہجہان کے بعد سلطنت درجہ بدرجہ منتقل ہوتی ہوئی محمد شاہ رنگیلے تک پہنچی اور لال قلعہ کا دیوانِ خاص عیش و نشاط کے سامانوں سے فردوسِ بریں بن گیا۔ معتمد الملک سید ہاشم علوی خاں حکیم رنگینیٔ ذوق کے مددگار تھے۔ ان کے حکم سے شتر خانہ بادشاہی میں گرمی جاڑا برسات دو سو اونٹ بدمست رکھے جاتے تھے اور ان کے کانوں کے پیچھے کی مستی دوا کے کام میں آتی تھی۔ میر شکار جنگلی کبوتروں کے بیس انڈے تازہ بتازہ اور بارہ انڈے چڑیا کے پیش کرتا تھا۔ کیونکہ دونوں چیزیں مقوی ہیں۔ شراب پانی کی طرح لنڈھائی جاتی تھی۔ ایک رات محمد شاہ نشہ کے سرور میں اس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے جس میں حضور رسالت پناہ اور بزرگوں کے تبرکات امیر تیمور کے عہد سے جمع کئے گئے تھے۔ یہ درگاہ لال قلعہ میں ہی تھی۔ اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ نادر شاہ آیا اور لال قلعہ کو اور

شاہجہان آباد کو اجاڑ کر چل دیا اور بقول مومنؔ ــــ

حسنِ روز افزوں پہ غرّہ کس لئے اے ماہ رو
یونہی گھٹتا جائے گا جتنا کہ بڑھتا جائے گا

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری میں ٹھٹھر کر رہ گئی۔ دانایانِ فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ کوئی حاکم، کوئی رئیس، کوئی نواب عہدہ برآنہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنایا۔ ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا۔ کیونکہ مرتا کیا نہ کرتا، جان بچی لاکھوں پائے۔ ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ ہندوستانی عموماً انہیں اچھا جاننے لگے تھے اور ان کی سپاہ اور شاہراہ اور تنخواہ کی بچہ بچہ کی زبان پر تعریف تھی۔ یعنی فرنگیوں کی فوج جرّار ہوتی ہے۔ دس ہزار پہ ایک ہزار بھاری ہوتی ہے۔ شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں تک ان کی حکومت پہنچتی ہے پکی سڑک اور سڑک کے ساتھ ساتھ ریل اور ڈاک بھی اوڑی چلی جاتی ہے اور تین تین دن میں خط پتر ملک کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اس کا درماہہ یا طلب یا وظیفہ بے قیل و قال بے چون و چرا پہلی کی پہلی کر دیتے ہیں۔ راجہ مہاراجہ نوابوں اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی اور نوکر کا گھرانہ فاقہ کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

(۲)

ابو نصر معین الدین اکبر ثانی جب بیٹے کی منت پوری کرنے اور پھول والوں کی سیر منانے مہرولی حاضر ہوئے تھے تو عجب سماں تھا۔ برکھا رت، ساون کا مہینہ، بادشاہی خیمے مخملی باناتی اطلسی سبز سرخ زرد ریشمی کلابتونی سوتی طنابوں سے جکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سنہری کلس اور شمسے سورج میں چمک رہے تھے اوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا بادشاہی خیمہ سے لے کر حضرت قطب صاحب بندہ نواز کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں۔ دورویہ قنات کھڑی تھی کیونکہ ملکۂ دوراں مرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لئے درگاہ میں حاضر ہوں گی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے ظلِ سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آ گیا۔ بس ملکۂ دوراں نے پچاس خوان اندر سے اندرسہ کی گولیوں اور پھینیوں کے آراستہ کئے ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنہ، پکھراج، نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے جس کی بالشت بھر نیچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا بدھی، طرہ عطر میں بسا کر اس کے سر پہ بندھوا کر وہ کشتی صاحبِ عالم کے سر پر بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہزادہ کی بلائیں لے کر کہا ”اماں میرا منہ نہ تھا کہ تو فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہجہان آباد آئے اور میں تجھے دیکھوں یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جانِ من منت کی کشتی سنبھال کر اور سر ادب نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلو۔ آؤ۔ غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پہ اور صندل دان عطر دان بیگم نے اپنے سر پر اور مٹھائی کے خوان بادشاہزادیوں نے اپنے سروں پر رکھ کر سب نے مل جل کر آستانۂ پاک کی راہ لی بیگمیں بادشاہزادیاں ٹکواں جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھرو کے جال کے سلمہ ستارہ کلابتون کے تمامی، زری بوٹی، زربفت کمخواب زری گاچھ اطلس ولائی، بابر نیٹ بنارس گجرات سورت احمد آباد شریف لاہور کے شاہی کارخانوں ریشمی اور زریں کپڑوں کے لباس پہن کر آراستہ ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپیہ کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور نارنول کی مہندی رچی ہوئی تھی، ڈھیلے پائنچوں کو دو لونڈیاں اٹھائے چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ کو سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں بیگموں کے چھاجھن چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندہ اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات در قنات یہ سب درگاہ شریف میں پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھما دیئے گئے۔ ملکۂ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک پہنچ کر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا مگر عورتوں کے لئے ہمیشہ سے یہی حدِ ادب ہے۔ بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف پھر صندل

چڑھایا اور اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ نقدنذرانہ جھری میں بھر دیا گیا۔ بادشاہزادوں کو قدم بوس کرایا اور سب حاجی دعا کرکے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردہ شاہی میں داخل ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہونے لگا۔ صحن میں کھم گڑے تھے۔ نوعمر بادشاہزادیاں جھولے میں بیٹھیں اور گائنیں انہیں جھلانے اور یہ غزل گانے لگیں :۔

میری دل کی کنجی میری جان جھولا　　　میری آرزو میرا ارمان جھولا

پھول والوں کی سیر سے فارغ ہوکر بادشاہ شاہجہان آباد تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا کہ جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کی جائے یہ رسم دلّی سے مٹ گئی اور نئی نانتی نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہے اس لئے فقیر (فراق) تورہ کے معنی عرض کرتا ہے۔ تورہ ترکی زبان میں قانون یا آئین کو کہتے ہیں۔ اس واسطے دہلی میں محاورہ بنا "شرع تورہ" یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک بات۔ مگر عورتیں اپنی بول چال میں طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنے میں استعمال کرتی ہیں مثلاً "اللہ رے عورت ترا تورہ" بڑا یہ اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا۔ تورہ پیٹی۔

دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں اور توران میں اس کھانے کے خوانوں کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصہ بخرہ کے بھائی بندوں عزیزوں دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ ہندوستان میں فرمانروا ہوئے تو ان کے ساتھ تورہ چنگیزی بھی آیا۔ بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے نام بنام، تاکہ عین تاریخ پر تقریب میں ہلڑ نہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے یا دسترخوان پر نہ بٹھایا یا ہم دسترخوان پر بیٹھے تو تھے مگر فلاں کھانا فلاں شے ہمارے آگے نہ تھی، ہماری توہین کی گئی۔ اس لئے تورہ کے کھانوں کی فہرست لکھ کر کنبہ خانوں میں بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں۔ ایک گھر کے دس تورہ ہیں تو وہ دسوں تورہ ایک دن میں لے سکتے ہیں اور دل چاہے تو دس دن میں لے لیں۔ پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کردی جاتی تھی۔ چاہے لینے والے نقد لے لیں۔ ایک منشی مع دوات قلم کے اور پانچ خادموں کے توروں کے ساتھ ہو لیتا۔ ایک تھیلی روپیہ کی بھی اس کے ہمراہ ہوتی تھی، اس کے ذمہ پچاس تورہ ایک دن میں تقسیم کے لئے ہوتے۔ رسید لے لیتا تھا اور تورہ دے دیتا تھا۔ جو نقد لینا چاہتا اسے نقد دیتا تھا۔ ہر تورہ ایک کہاری کی بہنگی میں ہوتا تھا۔ تورہ جو ادنیٰ قسم کا ہوتا اس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی۔ تورہ کا کھانا مٹی کے برتنوں میں عموماً ہوتا تھا۔ تورہ کے کھانوں کی تفصیل یہ تھی۔ ایک لکڑی کے خوان میں سب سے نیچے:

(۱) باقرخانیاں ڈھائی سیر پختہ کی دو عدد (۲) قورمہ کے دو پیالے، ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ (۳) کباب شامی پانچ عدد (۴) بریانی دو طباق (۵) متنجن دو طباق (۶) فیرنی دو پیالہ۔ ہر پیالہ میں آدھ سیر (۷) مربہ آم وغیرہ کا ایک پیالی میں (۸) اچار کسی قسم کا ایک پیالی (۹) دہی آدھ سیر ایک پیالہ میں (۱۰) گاؤ زبان دو عدد (۱۱) گاؤ دیدہ دو عدد (۱۲) نان تنور یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔

یہ سب کھانے مانڈوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ مانڈہ اس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے جو شب برات کو پکتی ہیں۔
ایک مثل بھی مانڈوں کے متعلق مشہور ہے۔ مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں، انہیں اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔

یہ معمولی تورہ ہے ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزار نعمتوں کے سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے۔ اس رسم کو بادشاہوں سے دلّی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں بھی تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے۔ اب تو پارٹی کی گرما گرمی ہے۔

———

عشرت لکھنوی

دربارِ دہلی کی کنکوا بازی

لکھنؤ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ دہلی میں بادشاہ کا دربار ہوگا۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوس فرمائیں گے۔ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ پیشوائی کو آنے لگے۔ تمام ہندوستان میں اس بات کی خوشی تھی کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دہلی میں رونق افروز ہوں گے۔

لوگ اس تماشہ کو دیکھنے کے واسطے دور دور سے آرہے تھے۔ ہر فن کے اہلِ کمال جمع ہو رہے تھے۔ فوجیں جنگ کا نمونہ دکھانے کے واسطے بلائی گئیں۔ مرغ باز، تیتر باز، بٹیر باز سب نامی گرامی بلائے گئے۔ پلاک صاحب ڈپٹی کمشنر نے لکھنؤ میں سیّد آغا حسین صاحب کو لکھنؤ کے کنکوا بازوں میں انتخاب کیا اور بلا کر کہا کہ کچھ آپ نے سنا بھی ہے، دہلی میں دربار ہونے والا ہے۔ تمام دنیا کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمام بازیوں کے کھلاڑی شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ اپنے فن میں یکتا ہیں۔ ہم آپ کو چھٹی دیں گے آپ شاہی خیمے میں شاہی مہمان ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی عزت نہیں ہو سکتی۔

آغا صاحب سوچنے لگے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دوست احباب سے مشورہ لیا سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آغا صاحب ایسا اچھا موقع آپ کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا ایک تو ہندوستان بھر میں عزت دوسرے امیدِ بہبودی یعنی اگر بادشاہ کو آپ کی کنکوا بازی پسند آگئی تو کچھ جاگیر گورنمنٹ سے انعام میں مل جائے گی۔ عمر بھر چین کیجئے گا۔ یا کم سے کم تنخواہ بیش بہا تا حیات مقرر ہو جائے گی۔ سب سے عزت کی بات یہ ہے کہ خود ڈپٹی کمشنر آپ کو اپنی طرف سے بھیجتے ہیں۔ شاہی خیموں میں آپ فروکش ہوں گے اور شاہی مہمان تصوّر کئے جائیں گے اور پھر بسر بھی ایسی دیکھنے میں آئے گی جس کے واسطے لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے تمنا رکھتے ہیں کہ دہلی میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے۔ لوگ تو اسی حسرت میں رہتے ہیں۔ یہ دن کس کو نصیب ہوتا ہے۔ نواب بنے صاحب نے فرمایا "ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ لاٹ صاحب سے انگریزی میں گفتگو کر کے ایک خیمہ ڈلوا لیں گے۔ اسی میں ہم آپ سب رہیں گے۔" منجھے صاحب سوز خوان نے کہا "آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے ہم آپ کے ساتھ چلیں گے، آپ ڈپٹی کمشنر سے جا کر چٹھی تو لکھوا لائیے۔"

آخر بے چارے آغا صاحب سب کی اشتعالک سے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ چٹھی لکھوا کر لائے۔ اچھے کاریگروں سے عمدہ کنکوے بنوائے۔ مانجھا سنتوایا، ایک ڈیڑھ تا دے پر "ویلکم" بنوا کر کہا یہ بادشاہ کے خیمہ میں گرا دیں گے۔ کنکوؤں کو کسا، کنتے باندھے، چرخیوں پر سادی اور مانجھا چڑھا کر

ان پر غلاف اطلس کے چڑھائے۔ پوشاکیں نفیس بنوا کر بکسوں میں رکھیں اور بہت سی امیدیں، بہت سے ارمان لے کر ہمراہ نواب بنے صاحب، منجھو صاحب سوز خواں دہلی کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے، دیکھا تو پرانی دہلی کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہے اور نئی دہلی میں جہاں شاہی خیموں کا جنگل ہے، فوجی پہرے موجود ہیں۔ آدمیوں کو رستہ نہیں ملتا۔ میدانِ حشر معلوم ہوتا ہے کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ بہت مشکل سے بنے صاحب اور ہم خیموں تک پہنچے۔ وہاں کمپنی کو ڈپٹی کمشنر کا خط دکھایا انھوں نے بہت عزت کی۔ ایک خیمہ آغا حسن صاحب کو دیا اور اس پر گوروں کا پہرہ مقرر کر دیا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ اب آغا صاحب کو کھانے کی فکر ہوئی۔ یہ سمجھے تھے شاہی مہمان ہیں، کھانے کے خوان آتے ہوں گے مگر جب کھانے کو کسی نے نہ پوچھا تو یہ خیال ہوا کہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوایا جائے مگر یہاں سرکاری خیموں میں ہوٹلوں کا ذکر کیا۔ کھانے کی بو باس پر گوروں کا پہرہ تھا اور کارونیشن ہوٹل شہر سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ آخر ہم سب لوگ خیمہ چھوڑ کر ہوٹل میں مقیم ہوئے مگر دن بھر خیموں میں رہتے ہیں۔ سرکاری کمیٹی نے حکم دیا کہ آغا صاحب آج کنکوا لڑائیں۔ دہلی کے نامی کنکوا بازان سے کنکوا لڑانے گئے۔ آغا صاحب نے چاہا کہ پہلا کنکوا اڑھا کر بادشاہی محل میں ڈھا دیں تاکہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گزرے کیونکہ اس پر 'ویلکم' لکھا ہوا تھا۔ مگر ہوا مخالف تھی، مجبور ہو کر خاموش رہے اور اس ناکامی پر سخت تعجب کیا۔

سہ پہر کو آغا صاحب نے کنکوا اڑایا۔ دہلی والوں نے بھی کنکوا اڑایا۔ شام تک کنکوا اڑایا کئے اور بارہ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو کمیٹی میں بلائے گئے۔ وہاں مسٹر داس صاحب سیکرٹری کمیٹی نے کہا کہ آج آپ کے بارہ پیچ زیادہ ہوئے مگر دہلی کے لوگوں نے ہم سے کہا کہ یہ دہلی کے اچھے کنکوا باز نہیں تھے، اور انھوں نے درخواست کی ہے کہ پھر ایک دن ہم کو دیا جائے تاکہ ہم اچھے اچھے لوگوں کو پیش کریں جو کنکوا بازی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کل پھر کنکوا لڑائیے۔

دوسرے دن پھر دہلی والوں سے لڑے، ۲۰ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو پھر کمیٹی میں گئے تو سیکرٹری صاحب نے کہا: "آج تو آپ کے بیس پیچ زائد رہے۔ اور سب لوگوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا کل آپ میرٹھ والوں سے کنکوا لڑائیے۔

تیسرے روز آغا صاحب نے ———— میرٹھ والوں سے کنکوا لڑایا اور ان سے بھی ۵۲ پیچ زائد رہے۔ کمیٹی نے شام کو آغا صاحب کو بلا کر کہا کہ سارا دربار آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ سے بہتر کنکوا لڑانے والا کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج آپ کے ۵۲ پیچ زائد رہے۔

آغا صاحب کی خوشی کو کچھ نہ پوچھئے۔ ہاتھوں دل بڑھ گیا اور کہنے لگے اب تو ضرور کوئی علاقہ سرکار سے ملے گا اور زندگی بھر عیش کریں گے۔

چوتھے روز بریلی والوں نے کنکوا لڑایا اور وہاں بھی آغا صاحب کو کامیابی ہوئی اور شام تک ۲۲ پیچ کاٹے۔

پانچواں کنکوا اڑھایا اور برابر کاٹتے رہے۔ تینتیس پیچ کاٹے۔ شام کو پھر دربار میں بلائے گئے اور لاٹ صاحب کی میم صاحبہ نے اور بڑے جلیل القدر انگریزوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا تمام ہندوستان میں آپ سے بڑھ کر کوئی کنکوا نہیں لڑا سکتا۔ ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی اور آغا صاحب دل میں خوش تھے کہ آج بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے انعام کا اعلان لاٹ صاحب کریں گے۔ سب انگریزوں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اتنے میں میم صاحبہ نے آغا صاحب کو ایک کرسی پر کھڑا کیا اور ایک روپے سے بڑا نکل کا بنا ہوا ایک تمغہ سینہ پر آویزاں کیا اور سب لوگوں نے چیرز دئے اور سرکاری فرمان بھی نہایت خوشی سے پیش کیا۔

یہ دیکھ کر آغا صاحب تو جیتے جی مر گئے، ضبط نہ ہو سکا، آخر بے اختیار ہو کر بول اٹھے:

"میم صاحبہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں آتے ہیں اور پانچ سو روپیہ ہمارا صرف ہو چکا۔ خیال تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ہماری پنشن مقرر کی جائے گی یا کوئی علاقہ انعام میں عطا ہوگا کہ بقیہ عمر عیش و آرام سے کٹے گی۔ آپ نے اس سب خدمت کے بدلے ایک روپیہ ہمارے سینے سے لٹکا دیا اور ایک کاغذ ہم کو دیا۔ اسے ہم لے کر کیا کریں گے؟ ہمارے کس کام کا؟ یہ تو ہمارے درد کا علاج نہیں ہے؟"

میم صاحبہ نے کہا "آغا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی چیز آپ کو دی جاتی ہے جو فوجی افسروں کو جنگ کی کامیابی پر بادشاہ دیتے ہیں اسی کے سبب سے آپ ہر ایک دربار میں جا سکتے ہیں اور ہر سرکاری جلسہ میں آپ کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ ہر فوجی افسر کے پاس یہی تمغہ ہوتا ہے جس سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بہت عزت کی چیز ہے آپ کو بادشاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ آپ کو اتنی بڑی عزت عطا ہوئی اور شاہی فرمان کے کاغذ میں آپ کو کامیابی کی مبارک باد دی گئی ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ بادشاہ نے آپ کی بہت قدر کی۔"

آغا صاحب کا چہرہ اتر گیا اور بادلِ ناخواستہ اپنے اوپر ہزاروں نفرین کرتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہنے لگے:

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہنے لگے کہ کنکوا لڑو ہزاروں جگہ لڑانے گئے مگر یہ سوختگی کبھی نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد کنکوا بازی سے توبہ کر لی۔

———

چودھری افضل حق

زود پشیمان

ریاض شاداب پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا تھا۔ بہار خوشی کے جھولے میں جھول رہی تھی۔ اس خوش گوار موسم میں شگفتہ رو نوجوان سوچ میں بڑا فضا کو کیوں تاکتا ہے؟

"میری زندگی کا مصرف کیا ہے؟" ریاض نے آہستہ سے کہا "عیش و آرام، شہرت، جاہ طلبی، دنیا کا سیم و زر ان سب چیزوں کی کمی نہیں۔ باوجود اس کے چند دن سے طبیعت میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان چیزوں سے اب مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ کیا مجھے خوشی کے اور ذریعہ کی تلاش میں نکلنا چاہئے۔ یہ خوشی بھی کیا ہے جس کے لئے میں مارا مارا پھروں۔ میں نے اپنی خوشیوں کے لئے بیسیوں کا آرام حرام کر دیا۔ شہرت اور جاہ طلبی کی بھاگ دوڑ میں کئی ایک سے بازی لے گیا۔ اور انہیں ناکامیوں کی حسرت ناک زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ گیا۔ کیا گوشۂ تنہائی اختیار کروں۔ کیونکہ وہ بھی خوشی اور اطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر گوشۂ تنہائی میں بیٹھوں، اطمینان تو نصیب ہو جائے گا۔ مگر زندگی کی افادیت گھٹ جائے گی۔ پس میری عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ ایسی فائدہ بخش زندگی بسر کروں جس میں میری ذات کو دو روٹی سے زیادہ دخل نہ ہو۔"

وہ اٹھ کر محل میں آ گیا۔ ڈیوڑھی پر ملازمین نے جھک کر سلام کیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

خوبصورت نسیمہ راحت بخش اور آرام دہ مخملیں کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ گویا مخمل پر رنگین ریشم کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ زندگی کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی تھی۔ ریاض نے شادی کے بعد نسیمہ کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان کی متاہل زندگی میں دن عید رات شب برات ہو کر گزرتی تھی۔ ریاض حسب معمول مسکراتا گھر میں داخل ہوا۔ نسیمہ کے لئے گھر بھر میں گلزار کھل گیا۔ ریاض نسیمہ کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گل و بلبل محبت کی سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔ نسیمہ نے تین سال کی بچی کی طرف جو پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم پر خدا نے زندگی کی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ ابھی سے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آج ہی ہونہار بر دا پر نظر رکھنا ہو گی۔ اللہ کرے کوئی اچھا بر مل جائے۔

ریاض نے کہا: "اس کی کیا تشویش ہے۔ ہماری ڈیوڑھی کے دربان کے سات سالہ لڑکے کو علم و دولت سے مالا مال کیا جائے وہ اس بچی کے لئے ہر طرح موزوں ہو سکتا ہے۔"

نسیمہ اس طرح تڑپ اٹھی گویا ہزار بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہو۔ قریب تھا کہ وہ ریاض کو کچھ اُلٹی سیدھی سُناتی اس کی طبعی شرافت بروئے کار آئی۔ اور اس نے ضبط سے کام لیا۔ پھر خیال آیا کہ میں نے شاید بات سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس لئے دوبارہ پوچھا کہ "میں آپ کی بات کو نہیں سمجھ سکی"

ریاض نے کہا "بات تو تم نے ٹھیک سُنی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزاج کو گراں گزری ہے"

نسیمہ - تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ اپنی بچی کو دروازے کے دربان کی کنیز بنانے پر آمادہ ہیں؟

ریاض - اگر تم میری کنیز ہو تو تمہاری بچی کو بھی کسی کی کنیز بننے کے سوائے چارہ نہیں۔ مگر پیاری نسیمہ یہ تو بتاؤ کہ طبیعت میں اعتراض کیا ہے؟

نسیمہ - موری کی اینٹ چوبارہ کو کیسے لگے۔ رذیل شریف کا ناطہ کیا؟

ریاض - رذیل شریف کا معیار کیا ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے دولتِ دنیا کھو بیٹھوں۔ کیا رذیل ہو جاؤں گا

نسیمہ - آج آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ماں باپ اولاد کی ترقی اور آرام کی سبیلیں سوچتے ہیں یا انہیں جہنّم میں جھونکنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ کیا میری بچی کا خاوند دوسروں کے در کی دربانی کرے گا۔ اور میری بچی غیروں کے برتن صاف کر کے اپنا پیٹ پالے گی؟

ریاض - اگر ہم، جو بزعم خود بڑے بنے بیٹھے ہیں دولت سے محروم ہو جائیں، ہمیں بھی ہاتھ ہلا کر گزر اوقات کرنی پڑے گی۔ لیکن چھوڑو اس بحث کو میں تو یہ کہتا ہوں، دولت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس امر پر قادر ہو کہ دربان کے لڑکے کو زیورِ علم و اخلاق سے آراستہ کر دو۔ تمہارا داماد تمہاری لڑکی کا غلام بن کر رہے گا۔

نسیمہ - تو میں کفو اور خاندان کا خیال چھوڑ دوں؟

ریاض - ہم سب اولادِ آدم ہیں۔ رشتہ انسانوں میں کرو حیوانوں میں نہ کرو۔

نسیمہ خاموش ہو گئی مگر ماتھے کے تیور نہ اُترے۔

ریاض نے رات کے کھانے پر سب ملازمین کو دعوت دی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ شاگرد پیشہ لوگوں کو بے حد پریشانی تھی۔ اُمرائے کے آداب غربا کی معاشرت سے جدا تھے۔ ڈر تھا کہ کوئی حرکت رئیس کے ناگوار خاطر نہ ہو۔ بہر حال رات کو لجاتے شرماتے، سمٹتے سمٹاتے سب آئے۔ کوئی نتھو کو کہے تو چل۔ کوئی فتو کو کہے تو آگے ہو۔ رئیس کی دعوت کیا تھی۔ داورِ محشر کا سامنا تھا۔ غریب مہمان ہر چند نئے کپڑے بدل کر آئے۔ لیکن وہ خود اپنی نگاہ میں حقیر تھے۔ اس وقت کپڑے ان پر تنگ تھے وہ کپڑوں سے تنگ تھے۔

ریاض خود اٹھا۔ ایک ایک کو اخلاق سے ہمراہ لایا، اور زمین پر بچھے مکلّف دسترخوان پر سب کو بٹھایا۔ رئیس سامنے بیٹھا تھا۔ غریب مہمانوں کی حرکات عروسِ نو کی طرح محجوب تھیں۔ وہ لقمہ اٹھاتے اور ساتھ ساتھ آنکھ چُرا چُرا کر رئیس کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں وہ تو ان کو نہیں دیکھتا۔ مبادا اس کو ان کے خورد و نوش کے طور طریقے ناپسند ہوں۔ اور وہ بے ہودہ اور بے عقل تصور کئے جائیں۔

ریاض ان کی کیفیتِ قلب اور بے چینی کو سمجھتا تھا۔ انسان اور انسان میں اس مغائرت کا ذمہ دار وہ اپنے آپ کو خیال کرتا تھا، اور ساتھ ہی اعلیٰ سوسائٹی کو مطعون کرنے سے اسے دریغ نہ تھا۔ جس نے غریب امیر میں آدابِ معاشرت کی خلیج حائل کر دی۔ جب تک اخوت و مساوات کی بنیاد پر تہذیب و سیاست کی تعمیر نہ ہو گی۔ تب تک انسان مختلف درجوں میں بٹے رہیں گے۔ نسیمہ نے جب سنا کہ ریاض شاگرد پیشہ لوگوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہے تو وہ غصہ کی دیوی بن کر اندر آنگن میں پھرنے لگی۔ اس کا چہرہ لال اور آنکھیں غصہ سے سُرخ تھیں۔ اس نے رات کو سونا چاہا مگر غصہ سے نیند نہ آئی۔ ریاض نے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا۔ نسیمہ کی نظر میں وہ خود اچھوت ہو گیا۔ صبح اٹھی اور لڑکی کو لے کر چپکے سے موٹر میں بیٹھ میکے چلی گئی۔

ریاض کو محبوب بیوی کی مفارقت شاق گزری۔ لیکن اس کے چپکے سے چلے جانے کا بھی صدمہ تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ نسیمہ عورت ہے۔ میرا عمل اگر اس کے خلافِ مزاج ہو تو اس کو احتجاج کرنے کا حق ہے۔ اس لئے چند دن اور صبر کروں۔

نسیمہ کے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ چند دن میں ریاض کا چہرہ اُتر گیا۔ مفارقت کی بیماری نے غلبہ پا لیا۔ ایک ہفتہ تو جوں توں کر کے کاٹا۔ ہفتہ کے بعد سُسرال میں گیا کہ نسیمہ کو منا لائے۔ کسی شیطان نے نسیمہ کو ورغلایا کہ اکڑی رہنا۔ جب تک دو چار بار لینے نہ آئیں نہ جانا۔ ورنہ امورِ خانہ داری میں وہ اسی طرح خود رائی کریں گے۔ بدی کے سرچشمہ کو ابھی بند کر لو، ورنہ سیلِ حوادث میں خود بہنا پڑے گا۔ ریاض نے ہر چند منایا کہ گھر چلو۔ نسیمہ نے ٹسو کی ایک کہہ دی کہ میں نہیں جا سکتی۔ مرد کا آخری کارگر ہتھیار بھی اس نے آزما دیکھا۔ یعنی ریاض نے یہ بھی کہا کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ باوجود اس کے نسیمہ نے کہا میں چھ ماہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ بیمار خاوند درماندہ مسافر کی طرح شکستہ خاطر ہو کر چلا آیا۔ نسیمہ کو اپنے حسن کی تاثیر پر اعتماد تھا کہ وہ ہزار بار آئے گا اور لاکھ بار مجھے منائے گا۔ ریاض کے خیالات میں پہلے ہی انقلاب آچکا تھا محبت کا بندھن اب کمزور ہو گیا۔ نسیمہ کے خلافِ توقع فیصلہ نے اس کا دل توڑ دیا۔ یہ وہ وقت تھا، جب انسان زندگی کے بہت سے خوشگوار اور ناخوشگوار فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ ریاض نے تازہ رجحانات کی روشنی میں اپنے کمزور عزم کو پختہ کر لیا کہ دو روٹی کے سوا مجھے دنیا میں اور کیا چاہئے۔ پندرہ گاؤں کا پرگنہ میرے کس کام کا۔ خدا کی زمین پر لوگ ہل جوتتے ہیں اور گاڑھے پسینے کی کمائی مجھے دیتے ہیں۔ خود بعض اوقات نان و نفقہ سے بھی محروم رہتے ہیں لیکن میری تن پروری اور عیش کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں۔ آخر کسان کا خون کب تک چُوسوں!

اب اس کے چہرے پر متانت بڑھ رہی تھی۔ اپنے ملازموں اور کسانوں سے اس کا سلوک ہمدردانہ ہی نہ تھا بلکہ مساویانہ تھا۔ وہ خود بڑھ کر سب کو سلام کرتا تھا۔ باورچی خانہ کے تکلفات ختم ہو گئے تھے۔ وہ ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ وہ پہلے شاہانہ ٹھاٹھ سے اپنے تعلقہ داری کے گاؤں میں جاتا تھا۔ اب اکیلا موٹر پر گھومتا ہے۔ اور ان کی فلاکت کو دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہے۔

فصل نکلنے کا موسم آگیا۔ ریاض کے مختار بڑے سرگرم ہیں۔ رئیس کے حسنِ سلوک نے ان میں کام کی طاقت بڑھا دی ہے۔ وہ اب کسی کسان پر رحم کرنا نہیں چاہتے۔ قرضے کی ساری رقوم کو اسی فصل پر وصول کر کے ریاض کے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک ریاض نے حکم دے دیا کہ زرِ قرضہ صرف اُسی کسان سے وصول کیا جائے جس کے گھر میں سال کا غلہ اور چھ جوڑے کے حساب سے ہر ایک کے پاس کپڑے ہوں۔ ایک ہل کے پیچھے پانچ روپیہ کا ماہانہ خرچ۔ ایک بچے کے لئے تعلیم کے اخراجات ماہوار نکال کر جو بچ رہے وہ قرضہ میں وصول کرو۔

سب مختار اس انوکھے حکم پر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، اور کہا "سرکار! اس طرح تو کچی کوڑی وصول ہونے کی نہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ریاست کے تمام حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ آپ کے خزانہ میں کوئی دمڑی داخل نہ ہوگی"۔

ریاض نے کہا "میں بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہوں کہ ریاست کے حقوق سے دست بردار ہو جاؤں یا انسانیت کے حقوق سے۔ مجھے اگر فکر ہے تو لڑکی کی تعلیم کی"۔

سب نے کہا "بے شک حضور! اس پر لاکھوں اٹھیں گے۔ تعلیم کے بعد شادی کا سامان بھی آج ہی ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے بھی لاکھوں اُٹھیں گے"۔

ریاض نے مسکرا کر کہا "جب ایک لڑکی کی تعلیم اور شادی پر لاکھوں اُٹھیں گے تو جن کسانوں کے ہاں دو دو چار چار بچے ہیں، ان کا اس دنیا میں کوئی حق ہے یا نہیں۔ اس لئے جاؤ میرے حکم کے مطابق دیکھ بھال کر آؤ کہ ان کم از کم اخراجات کے بعد کسی کے پاس کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں"۔

سب نے کہا "جانے کی کیا ضرورت ہے، ایسا کوئی کسان نہیں ہے جو رات دن جان مار کر بھی یہ سامان مہیا کرے۔ پھر بچانے کا سوال ہی کہاں رہا۔ بس ہماری نوکری ختم ہوئی۔ رئیس جانے یا کسان!"

ریاض "اگر تم ان حالات میں یہاں رہنا پسند کرو تو خیر، ورنہ تمہارے سپرد دوسرا کام کر دوں گا۔ تم اپنے تجربہ کی بنا پر کسانوں کو بہترین مشورے دو۔

کوئی جھگڑا اٹھے تو نپٹاؤ۔ کسی کا جانور بیمار ہو تو سلوتری کو دکھاؤ۔ بچوں کی تعلیم کی نگرانی کرو۔ غرض تم کسانوں کی تکلیفوں کے دور کرنے کا عہد باندھو تو تمہاری مقدور بھر خدمت کروں گا۔ تمہیں عمر بھر نظم و نسق کا تجربہ ہے۔ میں پانچ لاکھ روپیہ تمہارے سپرد کر دوں گا۔ اور پانچ برس تجربہ کر کے دیکھوں گا کہ تم نے ریاست میں کیا ترقی دکھائی ہے۔ تمہیں ہمت اور تدبیر سے کام کرنے کا موقع ہے۔ اس روپیہ کو کسانوں کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے لئے خرچ کرو۔ پانچ برس کی محنت سے اس پرگنہ کو ریاستوں کے لئے قابلِ رشک بنا دو۔"

ریاست کے دہقانوں نے جب رئیس کے ان پاکیزہ خیالات کو سُنا تو لٹو ہو گئے۔ ان کی اپنی ہمت میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان بازوؤں میں اور بل آ گیا ہے۔ مختاروں نے گاؤں اور اہلِ دیہہ کی ترقی کی راہیں سوچنا شروع کیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ ریاست میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

ریاض نے روپیہ مختاروں کے سپرد کر دیا اور کہا کہ میں بھی پانچ سال کے لئے مختلف مقامات کی سیر کو جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ میری واپسی پر تمہاری محنت اور تدبیر نے پرگنے کو رشکِ جنت بنا دیا ہو گا۔

نسیمہ کو اس انتظام اور ریاض کے جانے کی خبر ہوئی تو دل مسوس کر رہ گئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ رنگ متغیر ہوا۔ سوچا یہ تھا کہ وہ آئیں گے۔ آج نہیں تو کل ساتھ چلی جاؤں گی۔ ان کا کیا قصور، مجھ نصیبوں جلی نے کیا قیامت ڈھائی۔ وہ بیمار تھے اور منت پذیر تھے۔ میں نے کس دیدہ دلیری سے ان کو جواب دیا۔ اور وہ کس طرح اپنا سا منہ لے کر چلے گئے تو مجھے شکوہ کیا۔ مجھے بھی کہیں ڈوب مرنا چاہئے۔ اس غم میں نڈھال سی ہو کر پڑ رہی۔ نسیمہ کے والدین کو علم ہوا تو انہوں نے ڈھارس بندھائی کہ اس گھر میں کیا کمی ہے جو تمہیں کسی بات کا غم ہو۔ یہاں رزق دولت کی کمی ہو تو کوئی غم کھائے۔

نسیمہ کو باوجود ڈھارس بندھانے کے غم کھا رہا تھا۔ ایسے کم گو اور نیک طبیعت خاوند کے ساتھ کسی رذیل عورت نے بھی وہ غیر شریفانہ سلوک نہ کیا ہو گا جس سلوک کی میں مرتکب ہو چکی ہوں۔ مگر اب پچھتائے سے کیا ہوتا ہے۔

ریاض ریاست سے جا کر شہر میں آباد ہوا۔ وہ مزدور کی حیثیت سے بسر اوقات کرنے لگا۔ مزدور شہر کے جس متعفن حصہ میں رہتے تھے، وہی ریاض کا مسکن تھا۔ غریبوں کے گلی کوچے نسیمِ صبح اور سورج کی کرنوں کی مداخلت سے محروم تھے، اور مزدوروں کے بچے بچیاں دنیا کی آسائشوں اور خوشیوں سے ناآشنا تھیں۔ اس نے ایک دن ایک بوڑھی عورت کو گرمی میں سر پہ بوجھ اٹھائے دیکھا۔ عورت بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ اس نے عورت کا بوجھ سر پہ اٹھا لیا۔ منزلِ مقصود دور تھی۔ بوجھ اس کی برداشت سے بھی زیادہ تھا۔ ٹانگیں جھنگی پڑنے لگی۔ وہ ہانپتا جا رہا تھا۔ کپڑے پسینے سے شرابور ہو گئے تھے۔ وہ بوجھ سر سے گرا دینا چاہتا تھا۔ مگر خودی نے ہٹ نبا ہنے پر زور دیا۔ کچھ اور دور چل کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آنے لگا۔ زبان تالو سے لگ گئی۔ لب خشک ہو گئے۔ اس وقت کو ملامت کرنے لگا جس وقت رحم کے تقاضے سے اس نے بڑھیا کا بوجھ اپنے سر پہ اٹھایا تھا۔

بوڑھی عورت نے کہا "بس اب گھر آ گیا ہے۔" ریاض اس نویدِ جانفزا سے گویا تازہ ہو گیا۔ اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم سنبھل گئے۔ اور ایک اطمینان کی سانس لی، کہ اچھا ہوا خدا نے اس عورت کے سامنے ذلیل نہ کیا۔ ورنہ کہتی کہ اچھے جوان بچے ہو کہ مجھ بوڑھی کے برابر بھی بوجھ نہ اٹھایا گیا۔

وہ عورت ایک تاریک کوٹھڑی کی زنجیر کھول کر داخل ہوئی اور کہا "آ میرے بچے!" ریاض نے بوجھ سر سے گرا دیا۔ خود بھی کھڑے ہونے کی تاب نہ رہی۔ وہیں فرشِ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا بند بند دکھتا تھا۔ کائی جمے ہوئے کچے گھڑے سے مٹی کے آبخورے میں پانی پیا اور خدا کا شکر کیا۔ اسے مزدور کی زندگی کا احساس ہو گیا۔ عورت نے بتایا "بیٹا! تم نے میرے دو پیسے بچا دئے۔ کسی مزدور سے اٹھواتی تو دھنی دینا پڑتی۔ جیتے رہو۔"

آدھ آنے کے لئے مزدور کو یہ مصیبت کا پہاڑ اٹھانا پڑتا ہے۔ ریاض نے عالمِ تصور میں اپنی گزشتہ زندگی پر نفرین کی کہ کس بے دردی سے وہ روپیہ لٹاتا رہا۔ حالانکہ پائی پائی ملک کے مزدور کا حق تھا۔ ادھنی کے لئے ایک طرف انسان یہ مصیبت اٹھاتا ہے، دوسری طرف ایک

شخص روپے کو پانی کی طرح بہاتا ہے۔ لیکن ریاض نے دل میں کہا افلاس کا سمندر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ انسانیت اس میں غوطے کھا رہی ہے اس میں میں بے کس تنکا ہوں۔ میرے سہارے پر انسانیت ڈوبنے سے نہیں بچ سکتی۔

دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے غریب اور مزدور کی امداد کو ذریعۂ نجات قرار نہ دیا ہو۔ مذہب اور اہل مذہب موجود ہیں۔ لیکن غریب اور مزدور معیبت کے اتھاہ سمندر میں ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ اسی لئے تو شاید سوویٹ روس مذہب کے دعوئ غریب نوازی کا قائل نہیں۔ اور وہ غریب کو امیر کے خلاف صف آراء دیکھنا چاہتا ہے۔ امیر اور غریب میں اس اقتصادی بُعد کا لازمی نتیجہ جماعتی جنگ ہے۔ بیشتر مذاہب کا اخوت اور مساوات کا دعویٰ ہے۔ لیکن اس مذہب کے پیرو بھی اپنی صداقت کی مناسب مثال قائم نہ کر سکے۔

ریاض اپنے بے مثال ایثار سے مطمئن تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا۔ کہ میں بقیہ عمر امراء کی تربیت میں گزار دوں گا تاکہ وہ غرباء کی دستگیری میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھیں، اور اپنے اخراجات کو کم کر کے کسانوں اور مزدوروں کی ترقی اور فلاح کے لئے روپیہ صرف کریں۔ اس نے مسجد میں جا کر یہی وعظ کیا جو بہت موثر ثابت ہوا۔ ملک بھر میں گھوما۔ اُمراء کے پاس پہنچا۔ کون کہے کہ غریب کی مدد نہ ہونی چاہئے۔ وہ اپنی سعی سے بہت مطمئن تھا۔ اسے امید تھی کہ میں اپنی عمر میں ملک میں وہ نتائج پیدا کر سکوں گا جو چودہ سو سال قبل سرورِ عرب نے کئے جانے کا حکم دیا تھا، اور جس پر اب سوویٹ روس کا مختارِ مطلق لینن عمل کر رہا ہے۔

پانچ برس گزر گئے۔ ریاض نے مناسب سمجھا کہ وہ ریاست کی ترقی کا جائزہ لے۔ چنانچہ وہ ریاست میں اچانک واپس آگیا۔ پرگنے میں عجیب انقلاب تھا۔ کسانوں کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ ان کی صحت اور صفائی قابل دید تھی۔ آئے دن کی مالی پریشانیوں سے انہیں نجات مل چکی تھی۔ بچے مدرسے میں شوق سے جاتے تھے۔ انسان اور حیوان کے لئے ہسپتال تھے۔ صبح اور شام کے لئے سامانِ تفریح موجود تھا۔ ہر گاؤں میں ایک چھوٹا سا سینما گھر۔ بھاگ دوڑ کے لئے کھلا صاف میدان، نہانے دھونے کے لئے صاف ستھرے حوض۔ پرگنہ نمونۂ جنت بن گیا تھا۔ سب ریاض کے سر کو دعائیں دیتے تھے۔ ریاض نے یہ نقشہ دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ مختاروں کی ہمت کی داد دی اور کہا۔ "میں یہاں ٹھہر کر تمہارے کام میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا۔ میں تم سے بڑھ کر اور کیا کرتا۔"

ریاض اطمینان بخش انتظام سے خوش ہی نہ تھا بلکہ اس کو اپنا حیرت انگیز ایثار سمجھتا تھا۔ یکایک اس کے اطمینانِ قلب پر لڑکی کی اچانک بیماری اور آناً فاناً موت نے بجلی گرا دی۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر سسرال کے گھر گیا۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ ہر ایک ریاض کی لاپروائی کا شاکی تھا۔ بعض اسے ننگِ اسلاف کہتے تھے۔ جو اولاد اور جائداد سے لاپروا تھا۔ ریاض "ہر چہ مرضیِ مولا از ہمہ اولیٰ" کہہ کر خاموش تھا۔ لڑکی کے صدمہ نے گو طبیعت پر گہرا اثر کیا۔ تاہم اپنی زندگی کے کارنامہ پر اُسے فخر تھا۔ ریاست کے کسانوں میں خوشگوار انقلاب کے خیال نے اُسے پھر اطمینان کی دولت بخش دی اور بدستور زیردستوں کی امداد میں منہمک ہو گیا۔

ریاض نے سُنا "سکلات والا" مشہور سوشلسٹ ممبر پارلیمنٹ آیا ہے۔ جی چاہا کہ اسے اپنے پرگنہ کا ملاحظہ کرائے۔ اس نے جا کر ممبر موصوف کو مل کر ریاست کے حالات بتا کر اس امر پر آمادہ کر لیا کہ حالات کو بچشم خود دیکھے۔

مسٹر سکلات والا مزدوروں کے حال میں ایک رئیس کو دیکھ کر خوش ہو گیا اور کہا کہ ہندوستان میں سوشلسٹوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو آٹھ آنے کے کھدر کے کپڑوں میں بسر اوقات کرتا ہے۔ دو پیسے کی گاندھی ٹوپی، آگرے کے اُلٹے کھرل کی طرح سر پر رکھ کر پانچ ہزار کی موٹر میں چڑھا ہوتا ہے۔ وہ دس روپے کا روزانہ پٹرول جلاتا ہے۔ شاہانہ کوٹھیوں میں رہتا ہے۔ دوستوں کو ٹھاٹھ سے دعوتیں دیتا ہے۔ لیکن ملازموں کی تنخواہ دبا لیتا ہے۔ بہت سے نکمے کارکن اسے سچ مچ کا لینن سمجھ کر یا تہذیب مغربی کا حامل جان کر اس کے پیچھے لگے پھرتے ہیں۔ یہ ریاکار سرمایہ داروں کا نیا بہروپ ہے۔ میں ان بہروپیوں سے سخت متنفر ہوں۔ اُنہوں نے ظاہر میں تبدیلی کر لی ہے لیکن ان کا دل تبدیل نہیں ہوا۔ وہ اندر سے اب بھی سرمایہ دار ہیں۔ صرف لوگوں کی نگاہ میں معزز بننے کے لئے اُنہوں نے یہ روپ دھار لیا ہے۔"

"مسٹر ریاض!" سکلات والانے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تم سے خوش ہوں۔ تم سچے سوشلسٹ ہو۔ تم نے اپنے ملک کے ادنیٰ مزدور کی آمدنی کے مطابق اپنا خرچ گھٹا لیا ہے۔ تم ہی سچے مسلمان ہو۔ عرب کے اولوالعزم پیغمبرؐ نے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا۔ کیوں؟ کیا انہیں میسر نہ تھا؟ اگر تن آسانی اور شکم پروری مدِ نظر ہوتی تو شرب و بطحا کا رئیس اور مسلمانوں کے دل کا حکمران جو آرام چاہتا کرتا۔ لیکن سچا سردار فوج کا ادنیٰ سپاہی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو راحت پہنچانے کے لئے خود تکلیف اٹھاتا ہے۔ اس لئے مسٹر ریاض میں تمہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ تم نے سچے انقلاب کو قبول کر لیا ہے۔"

ریاض نے اپنی بیوی سے اَن بن کی داستان بھی کہہ سنائی کہ کس طرح ڈیوڑھی کے دربان کے لڑکے کے رشتے کے ذکر سے ناراض ہو کر وہ میکے چلی گئی۔ مسٹر سکلات والانے ریاض کو گلے لگا لیا اور کہا "خاندانی تعصب، نسل اور خون کا امتیاز بھی بنی نوع انسان کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ انسانیت کے لئے بدترین فتنہ ہے۔ سرمایہ اور کفو کا امتیاز یہی سامانِ غرور ہے۔ اور انسانیت تب ہی آسودہ ہوگی جب دونوں کا نشان دنیا سے اٹھ جائے گا۔ رسولِ عربیؐ نے اپنے غلام زید سے بہن کا نکاح کر کے آدھی دنیا میں نسلی تعصبات کا خاتمہ کر دیا۔ پھر زیدؓ کو سردارانِ قریش کی سرداری دے کر دشمن کے مقابلہ میں بھیجا تاکہ اخوت و مساوات کا اصول زبانوں پر نہ رہے دل میں بھی سما جائے۔ عرب کے بعض لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ عالی ظرف زیدؓ کی شہادت کے بعد اس کے بیٹے اسامہؓ کو دنیا کو تسخیر کرنے والے سرداروں کا سردار اسی لئے بنایا گیا تاکہ نسلی تعصب کا ذلیل جذبہ اگر کسی کے دل میں موجود ہے تو وہ بھی کچلا جائے۔"

سکلات والانے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "ریاض! مجھے اسلامی تاریخ کا وہ واقعہ، پہلی خلافت کا وہ زریں زمانہ رہ رہ کر یاد آتا ہے جب غلام زیدؓ کا بیٹا ۱۸ سالہ معصوم اور ناتجربہ کار، دنیا کو فتح کرنے والے جرنیلوں کا سردار بنا کر بھیجا گیا۔ اور خود خلیفۂ اول نوجوان اسامہؓ کی رکاب تھامے شہر سے نکلا۔ علیؓ خالدؓ اور وقاصؓ جیسے جرنیل اسامہؓ کے احترام میں گردنیں جھکائے ساتھ ہو لئے۔

اسامہؓ نے خلافت پناہ کو کہا کہ یا مجھے پیدل چلنے دیجئے یا آپ بھی سوار ہو جائیے۔ یاد ہے باعظمت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا کہا۔ کہا تو یہ کہ "میرے آقا کے نامزد کئے ہوئے سردار! میں تیری برابری کیسے کر سکتا ہوں۔ نہ میں سوار ہو سکتا ہوں نہ تو پیدل ہو سکتا ہے۔ اس کے حکم سے تُو اور میں دونوں مجبور ہیں۔"

ریاض! مجھے تو اس واقعہ کی یاد تڑپا دیتی ہے۔ جب تم نے اپنی بیوی کو یہ مشورہ دیا۔ اس وقت تیرے اندر سچے مسلمان کی روح موجود تھی۔"

ریاض ــــــ مسٹر سکلات والا کی حوصلہ افزائی سے مسرور تھا۔ آنکھوں میں بٹھا کر اُسے پرگنہ میں لے گیا۔ حالات کو دیکھ کر سکلات والا کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ ریاض کو داد دیتے دیتے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ ریاض بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ یک بہ یک سکلات والانے دریافت کیا کہ "آپ نے اراضیات کا حقِ مالکانہ کسانوں کو دے دیا ہے؟" ریاض نے جواب دیا کہ "نہیں۔"

سکلات والانے ریاض کی طرف دیکھا اور بے تکلف ہو کر کہا کہ "تمہاری روح میں بدترین شیطان گھسا بیٹھا ہے۔ نفس تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ اور تم دنیا کو دھوکا دے رہے ہو۔ بہت سے ریاکار اپنی شہرت کے لئے دنیا کی بدترین سختیاں جھیلتے ہیں مگر ان کی ریاضت نیکی نہیں۔ تمہاری یہ غریب نوازی ایک دن کسانوں کے لئے بدترین لعنت ثابت ہوگی۔ جب تم مر جاؤ گے، تمہارا وارث ان کسانوں کی ساری خوشیاں بدستور اپنی ذات پر قربان کرے گا، اور یہ لوگ پہلے سے زیادہ بدحال ہو جائیں گے۔ تمہارا عارضی کرم ان پر مستقل ظلم بن جائے گا۔ کیا تم مالکانہ حقوق سے دست بردار ہو کر اس جائیداد کو وقف نہیں کر سکتے تاکہ کسانوں کو بلا وجہ بے دخل نہ کیا جا سکے؟"

ریاض نے کچھ دیر سوچا۔ اس کا رنگ زرد ہونا شروع ہو گیا۔ سکلات والانے سمجھ لیا کہ وہ زمین کی وراثت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

سکلات والانے کہا "ریاض! تم اپنی بیوی کو گھر لاؤ جو نہ نسلی مفاد ترک کرنے پر آمادہ ہے، نہ اقتصادی حقوق سے دست بردار ہونا چاہتی ہے۔ معاف کرنا۔ تم اور تمہاری بیوی میں ایک ہی روح جاری و ساری ہے۔ میرا لہجہ کرخت ضرور ہے مگر میرا دل و دماغ بہت صاف ہے۔ تم اور تمہاری بیوی دونوں مفادِ عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تمہاری بیوی زیادہ نیک ہے۔ کیونکہ اس نے تمہاری طرح ریاکاری کا جامہ نہیں پہنا۔ لو مسٹر ریاض رخصت! بھلائی اور دنیا ئے دوں دونوں کی طلب نہ کرو۔"

سکلات والا یہ کہہ کر بلا ہاتھ ملائے چلا گیا۔ ریاض دم بخود رہ گیا۔ اس کا دماغ سکلات والا کے کلام کی صحت کو قبول کرتا تھا۔ مگر دل اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ دماغ اور دل کے عدمِ تعاون سے طبیعت عجب کشمکش میں مبتلا ہوگئی۔ رات دن کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش اور ناکامی سے اسے کم خوابی کا دورہ شروع ہوگیا۔ دل کڑا کر کے آنکھیں بند کرتا تھا۔ سکلات والا کے الفاظ کانوں میں گونجتے تھے کہ "تم اور تمہاری بیوی دونوں مفادِ عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ وہ نیکی کا عزم کر کے سونا چاہتا تھا۔ تو دل پکار اٹھتا تھا کہ عارضی طور سے حکومت سے دست بردار ہونا اور حقیقی طاقت کا مالک رہنا شہرت کو چار چاند لگاتا ہے۔ لیکن ریاست کے حقوق مستقل طور پر ضائع کر کے عام آدمیوں میں شمار ہونا ناقابلِ قبول امر ہے۔ دماغ خیالات کے تصادم سے پراگندہ اور دل مضمحل تھا۔ ہر وقت وہ اپنے دل سے باتیں کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی وہ کہتا کہ میں مفادِ عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنے کو حرام سمجھتا ہوں۔ پھر پکار اٹھتا کہ نہیں میں امتیازی زندگی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں کس طرح حقوقِ ریاست سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤں۔ علاوہ ازیں لڑکی کی موت کا صدمہ بھی دل سے نہ گیا تھا۔ دل اور دماغ کی اس کیفیت نے وہم کی صورت اختیار کی۔ خیالات کے ایک مرکز پر نہ رہنے سے وہ رات دن پریشان اور حیران رہنے لگا۔ کم خوابی بے خوابی میں بدل گئی۔ پریشانی اور حیرانی نے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں کر دئے۔ بڑا عزم لے کر اٹھنا اور پھر قوتِ فیصلہ کو جواب دے دینا ناقابلِ برداشت اذیت ہے۔ بالآخر وہم نے بڑھ کر دیوانگی تک نوبت پہنچا دی۔ ہم عصر رئیس اسی تاک میں تھے۔ انہوں نے سرکار دربار تک نوبت پہنچائی کہ ریاض کا انتظامِ ریاست دیوانگی پر مبنی ہے۔ اسی سے سب رئیسوں کا انتظامِ ریاست بگڑتا ہے۔ رعایا دلیر ہوگئی ہے۔ غریب امراء کے منہ آنے لگے ہیں۔ اس شکایتی ٹولہ میں اس کا خسر پیش پیش تھا۔ حکامِ بالادست کو بھی ریاض کی غریب نوازی کی ادا ناپسند تھی۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض کی ریاست کا انتظام براہِ راست حکومت کی نگرانی میں آگیا۔ اور ایک افسر ریاست کے انتظام کے لئے مقرر ہوا۔

سرکار کے مقرر کردہ افسر نے آکر دیکھا کہ خزانہ خالی ہے۔ سب مختاروں کو بلا کر لتاڑا کہ تم نے رئیس اور ریاست دونوں کو برباد کر دیا۔ غضب خدا کا ایسی زرخیز ریاست اور خزانہ خالی۔ کسانوں کے گھروں میں مُن برستا ہے اور رئیس کے ایوان میں خاک اڑتی ہے۔ سابقہ بقائے اور قرضے وصول کرو اور آیندہ حسبِ سابق ریاست کا حصہ کسانوں سے حاصل کر کے داخل کرو"

جب کسانوں نے اس حکم کو سنا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک تو کھایا ہوا اُگلنا پڑا۔ علاوہ ازیں افلاس بھیانک صورت میں سامنے آگیا۔ غریبوں کے دلوں سے ہوک اٹھی۔ کچھ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" کے مصداق آہ بھر کر بیٹھ گئے۔ کچھ ناقابلِ برداشت حالات کے پیشِ نظر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ پشت پر طاقت ہو تو مخالفت کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ بے زور کسان کا اللہ والی تھا۔ جس نے سر اٹھایا، پولیس کا نادرشاہی ڈنڈا سر پر پڑا۔ محکوم در محکوم کسان میں قوتِ برداشت باقی نہ رہی۔ بعض پُرجوش لوگ ریاست سے ہجرت کر گئے۔ باقی مثلِ سابق خونِ جگر پی کر کھیتوں میں کام کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ دنیا جو اُن کے لئے بہشت بن گئی تھی۔ اب وہ دوزخ میں تبدیل ہوگئی۔ ریاست کے خزانہ میں پندرہ لاکھ روپیہ وصول ہو کر داخل ہوا۔ کسان کے بیوی بچے پھر چیتھڑوں میں دکھائی دینے لگے۔ البتہ سرکار کا مقرر کردہ ایک کامیاب منتظم سمجھا جانے لگا۔ جس کا عہدہ اور تنخواہ بڑھا دی گئی۔ کسانوں کی ساری خوشحالی سمٹ کر دیوانے رئیس کے خزانہ میں آگئی۔

ریاض کا معالجہ برابر جاری تھا۔ طبیعت تین سال کے بعد آہستہ آہستہ بحال ہونا شروع ہوگئی۔ دو سال تک علاج اور جاری رہا۔ خدا نے شفائے کلی دی۔ ریاض نے صحت یاب ہو کر پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کے پاس جا کر معذرت طلب کی اور کہا "نیکی، اخوت اور مساوات کا وہم بھی اب دور ہوگیا ہے۔ گھر چلو تاکہ آرام چین کی زندگی بسر کریں۔" نسیمہ جسے ریاض سے سچی محبت تو تھی مگر اس کی اخوت اور مساوات کی نئی اُپج سے نفرت تھی باغ باغ ہوگئی۔

نسیمہ نے کہا "نیکی کرو مگر نہ اتنی کہ اپنے خاندانی مفاد پر ضرب لگے۔ امیر و غریب خدا نے بنائے ہیں۔ اگر وہ چاہتا سب کو برابر بناتا۔"

ریاض نے ہنس کر کہا "وعظ نہ کہو بیوی! نہ میں اتنی نیکی کروں گا نہ اتنی۔ میرا تو سرے سے اعتقاد ہی بدل گیا ہے۔ رؤسا کو نیکی راس نہیں آسکتی۔ خصوصاً غریب کا درد دل میں رکھ کر خدا سے اپنی عافیت چاہنا وہم ہے۔ نیکی کے عزم کے ساتھ ابتلا اور امتحان کا سلسلہ شروع ہونا لازمی ہے۔ اُمراء اور رؤسا کا اس میں پُورا اترنا ممکن نہیں۔

"پیاری نسیمہ! اگر کوئی امیر اور رئیس نیکی کا عزم کرے۔ پہلے تو اس کی بیوی ناراض ہو کر میکے چلی جاتی ہے۔ پھر اولاد سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی بیوی بچوں کا صدمہ برداشت بھی کرلے تو بھی ایثار کی وہ صورت اختیار نہیں کر سکتا جو نیکی کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے میں نے نیکی کے خیال سے توبہ کرلی ہے۔ یہ سرد دہی بھی غربا کو بھلی لگتی ہے۔ آؤ ہم تم چین سے بسر کریں اور مسیح کے اس قول کو بھول جائیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ میں سے گزرنا ممکن ہے لیکن اُمراء کا بہشت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے نسیمہ کیوں نہ جہنم کے وہم کو چھوڑ کر اسی دنیا میں جنت کے مزے لُوٹیں:"

ریاض نے پختہ کار سرمایہ دار کی طرح بسر اوقات شروع کر دی۔ اب ریاض اور نسیمہ کی زندگی ان دل کش نغموں کی طرح آسودہ تھی۔ جو صبح بہار کی خوشبو سے بسی ہوئی ہواؤں میں پھیلے ہوئے ہوں۔ ریاست کے کسانوں کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سامان عیش و راحت میں صرف ہوتی تھی۔ ساز و سرود اور سنہرے ساغروں نے محل کی ساری فضا کو رنگین کر دیا تھا۔ لیکن مسرت ناآشنا کسان اور ان کے بچے افلاس کی دردناک مصیبت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ ریاض نے ان کی چیخوں کو نہ سننے کے لئے عیش و نشاط کی روئی کان میں دے رکھی تھی۔ اور ان کا حال نہ دیکھنے کے لئے غفلت کی پٹی آنکھوں پر باندھ لی تھی۔

فلک پیما

ریاکار

ریاکار کو موٹے موٹے دل، جگر، جلا دینے والے لفظوں میں برا بھلا کہہ دینا آسان ہے۔ ظہیر فاریابی نے لکھا ہے کہ جس زاہد سے ریا کی بو آئے اسے اس کے بوریے کا کفن پہنا کر آگ میں ڈال دو۔

آج کل پاکیزہ زندگی کے زبانی شیدائی پاکستان میں بکثرت ہیں اس لئے ہر محفل میں ریاکار کی مٹی پلید ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مسجدوں کی رونق ریاکاروں کے طفیل سے ہے اسی طرح مجلسوں میں ریاکار کے ذکرِ خیر سے چہل پہل رہتی ہے۔ ریاکار کے اس احسان کا اعتراف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

بزرگانِ دین انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں سے آگاہ تھے۔ ریا کے معاملے میں اولیاؤں نے ہمیشہ قابلِ تعریف تحمل اور فراخدلی کو مدِنظر رکھا ہے۔

ایک صوفی نے تو انتہا کر دی۔ لکھا ہے کہ اللہ میاں نے ایک بزرگ سے کہا کہ اگر تمہارا پردہ فاش کر دیا جائے تو تم بتاؤ کہ تمہارا دنیا میں کیا حال ہو؟ اس بزرگ نے بلا تامل جواب دیا کہ اللہ میاں اگر تمہاری بخشش و عفوِ گناہ کا صحیح حال ظاہر کر دوں تو آپ فرمایئے پھر عبادت کون کرے گا؟ اس پر بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ ہم بھی خاموش رہیں گے تم بھی خاموش رہو۔

یہ اس لئے گوش گذارش ہے کہ پاکیزگی کے مدعی خلوص کی حمایت میں شور مچانا چاہے مچالیں مگر یہ شور بھی اشتہاری ہے اور ریا سے خالی نہیں۔

ریاکار کے متعلق یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ ریاکار کے سجدے سے زمین چلا اٹھتی ہے کہ مجھے خراب کر دیا۔ یہ بھی سب کو علم ہے کہ حافظ شیرازی میٹھے میٹھے لفظوں میں ہدایت کر گئے کہ شراب پیو، رندی کرو مگر ریاکار کی طرح قرآن کو دامِ تزویر نہ بناؤ۔ ملا عرفانی اور حافظ شیرازی کا مطلب یہ تھا کہ دکھلاوے کی عبادت کی مذمت کریں مگر صوفیائے کرام ہمیشہ یہی تلقین فرماتے رہے کہ چشم پوشی اختیار کرو عیب جوئی کے کنوئیں میں مت گرو۔ مگر دنیا ہے کہ عیب جوئی سے باز نہیں آتی اور ریاکار ہے کہ دکھلاوے کے سجدوں سے نہیں چوکتا۔ صرف سجدے نہیں بلکہ جبّہ و عمامہ کی ترتیب سے اپنے آپ کو پارسائی کا سالارِ اعظم ظاہر کرتا ہے۔ اس ریج دھج کے شوق کی وجہ یہ ہے کہ زاہد ریاکار کو علم ہے کہ عوام ظاہر پرست ہیں یہ جانتے ہوئے کہ اصلی عبادت صرف خدمتِ خلق ہے۔ وہ مخلوقِ خدا سے اپنی خدمت کروانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی ذاتی منفعت کے لئے وقف ہے۔

ریاکار یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے گرد رہنے والے مر کر تو اس کے کام ہرگز نہ آئیں گے اسی زندگی میں پارسائی کا جال پھیلا کر اپنا اُلو سیدھا کرتا

کرتا ہے۔ اس زندگی میں عزت، آرام آسائش کا خواہاں ہے اور اس کا ہر فعل اس امر کا گواہ ہے کہ

عاقبت کی خبر خدا جانے   اب تو آرام سے گذرتی ہے

کیا یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ دھوکا کھاتے ہیں تو قصور لوگوں کا ہے؟ کیوں؟ اُن میں اتنی عقل نہیں، اتنی تمیز نہیں کہ نمود کی نمازوں، رسمی عبادتوں سے متاثر ہو کر ریاکار کو پیش پیش نہ ہونے دیں۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ ریاکار بھولے پن سے ریاکاری کرتا ہے تو یہ خیال غلط ہے۔

شروع شروع میں ریاکار دانستہ ریاکاری کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ خود احمق نہیں ہوتا لوگوں کو احمق بناتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جوں جوں ریاکاری کامیاب ہوتی ہے یہ خصلت عادت بن جاتی ہے۔ اور گو عوام بھانپ جائیں ریاکار اپنی چالوں سے باز نہیں آتا۔ اور کیوں باز آئے؟ نفع کا سودا اور وہ بھی عبادت کے روپ میں۔ چپڑی اور دو دو۔ ریاکار اتنا زیاں کار نہیں کہ آرام، عزت، دولت کو ٹھکرا دے۔

ایک ریاکار حضرت کسی موقع پر بے تکلّف صاف گو دوستوں کے قابو چڑھ گئے۔ دوستوں نے صلواتیں سنائیں۔ ریا کی کمائی میں سے حصّہ بخرا طلب کیا۔ پتے کی باتیں کہیں۔ افغانستان سے جو رقم آئی اس کا ذکر چھیڑا۔ ریاستوں سے امداد کی تفصیل اور وجہ پوچھی۔ ریاکار صاحب کب دبنے والے تھے۔ جواب میں فرمانے لگے تم بے وقوف سب حاسد ہو مجھے مولا کریم اپنے خزانۂ غیب سے وظیفہ عطا کرتا ہے۔ میرا روزانہ ورد ہے ؎

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب   گبر و ترسا وظیفہ خور داری
دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ با دشمناں نظر داری

یہ ورد کرتا ہوں۔ دعا کی برکت سے دعوت نامے آتے ہیں، دولت آتی ہے، عزت میں ترقی ہوتی ہے۔ تم یونہی جلتے ہو۔ میری طرح ورد کرو، تعریفی خط لکھو، مناسب موقع پر بڑے آدمیوں کی کامیابی کی دعا بعد نمازِ جمعہ ہزاروں آدمیوں سے کرواؤ اور اس دعا کرانے سے پہلے اور بعد میں اپنے ممدوح کو باخبر رکھو۔ دیکھو پھر کس طرح شہرت اور دولت کی بارش ہوتی ہے۔ ریاکار حضرت اپنے فن کی کچھ اور باریکیاں بیان کرنے کو تھے کہ ایک منہ پھٹ بولا "اے ابلہ فریب! لوگوں کو دھوکا دے کر موٹا ہو جائے گا تو خدا کو کیا جواب دے گا؟"

اس پر ریاکار حضرت بہت بگڑے۔ جوش میں آ کر کہنے لگے کہ "تم سب کے سب ملحد ہو۔ نامسلمان ہو۔ تمھارا خدا پر ایمان نہیں ہے۔ کیا تمھاری یہ مرضی ہے کہ میں اُس جلّ شانہٗ کے ایک فرشتے کو معطّل کر دوں۔ کارسازِ حقیقی نے میرے دونوں کندھوں پر ایک ایک فرشتہ معیّن کر رکھا ہے۔ دائیں کندھے والا نیکیاں لکھتا ہے۔ بائیں کندھے والا میری لغو حرکتوں کا محرر ہے۔ اگر میں لغو حرکتیں، ابلہ فریبی اور نمائشی عبادت نہ کروں تو بائیں کندھے والا فرشتہ بے کار ہو جائے۔ تم میرے عیب دیکھتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ کماتا ہوں اس سے دس غریب کنبے پالتا ہوں۔ تم تو بتاؤ کہ تمھارے ہاں کتنے غریب نوکر ہیں؟ تم جیسے مسلمانوں نے زکوٰۃ جیسے فریضے کو متروک کر رکھا ہے۔ میں محنت سے زکوٰۃ اور صدقۂ عید الفطر جمع کرتا ہوں، جو جمع کرتا ہوں اس میں سے آدھی رقم یتیم خانوں میں بھجواتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ یتیم خانے کے انتظام میں اپنے آدمی رکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ تم نے عملی کام کیا کیا؟ نہ کسی یتیم خانے میں تم مدد دو، نہ کسی دینی کتاب کے چھپوانے اور فروخت میں دلچسپی لو، تم مجھ سے کہیں زیادہ ملعون ہو۔ میں تو صرف ریاکار ہوں۔ تم بے کار ہو اور بے کار، ریاکار سے کہیں بدتر ہے!"

اب آپ ایک اور منکسر مزاج ریاکار کی داستان سنیئے! یہ حضرت اپنے آپ کو عاجز، گنہگار، کمترین خلائق بیان کرنے میں بڑے حاتم تھے۔ بات پیچھے ہوتی تھی اور یہ پہلے فرما دیتے تھے کہ مجھ نالائق سے کیا ہوگا۔ جب ان کی بہت خوشامد کی جاتی تو فرماتے اچھا آپ کا ارشاد ہے تو بسر و چشم حاضر ہوں۔ چنانچہ یہ جملے دہراتے ہوئے وہ بصد شوق ہر ایسے کام میں شامل ہو جاتے جس میں چندے کی ضرورت ہو۔ ہوتے ہوتے کچھ مقبول ہو گئے مگر انکسار پہلے سے دُگنا تگنا۔ عام چرچا ہوا کہ یہ شخص اپنے کام میں محنت کرتا ہے۔ قومی کاموں میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ نہایت ہمدرد مفید انسان

ہے۔ اُن حضرت کے جو دو ایک راز دان تھے انھوں نے ایک دن ذرا سخت گوشمالی کی اور کہہ دیا کہ اب تو اس فریب سے توبہ کرو۔ فرمانے لگے کہ مجھے تم ریاکار کہتے ہو۔ مجھ سا بد کار دُنیا میں کوئی نہیں مگر تم لوگ بے سمجھ ہو۔ یہ دُنیا میں نے نہیں بنائی۔ اس کے طریقے میرے ایجاد کردہ نہیں۔ مجھے صرف یہ علم ہے۔ اور صحیح علم ہے جیسا کہ حضرت امیر خسروؒ فرما گئے کہ :-

"عشق، افلاس اور مسلمانی کافری سے سو درجہ بدتر ہیں۔ اس کافری سے ڈرتا ہوا افلاس سے بچنا چاہتا تھا۔ سو خدائے بزرگ کی بخشش سے افلاس دور ہوا، عشق حاصل ہوا۔ ایک مسکین خاتون کی دلجوئی کرتا ہوں۔ اب جو تمھارا جی چاہے کہو اور کرو۔ مجھ عاجز کا خدا والی ہے!"

زہد فروشی کی ان دو مثالوں سے سُننے والوں کو ریاکار کا نقطۂ نگاہ واضح ہو گیا ہو گا۔ مگر جو اصحاب اپنے خصوصی حلقوں میں اقبال کرتے ہیں کہ وہ ریا کی کمائی کھاتے ہیں وہ دو باتوں کا جواب چاہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ کونسا خدائی فوجدار ہے جسے علم ہے کہ ہمارے سب سجدے، سب نمازیں، سب دعائیں ہمیشہ محض ریا ہیں؟ کیا ہم بھولے سے بعض دفعہ خلوص کے سجدے نہیں کرتے۔ وہ کون ہے جس کی ہر نماز میں حضورِ قلب کا نور ہے؟ ایک خلوص کا سجدہ، ایک سچے دل کی توبہ ہفت سالہ گناہوں کو دُور کرنے پر قادر ہے۔ سوائے ذاتِ باری کے کسے معلوم ہے کہ ہم مردود ہیں۔ ہم بُرے سہی مگر ہر ایک کو تو علم نہیں کہ ہم ہر وقت ریاکار ہیں۔ بہت لوگ ہیں جو ہماری مثال سے نیک تو ہو جاتے ہیں ریاکار نہیں بن سکتے! کیا اس مثال کا قائم کرنا قابلِ قدر نہیں؟ زاہد ریاکار کو اسفل السافلین شوق سے کہیئے مگر ریاکار اور دنیا دار میں فرق کیا ہے؟ صرف یہی کہ دنیا دار دکانوں، بنکوں، کارخانوں کے ذریعے سے لوٹتا ہے اور ہم زُہد کو ذریعۂ تجارت بناتے ہیں۔ ان کا راس المال روپیہ ہے ہمارا راس المال عبادت۔ ہر دُنیا دار کامیاب نہیں ہوتا، ہر ریاکار کی دکان بھی نہیں چلتی۔ ہم میں اور ان میں فرق کیوں کیا جاتا ہے؟ روپیہ کی سیڑھی کو عبادت کے زینہ پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ کیوں لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ریاکاری معاشی پیداوار ہے؟ شخصی تخلیق نہیں۔ اگر ریاکار مردود ہے تو وہ جماعت جس کے وہ جزو ہیں مردود تر ہے۔

ریاکار کا دوسرا سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ پوچھتا ہے۔ ایمان سے کہو

"کون ہے جو ریاکار نہیں؟

غیب کا علم تو خدا کو ہے مگر جہاں تک دیکھنے میں آیا ہے شہروں میں ایک سے ایک بڑھ کر ریاکار ہے!

چراغ حسن حسرت

ستی جس کا چہرہ چاند کا سا تھا۔ شوجی[1] کی استری اور دکش جی[2] کی بیٹی تھی وہ اپنے پتی کے ساتھ کیلاش[3] پربت پر رہتی تھی۔ جہاں سورج کی کرنیں دیودار کے پیڑوں تلے جھولا جھولتی ہیں اور سپید بادل ننھے بچوں کی طرح کھیلتے پھرتے ہیں۔ پر یہ دکھ اُسے گھلائے ڈالتا تھا کہ اُس کے پتا دکش جی رات دن شیو جی کی نندا کرتے رہتے تھے۔ کبھی اُنھیں بھکاری اور کنگال کہتے۔ کبھی بیٹی کو بھکارن کہہ کے اُس بچاری کا جی دکھاتے۔ ایک دن انھوں نے ستی کو ایسے ایسے طعنے دیئے کہ اُس جانہار نے آگ میں کود کے جان دے دی۔

ستی اپنے جی سے گئی۔ پر اُس کی یاد شوجی کے جی سے نہ جا سکی۔ اُنھیں آٹھوں پہر اُسی کا دھیان لگا رہتا۔ اور جدھر نظر اُٹھتی ستی کی سندر مورت کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

ہاتھ کی اُمٹ لکیروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور ہو کے رہتا ہے ستی کے نصیبے میں یہی لکھا تھا کہ وہ پربتوں کے راجہ ہماچل کے ہاں جنم لے کے پھر شوجی کی استری بنے اور کیلاش کی اندھیری گپھاؤں میں اُجالا کرے۔ اور یہ بات پوری ہو کے رہی۔

اس جنم میں اُس کا نام اُما تھا۔ اور لوگ اُسے پاربتی یعنی پربت کی بیٹی بھی کہتے تھے۔ اُس کا چمپئی بدن ہماچل کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں

---

[1] شوجی ہندوؤں کے تین بڑے دیوتاؤں میں ایک ہیں۔ ویدوں میں ان کا نام رودر ہے۔ اُپنشدوں اور پرانوں میں انھیں شو شنکر، مہیشور اور مہادیو کہا گیا ہے۔ عام طور پر انھیں فنا اور ہلاکت کی قوت سمجھا جاتا ہے۔ پر ہندو فلسفیوں کے نزدیک شوجی کی ذات زندگی اور موت حیات اور فنا دونوں کا سرچشمہ ہے پرانوں میں اُن کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کے پانچ چہرے اور چار بازو اور تین آنکھیں ہیں اور تیسری آنکھ ماتھے کے درمیان ہے۔

[2] دکش جی جو برہما کے بیٹے ہیں دیوتاؤں میں بڑے اونچے سمجھے جاتے ہیں مہابھارت میں لکھا ہے کہ برہما کے داہنے انگوٹھے سے پیدا ہوئے اور ان کی استری نے بائیں انگوٹھے سے جنم لیا۔ دکش جی کی تیرہ بیٹیاں کیشپ رشی کو بیاہی گئی تھیں۔ بہت سے دیوتا۔ انسان اور حیوان اُنھیں سے پیدا ہوئے۔

[3] کیلاش جو شیو جی کا استھان ہے۔ ہمالیہ کے اُس حصّے کا نام ہے جو مان سرور سے اُتّر کی طرف ہے۔

کی طرح چمکتا تھا۔ جن پر پیلی پیلی دھوپ اپنا سنہری رنگ پھیر دیتی ہے۔ اُس کی کمر انگور کی بیل کی طرح پتلی اور لچکیلی تھی اور آنکھیں مان سرور[1] سی نیلی اور گہری۔ جب وہ کیلاش کی برف بھری چوٹیوں پر نظر ڈالتی۔ تو اُس کے ہونٹوں سے جو شہدانہ کی طرح لال تھے۔ ایک سرد آہ نکل جاتی۔ اس وقت اُس کی آنکھیں لمبی اور گھنی پلکوں کی چھاؤں میں اس طرح بے چین معلوم ہوتیں جیسے مان سرور کا پانی گھنے پیڑوں کے سائے تلے تیز ہوا میں جھکولے کھا رہا ہو۔

وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت کی گود میں کھیل کے پلی تھی۔ پیڑوں سے ڈھکی ہوئی گھاٹی۔ پہاڑ کا ڈھلوان، گہرا کھڈ اور اونچی گگہ اُس کیلئے گھر آنگن تھے۔ اور سارس اور تیز بگلے اور مرغابیاں پتھریلی چٹانوں میں گھونسلا بنانے والے باز اور سہمی ہوئی آنکھوں والی ہرنیاں اُس کے بچپن کے ساتھی۔ گرمیوں کی رُت میں جب برف پگھلتی۔ خوبانی کی کلیاں کھلتیں اور اُجلی اُجلی پن چادریں سپید سپید پتھروں پر سر ٹپکنے لگتیں۔ تو وہ اونچے سروں میں شوجی کی مہما کے گیت گاتی اور لہراتی ہوئی ندیاں، گنگناتے ہوئے چشمے سنگت کرتے۔ کبھی اُسے کوئی ہرن کسی پیڑ تلے چوکڑیاں بھرتا نظر آ جاتا۔ تو وہ اُس کے پیچھے دوڑ پڑتی۔ راستے میں اُسے کوئی چشمہ مل جاتا۔ تو وہ ہرن کو بھول کے اُس میں اپنا روپ دیکھنے لگتی۔ پھر وہ ایکا ایکی مسکرا اٹھتی۔ اور اُس کی مسکراہٹ پھولوں کی مسکراہٹ میں یوں گھل مل جاتی، کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

پھر جب تیز اور سرد ہوا سوکھے پتوں میں سے سرسراتی ہوئی گزرتی اور اس کا ایک جھونکا اُما کے گالوں کو تھپ تھپاتا۔ اُس کے بالوں کو کندھے پر بکھیر دیتا۔ تو وہ جان لیتی کہ جاڑا آ گیا۔ پر وہ برف اور آندھی کہر اور دھند سے ڈرتی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت[2] کی بیٹی کو کون ڈرا سکتا ہے۔ وہ چاہتی۔ تو اپنی گرم گرم سانس سے برف کو پگھلا دیتی۔ بادلوں کو ہوا میں یوں اچھال دیتی کہ اُن کا کوئی اتا پتہ نہ ملتا۔ اور جاڑے کی تیز ہوا تو اُسے اپنی سانس کی طرح جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ کیلاش کی چوٹیوں کو چھو کے آتی تھی۔

کھلی ہوا اور پیلی دھوپ میں نیلے آسمان کے سائے تلے اُس کے جوبن کی جوت یونہی بڑھتی گئی۔ پر جوں جوں اُس کا روپ نکھرتا جاتا تھا۔ اُس کے دل میں چاہت کی آگ زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ اب اُس میں اگلی سی اچپلاہٹ نام کو نہ رہی تھی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی اور اداس نظر آتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو اُسے ایسی چپ لگ جاتی کہ جنگل کے پکھیرو جنھوں نے اُسے مسکراتے، قہقہے لگاتے اور سورج کی کرن کی طرح سرد اور اندھیری گپھاؤں کو جگمگاتے دیکھا تھا۔ حیران ہو ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے "پربت کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے"؟

اُس کے جی کو شیو بھگوان سے کچھ ایسی چیٹک الگادی تھی کہ وہ رات دن اُنہی کے نام کی سمرن کرتی رہتی۔ وہ لمبے لمبے برت رکھتی۔ پیاس کے دُکھ سہتی۔ بھگوان کے سامنے بیل کے پتوں۔ جنگلی بیروں اور آنسوؤں کی لڑیوں کے چڑھاوے چڑھاتی۔ پر شوجی کے من میں تو ستی بسی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اُما کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا وہ کبھی کبھی اُس کے پاؤں کی چاپ سے اتنا جان لیتے تھے کہ ہماچل کی بیٹی پوجا کرنے آئی ہے۔ پر انھیں یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ پربتوں کے راجہ کی بیٹی کیسی ہے؟

یہ دیکھ کر دیوتا سناٹے میں آ گئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیئے کہ مہا دیو ستی کو بھول کے اُما کو

---

[1] ۔ ہمالیہ کی ایک مشہور جھیل جس کا ذکر سنسکرت کی کتابوں میں بکثرت آیا ہے۔ اس جھیل سے کوئی دریا نہیں نکلتا۔ ہاں دریائے ستلج کا منبع مانسرور کے قریب ہے۔

[2] پاربتی یا پربت کی بیٹی کوئی فانی انسان نہیں۔ بلکہ شوجی کی شکتی ہے۔ اُس کے دو روپ ہیں۔ اپنے پہلے روپ میں وہ گوری ستی۔ اُما۔ پاربتی اور ہماوتی ہے اور دوسرے روپ میں کالی درگا اور چنڈکا۔ پہلے روپ میں وہ حُسن کی مورت ہے اور دوسرے میں تباہی کی دیوی۔ اسے مہادیوی۔ مہامایا۔ بھیروی اور بھوانی بھی کہتے ہیں۔

چاہنے لگیں۔ کیونکہ برہما[1] جی کہہ چکے ہیں کہ جب شو جی پاربتی سے بیاہ کریں گے اُن کے ہاں ایک لڑکا[2] پیدا ہوگا جو سنسار کو راکششوں[3] کے ظلم سے چھڑائے گا۔ اس لئے جب تک اُما سے مہادیو کا بیاہ نہیں ہوتا، دھرتی پر یونہی پاپ کا اندھیرا چھایا رہے گا۔

آخر دیوتاؤں کے راجہ اندر[4] نے لکشمی[5] کے بیٹے مدن کو بلا بھیجا جو پریم کا دیوتا ہے۔ اور جس کے زہریلے بانوں سے انسان تو انسان دیوتا بھی نہیں بچ سکتے۔ اور کہنے لگے ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ مہادیو کسی ڈھب اُما کو چاہنے لگیں۔ اگر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکے تو تمھارے بان جو پریم کے بِس میں بجھے ہوئے ہیں اور کس کام آئیں گے۔

شو کا نام سن کے مدن کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور اُس کی استری رتی ایسے کانپنے لگی۔ جیسے مینہ کی بوچھاڑ میں چمپا کی پنکھڑی کانپ رہی ہو۔ مدن کو مہادیو پر تیر چلانے کا ہیاؤ تو نہیں پڑتا تھا پر جب اندر نے کہا "گھبراتے کیوں ہو۔ رُتوں کا راجہ بسنت[6] جس کی سانس میں کلیوں کی باس ہے۔ تمھارے ساتھ ہوگا"! تو مدن کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھ گئی۔ اور وہ کمان کو کندھے پر ڈال۔ رتی کو ساتھ لے کیلاش کی طرف چلا۔ آگے آگے بسنت پھول بکھیرتا جا رہا تھا اور پیچھے پیچھے یہ دونوں جنے چلے آ رہے تھے۔

اُس سمے سارے جنگل اور بن سنسان تھے۔ پربت کچھ اس ڈول سناٹے میں تھا۔ جیسے اُما کا دُکھ اُس سے دیکھا نہیں جاتا۔ کالی نیلی۔ ملگجی، اور سپید چٹانیں اس طرح سوچ رہی تھیں۔ جیسے اُن کے دل پر کوئی بڑا بوجھ ہو۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ پن چادر دن کا شور مدھم پڑ گیا تھا۔ پکھیرو گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ چیتے اور نال آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے پہلو میں کسک دبائے سر نہوڑائے کھڑے تھے ہاں کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرنے لگتی۔ تو یہ خیال ہوتا کہ اب یہ آنسو پربت کے گالوں پر پھوٹ بہیں گے۔

پر جب پانچ تیروں والا دیوتا[7] مدن اپنی استری رتی کو لے کے کیلاش کے بنوں میں پہنچا تو ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ دو چنچل کرنیں پربت

---

[1] - برہما دنیا کا خالق ہے۔ اُسے پرجاپتی بھی کہتے ہیں۔ رامائن میں لکھا ہے کہ پہلے ہر طرف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اُس میں سے دھرتی اُبھری اور برہما جی نمودار ہوئے۔

[2] شو اور پاربتی کے لڑکے کا نام کارتکیہ ہے۔ اسے سکند اور کمار بھی کہتے ہیں۔ وہ دیوتاؤں کا سنیاسی (سپہ سالار) اور جنگ کا دیوتا ہے۔

[3] ایک مخلوق کا نام ہے۔ راون جو رام چندر جی کے ہاتھوں مارا گیا۔ راکششوں کا ہی سردار تھا۔ رامائن میں لکھا ہے کہ جب ہنومان جی لنکا گئے تو انھوں نے وہاں ہر قسم کے راکشش دیکھے۔ ان میں سے کچھ خوبصورت تھے۔ کچھ بدصورت۔ کچھ موٹے کچھ دُبلے پتلے۔ کچھ لمبے کچھ بونے۔ بعض کے سر ہاتھیوں جیسے تھے۔ بعض کے سانپوں کے مانند۔ اس زمانے کے عالموں کا خیال ہے کہ راکشش وہ لوگ تھے جو آریاؤں کے آنے سے پہلے ہندوستان میں آباد تھے۔ آریاؤں نے انھیں دکن کی طرف دھکیل کے ملک پر قبضہ کر لیا۔

[4] اندر آکاش کا دیوتا اور دیوتاؤں کا راجہ ہے وہ مینہ برساتا اور فصلیں اُگاتا ہے۔ بجلی کا کڑکا (رعد) اور دھنک (قوس قزح) اس کے ہتھیار ہیں۔ سورگ کا راج بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ ایراوت اُس کے ہاتھی کا نام ہے اور اندرانی اس کی بیوی ہے۔ اندر آریوں کا پرانا دیوتا ہے۔ ویدوں میں اس کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔

[5] لکشمی دولت کی دیوی ہے اسے شری بھی کہتے ہیں۔ پرانوں میں لکھا ہے کہ جب دیوتاؤں نے سمندر رکو بلو کے اس میں سے امرت نکالا تو لکشمی ہاتھ میں کنول کا پھول لئے سمندر کے جھاگ سے نمودار ہوئی۔ ہری بنس میں جو سنسکرت کی ایک مشہور نظم ہے۔ کام دیو کو لکشمی کا بیٹا بھی کہا گیا ہے۔

[6] بسنت بہار کا دیوتا ہے، جو مدن کا دوست سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر خواہشیں اسی موسم میں پیدا ہوتی ہیں۔

[7] مدن کے پانچ تیر پانچ پھول ہیں۔ وہ آم کی پتلی ٹہنیوں سے اپنی کمان بناتا ہے مدھ مکھیاں کمان کی تانت کا کام دیتی ہیں۔ یونانی دیومالا میں ایروس یعنی کیوپڈ محبت کا دیوتا ہے۔ یوں تو وہ بھی تیر کمان سے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں نہیں۔

کی گود میں مچل رہی ہیں۔ جن کی جوت سے اندھیرے جنگلوں میں اجالا سا ہو گیا ہے۔ چٹانیں اس طرح دمک اٹھیں۔ جیسے ان کے سینوں میں آگ دہک رہی ہے۔ کچھوا الکی۔ چشموں کا پانی ہلکورے لینے لگا ندیاں شور مچانے اور لال اور سپید پتھروں پہ سر ٹپکنے لگیں۔ ہری ہری دوب کے فرش پہ پھولوں اور کلیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور ہوا ان کی خوشبو سے مہک اٹھی شفتالو کی ٹہنیاں، خوبانی کے پیڑ میں پھنسیں۔ انار کی کلیاں انگور کے پتوں میں کھچڑی ہو گئیں۔ چنبیلی کی ڈالیاں لچکنے کے ساتھ اٹھیں اور آپس میں مل گئیں۔ عشق پیچہ بادام کی ٹہنیوں سے لپٹ گیا۔ اور انگور نے اپنی نازک باہیں چنار کے گلے میں ڈال دیں۔ کنول کی سپید کلیاں ندی کے پانی میں اپنا روپ دیکھنے لگیں۔ بھونروں کے گھنگھرو بجنے لگے۔ پکھیرو سرک کے ایک دوسرے کے پاس آ گئے۔ اور ان کی کوک سے دلوں میں ہوک سی اٹھنے لگی۔

مدن نے دور سے دیکھا کہ درختوں کے جھرمٹ میں دیودار کا ایک پرانا پیڑ ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں سے دل میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ پیڑ تلے مرگ چھالا ہے اور مرگ چھالا سے کچھ دور ہٹ کے کیشپ[1] کا بیٹا نندی سنتری کی طرح پہرہ دے رہا ہے۔

مدن نے کندھے سے کمان اتاری۔ پرندے چہکارے بھرنے لگے کیلاش کی گپھاؤں میں جو تپسوی مدتوں سے بیٹھے تپسیا کر رہے تھے ان کا بھی من ڈول گیا۔ ایکا ایکی نندی نے کہا "چپ" اور بن پر سناٹا چھا گیا۔ پرندوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہوا نے سانس روک لیا۔ مدھ مکھیاں گانے گاتے ٹھٹک گئیں۔ پھر مدن کو دیودار کے پیڑ تلے شو کی جھلک سی نظر آئی۔ گورا رنگ اور اس پر بھبوت کا بانہ۔ جیسے راکھ میں آگ چمک رہی ہو۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا بازوؤں سے ناگ لپٹے ہوئے۔ گورے ماتھے پہ ہلکی ہلکی لکیر جیسے کسی پنچھی کے پنکھ چشمے کے تھمے ہوئے پانی سے چھو کر اس پر سلوٹ سی ڈال گئے ہوں۔

مدن سمجھ گیا۔ یہ مہادیو کی تیسری آنکھ ہے۔ جس میں سارے سنسار کو بھسم کر ڈالنے کی شکتی ہے یہ اگر کھل گئی تو اس سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ یہ سوچ کے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ مڑا اور بسنت اور رتی کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے جھاڑیوں میں دبک گیا۔

وہ پریم پتی۔ جگت جیت مدن۔ جس نے نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑ دیا تھا۔ وہ کام کا دیوتا، جو جگ ان کے من میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ وہ دلوں کا شکاری جس کے بانوں نے ان گنت سینوں کو چھید ڈالا تھا۔ آج سہما ہوا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح ڈھلک رہی تھیں۔ اور سانس کچھوا کی طرح چل رہا تھا۔

بسنت نے کہا۔ کوئی آ رہا ہے۔ رتی کہنے لگی سچ مچ کوئی آ رہا ہے پر یہ کون ہے جو مہادیو کے استھان میں یوں بے دھڑک چلا آ رہا ہے۔ یہ کوئی دیوتا ہے یا کوئی تپسوی جس نے تپسیا کے بل سے تینوں لوکوں[2] کو جیت لیا ہے۔ نہیں یہ تو ایک سندر استری ہے۔ جس کے روپ میں سورج کی جوت اور جس کے جوبن میں کونپل کی پھبن ہے یہ کسی گندھرو[3] کی کنیا ہے جو بادلوں پہ پاؤں رکھتی دھنک کے چنچل رنگوں کو روندتی ابھی ابھی آکاش سے اتری ہے یا سورگ کی اپسرا[4] ہے۔ جس کے گورے گورے پاؤں تلے پربت کا دل مارے خوشی کے دھڑک رہا ہے۔ نہیں یہ نہ تو کسی گندھرو کی کنیا ہے۔ نہ سورگ کی اپسرا۔ یہ پربتوں کے راجہ ہماچل کی بیٹی اما ہے۔ جو شردھا کے بل اور

---

[1] کیشپ رشی سات مشہور رشیوں میں ایک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ برہما کے پوتے تھے۔ وایو پران میں لکھا ہے کہ شوجی کا بیل نندی ان کا بیٹا ہے۔ لیکن صرف ایک نندی ہی پہ موقوف نہیں۔ بہت سے دیوتا ان کی اولاد میں سے ہیں۔ کیشپ رشی دکش جی کی تیرہ بیٹیوں سے بیاہے گئے تھے۔ جن میں سب سے بڑی کا نام ادیتی تھا۔ ادیتی سے کئی دوسرے دیوتا پیدا ہوئے اور باقی سے دوسری مخلوق نے جنم لیا۔

[2] تین دنیائیں۔ دھرتی سورگ (بہشت) اور پاتال۔ مگر ہندوؤں کی بعض کتابوں میں سات اور بعض میں آٹھ لوکوں کا ذکر آیا ہے۔

[3] گندھرو، ایک آسمانی مخلوق کا نام ہے جو دیوتاؤں کو گا بجا کے رجھاتی ہے۔ اسی لئے موسیقی کو گندھرو ودیا بھی کہتے ہیں۔

[4] گندھرو کی استری۔ سورگ کی ایک حسین مخلوق۔ حور۔

بھگتی کی شکتی سے وہاں آپہنچی ہے۔ جہاں دیوتا بھی پاؤں نہیں رکھ سکتے۔

اُما مہادیو کے سامنے پہنچ کے ڈنڈوت کو جھکی۔ تو اُس کے بالوں کی ایک لٹ کھل کے اُس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر آرہی۔ مدن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمان میں تیر جوڑا۔ شوجی نے مسکرا کے آنکھیں کھول دیں۔

کتنے لال ہیں۔ اِس کنیا کے ہونٹ۔ لال اور رس بھرے۔

یہ خیال شوجی کے من میں لَو کی طرح لپک اُٹھا۔ اُنھوں نے پہلی بار پربت کی بیٹی کو آنکھ بھر کے دیکھا تھا۔

پھر وہ ننھی سی لَو کانپی اور کانپ کے بجھ گئی "یہ میرے جی میں یہ بات کہاں سے آئی۔ کیسے آئی۔ میرے من نے اسے جنم نہیں دیا یہ تو کہیں باہر سے آئی ہے۔ چپکے چپکے، دبے پاؤں چوروں کی طرح لال اور رس بھرے ہونٹ، یہ بات میرے من میں کس نے ڈال دی — کون ایسا ہے —؟"

یہ سوچتے سوچتے اُن کی بھویں تن گئیں اور پھر ایکا ایکی اُنھوں نے اپنی تیسری آنکھ کھول دی۔ وہی آنکھ جس میں تمام سنسار کو جلا ڈالنے کی طاقت ہے۔

لال لال شعلے لچکیلی زبانیں نکالے ہوئے بڑھے۔ اور دلوں کے شکاری کو جو جھاڑیوں کی اوٹ میں کمان کا چلّہ چڑھائے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جلا کر راکھ کر ڈالا۔ رتی نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اُٹھائیں۔ مرگ چھالا سونا پڑا تھا۔ شوجی کہیں نہیں تھے۔ ہاں اُما پھولوں بھری ڈالی کی طرح سر نہوڑائے کھڑی تھی۔ اُس کا جوڑا اب پوری طرح کھل گیا تھا۔ اور لمبے لمبے بال اُس کے پاؤں میں لوٹ رہے تھے۔

(۲)

جب اُما نے دیکھا کہ اُس کا رُوپ اور جوبن شوجی کے من سے ستی کی یاد کو نہیں مٹا سکا۔ تو اُس نے سارا گہنا اُتار ڈالا۔ ست لڑے ہار کو یوں نوچ کے پھینک دیا کہ اُس کی رگڑ سے چندن کا لیپ آپ ہی آپ اُتر گیا۔ کان کے بُندوں کو غصّہ میں یوں نوچا کہ کان لہولہان ہوگئے۔ پھولوں کے جھومروں کو پاؤں تلے روند ڈالا اور ریشم کا سُوہا جوڑا جس میں سونے کے تار گندھے ہوئے تھے، اُتار کے درختوں کی بھوری چھال سے اپنا بدن ڈھانک لیا۔ اور گھر بار چھوڑ ایک سنسان جنگل میں جو آبادی سے دُور راہ باٹ سے کٹا ہوا تھا کٹیا بنا کے رہنے لگی۔

پر اس برن میں بھی اُس کے رُوپ کی جھمک دمک کم نہیں ہوئی تھی۔ اور بھوری چھال کے جوڑے میں اُس کا نکھرا ہوا جوبن یوں جھلکتا دکھائی دیتا تھا۔ جیسے پچھلے پہر کے دھندلکے میں پو پھٹ رہی ہو کیونکہ کنول کا پھول کائی میں گھرا ہوا بھی بھلا معلوم ہوتا ہے اور بھونرا اُس کے ہونٹوں کا رس پینے کے لئے اُس کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔

پچھلے پہر وہ ندی پہ جا کے اشنان کرتی۔ اور لوٹتے وقت پودوں کو پانی دینے کے لئے گگری بھر لاتی۔ جب بھوک بہت ستاتی۔ تو پھل پھلاری اور پیڑوں کی جڑیں کھا کے گزارہ کر لیتی۔ اور رات کے سمے اپنی نازک بانہہ کو تکیہ بنا کے پتھریلی زمین پر پڑ رہتی۔ جنگل کے پنچھی پکھیرو اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ہرن ہرنیاں اُس سے یوں ہل گئی تھیں۔ جیسے وہ بھی کوئی ہرنی ہے جو راستہ بھول کے اس طرف آنکلی ہے۔

آہستہ آہستہ اُسے بھوک پیاس بھی بسر گئی۔ پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹنے لگیں اور نیند اس کی آنکھوں کو یوں چھوڑ کے چلی گئی۔ کہ پھر اُس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ اب تو اُس کا یہ حال ہوا کہ جو تھوڑا بہت وقت ان دھندوں میں خرچ ہو جاتا۔ وہ بھی تپسیا میں کٹنے لگا۔ اس

کا جسم جو نئی کھلی ہوئی کلی کی طرح نرم اور تازہ تھا۔ کملا گیا۔ مالا پھیرتے پھیرتے انگلیوں پر گٹّے پڑ گئے۔ پر اس کے جپ تپ میں کوئی فرق نہ آیا۔

اُما کو یونہی تپسیا کرتے مدتیں بیت گئیں۔ ایک دن وہ کٹیا کے دروازے پر کھڑی تھی۔ کہ ایک برہمن جو شاید راستہ بھول کے ادھر آنکلا تھا۔ کٹیا کے پاس سے گزرا۔ اور اُما کو دیکھ کے رُک گیا۔

اُما نے برہمن دیوتا کے پاؤں دُھلائے۔ اُن کی پوجا کی۔ اور پھل پھلاری اُن کے سامنے رکھ کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

برہمن پہلے تو ٹکٹکی لگائے اُس کے مُنہ کو تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ اے کنول کے سے نینوں والی میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہرن تجھ سے بہت ہلے ہوئے ہیں۔ وہ کشا[1] گھاس کے تنکے تیرے ہاتھوں سے چھیننے لئے جاتے ہیں۔ اور تو بھی ان ہرنوں اور ہرنیوں میں بہت خوش معلوم ہوتی ہے۔ پر سندری ایک بات پوچھوں۔ بُرا تو نہ مانے گی۔ تو اس سنسان بن میں کیوں اپنی جوانی گنوا رہی ہے۔ تجھے تو اس چاند ایسے چہرے سے کسی راجہ کے نواس کو اُجالنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ یہ چھال کے کپڑے بڑھاپے کا سنگار ہیں۔ ایسی تپسیا تو ہم ایسے بوڑھوں کا کام ہے جو زندگی سے نراش ہو چکے ہوں۔ میری سُنے تو اس جنگل کو چھوڑ کے اپنے گھر چلی جا۔ یہاں تیری رسیلی جوانی کی بہار دیکھنے والا کون ہے؟ اچھا میں سمجھ گیا۔ تیری ٹھنڈی سانس نے تیرے دل کا بھید کھول دیا۔ تو نے کسی کی چاہت میں یہ دھج بنا رکھی ہے۔ پر دھرتی پر کون ایسا ہے۔ جسے تو چاہے اور وہ تیرے قدموں پر نہ آگرے۔ اُس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کی سِل ہو گی۔ کہ وہ تیرے اُداس چہرے، بکھرے بکھرے بالوں، اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھتا ہے اور اس کا جی نہیں پسیجتا۔ نہ تیرے ہاتھوں میں مہندی ہے نہ تیری آنکھوں میں کاجل۔ تیرے کان بُندوں سے خالی ہیں۔ اور تیرے سینے کو جسے ہاروں سے ڈھکا ہونا چاہیئے تھا۔ سورج کی تیز کرنیں جُھلس رہی ہیں۔ وہ کون ہے جو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اسے تیری حالت پر ترس نہیں آتا۔

مجھے تو کوئی ایسا برہمن سمجھتی ہے۔ جو صرف باتیں کرنا جانتا ہے۔ پرے پتلی کمر والی کنیا۔ میں نے بھی تپسیا کی ہے۔ مجھ میں بھی اتنی شکتی ہے کہ اگر چاہوں تو تیرے پریتم کو تجھ سے ملا دوں۔ اس لئے مجھ سے اپنا بھید مت چھپا۔ اور صاف صاف بتا دے کہ کس کی چاہت تیرے جی کی گاہک ہوئی ہے۔

اُما بولی "برہمن دیوتا۔ میں شو بھگوان کے سوا اور کسی کو نہیں چاہتی۔"

برہمن ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ اُس کی ہنسی میں بادل کی گڑگڑاہٹ تھی اور اُس کے اُجلے اُجلے دانت بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ شو! میں شو کو جانتا ہوں۔ پر اُس کے پاس کیا رکھا ہے کہ تجھ ایسی دیوی اُس کی چاہ میں اپنا جوبن گنوا دے۔ شو تو بھکاری[2] ہے بھکاری۔ اُسے تو پہننے کو کپڑا بھی نہیں جُڑتا۔ اور میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ وہ گیت جوڑنے والے شاعروں کی طرح سپنے دیکھتا رہتا ہے۔

اُما ٹھنڈی سانس بھر کے کہنے لگی۔ دیوتاؤں کے ڈھنگ نیارے ہیں اُن کی باتوں کو ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم شو کو بھکاری کہتے ہو پر دیوتاؤں کا راجہ اندر اُسے ڈنڈوت کرتا ہے۔ اور برہما جس نے سارے سنسار کو پیدا کیا۔ اُس کی مہما کے گیت گاتا ہے۔

برہمن بولا "میری سُن تو ــــــ"

اُما کی بھنویں تن گئیں، اور وہ کڑک کے بولی "چپ! میں اور کچھ سُننا نہیں چاہتی۔"

---

[1] ایک قسم کی گھاس جو پوجا کے کام آتی ہے۔

[2] شو جی کا لباس شیر یا ہاتھی کی کھال بتایا گیا ہے اُن کے سر پر بالوں کا جوڑا ہے جو سنکھ کی طرح کا معلوم ہوتا ہے۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ہے اور بازوؤں سے سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔

پر ایکا ایکی اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اُس کا دِل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ یُوں رُک گئی جیسے پتھریلی چٹان کا ایک ٹکڑا کسی چنچل ندی میں ٹوٹ کے آ پڑے اور اُس کا راستہ روک لے۔ کیونکہ برہمن کی جگہ مہادیو کھڑے مُسکرا رہے تھے۔

اُما اپنے رُوپ اور جوانی سے تو شِو کے من کو نہ بھا سکی۔ پر اُس کا تپ وشوا ناتھ[1] کو اُس کے دوار پہ لے آیا۔

پھر وہ پانچ پُھولوں والا دیوتا بھی جی اُٹھا۔ جو مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑتا ہے۔ اور جس نے اپنے زہریلے بانوں سے اَن گنت سینے چھید ڈالے ہیں۔

جب آموں پر بور آتا ہے اور اُس پر بھنوروں کے جھُنڈ گونجنے لگتے ہیں۔ تو مدن بے کھٹکے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ پر جب سے اس نے شِو جی پر تیر چلانے کا ہیاؤ کیا ہے، وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔

---

[1] وشوا ناتھ بھی شِو جی کا نام ہے۔ جس کے معنی سب کا مالک ہیں۔

اشرف صبُوحی

حاجی بغلول لاہور میں

کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم۔ معاف فرمائیے گا حضرات اور حاضرات الرحمٰن کہنا تو ہم بھول ہی گئے۔ کیا کریں سب سے پہلے ہمارے جدامجد نے گیہوں کھاکر چوک کھائی تھی، ہم بھی اگر بھول چوک نہ کھائیں تو ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کس منہ سے کریں۔ دوسری بات یہ بھی بھول جائیے کہ ہم مولوی نہیں ہم تو حاجی ہیں حاجی۔ ہمارا نام نامی اس طرح ہے۔ حاجی بلغ العلیٰ ابن حاجی بدرالدجیٰ مکی مدنی ثم لکھنوی، ثم بدایونی، ثم دہلوی۔ یہ ثُمّ ہمارے عرب کی بول چال ہے۔ آپ حضرات کو اس ترکیب کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ البتہ اس کے بالمقابل آپ ثُمّ مہ لکھ سکتے ہیں۔ جیسے سید محمد بدایونی، ثُمّ مہ بریلوی۔ یاایہا الناس! کیا نام کہ آپ میں سے جو حضرات سنّو کے پیٹے میں ہیں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ ہم سید سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے دستِ راست و دستِ چپ تھے۔ جس طرح ایک مخلص مومن کی تعریف میں یہ حدیثِ قدسی ہے کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی اس سیّد زادے کا دماغ بن گئے تھے جس سے وہ سوچتا تھا۔ ہاتھ بن گئے تھے جس سے وہ لکھتا تھا۔ الغرض سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے ہمارا ہی تخیل اس پر سوار تھا۔ کیا نام کہ وہ غریب جلدی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہم نے بھی اس کے ماتم میں قیصر باغ کے جلسے یک قلم موقوف کر دئے۔ نخاس کا پھیرا لگانا چھوڑ دیا۔ امام باڑہ سے منہ موڑ کر گومتی کے کنارے دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ کیا نام کہ بارہ اور بارہ چوبیس برس کے بعد ایک اور سیّد زادے میاں محفوظ علی بدایونی ہمیں زبردستی بدایوں لے آئے۔ وہاں لا کر بے چارے نے زور تو بہت لگایا کہ ہماری طبیعت کی جولانیاں بڑھیں۔ مگر جناب تو یہ کہیے

لکھنؤ بھی چھٹ گیا وہ عشق بھی باقی نماند
آں قدح شکست وہاں ساقی نماند

آخر مجبور ہو کر بدایونی ہمیں دلّی لے آئے اور اجمل خاں کے مطب میں لے جانے کی بجائے "ہمدرد" کے دفتر میں بند کر دیا۔ یہاں علی برادران سے ہمارا تعارف کرایا گیا۔ انہوں نے ہر طرح ہماری خاطر مدارات کی۔ طبیعت سنبھلتے سنبھلتے سنبھل گئی، اور پھر وہی ہنسی، دل لگی، چہل، تفریح، پھکڑ بازی جو ہماری عادتِ ثانیہ تھی، عود کر آئی۔ اور ہم دوبارہ دنیا کے چار کھونٹ مشہور ہو گئے۔ چند سال بعد "ہمدرد" بند اور علی برادران جیل میں نظر بند۔ کیا نام کہ اس قید و بند کے زمانے میں یہی مناسب معلوم ہؤا کہ ہم بھی اپنی آنکھوں میں شام و سحر بند کر لیں اور حبسِ دم سے کام لیں۔ یاد نہیں کتنے سال سوتے

رہے اور جب اصحاب کہف کی طرح بیدار ہوئے تو دنیا کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

دفعتاً "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے ہر چھوٹے بڑے کی زبان سے سننے میں آئے۔ وہ جو کہتے ہیں زبانِ خلق نقارۂ خدا۔ بس خدا نے پاکستان بنوا دیا۔ ہمارا پاکستان دیکھنے کا شوق جب حد سے بڑھ گیا تو کیا نام ہم آنکھوں میں سرمۂ سلیمانی لگا بغیر پاسپورٹ کے لاہور میں آ وارد ہوئے۔ قیام کی فکر دامن گیر تھی اور ہم سڑک کے درمیان کے وسط میں چل رہے تھے۔ سامنے ایک چوک آیا اور پیچھے سے تانگے والے نے آواز دی "بچ موڑ توں"۔ خیر صاحب ہم ایک طرف کو ہو گئے۔ آگے بڑھے تو بڑے ہسپتال کے قریب کئی فوٹو گرافر بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے جھٹ کیمرہ سنبھالا۔ ہم نے کڑک کر کہا "تصویر نہیں اتروانی ہے"۔ وہ بولا "مجھے تو اتارنی ہے۔ قسم ہے ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی"۔ اس پر ایک اور صاحب نے جیب سے فیتہ نکال کر سر ناپتے ہوئے فرمایا۔ بھائیو! جس کے سر کا دور چودہ انچ ہو اس پر پچیس گز کا عمامہ بھی بندھا ہو اور ابرو اس طرح آگے کو جھکے ہوں جیسے خس پوش سائبان۔ ناک کا بانسہ حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا ہو اور نتھنے ایسے ہوں جیسے تہ خانے کے روشندان۔ اوپر کا لب چھوٹا نیچے کا جبڑا مع زنخداں آگے کو اُبھرا ہوا۔ ٹانگیں چھوٹی اور موٹی۔ اس پر ایک ٹانگ میں لنگ بھی ہو، منہ پر چھتر شاہی ڈاڑھی۔ ایک عدد جریب زیتونی ہاتھ میں لے کر جب ایسا شخص پوندمی چال چلے تو کون ایسا بے ذوق ہوگا جو ایسی تصویر کا گاہک نہ ہو۔ ایک اور صاحب ہنس کر فرمانے لگے اس تصویر کے نیچے یہ بھی لکھ دیا جائے "ڈارون کی تحقیق کا نچوڑ۔ یعنی افریقہ کا بندر"۔ اس پر کیا نام کہ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ جن صاحب نے یہ پھبتی کسی تھی وہ نزلہ حار کا شکار تھے۔ ان کی آنکھ، ناک اور منہ سے پانی جاری تھا۔ کیا نام کہ ہم نے کہا صاحب زادے! راوی، چناب، جہلم کی روانی تو دکھا چکے اب ستلج اور بیاس کے دہانے بھی کھول دو۔ اور اگر یوں نہ کھلیں تو شورہ قلمی کی مدد سے کھل جائیں گے۔ اور ساتھ ہی تمہاری آنکھیں بھی کھلیں گی اور پہچان لوگے کہ افریقہ کا بندر تمہارا بزرگ حاجی بغلول ہے۔ کیا نام کہ یہ سنتے ہی وہ جھینپ گئے اور یہ صدا لگاتے ہوئے ایک طرف کو چل دئے ۔

عزیزِ حق تعالیٰ کبریا ہے
شرف بغلول کو جس نے دیا ہے

پھر ہم نے فوٹو گرافر سے کہا ہم حاجی ہیں، ہماری تصویر کھینچ کر شیطان کا آدھا عذاب تمہیں اٹھانا پڑے گا۔ مسافروں سے ٹھٹھا مخول نہ کرو اور کسی سرائے کا راستہ بتا دو۔ وہ بولا یہ رہی سامنے رتن چند کی سرائے۔ ہم نے وہاں جا کر ایک شخص سے پوچھا یہاں ٹھہرنے کا کیا لیا جاتا ہے؟ اس نے جواب دیا بڑے میاں! اس سرائے میں بسیں ٹھہرتی ہیں۔ آدمیوں کے لئے بازاروں میں ہوٹل ہیں۔ یکایک ایک چھیبے والے نے آواز دی بگو گوشے لو۔ ہم خود گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھے۔ بگو گوشے والے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایک واقف کار نظر پڑ گئے۔ "اور حاجی صاحب ابھی زندہ ہو"۔ یہ کہہ کر بغل گیر ہو گئے اور اپنے مکان میں لے آئے۔ اور ان ہی کی وساطت سے کچھ ادبی انجمنوں اور مخصوص مشاغل کی صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

کیا نام کہ ایک روز انجمن اخوان الادب کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ حاضرین نے پرجوش طریقے پر ہمارا خیر مقدم کیا اور اصرار کیا کہ ہم مختصر سی تقریر بھی کریں اور اپنا کلام بھی سنائیں۔ چنانچہ ہم نے کھڑے ہو کر کہا بھائیو! آپ کی بغلول نوازی کا شکریہ۔ اور دو دو عیدیں منانے پر مبارک باد۔ کیا نام کہ چپڑی اور دو دو۔ ایسا تو اتر تو ہم نے اپنی صد سالہ عمر میں کہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر کسی کو ۲۷ تاریخ کے بعد ہی سے چاند نظر آنے لگے اور ایک دو کی بجائے آپ تین تین عیدیں منانے لگیں۔ اے پاکستانی بھائیو! کیا نام کہ نمازِ عیدین سے مقصد اجتماعِ ملت ہے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ عموماً ہر مسجد اور ہر میدان میں یہاں نمازِ عید ہوتی ہے دس بیس آدمی اکٹھے ہوئے اور کسی سبزہ زار پہ کھڑے ہو کر نمازِ عید ادا کر لی چاہے بڑا اجتماع اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر صفوں کی ترتیب بھی نہیں۔ صف سے ہٹ کر جہاں سایہ دیکھا وہیں کھڑے ہو گئے۔ کیا نام کہ آپ ہمارے کہنے کا بُرا نہ مانیں۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کا ملک بہت غریب ہے لیکن یہاں کاروں اور کوٹھیوں کی کثرت دیکھ کر یقین تو نہیں آتا۔ اگر واقعی ملک غریب ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے ملک میں کوئی احمق نہیں بستا۔ کیا یہ کہاوت آپ نے نہیں سُنی: چو احمق در جہاں باقیست مفلس در نمی ماند۔

لیجئے حضرات ہمیں اتنا ہی کہنا تھا۔ عقلمند را اشارہ کافیست۔ اب خاص رنگ میں چند شعر ملاحظ فرمائیے۔ عرض کیا ہے:۔

ہوئے بیچ کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ ورگڑھیا ۔۔۔ وہیں رہتے مثل مینڈک وہیں غائیں غائیں کرتے

ہمیں کیا سمجھ کے تو نے دھتکارا اپنے در سے ۔۔۔ کوئی کوّے تھے کہ چھت پر تری کائیں کائیں کرتے

تری بات کا ستمگر نہ جواب بن پڑا کچھ ، ۔۔۔ یونہی وقت ہم نے ٹالا فقط آئیں بائیں کرتے

یہ جریب اپنی موٹی کوئی قمچی ہوتی یا رب! ۔۔۔ تو اُسے گھما گھما کر ابھی شائیں شائیں کرتے

سامعین کو یہ اشعار بہت پسند آئے اور تحسین و آفرین کا وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ہم نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی جریبِ نیتونی سنبھالے ہوئے ڈائس سے اُترے اور گھر روانہ ہوئے۔

اس مشاعرے کو ابھی دو روز بھی نہیں گزرے تھے کہ پاکستان کے رسائل و جرائد کے مدیران کی جو کانفرنس ہو رہی تھی اس کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ مقبرہ جہانگیر میں چار بجے تشریف لائیے۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ کا کیا علاقہ؟ تو کیا نام ہم کسی زمانے میں "بعیر الاخبار" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اس لئے یہ تقریب عمل میں آئی۔ چنانچہ ہم وقت مقررہ پر مقبرہ پہنچ گئے۔ یہاں ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور چاندی کی تھالی میں ایک ایڈریس بھی پیش کیا گیا۔ اس کا مضمون آپ بھی سن لیجئے:۔

بخدمت عالی متعالی حضرت حاجی بلیغ ابن حاجی بدرالدجیٰ مکی مدنی ثم لکھنوی دام فیضہٗ۔ زندہ باد و پائندہ باد! ہم سب آپ کی تشریف آوری پر ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔ اس وقت اس برادری میں آپ کی شخصیت بابا آدم سے کم نہیں۔ آپ نے بعیر الاخبار اس وقت نکالا تھا جب صرف ہینڈ پریس تھے۔ کاغذ اور دیگر سامانِ طباعت بھی کمیاب تھا، اور ذوقِ اخبار بینی بھی اتنا عام نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ آپ کی ہمت کو آفرین ہے کہ سخت مشکلات کے باوجود آپ نے اپنا مشن جاری رکھا خدا ہمیں بھی آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

ہم نے اس کا جواب دیا:۔

"ایہا الحاضرین والحاضرات! (آوازیں "یہاں کوئی مسماۃ نہیں") ہم نے کہا کیا نام کہ "آپ کا یہ دخل در معقول و نامعقول ہمیں پسند نہیں۔ حاضرات تو آپ کی بائیں پسلی میں پھڑک رہی ہیں، ذرا کو ٹھا ٹھکانے کی دیر ہے اس طرح گرنے لگیں کہ جس طرح موسمِ خزاں میں پتے درختوں سے گرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم عملِ حاضرات کے ماہر بھی تو ہیں۔ دیکھئے شروع کرتے ہیں" یا قاضی الحاجات۔ حاضرین کو بنا دے حاضرات یا قوی قادر حاضرات کو کر حاضر"

اتنا کہنا تھا کہ چند خواتین جو تفریح کے لئے آئی تھیں ہماری تقریر سننے کے لئے وہاں کھڑی ہوگئیں۔ لوگوں کے دلوں میں ہماری ولایت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے ہم نے کہا:۔

"کیا نام کہ آپ نے جن مخلصانہ، دوستانہ، بزرگانہ اور بچگانہ قسم و نوع کے جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے مایۂ شترِ اعرابی ہے۔ لاحول ولا، بھولا صاحب وہ میرے لئے مایۂ ناز ہے۔ اور مرحوم بعیر الاخبار کا ذکر کر کے تو ع

اک تیر میرے دل پہ مارا کہ ہائے ہائے

کیا نام کہ بعیر عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی تو اس

ادونٹ اخبار کی بھی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ جب پرچہ چھاپنے کا وقت آتا تو پریس مین ندارد کبھی کاتب غائب غلہ تو کبھی سنگ ساز فقروالی اللہ۔ غرض پریس کے عملے نے "البصیر" کی چولیں تک ہلادیں۔ ہمارا کاتب بڑا تیز رقم تھا۔ اس نے زود نویسی میں نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب جلی لکھتا تو یہ معلوم ہوتا گویا ہاتھی دوڑ رہے ہیں اور خفی لکھتا تو دال اور چاول پر قرآنی سورتیں لکھنے والوں کو بھی پرے بٹھا دیتا۔ غلطیاں درست کرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ لاکھوں جوؤں کا خون بہہ رہا ہے۔ اگر چیپیاں لگاتا تو ساری کاپی سانپ کی کینچلی معلوم ہوتی۔ بس کیا نام کہ ہمارا ہی جامہ تھا کہ یہ بارِ امانت جسے پہاڑ اور جنگل نہ اٹھا سکے ہم نے اپنی اکیلی لنگڑی ٹانگ پر اٹھالیا ؎

تجھ ہی سے اٹھیں میر یہ خواریاں — نہ بھائی ہماری تو طاقت نہیں

آپ نے ایڈریس میں کہا ہے کہ اب پہلے کی نسبت طباعت و کتابت میں آسانیاں ہیں، خدا کرے ایسا ہی ہو۔ "ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

اتنا کہہ کر ہم بیٹھ گئے اور چائے کا دور شروع ہوگیا۔ پھر ہمارا تعارف مختلف اشخاص سے کرایا گیا۔ آپ "شہنائی" کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی نغمہ نوازی پر سارا پاکستان جھوم اٹھتا ہے۔ آپ "سنگ و خشت" کے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی سنگین قسم کی اردو لکھتے ہیں۔

پھر اخباری رپورٹر ہمارے گرد جمع ہوگئے اور سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ "کیا آپ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" ہم نے جواب دیا کیا نام کہ جب کوئی پھل آخر ہونے لگتا ہے۔ اور بازار میں کم کم دکھائی دیتا ہے تو پھل والے آواز لگاتے ہیں کہ "خبردار! میوہ چلا وطن کو"۔ تو میری بہار بھی ختم ہو رہی ہے۔ میرا وطن عرب ہے۔ لہٰذا براہ کراچی عرب جا رہا ہوں۔

"چھیڑ چھاڑ" کے نمایندہ نے سوال کیا "آپ نے اپنی عمر میں کبھی رومان بھی لڑایا ہے؟" ہم نے کہا "میاں صاحبزادے رومان لڑانا بیسویں صدی کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تو بٹیریں لڑائی ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ ایک مرتبہ ذرا تعلقِ خاطر ہوگیا تھا، وہ بھی ایک دوشیزہ سے جس کا نام مرادی تھا۔ مگر افسوس کہ نامرادی پلّے بندھی۔" انہی صاحب نے فرمائش کی کہ مرادی کے متعلق جو اشعار یاد ہوں وہ سناؤں۔ میں نے یہ کہہ کر لاکھ ٹالنا چاہا کہ میرے نجی معاملات سے آپ کو کیا غرض۔ مگر وہ نہیں مانے۔ مجبوراً دو شعر سنانے پڑے۔ آپ بھی سُن لیجئے ؎

یاروں کو کیوں یہ واقعہ اک کھیل ہوگیا — کیا امتحانِ عشق میں میں فیل ہوگیا

تن ہوگیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا — اپنے تو حق میں عشق امربیل ہوگیا

ساری مجلس قہقہوں سے گونج اٹھی۔ اور یہ صحبت جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ ختم ہوگئی۔ اللہ بس باقی ہوس۔

---

(۵)

اُردو افسانہ

پہلا دور

سجاد حیدر یلدرم

خارستان و گلستان

گلستان

آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے۔ بحرِ ہند میں ایک جزیرہ تھا جو اب ناپید ہے۔ چاندنی رات تھی، سطحِ آب پر سکونِ مطلق طاری تھا، اور اس سکون پر چاند اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی، بے پایاں سمندر، ڈراؤنی تنہائی، وحشت انگیز سکوت، کوئی صدا نہیں، کوئی اثرِ حیات نہیں۔ ایک غیر محدود مگر روشن تنہائی، ایک منتشر سکون! یہ عالم ہے۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے، موجیں بھی سوچ رہی ہیں، چاند کی کرنوں کے سیلان سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے، بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا، اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی؛ سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے، تمام موجودات ہیں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں سستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آ جائے تو دنیا ہنس پڑے گی، اچھل پڑے گی۔

نسرین نوش جزیرے کے دامن میں، سمندر کے ریت پہ ایک سرد زریں کی طرح جو زمین پہ گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی، کہ موجوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، اور وہ نسرین نوش کے عریاں جسم، چاند جیسے عریاں جسم پہ، گردن پہ، بالوں میں سے گذرنے لگیں۔ ادھر سبیل قمر اس کے بدن پہ پڑ رہی تھی، ادھر چھوٹی چھوٹی موجیں ایک دوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اس سیمیں تن کے کبھی بالوں میں سے گذرتی تھیں، کبھی اس کے گورے بازوؤں سے لپٹتی تھیں، کبھی اس کے بلوریں سینہ سے ملابست کرتی تھیں، کبھی اس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں، اور اس کے بوسے لے کر آگے چلی جاتی تھیں، اور پھر لوٹ کر آتی تھیں اور قعرِ بحر سے موتی لا لا کر اس کے پاؤں پہ نثار کر کے نہایت تعظیم اور احترام کے ساتھ واپس جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پُر لطف تھکن سے، ایک بے ہوش نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہوئی۔ اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ اُن پہ نظر ڈالی، اور اپنے لعل۔ لبوں سے یوں تبسم گرا کے کہا: "میری پیٹھ ملو" اس پہ چند خادمہ تعمیلِ حکم میں مصروف ہوئیں

اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیا، چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں، انھوں نے اُس کے بازوؤں، سینے، اور پاؤں کو پُونچھنا اور بالوں کو سکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش اس شاہراہ زرّیں کو جو چاند نے اس تک بنا رکھی تھی دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سُننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف بحر کی بنی ہوئی نفیریاں، اور دف اور سارنگی اور ستار غرضکہ پورا سازنہ لئے ہوئے، نسرین نوش کے گرد اُڑنے اور ستار بجانے لگیں۔ نسرین نوش اُٹھ کھڑی ہوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے، اس رات کے لئے اُسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے، کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے پھولوں سے چھپے ہوئے راستے پہ نسیم کی طرح خرام ناز سے چلنا شروع کیا۔

اس وقت پھول جھک جھک کے سلام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے مل کر گویا تالیاں بجاتے، بنفشہ اُس کے پاؤں چومنے اور روندے جانے کی تمنّا سے راستہ میں آپڑتا تھا۔ نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوگی کہ ایک کاشانۂ بلّوریں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی کُل دیواروں، اور صحن کے فوّارے پر پڑتا تھا، اور اس فوّارہ نور سے ایک زمزمہ روح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے لیموں، نارنگی، ترنج کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے۔ یہ سب ایک دسترخوان پر بیٹھ گئیں، زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے لائے گئے، خرمے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں، لائی گئیں۔ لالے کے پیالوں میں، شراب، شربت، گلاب پیئے گئے۔

حوض کے دُوسری طرف، ناچنے والیوں، گانے والیوں، نے ایک حلقہ باندھا اور رباب، مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کی حسن و ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں، گانا بھی وہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

ادھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں، اور پھولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہوئی، اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں۔

لذیذ شراب کے نشہ سے، نسرین نوش ہنستی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی، اور اپنے ہونٹ چوس چوس کر نظر اس طرح دُور دُور ڈالنے لگی۔ گویا عالمِ خیال میں ہے۔ سہیلیاں، اپنی مالکہ کے ہاتھ چوم چوم کے، اس کی بالوں کی خوشبو سے دماغ معطّر کر کر شراب کا ایک ایک گھونٹ پیتی تھیں۔

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہوا۔

سازندہ پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک، نورانی ناچ ناچا گیا۔

وہ گلابی، چمپئی، دھانی ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں، وہ اس ناچ کے چکروں میں مل کر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی ہلکی پرواز کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں، کبھی دو ایک دوسرے سے ملیں کبھی علیحدہ ہو جائیں۔ کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گذر جائے کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جائے۔ اس ملنے، جُدا ہونے چکر کھانے سے رنگ اور نور کا انحلال اور اجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں سے آفتاب کی کرنیں گذر رہی ہوں۔ ان پریوں کا تھرک تھرک کے ملنا، پھر تتّر بتّر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحرِ سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمروں کا لچکے کھانا، جھک جھک کے دُہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس و بلیغ گتوں سے (جو سازندے پریاں بجا رہی تھیں) مل کر ایک ایسا نشہ آور منظر پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے، یا رقص

نغمہ ساز ہے، کیا ہو رہا ہے۔

نسرین نوش ان تمام تموّجات رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی، صبح خنداں کے زانو پر سر رکھے ہوئے ایک بے پرواہ، لااُبالیانہ نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں، کیونکہ اُس کی نگاہ کسی دُور نقطہ پر گڑی ہوئی تھی۔

یہ ٹیپ ٹاپ، یہ ناچ گانا، وہ رات دن دیکھتی تھی، اس لئے اُس کی رُوحِ خفتہ کو جگانے یا اُس کی دل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے۔

اس رات محل میں داخل ہونے کیا اس کا دل نہ چاہا۔ اس کی طبیعت میں چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کہ اُس کے عُریاں جسم سے جا کر لپٹ جائے۔ وہ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، سہیلیوں نے، اس کی طبیعت بہلانے کے لئے لطیفے، کہاوتیں، اپوجھ پہیلیاں کہنی شروع کیں، کہ چاند اور سورج میں کیسی دوستی ہے، شہد کی مکھیاں، پھولوں سے کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا کرتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اُن نورانی آنکھوں میں نیند آنی شروع ہوئی، اس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے، اُس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر، ہلکے بادلوں کے نیچے بھاگتے ہوئے چاند کو پیشِ نظر کر کے غرضکہ عجب عجب دھوکے دے دے کے، نیند اسکی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور اُن گھنی پلکوں کو ملا دیا۔

نسرین نوش کا نیند میں جانا تھا، کہ ناچ بند کر دیا گیا لطیفے پہیلیاں ختم ہو گئیں۔ نہ صرف یہ بلکہ فوّارے بند ہو گئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بند بیٹھی گا رہی تھی، چپ ہو گئی، ہوا کی سنسناہٹ بند ہو گئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے۔ تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں، دبے پاؤں علیحدہ ہو گئیں، گھونگھر و آہستہ آہستہ اُتار ڈالے گئے، اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں، اور نسرین نوش کے گرد اُڑنے لگیں، اُن کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ پریاں نسرین نوش کی نگہبان تھیں۔

دو تین منٹ کے بعد ایک بڑھیا درختوں میں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈال دی گئی تھی، اُسے چہرے پر سے ہٹا کر، غور سے دیکھنے لگی۔ اُس کے سوکھے چہرے پر آثارِ اطمینان ظاہر ہوئے اور "الحمد للہ" کہہ کے جیسی آئی تھی ویسی ہی غائب ہو گئی۔

یہ نسرین نوش کی ماں تھی۔ اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اس طرح ہر شام کو آ کر تحقیقات کرتی تھی۔ یہ معمّر عورت سوچا کرتی تھی کہ میرے بالوں کو سفید کرنے والے، میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں، اپنی اولاد کو میں ان مصیبتوں سے بچاؤں گی۔ اسی لئے میں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں۔ اُسے کھیل تماشے، دل بہلاوے، ہنسی، دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دوں گی، لیکن مرد کیا شے ہے، یہ نہ جاننے دوں گی۔ وہ فلاکت جس کا نام مرد ہے، اُسے اس کے قریب نہ آنے دوں گی، لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد آ جائے، بہر حال اس وقت تو میری کل تدبیریں مکمل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے۔

ماہتاب دھیما ہوتے ہوتے، غائب ہو گیا۔ مگر نسرین نوش کے جسمِ نازک کو طلوعِ آفتاب کے سپرد کر تا گیا۔ سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں، ہٹ گئیں، اور ان کی بجائے، سہیلیاں، اور گانے والیاں آ گئیں، جنہوں نے نرم و نازک آواز سے اُسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں گانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں، نسرین نوش نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی، اور اپنے پریشان بالوں کو سنوارتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھولوں کی ایک چوکی پر جا کر بیٹھ گئی، پریاں

بھی آکر اُس کے گرد جمع ہو گئیں۔

مشاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا۔ نسرین نوش نہر کے صاف پانی میں اپنے عکسِ جمال کو دیکھ رہی تھی۔ تیتریاں ایک دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اُڑ رہی تھیں، نہر کی روانی سے نرم صدا پیدا ہو رہی تھی۔ سہیلیوں نے پھر ہنسنا [illegible] شروع کیا [illegible] وہ پیارے باریک ہونٹ تبسم میں کھل کھل جاتے تھے۔

سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام، گل چکاں، زہرہ جبیں، ناز آفریں، مہ جبیں نور، بعضوں کے نام پھولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ، بعضوں کے پرندوں کے اوپر، مثلاً طاؤس خرام، کبک رفتار وغیرہ وغیرہ تھے، اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب ان کا لباس تھا۔

سنگار کے بعد، اس صبح کے لئے ایک خاص رنگ کا لباس پہن کر، نسرین نوش نیلوفر کے پتوں کی کشتی میں بیٹھ کر سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دُور تک نہر میں گئی، پھر یہ سب کنارے پر پہنچیں، جہاں بلور اور پھولوں کی ایک بگھی تیار کھڑی تھی، اس بگھی میں دو مادہ سیمرغ جُتی ہوئی تھیں، اور اس انتظار میں کہ ان کی مالکہ بگھی پر سوار ہو گی، آمادۂ روانگی کھڑی تھیں، جُوٹے رواں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسرین نوش گاڑی میں سوار ہوئی، اور جُوئے رواں کو اپنے پاس بٹھا کر "دیارگل" کو چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے سُنتے ہی، چند چھوٹی چھوٹی پریوں نے، جو چھوٹے چھوٹے بگل لئے کھڑی تھیں، کوچ کا بگل بجایا، اور اس تزک و احتشام کے ساتھ سواری روانہ ہوئی۔ سامنے طاؤس، کبوتر، قمریاں، طوطی، ناچتے، ہوا میں اُڑان بھرتے، اگاتے چہچہاتے اور طرح طرح کے تماشے کرتے جاتے تھے۔

سڑک پر پھول کی پتیاں، گلال، اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہوئے تھے، جو پہیّوں کے چلنے سے اُڑ اُڑ کر، گاڑی کے بلوریں پہیّوں میں، پرندوں کے پروں میں جم جاتے تھے، اور اس سارے قافلے پر قوس قزح کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

آفتاب، اُفق سے اپنے نورانی بادوں کو سنوارتا ہوا، کچھ اُونچا ہوا تھا کہ یہ قافلہ اس بلادۂ شعر و خیال میں جسے نسرین نوش نے "دیارگل" کہا تھا پہنچا۔ یہاں کی وادی حقیقتاً وادیٔ گل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں، تمام غنچے ایک دم کھل گئے، اور ان کی خوشبو نکل نکل کے، اُس کے جسم کو، کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چومنے لگی، نسرین نوش گاڑی سے اُتری، اتنے میں سہیلیاں، نوکرانیاں، اور سازندے وغیرہ بھی پہنچ گئے۔

اب نسرین نوش نے اس زمان و مکان لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ سہیلیاں، تعظیم اور احترام کے انداز سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اونچے درخت بھی اس ملکۂ ملاحت کے سامنے جُھک جُھک کر اس کی خدمت میں پھول پیش کر رہے تھے اور نسرین نوش اُن پھولوں کو اپنے اُن پیارے ہاتھوں سے (جن میں اور پھولوں میں صرف اس قدر فرق تھا، کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز نیم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ "انھیں توڑ لو"۔ زہرہ جبیں، گل چکاں کی گودان پھولوں سے بھر گئی۔ ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا جسے نسرین نوش نے پہنا، غرضکہ اس طرح، نسیم صبح کے ساتھ، اور نسیم صبح کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کے ایک اُونچے موقع پر پہنچیں، جو مطلع آفتاب کے مقابل تھا، نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب کی طرف جُھکی اور پھر سیدھی ہو گئی، بعد اپنے ہاتھ کو چوم کر گویا سورج کو ایک بوسہ بھیجا۔ یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا۔ اس بوسہ کے بھیجتے ہی، سہیلیاں ہنس ہنس کے، دوڑ دوڑ کے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے، بالوں میں پھول لگا لگا کے، ہاتھوں میں پھولوں کے پنکھے ہلا ہلا کے، نازک کمروں کو بل دے دے کر، آنکھوں کو شرارت سے پھرا پھرا کے، نسرین نوش کے گرد چکّر لگانے لگیں۔ پھر کھڑی ہو کر آفتاب کی شان میں گانے گانے لگیں۔ پھر ان سب نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر کبھی ہوا میں اُڑ کر، کبھی زمین پر پاؤں مار کے آفتاب کے لئے ایک مستانہ ناچ ناچا، اور ایک دلربا گانا گایا۔ اس گلبانگ رقص و آہنگ کی لطافت میں درخت بھی جھوم جھوم کے، نسیم آہستہ آہستہ چل کے شریک ہوئی۔ پھول، درخت، ہوا، سب حالتِ وجد میں آ گئے۔

نسرین نوش اس نشۂ شعر کی کیفیت سے لذت یاب معلوم ہوتی تھی اور اس آئینِ آفتاب پرستی میں دل سے شریک تھی۔ آخر میں اس کو ختم کیا لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ختم کرنے پر پوری طرح دل سے راضی نہیں تھیں، کیونکہ آئین ختم ہوتے ہی، درختوں کی شاخوں میں پھولوں کے بنے ہوئے جھولے ڈالے، اور اُڑ اُڑ کے ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر جانا، جھولنا، ہنسنا، اور کودنا اچھلنا شروع کیا، ایک مدت تک اس طریقہ سے وقت گزرا۔

آخر کار نسرین نوش پھر گاڑی پر سوار ہوئی، اور اُسی انتظام کے ساتھ واپس ہو کر کاشانۂ بلور میں جو دسترخوان کھانوں سے حاضر تھا اُس پر مع سہیلیوں کے بیٹھی۔

غرضکہ دن اس طرح گزرتے تھے۔ اکثر نسرین نوش صبح کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتی تھی، اور تیسرے پہر کو شکار کے لئے نکلتی تھی۔ نازک پیارے ہاتھوں میں تیر کمان لے کر کبھی کبھی مشق تیر اندازی کرتی تھی۔ کبھی غروبِ آفتاب کے قریب، ساحلِ بحر پر غسل کے لئے جاتی تھی، اور تیر اندازی کے بعد تھکن اُتارنے کے لئے، گلاب یا بنفشہ کا اُبٹنا مل کے، سمندر میں نہاتی تھی، رات کو سہیلیوں کو بُلا کے گانا، پہیلیاں کہانی وغیرہ سے دل بہلاتی تھی۔ کبھی کوئی بحث شروع ہو جاتی، اور یہ زمزمۂ مکالمہ کبھی پُر حدت ہو جاتا، گویا ایک منبع شفاف سے پانی گر رہا ہے، کبھی تیز اور بلند قہقہہ کی آواز آتی، گویا ساز زور سے بجا، کبھی آہستہ آہستہ باتیں ہوتے ہوتے خاموشی طاری ہو جاتی، گویا بادِ نسیم پھولوں میں ہلکے ہلکے چل کے رُک گئی۔ چاندنی رات ہوتی تو ایک دو سہیلیاں ساتھ لے کر سیر کو نکل جاتی، اس وقت نسرین نوش کا چلنا، اس نہر کے پانی کی مانند ہوتا تھا جو بلور کی زمین پر بہہ رہی ہو۔ اور جس کے پانی کو معطر نسیم جنبش دے رہی ہو، جس کے کنارے پھول کھلے ہوں اور بلبلیں اُڑ رہی ہوں۔

نسرین نوش پانچ برس کی تھی جب اس جزیرہ میں پہلے پہل آئی۔ تیرہ برس سے اسی طرح، خوشبوؤں میں، آرام میں، نازونعم میں، بےفکریوں میں، لاڈ اور پیار میں زندگی بسر کر رہی ہے، اور مجہول غیر مجسم خیالات میں مستغرق رہ کر، دن ہنسی کے ساتھ، اور رات متبسم خواب میں گزارتی ہے۔

لیکن ایک صبح خلافِ معمول اُس کے دل میں ایک جنبش محسوس ہوئی۔ اُٹھی، کاشانۂ بلور کے قریب جو نہر بہتی تھی اُس تک گئی، اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اُس میں بے حرکت پڑی رہی۔ پھر نکل کے اور بدن کو سکھا کے، سفید ریشمی بستر پر جا لیٹی۔

نسرین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی، اور وہ شام تک سوتی رہی یہاں تک کہ سورج ڈھلا، سورج کی شعاعیں اس پر آ کر پڑیں اور وہ جاگی۔ اس وقت اُس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی، ایک ایسے مبہم وجود کی آرزو کر رہی تھی جو اس کے بازوؤں کو پکڑے، کمر کو سنبھالے، اس کے جسم کو اُٹھائے۔ ایک غیر معنی تمنا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات، ایک وجود ہوئے، جو اس پر قادر ہو، جو اس پر حاوی ہو۔

اُس نے دیکھا کہ اُس کے پاس ایک سفید براق ہنس پھر رہا ہے۔ اُسے ہی اُس نے گود میں لے لیا، اور اُس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ اور اُس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا۔ اور اپنی تمام قوت سے اُسے بھینچنا شروع کیا۔ اور اس طرح پرندے کے نرم پروں میں، اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے، کچھ بند کئے، بدن کو جھکائے دیر تک بے حرکت پڑی رہی۔

نسرین نوش، ان خوشبوؤں سے، ان رنگوں سے، ان پھولوں سے، ان کھیل تماشوں سے، اُکتا گئی تھی اور ان سے چھٹکارا چاہتی تھی۔

اب پھولوں کا اس پر نثار ہونا، اس کی روح کو مشغول نہ کرتا تھا۔ ناچنے والیوں کے ناچ اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے

تھے، سہیلیوں کا اس کے بدن کو ملنا، اُسے آرام نہ دیتا تھا۔ وہ ایک شئے تلاش کرتی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا ہوگی یا نہ ہوگی، ایک مبہم چیز چاہتی تھی جو اسے دکھ دے، اُس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اُسے مسل ڈالے۔ ایک ایسی پُر قوت، پُر جرأت شئے کہ باوجود اس کے حسن و جمال کے، باوجود اس کے کہ وہ جزیرے کی ملکہ تھی، اُس سے نہ دبے، اُس کے رعب میں نہ آئے، بلکہ اُسے پکڑے، اُسے مارے، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

خارستان

تاڑ، برگد، سال، چیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں سوکھے پتوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اُٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر، سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی، ہر زندہ شئے، اس فریادکار ظلمت میں، تدارک غذا، وگذران زمان کے لئے کبھی شیرانہ جرأت سے کام لیتی تھی، اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اُٹھتی تھی۔

ساحل کے قریب جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، ایک تنہا موقع پر، ایک چٹان کے کنارے ایک مرد، غمگین بے حرکت، حالت میں شام کے وقت شام کے ستارہ پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ چہرہ کی سُرخی اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ رگوں میں پُر صحت خون دوڑ رہا ہے۔ کندھو تک لٹکے ہوئے بال گھنے اور چمکدار ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جسم کا نشو و نما جوش پر ہے۔

اس مرد نے انگڑائی لی، اور دُور سے ایک تبیر کی گرج کو مسکرا کے سُننا شروع کیا۔ ......

آریاؤں، اور ہندوستان کے قدیمی باشندوں کے قدیمی باشندوں سے بھی پہلے، ایک قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ اس قبیلہ کی بے تاب طبیعت نے ایک خاندان کو مجبور کیا، کہ جزیرۂ سرندیپ سے نقلِ مکان کر کے، اللہ توکل کسی نئے مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ لنکا میں زندگی کی دشواریاں کچھ قدیم انسان کی سیماب دار طبیعت، غرضکہ یہ سرندیپ میں بھی نہ ٹھہرے، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے تئیں بحرِ ناپیدا کنار کے سپرد کر دیا۔ سمندر کے طوفانوں نے بہت سی کشتیوں کو غرق کر ڈالا، صرف ایک کشتی جس میں رئیسِ قافلہ کا بیٹا خارا، اور سات آدمی اور تھے، جزیرۃ العرب کے جنوب غرب میں ایک خالی جزیرہ کے کنارے آ لگی۔ عورتیں کچھ تو سمندر میں ڈوب چکی تھیں، دو ایک جو بچی تھیں وہ مصائبِ سفر سے جانبر نہ ہوئیں۔ خارا کی عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ ان سات آدمیوں نے جو اس جزیرہ تک پہنچے تھے، اُس قسمت کی ضد پر جس نے اُنھیں اس جزیرے میں لا پھنسایا تھا، اور گذشتہ پُر لطف زندگی کی یادگار کے طور پر اس بچے کو نہایت چاؤ اور پیار سے پالا، کشتی میں جس قدر آلات و اسلحہ تھے، یہ لوگ انھیں لے کر نکلے تھے، اور سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ خارا کی حفاظت کے لئے زیر زمین غار نما ایک گھر بنایا اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں بھیڑیا، چیتا وغیرہ کوئی درندہ نہ گھس سکے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہر وقت خارا کی حفاظت کے لئے رہتا تھا، باقی صید و شکار کو نکل جاتے، شکار کا گوشت، اور بکریوں کا دودھ لا کر، اس بچے کو پالتے تھے۔ خارا نے پہلی بات جو سیکھی وہ اپنے تئیں درندہ حیوانوں سے بچانے کے لئے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ ابھی جزیرہ میں آئے چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن خارا کے محافظ کو بڑی مسرت کا دن نصیب ہوا یعنی غار کے سامنے سے ایک چڑیا اُڑ کر جا رہی تھی، خارا نے ایک پتھر کھینچ کے مارا، جس سے چڑیا زخمی ہو کر زمین پر آ پڑی۔ اس واقعہ پر بڑا جنگل میں منگل کیا گیا، اور ان ساتوں آدمیوں نے مل کر اپنے رئیس زادے کی شان میں گانے گائے۔

اب خارا ہر شئے کو جس پر اُس کا بس چلتا، توڑتا، پھوڑتا، مارتا اُکھاڑتا تھا، کسی چڑیا کا گھونسلا ہاتھ لگ جاتا تو اُسے توڑتا، انڈوں

کہ چھوڑتا، بچوں کا گلا مروڑتا تھا۔

ایک دن رکئی سال کے بعد) خارا نے پہلی دفعہ ایک بارہ سنگھا شکار کیا، ایک بڑا پتھر اس کے سر پر مارا جس کی ضرب سے بارہ سنگھا گر پڑا خارا اسے کھینچ کھینچ کر غار تک لایا، اور اپنے ساتھیوں کو فخر کی ادا سے دکھایا۔ اس دن ساتھیوں نے پھر عید منائی اور خوشیاں کیں۔ اس بارہ سنگھے کے سر کو غار کے منہ پر لٹکایا۔ خارا نے اس کی کھال سے جسے اس نے خود صاف کیا اور سکھایا تھا، اپنے لئے ایک لباس بنایا۔ یہاں ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے اور پتھریلی زمین، اونچی چٹانیں، خوفناک گھاٹیاں، اس جزیرے کی اجزائے ترکیبہ تھیں۔ جب کبھی آندھی اٹھتی تو جزیرے کے اونچے اونچے اور تناور درختوں میں سائیں سائیں کر کے شور مچاتی۔ کسی دن آندھی کی شدت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کے پتھر اڑا اڑ کر طغیانی انگیز سمندر میں گرتے تھے، اور جزیرے کے درندوں کا شور سمندر کے پرندوں کی چیخوں سے مل کر ایک محشر ہیجان پیدا کرتا تھا۔ اس وقت اس گوشۂ عافیت یعنی خارا کے غار میں ایک عمیق خوف طاری ہوتا تھا۔ خارا اور اس کے ساتھی، ایک دوسرے سے ملے ہوئے، ناامیدی، نفرین، اور ڈر کے ساتھ اس وحشی غلغلہ کو سنتے تھے اور کانپتے تھے۔

کسی رات موسلا دھار مینہ پڑتا، اور پانی ریلا کرتا ہوا، اس غار تک آتا، بجلی چمک چمک کے، تڑپ تڑپ کے، بادل گرج گرج کے اس جزیرے کو گھیر لیتے، قدرت کے اس شور و شغب میں، شیر کی ڈکار، ہاتھی کی چنگھاڑ، اور درندوں کی چیخ پکار قیامت برپا کر دیتی تھی، کبھی جزیرہ کی ایک طرف کوہ آتش فشاں آگ اگلتا، اور اپنے چاروں طرف ہر زندہ شئے کو جھلسا دیتا تھا۔

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔ یہ سات آدمی تدارک معیشت کے لئے صبح نکلتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے، مگر اس طرح کہ کانٹوں سے پاؤں زخم کھائے ہوئے، ہاتھ چھدے ہوئے، چہرے چھلے ہوئے، غار میں بیٹھ کر ان زخموں کو دھوتے، لیکن اس وقت ان زخموں کو دھونے، اور چہرے اور ہاتھوں کو روغن ملنے کے لئے، عورت کے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے ان میں کا ایک بڈھا آدمی، غار کے سامنے کے ایک پتھر پر بیٹھ جاتا اور سفید لٹوں کو ہلا ہلا کے، اور زخمی سینہ کو کھول کے، سمندر کی پرعناد اور ظالم موجوں کی طرف گھونسا تانتا، اور قسمت پر لعنت بھیجتا۔

خارا اس آفتاب کے تلے، اس کٹیلی پتھریلی زمین پر، ان درندے حیوانوں میں پلا تھا، اس کے ہاتھ سینکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے، سینہ پر ہزاروں مرتبہ کھرچیں لگی تھیں، چہرہ تمتما کے تانبہ ہو گیا تھا۔

خوفناک ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے، کبھی اس کے خون کا جوش اسے آدھی رات کو خواب سے بیدار کر کے باہر لے جاتا، اور ایک ساکن فی المنام شاعر کی طرح جو فضائے نامتناہی کی سیر کر رہا ہو، خارا بھی ایک چٹان پر بیٹھ کر خیالات میں غرق ہو جاتا، یہ ظاہر ہے کہ خیالات اس جزیرے اور خارا کی کل زندگی کی مناسبت سے پرحدت ہوتے تھے، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کبھی کبھی، نرم و نازک خیالات ایک سفید چھوٹی چڑیا کی طرح اس کے دماغ کے سامنے اڑتے نظر آتے تھے، اور کبھی اس کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اس طرح مجسم ہوتے تھے جیسے ہوا چل رہی ہو اور درختوں کا متحرک سایہ کانپ رہا ہو۔

خارا کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی، حسیات کا ہجوم تھا اور اکثر راتیں وہ کسی پہاڑی پر درختوں میں گزارتا۔

ایک شام کو غار میں آیا اور بستر پر جا پڑا، تین دن تک بخار میں بیہوش پڑا رہا۔ اس بخار کی حالت میں اس کی پیاس بجھانے کے لئے اور سوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے، اس کے ساتھی اسے جگا کر پانی دینا چاہتے تھے مگر وہ نہیں جاگتا تھا۔ اس وقت وہ بڈھا اپنے سوکھے ہاتھوں کو جن میں رگیں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں اٹھا اٹھا کے کہتا ”آہ! ایک عورت! ایک عورت“ اور پھر خارا

کی تیمارداری کرتا۔ آخر خارا نے آنکھیں کھولیں اور اس کی حالت بہتر ہونی شروع ہوئی، تاہم نقاہت باقی تھی، ایک شام، یہ ہمراہی خارا کے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے تھے، کہ بڈھے نے ایک پرانا راگ جسے وہ بھول نہیں گیا تھا، گنگنانا شروع کیا:۔

" جینا تو ایک نیند ہے پیارے، پریم ہے اُس کا سپنا "

خارا نے پوچھا:۔

" جینا کیا چیز ہے "؟

بڈھے نے جواب دیا " پریم "

" پریم کیا ہے "؟

" عورت "

اس طرح خارا سوال، اور بڈھا توضیح کرتا تھا۔ غرضکہ نوجوان کو معلوم ہوا کہ زندگی میں کانٹے اور پتھر ہی نہیں ہیں، بلکہ پھول اور خوشبوئیں بھی ہیں، چیرنا، پھاڑنا ہی نہیں، بلکہ ملنا اور گلے لگانا بھی ہے۔

اس کے بعد یہ نوجوان اپنے ہمراہیوں سے اکثر علیحدہ رہتا، اور اکثر سوچا کرتا، دن میں اسے اکثر کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی تنہا جگہ پر نکل جاتا، اور وہاں ایک مرمر کے ٹکڑے کو لے کر، بڈھے کی بیان کی ہوئی تصویر کے موافق ایک مورت بنانا شروع کرتا جس کی پوری شکل اس کے خیال خانۂ دماغ میں پھرتی ہوتی تھی۔ پہلے سر بنایا، پھر سینہ تراشا، پھر ہاتھ نکالے۔ اس جزیرے کی چٹانوں میں اور سمندر کے کنارے زمرد، الماس، لعل، یاقوت وغیرہ چمکدار اور رنگین پتھروں کی بہت کثرت تھی۔ خارا نے انھیں جمع کر کے، اس کی مورت کی آنکھ سفید اور سیاہ الماس سے، دانت موتی سے ہونٹ لعل و یاقوت سے بنائے۔ ایک برس کامل اس شغل میں، بڑی حرص اور بڑے شوق سے مشغول رہا۔ ایک دن ہمراہیوں نے آ کر اسے دیکھا اور بہت تعجب کیا، لیکن بڈھا ہنسا اور کہنے لگا: "اچھی ہے مگر حقیقت سے بہت دور ہے"۔ تاہم خارا کے لئے یہ مورت ایک بدیعہ خیالی تھی۔ اس نوجوان نے اپنے حسیات کی تمام قوت اس مرمر میں صرف کی تھی۔ صبح سے شام تک نظر اس مورت پہ گاڑے رہتا اور اس درجہ مستغرق ہوتا کہ ہمراہی کھانے کے وقت آ کر اسے جبراً وہاں سے لے جاتے، اور اس وقت بھی خارا مورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور پرشوق نظریں اس پہ ڈالتا۔

اس طرح مہینے گذر گئے۔ خارا، پتھر اور سیپیں جمع کرتا تھا، اور اپنے خواب، اور خیالوں کی تصویریں ان پتھروں سے بنانا چاہتا تھا لیکن اُسے خوف تھا تو صرف اس بات کا کہ بڈھے کے اعتراض اور استہزا سے یہ بچیں گی یا نہیں کبھی کبھی ایک مورت بناتا، وہ ٹھیک نہ ہوتی، اُسے توڑ دیتا، دوسری شروع کرتا۔ کبھی دوڑا دوڑا، بڈھے کے پاس آتا اور اس سے سوال کرتا: "پھر بتاؤ، عورت کیا ہوتی ہے، کیسی ہوتی ہے؟" بڈھا دواں بادلوں پر اپنی نظر گاڑ کر، اس کے سوال کا جواب دیتا، اور کہتا "عورت! عورت آدھا میوہ، آدھا پھول ہے" پھر چپ ہو جاتا اور رونے لگتا، خارا گھنٹوں اس بڈھے کی آنکھوں پر سوالی کی نظر ڈالے ہوئے، اس کی باتوں کو سنتا تھا اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڈھا اٹھ کر، خارا کو لے کر، جنگل میں ایک طرف جاتا، اور کسی تاڑ کے نیچے دو جڑواں، اپنی گردن، ایک دوسرے سے ملائے کھڑے ہوئے انھیں دکھاتا اور کہتا: "دیکھتے ہو، سمجھتے ہو؟ بس"!

خارا کچھ نہ سمجھتا، اور پھر سوالی آمیز نظروں سے بڈھے کے چہرے کو دیکھتا، خارا نے کئی مورتیں تراشیں اس میں وہ بغیر اُستاد کے محض اپنی طبیعت کے زور سے ماہر ہو گیا، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اُس نے خود ہی یہ فن ایجاد کیا۔ اس کی حاصلِ عمر، یہ مورتیں تھیں، اور وہ ان سے بیحد محبت کرتا تھا، محبت ہی نہیں پرستش کرتا تھا۔ یہ مقام گویا، اس کا معبد تھا۔ مبارزۂ حیات سے تھک کر، یہاں آتا، اور گھنٹوں مبہوت

نظروں سے ان مورتوں کو دیکھا کرتا، اور سوچا کرتا کاش یہ مورتیں سمندر پار کی حقیقت سے خبردار کریں، اور بتائیں کہ اس پُرطوفان سمندر کے اُس طرف، ان مورتوں جیسی نر مادہ مخلوق ہے کہ نہیں۔ کبھی اپنے خیالات کے تخیّل کرنے سے عاجز ہو جاتا، تو غصّہ میں آ کے، ایک سباعانہ وحشت سے، کسی مورت کو توڑ ڈالتا پھر رنج کرتا اور نکل کھڑا ہوتا، اور جو جانور ملتا، اُسے بعنوانِ انتقام مار ڈالتا۔

رات کا وقت تھا، گھنے درختوں میں، خارا چیتے کی کھال بچھائے بیٹھا تھا کہ اتنے میں پاؤں کی خفیف آہٹ سُنائی دی، تھوڑی دیر میں آہٹ زیادہ واضح ہوئی۔ اُس نے سر پھرایا تو دیکھا کہ ایک بارہ سنگھا آ رہا ہے، اتنے میں ایک لومڑی نکلی، بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر لومڑی کو اُٹھا کے پھینک دیا۔ یہ بارہ سنگھے کی شوخی، اور کلیل تھی۔ لیکن یہ شوخی اور کلیلیں بہت دیر تک نہ رہی کیونکہ ایک تیندوا بارہ سنگھے پر لپکا، بارہ سنگھے نے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا شروع کیا۔ خارا، نہایت شوق سے اس گیر و دار اور بھاگ دوڑ کو دیکھ رہا تھا۔ بارہ سنگھا اپنی تمام قوت سے دوڑ رہا تھا، یہاں تک کہ تھک کر اس کی رفتار میں سُستی معلوم ہوئی، پسینہ میں شرابور ہو گیا اور ہانپنے لگا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اُسے اپنی جان کی سلامتی کی اُمید نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر، تیندوا بارہ سنگھے تک پہنچ گیا اور اُسے دبوچ لیا۔ خارا تعجب کر رہا تھا کہ بارہ سنگھا بہت جلد مغلوب ہو گیا، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کو کسی طرح مدد پہنچائے کہ اتنے میں ایک گرج سُنائی دی اور ایک بڑا سایہ جھپٹتا نظر آیا، سر پھرایا تو گیا دیکھتا ہے کہ یکّہ تازِ میدانِ شجاعت، بادشاہِ بیابانِ وحشت یعنی شیر چلا آ رہا ہے۔

شیر نے، تیندوے اور بارہ سنگھے پر، ایک پُرغیظ و غضب نظر ڈالی، اور پھر ایک پُرہول ڈکار کے ساتھ پھلانگ مارتا نظر آیا، تیندوا پہلے تو باوجود اپنی تھکن اور ضعف کے، ہر چند بادا باد آمادۂ مقاومت معلوم ہوتا تھا، لیکن شیر کی زہرہ ریز گرج نے جو اُس نے اپنی تمام قوّت سے کی تھی، تیندوے کے حواس باختہ کر دیئے، اور وہ مجبور اور منفعل، کانپتا ہوا، اپنا شکار اور اپنی نخوت شیر کے لئے چھوڑ گیا۔ تھوڑی دیر تو تیندوے نے آثارِ غصّہ ظاہر کئے تھے اور اُس کی طرف گھور کے دیکھا تھا، لیکن شیر کی آتش ریز آنکھوں سے کون آنکھیں ملا سکتا تھا۔ ان آنکھوں کا دو چار ہونا تھا، اور گرج کا نکلنا تھا کہ تیندوے نے ہار مان لی۔ شیر نے، بارہ سنگھے کے جسم پر اپنے پنجے گاڑ کر، اُسے ٹکڑے کرنا شروع کئے۔ خارا جو اس سے پہلے بارہ سنگھے اور تیندوے کی کشمکش بے پروائی اور بغیر خوف کے دیکھ رہا تھا، اب ذرا سنبھل بیٹھا۔ اُس کے دل میں خوف اب بھی نہ تھا، لیکن ذرا احتیاط سے بیٹھا ہوا تھا۔

اب شیر لپ لپ کر کے خون پی رہا ہے، ہڈیوں کو چبا رہا ہے۔ اور جھوم رہا ہے۔ غلبہ اور کامیابی کے نشہ میں، اپنی دُم دائیں اور بائیں مار رہا ہے۔ اور اس پُرلطف ضیافت کو کھاتے وقت مزے میں آ آ کر کبھی اپنا سر اُٹھا کے اُوپر کو دیکھتا ہے۔

ایک دفعہ اُس نے اپنی دُم اُٹھا کے، اور اپنے اگلے پاؤں، بارہ سنگھے کے مُردہ جسم سے ہٹا کے نظرِ تفتیش سے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر اُس کے سر اور اُن ہڈیوں کو جن پر ابھی گوشت باقی تھا، چبانے کے لئے وہاں سے گھسیٹ کر لے جانا شروع کیا، اتنے میں شیر کی نظر خارا پر پڑی، اور اس زبردست خونخوار طاقتور مخلوق کی آنکھیں، اس جزیرے کے جوان انسان سے دو چار ہوئیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے، خارا اس احتشام مجسّم یعنی شیر کو، اس کی ہیبت اور طاقت سے متاثر ہو کر دیکھ رہا تھا، اور اس غالب مغرور کی دل میں عزّت کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت جبکہ شیر اس کے سامنے تھا، اس وقت ایک قدرتی جوش مقابلہ سے وہ اس کی طرف بڑھا، شیر بھی جاتے جاتے رُک گیا، اور شاخوں اور پتّوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دباتا، توڑتا، اور کھڑ بڑ کرتا ہوا خارا کی طرف چلا۔ غرضکہ لڑائی کی ٹھن گئی، اور خارا نے شیر کے بائیں طرف سے اُس پر حملہ کرنے کی ٹھہرا لی۔

شیر نے سر اُٹھا کر پھر اُسے دیکھا، اور اس پر کودنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سیکنڈ رائگاں نہ کر کے، کمان کو پوری طاقت سے کھینچ تیر چھوڑا۔ تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اُس کی طرف گیا اور گردن میں گھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی خارا نے اپنی ڈھال سنبھال کے

اور ایک ہولناک "ہائے" کا نعرہ مار کے بائیں طرف پھرتی سے پھر کر، اپنا گرز شیر کی گدی میں (جو چھلانگ مار کر اس پر چھا گیا تھا) مارا۔ پھرتی اور طاقت خارا کے جسم میں بچپن سے ایسے مشاغل میں رہنے کی وجہ سے ہم جیسے آدمیوں کی نہ تھی، پس اس نے ادھر اپنی تمام قوت بازو سے گرز مارا، اور ادھر اپنی کمر سے برچھی نکال کے، اب مارے غصے کے دیوانہ شیر کے پیٹ میں پوری گھسیڑ دی، اس دفعہ، اس درندہ جانور نے پیچ کھا کے، خارا کے بائیں بازو کو پکڑنا چاہا، لیکن اس کے منہ میں خارا کی ڈھال جو وہ بائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھا آ گئی، اور شیر نے شدت غضب اور درد میں اسی کو چبانا شروع کیا، لیکن اس عرصہ میں بیحد خون شیر کے جسم سے نکل چکا تھا، اور اس پر ضعف طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خارا نے ایک دفعہ پھر پہلے کی طرح نعرہ مار کے، اور پہلی جیسی قوت سے برچھی کو گھسا دیا، آخرکار، شیر اپنی غرور جنسی کے باوجود، زمین پر آ رہا۔ لیکن نوجوان نے اس گرنے کو اور اس مغلوبیت کو حیلہ تصور کیا، اور برچھیوں پہ برچھیوں کے وار کرتا رہا۔

مگر اب شیر کی زرد، بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، پنجے پھیلے تھے، منہ بغیر نفس کے کشادہ تھا جس میں سے اس کے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے، جو خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ یہ وہی شیر تھا جس کی مہیب آواز اندھیری راتوں میں ہر جاندار کو کنپا رہی تھی، وہی شیر اب اس کے پاؤں کے تلے مسکین حالت میں پڑا ہوا تھا۔ یہ خیال خارا کے دل میں گذرا، تو اس کا سینہ ایک شیریں غرور جلاوت سے ابھرا، اور وہ ایک خودکام نمائش کے ساتھ، اپنی تیر و کمان، ڈھال، برچھی اور گرز کو ایک جگہ رکھ کے نہایت فخر کی ادا سے شیر پہ بیٹھ گیا، اور متخیل اور متفکر نظروں سے مشرق میں آہستہ آہستہ ابھرتے ہوئے نور پاش ماہتاب کو دیکھنے لگا۔

رات کی سیاہ پلکیں کھلنے کے بعد، صبح کا رنگین نور، آسمان میں ادھر ادھر سنہری تیر پھینک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تیر، تیز اور پر حدت ہونے شروع ہوئے۔ اور نوجوان کی آنکھیں صبح کے وقت، اور موقع اور گذشتہ واقع کی یاد سے پر نور، اور اس کا دل، دور سے دکھائی دینے والے سمندر کے شور کو سن سن کر، ذوقِ حیات سے متلذذ ہو رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ نہایت پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ، رنگوں میں لپٹی ہوئی ایک شے صبح کے ایک مجسم ٹکڑے کی طرح، ہوا میں تیرتی ہوئی، خارا سے کچھ دور زمین پر آ رہی۔ تھوڑی دیر میں، وہاں پہلے تو مشکوک اور مبہم اور پھر عیاں اور واضح ایک شکل لطیف پیدا ہوئی۔

خارا کا رفیق بڈھا، جب کبھی نہایت تھک جاتا، یا کسی اضطراب میں ہوتا، یا اور کسی تکلیف سے بیتاب ہو کر، "عورت..... عورت، عورت" کہہ کہہ کے آہیں بھرا کرتا تھا اور خارا پوچھتا تو بیان کرتا کہ وہ کیا شے ہے۔ غرضکہ یہ نازک شے، اس بڈھے کی بیان کی ہوئی چیز سے بہت ملتی تھی۔ اور اس مورت سے، (جسے اس نے بڈھے کی تعریف کے مطابق، پتھر سے تراش کے بنائی تھی) بہت مشابہ تھی۔ اس کو دیکھ کر نوجوان کا دل ایک عجیب پر شوق رقت سے کانپنے لگا۔ اور اس نے اس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اور سوچنے لگا کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کے اس سے جا ملے، اسے پکڑے۔ لیکن اس سے شیر کی طرح لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا، بلکہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شکار جو اس قدر رنگوں میں، اس قدر محبت آمیز اختشام، اور ایسی نرماہٹ کے ساتھ زمین پر آیا ہے، اس شکار کو آہستہ آہستہ جا کے نہایت ہلکے سے چھوئے، اور اسے خوف نہ دلائے، بلکہ پھسلا پھسلا کے، چمکار چمکار کے پکڑے۔ سوچا کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اور یہ سوچ کے، سب آلات حرب ایک طرف رکھ دیئے، اور دبے پاؤں اس کی طرف چلنا شروع کیا۔ دو قدم نہ رکھے ہوں گے کہ جیسے نسیم کسی چھوٹے پودے کو ہلاتی ہے، یہ خیال دلفریب بھی جنبش کھا کے بادلوں کی طرف ہٹنے اور خارا سے دور ہونے لگا۔ اور ایک منٹ کے بعد، زمین پر چٹان کے ٹکڑوں اور پتھر کے روڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عمر میں یہ پہلی دفعہ تھی کہ خارا رو دیا۔ غار کو نہایت رنجیدہ حالت میں واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری سرگذشت سنائی۔ ساتھیوں میں سے بعض کہنے لگے "یہ خیال تھا" اور بعضوں نے کہا: "نہیں، تم نے خواب دیکھا ہے"۔

شیرازہ

ہر طرف کانٹے، ہر طرف پتھر تھے۔ اب خارا سوچا کرتا تھا کہ کیا ان پتھروں اور کانٹوں سے رہائی ممکن ہے کہ نہیں، کیا اُس زخم کا چارا جو اُس کے دل میں ہے کوئی علاج ہے کہ نہیں۔ دوسرے اُفقوں کو کشف کرنے، نئے شکار، شکار کرنے، اس کے قعرِ جان میں جو خالی خالی ایک کونا محسوس ہوتا تھا، اسے بھرنے اُس کے دل میں جو ایک نامعلوم کمی تھی اُسے پورا کرنے کی آرزو، اُسے پاگل کئے ہوئے تھی۔

وہ بیمار نہ تھا۔ کھانا پہلے کی طرح کھاتا ہے، بھوک کھل کے لگتی ہے، درندوں کا شکار پہلی طاقت و قوت سے کرتا ہے، زندہ رہنے کی خواہش قائم ہے، ہر لڑائی اور مقابلہ میں جیتنے کی خواہش باقی ہے۔ پھر یہ ہر جگہ اور ہر وقت جو کمی اُسے محسوس ہوتی ہے، یہ کیوں؟ یہ کس لئے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا، اُسے سمجھنا چاہتا ہے؟ لیکن اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔

جب یہ لوگ جزیرہ میں آئے تھے، اُس وقت سے اس وقت تک یہاں سے چھٹکارا پانے کے خواب تو بہت دیکھے، لیکن سمندر میں پہلی دفعہ مصیبت اُٹھانے کے بعد کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ پھر اُس طوفان خیز بے رحم، کس ناشناس موجوں کو اپنی جان سپرد کر دے، پس سوائے اس کے کہ اس شکستہ کشتی کی تقلید میں جو انھیں اس جزیرے تک لے آئی تھی، ایک کشتی بنائیں، اس خانہ ویران قافلے نے اور کچھ نہ کیا۔ ہاں کبھی کبھی ساحل کے قریب خارا کو لے کر وہ ایک کشتی چلا کے مچھلیاں پکڑ لایا کرتے تھے۔

ایک رات جبکہ چاندنی کھلی ہوئی تھی، اور جزیرے میں خاموشی طاری تھی، خارا آلاتِ حرب، اور بہت سا خورد و نوش کا سامان لے کے، جزیرہ خارستان کو "خدا حافظ" کہہ، کشتی میں بیٹھ سمندر سے مقابلہ کے لئے چپکے سے نکل کھڑا ہوا۔

اور اپنے دل میں کہنے لگا "موت؟ آخر کیوں؟ کس لئے؟ کوئی وجہ نہیں، ہر چہ بادا باد، اس یکساں زندگی سے تو نجات ملے گی"، یہ کہہ کے کبھی کشتی کھیتا، کبھی چھوڑ دیتا کہ کشتی اپنے آپ چلے۔ پو پھٹتے ہی اُس کی آنکھوں کو جو رات کی بے خوابی سے بے تاب، اور مخمور تھیں، دور بہت، بہت دور ایک نقطہ سا نظر آیا۔ اور خارا نے یہ اُمید کر کے کہ شاید یہ وہی ارضِ موعود ہے جس کے لئے اس کا دل و جان بیتاب ہے، خوشی خوشی کشتی کو اس کی طرف لے جانا شروع کیا، اور شام تک اپنی پوری کوشش اس میں صرف کرتا رہا، وہ اس قدر محو تھا کہ اُسے نہ معلوم ہوا کہ تھکن کیا چیز ہے، نیند کیا شے ہے، بلکہ اپنے آپ اس کی طبیعت نے ایک گانا بنایا جسے وہ شوق سے گاتا رہا۔

"سُنتا ہوں نگری نیکی ہے، اور سُندر ہے سنسار
نا ؤ تو سپیہ پار، نیا تو لگیو پار"

رات آدھی گذر چکی ہو گی، کہ یکایک ایک بلبل کی نرم و نازک و شیریں آواز جسے عمر بھر میں اُس نے کبھی نہ سُنا تھا اُس کے کانوں میں آئی اس آواز کے نشہ سے مست ہو کر اس نے کشتی چلانی بند کر دی، اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اُسے سُننا شروع کیا۔ زمردیں ٹیلوں سے، بوئے گل، اور نوائے بلبل، نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ساحل تک آ رہی تھی اور مستی اور خوشی پھیلا رہی تھی۔

اگرچہ چاندنی رات تھی، لیکن آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے، چاروں طرف کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں۔ خارا اس خفیف تاریکی میں اس غیر معمولی حالت میں، اس راحتِ روح نغمہ و خوشبو کو بچّوں کی طرح ہمک کے لینا چاہتا تھا، لیکن ان سب سے مست ہو کر آنکھیں اور ہونٹ کھولے، سر نیچے کو ڈالے کشتی میں پڑا تھا۔ اس کے کان جو درندے حیوان کی پُرہول آوازوں سے آشنا تھے، اب بلبل کا ترانہ سُن رہے تھے، اس کا جسم جو کانٹوں اور پتھروں سے چھدا، اور چھلا کرتا تھا، پھولوں کی خوشبوئیں اُس جسم کو آ آ کر لپٹ رہی تھیں۔ اور اس پر ایک پُر لطف اور اشتیاق انگیز سستی طاری ہو رہی تھی۔ خارا اس قدر دلشاد تھا اور ایسا لطف اُٹھا رہا تھا کہ اس خوف سے کہ اس میں خلل نہ پڑ جائے،

کشتی میں ذرا نہ ہلتا تھا۔

جس وقت صبح ہوئی، اور گردو نہ گلگد نہ آفتاب، اپنے مطلع احتشام سے نکل کر آہستہ آہستہ اوپر کو بڑھا، اس وقت درختوں کے سبز پتے اور رنگ رنگ کے پھول چمک اٹھے، اور پتوں پہ قطرات شبنم موتی بن گئے۔ خارا اس سے بے خبر کہ کہاں آیا ہوں، اور اس سے غافل کہ کیا دیکھ رہا ہوں، متحیر نظریں چاروں طرف ڈال رہا تھا۔ اتنے میں درختوں کے پیچھے سے ایک گرد باد اٹھتی، اور قہقہہ اور زمزمہ کے ساتھ خارا کی طرف بڑھتی نظر آئی۔

نوجوان خارا، جو اب تک نہیں جانتا تھا کہ ڈر کیا چیز ہے، اس وقت ایک خلجان اور گھبراہٹ سے کانپنے لگا، اور ہر احتمال کے مقابلہ کے لئے تیاری کرنے لگا۔

پھر صد رنگ وسحاب، آہستہ آہستہ خارا جہاں کھڑا تھا، اس سے کچھ فاصلہ پہ سمندر کے کنارے آکر رک گئی، اور جب خاک چھٹی، تو اس میں سے ایک جسم متحد ظاہر ہوا۔ خارا پہلی نظر میں نہ سمجھ سکا کہ آیا آفتاب زمین پہ اتر آیا ہے، یا میں آسمان پہ ہوں۔ یہ سوچے بغیر کہ کیا کرنا چاہیئے، وہ اپنی کشتی سے نکلا، اور حسب معمول، "اسی ہاؤ" کے ساتھ اس نے اس پہ حملہ کیا، کہ یکایک ایک تیر نے سامنے سے آکر خارا کو زخمی کر دیا۔

نسرین نوش اپنا دل بہلانے کے لئے، اکثر اپنی ماں سے اجازت لے کر شکار کو نکلا کرتی تھی، اس صبح کو، اپنی سہیلیاں پیچھے چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل گئی تھی، اور آخر کار تھک کر ساحل تک شکار اور غسل کے لئے آئی تھی۔

خارا جیسے مجہول، اور غیر معلوم شکار کو دیکھ کر، اس نے فوراً اس پہ تیر چھوڑا تھا جس سے یہ شکار زخمی تو ہوا، لیکن نسرین نوش نے دیکھا کہ زخم کھا کے وہ اس کی طرف جھپٹا، اور قبل اس کے کہ دوسرا تیر چھوڑے، اس نے اپنے تئیں شکار کی آغوش میں پایا۔ اور شکار اور شکار کرنے والی کی نظریں، ایک آتش رنبہ حرارت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں۔ نسرین نوش سمجھتی تھی خارا کوئی نیا شکار ہے، خارا سمجھتا تھا نسرین نوش کوئی شکار کرنے والی چڑیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی، اور کیا سبب تھا، ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کیوں ان کی نظروں میں ایک دوسرے کے لئے کشش تھی۔ دونوں کے دلوں میں گھبراہٹ تھی، جانے کیسے، خارا کی فریاد سے نسرین نوش، اور نسرین نوش کی پرُ خلجان مسکراہٹ سے خارا نے سمجھ لیا کہ ہم ہمجنس ہیں۔ نسرین نوش کا نرم ریشمیں لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہوئے تھا پھنس گیا، دونوں نے اسے چھڑانا چاہا مگر دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک کا ہاتھ، دوسرے کے ہاتھ میں ہے، اور ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو محبت سے دبا رہا ہے۔

خارا نے اپنے اوپر جونگاہ ڈالی تو دیکھا کہ تیر کے زخم سے خون نکل رہا ہے، کچھ اس تردد سے کچھ نہ معلوم کیوں، خارا نے اپنے کل ہتھیار زمین پہ ڈال دیئے۔ نسرین نوش کے ہاتھ سے بھی حیرت کی وجہ سے تیر گر پڑے۔ اب ان دونوں میں اپنے آپ ایک بے تکلف، بے مراسم، مگر اسرار انگیز آمیزش نہانی پیدا ہو گئی۔ نسرین نوش اس سے پوچھ رہی تھی: "تو کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے" اور خارا اشاروں سے سمجھا رہا تھا: "دور سے آیا ہوں، کانٹوں سے، پتھروں سے آرہا ہوں" ہاتھوں کے ملنے سے، نوجوان خارا کے جسم میں ایک عجیب برقی حرارت سرایت کر گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا۔ ادھر خون نکلنے کی وجہ سے، اس کے چہرہ کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

نسرین نوش نے آہستہ آہستہ تیر، خارا کے پہلو سے نکالا۔ خون کو اپنے کپڑے سے پونچھا، اور زخم دھویا، پھر جا کے قریب سے چند پتے لاکے زخم پہ باندھے۔ انھیں باندھتے وقت، نسرین نوش جب خارا پر جھکی تو ایک مرتبہ پھر ان دونوں کی نظریں، نظر بن گیا، ان دونوں کی توجہ، ایک مبہم شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملیں، اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں سے ایک جاں فروز چمک، ایک دل سوز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب، کائنات پہ کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے؟

بس بالکل اسی طرح، ان دو بیگانہ روح آشنا کے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک شوق کے ساتھ، ایک دوسرے سے ملے۔

یہ جزیرہ گو، بے انتہا خوبصورت تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے، اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا، کہ جزیرے کے پرند، چہچہا کر اڑنے لگے، تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں۔ ایک گرد آہنگ و رنگ، ایک زمزمۂ جوش و خروش نے کل جزیرے کو گھیر لیا۔ اس وقت دونوں، (خارا و نسرین نوش) مدہوش و بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ خارا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی، جو اس نے تمام عمر میں اب تک محسوس نہیں کی تھی۔ اور اس نشہ کی لذت سے، اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں، آغوش کھلی ہوئی تھی، سینہ سانس کی وجہ سے ابھر رہا تھا اور دل ایک ننھی چڑیا کی اڑان کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔

پہلے نسرین نوش ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر، جہاں خارا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا تھا، یہ کیا؟ اس نے سوچا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ، جب وہ سو نہیں رہی تھی، بلکہ آنکھیں بند کئے تھی، اور اس کی ماں حسب معمول اسے دیکھنے آئی تھی، تو اس نے کہا تھا: "خدا نہ کرے، مجھے خبر ہوئے بغیر، یہاں کوئی مرد آئے، لیکن اگر آیا تو مجھے معلوم ہو جائے گا، کیونکہ اگر اس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا، تو بوسہ کی جگہ پھول کھلیں گے اور اس سے مجھے پتہ لگ جائے گا۔" ماں کی یہ تقریر جب نسرین نوش کو یاد آئی، تو وہ گھبرائی، ایں یہ تو مرد ہے! یہ وہ چیز ہے جس سے میری ماں مجھے بچانا چاہتی تھی، اب کیا کروں؟ یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ بڑی برائی ہوئی، مگر برائی کہتے وقت دل کہتا تھا: "اگر برائی ہے، تو شیریں اور پرلطف برائی ہے۔"

اب نسرین نوش ہزار طرح سے خارا کو سمجھانا چاہتی ہے، کہ ماں آئے گی تو تجھ پہ بہت خفا ہو گی، جا، جہاں سے آیا ہے، وہاں بھاگ جا۔ لیکن خارا، نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر عاجز ہو کر نسرین نوش رونے لگی، اور آنسو اس کے سرخ رخساروں سے ڈھلک کے، زمین پر گرنے لگے۔ یہ آنسو گرتے ہی، موتی بن جاتے تھے۔

خارا اس رونے سے بھی کچھ نہ سمجھا، بلکہ پہلی لذت کا جو اثر دماغ میں بسا ہوا تھا، اس سے متاثر ہو کر، پہلے جوش و اشتیاق کے ساتھ نسرین نوش کو آغوش میں لے کر، ان رونے والی، آنسوؤں سے تر آنکھوں کو چومنے لگا۔ اور جب نسرین نوش نے اپنے ہاتھوں سے، اسے اپنے پاس سے ہٹانا چاہا، تو خارا نے، ہاتھوں ہی کو پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔

نسرین نوش، اس وحشی مگر فسوں کار، سودا زدہ مرد کی آغوش سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہی تھی، کہ دور سے، اس کی ماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ماں، جو مرد کو سب سے بڑی مصیبت خیال کرتی تھی، وہ ماں، جو رات دن اسی دھن میں رہتی تھی کہ مرد کا گذر اس جزیرے میں نہ ہو، اب مرد کے روبرو تھی، اس کشمکش میں، اور نیز اپنی ماں کو آتا دیکھ کر، نسرین نوش، گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے بیہوش ہو گئی۔ خارا نہیں جانتا تھا، کہ بیہوش ہونا کیا چیز ہے، اس لئے اس نے اس بے ہوشی کو ایک ادائے تسلیمیت خیال کیا، اور نسرین نوش کے پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں سے لے کر، پاؤں تک لگاتار بوسے لینے شروع کر دیئے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں بوسے لئے تھے، وہاں پھول کھل گئے، یہاں تک کہ نسرین نوش کے جسم پر کوئی جگہ خالی باقی نہ تھی جہاں پھول نہ کھلے ہوں۔ (نسرین نوش کی ماں کے خارا تک پہنچتے پہنچتے نسرین نوش ایک گلدستۂ لطیف بن گئی۔

بڑھیا، اپنی بھویں اٹھا اٹھا کے، خارا سے، اس جزیرے میں آنے کا سبب پوچھتی تھی، مگر خارا نہ سمجھتا تھا، نہ سمجھنا چاہتا تھا بس اپنے ہاتھوں میں کے گلدستے کو دکھاتا تھا، اور اپنی آغوش میں لے کر بھینچتا تھا، بڑھیا نے خیال کیا کہ "بہتر یہی ہے کہ اسے جزیرے سے نکال دوں، کیونکہ میں اس کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی۔" یہ سوچ کے اس نے اپنی جریب سے اشارہ کیا "جا، اس جزیرے سے نکل جا۔"

خارا فوراً گلدستے کو اپنی گود میں اُٹھا کر، کشتی میں جا بیٹھا۔ نسرین نوش اب تک بے ہوش تھی۔ اس دفعہ ہوا، اور موجوں نے خارا کی کشتی کی مدد کی، اور وہ بہت جلد جزیرہ خارستان کو پہنچ گیا، جزیرے کے کنارے، اس کے تمام ساتھی، پریشان، مضطرب، منتظر بیٹھے تھے۔ خارا، اپنے مالِ غنیمت، یعنی اس گلدستۂ روح و راحت کو لے کر کنارہ پہ آیا، تو اس کے تمام ساتھیوں نے جو مدّت سے ان پھولوں کی خوشبو سے محروم تھے بہ کمالِ احترام، اس گلدستہ کی خوشبو سے اپنی مشامِ جان معطّر کرنا شروع کیا۔ جب خارا نے اپنی سرگزشت سُنائی، تو ساتھیوں نے تحسین اور حیرت بھری نگاہیں اس پہ ڈالیں، اور سب سوچنے لگے کہ زندگی کی بڑی کمی کو پورا کرنے والی، یہ چیز، یہ لازمہ عمر یعنی یہ عورت کس طرح ہوش میں لائی جائے۔

آخر سب نے کہا کہ بڈھے کے پاس (جو غار میں تھا، ساحل تک نہیں آیا تھا) لے چلنا چاہیئے، وہ کوئی ترکیب بتائے گا۔ بڈھے نے تمام حال کو سُنا، اور خوشی خوشی، اپنے تمام تجربوں سے جو ہندوستان و سرندیپ میں اُسے حاصل ہوئے تھے، نسرین نوش کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ دوائیں دیں، منتر پڑھے، پانی چھڑکا، یہاں تک کہ صبح ہوئی اور آفتاب عالمتاب، دُنیا کو حرارت اور زندگی دیتا ہوا نمودار ہوا، اور اُس وقت نسرین نوش کے جسم کے پھول، ایک ایک کرکے زمین پر گر پڑے، اور یہ عورت، اپنے تمام عورت پن، اپنی تمام نسوانیت، اپنی تمام شفقت، اپنی تمام شعریت کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اب نسرین نوش، اپنے تئیں خارا کے قوی بازوؤں پُرجوش سینے میں پانے سے خوش تھی، اور ایک نسوانی غرور کی ادا سے، چاروں طرف دیکھتی تھی، اور ہنستی تھی۔ اس کے ہنستے ہی، اس خشک جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہوگئیں، سیاہ و غمناک کانٹے پھول اور سنبل بن گئے۔ اور عورت کی جادو بھری نظر، اور نیم خندہ سحر نے، اس مصیبت زدہ طائفہ کو جو مدّت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا، جانِ تازہ بخش دی، اور یہ لوگ اُن عذابوں کو جو اُنھوں نے اُٹھائے تھے آن کی آن میں بھول گئے۔

ہیرے، موتی، زمرّد، لعل، یاقوت، فیروزے وغیرہ جو اس جزیرے میں پڑے ہوئے تھے، اور کوئی اُن کی بات نہ پوچھتا تھا، اب جمع کرکے لائے گئے، اور نسرین نوش کے قدموں پہ ڈال دیئے گئے۔ اس حُسن و آن کو دیکھ کے بڈھا مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا، اور سر ہلا ہلا کے کہتا تھا۔

"ہاں! محبّت پاش، سودا ریز بال نہ ہوں، جن میں ہیرے لگائے جائیں تو ہیروں کی کیا قدر ہو سکتی ہے اور اگر نازک اُنگلیاں نہ ہوں، تو یاقوتوں سے، زمرّدوں سے، اور پیاری گوری گردنیں نہ ہوں، تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ؟"

بڈھا مارے خوشی کے متوالا سا ہو گیا تھا، کچھ چُپ ہو جاتا، لیکن ترنگ میں آکر پھر کہنا شروع کرتا:۔

"عورت! عورت! عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کے، اُسے تازگی، اُسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دُھونی ہے کہ محبّت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد، سخت دل ہو جاتا ہے، اکھل کھُرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت و نوازش، یہ اُس کی مسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ عالی اور رقیق حسّیات سے منوّر ہو جاتا ہے"۔

اب نسرین نوش کو ایک دستِ قوّت مل گیا تھا، جو اُسے آغوش میں لے، اور خارا کو ایک دستِ شفقت ہاتھ لگ گیا تھا، جو مبادرۂ حیات کی اذیتوں کو بھلا دے۔

بڈھا اس جوڑے کو دیکھ کر، وفورِ مسرّت سے چُپ نہ رہ سکتا، ناچنے لگتا، پھر کہتا:۔

"عورت میں حُسن نہ ہوتا، تو مرد میں جرأت اور عالی حوصلگی نہ ہوتی، مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی، تو عورت کی خوبصورتی و دلبری رائگاں جاتی"۔

اَلْحَمْدُ لِمَنْ قَدَّرَ خَيْراً وَّ جَمَالاً وَالشُّكْرُ لِمَنْ صَوَّرَ حُسْناً وَّ جَمَالاً

سلطان حیدر جوشؔ

طوقِ آدم

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں رسالہ یا اخبار کے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے "ضرورت ہے" والے کالم کو کیوں پڑھتا ہوں اور اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں اس کا جواب صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ پر ہوتے اور آپ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میری کالج کی زندگی ایک عجب آزادی کے ساتھ گزر رہی ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب نہیں ہوا۔ کبھی امتحان دینے کے بعد مجھے اپنی کامیابی کا یقین نتیجہ آنے سے پیشتر نہیں ہوا۔ مجھے کتاب کے نام سے بلا کسی استثنا کے نفرت تھی۔ اگر کبھی اخبار وغیرہ کے دیکھنے کی خطا مجھ سے سرزد ہوتی تھی تو محض اس خیال سے کہ کسی نئے اشتہار کو معلوم کر سکوں۔ ریاضی سے مجھے اسی قدر لگاؤ تھا جس قدر ایک مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ لاجک سے مجھے ایک ناقابلِ بیان الجھن ہوتی تھی اور فلاسفی سے مجھے للّٰہی بغض تھا۔ میں خود تعجب کرتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے بی۔ اے کا ڈپلوما کس طرح پا لیا۔

مستقل مزاجی مجھ سے اس طرح کوسوں بھاگتی تھی جس طرح لاحول سے شیطان۔ ہمیشہ ایک ہی چیز کو اچھا کہنا میری رائے میں اول درجہ کی جہالت تھی۔ میں کبھی فٹ بال ٹیم کے ساتھ ٹور پر جاتا تھا اور کبھی روزانہ سب کی استدعا پر بھی روزانہ کھیل میں شریک ہونے سے گھبراتا تھا۔ کالج کی زندگی نے مجھے "سیماب" کا خطاب دلوا دیا تھا۔ اور میں اسی خطاب سے عام طور پر مشہور تھا۔ ایسی طبیعت اور ایسا دل لئے ہوئے میں نے ڈگری لینے کے بعد پیارے کالج کو خدا حافظ کہا۔ ایک بھری دنیا میری اپنی بے شمار دلچسپیوں کے ساتھ میرے سامنے موجزن تھی۔ اور میں ناتجربہ کار ناواقف حیران۔ اس کے ساحل پر کھڑا سوچتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے کود پڑوں یا نہیں۔

یہ اور سن لیجئے کہ میں اپنے فرسٹ ایئر کے زمانے میں اپنے جونیئر، کم عمر، دوست کے بار بار کہنے پر اس کے ساتھ بمبئی گیا تھا۔ میں کالج میں اسی سال پاس ہو کر شامل ہوا تھا، اور وہ یعنی چراسٹ انٹرنس میں تھا۔ آپ کو چراسٹ کے سمجھنے میں دقت ہو گی۔ مگر یہ بھی ایک خطاب سمجھ لیجئے۔ جو اس کو تیسری جماعت کے زمانے میں ملا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک روز اپنی ریڈر کے یاد کرنے میں بآوازِ بلند مشغول تھا اور

"سی - ایچ - آر - آئی - ایس - ٹی چرائسٹ معنی عیسیٰ" کی رٹ لگا رہا تھا۔ کہ کسی بڑے طالب علم نے سن پایا اور بس اسی روز سے وہ چرائسٹ مشہور ہوگیا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنی عمر میں سب سے پہلے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میں اسی کے یہاں مہمان ہوا۔ اور یہ بھی سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کی والدہ اور اس کی نوعمر چھوٹی بہن نے مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ بمبئی سے پردہ گدھے کے سر سے سینگ سے زیادہ مفقود ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ میری رائے میں پردہ کیسی سے کیسی معتدل شکل میں بھی ایک نہایت وحشیانہ حرکت ہے۔ .... ممکن ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نہ ہوں مگر آپ کی کمزوری کا جواب وہ سوائے آپ کے اور کوئی نہیں ٹھہرا یا جاسکتا۔ مختصر یہ کہ اس گھر میں جو راحت مجھے اس قلیل زمانے میں ملی ہیں اس کو کبھی نہ بھول سکا۔ اور اس گھر والوں کا بے حد خلق اور مہمان نوازی میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہی۔ دماغ پر تو اس وجہ سے کہ اس کے بعد سے چرائسٹ کے والدین کو ہمیشہ خط لکھتا رہا اور وہ انتہائے انسانیت کے ساتھ برابر جواب دیتے رہے اور دل پر اس وجہ سے کہ .... خیر اس کی نسبت آگے چل کر معلوم ہوگا۔

ہاں اس جملہ معترضہ کو چھوڑیئے۔ میں نے جب کالج چھوڑا تو اپنا سامان وغیرہ ڈھونے سے فراغت حاصل کرتے ہی مجھے بمبئی کی لو لگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں۔ مگر کوئی چیز تھی جو مجھے زبردستی لے گئی۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ دن کو گشت لگاتا تھا شام کو سمندر کے کنارے دل و دماغ کو تازہ کرنے جاتا تھا مگر پھر یہ سوچتا تھا کہ آخر میں اس بحرِ ناپیدا کنار میں کود پڑوں یا نہیں!

چرائسٹ کے والدین مجھے قریب قریب روز ملتے تھے اور قریب قریب روز مجھے اپنے مکان میں اٹھالے جانے پر مجبور کرتے تھے مگر میں خدا جانے کس کشمکش میں مبتلا تھا۔ میرے دل کو ایک گونہ تسلی بلاناغہ ہوتی رہتی تھی اور میری آنکھیں اپنا مشغلہ روزانہ کم از کم ایک مرتبہ ضرور پالیتی تھیں۔ مگر میں پھر بھی یہی سوچتا تھا کہ آخر میں اس تموج جادو فریب میں کود پڑوں یا نہیں۔

ایک ایک معمولی واقعہ بیان کرنا گویا داستان کہنا ہے اور سلسلہ وار کتھا گانا ایک دقیانوسی طریقہ ہے۔ میں بلاتفریق ہر پرانی حرکت سے متنفر، لہٰذا اس قدر بس سمجھئے کہ میں بھی آخر کار اس دل فریب بحرِ ذخار میں کودا، کودا اور آنکھیں بند کرکے کودا۔ دوسرے سال کے جاڑے میں میں اپنے ڈرائنگ روم میں چرائسٹ کی نوعمر بہن حمیدہ سے یا فی زمانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا تھا "کیوں پیاری! آج تو غضب کی سردی ہے۔ بدن کانپا جاتا ہے۔"

(۲)

میں غالباً کہہ چکا ہوں اور میری ہیئت بھی ہر دیکھنے والے کو بتا سکتی ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں اور نہ خدا نخواستہ کسی حالت میں کولھو کا بیل بننے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ مستقل مزاج اور کولھو کا بیل میری نظر میں ہر لحاظ سے مرادف نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو میں آج پسند کرتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ کل بھی اسی کو پسند کروں۔ مجھے اس منطق کے صغرے کبرے میں حصۂ مشترک ہی مفقود نظر آتا ہے، جو شخص مستقل مزاجی کا حامی ہو، وہ بشرطِ فرصت مجھ سے تبادلۂ خیالات کرسکتا ہے۔ خدا جانے یہ بوسیدگی دماغ کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ زمانے کے ساتھ برابر بڑھتے رہنا اور مستقل مزاجی کے معنی یہ ہیں کہ معاف فرمائیے گا۔ نکمے اونٹ کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانا۔

در اصل میرا مزاج اور میری طبیعت انگلینڈ کا موسم تھی! کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل میری حالت کیا ہوگی۔ میں کس بات میں دلچسپی لوں گا اور کس بات سے نفرت کروں گا۔ میں اس زندگی کا عادی تھا اور میرے لئے اس کو چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسا مچھلی کا پانی کو چھوڑنا۔ میں کبھی کسی ایک چیز کا مداح برابر نہیں رہا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ تقلید کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ مگر یہ سچ ہے کہ حمیدہ نے میری اس عادت کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ میری گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی طبیعت کو تاڑ گئی تھی۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ وہ مجھے روز نئے نئے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی تھی۔ یہ ایک فیکٹ ہے کہ

وہی ایک پہلی چیز تھی جس سے میں کبھی نہیں اُکتایا۔ وہی پہلی صورت تھی جس سے میرا دل کبھی سیر نہیں ہوا۔ وہ میری طبیعت کے ساتھ ساتھ روزانہ پلٹ جاتی ہو یا کسی اور طرح میں قطعی نہیں بتا سکتا۔ کہ وہ مجھے چھ مہینے خوش اور مطمئن رکھنے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔

اس کی حقیقت اگر میں بلا کم و کاست بیان کروں تو غالباً آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی بیوی کو رشکِ پروین بنانا چاہتا ہوں یا میں خود اس کے پیچھے رشکِ قیس بن گیا ہوں۔ مگر پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیس عامری اور فرہاد ایرانی دونوں میری نظر میں اول درجہ کے مخبوط الحواس تھے۔ میں ایسے عشق کو جہالت سمجھتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ایسے آندھی اندھیر۔ جذبۂ عشق میں سوائے حیوانیت کے اور کچھ نہیں۔ شاعروں نے اس کو چار چاند لگانے میں بہت کچھ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا ہے مگر سرے سے شاعروں ہی کی حقیقت میری نگاہ میں کچھ نہیں۔ میں نفسِ شاعری میں ہی کوئی بات قابلِ ستائش نہیں پاتا۔ شاعری اور دنیا کی اور بہت سی فضولیات سب ایک قطار میں ہیں۔ تضیعِ اوقات کے لئے اب دُنیا نے شاعری سے زیادہ دلچسپ مشغلے ایجاد کر لئے ہیں۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔ آپ کی یا اور کسی کی آنکھوں سے دیکھوں آپ یقین کیجئے موسیقی اور شاعری میں اگر کچھ اثر مانا جاتا ہے تو میں "واٹر پروف" کی طرح "میوزک پروف" یا "پوئٹری پروف" ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کسی بات میں شاعری کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے میرا یہ کہنا کہ حمیدہ میرے نقطۂ خیال سے تمام خوبیوں اور حسن دلفریب سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کے لئے نہایت موزوں تھی۔ البتہ اس میں صرف ایک عادت تھی جو آخرکار میرے مزاج کے خلاف ثابت ہوئی۔

وہ میرا ہی دل لبھانے کے لئے سہی روز نت نئی صورت و لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اسکی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غضب تھا۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا، اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین سب سے زیادہ دلکش سب سے زیادہ دلفریب، نیچر کی انتہائی صنعت، تہذیب اور ترقی کی نقش آخرین وغیرہ وغیرہ تھی، اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرایا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ خودستائی اس میں بھڑک اُٹھتا۔ اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک کہ میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ میں اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا نام ——— کالج کا نام ——— سیماب تھا۔

اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے خوبصورت سُننا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ گویا اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھیں۔ اور میں کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطبِ شمالی، قطبِ جنوبی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حُسن کی تعریف سُننا نہیں چاہتی تھی۔ اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں بادِ صرصر کا طوفان کہے جا سکتے ہیں اکثر واقع ہوتے تھے، لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اُوپر ہی اوپر اُتر جایا کرتی تھیں، اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز عین اس وقت جبکہ وہ اپنے ٹائیلٹ سے یا بالفاظِ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ ہو چکی تھی، اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبی اور حسنِ بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی تھی۔ میں ایک تصویری انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹرس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ غالباً وہی شعلۂ خودنمائی اس کے اندر بھڑک اُٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آ کر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے نظارہ میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلۂ خودنمائی زیادہ مشتعل ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر

کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی، اور میں نے آخر کار کہا۔

اور کہا "پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹرس کس قدر خوبصورت ہے!"

"کیا خاک خوبصورت ہے مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی" اس نے کہا۔

وہ یہ چاہتی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ غور کے ساتھ اس کو سرتاپا دیکھ تو لوں اور مجھ پہ یہ جن سوار تھا کہ اسے میری ہاں میں ہاں ملانی چاہیئے۔

میں نے تصویر پہ نظر جمائے ہوئے پھر کہا "بھلا کیا کہتی ہو؟ اس کی آنکھیں تو دیکھو۔ اس کے بال تو دیکھو؟"

"ہزار حسینوں کی ایک حسین سہی۔ مجھے کیا؟ میں نہیں سمجھ سکتی۔ تم ایسی فضول باتوں میں کیوں اپنا اور میرا دونوں کا سر پھرایا کرتے ہو۔"

"سچ یہ ہے کہ دن کو دن کہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ اگر تم اس کے خلاف ہو تو یہ تمہاری ذاتی رائے ہے جس میں ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی پوشیدہ ہو۔ مگر اختلاف رائے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی آزاد رائے ظاہر نہ کر سکوں۔ اور سلیکٹڈ سوالات کو محض تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے ایک کاک لگی ہوئی بوتل کی طرح اپنے میں بند رکھوں۔"

یہ بحث برابر بڑھتی چلی گئی۔ مجھ پہ اور اس پہ دونوں پہ اپنی محبّت کے موافق ایک جن سوار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ یہ آندھی بلا نقصانِ عظیم کے نہیں اُتری۔ حمیدہ نے بات بڑھ جانے پر اپنی ریشمیں نقاب اُٹھائی اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں نے گاڑی کے باہر جانے کی آواز سُنی اور اس وقت مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا فقرہ جو وہ تمسخر کے طور پہ ہمیشہ کہا کرتا تھا، یاد آیا کہ شادی کر اور بربادی لے۔

(۳)

پہلے روز تو میں اپنے اسی خیال میں مستغرق رہا میری نگاہ میں حمیدہ کی یہ دیدہ دلیری ناقابلِ عفو جرم نظر آتی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس بھی تھا۔ افسوس اور بے حد افسوس۔ صرف اس بات کا افسوس کہ میں نے اپنی بیش بہا آزادی کو محض وہ فتنہ زا آنکھوں، وہ دلکش رخساروں اور چند ایسی ہی دلفریب چیزوں کے عوض کیوں غارت کر دیا۔ میری رائے میں اس وقت شادی "زر دادن و درد سر خریدن" سے زیادہ وقیع چیز نظر نہیں آتی تھی۔ میں مرحوم غالب کی رباعی کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھ رہا تھا۔

بہ آدم زن بہ شیطاں طوقِ لعنت — سپردند از رہِ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوقِ آدم — گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

دوسرے دن میرے خیالات یہ نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لئے بے قرار نہ ہوتا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کئے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادمہ کی ضد تھی کہ پہلے برتن دیکھ لئے جائیں وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کیسی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب و کتاب ناممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سب سے برابر آتی ہو گی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہیئے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ قلابہ کے اسٹیشن پر اُتری تھی۔ بفرضِ محال اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہر جگہ پہنچتا۔ میرے دل و دماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جا کر خوشامد کرتا یا دو ایک

کو درمیان میں ڈال کر، اور نہ زیادہ تشہیر کرنا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچتا رہا اور سوچتا رہا۔ مجھے اس سے پہلے سوچنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ کیونکہ سوچنا میرے خیال میں ایک بہت نازیبا بات ہے۔ اس سے انسان کی پیشانی پر جھرّیاں پڑتی ہیں۔ اس سے طبیعت پہ ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے عمر زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے آدمی بڈھا ہو جاتا ہے اور؟ اور کیا نہیں۔ اس سے تمام نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں۔ بہر حال بندہ مجبور و لاچار۔ سوچنا ہی پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی چیز دماغ میں بجلی کی روشنی کی طرح پرتو افگن ہوئی۔ میں فوراً اٹھا اور ٹوپی سر پہ رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس قدر عرصہ میں گھڑی کی بڑی سوئی نے ۲۰منٹ کا فاصلہ طے کیا اسی قدر عرصہ میں میں نے اپنا راستہ ختم کر لیا۔ ۲۰منٹ کے اختتام پر میں ...... روزانہ اخبار کے آفس میں منیجر سے نہایت تعجیل کے ساتھ کہہ رہا تھا "اچھا تو آپ الفاظ کے حساب سے چارج کریں گے۔ خیر جس طرح آپ چاہیں۔ میں جو عبارت شائع کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی لکھے دیتا ہوں آپ ملاحظہ کر لیں"

منیجر نے میری عجلت کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم دوات میری طرف بڑھایا اور میں نے کھڑے ہی کھڑے میز پہ ایک ہاتھ ٹیک کر جھکے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

"ضرورت ہے"

ایک چھ مہینے کے شادی شدہ شوہر کی اپنی حسین بیوی کی جو دو روز سے تبدیلِ مزاج کی غرض سے کہیں چلی گئی ہے۔ آنکھیں سیاہ۔ رنگ سرخ و سفید۔ بال گھونگھر والے، قد میانہ، عمر ۱۸ سال۔ نام حمیدہ۔ جو شخص مذکورہ بالا کو کسی طرح نمبر ۴ منزل نمبر ۱ بائیکلا میں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ اس کو دو اشرفیاں بطور معاوضہ محنت نذر کی جائیں گی۔ خط و کتابت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ مزید حالات بتلائے جا سکتے ہیں"

بے چین شوہر۔ عبدالحی سیماب

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منیجر نے اس اعلان کو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ جو غالباً کوشش خودداری کی زنجیروں میں جکڑے جانے کی وجہ سے مسکراہٹ ہی بن کر رہ گئی تھی، ورنہ قہقہہ بننے کے لئے تیار تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بلکہ تمام چہرے پر ظاہر ہوئی۔ میں نے اجرت بلاحجت نقد ادا کی اور خدا حافظ کہتا ہوا باہر تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو چار کلمہ کون اور منیجر کے دل کھول کر ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار کو دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزانہ اخبار میں کیا۔ کیا اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے، میری حالت سے آگاہ ہو، جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہوگا۔ اور اگر اس نے مان لیجئے کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گذر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی۔

میں اپنے ڈرائنگ روم میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا۔ ڈوبا ہوا تھا کہ میرا نوکر کواڑ کھول کر اندر گھسا اور کہنے لگا "حضور ایک

شخص اور ایک نقاب پوش عورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عزیزہ حمیدہ کا چچا زاد بھائی ہوگا۔ حمیدہ کو لایا ہوگا۔ یا ممکن ہے کسی کو حمیدہ اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں نے فوراً اندر آنے کی اجازت دی اور کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر نہایت سُرعت کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ آخر میں کہوں گا کیا۔ دروازہ کھلا اور جاہل شخص جو صورت سے کوئی دکاندار معلوم ہوتا تھا، اندر گھسا اور یہ کہتا ہوا اندر گھسا "حمیدہ حمیدہ! اندر آؤ۔" اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان عورت جس نے نقاب اُتار ڈالی تھی، اندر آئی۔ اس کا چہرہ، اس کی بے باکی، اس کی وضع، غرض اس کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ نہایت چلتی ہوئی عورت تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ اور ادا شناسی کام کرتی ہے، میرے خیال میں وہ کوئی بازاری آوارہ گرد عورت تھی۔ لانے والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیجئے یہ اب یہاں موجود ہیں، یہ ہم کو ایک ہوٹل میں ملیں۔ ہم کل سے اخبار پڑھ کر تمام بمبئی ڈھونڈھ ڈالا۔ آج ہم کو ملی تو ہم نے فوراً پکڑ لیا۔ اس نے بہت کچھ شکایت کیا۔ تمہارا برائی کرتا ہے۔ خیر تم جانے یہ جانے۔ یہ خود کہے گا تم سُنے گا، اب ہمارا معاوضہ۔ بس ہم خلاص!"

مجھے تعجب تھا، حیرت تھی پریشانی تھی۔ میری زبان سے نکلا "تم کہنے کیا ہو؟ یہ عورت کون ہے؟"

وُہ "ہم کہتا ہے کہ تم نے اخبار میں لکھا کہ جو کوئی اس کو لائے گا، وہ دو گنی پائے گا۔ ہم کل بارہ گھنٹے تلاش کیا۔ رات بھر اسی خیال میں رہا۔ آج برابر صبح سے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں، رنگ گورا ہے سُرخی نہیں ہے تو وہ اس چار دن کی پریشانی میں جاتا رہا۔ بال گھونگھر والا ہے۔ قد بیچ کا ہے۔ عمر کون اس کا ۱۸ سال سے زیادہ بتا سکتا ہے؟ نام اس کا حمیدہ ہے۔ (اس کی طرف) کیوں ہے نا؟"

اس میں شک نہیں کہ اس میں یہ سب باتیں تھیں، مگر آخر اس جہالت کے معنی کیا؟ وہ میری پیاری حمیدہ نہیں تھی۔ نہیں خدا نہ کرے۔ میں نے جواب دیا "مگر یہ میری بیوی نہیں ہے۔"

وُہ ۔ (عورت کی طرف) "کیوں یہ کیا بات ہے؟"

عورت "کیا پیارے سیماب! پیارے سیماب۔ اب تم ایسے خفا ہو کہ پہچانتے تک نہیں۔ میں تمھاری بیوی نہیں ہوں؟"

میں "حمیدہ۔ میری طرف تو دیکھو!"

اب تک مجھے استعجاب تھا۔ مگر اس جواب پر وہ استعجاب غصّہ سے بدل گیا۔ یہ نالائق عورت اور میری بیوی۔ اس گستاخی کے معنی کیا؟ یہ بدمعاشی، پکّی دغا بازی، جعلسازی۔ غصّہ بڑھ چلا اور میرے منہ سے نکلا۔ گستاخ عورت اس بدتمیزی کے کیا معنی......؟

میں فقرہ بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ وہی لانے والا شخص بولا "دیکھو سیٹھ۔ بدتمیزی وغیرہ کا وجہ تنہائی میں پوچھو۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کا قصور ہے۔ سب کے سامنے ایسا مت کہو۔ آخر وہ تمھاری بیوی ہے۔"

میں ۔ (نہایت غصّہ کے ساتھ) "بدمعاش! یہ پاجی عورت میری بیوی کیوں ہونے لگی......"

وُہ ۔ دیکھو سیٹھ۔ ہم پر زبان مت چلاؤ۔ تم جانو تمھارا بیوی جانے۔ ہم سے کچھ مطلب نہیں چاہے تم اسے رکھو چاہے نکالو۔ مگر ہمارا دو گنی ہم کو دو۔ بس۔

مجھے غصّہ تھا پریشانی تھی الجھن تھی۔ سب کچھ تھا۔ قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لڑوں کیا کروں۔ اتنے ہی میں دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور گنوار جاہل ایک عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر گھسا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ لو۔ یہ حمیدہ موجود ہے۔ میں دو دن سے مارا مارا پھرتا تھا۔ آخر میں نے ایک دکان پر دیکھ پایا اور کھینچتا ہوا لایا۔ آنکھ۔ رنگ، بال۔ قد۔ عمر۔ سب دیکھ لو۔ یہ تمھاری بی بی حمیدہ ہے کہ نہیں۔ اور میرا انعام؟"

اب میرے غصّے نے بھی مجھ سے بھاگنا شروع کیا۔ میں ساکت تھا۔ خاموش تھا مبہوت تھا۔

دوسری عورت "پیارے سیماب! کیا اب بھی تم اپنی پیاری حمیدہ سے نہیں بولو گے؟"

پہلی عورت "۔ تو کون چڑیل ہے جو میرے شوہر کو اپنا شوہر بتاتی ہے ۔؟"

دوسری عورت "۔ چل چخے ۔ تجھ جیسی مکّار میں نے ہزاروں دیکھ ڈالیں ۔ سیٹھ صاحب میرا شوہر ہے یا تیرا ؟"

دونوں لانے والے ۔ (تقریباً ساتھ ہی ساتھ) "بتائیے سیٹھ آپ کا بیوی کون ہے ؟"

"بولو صاحب بولو ۔ ہاتھ پکڑلو ایک کا ۔"

گورنمنٹ کا قانون کہیئے ۔ اپنی پوزیشن کا لحاظ سمجھئے ۔ یکایک حیرت زدہ ہوجانا اس کی وجہ ٹھہرائیے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خیال نے اس وقت مجھے دست درازی سے روک لیا ۔ میری حالت عجیب تھی ۔ میں حیرت زدہ بھی تھا ۔ اور پریشان بھی ۔ خائف بھی تھا اور غصہ سے لرزاں بھی ۔ میں نے گھنٹی بجائی ۔ ملازم فوراً اندر تھا ، میں یہ کہتا ہوا کہ "دیکھو پولیس کو بلاؤ اور ان سب بدمعاشوں کو ان کے حوالے کردو" ڈرائنگ روم سے نکل کر سونے کے کمرے میں چلا گیا ۔ میرا خیال ہے کہ میں جاتے ہی پلنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا ۔

برابر والے کمرے میں سے سب کے باہر جانے کی آواز میرے کان میں آئی ۔ پھر کچھ تکرار نہ ہوا اور تھوڑی دیر میں سنّاٹا ۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گا ۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اسی طرح دس پانچ زبردستی بیوی بننے والیاں .... میرا سلسلۂ خیال کواڑ کھلنے سے ٹوٹ گیا ۔ میں نے دیکھا تو پیاری حمیدہ ریشمیں نقاب ڈالے ہوئے ایک عجیب شانِ دلربائی کے ساتھ میرے سامنے تھی ......!

تھوڑی دیر کے بعد جس میں معمولی شکوہ و شکایت کا دفتر ختم ہوچکا تھا ، وہ میری آغوش میں تھی ۔ اس کا شعلۂ خود ستائی پھر بھی بھڑک اٹھا مگر میں اس کے بجھانے کے لئے کئی روز سے تیار تھا ۔ اس وقت اور صرف اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دونوں بازاری عورتیں اور اوباش آدمی حمیدہ ہی کے اشارہ پر آئے تھے اور عزیز نے اس کا انتظام کیا تھا ۔ میری دو اشرفیاں تو بچ گئیں ۔ لیکن حمیدہ کو اس پلاٹ کے تیار کرنے میں دو گنیاں نذر کرنی پڑیں ۔ آہ شریر شوخ ...... پیاری حمیدہ ۔

وہ دن اور آج کا دن دو باتوں میں پورا پورا اعتقاد رکھتا ہوں ، ایک تو یہ کہ اخبار کا "ضرورت ہے" والا کالم قابلِ فروگذاشت چیز نہیں اور دوسرے یہ کہ مرحوم مرزا نے سچ کہا ہے

ولیکن وردرا اسیری طوقِ آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

نیاز فتحپوری

کیوپڈ و سائکی

یوں تو، یونان کے عہدِ زرّیں کا ذرّہ ذرّہ بجائے خود اک حسن آباد تھا، لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً "عورت کی دُنیا"، میں ایک سحر تھا، اک اعجاز تھا۔

حُسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیرِ اثر اک ماہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا، جیسے سائکی کے حُسنِ عالم افروز سے کوئی نسبت دی جا سکتی، پھر یہ خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں، لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اُس کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی، تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب اُلٹ اُلٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

اگلاریس و کیوپڈس بھی غیر معمولی حسین تھیں، اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقشِ حسن و شباب (سائکی) اور نہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں، کہ دُنیا انھیں کے لئے ترستی، انھیں کے لئے تڑپتی، اس لئے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں، تو جائے عجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی، اس لئے وہ اپنی تسلی، اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین سہی، مگر کم از کم وہ ان لذّات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں" کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی"؟ اب رئیس یونان کے پیشِ نظر صرف یہی اک فکر تھی، جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا، دُنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آئے، خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں، اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے تو اس پیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ سائکی کے لئے کوئی بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب سائکی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو بُرے بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی وہ تو اب پُوری جوان تھی اور اس لئے انتخابِ شوہر کی حس، جو عورت کی جوانی کی تنہا حس ہے اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی اوّل تو بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اُسے دکھائی

بھی جاتی تھیں، تو سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غرور سے ازسرتا پا دیکھ لیتی۔ ہاں اُسے غرور تھا، اپنے حسن پر ناز تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھ دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک سچی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہوگیا کہ دُنیا کے ہر گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اسکی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہوگیا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اُٹھا لیتی اور جذبات حسن وعشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی، بارہا ایسا ہوتا کہ جب کتاب دیکھتے دیکھتے اسی حالتِ انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی، تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اُٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی۔ خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو، اور اس کا کوئی تخیل ایسا نہ تھا جو شرم وحجاب پر ختم نہ ہوتا ہو، اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا یا پھر ایسے کھیلوں میں، جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈھتا، یا اپنے تئیں ڈھونڈھا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو تنہا ہی کی بھول بھلیاں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عورت تھی اور نصف انفعال وجستجو۔

دن گزر گئے، یہاں تک کہ ساگی کا شباب، سُرور سے سُکر، اور سُکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا، لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخابِ شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا، جس کی زمین کے نسبت فرش گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ ساگی اپنے باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی، یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی، مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر تاریکی اس کے لئے روشنی ہے۔ اور اس کی ہر رات چاندنی، وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی، اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اُٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کئے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی، اپنا درد کہہ رہی تھی، شکایتیں کر رہی تھی کہ،

> اے چاندنی تو تو آسمان کی ساگی ہے، آسمان ہی میں رہ، دُنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک ساگی سے بیزار ہے، زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونی بند ہوگئی ہے سنسان ہے۔ لیکن، نہیں تو مجھے بتا۔ تو تو روز یہاں آکے ڈھونڈھ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ چراغ کی طرف پتنگا بیتابانہ آتا ہے، میں اُسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھونرے کو گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے شمعیں اُٹھوا دیں، اپنے باغ سے کلیاں نکلوا دیں، کہ جب شمع نہ ہوگی تو پتنگے کیا کریں گے کلیاں نہ ہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے، لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری اُنگلیوں کے سرے چراغ کی لوہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں، ڈھلی جاتی ہے، میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں، رونا چاہتی ہے، میرا وہ چہرہ، جس پر اے چاندنی، ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔ افسردہ ہے کیونکہ دُنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگار حسن باقی رکھے، کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے،

اور کوئی مغنی ایسا نہیں، جس کے بربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں، پھر اے آسمان کی سائکی، تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کو لکھ سکے، جو نکہت کو گا سکے کہاں ملے گا"

سائکی جیسی حسین وجمیل تھی، ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصوّرہ بھی تھی، اور اس لئے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین، اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی، یہاں تک کہ وہ خستہ سی ہو گئی اور اس نے ایک آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کئے۔ بربط کو پھینک دیا، گویا وہ اس سے بھی بیزار ہو گئی تھی اُس نے چاندنی میں ایک جمائی لی، اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی، یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب ہی رہتی تھیں، اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں . . . . . . ساری فضا سو رہی تھی، آسمان و زمین سو رہے تھے، وہ شاہزادی زرّیں جس پہ چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اُتر رہی تھیں، سو رہی تھی، مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش سائکی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ، اِس حالت کو بنجر گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

پایانِ کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی۔ یعنی صبح جاگی، ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی یعنی کلیاں جاگ اُٹھیں۔ سائکی اُٹھی اور کنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اُٹھا، وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی۔ اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اُٹھا سکی، جس کے ہر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اُس کا شباب صرف ہوتا تھا۔ گیت کے بول جن میں اس کے سارے حسیّاتِ لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے چنانچہ وہ سو گئی اور انھیں تمناؤں، شکایتوں اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لئے ہوئے سو گئی، جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر مل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اُٹھی، تو اس کے اعضا دُکھ رہے تھے، اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ اُلٹ کر اپنی پیشانی کو چھُوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہولی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر، تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں، بلکہ ایک جُدا حسُن ہے، تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسُن صرف سائکی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا تھا۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں، مگر ہوا اس سے معمور ہے، بھنبھیری اُڑ کر نکل گئی، مگر اس کی لچک اور سبک پرواز اب بھی نگاہ میں تھرتھرا رہی ہے۔ سائکی کنجوں میں غائب ہو گئی، لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی، اس نے سمجھا کہ بدن کا درد، اعضا کی دکھن عدم آسودگیٔ خواب کی وجہ سے ہے، اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں، لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی، کہ نسرین جو سائکی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زرّیں بربط لئے ہوئے آئی، اور بائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بربط کے تار اپنی نازک اُنگلیوں سے درست کئے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے، اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے، اس نے افسونِ خواب نہایت ہی نرم وشیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

"اے نیند آ، اور گھنی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے، اے نیند آ، اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے، دائی یونان کی بیٹی کو افشردۂ انگور کی ضرورت نہیں۔ اس کا شباب خود شراب ہے، میں نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر اسے ٹہلتے دیکھا ہے۔ اور اگر کسی رات وہ مجھ سے چھپ کر چلی گئی ہے تو

صبح کو میں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزشِ رفتار نہ پہچان لے۔ اے نیند آ جا، کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ ساقی کروٹیں لے رہی ہے، اس کا بدن شاید دُکھ رہا ہے، رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ ..... "

"نسرین خاموش۔ افسوں خواب کو ختم کر کہ میرا جی گھبراتا ہے"

اب ساقی اُٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن، ایک ننھی سی موج بلوریں، ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی، آخرکار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا، اور یوں ہی بغیر کسی نظام و اصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ نسرین خاموش مؤدب کھڑی ہوئی ساقی کی اس خلافِ معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی، یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیلِ احکام اور ضروریاتِ صبح کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ لیکن ساقی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی :-

اے نسرین آج تو ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکال۔ جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر، جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آ جائیں، تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری اُن راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں، تو تُو مجھے وہ بیاں سُنا کہ میں اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروجِ صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اُسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو اک ایسی صدا ہے، جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اُٹھا سکتا ہے، اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو تُو ہزار دفعہ وہی گا۔ جو ابھی گائی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں آتا رہے نغموں کو بھول جا، اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ، اور میرے ساتھ کراہ۔"

قبل اس کے کہ ساقی اپنی گفتگو ختم کرتی، وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور ساقی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر اُن کے ساتھ چلی دی۔

ساقی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سترھویں سالگرہ تھی اور اسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعرا، شاہزادے، سفیر، مغنی سبھی موجود تھے۔ اور دربار میں ساقی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو ساقی کتان کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور ساقی اپنی جگہ پر جو بہت مرتفع تھی کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہار ہوتے تھے اور دوسرے میں وہ چیز جو نذر کے لئے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھولوں کو ڈال دیتا تھا اور پھر نذر پیش کرتا تھا، چنانچہ تھوڑی دیر میں ساقی کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صناعتِ انسانی کے نازک و لطیف نذرین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعرا نے اپنے قصائد شروع کئے مغنیوں نے اپنے ساز درست کئے یہاں تک کہ اختتامِ دربار کا وقت قریب آگیا۔ جس کے لئے ہر دل تڑپ رہا تھا۔ اور جس ایک لمحہ کے لئے یہ سارے تکلفاتِ تمہیدی برداشت کئے گئے تھے۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا، تو ان ہدایا کی پذیرائی میں سائکی کو ایک لمحہ کے لئے اپنے چہرہ سے نقاب اُلٹ دینا پڑتی تھی، اور غالباً اسی برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں سائکی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دُنیا اس جلوۂ عریاں کے لئے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنا ہے کہ جس وقت سائکی پورے بارہ برس کی ہو گئی اور اوّل اوّل دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ جب پانزدہ سالہ سائکی کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاعِ عالم میں اس کے حسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی اور اس سال جبکہ اس کا شباب پورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہوگا، غرضکہ وہ ساعت آئی، جب سائکی کو بے نقاب ہوتا تھا، یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطرار ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا، لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت، کوئی صدا، اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی، لب باہم وصل ہو کر رہ گئے تھے، اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخرکار سائکی اُٹھی اور اپنی بلوریں نازک اُنگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لئے اور اپنے سحرِ حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لئے پتھر کا بنا کے چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا، تو بے جا نازنہ تھا کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا، گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انھوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی، بُت تراشوں نے اس کے مجسّمے تیار کئے مصوّروں نے اس کی تصویریں بنائیں شعرا نے اس کے حُسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنّیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دُنیا کو مبہوت و متحیّر کرنا چاہا، مگر یہ پرستارانِ حُسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لئے آخرکار انھیں منہ کے بل اس کے سامنے گر کر کہنا پڑا کہ "اے ملکۂ حُسن تیرے مجسّمے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں ان کی طیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں، نادرست ہیں، ہمارے قصائد جن میں حسُن کی نسبت لطیف ترین تخیّلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے، نامکمل ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانۂ عبودیت کی صورت میں تیرے آستانۂ جمال تک پہنچانا چاہتے ہیں، کمزور و ناقص ہیں، پھر اے تو، کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے ماوراء تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پرشکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کیا ہے بلکہ ہمیں یہ دکھا کہ تو کیسی ہے!" ——— یہ تھے دُنیا کے خیالات وینس کے حسُن کی نسبت اور یہ تھا اک عام بے چینی و وارفتگی کا حال۔

وہ زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے جو سما میں چمکتی تھی، آج بھی شاید اسی انداز سے درخشاں ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے، اور ہم ایک کرۂ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا ہو، اور وینس وہاں کی ملکہ ہو، اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ اُس وقت اس ملک کی حکمراں ایک حسین و جمیل عورت تھی، جو ہر چند طبقۂ انسان سے نہ تھی، مگر طبقۂ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا، جو سائکی نے زمین میں۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں، مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اُس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں) بہرحال

ایک جزوِ زمانہ کا واقعہ ہے ، وینس اپنے کاشانۂ بلور میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشۂ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی ، ایک بلوریں حوض جس کی تہہ اور دیواریں صیقل کئے ہوئے آئینہ کی تھیں نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی ، اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لئے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا غرضکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جد وجہد کا تماشہ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اُٹھ کر چلی گئی -

اروٹس ، وینس کے ملک کی مشہور سیّاحہ اور شہرت کی دیوی ، جو اس سے قبل کئی بار کرۂ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرّب درباریوں میں تھی ، وینس سے ملنے آئی تھی ، وینس پہنچی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اس کی نئی سیاحت دُنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس ، میرے حالاتِ سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر ، کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لئے اضمحلال و افسردگی کا باعث ہو"

وینس نے نہایت متحیّر ہو کر پوچھا "اے اروٹس آخر تو وہ کونسی بات اب کے دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہو گی ، مجھے یقین ہے کہ تو نے کرۂ ارض کے اُن ذلیل باشندوں میں ، جن کو ہوا نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں ، کوئی بات ایسی نہ پائی ہو گی ، جس کو سُن کر وینس جلے ، کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ سُنکر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہو گئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں ۔ اے اروٹس کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ ، جو کچھ تو نے دیکھا ہے ، میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلافِ معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے ۔"

اروٹس جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ و متین دیوی تھی یہ سُنکر کچھ چیں بر جبیں ہوئی اور بولی "اے وینس مانا کہ کرۂ ارض کثیف ہے اور اُس کے رہنے والے ، جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں ، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے ، جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی ، لیکن جب تُو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سُن میں بتاتی ہوں کہ والیِ یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائکی ہے ، ایسی حسین ہے کہ اگر اس کی خاکِ پا مل جائے تو وینس کو چاہیئے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے ، کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس تقریب میں اتفاق سے پہنچ گئی تھی ، لیکن اے وینس یقین کر کہ میں جو اس وقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں ، اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں ، اُس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکی ، جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جُدا کیا ۔ اے وینس ، میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو تو اپنے دل میں پیدا کر سکتی ۔"

وینس جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا ہے ، یہ سُنکر کہ ایک عورت اور وہ بھی کرۂ ارض کی ، اس سے زیادہ حسین ہے ، چونک پڑی اور اُس کے غرورِ حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکرمند ہو کر خاموش ہو گئی ، لیکن کچھ سوچ کر بولی :

"اے اروٹس ٹھہر ، میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں ، اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے ، تو یہ سمجھ رکھ کہ وینس جس طرح حسنِ خدمات پر انعامات کی بارش کر سکتی ہے ، اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے ۔"

اس نے اروٹس کو رخصت کیا ، اور کنیزوں سے طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا ۔ اور سب کو علیحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی ، یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا کوئی پندرہ منٹ تک ۔ وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی ۔ لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اُس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا ، جو حقیقتاً وینس کے

وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اور نسبتاً بیتابی میں کچھ کمی پیدا ہو ئی "بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی، پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہیئے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے، اور اس کی رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اس کو جلد سے جلد درسِ عشق دینا چاہیئے۔ اور عشق بھی نہایت شدید سخت ناکام و مایوس" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ، وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لئے، اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے، روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیر اندازی کرے۔ ہر چند اس وقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پر دار معصوم بچہ ہی کی شکل میں دکھائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا، اس کا عنفوان شباب تھا اور اس لئے اس کی ناوک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی، اور بیٹے کا منہ چوم کر کہنے لگی "اے کیوپڈ میں نے سنا ہے کہ جب تو تیر و کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اچھے کیوپڈ، جی چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے، لیکن خدا کے لئے پیروں میں زنجیر محبت نہ ڈال، کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیر محبت سے زیادہ آسان ہیں، کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ تو ان تیروں سے کیونکہ وہ زنجیر طیار کرتا ہے، کرۂ زمین میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قائل نہیں، جا، اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز و غرور شکن ہے"۔

کیوپڈ یہ سن کر پھڑک گیا۔ نئے شکار کا حال معلوم کر کے اس کی چٹکیاں بے چین ہو گئیں۔ کمان شانہ سے اتر کر ہاتھ میں آ گئی اور تیر ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں، اور دفعتاً نگاہ سے غائب ہو گیا۔

(۳)

سائکی کی رسم سالگرہ، جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافہ قیامت کیا۔ ختم ہو گئی اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس لمحہ عرباں کے انتظار میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، جس کو وسیع دیکھنے کی تمنائیں اس درجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وسعت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مان بھی لیا جاتا تو سائکی کے بے نقاب چہرہ اور نگاہ بے محابا کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لئے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھانا چاہتا تھا۔ اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دنیا سے اب یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ سائکی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات۔ ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ، اس کے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لئے بستر آ جائے، آہ یہ خواہش تو ایسی خواہش تھی، جو اب کفر میں داخل تھی، کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں اب ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا، اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے، عالم اسے پوجنے لگے، سائکی کا نام لیا جائے، تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اٹھ چکی ہے وہیں تک اٹھ کر رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیمان قابل اعتبار سمجھا جائے، جو سائکی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو، غرضکہ رئیس یونان کو پورا یقین تھا کہ اب سائکی کی شادی کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اس کو کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ سائکی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ سائکی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے، اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ سائکی کے حسن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، بہر حال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا، لیکن افسوس ہے

کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو سائگی اپنے باغ میں حوض پہ بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بیقراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی، وہ شاید چند لمحوں کے لئے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی سائگی ہے جس کی ناکامیاب رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور وہ اس سال بھی اپنے شباب کو خلوت و مہجوری میں کاٹنے کے لئے مجبور ہے، اور نہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دُنیا کی تمام تفریحیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور ذرا حسین ہونا، ایک ایسا قہر ہے، جس کا علاج اس دُنیا میں ممکن نہیں اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ غذا ابقائے حیات کے لئے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جُدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے جی اُلجھا تو اُٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں ؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ آہ سائگی جہاں کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہار یوں ہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید گجرے، کوئی اپنے لئے نہیں پہنتا۔ ہار اس لئے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نکہت کو صرف ہوا اُڑائے لئے پھرے ان سے یہ مقصد نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پہ پڑے پڑے سُوکھ جائیں۔ بلکہ شاید اِن سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نکہت سے بیقرار ہونے والا ہو، اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے اسے بے قراری کا جواب دے، ورنہ یوں تو ناکام سینہ ایک مزار ہے، اور مزار پہ چڑھائے ہوئے پھول کیا، اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی، کیونکہ وہ لحن میں کچھ نقصان محسوس کرتی تھی سازوں کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تاروں میں کسی خاص تار کی کمی ہوگئی ہے، اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے، اگر گانا سکون ہے، تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو دل کو بیقرار کئے دیتا ہے۔

غرضکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دیئے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حسیاتِ شباب کا جواب دینے والا نہ تھا، وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہوگئی تھی، وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے، وہ اپنی نازک کمر، وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دُکھائے اور دُکھائے جائے، وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت و دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرورِ حُسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر مُنہ پھیر لیتی تھی، اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی، اور ہنس کو بھی گردن اُٹھائے، اُبھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی، تو وہ چاہتی تھی کہ یہی بازو کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی نڈھال گردن پہ اپنی زبردست گردن ڈال دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اوّلی تمکنت نے معاملہ کی صورت کو اس قدر اہم بنا دیا تھا کہ اب چارہ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے۔ لیکن آہ، کون جانتا ہے کہ ایک دیوی، جس کو دُنیا معصوم جانتی ہے، اس وقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لئے ہوئے تھی۔

بہرحال وہ اس وقت حوض پہ بیٹھی ہوئی تھی، اور نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی، کنیزیں پھولوں کے پنکھے لئے اسے ہوا پہنچا رہی تھیں، اور سامنے دوسرے کنارے پہ نسرین حسب معمول اپنا سرود لئے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی، کہ سائگی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی کہ "نسرین، یہ تو کیا گنگنائی، پھر کہہ، ذرا آواز سے کہہ، ساز لے اور گا کہ مجھے کچھ لطف آیا، نسرین جو سائگی کی افسردگی سے بہت فکرمند تھی، خوش ہوگئی اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا :-

وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانہ میں مُنہ لپیٹے پڑی رہتی تھی، گئے، وہ راتیں جب سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی گذر گئیں، اب تو جی چاہتا ہے کہ نقاب میرے چہرہ سے جُدا ہو اور پھر چاروں طرف کی چاندنی

سمٹ کر ایک ہالہ نظر آئے، جنہیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انہیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا، شاید میں افسردہ تھی کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ عرصہ سے محروم تھیں، راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغموں نے انہیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا، لیکن، اب اے صبح، اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کر لے کہ میں آج پھر بے نقاب پھر رہی ہوں، اے شام اپنے تئیں خوب بسا لے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر کھلے ہوئے ہیں، اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے" میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی، انہیں مسحور ہونا نہیں آتا، میرا حسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اس کی پرستش ہی کی جائے گی، وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو۔ دنیا اگر میرے لئے تڑپ رہی ہے تو تڑپے، میں کسی کے لئے کیوں تڑپوں، میری رعنائی ایک مستقل استغنا ہے، اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوۂ گریزپا کا ادنیٰ خراج"۔

سائکی بے تکہ جوش میں آ گئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی، سیاہ ریشمی چادر جو اس کی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہنچ گئی تھی، ڈھلک گئی، شانے کھل گئے بیاضِ گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی، سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے، ابرو ئیں تن گئیں، مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں، ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر و کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائکی پر خالی کر دیگا، لیکن نشانہ کو پیشِ نظر رکھنے کے لئے، کیوپڈ نے سائکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا، کمان ہاتھ سے گر پڑی، چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ، کاش کوئی سائکی سے اس وقت جا کر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزومند ہے، جس عشق کی اسے تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے صیاد خود اس کا مجروح ہے۔ عشق خود اس کا دیوانہ ہے اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے، خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کئے ہوں گے، لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکاں، جنہیں صرف اک حسین دوشیزہ ہی کی نیم باز آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جا، تیرا تیر، اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا، تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا، حوروں نے اپنے کانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج سائکی کے باغ میں بیہوش پڑا ہے۔

وینس کو یقین تھا، اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ بھی یقین کرے گا کہ ایک سائکی کیا اگر اس جیسی ہزار ہوں تو وہ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے، مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تھا، اک ناوک اور تھا، جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا، مگر ان سے زیادہ کارگر تھا اور جس وقت سائکی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اس کی نشیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا، کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی، اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے، لیکن سائکی کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں، نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھیں، اور نہ کسی اہتمام کو، وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھیں اور نہ کسی انصرام سے، ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

غرضکہ کیوپڈ سائکی کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا، اور اس کی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اپنے اضطراب و بیقراری کا لطف اٹھا رہا تھا کہ وینس آئی اور خلافِ معمول

اس کو اس درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آسکتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا مضمحل ہو کر لوٹنا، وہ کچھ سمجھی، اور سمجھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی، بڑھی اور ایک خاص انداز میں بولی "اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تو تیر چلاتے چلاتے چٹکیاں دُکھ گئیں، ہاں، ہاں، سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہو گا کہ کیوں سائکی کو زخمی کیا، وہ ایسی ہی حسین ہے، اور اے کیوپڈ یہی وجہ تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی کو لازم کر دیا تھا۔ اے کیوپڈ بول، جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے یا وادیوں میں کہیں خراب و خستہ پھر رہی ہے"!

کیوپڈ، سائکی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بے قرار ہو کر بول اُٹھا۔

"ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دُکھتی ہیں، کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کے لئے یہ عذر کافی نہیں ہیں، میں سائکی کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا، کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا دیواروں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہو گی، کیوپڈ نے اپنی کمان توڑ ڈالی، تیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ سائکی کے درد و مصیبت میں اپنے تئیں مٹا دے اے وینس مجھے ملامت نہ کر، کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر تاسّف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے، آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا تو میں اس کو اس حال میں کہ وہ میرے خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا، اولمپس واٹناس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپیٹر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر ڈالے"!

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پر کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا، وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آ کر دیا یہ تھا کہ "سامانِ سفر درست کیا جائے"!

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ اہتمام و تیاری میں مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لئے آمادہ۔ پرِدار گھوڑے جن کا ساز و یراق جواہرات کا تھا اور جن کی دُم و ایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے، وینس کے زرّیں رتھ میں لگائے گئے اور معاً اپنی کنیزوں، کنواریوں اور پریوں کے دفعتہً بادلوں کی طرح جو سما پر چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب۔

(۴)

سارا یونان آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر بزمِ رقص و سرود ——— ایک سیلابِ مسرت تھا، کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی۔ ایک طوفانِ نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا، ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی، شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دُنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دستِ کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصّہ لیا ہو۔ آگسٹس والئی یونان کا عہدِ سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہدِ زرّیں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ رعایا کا خیر خواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس سے بہتر موقع اس کے لئے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا، سارا دربار زر اندود تھا اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔

یونان کے تمام امراء جمع تھے اور پایۂ تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی، اگلاس و کیوپڈس، سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک

جواہرات میں غرق وہ لہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہر ان کے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی، اور یونان کی لطیف ترین شراب بلّوری و الماسی گلاسوں میں چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آ کر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نشے ہرن ہو گئے، مسرتیں منغص ہو گئیں، سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی، اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا، اور ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا، آنکھیں شدت درد سے اُبل پڑی تھیں، اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے، ملکہ چیخ کر بادشاہ سے لپٹ گئی، کہ "یہ خدایا یہ کیا ہوا"؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا، مگر ہاں ایک دیبنس، جو لوگوں کی نگاہ سے غائب ہو یا یہ کہتی ہوئی چل دی کہ "یہ ابتدا ہے، انتقام کی۔ سائکی، دیبنس کے بیٹے کو بے قرار کر کے زندہ رہے، ناممکن ہے"۔

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے لوگ دوڑ پڑے، ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کر دیں، شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوتی اور اس لئے پایان کار تمام اراکین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے اور جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسانی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی، اور اس عرض و التجا کے لئے ایک خاص مقام مقرر تھا، یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگِ مقدس کہتے تھے، اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آ جاتی تھی جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفع بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی، چنانچہ اس وقت صعب ہیں، جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لحظہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا، سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگِ مقدس سے مدد چاہی جائے۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ملکۂ امرائے دربار، اراکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہو گئی، اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لئے چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہنچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کئے گئے، جن کا ادا کرنا ضروری تھا، مگر آہ کسے خبر تھی کہ دیبنس کے ہاتھ نے اس سنگِ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے، جس کے دیکھنے اور سُننے کے لئے نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہو گئیں تو ملکہ دھڑکتا ہوا دل لیکر بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا، جو سنگِ مقدس پر پڑا ہوا تھا۔ اس تحریر کا مفہوم یہ تھا۔

> "رئیس یونان بیمار رہے، لیکن اس کی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے، سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ، لیکن وہ نہ بتا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے، ساری دُنیا کے اختر شناس جمع کرو، لیکن وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے، وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دُور کر سکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیو پیٹر نے اس پر نازل کیا ہے، یہ اس کا غصہ ہے کہ اگر اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی، تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا، اگر یونان کی ملکہ، یونان کے امراء، یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن و سکون کے آرزومند ہیں تو ان کو چاہیئے کہ شاہزادی سائکی کو کوہ الوند کی سب سے اُونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپیٹر اس قربانی کو کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرے گا،

اور بادشاہ فوراً صحیح و تندرست ہوجائے گا، اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار سائکی کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دُور نہ کرسکیں گی۔"

ملکہ غش کھاکر گر پڑی، امرا متحیر رہ گئے، کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں اس حلقۂ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا، اور جن کے لئے اس ظالم پتھر کی یہ ظالم تحریر اک شعر سے زیادہ پُر لطف ایک نغمہ صباحی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اگلارس و کیوپڈس نے اپنی ماں کو اُٹھایا اور ہوش میں لاکر جلد واپس چلنے پہ اصرار کرتی ہوئی بولیں "اے ماں اللہ، خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہوگا۔ ہر چند جوپیٹر کا فیصلہ نہایت شدید و ظالم ہے، لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہوگا۔ اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہ کیا گیا۔"

بہرحال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی، لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لئے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی، تو وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلہ میں برداشت کرلیتی، مگر نہیں فطرت اس وقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی، سخت المناک آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی، شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس لئے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے، یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے، مگر کس کو دے اور کس کو لگائے رکھے، یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا، لیکن جب اس نے سائکی کو باپ کے پاس سخت حالت فسردگی میں بیٹھا پایا۔ تو وہ "ہائے سائکی" کہہ کر زمین پر گر پڑی۔ اور بیہوش ہوگئی، ہمیں خبر نہیں کہ وہ کب تک اس عالم میں رہی، اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا، مگر ہاں، جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اُڑا ہوا تھا، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ضعف و نقاہت کا وہ عالم تھا کہ کسی کے سہارے سے اُٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا، مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اُس نے اپنے پندار میں بحالت خواب وحشی پایا تھا۔

نہ صرف امرا و دربار وارا کین سلطنت، بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھئے ملکہ کس نتیجہ پر پہنچتی ہے، بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ، ایسا سخی و رحیم حکمران پھر یونان کو نصیب نہ ہوگا، اس لئے جس قدر گراں قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے، لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو سائکی زندہ رہے، کیونکہ بادشاہ تو ضعیف ہے اور بہرحال یونان کو ایک نہ ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن سائکی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جس کی ذات ساری زمین کے لئے مایۂ ناز ہے، روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت منتظرہ میں دفعتاً بادشاہ کی خواب گاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتہً آنکھیں کھول دیں۔ اور اس سکوت کے دُور کرنے کے لئے جو اس وقت سارے دربار پر چھایا ہوا تھا، اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کے سُننے کے واسطے یونان کا ہر متنفس ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا وہ اُٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال میں لئے ہوئے، اس عجیب و غریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کرکے کوئی فتح حاصل کرچکی ہے، اور اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ ساتگی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اس لئے مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوکہ سے نفع نہ اٹھانے دوں، اگر ساتگی کو ہاتھ سے دے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کرے گا تو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی شخص اپنی محبوب ترین چیز دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے ساتگی کو مخاطب کر کے بولی کہ:- "اے بیٹی پیاری ہوجا، میں تجھے اجازت دیتی ہوں کہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر، اے ساتگی مجھ کو یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ مدت جی سکوں گی۔ لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی تو کیا مجھے یہیں دیکھنا چاہیئے تھا، پھر تیرا چلا جانا بھی تو میرا اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے، سارے میرے جگر کے ٹکڑے دیکھ، اپنی کمزوری سے اس وقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو، کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آملے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لئے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی"۔

اب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ امنڈ کر آنے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اسے بات کا اشارہ کرنا پڑا کہ "بس اب ساتگی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو"۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ساتگی نے اوّل اوّل اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی، کس طرح سنا اور اس حالتِ انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی، اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں، تو وہ بالکل مُردہ سی تھی، اور اس کے قویٰ نے بالکل جواب دے دیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے، اس لئے ساتگی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی تھی، لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنا دیا جس صدمہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو جذب کر لئے وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو ماں، کیونکر برداشت کر سکے گی"۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلا کر دیا۔ اور اس طرح گویا اس نے اجازت دے دی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔

اگلا دن دیکھ پڑھ کر نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب ساتگی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الوندکی طرف چل دیئے۔

سوگوار ماں، جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی اور اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مُردہ کو گھیرے ہوئے تھا، سارے شہر میں ایک کہرام برپا تھا، اور ہر گھر میں نالہ و ماتم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہ ہو، اور کوئی دل نہ تھا جو بیقرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات پلٹ دی جانے کو ہے، اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں ساتگی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں پس پشت رسی سے باندھ دی گئی تھیں اور وہ کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لئے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی، اس کی وہی ریشمی چادر جسے وہ صف باندھتی اور نصف اوڑھ لیتی تھی اس کے جسم پر تھی، لیکن وہ نقاب جو ۶ سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا اب جُدا تھا، کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

ساتگی کا یہاں تک لایا جانا، اس کی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا، یہ سب عالم بیہوشی میں ہوا، لیکن جس وقت اس کی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اس کی پیشانی کا لیا تو ساتگی کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور چونکہ وہ اب ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی کیونکہ وہ بندھے ہوئے تھے

وہ قدموں پہ نہ گر سکتی تھی، (کیونکہ وہ درخت سے کَس دی گئی تھی) وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس لئے اس کی وہ ساری التجائیں، وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضا سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آگئی تھیں، اور اس لئے عالمِ یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے رحم طلب کرنا، حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں کیا لا سکتی تھی، وہ بیہوش ہو کر گر پڑی، لوگوں نے اسے اٹھایا اور سائکی کو یونہی تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیئے۔

مگر آہ، وہ سائکی کا کسمسانا، کسمسا کر اک آخری نگاہِ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا، جب تک سب لوگ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی، مگر آہ، نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا۔ اور نہ ماں وہاں موجود تھی کہ پھر ایک بار چیخ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں سائکی کی نگاہ واپسیں گم اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بے ہوش۔

(۵)

"اے خواب کی ملکہ، اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سکون بھر دے، اور تو بھی اے نسیم کی دیوی، اُٹھ اور اس کی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے، کیونکہ فانی نوعِ انسان میں ایسا ساحر و دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کر و کیونکہ میرا دل اس کی محبت میں پھنک رہا ہے" کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سُنا اور دفعتاً کوہ الوند کی اس خوفناک چوٹی پہ پہنچ گئیں، جہاں اک شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبش شروع ہوئی۔ پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نکہت بیز ہوا نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائکی کے دماغ کا اس تعطر سے متاثر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ بادِ نسیم نے درخت سے جُدا کر کے، اپنے ہاتھوں پہ سنبھال کر فرش پہ لٹا دیا۔

سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی، چادر اس کے سر و سینہ سے جُدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے اس لئے اپنا عریاں حصۂ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیئے، اس کے بال ہوا سے اُڑ اُڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پہ آرہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اُٹھا رہا ہے، اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پہ نقاب ڈال لینا چاہیئے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی، مگر محوِ خواب نہ تھی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حُسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائکی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو، اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ سائکی کی سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے، وہ متحیر تھا کہ اس کی نازک کمر پر اپنے تئیں تباہ کرے یا اس کی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر۔ وہ دیر تک اسی عالمِ حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا، اور آخرکار یہ فیصلہ کر کے کہ سائکی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے رنگین تلوؤں پہ ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اُٹھ بیٹھا کہ :-

"اے سائکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا، تجھ سے پیار نہیں کروں گا، تجھ سے عشق نہیں کرونگا، کیونکہ یہ بھی ایک ناقص طریقۂ اظہارِ جذبات کا ہے، میں تیری عظمت کروں گا، تجھے پوجوں گا، تجھ سے ڈروں گا، ایک ایسا ڈر اپنے دل میں لئے ہوئے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا، تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا، بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی ہیں مجھے ایک ملکہ، نہیں، ایک دیوی آہ، یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا، اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم، ایک ادنیٰ پرستار، آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب، فقیر، اک ذلیل گدا، ایک خوار بھکاری، اور اس سے زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا، جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کرسکتا۔"

مارفیس وزفر نے سائکی کو اُٹھایا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کوہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر سائکی کے لئے تیار کرایا تھا، وہ اک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا لٹا دی گئی اور مارفیس اپنی نیند اس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہوگئی۔

سائکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنے تئیں اک طلائی برج میں جواہر کار فرش پر پایا، اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو، مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہوسکا۔ اور اک شیریں آواز سائکی کے کانوں میں آئی کہ "یہ خواب نہیں حقیقت ہے" اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے، سونے کی بوچھاروں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "متعجب نہ ہو، تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے، اسے کوئی حکم دے شاہانہ لب و لہجہ کے ساتھ کچھ کرنے کو کہہ، کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے، اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں۔ جس کے لئے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی، اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشاتِ قلب مہیا کردے"۔

سائکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت، مردم خوار عفریت اس کا شوہر بنے گا، لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب، اس کا کندنی رنگ جو نقاب سے چھپا پڑتا تھا، کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے ایک نہایت ہی خوبصورت اور پرشباب چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حسیات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے، دفعتاً زندہ ہو کر پھر اس کے خون میں دوڑنے لگے، اس کا چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا، انفعال سے بھیگ گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آگئی جس سے اس کا حُسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخر کار اپنی تمنا سے مغلوب ہو کر اُٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ "اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات، اپنی تمناؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے، وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں، میں اُن سے محبت کرنا سیکھوں گی گو انھیں مجھ سے محبت نہ ہو، میں اپنے بہترین ہار ہائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی، خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائی جائیں"، یہ کہتے ہوئے سائکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و پُر لجاجت لہجہ میں بولا کہ:-

"اے سائکی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر، جس کو میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھی کو افسوس کرنا پڑے، اگر تو مجھ پر صرف اس لئے رحم کرسکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لئے

تیار نہیں، تو تو رحم کر، ورنہ اے سائکی پھر میں تجھ سے چھُٹ جاؤں گا اور مر جاؤں گا۔"

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر اور کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پا کر رُک گئی۔ ٹھہر گئی، اور ایسا محسوس کرنے لگی۔ گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں، اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے آخر کار اس نے اپنے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا، اپنے تئیں اس کی آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، اور جس کے لئے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی، آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہو کر گر پڑی۔

ہر چند، ملک، وطن، ماں باپ کو اس طرح یکایک چھوڑنے کا رنج، ایسا معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس، ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع جلد فراموش کر سکے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے، یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغلِ حیات میں بھی منہمک ہو مختلف اسباب تفریح سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ بکسر محویت و استغراق ہو جائے، لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کرو۔ جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو، پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دُنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ نہ ہو جائے، یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے، اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی، حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوارا سنوار کر مزے لیا کرتی ہے، وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو، اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سائکی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ اُلفت تھی، اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی، لیکن یہ اُلفت، یہ جاں نثاری یہ قربانی اسی وقت تک تھی جب تک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا، لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا، اور اس کی وارفتگی، اس کی افتادگی، اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی، کانوں سے سُن لی اور ہاتھوں سے چھو لی، تو وہ اپنے سارے افکار بھُول گئی، سارے غم طے کر گئی، کیونکہ اب کوہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیاتِ معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکتی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بارِ شباب سے خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی، آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑے، اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے، حسین ہے، اس لئے اس نے مطلق پروا نہیں کی، اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا، اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لئے آمادہ ہے، اس لئے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی، وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں۔ کبھی وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب، کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے۔ غرضکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا، مجنوں تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پرنم ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیئے اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھُول گیا، اور اس کی آغوش میں بیہوش ہو کر پڑ رہا۔

(۶)

ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک کوہ اولمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہو کیونکہ

اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تجلّی گاہ تھیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا ایک انسانی قوّت سے باہر تھا ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں۔ ناقابلِ پیمائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت، نہایت ہولناک سیاہ پانی کے عمیق چشموں کی اس وسعت میں روانی، بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہوا کا مہیب سناٹا، خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت، بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ، اور اسی طرح کی اور بہت سی ڈراؤنی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ!۔

یہ تھا کوہ اولمپس جہاں کیوپڈ نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا، اور یہ انتخاب اس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی، تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی۔ پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہ اولمپس ہی ایک ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا، کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب نازل کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر اُتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا، چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہ اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپیٹر کا غصّہ آگ بن کر نکلا اور دور دور آبادیوں کو تباہ و برباد کر گیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصّہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا، مگر چونکہ کیوپڈ، جیوپیٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں پہنچ سکا، اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں، مارفیس اور زفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زرّیں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے یہ وصلت کی مسرّت ایک ایسی مسرّت سائکی کے لئے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اُسے یہ ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ انھیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ جانے سے کرۂ ارض میں کج خلقی، بے رحمی، اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنا تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرے، لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ آئے گا سائکی کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں اُلجھائے رکھے گی؟ اس کا جواب ذرا دشوار تھا، مگر آخر سائکی نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالی قصر میں اُن تمام اسباب تفریح کو مہیّا کر دے، جن کی وہ اپنے زمانۂ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اُٹھا کر زمین پر دے مارے جو خود تو غائب ہو گئے، لیکن بجائے ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹنکے ہوئے تھے اور جن کی عمریں ۱۴-۱۴ سال سے زائد نہ تھیں نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے ان سے کہا کہ "جاؤ اور قبل اس کے کہ ملکہ سائکی دروازہ تک پہنچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کر دو جو والئی یونان کے محل سے متعلق ہیں"۔ ان کو رخصت کر کے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش زمین پر ٹپکنا شروع کیا، یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے بھر گیا اور سائکی ان پُر دار پیش خدمتوں سے گھر گئی، ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب مسکر خوشبو پیدا ہوتی تھی، سائکی اس زمانہ قیام میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی، لیکن اس کی نگاہ دروازہ سے باہر نکل کر پھیلی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہو گئی کہ شاہ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشوں، نہروں، کنجوں، فواروں، درختوں اور حوضوں کے کیونکر یہاں منتقل ہو سکا، وہ اپنے اس باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پھیلے ہوئے تھے اور یہاں ذرّہ ہائے الماس تھے، وہاں حوض سنگ مرمر بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں وہ اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرتی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ

مست و سرشار تھی۔

ساگی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کے ساتھ ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مؤدب کھڑی رہیں۔

شام ہو گئی تھی، چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر ساگی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اس نے کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

(۷)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لئے باہر چلا جاتا اور پھر اک نیا شوق، نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائکی کے پاس رہتا۔ ہر چند ساگی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں انتظار کی گھڑیاں، مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی۔ لیکن وہ کیوپڈ کی اس گھڑی گھڑی کی مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی اور وہ اپنے کنجوں، پھولوں اور پریوں سے بیزار، اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسی کا ہم جنس مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کی، جن سے ساگی گفتگو کر سکتی۔ غرضکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہ ان بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ "میں تو اب بھی ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں"۔

جس وقت تک عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک کلی کی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے، وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار، جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں، لیکن جب کوئی ایسا شخص اُسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کے لئے قابل فہم بنا دیتا ہے، تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے، یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شادکام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے، اس لئے ساگی بعض وقت گھبرا اُٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اس کی بہنیں، اگلا رس و کیوپڈس ہی آ کے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلافِ معمول کئی دن کے بعد آیا، تو ساگی مچل گئی، کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی، اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انھیں کو یہاں بلاؤں گی، یا تو وہ اس کے پاس سے ہٹانہ کرے یا پھر کیوپڈس و اگلا رس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انھیں کے ساتھ بسر ہوں۔

کیوپڈ خاموشی سے ساگی کی ضد دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے ساگی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منغص نہ کر دے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آ جائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور یہی ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، اے ساگی اب بھی سوچ اور مجھے ان کے بلانے پر مجبور نہ کر"۔

مگر سائکی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی، اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو با دل نخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے مارفیس و زفر کو بلایا، اور اگلاریس وکیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ اُن کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

"میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گزر جاتی ہیں، کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے، لیکن ہاں میں اُن راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو اِدھر مجھ پر اور اُدھر تجھ پر تنہا گذریں، کیونکہ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انھیں کے ساتھ ہے، لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں، کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی، تجھ سے محبت کرنے کی۔ پھر اگر تو مجھ سے علیحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو تیرے ساتھ ہے۔ پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشاغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے، وہ سکوت وہ فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں، تو رات کو کسی دور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے، گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے، یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائکی ہے جو تیری آنکھوں میں آجاتی ہے، اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے لوگ کہتے ہیں محبت بری ہے، مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا۔"

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لئے بول اُٹھا کہ "اے سائکی، کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا؟"

سائکی بولی ہاں سچ ہے، تمھیں نے چلایا، تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے سُنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا، اس کے دل میں ذرا رحم نہیں ہے، اس کا سینہ گداز عشق سے خالی ہے، وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو!"

کیوپڈ "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی، شاید درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔"

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر، سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے آئیں اور رجگا کر غائب ہو گئیں۔ سائکی اپنی بہنوں کو لے کر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی، دل میں تو وہ اور جلیں کہ سائکی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی لیکن ظاہر میں انھوں نے سائکی کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ "یہ زر و جواہر یہ سامانِ نشاط کہاں سے آیا؟"

سائکی نے جواب دیا کہ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے، جس نے مہیا کیا؟" انھوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

"آہ میں اس کا نام نہیں جان سکتی، اس کی ممانعت ہے۔"

"مگر اے بہن، تُو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا، کیا بہت خوبصورت ہے؟"

"نہیں، میں نے اس کی صورت تو نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے۔"

"ہاں ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب اور میری نیندیں اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اُٹھتی ہیں۔"

بہنیں بولیں "اے لڑکی، تجھے فریب دیا گیا، کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھالے گا۔" سائکی نے کہا "نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔" مگر دونوں بہنوں نے پھر بھی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سائکی بھی کچھ متفکر سی ہوگئی۔ اس تفکر سے انھوں نے اور فائدہ اُٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ ابھی جائے اور نقاب اُلٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہوگئی تھی، کیوپڈ اپنی خوابگاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا، سائکی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اُس کے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیا، مگر بجائے اس کے کہ وہ عفریت کی ڈراؤنی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں سائکی کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کرلئے۔

کیوپڈ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ "اے بیوقوف سائکی یہ تُو نے کیا کیا، کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں اک قوتِ غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا، لیکن بدقسمت سائکی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح وہ لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہر چند کیوپڈ، سائکی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے، لیکن وہ رُک گیا، کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر فانی روح اس سے چھین لی جاتی۔ اس لئے کیوپڈ فوراً ایک بادل اپنے اور سائکی کے درمیان حائل کر کے غائب ہوگیا اور سائکی بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی، لیکن ہاں، جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا، نہ وہ اس کی مکلف خوابگاہ، نہ وہاں باغ تھا، نہ کوئی کنیز، وہی وحشت ناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لئے لائی گئی تھی، اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ کبھی کس کے باندھ دی گئی تھی، پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ میں کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا پڑا کہ خواب نہیں ہے، بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پُر لطف زندگی بسر کی، مگر ایسا خواب، ایسا طویل خواب نہیں ہوسکتا، مگر پھر کیا تھا!

آہ، وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی، وہ بالکل مبہوت تھی، دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مر جانا چاہتی تھی۔

(۸)

سائکی دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے، اور سارا بدن چوٹوں سے داغ دار، کراہتی تھی، اور روتی تھی، چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی، لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا، اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس چلی گئی۔ جیوپیٹر اس کا شوہر آدلین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی، اس لئے اس نے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا، مگر جس وقت سائکی لائی گئی، تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوصف تمام تدابیر حسن افروز کے بھی مقابلہ نہیں کرسکتی، عرق عرق ہوگئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیئے، لیکن جیوپیٹر نے رات کو وینس کے خواب میں آکر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پرسرپائن

کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اٹھی، کیونکہ اس کے نسبت مشہور تھا کہ وہ کوہ ہیڈیس کے سب کے نیچے اور عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے۔" یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پروا کی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ ایک روشنی تھی، اک محبت پاش جھلک تھی جو اس کے آگے آگے تھی، اور اسے ان مصائب میں تسکین دیتی جاتی تھی، راستے میں درندے اسے ملے، مگر وہ اس حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے، غرضکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسرپائن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا، سائکی خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا، اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ پھر واپس آجائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، لیکن وینس، سائکی کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جلی اور بدعہدی پہ آمادہ ہو گئی۔ جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آ گیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، آخرکار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب الوہیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی۔

(۹)

کیوپڈ و سائکی پھر اسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی شروع ہو گئی جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی، اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا۔ مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر ان پر تیرِ عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

مجنوں گورکھپوری

سمن پوش

"شہیدِ زخمِ شمشیرِ تغافل اجرہا دارد"

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی، ناصری کو فنِ نقاشی سے خاص شغف تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی، اور بصیرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دوکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہرِ فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اس پیکرِ جمال میں محو ہو گیا جو صفحۂ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا، گویا وہ کہہ رہی تھی۔ "ٹھہر جا اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو۔" اس کے رخسار گلابی تھے، بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے، اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالمِ محویت سے چونکا۔ ایک لرزشِ خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ کہ ناصری جو اپنا سامانِ نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا۔ واپس آ گیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصری کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ میں غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ تصویر میں ایک ناقابلِ بیان چیز ہے۔ جس کو کاغذ پر بجنسہٖ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا۔ وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذبِ نظر صورت سامنے تھی۔ جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی، میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا۔ اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ کی طرف سے جا رہا تھا، یکایک میرے قلب کی

حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی، میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا، مجسمہ کے پاس بنچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا؟ وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کے گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا۔ جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی جانب بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا، باوجود دماغ کی پریشانی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا کہ اس کا چہرہ زرد تھا، جسم کی ساخت نازک تھی، رنگ میں صباحت تھی۔ دوش تک وہ عریاں تھی، اس کی بلوری گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے، اور وہ ان کو برابر کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ ارمنی کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اس لئے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لئے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا، کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس نے مجھ کو متشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی۔ اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا۔ اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں چند اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا، لہذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے "نگار خانہ" میں دیکھ آیا تھا۔ اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا۔ صرف شادکیشی کا، ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے، سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے "سمن پوش نازنین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا۔ اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا۔ اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیئے، چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غائت کی طرف دھیان تھا۔ نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش، میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا، یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کئے ہوئے۔ ارکسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی، وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا "اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کئے ہوئے بیٹھی ہے"؟ وہی جس کے گلے میں ہار ہے۔"

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی۔ اور سر ہلا کر جواب دیا "نہیں تو! کہاں بیٹھی ہے؟"

"بالکل سامنے" میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا "آرکسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے"۔

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا "خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"کوئی عورت نہیں!" اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "شاید مجھ کو مغالطہ ہوا" اور فوراً مبحث بدل دیا۔ جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی درد مند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی، آج اس کے سامان آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آ رہا تھا۔ یعنی ایک خوب صورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ رہ رہ کر اسی پر حسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشا نہ ہونے دیتا تھا۔ جب تماشہ ختم ہوا۔ اور سب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو وہ بھی اٹھی۔ اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی۔ ہجوم میں غائب ہو گئی، چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار

معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔" کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سرِ نو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔" میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا، لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لئے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو۔"

اسی کشمکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چٹکی کہ مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیّر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالمِ ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالمِ اجسام سے، کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن "سمن پوش" اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اسکی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا اور اس دورِ تعطیل سے گذر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم و بیش ہر شخص کو گذرنا ہوتا ہے۔ یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ ایس۔ سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسبِ معاش کی فکر سے بے نیاز اس لئے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا جبکہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر المناکیوں سے ہوا ہے یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں، بہرحال سائرہ کو میری طرف سے حُسنِ ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحناک لمحے میری معیت میں گذریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا، وقت کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کر لیا، میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

"جمال منزل" واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا جس نے ایسے دیہات میں اس "فردوسِ ارضی" کو اپنے لئے تعمیر کرایا ہوگا۔ اس میں ذوقِ سلیم اور حسنِ لطیف کہاں تک رچا ہوگا۔ اس کے علاوہ "جمال منزل" سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لئے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور پھر بھی ان کو میری نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا ———

شمیم نے کہا: "تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا، شاعر تھا، نقاش تھا، اور آج بیس ۲۰ برس سے زیادہ عرصہ گذرا ہے کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لئے بے تاب ہو گے۔ اس کا نام "جمال الدین" تھا۔"

"جمال الدین!" میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈراما "ہذیانِ محبت" بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا: "آپ نے برا کیا۔ سہیل بھائی کے لئے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آ رہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحتِ شب سے بھی محروم کر دیا۔"

میں نے مسکرا کر کہا: "نہیں! نہیں! قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو گیا؟"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سُنا ہے اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ اعلم کیوں قتل کر دیا، جمال الدین اس صدمہ کو زیادہ برداشت نہ کر سکا اور غالباً سال ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعر یوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رَو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔"

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزاء پایا جاتا تھا، میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بھی بے حس ہوتا ہے۔ میں نے جواب دیا "شمیم! تمہاری گفتگو نے مجھے تو بہت دُکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی، یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارۂ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے، تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو، بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کر کے کون سی نئی بات حاصل کی؟

ایں کہ دل نام کردۂ بہ مجاز
رو بہ پیشِ سگاں کہ انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور حیوانوں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلافِ قلب (PERICARDIUM) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے مگر تم کو کیا کہوں بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہی خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ کارلائل نے اسی لئے ایسے لوگوں کا نام "منطق تراش (LOGIC CHOPPERS)" رکھا ہے اسی لئے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقاء کا سدِ باب ہو گیا، وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے:

ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے ہیں اور جو ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں، ورنہ آج میمتھ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو 'انسان' کہلاتی ہے۔"

میرے ہیجان کا دورہ شروع ہو گیا۔ میں انسان کا "جہلِ مرکب" نہیں برداشت کر سکتا۔ یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں

نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لئے جہاں سوئی سے کام لینا چاہئے وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں۔ سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے، چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لئے ہوتے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر ان کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں کہ "اچھا! اب بے کار بحث کو جانے دو، ایک لطیفہ اور سنو! گانے والوں میں مشہور ہے کہ "جمال منزل" روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی کیا تھا، مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا: "نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ"۔ شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے، انہوں نے کہا: "مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا۔"

"غلط خیال ہے" میں نے جواب دیا۔ "میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہوگا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا۔"

رات زیادہ جا چکی تھی ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا: "آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے، دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، خدا کے لئے آج کے مبحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا: "سائرہ! بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔" اور آ کر اپنے بستر پر لیٹ رہا، نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا، گرمی کی سہانی رت تھی، پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے، میں اٹھ بیٹھا۔ شمیم نے کہا: "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں، یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے؟"

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کئے؟" میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے: "تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی۔"

"ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی۔" یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا، قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علیٰ تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے، ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے والا کوئی نہیں، تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "سمن پوش" یاد آ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں پھر عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا: "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا: "اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں۔" میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔ چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے، لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی، اس پر گھاس اُگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی، میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے

میرا ایما پا کر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا، دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے، مگر باوجود سعیٔ بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا۔ اس لئے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا، اور زمانہ کی رگڑ نے نقوش کو کافی مٹا رکھا تھا میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں، لیکن کچھ بس نہ چلا۔ شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا، تاکہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا، آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید کا مزار" رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم، فوٹوگراف، تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کچھ لکھوں، مگر یہاں اس کی کوشش کرنا "بت پرستوں کے شہر میں نماز کے لئے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح کے کتبہ پر نظر ثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے، رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا، کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرہ سے سگرٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو ٹکٹکی باندھے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی "سمن پوش!" اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا کہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

"تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔ "اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟"

اسی طرح اس نے پھر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس لئے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

"کیا تم سکون سے محروم ہو؟"

"یک قلم" یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

"اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ "میرے لئے دعا کیجئے، جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لئے دعا نہیں کی بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔" اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

"تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

اب سمن پوش، قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا کہ اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں" اس نے کہا۔ "آپ میرا پورا افسانہ عجائبات سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے۔"

"ہاں! ...."

"تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟" میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے، گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لئے

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے ؎

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام گر بجز و ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اس بیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور جو "اسٹوڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے۔"
یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے سمن مزار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا "اسٹوڈیو" رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری، وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ بیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھو گی۔"

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبد العلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا ادعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطقی اپنے اصول، موضوع اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو بل، اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔ اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کم نا ہو گا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا۔ بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

———

ل۔ احمد

بھینٹ

"بھائی آگ تو تُرت ٹھنڈی ہووے نا ہے۔ اور آج بنئے نے کھورا کی روک دی ہے۔ اب جتن کیا؟"
بڑھے مزدور نے بات شروع کی۔

"بابا! کھان تو بھینٹ لے گی جبھی ٹھنڈی پڑے گی!" ایک مزدور بولا۔

"ہاں، کھان مجور کا پالن بھی کرے ہے اور وا کا کال بھی ہے۔ ندی کے سمان اَن داتا بھی ہے اور نگل جانے والا اجگر بھی!" ایک گیانی مزدور نے سمجھایا۔

"دس دنا کی تنکھا مپھت گئی!" ایک ضرورت کا مارا بولا۔

"بیتی سو بیت گئی، آگے کی کہو!" بوڑھے نے توجہ دلائی۔

"بابا کہو سُن کائے کی۔ باہر بھی مرن بھیتر بھی مرن ——— مجوری کائے چھوڑیں!" کان مالک کا ایک گرگا بولا۔

"یا بٹیا اتّی جانوں کہ موت کے جبڑے میں دے دیوے ہے ——— دو چار دنا اور صبر کتا!" ایک صلح پسند نے رائے ظاہر کی۔

"کیوں بھائی آگ مہینا لگی رہے ہے تو وہ کیسے کھدائے جائے۔ اور پھر پاوے کس سے؟" ایک معاملہ فہم مزدور نے کہا۔

"ایسے سمے کھان مالک کو کھورا کی دے چہیئے۔ کھطرے ہیں کھان چالو رکھنے کی منا ہی ہے ——— مالک مینجر اپنے سوارتھ کے لئے دکھا دیں ہیں۔ کہ کھطرہ نا ہے۔" ایک اشتراکی خیال والے مزدور نے اپنی معلومات کا ثبوت دیا۔

"سمجھ کی بات کہو بھائی۔ مالکوں پہ مجوروں کا کیا جور؟" ایک مایوس تقدیر کے مارے نے دخل دیا۔

"جور کون نا ہے؟ آندولن کرو تو سرکار بھی چیتے" وہ اشتراکی بولا۔

"اور کمیٹی کونسلوں کے ممبر کون دنا کام آدیں گے؟" ایک جان کار نے اپنی عقلمندی کا اظہار کیا۔

"ممبر بچارے تو گھنی بھون بھون کر دیں ہیں، پہ اِن کا بس کیا ہے؟" ایک دوسرے جان کار نے حقیقت سے پردہ ہٹایا۔

"بھتا تو ماریں ہیں!" اس مایوس نے غصے کے لہجے میں کہا۔

اس پنچایت میں ہر پہلو سے نظر ڈال کر صورت حال کو سمجھا گیا۔ مزدور آگ سے ڈرتے ہیں تو بھوکا مرنا ہی پڑیگا۔ بنیا نیل چاول بند کر کے اتنے مزدوروں کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے تو اس سے جواب طلب کون کرے؟ مزدوروں کی بھوک اور فاقے کی فکر مالکوں کی جوتی کرے؟ گورنمنٹ وباؤ سے ہی جیت سکتی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو روٹی دینے تھوڑے ہی آئی ہے! ممبر بھتا پاتے ہیں تو گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے حلال بھی کر لیتے ہیں! یہ ساری باتیں ہوئیں مگر بات جہاں تھی وہیں رہی! مزدور اگر جلتی کان میں نہ اُتریں تو کھائیں کہاں سے؟

"تو بھائیو اب پد کیسے بیٹھے؟" بوڑھے نے پنچائت سے پوچھا۔

"بس سویرے کھان میں اُترچلو۔ بچے بوڑھے بھات بنا تر پھینگے تو نا!" کان مالک کا ایجنٹ پھر بولا۔

"بولو بھائیو؟ یائی جتن ہے نا؟ بوڑھے نے پنچایت کی رائے لی۔

"ہاں!" "اور کیا!" "ہاں ہاں!" مختلف آوازیں اُٹھیں۔

چھوٹے ناگپور کا پہاڑی علاقہ کوئلے کی سرزمین ہے۔ جہاں سینکڑوں کانیں چل رہی اور ہندوستان بھر کے مل، فیکٹریاں، انجن اور ریلیں چلا رہی ہیں۔ راجہ، نوابوں کے محلوں کو روشن اور ٹھنڈا کرنے کے لئے، پیسے والوں کی دولت بڑھانے کے لئے ان کانوں کے اندر ہزارہا مزدور کا انسان بنے کدال پھاوڑا چلاتے رہتے ہیں ـــــــ سینکڑوں فٹ زمین کے تلے دن رات پسینہ بہاتے رہتے ہیں۔ کانوں کے قریب ہی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر نہ تو آدمی سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ اس میں ایک چارپائی بچھ سکتی ہے۔ مگر مزدور کا ایک کنبہ اس میں زندگی بسر کرتا ہے۔

کان میں آگ لگ اُٹھی تھی اور مزدوروں نے جان کے خوف سے کام بند کر دیا تھا۔ منیجر نے بہت کوشش کی اور یقین دلانا چاہا کہ آگ بڑھنے کا خطرہ نہیں، مگر مزدور راضی نہ ہوئے۔ دس روز گذر گئے مگر آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ کان کے مالکوں کا ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اور منیجر کی بدنامی تھی۔ مگر مزدور جلتی کان میں کام کرنا نہ چاہتے تھے۔ منیجر نے بقال کو بلا کر حکم دے دیا۔ کہ مزدوروں کو اُدھار خوراکی نہ دے۔ چنانچہ مزدور جب مودی کے پاس سودا لینے گئے تو اس نے ٹھلوے آدمیوں کو آٹا دال دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے تمام مزدوروں میں ہلچل پڑ گئی اور پنچایت بیٹھی کہ اب کیا ہو؟

پنچایت کے سامنے سوال کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ جان کے خوف سے کام چھوڑا، اب کام بند کر دینا جان پر بنا دینا چاہتا ہے! دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جان بچانا ہے تو جان کو خطرے میں ڈالو!

یہ صورتِ حال غریبوں ہی کے سامنے آسکتی ہے، جن کی فریاد نہ انسان سنتا ہے اور نہ خدا کے ہاں سے داد ملتی ہے! اب چونکہ جان دونوں طرح خطرے میں تھی۔ اس لئے ان مزدوروں کے سامنے یہ مصلحت آنا ہی تھی کہ بچوں اور اندھے دھندوں کو مٹھی بھر بھات اس وقت تک پہنچتے رہنا چاہیئے جب تک کان کسی کو نگل نہ لے!

ان مزدوروں میں ایک جھونرا بھی تھا۔ جس نے کام بند ہونے سے چند ہی دن پہلے بدری سے بیاہ کیا تھا۔ بدری کو جھونرا کی جان کا ڈر تھا اس لئے وہ اس کے ساتھ پنچایت میں بھی آئی تھی کہ فیصلہ سنے۔ پنچایت کا یہ فیصلہ کہ مزدوروں کو کان میں اُترنا ہے جھونرا کی ان آنکھوں میں جو جوانی کے ولولوں کا گھر اور پریم رس کا مٹکا تھیں ایک ایسی نظر پیدا ہو گئی جسے "تن بہ تقدیر" کی نظر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اسے بدری سے پیار پریم تھا اور اسے فاقہ کرانا گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ مگر پنچایت کا فیصلہ سن کر بدری کا دل بیسے کا ہو گیا۔

بدری کو کان سے دلی نفرت تھی۔ کان اس کے باپ کو کھا چکی تھی، بھائی کو نگل گئی تھی۔ اور اب پتی کو بھی بھسم کرنا چاہتی تھی! اس لئے بدری کی نفرت کوئی اچنبھے کی بات بھی نہ تھی۔ بلکہ اچنبھا اس پہ ہو سکتا تھا کہ اس کی یہ نفرت کوئی عملی صورت کیوں نہ اختیار کر سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بدری اپنی نفرت کو عملی صورت دیتی تو ساتھ ہی فاقے کو بلاوا بھی دیتی۔

بدری کی عمر کا تو سترھواں ہی برس تھا اور شادی ہوئے چند ہی روز گذرے تھے، مگر اچانک شوہر کی جان جوکھوں میں پڑ جانا ایک ایسی تحریک تھی، جس نے اس کی روائتی شرم اور ناتجربہ کاری کی کم عقلی کے باوجود اس کے اندر تحفظ کی جبلّت کو پوری طرح جگا دیا تھا ——— عورت کی جرأت کو ابھار دیا تھا! اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی چٹیک پیدا کر دی تھی!

پنچایت میں پہنچکر یہ دونوں کنارے ہی بیٹھ گئے۔ بدری کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی آ کر بیٹھا ہے۔ اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا، مگر بدری کی چھٹی حس نے بتا دیا کہ وہ کرما ہے۔

کرما آس پاس کے علاقے میں بڑا جیالا اور سب سے منچلا جوان مشہور تھا۔ وہ آزاد تھا اور نڈر۔ دُنیا جن باتوں پر ایمان رکھتی ہے، یہ نیم وحشی مزدور ان باتوں کا مذاق اُڑاتا تھا۔ دُنیا جن چیزوں سے ڈرتی ہے، یہ بھی کام مزدور ان کو انگوٹھا دکھاتا تھا ——— غرض وہ کسی کھلی یا ڈھکی طاقت اور بل کو دھیان میں نہ لاتا تھا۔ اس کا یہ ناستکی ڈھنگ لوگوں کو ناپسند تھا۔ لیکن لوگ اس پر بھروسہ کر لیتے تھے! دلوں میں اس کی عزت کرتے تھے!

کرما نے دس برس کی عمر سے کان میں کام کرنا شروع کیا۔ اور پورے پندرہ برس لوگوں کو یہ دیکھتے ہو گئے تھے کہ بیسیوں حادثے پیش آئے مگر کرما ہمیشہ بال بال بچ گیا۔ ہر موقعے پر اُس نے پرماتما کا منہ چڑایا اور کبھی بال بیکا نہ ہوا! لوگوں کو اس پہ اچنبھا بھی بڑا تھا۔

پنچایت میں کرما چپ بیٹھا رہا۔ وہ بات کرتا ہی بہت کم تھا۔ بنئے کی طرف سے اس کے دل میں بڑا غصہ تھا۔ یہ لالچی بنیا اتنی جانوں کو موت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے ——— کان بھینٹ ضرور لے گی! کرما بنئے کو قتل کر دینا چاہتا تھا ——— لیکن یہ مزدور تو کان میں اُترنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں! یہ اگر کام پر گئے تو وہ سب سے پہلے جائے گا۔!

بدری کو جب ناتوں سے سابقہ پڑا، تب سے اُسے اُس شکتی پر جسے پرماتما کہا جاتا ہے خود بھی شک ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے اس شک کو پاپ سمجھتی تھی۔ اور اس وجہ سے دل میں ڈر بھی تھا۔

اس شکتی پہ کرما کو بھی اعتراض تھا، مگر وہ اس کا اظہار کھلے بندوں کرتا تھا۔ اور اس کے دل میں ڈر بالکل نہ تھا۔ بدری جب کرما کے منہ سے ایسی باتیں سُنتی تو ایک طرح کی شانتی تو محسوس کرتی، مگر کرما پر کسی آفت آ جانے کا یقین بھی رکھتی تھی۔ جب بھی کرما اس کے سامنے آتا، وہ خیال کرتی کہ اب کرما پر بجلی گرنے ہی والی ہے! وہ جس طرح اپنے خیالوں کو پاپ سمجھتی تھی، اس طرح کرما کی باتوں کو بھی پاپ کہہ لیتی تھی۔ کرما کی باتوں کو پاپ کہہ کر شاید وہ اپنے وچاروں کے پاپ کو دھونا چاہتی تھی! دُنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جو اپنے گناہوں کو دوسروں کے وضو کی دھوون میں بہا دیتے ہیں۔

پنچایت سے اُٹھتے اُٹھتے بدری نے منہ ہی منہ میں پرارتھنا کی۔

"بھگوان! کھان میں سے چھوترا جیتا نکل آئے!"

کرما نے اس کی بہت دھیمی آواز کی کھنک سُن لی اور زور کا ٹھٹھا مارا۔ اس کا یہ ٹھٹھا بدری کو نرم ہنسی کی طرح محسوس ہُوا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کرما کا یہ ٹھٹھا اور کسی نے نہیں سُنا۔ وہ صرف اسی کے سُننے کے لئے تھا!

چھوترا نے پوچھا "کیا کہہ رہی ہے؟"

"کچھ نا ——— آگ بھڑکتی ہو، تو کھان میں مت اُترئیو۔" بدری نے جھونرا کی آستین پکڑ کر کہا۔

"کام پہ نہ جاؤں تو نئی دُلھنیا بھات کیسے پائے؟"

"ہم اور کہیں پردیس جائیں گے۔" بدری نے جواب دیا۔

"پردیس؟" جھونرا نے سوال کیا۔

"ہاں محنت مجوری ہر جگہ ملے ہے!" بدری بولی۔

اپنی پیاری بیوی کے منہ سے اُمیدوں کے خلاف، جگوں کے چلن کے مخالف بات سُن کر جھونرا کو ایک دھکا سا لگا۔ جھونرا نے بتایا:—

"بدری، ہمارے مات پتا تو کہیں نا گئے تھے!"

"ہاں، وہ تو کہیں نا گئے!" بدری نے شرمندہ ہو کر اقرار کیا۔

درخت کی آڑ میں سے پھر وہی قہقہہ سُنائی دیا، جو پہاڑی علاقے کے سناٹے پر چھا گیا۔ کرما پھر سامنے کھڑا تھا۔ مگر بجلی نہ پہلے کبھی گری تھی نہ اس وقت گری۔ مگر یہ ڈر بدری کے دل میں اس وقت بھی تھا۔

کان کے منیجر کو منٹ منٹ کی خبر پہنچتی تھی۔ پیسے والے کی دُور بلا! پنچایت کے فیصلے کی خبر اسی وقت پہنچ گئی۔ اس کے انتظار میں اُسے نیند نہ آ رہی تھی۔ اب وہ پاؤں پھیلا کر سوئیگا۔ مزدور موت کے منہ میں جائیں گے۔ اور اس کی نیک نامی ہو گی!

بہت سویرے کام پر پہنچنے کی سیٹی بجنے لگی اور جھونپڑوں سے لے کر کان کے دہانے تک مزدوروں کی لنگار لگ گئی۔ لیکن دہانے پہ پہنچ کر سارے مزدور اکٹھا ہوتے گئے۔ حالانکہ بجلی کا جھولا انہیں کان میں لے جانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن کوئی مزدور اس پر سوار نہیں ہوا۔ پیٹ کی مار موت کے گڑھے میں لئے جا رہی ہے۔ مگر بچاؤ کی جبلّت پاؤں پکڑے ہوئے ہے!

جھونرا کے ساتھ ساتھ بدری بھی موجود تھی۔ جھونرا کا دامن پکڑے کھڑی تھی۔ بدری کی آنکھیں چاروں طرف کسی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ دُور سے کرما آتا دکھائی دیا تو بدری کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ وہ سب سے پیچھا پہنچا اور بھیڑ کو چیرتا ہُوا جھولے پر جا چڑھا۔ اس کے پیچھے بدری نے جھونرا کو بھی سوار کرا دیا۔ پھر تو سب جانے لگے۔

جھولا جب نیچے اُترنے لگا تو کرما نے بدری کے چکنے گالوں پر آنسو ڈھلکتے دیکھے۔ کرما شاید ان آنسوؤں کی زبان سمجھتا تھا:

"پریم ہے تو میرے پتی کا دھیان رکھنا!"

دن بھر میں بدری نے کان کے دہانے تک کئی چکر کاٹ ڈالے۔ ڈرتی ڈرتی جاتی اور جب وہاں کسی ہلچل کے آثار نہ دیکھتی تو مطمئن ہو کر پلٹ آتی۔ شام کو چھٹی کی سیٹی بجی تو بدری دہانے پہ پہنچ چکی تھی۔ کرما اور جھونرا پہلے ہی جھولے سے اُترے۔ بدری کا چہرہ کلی کی طرح کھل گیا۔ کرما نے اپنا مستقل ٹھٹھا پھر لگایا۔ بدری بھی اس کے ٹھٹھے کا مطلب سمجھتی تھی:—

"تجھے پریم شکتی پہ بھروسا نہیں ——— سنبھال اپنے پتی کو!"

جھولے سے اُتر اُتر کر مزدور مودی کی دکان پہ پہنچے۔ تیل، چاول لے کر خوشی خوشی گھر جانے لگے۔ بدری نے بھی سودا لیا اور جھونرا کے ساتھ جھونپڑی میں پہنچی۔ کھایا پکایا اور پھر ٹاٹ بچھا کر دونوں سو گئے۔ بدری کو فوراً نیند آ گئی۔ مگر جھونرا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بدری کے، کرما کے، اور کان کے دھیان میں جاگتا رہا۔ ایکا ایکی بدری چونک پڑی۔

"کیا ہُوا؟" جھونرا نے پوچھا۔

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوشِ حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونک ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہرحال قصہ سنتے جائیے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جائیے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی۔ جو گو عورتوں میں بھی ہوتی ہے مگر ہم ایسے بورژوا لوگ اس کو مردوں سے منسوب کرتے ہیں یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کہ مرد ان کا تابع فرمان رہتا تھا۔ اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے۔ تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجئے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات۔ کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اُڑائے، مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکز سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیاہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حقدار ٹھیرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ وہ تھان رادھانگری ڈوریئے کے لئے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی یہ ڈوریہ کیسا لاتے ہو؟"

حسن علی: "آپ کے کرتوں کے لئے۔ ڈوریہ وضعدار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا۔"

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لئے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی۔ برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

خیر بھئی!"

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں "میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی۔"

"آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے صبح کو مرغ پک جائے گا۔" تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے۔ اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھبوٗ داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی نئی نکالیں گے۔

بہرحال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے۔ وہ یہ تھا۔ کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہان میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا اگر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنے ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ ادل بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھر کم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے۔ تو حسن علی احدی کو بلوا

چودھری محمد علی ردولوی

تیسری جنس

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔ تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا دیکھا ہی کیجئے شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت، نہ بنوٹ کی شرم، نہ لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آ جائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لئے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بنوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں، قد، چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز ہنسی، چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات ہے مگر واقعہ ہے۔ ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیا میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

"مر گیا ؟ نہیں، کرما نہیں مریگا!"

"جلتے جلتے سرنگ پھوٹ گئی اور آگ پھیلی تو سارے میں دھواں بھر گیا۔ میں بھاگا ———— کچھ نا کدھر سے کرما میرے پیچھے پیچھے تھا۔ دھوئیں سے مجھے مرچھا آ گیا تو کرما اٹھا کر دوسری سرنگ میں لے گیا۔ وہاں دھوآں نا تھا۔ پر وہ بھی بہت دھوآں کھا گیا تھا۔ بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر آیا تو دوا دارو سے میں تو اچھا ہو گیا۔ پر کرما ———— کرما مر گیا!"

"نہیں، کرما نہیں مریگا!" بدری نے چیخ کر کہا۔

"کرما کے کھیسے سے یا کنٹھا نکلا تھا۔ تیرے کارن لایا ہوگا ———— کرما کو تیرے ساتھ پریم تھا۔"!

بدری نے جھپٹ کر وہ کنٹھا جھونرا کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور کنٹھے سے باتیں کرنے لگی:۔

"پریم کی مالا! کرما مر گیا ؟ نہیں، کرما نہیں مریگا!"

میرے ایک عزیز ریلوے میں ڈاکٹر ہیں۔ میں ان سے ملنے بکارو گیا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ریلوے کی کوئلے کی کانیں ہیں۔ وہ ہسپتال گئے تھے۔ اور میں بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے متوجہ کر لیا:۔

"کرما مر گیا ؟ کرما نہیں مریگا!"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک خستہ حال جوان عورت بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے چوکیدار نے خموش محبت کی خموش قربانی کی یہ عجیب و غریب داستان سنائی۔

"ڈراؤنا سپنا دیکھا" بدری نے جواب میں بتایا۔

"کیا سپنا؟"

"کچھ نا!"

"اچھا سو جا ——— تنکھا کے دنا بجار ساتھ چلیو۔ تجھے وہ نیلا کنٹھا لا دوں گا۔ جو وا دن کرما کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ نیلے موتیوں پہ تیرا من بڑا للچایا تھا۔"

"وہ کنٹھا بڑا سندر تھا!" بدری نے اٹھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

دونوں سو گئے اور حسب معمول منہ اندھیرے سیٹی بجی۔ سارے مزدور کان میں پھر اتر گئے۔

کرما سب سے پہلے پہنچ گیا تھا، مگر جھولے کے پاس کھڑا رہا۔ بدری اور جھونرا سب سے پیچھے پہنچے۔ جھونرا نے جھولے کی طرف بڑھتے ہوئے کرما سے پوچھا۔

"آج کام نہ کریو گا؟"

"آج تو جرور کرنے!" کرما نے جواب دیا اور سوچتا ہوا جھولے پر چڑھ گیا۔

بدری کھڑی دیکھتی رہی۔ اُس وقت کرما نے کوئی ٹھٹھا نہ لگایا۔ وہ بس بدری کی طرف دیکھتا ہوا کان میں اُتر گیا۔ بدری گھر کو پلٹ گئی۔

رات میں کام کرنے والے واپس آ چکے تھے۔ بدری وہاں سے گذری تو ان مزدوروں کی باتیں سُنیں جو جھونپڑیوں کے سامنے درختوں کی چھاؤں لیٹے بیٹھے بیڑی پی پلا رہے تھے۔

"بھائی رات آگ کا بڑا جور رہا۔ کھان بھینٹ جرور لے گی!" ایک بولا۔

"میں نے کرما کو جتا تو دیا ہے ———"

"اونہو نہہ! کرما سب جانے ہے ——— کیا اور کھان تو منتر ہیں!"

یہ سُن کر بدری دل میں خوش ہوئی۔ کرما کے متعلق اس کا بھی خیال کچھ ایسا ہی تھا۔

دوپہر نہ ہونے پائی تھی۔ کہ خطرے کی سیٹی بجنے لگی۔ مزدوروں کی بستی میں ہلچل پڑ گئی۔ بوڑھے، بچے، عورت، مرد نکل نکل کر کان کے دہانے پر جمع ہونے لگے۔ ہائے والئے کا شور مچ گیا۔ سخت افراتفری پڑی ہوئی تھی۔

سیٹی کی آواز کے ساتھ بدری کی جان سی نکل گئی۔ وہ جہاں تھی، بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایک سناٹا تھا اور دُنیا تیزی سے گھومے جا رہی تھی۔ سب طرف بھگدڑ اور ہنگامہ تھا۔ لیکن بدری کے دل میں سناٹا اور بے صبری تھی۔

اس حالت میں وہ نہ معلوم کتنی دیر بیٹھی رہی۔ اچانک جھونپڑی کے باہر کسی کی چاپ سُنائی دی اور اس چاپ کی آواز نے بدری کو ایک دُنیا سے دوسری دُنیا میں پہنچا دیا۔ بدری کے مُنہ سے بے ارادہ نکلا:۔

"کرما!"

اس کے جواب میں جھونرا جھونپڑی میں داخل ہوا:۔

"کرما نہیں، میں ہوں!"

"کرما کہاں ہے؟"

"کرما؟ وہ تو مر گیا!"

سمجھتے تھے کہ دسترخوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دسترخوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ
اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحبِ اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمنا لوگوں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہو گا۔
دسترخوان پر شوربا گرانا۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پورا پیالہ لڑھکا دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو
کہتے یہی ہیں کہ جو الوان ذرا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دسترخوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی
طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف چھوٹا
بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے
پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت
نہیں ہوتی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس
کے سن میں جنس تلوانا۔ کھانا پکوانا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا۔ دیکھنے
والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھیں تو آئینہ کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر
ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انہوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار
ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں۔ بھتیجے صاحب شادی ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی مگر جہیز
وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولہا بھی تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں آتے تھے۔ مدی
سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری۔ بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آ گئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام
لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔
عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کمسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ اچنبھے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر نور اپنے
کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ نہ اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا
حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا انداز اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی
کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے
تھے۔ خود اپنی ہیچ میرزی اور بی بی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ بھی ہاتھ آجاتا تھا۔ اس لئے
چپ تھے، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا۔ دلائی جھاڑی۔ پائنتی جھک کے دیکھا۔
گھر میں ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئیں۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچا دیا۔ تحصیلدار صاحب
تک خبر ہوئی۔ انھوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولہا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک
پہنچ چکی ہے۔ بھتیجے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے
انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا۔ اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا
نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئیں۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم
تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا۔ داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پن ہی کر بیٹھے اس لئے مدی کا پورے طور سے تحصیلدار ہی صاحب کے یہاں
رہنا اچھا ہے۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لئے معطل کر دیئے گئے۔
جب سے مدی کی شادی ہو گئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی

سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب تے اس سے آشنائی کر رکھی ہے۔ مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لئے علیحدہ گھر اور کچھ بود گی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی مدی نے بھاری بھرکم جوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت، چار پائیوں، الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انھوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک، گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنی طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی بھی چل بسیں وا ب صرف بی مدی اور اُن کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا بُرا کیا ہو گا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اُوپر نہ تھی۔ کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شادی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیتے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانہ نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پاندان سے کھاتے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا۔ عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں، کچھ کپیلیں لیس، صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔ صبح ہوئی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا، آرام کیا، اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پر گت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت و یگانگی کی وہ پینگیں بڑھیں۔ کہ سگی بہنیں مات تھیں۔

صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھنے سینہ کم تھا۔ کمر، کولھے، پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ نہیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا پھر سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ۔ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اعلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہو گی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں۔ اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں

کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہا جاتا تھا۔ مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے۔ اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنے ہی جنس سے تعلقات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا سے ہے اور اس لئے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہیئے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راہ آئی تھی۔ اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی پجڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جوئندہ یابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں اس کے بعد اور بھی ملاکیں مگر ؎

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اسی لئے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیلدار کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پراٹھے کباب بنانا شروع کئے، جاڑوں کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوا لیا۔ چکن کروشیا کا بھی ڈھیر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ارد گرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقہ کے پہنتی تھی۔ گاڑھا پہ وہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی کام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس لئے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں کسی نے کہا "بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے" بی مدی بول اٹھیں۔ "سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنھوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلا ناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدتمندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا مدی بھی ان سے لگی چلی جا رہی ہیں۔ اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لئے شاہ صاحب

کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھیرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں۔ بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلیعم باعور تھے۔ جی چاہے الگنی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی گنی گنٹے ہیں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے۔ تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

---

(٦)
اُردو افسانہ
دُوسرا دور

پریم چند

کفن

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بُجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سُکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک وہ پیسے رہتے دونوں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجب زندگی تھی ان کی! گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے دنیا کے فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے، مار بھی کھاتے، مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے، یا دس پانچ اوکھ

توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پہ چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا، مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے، گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام بھی کر لیتی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔
وہی عورت آج صبح سے دردِ زہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا، ”جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہو گا اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے، کس کے گھر سے آئے؟“

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھڑی میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا، بولا ”مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر کس بات کا ہے، میں تو یہاں ہوں ہی۔“

”تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔“

”میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا، آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہوگی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔“

”میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ، گڑ، تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔“

”سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو۔ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے، گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔“

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا ”وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں، سب کو۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری،

دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم، گول گول مہکتی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے، پتل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی، کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ کر جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کِپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو، کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے، ہاں کھرچ میں کِپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوریاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے جیسے دو بڑے اژدر گینڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھڑی میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اسی طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر، آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا "سرکار بڑی بپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی رات گجر گئی، دن بھر تڑپتی رہی سرکار۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا، مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہو گئے، گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں، اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا، ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا، سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی، آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ کر یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقعہ نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً

دو روپے نکال کر پھینک دئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں، گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دئے، کسی نے چار آنے، ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش کو آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو!"

مادھو بولا "ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کپھن چاہیئے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا۔ لاس اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی، رات کو کپھن کون دیکھتا ہے؟"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیئے۔"

"کپھن لاس کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے، پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی کچھ گزک، اور دونوں برآمدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کُجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آ گئے۔

گھیسو بولا "کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو "دنیا کا دستور ہے۔ یہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں، کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دوگے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا، اس غیر متوقع خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا "بڑی اچھی تھی بچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہوگا؟"

مادھو نے فرقِ عقیدت جھکا کر تصدیق کی "ضرور سے ضرور ہو گا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہر دے سے اسے دعائیں دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کفن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر"

"پوچھے گی تو ضرور"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کفن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے"

مادھو کو یقین نہ آیا۔ بولا "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے"

گھیسو تیز ہو گیا "میں کہتا ہوں اسے کفن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آ جائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی لہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ، کتنے تو چُلّو میں اُلّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں، یا زندہ درگور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا "لے جا۔ خوب کھا اور اسیرباد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیرباد اسے ضرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "بیکنٹھ میں جائے گی دادا۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں اور مندروں میں جل چڑھاتے ہیں"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلوّن نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا، مادھو بولا "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔

مری بھی کتنا دُکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھسیو نے سمجھایا۔ "کیوں روتا ہے بیٹیا۔ خوش ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے:

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں بیکسِ محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اُچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتلائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

سدرشن

جاں نثار

دیوالی کی رات تھی، زمین آسمان بنی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ چراغوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جیسے آسمان کے تاروں کا شمار نہیں مگر یہی چاندنی (؟) رات ہے۔ جب ہزاروں حریص ہاتھ خیالی ثروت کی آرزو میں اپنا اثاثہ لُٹا بیٹھتے ہیں۔ اور پھر اپنی حماقت پر بیٹھے روتے ہیں انسان محنت نہیں کرنا چاہتا مگر اس کے شیریں پھل کھانا چاہتا ہے۔ امید عقل کو دھوکا دے جاتی ہے۔ پورن چند بھی اسی امید سے مسحور ہو چکا ہے وہ دن رات جوُا کھیلتا رہتا تھا۔ اور دیوالی کے قریب آکر تو اُسے کھانے پینے کی سُدھ نہ رہتی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ کبھی نہ کبھی دن نصیبہ چمک اُٹھیگا۔ اُمید ہر بار یاس کی صورت اختیار کرتی تھی۔ مگر پورن چند حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ اور قسمت کے لبساط پر برابر پانسہ پھینکتا جاتا تھا۔ وہ ایک دفتر میں خزانچی تھا۔ دیوالی قریب آئی۔ تو دفتر سے غیر حاضر رہنے لگا۔ مگر مہینے کے آخری دنوں میں دفتر جانا ضروری ہو گیا۔ عملہ کی تنخواہوں کا بل تیار کرنا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے دیوالی یکم نومبر کو تھی۔ ۳۱۔ اکتوبر کو تنخواہوں کا روپیہ آیا۔ مگر پورے چار بجے کلرک گھر جا چکے تھے۔ تنخواہ اُس دن تقسیم نہ ہو سکی۔ لیکن پورن چند نے تنخواہ اسی وقت لے لی اور خوش خوش گھر چلا۔ دیوالی کی رات کا سامان مہیّا ہو گیا تھا۔ رات کو جب لکشمی پوجا ہو چکی تو وہ دیپ مالا دیکھنے کے بہانے گھر سے چلا۔ اور جوُئے خانہ میں جا پہنچا۔ بدقسمتی پہلے ہی انتظار کر رہی تھی جاتے ہی سب کچھ ہار گیا۔ اب اس کی حالت اُس پرندہ سے مشابہ تھی جو مصروفِ پرواز ہونے سے پہلے ہی پر قلینچ ہو چکا ہو۔ اس وقت اس کی بے بسی کیسی دلخراش ہوتی ہے۔ وُہ اُڑنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے کترے ہوُئے پروں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔ اور تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ پورن چند کو ایسا معلوم ہوا گویا دیوالی کی رات کے ساتھ ہی اس کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو رہی ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کہیں سے روپیہ ملنے کی صورت نظر نہ آئی۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال نے سر اُٹھایا امید سامنے کھڑی دکھائی دی .... عملہ کی تنخواہوں کے روپے دفتر میں موجود تھے اور وہ خزانچی تھا۔

پورن چند پر نشہ سا چھا گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دفتر کی طرف روانہ ہوُا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ چراغوں کی بہار میں خزاں کے پہلو نمودار ہو رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کم ہو رہی تھی۔ مگر پورن چند کی آنکھیں اس طرف سے بند تھیں۔ وہ اس طرح بھاگتا ہوا جا رہا تھا جیسے

کسی عزیز یہ بیمار کے لئے کوئی ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہو۔ دفتر میں پہنچا تو چوکیدار دکھائی دیا۔ پورن چند کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چوکیدار نے پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں گنگا دین! کہو کیا حال ہے؟"

گنگا دین نے آواز سے فوراً پہچان لیا اور آگے بڑھ کر بولا "آئیے بابو صاحب۔ بجا ر میں تو خوب رونق رہی ہے۔ آپ یہاں کیسے آگئے؟"

پورن چند کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر زبان پر پورا پورا قابو تھا ہنس کر بولا "کچھ کاغذ بھول گیا ہوں۔ ذرا دروازہ کھول دے۔"

گنگا دین نے فوراً تعمیل کی۔ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید وہ انکار کر دیتا۔ مگر پورن چند خزانچی تھا۔ اُس سے کچھ عذر نہیں کیا۔ بعض دفعہ پیشگی کی ضرورت آ بنتی تھی۔ پورن چند کمرے میں پہنچا۔ اور روشنی کر کے میز کے سامنے ہو بیٹھا اس وقت اس کی عقل اس طرح بے تاب تھی۔ جیسے کبوتر شکرے کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔ بار بار خیال آتا تھا۔ کہ یہ قدم تباہی کی طرف لے جانے والا ہے مگر اس تاریکی میں امید کا دلفریب چہرہ بھی کبھی کبھی نظر آ جاتا تھا آخر پورن چند پر امید کا جادو چل گیا۔ اُس نے تجوری کھول کر چار سو کے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ اور کمرہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کامیابی کا ایک مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُس کا ہر قدم اُسے سرزمین کامرانی سے دور لئے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُسی جوئے خانہ میں تھا۔ جہاں قسمتیں برباد ہوتی ہیں اور تباہی ہنستی ہے۔ اُمید اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔ مگر بدقسمتی اوٹ میں کھڑی مسکراتی تھی۔ پورن چند نے پھر داؤ لگائے اور پھر سب کچھ ہار گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی سے زیادہ خوفناک وہ سپیدۂ سحر تھی۔ جو آہستہ آہستہ نزدیک سرک رہی تھی۔ اس سپیدی سے پورن چند اتنا خائف تھا کہ اس کے تصور سے ہی اُس کی رُوح کانپ جاتی تھی سوچتا تھا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ کل صبح کا سُورج ہی طلوع نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پورن چند گھر پہنچا اس وقت اس کے پاؤں ایسے لڑکھڑا رہے تھے جیسے شراب پی رکھی ہو۔ اس کا باپ رائے صاحب سرجن مل امیر آدمی تھا۔ مگر اس کی امارت سے زیادہ مشہور اس کے بخل کے قصے تھے۔ پورن چند کو کئی بار خیال آیا کہ چل کر ان کے سامنے ساری بات ظاہر کر دُوں تو یقیناً وہ مجھے چار سو روپیہ دینے سے انکار نہ کریں گے۔ مگر پھر سوچا۔ کہ یہ نہیں ہوگا۔ اگر ایسے نصیب ہوتے تو وہ مجھے کوئی کارخانہ نہ کھول دیتے۔ ناحق ذلیل ہونے سے کیا حاصل؟ کوئی اور طریقہ سوچنا چاہئے اب اُسے عقل آگئی تھی، امید کوئی دھوکا نہ دے سکی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ مگر صبح ہوئی تو اُس کا چہرہ قدرے بحال ہو چکا تھا ایک گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے نئے گناہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا خیال اپنے نوکر رونقی کی طرف تھا۔

(۲)

رائے صاحب کے تین نوکر تھے۔ ان میں رونقی سب سے پرانا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ رائے صاحب ہی کی خدمت گزاری میں صرف کیا تھا۔ اس لئے رائے صاحب اُسے سخت سُست نہ کہتے تھے۔ رونقی کو بات چیت کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ بولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا لڑ رہا ہے۔ کام کرنے سے بھی جہاں تک ہو سکتا کترا جاتا تھا۔ ہاں دُوسرے ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اور اس کام کو ایسی مستعدی سے سرانجام دیتا کہ ملازم بلبلا اُٹھتے تھے۔ رونقی کی اس مستعدی کے خلاف رائے صاحب کے پاس اکثر اپیلیں دائر ہوتی رہتی تھیں مگر رائے صاحب رونقی کے فیصلوں کو اکثر بحال ہی رکھتے تھے۔ اس سے رونقی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اکڑ کر کہتا "مگھی کا دمیرا تم نے کیا بگاڑ لیا؟"

مگر رونقی میں کوئی بات ہو نہ ہو۔ یہ بات ضرور تھی کہ وہ مالک کے لئے جان تک نثار کرنے کو تیار رہتا تھا رائے صاحب کو اس پر روپے پیسے کے معاملات میں کامل طور پر اعتماد تھا۔ ان کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ رونقی مر تا مر جائیگا۔ مگر ایک پائی کی بے ایمانی بھی نہیں کرے گا۔ کئی مواقع ایسے آئے، جب رونقی چاہتا تو سیکڑوں روپے بالا بالا اُڑا سکتا تھا، ترغیب نے سنہری جال بچھائے مگر رونقی نے اپنی طبیعت کو ڈانواڈول

نہیں ہونے دیا۔ وہ پرائے روپے کو مٹی کے برابر سمجھتا تھا۔ رونقی کی اس خوبی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔

(۱۳)

دیوالی کے دُوسرے دن صبح کے وقت رونقی اپنے کمرے میں بیٹھا حُقہ پی رہا تھا اور آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں پُورن چند بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا "رونقی مجھے بچالو۔"

آواز میں حسرت تھی، الفاظ میں گھبراہٹ، رونقی کے ہاتھ سے حُقہ چھُوٹ گیا۔ اُسے پُورن چند سے انتہا درجہ کی الفت تھی۔ اُس نے اُسے گودیوں میں کھلایا تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً بے سُدھ پڑا سوتا رہتا تھا۔ مگر جب کبھی پورن چند بیمار ہو جاتا تو ساری ساری رات اُس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اُسے زیادہ تنخواہ پر اپنے ہاں لے جانا چاہا مگر پورن چند کے خیال سے اُس نے سب جگہ انکار کر دیا۔ اور اُسی جگہ پڑا رہا۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر وہ پورن چند سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا۔ جس طرح جنگل کے درخت کو پانی دینے والا اُس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح رونقی پورن چند اور اس کے مستقبل سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اُسے عمر میں بڑا ہوتے دیکھتا تو اس پر روحانی سرور سا چھا جاتا تھا۔ گو یا وہ اس کا نوکر نہیں بلکہ باپ تھا۔ جب وہ کبھی تنہائی میں بیٹھتا۔ تو پورن چند ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اسی کے خیال میں محو تھا۔ سوچتا یہ تھا کہ رائے صاحب جلد اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ رائے صاحب کی دوراندیشیاں اُس کے لئے بخل سے کم نہ تھیں۔ اچانک پورن چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ گھبرا کر بولا "کیوں سرکار! معاملہ کیا ہے؟"

(۱۴)

یہ کہتے کہتے اس نے کونے میں پڑی ہوئی لاٹھی اُٹھالی اور اس طرح تیار ہو گیا۔ جیسے پورن چند کے تعاقب میں کوئی خوفناک ڈاکو آ رہا ہو۔ پورن چند کے غمگین چہرے پر ایک لمحہ کے لئے ہنسی نمودار ہوئی۔ جیسے رات کو آسمان میں جگنو چمک جاتا ہے۔ اُس نے آہ سرد بھری اور کہا "رونقی لاٹھی رکھ دو اس کی ضرورت نہیں۔"

رونقی کے سینہ سے بوجھ اتر گیا۔ لاٹھی رکھتے ہوئے بولا۔ "تو سرکار ایسی کیا آپھت آئی ہے۔ جو مُوں سُوکھ گیو ہے"۔

پورن چند نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے چور چوری کرنے سے پہلے دیکھتا ہے۔ انتہائے فکر نے اُس کے ہوش و حواس باختہ کر دئے تھے۔ اس کو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ آہستہ سے بولا۔ "میرے سر پہ سچ مچ آفت ہی آگئی ہے تم چاہو تو مجھے بچا سکتے ہو کہو۔ میرا ایک کام کرو گے؟"

رونقی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ "ہجور حکم دیں تو کھی (میں) بھاڑ میں کُود پڑے۔"

پورن چند کا چہرہ منور ہو گیا۔ تاریکیٔ یاس میں شعاعِ امید چمک گئی تھی۔ اُس نے جیب سے ایک ہار نکالا۔ اور رونقی کے ہاتھ میں دے کر کہا "یہ بازار لے جاؤ اور بیچ آؤ۔ مجھے ابھی روپے کی ضرورت ہے۔"

رونقی پر بجلی سی گر پڑی۔ ہار دیکھ کر وہ اس طرح سہم گیا۔ جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اُس کی زبان بند ہو گئی دماغ میں ہزاروں خیالات سما گئے۔ وہ رہ کے سوچتا تھا کہ پورن چند کو ایسی کیا ضرورت آپڑی ہے۔ جو ہار بیچنے کی نوبت آئی ہے۔ اور پھر وہ غریب آدمی نہیں۔ رائے صاحب چاہیں تو آدھا شہر خرید سکتے ہیں۔ اُن کو زیور فروخت کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ رونقی سمجھ گیا کہ پورن چند یہ کام رائے صاحب سے چھپا کر کر رہا ہے۔ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ بحرِ خیالات میں بہت دیر تک غوطے کھانے کے باوجود اُسے ساحل نہ مل سکا۔ اُس نے عجیب انداز سے

پورن چند کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں دل رکھا ہوا تھا۔ پورن چند اُسے تذبذب میں پڑے ہوئے دیکھ کر پھر گھبرا گیا۔ شعاعِ امید آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

رونقی نے پوچھا "سرکار! معاملہ کا ہے اتی جرورت کیا بن گئی۔ جو ہار بیچنا ہو؟"

پورن چند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ہار جیب میں ڈال کر واپس چلنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ حسرت و یاس کی زندہ تصویر تھا۔ رونقی کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ پیچھے دوڑ کر بولا "سرکار تم کو کتنے روپے کی جرورت ہے؟"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پورن چند نے پھر اُمید کے لہجہ میں جواب دیا "چار سو کی۔"

"رُوپیا کب چہیئے؟"

"ابھی"

رونقی کے پاس چھ سو کے قریب روپیہ موجود تھا۔ یہ روپیہ اُس نے کئی سالوں میں جمع کیا تھا۔ وہ ساری تنخواہ گھر نہیں بھیج دیا کرتا تھا۔ تین چار روپے ماہوار بچا رکھتا تھا۔ یہ روپے اُس نے اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں دبا رکھے تھے۔ رونقی نے سوچا کہ ہار لے کر بازار میں کہاں بیچتا پھروں گا۔ اپنے پاس سے روپے دے دوں تو کیا حرج ہے۔ پورن چند کوئی اس طرح ہمیشہ تھوڑے ہی تنگدست رہے گا۔ جب اُس کے ہاتھ چار پیسے آئیں گے تو اُس سے اپنا روپیہ واپس لے کر ہار لوٹا دوں گا۔ اس وقت اُس کا کام چل جائیگا۔ یہ سوچ کر اُس نے پورن چند کے ہاتھ سے ہار لے لیا اور کہا "اچھا سرکار! تمرا کام کر دیں گے۔"

پورن چند کی جان میں جان آ گئی۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا رونقی اُس کا نوکر نہیں بلکہ فرشتۂ رحمت ہے۔

(۵)

تھوڑی دیر کے بعد رونقی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ اس وقت اُس کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے چوری نہیں کی تھی۔ بدنیتی نہیں کی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ پورن چند کا کام ہو جائے اور اُسکو رائے صاحب کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر چند کہ جاہل اَن پڑھ تھا۔ تاہم اُسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر پورن چند کا یہ قصور جس کے بارے میں وہ تاحال تاریکی میں تھا، رائے صاحب کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ تو پورن چند کا مستقبل خراب ہو جائے گا اس خیال سے اس کا خون خشک ہوا جاتا تھا۔ . . . . اُس نے جلدی جلدی زمین کھودی روپیہ گن کر نکالا اور زمین پھر سے ہموار کر دی۔ اس وقت اس کے چہرے پر پھر وہی بے فکری و اطمینان کا رنگ ہویدا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن چند امید و بیم کی صورت بنا ہوا آیا۔ اور ہچکچاتے ہوئے بولا "رونقی۔"

رونقی حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا مگر ہاتھ سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پورن چند نے روپیہ دیکھا تو تن مُردہ میں جان آ گئی۔ رونقی کی طرف احسانمندی کے انداز سے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

یکایک رونقی چونک پڑا۔ جیسے کسی کی کوئی قیمتی شے گم ہو جاتی ہے۔ وہ زمین کھودتے وقت ہار دبانا بھول گیا تھا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنی چارپائی کے سرہانے پہنچا۔ ہار وہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگا اب اسے رات کو دبانا چاہیئے۔ دن میں کسی کو شبہ بھی ہو گیا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے ہار کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر طبیعت میں سارے دن انتشار رہا۔

رات ہو گئی تھی رونقی نے دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ مگر ہاتھوں میں سکت نہ تھی دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی سپاہی

گرفتار کرنے کو آرہا ہو۔ جسم برسوں کے مریض کے مانند شل ہو رہا تھا۔ یہ ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ پر رونقی اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہ چلتے تھے۔ مگر وہ زمین کھود رہا تھا۔ یکایک کسی نے دروازے پہ ہاتھ مارا۔ رونقی کے وسوسے پورے ہو گئے گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کیا یہ میرا وہم ہی تو نہیں دروازے پر پھر کسی نے ہاتھ مارا۔ رونقی کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوئے۔ سردی کے دن تھے، مگر اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا تاہم اُس نے حوصلے سے پوچھا "ایس وقت کون ہے؟

"دروازہ کھول دے"۔

رونقی کا چہرہ فق ہو گیا یہ رائے صاحب کی آواز تھی۔ جو حالت بکری کی شیر کی دھاڑ سُن کر ہوتی ہے وہی حالت اس آواز کو سُن کر رونقی کی ہُوئی اُسے اپنی رسوائی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس نے بولنا چاہا۔ مگر گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ رائے صاحب نے کڑک کر کہا۔ "دروازہ کھول دے"۔

رونقی نے لپک کر ہار بستر کے نیچے چھپا دیا۔ ٹمٹماتا ہوا دیا بجھا دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ اُس وقت اُس کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ رائے صاحب نے اندر آتے ہی کہا۔ "دیا کیا ہوا؟"

رونقی نے جواب دیا۔ "سرکار بجھائے دیہ"۔

"ابھی تو جل رہا تھا۔ بجھائے کیسے دیہ؟ فوراً روشن کر دو"۔

رونقی کے اندیشے مادی صورت اختیار کر رہے تھے۔ حیل و حجت کرنے لگا وہ چاہتا تھا کہ یہ وقت ٹل جائے۔ تو بعد میں سینکڑوں بہانے تراشے جا سکتے ہیں۔ وقت اخفائے جرم کے لئے بہترین امداد ہے۔ مگر رائے صاحب نے اس کی مہلت نہ دی۔ جیب سے دیاسلائی نکال کر خود چراغ جلایا۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر بولے۔ "یہ تو کیا کر رہا تھا؟"

رونقی نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ "سرکار جو مہینہ ملتا ہے۔ اُس سے بچائے بچائے کر کسی بکت کے لئے مٹھی یہاں کچھ داب دیا کرتا ہوں۔"

"مگر آج کیا دابنے لگا تھا۔ ابھی تو تنخواہ بھی نہیں ملی"۔

جھوٹی زبان بند ہو گئی۔ رونقی رائے صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ رائے صاحب نے آگے بڑھ کر زمین سے مٹی ہٹائی اور روپوں کی پوٹلی دیکھی پھر بستر ہلایا۔ ان کا خیال تھا۔ کہ شاید رونقی نے جوا کھیلا ہے کیونکہ اُس سے اور کسی بے ایمانی کی انہیں مطلق توقع نہ تھی۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر کیسی حیرت ہُوئی کہ رونقی کے بستر کے نیچے ہار پڑا تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہ فعل کرتا۔ تو رائے صاحب ممکن ہے درگذر کر جاتے۔ مگر رونقی کو اس حالت میں دیکھ کر اُن کا خون جوش مارنے لگا۔ انہوں نے نہایت نرمی سے جو سخت غصے سے بھی خوفناک ہوتی ہے پوچھا "یہ ہار کیسے اُٹھایا؟ یہ تو ابھی چند ہی دن ہوئے خریدا تھا"۔

رونقی میں خواہ لاکھوں عیب تھے۔ مگر وہ چور نہ تھا۔ اس صفت کے لئے رائے صاحب اکثر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وقت اسکی وہ تمام نیک نامی خاک میں ملنے کو تھی۔ رونقی نے سوچا۔ اب تمام واقعہ صاف صاف کہہ دینا چاہئے۔ پورن چند آخر رائے صاحب کا بیٹا ہے۔ اُسے کھا تو نہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے حوصلہ مندی کے انداز سے سر اُٹھایا اور ہاتھ باندھ کر جواب دیا "سرکار! معاملہ یہ ہے کہ.........

اتنے میں اس کی نگاہ پورن چند پر پڑی۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے کسی کو بخار چڑھ رہا ہو۔ اُس نے ایک عجیب انداز سے رونقی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ رونقی کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے پورن چند نے اُسے کہا ہے۔ آخر تم کمینہ نکلے۔ مَیں نے تم پہ اعتبار کیا تھا۔ مگر تم اس کے نااہل ثابت ہُوئے۔ کاش مَیں یہ پہلے سے سوچتا تو اس وقت رسوا نہ ہوتا۔

جس طرح ہوا کا رُخ بدلنے سے پتنگ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اُسی طرح اس نگاہ سے رونقی کا ارادہ تبدیل ہو گیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خود

بدنام ہو نگا مگر پورن پر پر حرف نہ آنے دونگا۔ یہ سوچ کر اُس نے رائے صاحب سے کہا "سرکار معاملہ یہ ہے کہ مُجھی نے چوری کی ہے"۔

رائے صاحب اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئے اس وقت اُس کو ایسا افسوس ہوا گویا ہزاروں کا نقصان ہو گیا ہے مگر پورن چند دل ہی دل میں اس پر عش عش کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو اپنی غرض کے لئے دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

رائے صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر کہا "تم صبح ہونے سے پہلے پہلے میرے مکان سے نکل جاؤ۔ بس یہی تمہاری سزا ہے"۔ رونقی اور پورن چند دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(۶)

اس کے ایک سال بعد رائے صاحب سرجن مل کا انتقال ہو گیا۔ اب سارے روپے پیسے کا پورن چند ہی مالک تھا۔ اُس نے کریا کرم سے فارغ ہو کر رونقی کے نام چار سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا۔ اور ساتھ ہی خط لکھا کہ "تم فوراً میرے پاس آ جاؤ"۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد منی آرڈر واپس آ گیا۔ ساتھ اُس کے بھائی کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ اُسے مرے ہوئے ایک سال گذر گیا ہے۔ وہ جب آپ کے یہاں سے آیا تو ہمیشہ اُداس رہا۔ یہی اُداسی اس کے چہرے سے دم واپسیں تک نہیں گئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کوئی روگ ہے۔ مگر کیا روگ ہے؟ یہ کبھی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

پورن چند پر اس خط کا ایسا اثر ہوا کہ کئی دن تک روتا رہا۔ اب اُس نے جُوا کھیلنا ترک کر دیا ہے۔ اور رونقی کے نام پر ایک دھرم سالہ بنوا دی ہے اور اس میں اس کی قد آدم تصویر رکھی ہے۔ لوگ اُس کی حماقت پر ہنستے ہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ رونقی کی جان نثاری کے مقابلے میں اتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔ جتنی ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں۔

عظیم بیگ چغتائی

چینی کی انگوٹھی

(۱)

انگوٹھیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ ان سب میں سونے اور چاندی کی زیادہ مشہور ہیں۔ پھر بعض انگوٹھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا انگلی میں ڈالنا وبالِ جان ہو کر "انگوٹھی کی مصیبت" ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں میرا مطلب ایک عجیب و غریب "چینی کی انگوٹھی" سے ہے۔

ایک بڑے ضروری کام سے میں لکھنؤ سے بھی آگے جا رہا تھا۔ ایک دن لکھنؤ ٹھہرتا تھا۔ گویا یہ کہیئے کہ فی الحال لکھنؤ جا رہا تھا۔ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر اپنا اسباب کا نپور والی گاڑی میں رکھ کر اسٹیشن پر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ ابھی گاڑی میں کافی وقت تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ریفرشمنٹ روم کو سونگھنے لگا، جالی میں سے اندر جھانکا۔ کچھ شبہ سا ہوا۔ غور سے جو جھانک کر دیکھا تو بھائی شذری! واللہ کس شان سے پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ سامنے میز پر "لبالب" "نہیں بلکہ" "لدالد" "بھری ہوئی ایک کشتی رکھی تھی۔ جس میں کیک، پیسٹریاں، چاکلیٹ، توس، مکھن، انڈے وغیرہ اور نہ معلوم کیا کیا بلائیں درج نہیں۔ علاوہ چائے کے۔ بس کھانے کو بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ بیٹھتے بیٹھتے کچھ پیروی سنتِ رسول کا پاس یا پھر یہ کہ ابھی ابھی اپنی ناک مروڑی تھی، کچھ بھی ہو لپک کر ہاتھ دھونے کے لئے برابر والے کمرے میں نل پر پہنچے۔ اور ادھر لپک کر میں ان کی جگہ ....

...... بھائی شذری کے آنے کی آہٹ سُن کر میں نے گردن نیچی کر لی۔ میں نے کیک کھانا شروع کیا تھا۔ اور لمحہ بھر میں ہی آدھے پر پہنچ گیا تھا۔ ویسے گو "شارٹ ہینڈ" تو میں نے نہیں سیکھا لیکن کھانے میں بحمداللہ کافی سے زیادہ "زود نویس" ہوں۔ بھائی شذری اُدھر سے بھوک پہ دھار رکھے ہوئے آئے اور مجھے گردن جھکائے "محوِ خدمت" دیکھ کر بولے "ارے تم کہاں!"

میں منہ چلا رہا تھا تیزی سے! اور چونکہ بہ نسبت پلیٹ میں کیک رکھا رہنے کے ضروری خیال کرتا تھا کہ میرے پیٹ میں رہے۔ لہٰذا اپنے رخساروں کے لحاظ سے کچھ کچھ حضرت ڈارون کے مسئلۂ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر ورنہ تفسیر بنا بیٹھا تھا۔ لہٰذا بولتا کیا خاک۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کہہ کر بھائی شذری بھی کھانے پر پل پڑے۔ کیونکہ یہ موقع علیک سلیک کا بالکل نہ تھا۔ اور پھر علاوہ اس کے بھائی شذری ویسے بھی ایک قلفی کی برف والے کا مٹکا لوٹنے میں نمایاں حصہ کالج میں لے چکے تھے۔ جس نے شکایت کرنے کے لئے اِدھر اُدھر

بھاگنے یا غل مچانے کی بجائے کہ ہائے مجھے لڑکوں نے لوٹ لیا، یہ کیا تھا کہ خود بھی اپنی ہی قلفیاں لوٹنے لگا۔ وہ جلتا اور لڑکے ہارے۔ کیوں کہ اس نے اپنے ماہر ہاتھوں سے قلفیاں کھول کھول کر چابک دستی سے ہتھیلیوں میں پلٹ پلٹ کر تیزی سے برف کھانا شروع کر دی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے پیٹ میں پہنچ جائے بہتر ہے۔

جب کیک اور عمدہ قسم کی مٹھائیاں ختم ہو چکیں اور گویا گھوڑ دوڑ ختم ہو لی اور محض روکھی سوکھی چیزیں رہ گئیں تب کہیں جا کر تبادلۂ خیال ممکن ہوا۔ اب مجھے بھی اطمینان تھا اور انھیں بھی۔

"کہاں جا رہے ہو یار؟" بھائی تنذری نے پوچھا۔

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے جواب دیا۔

"پہلے تم بتاؤ!" بھائی تنذری نے چائے کی پیالی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

میں نے بھائی تنذری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوکھے منہ سے کہا۔

"ذرا ٹونڈلے تک آیا تھا۔"

"جھوٹے ہو،" بھائی تنذری نے چائے کی پیالی کو منہ پر سے ہٹا کر کہا "میں خود ٹونڈلے تک آیا تھا۔" پھر اپنا منہ چائے کی پیالی سے ڈھک لیا۔ ہم دونوں جھوٹ بولے۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ دوسرا کہے کہ میں کرایہ دوں گا۔ میرے ساتھ چلیے۔ پھر لطف یہ کہ دونوں کو معلوم تھا کہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔

"کہاں بیٹھے ہو؟" میں نے برجستگی سے پوچھا۔

"سیکنڈ کلاس میں"۔ بھائی تنذری کے منہ سے نکل گیا۔ اور پھر اپنی غلطی محسوس کر کے اسی چائے کی پیالی سے، جس سے کھیل رہے تھے جھنک کر کہا "بے ایمان کہیں کا۔"

یہ کہہ کر اپنی حماقت پہ ہنسنے ہی والے تھے کہ زور سے سیٹی بجی۔ گاڑی چھوٹنے کی اس نامعقول سیٹی کو سنکر ہم دونوں گویا ایک دم سے جاگ اٹھے اور بھاگے ہم دونوں مگر بھائی تنذری مع چائے کی پیالی کے۔ جس کا کنڈہ کھیلتے کھیلتے اب انھیں پتہ چلا کہ انگلی میں پھنسا ہوا ہے۔ ادھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر پیالی پار کئے جاتا ہے تو الگ پکارا کہ "لینا!"

ایک وقت میں بھائی تنذری کے ذمے اب دو کام تھے۔ ایک تو اپنی انگلی دیکھ کر چائے کی پیالی کا پھنسا ہوا کنڈا نکالنا اور دوسرے بے تحاشا سر پہ پیر رکھ کر بھاگنا کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ نتیجہ اس کا ناظرین خود معلوم کر سکتے ہیں سوائے اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب و غریب طریقے سے انگلی میں چائے کی پیالی کا صرف کنڈہ ہی کنڈہ رہ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ قبل اس کے کہ میں عرض کروں کہ کس طرح ایسا ہوا۔ ضروری ہے کہ یہ بھی عرض کر دوں کہ نہ تو کوئی ریلوے ریگولیشن ایسا ہے کہ دو بدحواس بیک وقت پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے پائیں اور نہ پھر یہ کسی قاعدے یا بائی لاز کی رو سے ممنوع ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر کوئی بدحواس خوانچہ پھاندنے کی کامیاب یا ناکام کوشش نہ کرے۔ پھر ویسے بھی بدحواسی جرم تو نہیں۔ چنانچہ ادھر سے میرا شیر بیشۂ حماقت تنذری چلا ہے اور ادھر سے ایک اور صاحب زور شور سے ایک خوانچہ پھاند کر ریل چھوٹنے کی گھبراہٹ میں چلے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان دونوں کا ریلوے کی اصطلاح میں "میل" ہوا جیسے دو گاڑیوں کا ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تحقیق کے ساتھ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے تاک کر اپنی ناک بھائی تنذری کے ہاتھ میں پھنسی ہوئی پیالی پر ماری تھی یا پھر بھائی تنذری ہی نے ایک اندازِ قادرانہ کے ساتھ خود ان کی ناک پر پیالی کا وار کیا تھا۔ کچھ بھی ہو دونوں گر کر اٹھے "اندھا ہے بے!" بھائی تنذری کے منہ سے نکلا۔ چشم زدن میں دونوں اٹھ کر سامنے والے ہی انٹر کلاس میں چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں

کہ میں ان دونوں حضرات سے دو سیکنڈ پہلے پہنچا تھا اور مجھے دیکھ کر ہی بھائی شنذری اپنا سیکنڈ کلاس چھوڑ کر جلدی میں اوپر آ گئے تھے۔ ہوٹل کے خانساماں کو مبلغ ایک روپیہ کلدار چائے کی پیالی کی قیمت یا جرمانہ پیش کیا۔ اب بھائی شنذری نے اپنے کلمہ کی انگلی کو دیکھا۔ جس میں چائے کی پیالی کا کنڈہ ہی کنڈہ پھنسا رہ گیا تھا۔ کھڑکی میں ہاتھ مار کر وہ توڑنے لگے کہ میں نے یونہی بغیر کسی وجہ کے ہاتھ روک کر کہا" یار اسے مت توڑو، ایک روپے کا ہے مجھے نکال دو۔"

(۲)

قبل اس کے کہ میں اپنا قصّہ بیان کروں، ضروری ہے کہ کچھ "چانٹے" یا "تھپڑ" کی اقسام و ماہیت پر بحث کروں۔ پنجاب سے لیکر دکن تک اگر ہاتھ کو کسی کے گال پر مارا جائے یا گال کسی کے ہاتھ پر مارا جائے تو کہا جاتا ہے۔ کہ چانٹا مارا یا چانٹا پڑا۔ لفظ "چانٹا" بہت عام ہے۔ تھپڑ بھی عام ہے لیکن ان دو الفاظ کے ہم معنی جتنے لفظ یو۔پی اور نیز دوسرے مقامات پر رائج ہیں ان کی "تلفظی" سائیکالوجی پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں چانٹے کے لاتعداد اقسام ہو سکتے ہیں۔ وہاں عوام نے مناسبت سے علیحدہ علیحدہ نام بھی رکھ لئے ہیں۔ چانٹا وہ ہے جو غصّہ میں کسی کے گال پر "عرض" کیا جائے۔ اس کے تلفظ ہی میں انگریزی اصطلاح آنو موٹو پیا مضمر ہے۔ یعنی لازمی ہے کہ چانٹا آواز کے ساتھ سرزد ہو۔ ایک پٹاخے کی آواز کا مفہوم لئے ہوئے ہے تھپڑ اس کا ہم معنی اور ہم مطلب لفظ کسی طرح نہیں۔ کیونکہ تھپڑ میں لازمی طور پر چٹاخے کی آواز مفقود ہے، وہ آواز جس کا تعلق محض انگلیوں ہی سے ممکن ہے۔ تھپڑ میں بدقسمت گال پر علاوہ ہاتھ کی انگلیوں کے کچھ حصّہ ہتھیلی کا بھی پڑتا ہے جو آواز کی لطافت کھو دیتا ہے۔ مگر ضرب البتہ بھاری پڑتی ہے۔ انگلیوں کے نشان گال پر ایک تھپڑ میں پڑنا لازمی نہیں۔ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ تھپڑ اور چانٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چانٹے کا ہم معنی لفظ طمانچہ ہے۔ مگر اس میں بھی وہ تیزی نہیں جو چانٹے میں ہے۔ پھر طمانچہ برابر والوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لئے مخصوص ہے۔ تھپڑ کو بعض لوگوں نے لپڑ بھی کہا ہے۔ یہ لفظ غیر فصیح ہے۔ مگر کیا کیا جائے جہاں مجبوری یہ ہو کہ ایک طرف گال کسی موٹے آدمی کا ہو تو ہاتھ بھی مولانا شوکت علی کا۔ چربی کے وجود نے اس میں سستی پیدا کر دی ہے۔ غرض اسی قسم کے اور بہت سے الفاظ ہیں چنانچہ انہی الفاظ میں سے ایک نہایت عامیانہ لفظ "زپاٹہ" ہے۔ یو۔پی سے اتر کر شاید بھوپال کی طرف بولا جاتا ہے۔ اس بھوپالی زپاٹے میں برق رفتاری اور انتہائی تیزی و تندی اس قدر زیادہ موجود ہے کہ بیان سے باہر۔ دراصل یہ چانٹا ہے۔ ایک بے حد تیز قسم کا۔ بوجہ اپنی رفتار کی تیزی اور زناٹے کے، چانٹے اور طمانچے کی مخصوص چٹخدار آواز پر اس کی تیزی کا زناٹا غالب آجاتا ہے۔ گو ویسے چانٹا ہونے کی وجہ سے اس میں چانٹے کی مخصوص آواز ضرور موجود ہے اور وہ بھی بدرجۂ اتم۔ لہٰذا "زپاٹا" وہ چانٹا ہے۔ جس میں ایک چانٹے کی تمام خطرناک طاقتیں موجود ہیں اور برق رفتاری اس کے علاوہ۔ اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنا قصّہ شروع کرتا ہوں۔

عموماً مسافروں کا قاعدہ ہے کہ سفر کی گڑبڑ سڑبڑ میں ضروری چیزیں ساتھ لینا بھول جاتے ہیں۔ جیسے ناشتہ دان، لوٹا، عقل، اخلاق، تہذیب وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ قصداً بھی اسباب کے بکھیڑوں کی وجہ سے سامان ضروریات لے کر ہی نہیں چلتے۔ چنانچہ یہی بھائی شنذری کا اصول ہے۔ کہ عموماً عقل، اخلاق اور تہذیب وغیرہ قسم کی تمام چیزیں قصداً سفر کی طوالت کی وجہ سے گھر پر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ مضبوط الاعضا حضرت جن سے بھائی شنذری کی ٹکر ہوئی تھی ایک لیڈی کی پوری سیٹ پر دراز تھے۔ اور منہ پر اخبار تھا۔ چھوٹا ڈبہ تھا۔ جگہ بالکل نہ تھی۔ اور دوسرے مسافروں کے آرام سے یہ بے نیازی اور غفلت بھائی شنذری کو بے حد ناگوار گذری۔ چنانچہ بھائی شنذری

نے کہا۔

"اخبار پھر پڑھیے گا ذرا اُٹھ کر بیٹھئے۔"

انھوں نے اخبار کو منہ سے ہٹایا اور جواب میں اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں تاکہ ہم لوگ وہاں بیٹھ جائیں۔ اور پھر اخبار منہ پہ۔ بھائی شنذری کو بھلا یہ رعونت کب گوارا۔ ان کے ہاتھ سے جھٹ اخبار چھین کر ڈانٹا۔

"آپ آدمی ہیں........"

وہ تڑپ کر اُٹھے۔ اخبار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ کیا بدتمیزی!" اور بھائی شنذری نے اخبار اُونچا کر کے کہا۔

"یا وحشت!"

"ادھر لاؤ اخبار" بڑھ کر انھوں نے ڈپٹ کر کہا "بدتمیز کہیں کے" غضب ناک ہو کر انھوں نے پھر کہا۔ اس کے جواب میں بھائی شنذری نے ان کا چھ آنے کا ٹائمز آف انڈیا ریل کے باہر پھینک دیا۔

اِدھر بھائی شنذری نے اخبار پھینکا اور اُدھر انھوں نے جل بھُن کر کباب ہو کر ایک اسّی نمبر کا زناٹا اس زور سے بھائی شنذری کے گال پر عرض کیا ہے کہ باوجود ریل کی گھڑگھڑاہٹ اور زن زناہٹ کے زناٹے کے زناٹے اور تڑاخے سے ڈبہ گونج گیا۔ بھائی شنذری کا منہ چرخے کی طرح گھوم گیا اور بانکا فیلٹ ہیٹ وہ گرا۔ بھائی شنذری نے سنبھلتے ہی ایک دو تین ہاتھ تابڑ توڑ ان کے دیئے۔ انھوں نے حملہ کر کے روک کر بقول کسے "الجھاوے" سے ہاتھ نکال کر ایک زناٹا بھائی شنذری کے اور دیا۔ کوئی چھپتر نمبر کا۔ مگر اب میں بھی اپنے عزیز دوست کی امداد پر آ چکا تھا۔ مگر تین گھونسوں میں سے ایک تو اوپر والی بنچ پر پڑا تھا۔ دو غنیم کے لگے تھے۔ اس دوران میں علاوہ ان دو زناٹوں کے طرفین سے دس بیس ہاتھ چل چکے تھے۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ اور ہم دونوں قطعی دشمن پر بھاری پڑتے کہ "ہیں ہیں" کر کے دو تین مسافروں نے قابو میں کیا۔ اس کے بعد سخت کلامی کے مدارج طے ہونے لگے۔ اور کس مشکل سے لوگوں نے شیروں کو قابو میں کیا ہے کہ بیان سے باہر۔ ہم دونوں دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ کیونکہ دراصل میں ایسے موقع پر تھا کہ جدل میں اچھی طرح شرکت ہی نہ کر سکا تھا۔ اب اس جنگ کے نتیجہ پر غور کیجئے۔ چائے کی پیالی کے کنڈے کی دھار دار گرہ سے دشمن کے بائیں ہاتھ کی پشت پہ زخم کاری لگا تھا۔ علاوہ اس زخم کے دشمن پہ کوئی وار ہی سالم نہ اُترا۔ یا تو کلائی پر رُک گئے یا اوچھے پڑے۔ مگر ادھر بھائی شنذری کے گال پہ زناٹوں کے نشان کس صفائی سے موجود تھے کہ کان تک گواہی دے رہا تھا۔ اصطلاحاً یہ مار پیٹ تھی۔ مگر دراصل "پیٹ"، کیونکہ غور جو کیا تو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ بھائی شنذری پٹے ہیں۔ کیا میرے مشیر نے بھائی شنذری کے چانٹے دیئے ہیں کہ ہنسی کو روکنا مشکل تھا۔ ہم دونوں اب دوسری بنچ پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنا شروع کیں۔ اس نشان سے بھائی شنذری سنسنے سرکار نکال کر سکا بیا ہے کہ جیسے ان کو پیٹنے سے نہ کبھی علاقہ رہا۔ اور نہ ہے۔ "اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے۔" بھائی شنذری نے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں چپکے سے کہا۔

"قطعی" میں نے کہا اور غور کرنے لگا کہ اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے۔ اس جملہ کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں ہے کہ اس سے آگے چل کر بھی پٹیں گے کیونکہ یہ نالائق شخص نہ صرف تگڑا تھا بلکہ قطعی طور پر ہم دونوں سے اچھی طرح نبٹ لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ گو چاہتا میں بھی یہی تھا کہ اس موذی کو کسی طرح آگے چل کر موقع دیکھ کر ماریں۔

اب ہم دونوں میں باتیں شروع ہوئیں۔ بھائی شنذری کو میں ان کے سیکنڈ کلاس میں بھلا کیوں جانے دیتا۔ اور پھر شاید وہ خود بھی نہ گئے غرض اب باتیں شروع ہوئیں اور سچ سچ حال ایک دوسرے کو بتانا پڑا۔ بھائی شنذری لکھنؤ جا رہے تھے۔ اور وہاں سے ایک دوسری جگہ اپنے ایک "بڑے گہرے دوست" سے ملنے۔

"یہ کون دوست ہیں تمہارے؟"

"ایک ہیں" بھائی شنذری نے جواب دیا۔

"کون ہیں آخر؟ کیا نام ہے ان کا کچھ تو بتاؤ؟"

"دوست تو کیا ہیں" بھائی شنذری بولے "ایک اُلّو تو پھنسا ہے عجیب احمق ہے"

"کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"محض ذرا سی ملاقات پر یا تعارف پر خط پہ خط، ملاقات کا شوق تقاضے پہ تقاضا، ناک میں دم کر دیا ہے یار میرے نے، مجبوراً وعدہ کرنا پڑا کہ بھئی لکھنؤ آئے تو تم سے بھی ملیں گے۔ چلو نا یار تم بھی چلو" مجھ سے بھائی شنذری نے زور دے کر کہا "چلو نا تم بھی"

(وہ حضرت جن کی ہم سے جنگ ہوئی تھی غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ اور گھورتے ہوئے پاخانہ گئے)۔

میں نے کہا "یار پہلے یہ بتاؤ کہ ہے وہ کون، کیا نام ہے، کیا کرتے ہیں، تم سے کب ملاقات ہوئی؟"

بھائی شنذری نے سارا حال بتایا، نام بتایا، زمیندار ہیں۔ شکار کے بے حد شوقین ہیں، ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ غائبانہ تعارف ہے۔ اور وہ بھی ایک بندوق کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں۔ اور پھر ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست ہیں"

"پھر تم نے اُسے بیوقوف اور احمق کیوں کہا؟" میں نے بھائی شنذری سے پوچھا۔ اور ادھر وہ حضرت پاخانہ سے واپس آ کر بھائی شنذری کے مضروب گال پر اپنی انگلیوں کے نشان غور سے دیکھنے لگے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں اور اپنی کارگزاری کو دیکھ کر مسکرا دئے۔ واقعی بھائی شنذری کے سخت زناٹے انھوں نے رسید کئے تھے۔ شنذری بھائی نے ان کی مسکراہٹ اور وجہ مسکراہٹ کو معلوم کر لیا اور جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ان کی طرف دیکھ کر کہا جیسے کہ کھا جائیں گے ان کو۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے اور بھائی شنذری نے اس سلسلہ میں کہا۔

"مجھے دراصل ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے کہ خواہ مخواہ دوستی کا ڈنڈا رٹے جاتے ہیں"

میں نے کہا "یار وہ پہلی مرتبہ ملے گا تو خاطر بے حد کرے گا"

"جب ہی تو کہتے ہیں نا کہ چلو تم بھی۔ ایسا اُلّو کم پھنستا ہے۔ خوب پیچ پیچ کر کھائیں گے۔ کہ یاد ہی کرے کہ آیا تھا کوئی"

"کرایہ داخل کرو" میں نے کہا۔

بھائی شنذری راضی ہو گئے۔ اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ساتھ چلیں گے۔ اور اس احمق کے یہاں نہایت بے تکلفی سے ڈٹ ڈٹ کر کھائیں گے۔

(۴)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اور کیل لئے اسٹیشنوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ اور دو آنے کے پیسے لیکر آپ کا نام وہیں کا وہیں برتن پر کھود دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کاریگر ہمارے ڈبے میں آیا۔ ریل رکنے پر ایک اسٹیشن پر لگا ایک صاحب کے لوٹے پر نام کھودنے یہاں بھیڑ لگ گئی۔ کس صفائی سے خط نستعلیق میں نام کھودتا تھا۔ بیحد پسند آیا خصوصاً بھائی شنذری کو۔ ان کے پاس لوٹا نہ تھا۔ میرا لوٹا لے کر کہنے لگے اس پر نام کھدوائیں گے۔ میں اس بد ذوقی کا سخت مخالف مگر بھائی شنذری نہ مانے اور نام کھدوانے لگے۔ نام کھدوا کر لوٹا تو ایک کنارے رکھا اور لگے ہم دونوں اسٹیشن پر ٹہلنے۔

قبل اس کے کہ میں بیان کروں کہ پھر کیا ہوا۔ ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنے اور بھائی شنذری کے بارے میں ایک بات عرض کر دوں۔ ہم دونوں

علیگڈھ کالج کے تعلیمیافتہ بھائی تنذری تعلیم ختم کر چکے تھے۔ اور مجھے ابھی ایک سال اور پڑھنا تھا۔ ہم دونوں کے خیالات صنفِ نازک کے بارے میں بے حد بلند واقع ہوئے تھے، اور ہیں۔ چنانچہ کس بے کلی سے ہم دونوں نے دیکھا ہے کہ تیسرے درجہ کے زنانہ ڈبے سے ایک نوعمر خاتون نے اپنی گردن ایک طرف کو نکال کر جھکا رکھی ہے۔ اور ایک ہاتھ میں لوٹا لئے پانی والے کو پکار رہی ہے۔ ہم کو تسلیم ہے کہ ہم اس کو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ نہ کسی اور وجہ سے بلکہ شاید اس کے معصوم اور بھولے چہرے پر مظلومیت اور افسردگی دیکھ کر، وہ پانی مانگ رہی تھی اور کوئی نہ سُنتا تھا۔ ہم دونوں چونکہ بالکل قریب سے گذرے اور بھائی تنذری تو بالکل ہی قریب سے، لہذا اس نے اپنا ہاتھ اور سر سب کچھ ڈبے کے اندر کر لیا۔ واپس تیزی سے لوٹتے میں ہم دونوں نے ایک دبی ہوئی آواز میں سُنا "چلبلی کی انگوٹھی" مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی۔ ایک اور چھوٹی سی لڑکی سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے جو بھائی تنذری کی طرف اُنگلی اُٹھائے ہوئے تھی۔ شاید اس کے جواب میں یہ کہا ہوگا "یہ چلبلی کی انگوٹھی" یا چائے کی پیالی کا کنڈہ بدستور بھائی تنذری کے دائیں ہاتھ کی کلمہ کی اُنگلی میں پڑا ہوا تھا جس سے وہ برابر باتیں کرتے میں کھیلتے جاتے تھے۔

گرمی کی تپش سے ہر جاندار کو پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور خصوصاً سفر میں متواتر تین اسٹیشنوں پر ہم دونوں نے اس غریب لڑکی کو پانی کیلئے لوٹے کو جھنڈی کی طرح ہلاتے دیکھا۔ اور اگر اس ہندوستان میں پردہ چلنے کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہوتا کہ کسی غیر جنس کی طرف دیکھنا بھی مذہباً کفر ہو تو ہم کبھی کا اس کو پانی دے چکے ہوتے دو ایک اسٹیشن بعد ہمیں اس کا خیال بھی نہ رہا کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

بھائی تنذری سیکنڈ کلاس کے مسافر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور لیمن سوڈا برف پینا چاہتے تھے مگر لطف تو دیکھئے میرے خرچ پر۔ میں نے تجویز کی کہ برف خرید کر شربت بنا لیا جائے، چنانچہ گاڑی میں سے برف لیا۔ اور پانی لوٹے میں لے کر واپس آ ہی رہا تھا کہ پھر اسی اُداس اور غمگین مگر خوبصورت چہرے والی لڑکی کو اسی طرح لوٹا لٹکائے پانی کے لئے پکارتے سُنا۔ میں بالکل ہی قریب آ گیا تھا۔ اس کا مُنہ دوسری طرف تھا۔ ریل نے سیٹی دی اور حرکت کی ہی تھی کہ میں نے لڑکی کے ہاتھ سے اس کا لوٹا لیکر اس پھرتی سے اپنا لوٹا دے دیا کہ اُسے لیتے ہی بن پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ ہوشیار ہو اور معلوم کر سکے کہ کیا ہو گیا۔ دوڑ کر خالی لوٹا لئے میں اپنے ڈبے میں چڑھ گیا۔ بھائی تنذری نے مجھے یہ کرتے دیکھ ہی لیا تھا۔ میری اخلاقی جرأت کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں مجھے بھی تو یہ کسی موذی سے نہیں بڑوائیں گے۔

میں نے غلطی کی جو اگلے اسٹیشن پر ہی اپنا لوٹا واپس نہ لے لیا۔ کیونکہ اس کے بعد کے اسٹیشن پر گاڑی بہت دیر نہ رُکی اور تیسرے اسٹیشن پر زنانے ڈبے کی طرف جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو زنانہ درجے میں لڑکی نظر نہ آئی۔ نہ معلوم کون تھی۔ کہاں، کب اور کدھر اُتر گئی مگر میرا لوٹا اس کے پاس تھا اور اس کا لوٹا میرے پاس۔

(۴)

کانپور کے اسٹیشن پر ہم لوگوں کو اس کی فکر ہوئی کہ اپنے دشمن کو کس طرح ماریں مگر کوئی صورت ممکن نہ ہو سکی۔ وہ بھی لکھنؤ جا رہا تھا لہذا طے کیا کہ لکھنؤ پہ ماریں گے۔

لکھنؤ بھی دُور نہ تھا۔ زیادہ حصّہ سفر بھائی تنذری نے میرے ہی ساتھ طے کیا تھا۔ ویسے میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھتا تھا۔ لکھنؤ کا اسٹیشن جب قریب آیا تو بھائی تنذری نے مشورہ کیا کہ اسے مارو۔ چنانچہ موقع مل گیا۔ میں اسباب وغیرہ لیکر لکھنؤ کے اسٹیشن پر تیزی سے آگے نکل گیا۔ اور بھائی تنذری اُدھر دشمن کی طرف اسی لوٹے سے مسلح ہو کر پہنچے۔ موقع بھی خوب ملا۔ وہ لگا اپنے ٹرنک کا کنڈہ پکڑ کر قلی کے سر پہ ٹرنک لدوانے اور پیچھے سے اس کے کولھے پر بھائی تنذری نے لوٹے کی ٹونٹی پکڑ کر دیا کس کر لوٹا، بالکل "گرز لندھور" کی طرح اور پھر جو سرپٹ بھاگے ہیں تو تیزی تو دیکھئے کہ میرے پاس سے نکل گئے اور مجھے بدحواسی میں دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے آواز دی تو گھبرا کر کہا کہ "چلو جلدی بھاگو" کیونکہ خوب جانتے تھے کہ اگر کہیں پکڑ پایا اُس نے تو بُرے طرح کندی کرے گا مگر پھر اس موذی کا پتہ نہ چلا۔

لکھنؤ میں ہم دونوں دو دن ساتھ رہے۔ پھر بھائی شنذری اور ہم دونوں بارہ بنکی چلے۔ ان دوست سے ملنے۔ گاڑی جو بارہ بنکی کے پلیٹ فارم پہ داخل ہوئی ہے تو ہم دونوں سر نکالے ہی بیٹھے تھے۔ وہ موذی کھڑا نظر پڑا۔ اور ہم دونوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بھائی شنذری نے غڑاپ سے گردن نیچی کر لی اور میں نے بھی۔ "اب یہ تمھیں قطعی مٹھو نکے گا" میں نے بھائی شنذری سے کہا۔

"اس کی ایسی تیسی" بھائی شنذری نے کہا۔ اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

اِدھر میں نے کہا "قلی" اور اُدھر وہ موذی آپہنچا۔ بھائی شنذری نے لوٹے کا گرز بنا کے اپنے کو مسلح دکھایا۔

"سر پھوڑ دوں گا" بھائی شنذری نے لوٹا چمکا کر کہا۔

مگر وہ نامعلوم کس گڑبڑ میں تھا۔ گھونسہ دکھا کہ تیزی سے چلتا بنا۔ اسباب اُترا کہ ہم دونوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کیونکہ بھائی شنذری نے اپنی آمد کا تار دے دیا تھا۔ اور اُمید پختہ تھی کہ ان کے دوست لینے آئیں گے۔ انتظار کر رہے تھے کہ پھر آیا وہ موذی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے اب گویا بھائی شنذری کو ٹھونکنے کی تمہید اٹھائی۔

"جہنم سے" بھائی شنذری نے لوٹا تان کر کہا "سر پھوڑ دونگا"۔

"جانتے ہو کہاں ہو" اس نے کہا "دہلی کے دھوکے میں نہ رہنا۔ یہ بارہ بنکی ہے۔ ساری صاحب بہادری نکال دوں گا"

یہ کہکر شکر ہے کہ وہ چلتا بنا۔ اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک الفاظ ہم دونوں نے اس کے لئے استعمال کئے تھے۔

"تار ملا نہ ہوگا" بھائی شنذری نے کہا۔ قلی سے اسباب اُٹھوا کر باہر نکلے تانگہ کیا۔ اپنے دوست کا نام اور مفصل پتہ بتایا کہ لے چلو وہاں۔ تانگہ ایک گلی کے کنارے پر آکر رُکا اور ہم دونوں اس خیال سے کہ مکان کا پتہ لگا لیں تو تانگہ اِدھر لائیں۔ اُتر کر اندازے سے ایک مکان پر پہنچے۔ وہاں کھٹکھٹایا ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ مکان چھوڑ کر تیسرے پہ دریافت کیجئے۔ وہاں پہنچے، ایک بڑا سا عالی شان پھاٹک تھا۔ اندر پہنچے، ملازم سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ اندر ہیں۔ ملازم نے بلوایا اور کہا بیٹھئے۔

آپ یقین مانیئے کہ اندر سے وہی موذی چلا آتا ہے۔ اور نکلتے ہی وہ سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

وہ روشنی میں تھا اور ہم اندھیرے میں تھے۔

"یہ تو وہی ہے"، گھبرا کہ بھائی شنذری نے کہا اور نوکر سے اتنا پوچھا "کیا یہی ہیں"۔ اور جیسے ہی اس نے کہا "ہاں" بھائی شنذری نے کہا "یار بھاگو"

ہم دونوں سر پہ پیر دھر کر جو بھاگے تو تانگہ پہ آکر دم لیا اور سیدھے وہاں سے اسٹیشن۔ ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے واپس لکھنؤ اور قبل اس کے کہ گھر واپس پہنچیں بھائی شنذری نے لکھنؤ ہی سے معذرت کا خط لکھ دیا کہ افسوس میں حسب وعدہ حاضر نہیں ہو سکا۔

الحمد اللہ کہ اب تک ان نادیدہ دوست سے بھائی شنذری کے تعلقاتِ دوستی اسی طرح قائم ہیں۔ اور واقعی بڑی گہری دوستی دونوں میں چلی آرہی ہے۔

اعظم کریوی

پریم کی چوڑیاں

(۱)

نورپور گنگاجی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پنڈت گردھاری لال اس گاؤں کے زمیندار تھے۔ راما شنکر ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ کھیتی باڑی میں بڑی برکت تھی۔ گھر میں غلہ کا انبار لگا رہتا تھا۔ کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پنڈت رام لال کا لڑکا رام جیاون ذات کا برہمن تھا۔ کسی زمانہ میں اس کے خاندان میں بھی لکشمی دیوی کا راج تھا۔ لیکن غدر میں اس کا خاندان تباہ ہوگیا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ یتیم تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے اس کی پرورش کی اور بڑے ہوتے ہی اپنے یہاں پیادوں میں نوکر رکھ لیا۔ رام جیاون بڑا کسرتی پہلوان تھا۔ گو اس کی عمر ۴۰ سال سے کچھ زیادہ ہوگئی تھی پھر بھی نورپور کا تو کیا ذکر آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی جوڑ کا کوئی دوسرا پہلوان نہ تھا۔ پنڈت گردھاری لال کے یہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی، ہر فصل پر دس بارہ من اناج مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک اچھی ذات کی گائے تھی اس کے لئے بھوسہ آسامیوں سے مل جاتا تھا۔ جب پنڈت رام جیاون اکھاڑے میں ڈنڈ پیل کر صبح کو اپنی گائے کا تازہ دودھ پی کر لمبی پگڑی باندھے ہوئے اور الہ آبادی موٹی لاٹھی کندھے پر رکھ کر گاؤں میں آسامیوں سے لگان وصول کرنے چلتے تو رعب چھا جاتا۔ جو کام کسی اور پیادہ سے نہ ہوتا تو اُسے رام جیاون مہراج کے سپرد کیا جاتا۔ گھر میں اُن کی بیوی دُرگا اور ایک لڑکی پریم پیاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

راما شنکر اور پریم پیاری میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ راما شنکر کی پیدائش کے ایک سال کے بعد رام جیاون مہراج کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی تو راما شنکر کی ماں تلسی نے لڑکی کا نام پریم پیاری رکھا۔ گاؤں میں ایسے نام کم رکھے جاتے ہیں لیکن زمینداروں کا نام رکھا ہوا کیسے بدلتا۔ پھر بھی پریم پیاری کو لوگ پیار میں پربیا کہنے لگے۔

راما شنکر اور پربیا بچپن ہی سے ایک جگہ اُٹھتے بیٹھتے، کھیلتے کودتے اور گروجی کے یہاں ایک ساتھ پڑھتے۔ بھلا ان میں محبت کیوں نہ ہوتی صبح کے وقت خاک دھول میں لت پت ہو کر گھروندے بنانا دونوں کا ایک نہایت پُرلطف کھیل تھا۔ نورپور کے پُرفضا میدان میں گنگاجی کے کنارے گڑیوں کا میلہ لگتا تو گڑیاں اپنے سسرال جاتیں۔ پربیا ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی، اپنی گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجا کر بدا کرتی۔ گنگاجی کے کنارے جاتی تو راما بھی ساتھ جاتا۔ اور جب پربیا اپنی خوبصورت گڑیوں کو پانی میں پھینکتی تو راما اپنی خوش رنگ نیم کی چھڑی سے پربیا کی گڑیوں کو پیٹتا اور خوب خوش ہوتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں دونوں میں لڑائی ہوئی۔ کوسا کاٹا، مارا پیٹا اور پھر تھوڑی دیر میں ملاپ ہوگیا۔ پربیا کے روٹھنے پر راما اس کی دلجوئی کرتا اور جب راما بگڑتا تو پربیا اس کو

سناتیتی۔ اسی طرح ہنسی خوشی میں بچپن کا کھیل ختم ہو گیا اور دونوں نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ پنڈت گردھاری لال کے ایک چچیرے بھائی گلزاری لال الٰہ آباد میں وکیل تھے۔ انہیں کے پاس راما کو انگریزی پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ الٰہ آباد جانے سے پہلے جب راما پریما سے ملا تو پریما نے کہا "راما دیکھو الٰہ آباد جا کر مجھے بھول نہ جانا"

"پریما تیرا کدھر خیال ہے۔ بھلا میں تجھے بھول سکتا ہوں۔ میں جب الٰہ آباد سے آؤں گا تو تیرے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا"

"الٰہ آباد سے کب آؤ گے؟"

"مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور آؤں گا"

جب راما رخصت ہونے لگا تو اس نے دیکھا کہ پریما کی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے کہا پریما تو روتی کیوں ہے؟ پریما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی۔

(۲)

راما جب نورپور ایسے چھوٹے گاؤں سے نکل کر الٰہ آباد ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنے چچا کی عالی شان کوٹھی دیکھ کر راما کی نظر میں اپنے نورپور والے کچے مکان کی کوئی وقعت نہ رہ گئی۔ اس کا الٰہ آباد میں اتنا جی لگا کہ وہ عرصہ تک نورپور نہ گیا۔ اپنے نئے دوستوں سے مل کر وہ پریما کو بھول گیا۔ اس کے چچا نے اس کے لئے کوٹ پتلون اور انگریزی جوتا بنوا دیا۔ وہ فٹن پر سوار ہو کر شام کو خسرو باغ کی سیر کرتا۔ ادھر تو راما شہر کی دلچسپیوں میں اپنی دیہاتی زندگی محو کئے تھا اور ادھر نورپور میں پریما اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ روز شام کی ڈھلتی چھاؤں میں اپنے گھر کے سامنے چبوترہ پر بیٹھ کر راما کی راہ دیکھا کرتی۔ رہٹ اور دھنی کے چیچہوں سے جو قدرتی راگ پیدا ہوتا وہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اس کو مسرور نہ کر سکتا۔ برسات کے موسم میں جب کالی کالی راتیں سر پر ہوتیں۔ بجلی چمکتی، بادل گرجتا۔ مور جھنکارتے، جھینگر الاپتے تو راما کی یاد میں پریما کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگاتیں۔

خدا خدا کر کے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد راما الٰہ آباد سے واپس ہوا۔ جس وقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں۔ سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے۔ گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوویں گھڑے لئے گنگا جی سے پانی بھرنے جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے راما کو دیکھ کر اپنی ایک سہیلی سے کہا "اری! دیکھ تو یہ کون کرسٹان کا بچہ آ گیا ہے" اس کی سہیلی نے غور سے راما کو دیکھ کر کہا "یہ تو راما ہے۔ کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے" "ارے یہ وہی راما ہے جو دھوتی کرتہ پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا پھرتا تھا۔ میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا۔ اور پہچانتی کیسے، آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے"

دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ انس ہوتا ہے جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے، امیر و غریب سب اسی رشتہ میں بندھے رہتے ہیں۔ چنانچہ راما کے آنے کی خبر پا کر جگدیو لوہار۔ بھیلی بنیا۔ رمضان جولاہا۔ جگروا دھوبی۔ کالکا کاچھی۔ ادھین اہیر۔ رام جیاون مہراج وغیرہ راما کو دیکھنے آئے اور دعا دے کر چلے گئے۔

گاؤں میں بیٹھ کر راما کو پریما یاد آئی۔ رات تو کسی طرح سے اس نے بسر کی لیکن صبح اٹھتے ہی وہ اس کے مکان پر پہنچا۔ رام جیاون گنگا اشنان کرنے گئے ہوئے تھے۔ درگا دھان کوٹ رہی تھی۔ راما نے کہا "موسی! پرنام"

"کون؟ راما! جیتے رہو بھیا، بھگوان تمہیں بنائے رکھیں، آؤ آؤ اچھے تو رہے" یہ کہتی ہوئی درگا نے آواز دی "پریما! ارے او پریما! دیکھ تیرے راما بابو آئے ہیں۔ ان کو بیٹھنے کے لئے کچھ آسن تو دے" پریما چوکے میں دودھ گرم کر رہی تھی ماں کی آواز سن کر وہ جلدی سے اٹھی اور ایک کھٹولہ لا کر بچھا دیا۔ راما کو خیال تھا کہ پریما سامنے آتے ہی خوب گھل مل کر باتیں کرے گی اس سے الٰہ آباد کا حال پوچھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پریما بدن چرائے آنکھیں نیچے کئے

ہوئے آئی اور کھٹولہ بچھا کر پھر چوکے میں واپس چلی گئی۔ راما نے درگا سے کہا "موسی! پریما بھاگ کیوں گئی مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی"۔

درگا نے چلا کر کہا "پریما کہاں چلی گئی، ذرا ایک گلاس دودھ اور ملائی تو ڈال کر بھیا کو کھلا دے (ہنس کر) پریا پڑی پگلی ہے تم کو جو سال بھر کے بعد دیکھا تو سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے دیہاتی لڑکیاں بڑی ناسمجھ ہوتی ہیں راما"۔

"موسی میں بھی تو دیہاتی ہوں"۔

"بھیا تمہاری اور بات ہے، تمہارا اور پریما کا مقابلہ ہی کیا، تم پڑھے لکھے ہو لیکن پریما تو بالکل گنوار ہے بس وہی تمہارے ساتھ گرو جی سے کچھ ہندی کتابیں پڑھی تھیں کیا اتنے ہی سے وہ سمجھ دار ہو گئی۔ نہیں بھیا نہیں وہ بڑی جاہل ہے۔ دیکھو نہ کئی مرتبہ پکار چکی ہوں لیکن ابھی تک دودھ لے کر نہیں آئی"۔

راما نے اٹھ کر کہا "اچھا تو موسی میں خود ہی اس کے پاس جاتا ہوں، دیکھوں تو وہ مجھ سے کیوں نہیں بولتی ہے"۔ یہ کہتا ہوا راما چوکے میں گھسا اور درگا ہنس ہنس کر لوٹ گئی "ہاں بھیا ہاں تو ضرور پریما کو ٹھیک بنائے گا"۔ یہ کہتے ہوئے درگا نے پھر اپنا موسل اٹھایا اور دھان کوٹنے لگی۔

جب راما چوکے میں پہنچا تو دیکھا کہ پریما ایک گلاس میں دودھ لئے ہوئے سر جھکائے چپ چاپ کھڑی ہے۔ راما نے ہنس کر کہا "اوہو، ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے پہچانتی ہی نہیں، کہو اچھی تو رہیں"۔ پریما نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور ایک لٹیا میں جل بھر کر راما کے سامنے رکھ دیا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر ایک طرف کو چپ چاپ کھڑی ہو گئی لیکن کن انکھیوں سے راما کو دیکھتی جاتی تھی۔ راما نے کہا "نہ نہ پریما اس طرح سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک تم نہ بولو گی میں تمہارے یہاں کوئی چیز نہ کھاؤں گا"۔ تھوڑی دیر انتظار کر کے جب راما نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی جواب پریما نے نہیں دیا تو اس نے اداس ہو کر کہا "اچھا پریما نہ بولو جب تم میری بات کا جواب نہیں دیتیں تو میں اب جاتا ہوں"۔ یہ کہتا ہوا راما اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت لجاتی ہوئی پریما نے ایک عجیب انداز سے کسمسا کر دھیمی آواز میں کہا "ہائے راما، تم تو نہ جانے کیا کہتے ہو"۔

راما کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پریما کی آواز نے اس کا غنچۂ دل کھلا دیا۔ اب اس نے دودھ پی لیا اور ہنستا ہوا چوکے سے باہر نکل کر کہنے لگا "موسی آخر کار میں نے پریما سے بات چیت کر ہی لی۔ اس کی ضد میں نے توڑ دی"۔ درگا نے خوش ہو کر کہا "وہ تمہارے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی ہے، کہاں تک شرما سکتی ہے"۔

گھر سے باہر نکلتے ہوئے راما نے کہا "او ہو میں ایک بات بھول ہی گیا۔ موسی یہ دیکھو پریما کے لئے ایک جوڑہ چوڑیوں کا لایا ہوں، پریما کو دے دینا"۔

چوڑیوں کو دیکھ کر درگا بہت خوش ہوئی۔ چوڑیاں تھیں تو کانچ کی لیکن اس قسم کی قیمتی اور خوبصورت چوڑیاں اس وقت تک گاؤں میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھیں۔

درگا کے بلانے پر پریما چوکے سے باہر نکلی" دیکھو راما تیرے لئے کتنی خوبصورت چوڑیاں لایا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے درگا نے چوڑیاں پریما کی طرف بڑھائیں۔ پریما نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کو لیا اور دزدیدہ نگاہوں سے راما کی طرف دیکھا، زبان سے تو اس نے کچھ نہ کہا لیکن شرمیلی آنکھوں سے سوال کیا "کیوں جی! یہ چوڑیاں کانچ کی ہیں یا پریم کی"؟ راما نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اشاروں میں جواب دیا "یہ پریم کی چوڑیاں ہیں"۔

(۳)

آسمان نے کروٹ لی، زمین نے موسم پلٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ برس گزر گئے۔ اس دوران میں پنڈت گردھاری لال اور مہاراج رام جیاون بیکنٹھ سدھارے۔ راما اب ایک وجیہہ لحیم شحیم جوان تھا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس نے اپنی زمینداری کا کام سنبھالا۔ لین دین بھی کھاتہ اس کے ہاتھ میں آیا تو اس کے مزاج میں رعونت پیدا ہو گئی۔ سب نشوں سے زیادہ تیز، زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ راما اس نشہ میں بے خود ہو گیا۔ اور اپنے کاروبار میں اتنا منہمک ہوا کہ وہ لڑکپن کی محبت کو، پریما کے پریم کو رام جیاون مہاراج کی وفاداری کو بالکل بھول گیا اس نے ایک دن بھی بھولے سے بھی خبر نہ لی کہ یتیم پریما اور دکھیا درگا کی کیسی گزر رہی ہے۔

رام جیاون مہاراج کے کوئی جائداد تو تھی نہیں جس سے درگا کی چین سے بسر ہوتی، مہاراج کے مرنے پر دس بیس روپے گھر میں تھے بھی وہ انہیں کی کریا کرم میں ختم ہو گئے صرف ایک گائے گھر میں تھی، ماں بیٹی کی زندگی کا اب ایک یہی سہارا تھا، اس کا دودھ بیچ کر ان کی بسر اوقات ہوتی، کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑتے

اسی حالت میں ایک دن درگا نے پریما سے کہا "جی میں آتا ہے کہ اپنی مصیبت کا حال راما بابو سے جا کر کہوں، کیا وہ ایسی حالت میں ہماری مدد نہ کریں گے"؟

پریما نے اداس ہو کر جواب دیا "نہیں اماں ان کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ——— کیوں؛ جب ان کو خود خیال نہیں ہے تو ہمارے کہنے سے کیا ہوگا"۔ "ایک دن کہہ کر تو دیکھوں مجھے تو پوری امید ہے کہ وہ ہماری غریبی پر رحم کریں گے، کیا تیرے باپ کا بھی ان کو کچھ خیال نہ ہوگا"۔ مہاراج کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خوب جی بھر کے روئیں۔ جب کچھ جی ہلکا ہوا تو درگا نے کہا "بیٹی تو سچ کہتی ہے میں کسی کے پاس نہ جاؤں گی۔ جب ان کے جیتے جی میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے تو اب ان کے مرنے پر بھیک مانگ کر ان کی آتما کو دکھ نہ پہنچاؤں گی"۔

اس کے بعد پھر دونوں میں اس قسم کی باتیں کبھی نہیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ راما کی ماں تلسی نے درگا کو اناج بھیجا بھی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

سال بھر تک جس طرح بھی ہو سکا درگا نے دن کاٹے۔ پھٹے پرانے کپڑوں کو سی کر کسی طرح کام چلایا۔ لیکن برسات میں ایک نئی مصیبت آئی۔ ان کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ برسات میں کئی دن تک موسلا دھار پانی برسا تو اس کے مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مر گئی۔ اس نئی مصیبت نے ان پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ گھر میں دو چار چاندی کے جو زیور تھے وہ بھی بک گئے، پریما نے راما کی دی ہوئی چوڑیاں ایک کپڑے میں باندھ کر پٹاری میں رکھ دی تھیں۔ راما کی یہی ایک یادگار تھی۔ پریما نے سوچا کہ اگر وہ ان کو پہنے رہے گی تو ٹوٹ جائیں گی۔ فکرِ معاش بڑی بُری بلا ہے۔ درگا اب کھیتوں اور چراگاہوں سے گوبر اٹھا لاتی پریما اُپلے تھاپتی اور درگا گاؤں میں بیچ آتی۔ کبھی گوبر نہ ملتا تو اور مصیبت ہوتی۔ کبھی کوئی اُپلے چرا لے جاتا تو فاقے کرنے پڑتے۔ دنیا کا بھی عجیب حال ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے، کوئی رو رہا ہے۔ کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں کوئی رو رو کر زندگی کاٹتا ہے لیکن کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں۔

(۴)

راما کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا، دروازہ پر مردوں کا اور گھر میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف گھی کی اور دوسری طرف تیل کی پوریاں پک رہی تھیں۔ گھی کی معزز موٹے برہمنوں کے لئے تیل کی فاقہ کش نیچوں کے لئے۔ راما کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا، عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں، بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے پھر رہے تھے۔ مالن پھولوں کا گجرا کیلے کی شاخیں لائی، کمہار نئے نئے چراغ لائے اور ہانڈیاں دے گئے۔ باری سرسبز ڈھاک کے پتل اور دونے دے گئے۔ کہار نے آکر کلسہ میں پانی بھرا بڑھئی نے راما کے لئے نئی پیڑھی بنائی۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ راما جب نہا دھو کر اپنے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ایک پنڈت جی کھڑاؤں کھٹ پٹ کرتے براجمان ہوئے۔ راما کو پیڑھی پر کھڑا کر کے اشلوک پڑھا، ایک کچا دھاگا سر سے پاؤں تک ناپ کر بیسویں گرہ لگائی۔ تل ملا ہوا کچا دودھ پلایا ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر آشیرباد دی۔ پنڈت جی بھلا چوک سے خالی ہاتھ کیسے اٹھتے۔ ان کا پیٹ بہت بڑا اور خوب پھولا ہوا تھا۔ تلسی نے بھی اس موقع پر پنڈت جی کو خوب "دچھنا" دی اور پنڈت جی ہنسی خوشی گھر سے رخصت ہوئے۔ ان کے بعد نائی، دھوبی، بھاٹ، کہار، مالی وغیرہ کی باری آئی اور ان کو بھی انعام سے خوش کر دیا گیا۔ غرض اس دن نور پور میں سوائے درگا اور پریما کے کوئی اور راما کی چشمِ عنایت سے محروم نہ رہا۔

ادھر تو جشن کا یہ سامان تھا اور ادھر غریب درگا کے یہاں فاقہ تھا، کیونکہ ثروت کے نشہ میں سرشار زمیندار اپنے اس غریب آسامی کو نیوتہ دینا بھول گیا تھا۔ شام کو جب سب لوگ کھا پی کر چلے گئے تو اتفاقاً پریما کی یاد آئی اور اس نے اپنی ماں سے جا کر پوچھا "ماں جی کیا رام جیا دن مہاراج کے یہاں سے کوئی نہیں آیا تھا"؟

"نہیں تو۔ کیا تم نے اُن کو نیوتہ نہیں دیا تھا"؟

"کیا وہ بغیر نیوتہ کے نہیں آ سکتی تھیں۔ وہ ہمارے آسامی ہیں"۔

"آسامی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ مہاراج کے گھر کی اکڑ تو سارے گاؤں میں مشہور ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے میں نے دو من اناج بھیجا تھا لیکن درگا نے واپس کر دیا۔ وہ عورت اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے۔ جب تک مہاراج زندہ رہے ان کا آنا جانا رہا۔ ان کے مرتے ہی اس نے میرے

یہاں آنا چھوڑ دیا۔ بھلا بغیر خوشہ وہ ہمارے یہاں کیوں آنے لگی۔"

راما چپ چاپ اپنی ماں کی باتیں سنتا رہا اس کے بعد بولا "خیر درگا نہیں آتی تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا مجھے ایک تھالی میں کچھ سیدھا دے دو میں اس کو جا کر دے آؤں۔"

تلسی نے کہا "جب تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کل سیدھا کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ تمہارے جانے کی وہاں کیا ضرورت ہے۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے تم خود سیدھا لے کر جاؤ گے تو درگا کے اور مزاج بڑھ جائیں گے۔"

لیکن راما نے ماں کا کہنا نہ مانا۔ اس وقت اس کے سامنے اس کا گزرا ہوا زمانہ تھا۔ پربیا کی بچپن کی بے لوث محبت اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اُس نے تلسی سے سیدھے کی تھالی منگوائی اور اسی وقت درگا کے دروازہ پر پہنچ کر آواز دی۔ درگا نے دروازہ کھول کر کہا "کون؟"

راما نے جواب دیا "میں ہوں راما!" ——

"ہمارے دھن بھاگ آئیے اندر آئیے۔ کہئے آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آ گئے۔"

راما کے دل پر چوٹ سی لگی، اس نے شرمندہ ہو کر کہا "ایشور جانتا ہے کہ گھر کے کاروبار میں ایسا پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی۔"

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگا نے پربیا کو آواز دی "بیٹی ذرا دیا جلا دے مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں۔" پربیا ایک طرف کونے میں میلی کچیلی دھوتی اوڑھے پڑی تھی۔ آج اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ماں کی آواز سن کر وہ اٹھی اور آہستہ سے کہا "ماں جی دیئے میں تیل نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں حسرت بھری تھی۔ گو پربیا کو راما نے نہ دیکھا لیکن اس کی آواز سُن لی اور کہا "دیا جلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب جا رہا ہوں۔ ماں جی نے تمہارے لئے اس تھالی میں کچھ بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر راما نے تھالی بڑھائی لیکن درگا پیچھے ہٹ گئی اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا ——

"مالک ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں۔"

یہ سوکھا جواب سن کر راما سناٹے میں آگیا۔ غریبوں میں بھی خودداری کا مادّہ ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔

ایک غریب برہمنی نے اس کو ذلیل کیا اس کا اُس کو سخت صدمہ ہوا۔ اور وہ سیدھے کی تھالی لے کر درگا کے گھر سے نکل کر اپنے گھر واپس آگیا۔ راما کے جانے کے بعد پربیا نے اپنی ماں سے کہا "معلوم ہوتا ہے بابو جی ناراض ہو گئے ہیں۔" درگا نے جواب دیا "بھگوان راضی رہیں کسی کی ناراضگی کی کچھ پروا نہیں۔"

(۵)

پربیا اب انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پربیا کو عطا کی تھیں۔ اس کے انداز میں بھولا پن آواز میں نغمہ کی دل فریبی، آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی، کوئی قدردان نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ دان دہیز دینے کے لئے درگا کے پاس کچھ نہ تھا۔ جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اس کے گلے میں پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دو سو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دو سو روپیہ تو بہت ہوتے ہیں، گھر میں اتنے کھپریل بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف نکلتی لوگ اس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھا رکھی ہے بیاہ نہیں کرتی نہ جانے کیا ارادہ ہے۔ درگا لوگوں کے طعنے سُن کر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی اس لئے گاؤں میں اُپلے بیچنا بند کر دئے، ایک دوسرے گاؤں میں اُپلے جا کر بیچنے لگی وہاں بھی کچھ دنوں بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بے چاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی۔ کبھی سوچتی گنگا جی میں ڈوب کر اپنی جان دے دے لیکن جب پربیا کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آ جاتی۔ اب درگا دن رات اسی فکر میں رنجیدہ رہنے لگی۔ بسا اوقات وہ پربیا پر بھی خواہ مخواہ خفا ہو جاتی۔ ذرا سی بات پر جھڑک دیتی۔ اس پر اگر پربیا رونے لگتی تو خود بھی اس کے ساتھ روتی ایک دوسرے کے دل کا حال جانتی تھی لیکن زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ اس طرح دن گزر رہے تھے، ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اس سے ملنے آئی تو اس نے

کہا "چچی پریما کا بیاہ کب کروگی؟ لڑکی بہت سیانی ہوگئی ہے اس کو کنواری بٹھا رکھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ گاؤں بھر میں تمہاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔"

درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "بہن کیا بتاؤں بہت تلاش کرنے پر بھی اب تک کوئی بر ہی نہیں ملا۔"

گورا۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہ چلے گا میرے خیال میں تم کو اب دیری نہیں کرنی چاہئے۔

درگا۔ بہن تمہیں پریما کو کہیں ٹھکانے لگا دو بڑی کرپا ہوگی۔

گورا نے کہا "اچھا میں دیکھوں گی۔" یہ کہہ کر گورا چلی گئی۔ دو چار دن بعد وہ پھر آئی۔ اس نے آتے ہی درگا سے کہا "چچی مٹھائی کھلاؤ میں نے پریما کے لئے بر ڈھونڈھ لیا ہے۔" درگا نے خوش ہوکر کہا "کہاں؟"——

گورا۔ مہاراج ملبسی دھر کو تو جانتی ہو۔

درگا۔ وہی نا جو امر چھ میں رہتے ہیں۔

گورا۔ ہاں ہاں وہی وہی۔

درگا۔ ان کی تو عمر بہت زیادہ ہے وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں؟

گورا۔ عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مرد ہیں ان کی عمر کا کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت سے لوگ بیاہ کرتے ہیں۔ اور چچی برا نہ مانو تو کہوں تمہاری لڑکی بھی بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بڑے امیر ہیں۔ بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب، باغ سب ہی کچھ تو ہے۔ اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ "دان" "دہیز" بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں۔"

درگا ملبسی دھر کے ساتھ پریما کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی راضی نہ ہوتی لیکن جب اس نے سُنا کہ "دان" "دہیز" بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہوگئی۔

گورا۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج ملبسی دھر کے یہاں سے پریما کو دیکھنے آئیں گی۔

درگا۔ بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا میکہ کھاگا میں ہے۔ وہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو نہیں دیکھ سکتے۔

گورا۔ خیر تم ایک کام کرو کل سویرے پریما کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا امر چھ سے جب عورتیں میرے یہاں آئیں گی میں کسی بہانے سے پریما کو اپنے گھر بلا لے جاؤں گی، اس طرح وہ پریما کو دیکھ لیں گی۔ اس میں کوئی ہرج نہ ہوگا۔" درگا نے خوش ہوکر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے۔"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر گورا اپنے گھر چلی گئی۔ درگا آج بہت خوش تھی اس نے اپنی پٹاری کھول کر ایک پھٹی پرانی دھوتی اور شلوکا نکال کر دھویا اور اس کی مرمت کر دی۔ صبح گورا سے یہ سب باتیں ہوئیں اور شام تک گاؤں بھر میں اس کی خبر ہوگئی۔ جس کسی نے بھی سُنا کہ درگا اپنی پھول سی لڑکی کا بیاہ بوڑھے کھوسٹ ملبسی دھر سے کرنے والی ہے۔ اس نے افسوس کیا لیکن درگا نے کسی کے کہنے سننے کی کچھ پروا نہ کی۔ اُس کو اس کے سوائے کچھ خیال ہی نہ تھا کہ جس طرح بھی ہو پریما کا بیاہ ہو جائے اور "دان" "دہیز" نہ دینا پڑے۔ بدنامی ہوگی تو کیا اپنے فرض سے سبکدوش تو ہو جائے گی۔ پریما سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہی۔ سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی، وہ دردِ سر کا بہانہ کر کے شام سے لیٹ رہی اور چپکے چپکے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔

(۶)

صبح کاذب کا وقت تھا چاند دھندلی دھندلی روشنی ڈال رہا تھا۔ درگا نے پریما کو بلا کر کہا "بیٹا جلدی سے اٹھ اور گنگا مائی میں اشنان کر آ۔ لے یہ شلوکا اور دھوتی اس کو نہا کر پہن لینا۔ ہاں خوب یاد آیا ذرا ٹھہر جاؤ۔" درگا نے اپنی پٹاری کھولی اور اس میں سے لال لال دو موٹی کانچ کی چوڑیاں نکالیں اور بولی "تیرے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے میں اب تجھے بنوا دوں گی۔ آج تو یہ چوڑیاں پہن لے یہ بھی بہت خوبصورت اور قیمتی ہیں۔" پریما اب تک خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چوڑیوں کو دیکھ کر گھبرا کر چلا اٹھی "نہیں ماں نہیں، میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میں ان چوڑیوں کو نہیں پہنوں گی۔" درگا نے ڈانٹ کر کہا "پہنے گی کیسے نہیں، بس تجھ میں یہی تو ایک بڑا عیب

ہے کہ کہنا نہیں مانتی۔" یہ کہہ کر درگا نے زبردستی چوڑیاں پہنا دیں۔ پریما کو نہانے کے لئے بھیج کر آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئی۔ آج ہی امرچھ سے عورتیں پریما کو دیکھنے آئیں گی۔ درگا کو جلدی تھی جس قدر جلد ممکن ہو پریما نہا دھو کر فارغ ہو جائے۔ پریما جب گھر سے نکلی تو اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ ستاروں کی مدھم روشنی کے عکس سے دریا کا بعض بعض حصہ سانپ کی کینچلی کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ تمام دنیا سنسان تھی، دریا کے کنارے پریما نے دھوتی اور ٹشلو کا ایک طرف پھینک دیا گنگا مائی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی "ماتا! میں نے کون سا پاپ کیا ہے جو سب کی آنکھوں میں کانٹا بن رہی ہوں، کیا میرے لئے دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے جو میری ماں مجھے آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ماتا! میرے دل میں جس کی محبت بچپن سے تھی وہی میرا نہ ہوا تو اب دنیا میں مجھے کسی سے کچھ امید نہیں ہے۔

ماتا! کیا تم بتا سکتی ہو کہ راما نے مجھے کیوں بھلا دیا۔ ماتا! تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ اچھا میں سمجھ گئی۔ تم کہتی ہو کہ ان کا نام جپو لیکن میں تو ان کا نام آج سے نہیں بلکہ بالے پن سے جپتی رہی ہوں پھر بھی وہ میرے نہیں ہوئے۔ ماں! میں دھرتی ماتا کی پیٹھ کا بوجھ ہو رہی ہوں تم اس دکھیا کو اپنی گود میں چھپا لو میں تمہارے سرن میں آتی ہوں۔" پریما کی فریاد سن کر چاند کی تھرکتی ہوئی کرنیں بالو پر لوٹنے لگیں اور گنگا مائی کی لہریں اپنا سر ٹپکنے لگیں۔ پریما آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رکی اور اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار ڈالیں اور یہ کہہ کر کہ "میں تو پریم کی چوڑیاں پہنے ہوئے ہوں ان کانچ کی چوڑیوں کی ضرورت نہیں۔" ان کو توڑ کر ایک طرف زمین پر پھینک دیا۔ جن چوڑیوں کو وہ کبھی اپنی جان و دل سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی انہیں چوڑیوں کو آج اس نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور پانی میں ایک قدم بڑھایا ٹھیک اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی ——

"پریما! پریما! ٹھہرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی، مجھ سے بھول ہوئی تم مجھے معاف کر دو۔ تم میری غلطی کی سزا تمہارا جو جی چاہے دے سکتی ہو۔ لیکن جو کچھ تم کرنے جا رہی ہو یہ سزا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگی۔ پریما زور اور طاقت سے کانچ کی چوڑیاں توڑی جا سکتی ہیں لیکن پریم کا بندھن پریم کی چوڑیوں کا تعلق کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اس کے توڑنے کی طاقت نہ تم میں ہے اور نہ مجھ میں ہے۔ پریما جو میں نہیں کر سکا اس کو تم بھی نہیں کر سکتیں۔" یہ راما کی آواز تھی جو اتفاقاً اس وقت گنگا اشنان کرنے کے لئے وہاں آ گیا تھا۔ اس نے پریما کی فریاد سنی۔ پریما کا خوبصورت چہرہ دیکھا، پریم کی چوڑیاں توڑتے اور ان کو پھینکتے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو اٹھا لیا۔ ثابت رہنے پر بھی جن کی اس نے کبھی کچھ قدر نہ کی تھی معمولی کانچ کی چوڑیاں آج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گئیں۔ دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ محبت نے ایک کروٹ لی۔ بچپن کی محبت نے زور مارا اور قبل اس کے کہ پریما اپنی چاند سی صورت کو گنگا مائی کی لہروں میں چھپا لے راما نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر پریما کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا۔ جس طرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح راما نے جب پریما کی بانہہ پکڑی تو جوشِ محبت سے پریما کا ایک ایک عضو کانپ اٹھا اور وہ راما کے قدموں میں جھک گئی۔ محبت کے آنسو دونوں کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس وقت بادِ سحر مستی سے جھومنے لگی تارے غائب ہو گئے اور صبح ہو گئی۔ رنج و غم کا کہیں نشان بھی نہ رہا۔

کچھ دنوں کے بعد اچھی ساعت میں راما نے پریما کے ساتھ بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ کیا۔ درگا اس مبارک شادی کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہی لیکن اس وضع دار اور آن پر مرنے والی عورت نے اپنی جھونپڑی چھوڑ کر داماد کے یہاں رہنا کبھی گوارا نہ کیا۔

حکیم احمد شجاع

اندھا دیوتا

(۱)

اسلم دہلی کے ایک مشہور اور دولت مند سوداگر کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنے بزرگوں سے کوئی دولت ورثے میں نہیں پائی تھی۔ جو کچھ کمایا، اپنے دست و بازو کی ہمت اور دماغ کی ذہانت کی بدولت۔ جو کچھ بچایا اپنی ان تھک کوششوں اور کفایت شعاریوں کے باعث۔ اسلم کی ماں جوان عمر ہی میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اس وقت اسلم بچہ تھا۔ اس کے باپ نے اپنی نیک دل اور حسرت نصیب بیوی کی یاد نہ بھلانے اور اسلم کو سوتیلی ماں کی زیادتیوں سے بچانے کی غرض سے پھر شادی نہ کی۔

اسلم ایم اے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد قانون پڑھنے کے لئے لاہور کے لا کالج میں داخل ہو گیا۔ وہ پہلے امتحان میں کامیاب ہوا ہی تھا کہ اس کے والد یک لخت بیمار ہو گئے اور اس مہلک مرض سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسلم کو اپنے باپ کی ناگہاں موت کا بے انتہا صدمہ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے بے سرو سامان چھوڑ کر چل بسے تھے۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے بعد اس پر اپنے باپ کی کفایت شعار زندگی کی حقیقت روشن ہوئی۔ منیم کے پاس پچھتر ہزار روپیہ کے نقد پونڈ تھے۔ ساڑھے تین لاکھ روپے مختلف بینکوں میں جمع تھے اور قریب قریب دو لاکھ روپے کی مالیت کا سامان اس کے تجارت خانوں میں موجود تھا۔ شہر میں دس عظیم الشان مکان اور انگریزی آبادی میں بارہ بنگلے تھے۔ جہاں تک زندگی کی آسائشوں کا تعلق تھا۔ ان میں کوئی کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اور وسائل آمد مستقل۔ اسلم کو باپ کی موت کا صدمہ اس لئے ہوا کہ اس دنیا میں ان کے سوا اس کا کوئی اور رشتہ دار نہ تھا۔ اس کی ماں ایک غریب گھرانے کی یتیم اور لاوارث لڑکی تھی اور اس کے باپ کے تمام قریبی رشتہ دار یکے بعد دیگرے راہیٔ عالم بقا ہو چکے تھے۔ اب اس بھری دنیا میں وہ اپنی دولت اور لیاقت کے باوجود بالکل اکیلا تھا۔ شکل و صورت، وضع قطع، عادات اور خیالات کے لحاظ سے اسلم ایک قابل رشک انسان تھا۔ جس طرف جاتا، لوگوں کی انگلیاں اُٹھ جاتیں۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے انگریزی وضع کے کپڑے۔ اس کے ذرا لمبے بال، اس کی مستانہ چال میں ایک حسین ادا پیدا کر دیتے تھے۔ اُس کے سُرخ و سفید چہرے پر اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اور چھوٹی چھوٹی سیاہ

مونچھیں بہت زیب دیتی تھیں۔ اگرچہ اس کے لبوں پہ ایک غیر فانی مسکراہٹ ہمیشہ ایک کھلے ہوئے چمن کی بہار کا پتہ دیتی تھی۔ مگر اس کے کشادہ سینے کی تہوں
کے نیچے ایک یاس انگیز اور حسرت مند دل تھا۔ اسلم دولت اور عزت کی موجودگی میں بھی خوش نہ تھا۔ اُس کے دوست اس سے ملنے آتے۔ وہ ان کی خاطر
تواضع میں کوئی بخل نہ روا رکھتا ——— مگر اس کا ہر دوست یہی محسوس کرتا چلا جاتا کہ اسلم خوش نہیں۔ آخر اُس کے دوستوں میں خصوصاً
اور واقفوں میں عموماً اس بات کا چرچا ہونے لگا کہ اسلم کا دل کسی غیر معمولی غم کے بارگراں سے دبا رہتا ہے۔

باپ کی موجودگی اسلم کے لئے ایک طلسم تھا۔ جو اُن کی وفات کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اُس نے اپنی زندگی میں کچھ کمی محسوس کی
اور اس کو اپنا گھر کچھ خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ نوکر، چاکر، منیم، منشی سب ہی موجود تھے، مگر ان میں ایسا کوئی نہ تھا جس کو وہ اپنے دل کی بات بتاتا۔ جس کا خیال
اس کو کام کرنے کے وقت یا آرام کی ساعتوں میں بے چین کر دیتا۔

اسلم فطری طور پر فلسفی مزاج تھا۔ اس پہ چار پانچ سال کی فلسفے کی تعلیم اور دن رات کی محنت نے اس فلسفیت کو ایک خاص روشِ عمل بخش دی تھی۔
اور وہ بڑی کامیابی سے ہر عقدے کا حل سوچ لیتا تھا۔ اس نے اس اضطراب اور زندگی کی نعمتوں کے باوجود اس خلا کے احساس کا تجزیہ کیا اور پھر اس عقدے
کو حل کر لیا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کو ایک رفیقِ حیات کی ضرورت ہے جو اس کی خوشی سے خوش ہو اور اس کے غم سے مغموم۔ جو اس کی خوابیدہ طاقتوں کو
بیدار کرے۔ اس کے منجمد دل کو محبت کی آگ سے گداز کرے۔ اور خود اس محبت کا آئینہ بن کر اس کی زندگی کو ایک سچے لطف سے مسرور کر دے۔
ظاہر تھا کہ ایک عورت کے سوا اس کے دل کو ان کیف آور مسرتوں سے کوئی چیز سرشار نہیں کر سکتی تھی .... مگر
.... آہ یہ ایک بہت ٹیڑھا سوال تھا۔ کیا اسلم چار برس سے اس سوال کے بلاخیز گرداب میں چکّر نہیں کھا رہا تھا۔ اس
نے کتنی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھا۔ اور ان سے سبق حاصل کیا۔ کتنی کتابیں فلسفۂ ازدواج کے متعلق پڑھیں۔ اور ان کو آہ سرد بھر کر ختم کیا۔
یہی سوال اسلم کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دولت، اس کا حُسن، اس کی وجاہت حسین سے حسین صُورت خرید سکتی
ہے۔ مگر اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ تمام دولت محبّت کی ایک جھلک بھی نہیں خرید سکتی۔ وہ حُسنِ صورت اور شرافتِ طبعی کو صرف محبّت کے زیور سمجھتا تھا
اس کے نزدیک حقیقی حُسن محبّت میں تھا۔ صورت اور سیرت کی خوبیاں محبّت کے بغیر ایسی تھیں، جیسے ایک پتّھر کے حسین بُت کو آراستہ کر دیا
جائے۔ یا ایک خوبصورت اور نیک سیرت عورت کے جسم سے اس کا دل نکال لیا جائے۔

چار برس سے وہ اسی تلاش میں تھا۔ ایک بار بمبئی گیا۔ اور وہاں مختلف عورتوں کے چہروں میں اس محبّت کو تلاش کرنا چاہا۔ ہاں محبت کے
متعلق اسلم کا نظریہ یہ بھی تھا کہ یہ جذبہ بالکل فوری، اضطراری اور بے اختیاری ہے۔ اور ایک ہی نظر میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محبت کہ جو آہستہ
آہستہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ یا جو صرف اس لئے معرضِ وجود میں آ جائے کہ ایک انسان کسی دُوسرے انسان کی زندگی کیلئے ضروری
اور مفید ہے۔ محبّت نہیں، پسند ہے۔ لوگ محبت اور پسند میں اسی طرح تمیز نہیں کرتے۔ جس طرح دوستی اور رفاقت میں، یا پرستش اور
عزّت میں۔

اسی طرح وہ جہاں جہاں جا سکا، گیا۔ جس جس چہرے تک اُس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہ پہنچا۔ کیونکہ صحبت یا گفتگو ان میں سے کسی چیز سے اُسے
واسطہ نہیں تھا۔ وہ محبت کو پہلی نظر کی تیز شعاعوں میں ڈھونڈتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے دل کو اسی کیفیت بار دیں دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا
آتیں۔ اور پھر ایک گہری اور ٹھنڈی آہ بھر کر سگریٹ پینے لگ جاتا۔

سگریٹ اُس نے اسی دن سے پینا شروع کیا تھا۔ جس دن سے یہ اُمنگ اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ آرزوئے ناکام اپنی حسرت کبھی اور داغِ ناتمام سے مٹانا چاہتی تھی۔ سگریٹ اس مصروفیت کے لئے بہت اچھا بہانہ تھا۔ اس لئے اب جب کہ اس کے دل کی حسرت پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی اس کو اپنا دل بہلانے کے لئے سگریٹ ہی ایک دل کش کھلونا نظر آتا تھا۔ وہ اب اپنا بہت سا وقت سگریٹ پینے ہی میں صرف کرتا تھا۔ کسی خاص نشے کی مجبوری یا عادت کے تقاضے سے نہیں۔ بلکہ محض اس طرح جس طرح ایک معصوم بچہ کسی دل کش کھلونے سے کھیلتا رہتا ہے۔

اب اس آرزو کے شعلے اُسے دن بھر بے قرار رکھتے تھے۔ وہ رات بھر اپنی آئندہ صبح کا دستور العمل تیار کرتا رہتا تھا۔ مگر ہر صبح، اس کی ناکامی کی قبر پر آنسو بہا کر پردۂ عدم میں چھپ جاتی تھی۔

اس کے دوست، جن سے اسے کبھی محبت نہ تھی۔ اب اُسے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ عیش و آرام ایک شریک کی شرکت کے بغیر ڈراؤنا نظر آتا تھا۔ زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ آئینہ شاید اس کا سب سے زیادہ مہلک دشمن تھا۔ جب وہ اپنی صورت آئینے میں دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خود ہی اپنا منہ چڑا رہا ہے۔

ایک شب اُس کا دل سیاہ رات کی طرح بے چراغ تھا۔ امید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہر روز کی مایوسیوں نے بجھا دیا تھا۔ اور وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک دستور العمل سوچ رہا تھا۔ مگر ہر دستور العمل تاریک تھا۔ بیکار تھا.......... آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی زندگی کے جہاز کو ڈوبنے سے قبل بچانے کی کوشش کرے گا۔ اس سے پیشتر کہ محبت کے امکان کی امید کو وہ ہمیشہ کے لئے دل سے مٹا دے اس کے لئے ایک دفعہ سب سے بڑا موقع تلاش کرے گا۔ اس کے دل کی وہی کیفیت تھی۔ جو ایک ایسے بوڑھے دولت مند کے دل کی ہوتی ہے جو اپنی عمر بھر کی کمائی کے لئے ایک جائز وارث کی نہ پوری ہونے والی تمنا سے زندگی کو حرارت دیتا رہتا ہے۔

اسلم نے تہیہ کر لیا کہ وہ یورپ کا ایک دورہ کرے گا۔ کسی تعلیمی یا تجارتی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف محبت کی تلاش میں، اُس زندہ متحرک بُت کی تلاش میں، جو اس سے محبت کر سکے اور اس کی پرستش کے قابل ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اُس کے وطن میں حُسن اور محبت کے نظارے منظر عام پر میسر نہیں آ سکتے۔ اس مُلک کی بہترین دولت مقفل گھروں اور تہ در تہ پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔

یورپ میں شاید، حُسن اپنی بیباک کیفیتِ بے حجابی میں اُس کے منجمد دل کو پگھلا دے۔ اس کی بے قرار آنکھیں، شاید وہاں اس خیالی آرزو کی چلتی پھرتی تصویر دیکھ پائیں..........

وہ یورپ گیا، اور اُس نے تین برس تک یورپ کے کونے کونے کی خاک چھان ماری۔ لیکن شاہدِ آرزو، کسی سُرابِ خیالی کے نظر فریب دھوکوں کی طرح اور دُور ہوتا چلا گیا۔ اسلم کی پیاس بھی اس تعاقب اور گرم روی سے، اس شوق اور حسرت کی تلخ کامی اور تپش سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔

وہ واپس آیا۔ مگر اب اسلم وہ اسلم نہ تھا۔ وفورِ درد کے اس احساس کش اثر کی طرح جو کسی بیمار کو آرام اور درد دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس ناکامی تمنا نے اس کو آرام اور تکلیف، محبت اور نفرت، زندگی اور موت کے خطروں سے آزاد کر دیا تھا۔

اب وہ اس دنیا کی مادیت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کو اپنی ذات میں فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے اب شہر سے دُور ایک خوش نما بنگلہ بنایا اسے بہترین سامانِ آرائش سے سجایا۔ مگر زیادہ تر اُس کا وقت کتب خانے میں گزرتا تھا، جسے اس نے ہر نایاب اور قابلِ دید کتاب سے آراستہ

کر رکھا تھا۔ ہاں اُس کے بنگلے میں کوئی تصویر نہ تھی۔ وہ تصویروں سے ڈرتا تھا۔ کیونکہ وہ زندہ انسانوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کی جن میں سے کوئی بھی .... آہ .... اس کے لئے .... نہ تھی .....

(۲)

ایک دن شام کو اسلم اپنے کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھا غور کر رہا تھا کہ شاید کسی چیز کو کبھی نہ بھولنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے بھلا دینے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ وہ خیال جس کو بھلانے کے لئے وہ اس قدر محنت، دولت اور وقت صرف کر رہا تھا۔ روز بروز، ساعت بساعت زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے دل نشین ہو رہا تھا۔

وہ آج صبح ہی سے اپنے کتب خانے میں تھا، اور ایک ایسے قمار باز کی طرح، جو روز روز کی ہار سے مایوس ہو کر اپنی تمام باقیماندہ دولت ایک ہی بازی پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے آج یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج شام سے پہلے پہلے دریافت کرے گا کہ محبت کی کوئی ہستی بھی ہے، کہ نہیں۔

کتابیں جو مضمون، زبان اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے ایک دوسری سے مختلف تھیں، چاروں طرف کھلی پڑی تھیں۔ وہ کبھی ایک کے ورق الٹتا، کبھی دوسری کو اٹھا کر دیکھتا۔ کبھی ان سے باتیں کرتا اور پھر خود ہی ہنس دیتا۔ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی نادانی پہ ہنس رہا ہے، یا ان کتابوں کی ناکامی پر، وہ گویا ایک شرابی تھا، جو اردگرد کی تمام چیزوں کو مدہوش سمجھتا ہے، اور ان سے بے حجابانہ دست درازی کرنے لگتا ہے۔

اب اس کی شفاف پیشانی پر غصّے کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی آنکھوں میں کسی اندرونی صدمے سے آنسو بھر آئے۔ اُس نے زور سے وہ کتاب جو اُس کے ہاتھ میں تھی، زمین پر پٹک دی۔ اور چلا اُٹھا۔ "سب جھوٹ، سب دھوکا ہے۔ یہ صرف انسان کو بیوقوف بنانے کی تدبیریں ہیں"۔

اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک سگریٹ جل رہا تھا اور وہ اس کی سوزش کے اثرات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ اٹھا اس کے چہرے سے تھکن، اس کی آنکھوں سے مایوسی، اور اُس کی حرکات سے بے چینی ظاہر تھی۔ اب اُس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا، اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح متحرک اور مصروف ہے۔

اُس نے ایک اور سگرٹ جلایا، اور دیا سلائی کی جگہ سگریٹ پھینک کر دیا سلائی منہ سے لگالی، پھر اُس نے خود ہی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر وہ ہنسا، اب وہ بڑی متانت اور سنجیدگی سے دیوار میں نظریں گاڑے کچھ سوچ رہا تھا، اور اپنے خیالات کو خود ہی سننے کے لئے الفاظ میں متشکل کر رہا تھا۔

"دو بس اس طرح جس طرح میں نے یہ جلتا ہوا سگریٹ پھینک کر ایک بجھی ہوئی بیکار دیا سلائی اپنے منہ سے لگالی تھی، لوگ اس مفید اور کار آمد دنیا کے مشاغل چھوڑ کر ایک بے معنی خیال، ایک بے حقیقت ہستی کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں .... محبت نہ صرف ایک بے معنی لفظ ہے بلکہ جھوٹ ہے۔ جسے انسان عادتاً بولتا ہے۔ ایک فریب ہے۔ جس میں بے کار لوگ اپنے آپ کو مبتلا کر لیتے ہیں۔ ایک مرض ہے جو رفتہ رفتہ اگر دو دماغوں کو لاحق ہو جاتا ہے ...."

آہ غریب اسلم! شاید تجھے معلوم نہیں کہ محبت کی مخالفت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور شاید اس وقت جب تو اس قدر شدّ و مد سے اس کی ہستی کا انکار کر نا چاہتا ہے۔ محبت کا تیر انداز دیوتا تیرے دل کو للچائی ہوئی نگاہوں سے تاک رہا ہے۔

وہ بھکی بھکی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دماغ کو کسی اور خیال میں مصروف کرنا چاہتا تھا، مگر اس کوشش کی ناکامی اس کی آنکھوں سے

اضطراب سے ظاہر تھی۔ یک لخت اُس نے ایک جست بھری۔ میز کے قریب آیا۔ اور گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا........ اس کے چہرے پر اب تسکین تھی، گویا اُس نے کوئی بڑا عقدہ حل کر لیا تھا۔

ایک معتبر صُورت ملازم داخل ہُوا ”اور سرکار“ کہہ کر چُپ چاپ کھڑا ہو گیا، اسلم نے کچھ نہ سُنا۔ اور پھر بہت زور سے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ وُہ ایک بچے کی طرح اپنے خیال سے کھیل رہا تھا۔ ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر اور ذرا بلند آواز سے یاد دلایا۔

”میں حاضر ہوں سرکار!“

اسلم نے اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ابھی ملازم دو قدم ہی چلا ہوگا کہ وُہ زور سے چلّایا ”جلدی بہت جلدی۔“

اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کمرے میں نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ اس آواز نے ملازم کے اعصاب پر ایک برقی اثر پیدا کیا، اور وہ بھاگا .... ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اسلم بالکل بے قرار ہو گیا ——— وہ حیران تھا کہ کیا گاڑی تیار کرنے کے لئے دو مکمل دنوں کی ضرورت ہُوا کرتی ہے ——— وہ وقت کا ناقابل برداشت بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اسے آج وقت آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بے صبری سے باہر نکلا اور گاڑی کو اپنے دروازے کے سامنے نہ دیکھ کر آج پہلی مرتبہ سائیس کو اس کے کام کی اہمیت اور اپنے وقت کی قیمت بتانے کے لئے اصطبل کی طرف چلا ——— وہ صرف وقت کو صرف کرنا چاہتا تھا ———

اصطبل کے دروازے پر پہنچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی، اس کو توقع تھی کہ وہ سائیس کو حُقہ پیتے ہُوئے، ملازم کو باتیں کرتے ہوئے اور گھوڑے کو ابھی تھان پر بندھے ہوئے پائے گا۔ مگر وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا ——— سب ملازم غیر معمولی دلچسپی اور تیزی سے گاڑی تیار کرنے میں مصروف تھے ——— سائیس کی لڑکی دُھنیا بھی ایک جھاڑن سے گاڑی صاف کر رہی تھی ———

وہ اپنے حکم کی تعمیل کو ایک عملی شکل میں منتشکل دیکھ کر خوش ہُوا، اُسے اپنے لفظ کی اہمیت کا احساس ہُوا۔ خدا کے اتنے بندے اس کا حکم ماننے کیلئے اپنی تمام قوتیں صرف کر رہے تھے، وہ دو چار قدم آگے بڑھ گیا، اب اس کی آنکھیں صرف ایک حرکت کو اپنی آنکھوں کے محدود حلقوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا دماغ صرف ایک حرکت کو سمجھنے میں مستغرق تھا، یہ حرکت ایک نازک، سانولے، چاندی کے کنگن والے ہاتھ کی تھی ——— جو گاڑی کو صاف کرنے میں مصروف تھا، دھنیا، کی پشت اسلم کی طرف تھی، ———

وہ صرف ایک بلند، سڈول، اور صحت مند جسم کے حُسن کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس سانولے ہاتھ کو جو برابر اِدھر اُدھر حرکت کر رہا تھا......

اسلم کا پاؤں ایک اینٹ سے جو راستہ میں پڑی تھی ٹکا۔ ایک آہٹ پیدا ہوئی، اور وُہ سب لوگ جو گاڑی تیار کر رہے تھے۔ اِدھر متوجہ ہو گئے........

مگر اسلم کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں نے پہلے کسی دُور دراز پہاڑ پر چمکنے والی بجلی کی چمک دیکھی۔ پھر ایک برسات کی چڑھی ہوئی ندی کی روانی دیکھی۔ اور پھر اس کے لئے دنیا تاریک ہو گئی۔

دُھنیا اپنے آقا کو دیکھتے ہی شرما چکی تھی، اور جھاڑن پھینک کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف دوڑ کر غائب ہو چکی تھی ———

اسلم کچھ سمجھ نہ سکا، سائیس گاڑی دروازے پر لایا۔ اسلم چپ چاپ سوار ہو گیا، سائیس حکم کا منتظر تھا۔ اسلم ذرا گھبرا کر چونکا اور ”چلو“ کہہ کر پھر خاموش ہو گیا۔ گاڑی چلی، اسلم نے ایک جذبۂ بے اختیار سے مڑ کر اصطبل کی طرف دیکھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی قیمتی چیز

کھو بیٹھا ہے ۔ یا اس کل میں جس کا نام اسلم ہے ۔ کسی اہم جز کی کمی واقع ہو گئی ہے ۔ وہ اس تصویر کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا ۔ جو اس کے ذہن میں موجود تھی ۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے نہ تھی ۔

ابھی گاڑی نے مشکل سے کوئی دس گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا ۔ کہ اسلم نے سائیس کو واپس ہونے کا حکم دیا ۔ شریر، چالاک اور تندرست گھوڑا اس قدر جلدی مُڑنے پر بھڑکا، بوڑھے سائیس نے اپنے کمزور ہاتھوں کی طاقت کے اظہار کے لئے گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا ۔ گھوڑا ایک ایسے غیور اور باحمیت شخص کی طرح جو اپنی بے بسی کی حالت میں ذراسی سبکی کو اپنی انتہائی ذلت سمجھ کر بگڑ جاتا ہے، بگڑا اور اس نے تین چار ایسی چوکڑیاں بھریں کہ گاڑی اصطبل کے دروازے کے سامنے آ کر اُلٹ گئی ۔ سائیس نے گرتے ہی ایک چیخ ماری ۔ گاڑی کے الٹنے کی آواز، گھوڑے کی تڑپ کا شور اور سائیس کی چیخ سُن کر نوکر چاکر اصطبل اور کوٹھی سے بھاگے، ان میں دھنیا بھی تھی ۔

سائیس کو کوئی چوٹ نہ آئی ۔ مگر اسلم گاڑی سے کوئی سات آٹھ قدم پرے گر کر بے ہوش ہو چکا تھا ۔ ہمدردی اور غمگساری کے اس فطری تقاضے سے مجبور ہو کر جو عورت کو مرد کے لئے ایک لازوال نعمت بنا دیتا ہے ۔ دھنیا اسلم کی طرف دوڑی اور پھر کچھ سمجھ کر پلٹی، وہ ساتھ ہی کے نل سے پانی کا ایک چلّو بھر کر لائی اور اس سے پیشتر کہ مرد نوکروں کا وہ متحیّر اور ششدر جم غفیر کچھ کر سکتا ۔ ایک عورت نے اپنے انہیں نازک سانولے اور چاندی کے کنگنوں والے ہاتھوں سے اسلم کے چہرے پر پانی کے دو چھینٹے دیئے ۔

اسلم نے ذرا تڑپ کر آنکھیں جھپکیں، اور پھر وہ ٹکٹکی لگا کر اس عورت کو جو اب اپنی پوری شان بے حجابی سے اس کے سامنے تھی، دیکھنے لگا، دھنیا نے پانی کے بے شمار قطروں کو جو موتیوں کی طرح اسلم کے چہرے پر ڈھلک رہے تھے، اپنے آنچل سے صاف کر دیا ۔

دھنیا سائیس کی بیٹی تھی، مگر عورت تھی، عورت اپنے فرض کی ادائیگی میں وقت، موقع اور محل کی تلاش نہیں کرتی، جس طرح محض قدرت کی طرف سے کسی خاص جڑی بوٹی میں اکسیر کا اثر ہوتا ہے ۔ بالکل اسی طرح عورت کے ہاتھ میں مسیحائی اثر ہے ۔ اس کا ذرا سا اشارہ، اس کا ہلکا سا سہارا برسوں کی تکلیف اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے ۔ دکھے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی، قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہے ۔

وہ اپنا فرض ادا کر چکنے کے بعد چلی، اسلم کی پُرنم نگاہیں، جن میں احسان مندی اور شکر گذاری موجزن تھی، ایک کمزور اور تھکے ہوئے مگر ارادت مند پجاری کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں ....

اور اسلم کی آنکھوں سے دور اس کی عظمت و منزلت سے بے پرما ایک اندھا دیوتا اس کے دل پر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا ۔

(۳)

آج اسلم اپنی کوٹھی کے ہشت پہلو کمرے میں ایک خوبصورت اور آرام دہ صوفے پر رنگین اور ریشمیں تکیوں کے سہارے بیٹھا تھا ۔ اس کے چہرے پر سکون تھا، وہ سکون جو کسی لمبی اور خوفناک بیماری کے بعد چہرے پر ظاہر ہوتا ہے ۔ وہ سکون جو ایک خوفناک طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر نمایاں ہو جاتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہر عضو آرام اور اطمینان کے مزے لے رہا ہے ۔ یہ ہشت پہلو کمرہ کوٹھی کا سب سے زیادہ شاندار اور آراستہ کمرہ تھا ۔ مگر اسلم آج دوسری ہی مرتبہ اس کمرے میں آیا تھا ۔ ہاں اس کمرے کی ایک ہی کمی، جو ہر قسم کی تصویروں کی غیر موجودگی سے، ہر دیکھنے والے کو محسوس ہوا کرتی تھی، پوری کر دی گئی تھی ۔ اب تصویر یں ایک انتقامی ولولے کے ساتھ ہر دوسری آرائش کو پس پشت

ڈال رہی تھیں۔ ان تصویروں کو اسلم نے پچھلے ہفتے اس ذوق و شوق سے خریدا تھا، کہ شاید یہی ایک کام اس کی زندگی کا منشا و مقصد ہے۔ آج وہ اس مقصد کی تکمیل پر خوش ہو رہا تھا۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اپنے حسنِ مذاق کی خود ہی داد دے رہا تھا۔

اس کے سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ یہ انسانی دستکاری کا بہترین نمونہ تھی، اس کے نیچے روشن حروف میں "فتحِ حسن" لکھا تھا۔ یہ تصویر ایک حسین عورت کی تھی، جو متکبرانہ انداز سے ایک خوش نما درخت کی ڈال کے ساتھ جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ درخت کے ارد گرد خوبصورت پرندے تھے۔ جو بظاہر اس حسین عورت کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان دینے ہی کو مآلِ زندگی تصور کئے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر کے گھنے جنگلوں سے وحشی درندے پرستارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سامنے کے روشن دان سے کبھی کبھی ایک عجیب پر اسرار روشنی اس تصویر پر منعکس ہو جاتی تھی۔ جس سے اس بے جان تصویر میں زندگی کی حرارت پیدا ہو ہو کر رہ جاتی تھی۔

کمرے کے دائیں کونے میں ایک ہاتھی دانت کی مرصع اور خوش وضع تپائی پر ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ رکھا تھا، جو ابھی ابھی خواب نوشین سے بیدار ہو کر انگڑائی لے رہی تھی، دونوں باہیں ایک ذرا پیچھے کی طرف جھکے ہوئے سر کے اوپر اس خوبصورت بُت کا محراب بن گئی تھیں۔ کھلے ہوئے سیاہ اور لمبے بالوں نے اس کے چہرے کے ایک حصے کو چھپا رکھا تھا، اس کے حاشیے پر اسی طرح روشن حروف میں "فتنۂ بیدار" لکھا تھا۔

اسلم کے بائیں پہلو کے قریب ایک آبنوس کے خوب صورت مگر بڑے پشتیبان کے سہارے ایک اور تصویر رکھی تھی جو "بارگاہِ عشق" کے نام سے موسوم تھی۔ اس میں عشق کا دیوتا، حور پیکر پری جمالوں کے عقدِ ثریا میں گھرا ہوا تھا، ایک خوبصورت مگر سرکش حسین لڑکی کو زنجیروں میں مقید کر کے اس کے حضور لا رہے تھے۔ جسے دیکھ کر وہ اپنے پھولوں کے ترکش سے ایک تیر نکال کر ایک چھوٹی سی پھولوں کی کمان میں جوڑ رہا تھا۔

اسلم ان سب تصویروں کو ایسے دیکھ رہا تھا، گویا وہ کسی بیہوش کرنے والی شراب کے دریا ہیں، اور اس کی پیاسی آنکھیں تہیہ کر چکی ہیں کہ آج ان دریاؤں کو سُکھا دیا جائے گا۔ مگر وہ کبھی کبھی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگ جاتا۔ کیونکہ جس تصویر کو بھی وہ دیکھتا تھا، اس کی شکل و صورت میں آہستہ آہستہ تغیر رونما ہونا شروع ہو جاتا تھا، اور کچھ وقفے کے بعد اس کی آنکھوں کو اس تصویر کے پس منظر پر دھنیا، کے سوا اور کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔

کئی روز سے اس کی یہی حالت تھی، یعنی اس وقت سے جب اُس نے دھنیا، کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، اس وقت کا ایک ایک دن اور اس دن کی ایک ایک ساعت اُس کے لئے ایک مسرتِ مجسّم، ایک سرورِ لازوال بن گئی تھی۔ جس چیز کی تلاش میں وہ مارا مارا پھرتا تھا اُسے مل گئی تھی، اب ہر ایک شے اُس کے لئے معنی رکھتی تھی، اب اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے وقف ہو گئی تھی، اب اُس نے عورت کی پیدائش کا راز معلوم کر لیا تھا۔

پچھلے ہفتے کے سات دن اس کے لئے سات برس ہو گئے تھے، ان سات دنوں میں دھنیا کے متعلق کوئی سات ہزار تجویزیں اُس کے ذہن میں آئیں، سب سے پہلے اس کے دماغ میں وہی خیال آیا، جو ہر معمولی مرد کے دماغ میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر آتا ہے۔ اس نے اس پر ایک بے زبان حیوان کی طرح ملکیّت کا قبضہ حاصل کرنے کی تجویز کی، اس کی قیمت لگائی، مگر ہر قیمت اس کا حُسن خریدنے کے لئے کم نظر آتی تھی۔ پھر اُس نے اس خیال کو ناپاک، نازیبا اور بالکل عامیانہ خیال سمجھ کر ترک کر دیا۔ پھر اُس نے شادی کرنے کی تجویز کی، مگر آہ ————

دھنیا کے مذہب کا تعصّب، دھنیا کی قوم کی عصبیّت، دھنیا کی ذات کی دیوار اس کے ارادے اور اس ارادے کی تکمیل کے درمیان حائل تھی، وہ جانتا تھا کہ دھنیا کی غریب اور محنت کش برادری کسی قسم کے بیرونی دخل کو اپنی انتہائی ذلّت تصور کرتی ہے۔ وہ اپنے مقدمات کو عدالت کے دروازوں تک لے جانے سے احتراز کرتی ہے۔ اس وقت اُسے محسوس ہوا کہ انسان نے انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لئے کس قدر حیوانیت سے کام لیا ہے۔ وہ گھبرا گیا، مگر اُس نے ایک پوری رات کی نہ ختم ہونے والی گھڑیوں میں ٹہل ٹہل کر یہ مسئلہ بھی حل کر لیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ عام انسانوں اور ان کے قاعدوں سے ایک بہتر روش اختیار کرے گا۔ اس کی رُوح تکلیفیں برداشت کر کر کے جسمانی آلائشوں سے

پاک ہو چکی تھی، وہ سوچ رہا تھا اور اپنے کمرے کی ساکن اور خاموش دیوار کو سمجھا رہا تھا۔ "جس چیز سے محبت کی جائے۔ وہ یقیناً خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ہر خوبصورت چیز کو مقدس سمجھنا چاہئے، مقدس بتوں کی عزت کی جاتی ہے، پرستش کی جاتی ہے۔ مقدس چیزوں کو لوگ ہاتھ نہیں لگاتے دُور سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ شاید ان کو آنکھوں سے دیکھنا بھی خلافِ ادب ہے، عاشق و معشوق میں بُعدِ مکانی ضروری ہے تاکہ وہ روحانی انبساط، وہ برقی تسلسل جو اجسام کے وصال میں ناممکن ہے۔ قائم ہو سکے، چھُونے سے مقدس اشیاء کی پاکیزگی فنا ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ان کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ محبت مقامِ پرستش کی ایک منزل ہے۔ مقدس اشیاء سے مادی مفاد کی امید درست نہیں۔ کیا ایک مفید اور کارآمد چیز سے بھی کوئی شریف اور خوش مذاق انسان محبت کر سکتا ہے؟۔۔۔۔۔۔۔۔ تعجب ہے لوگ ان عورتوں کو جن سے وہ محبت کرتے ہیں، اپنی بیویاں بنانا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ بڑے زور سے ہنسا، لوگوں کی جہالت پر، اس عام خیال کی بے ہودگی پر، اور پھر اپنی کامیابی پر خوش ہوا، وہ اپنی بند آنکھوں میں ایک نئی دنیا کی وسعتیں دیکھ رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد دو تین روز اور گزر گئے۔ آج وہ اتنا خوش تھا، کہ اُسے اپنی مسرت پر خود حیرت ہو رہی تھی، اور اس لئے وہ آج ارادتاً اس کمرے میں اپنی خوشی کو خود محسوس کرنے کے لئے بیٹھا تھا۔

اس نے خلافِ معمول ملازم کو آواز دی، وہ زبان سے ہمیشہ بہت کم کام لیا کرتا تھا۔ ملازم حاضر ہوا، تو اُس نے دھنیا کے باپ کو بلانے کا حکم دیا۔ ملازم حیران ہوا، کہ آج سائیس کو اس کے اپنے نام کی بجائے اس رشتے سے کیوں یاد کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ ایک شریف گھرانے کا مؤدب ملازم تھا ———

دھنیا کا باپ آیا، اسلم نے اپنی جھکی ہوئی گردن اُٹھائی، اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو روشن تھے۔ اس کے زرد اور پُر اطمینان چہرے پر سُرخی کی ایک رَو دَوڑ رہی تھی، اور وہ اپنے گالوں کی گرمی اپنے ذہن میں محسوس کر رہا تھا۔

اُس نے کچھ رُک رُک کر، کچھ سوچ سوچ کر آخر کار کہا۔

"تم نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دھنیا کی۔۔۔۔۔۔۔۔ را۔۔۔۔۔۔ ہم)۔۔۔۔۔۔۔ شادی اب تک کیوں نہیں کی"۔۔۔۔۔۔۔

سائیس اس خلافِ توقع تفتیش سے گھبرایا، اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی "حضور کوئی دو چار پیسے ہو تے ہیں، تو شادی بھی کر دی جائے گی۔ منگنی تو ہو چکی ہے"۔

اسلم کے دل میں ایک غیر محدود مسرت کا طوفان اُٹھا، وہ دھنیا کے اس عظیم الشان احسان کا بدلہ اُتار سکتا تھا۔ ایک لڑکی کو ایک کامیاب اور بامراد عورت بنانے کے رستے میں صرف سونے چاندی کے چند سکے حائل تھے ——— اس نے ذرا جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"دیکھو رام بلی، تمہاری بیٹی نے ہماری جان بچائی ہے" وہ صرف اس کام کو کرنے کے لئے جسے وہ کرنا چاہتا تھا، ایک بہانے کی تلاش میں تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ پانی کے دو چھینٹے دینے کے سوا دھنیا نے اور کچھ بھی نہیں کیا تھا ———

"اس احسان کا بدلہ ادا کرنا ممکن نہیں"

بے چارا سائیس کچھ نہ سمجھا، اُس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"وہ آپ کی لونڈی ہے"۔

اسلم یہ جواب سننے کے لئے تیار نہ تھا، وہ جلدی میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا:

"وہ لونڈی نہیں ملکہ ہے، وہ عورت ہے۔ وہ مرد کی قسمت ہے۔ وہ نیکی کی دیوی ہے۔ وہ احسان کی مجسم تصویر ہے ——— تم نے کیا کہا لونڈی ہے...... تم نے گناہ کیا ہے۔ توبہ کرو، وہ عورت ہے۔ وہ ماں ہو سکتی ہے۔ وہ بہن ہو سکتی ہے، وہ بیٹی ہو سکتی ہے۔ وہ بیوی ہو سکتی ہے۔ مگر لونڈی کبھی نہیں ہو سکتی...... تم اس کے باپ ہو، اس لئے میں تمہیں معاف کرتا ہوں"۔

اسلم کے دل کی حرارت کو کون سمجھ سکتا تھا۔ جس چیز کو محسوس کرنے کے لئے اس نے اپنی عمر کی بہترین ساعتیں بیکار صرف کی تھیں، جس جذبے کی زندہ تصویر دیکھنے کے لئے اُس کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی، اُسے اُس نے دُھنیا کے ہاتھ کی ایک حرکت میں دیکھ لیا تھا، اس کی ایک نظر میں محسوس کر لیا تھا۔

دُھنیا اس کے لئے صرف ایک پرستش کے قابل چیز تھی۔ وہ اپنے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر چکا تھا، اور جس کام کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا، اب اسے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک لفافہ نکالا، اُس میں بنک کی ایک کتاب اور ایک مکان کا قبالہ تھا۔ اُس نے ایک ایسے عقیدت مند پجاری کی طرح جو پھولوں کا ایک حقیر ہار اپنے دیوتا کے قدموں پر نچھاور کرتا ہے، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یہ لفافہ بوڑھے سائیں کی طرف بڑھایا، اور کہا۔ "لو، یہ میری طرف سے دُھنیا کو دے دو، یاد رکھو، یہ اس کے احسان کا عوض نہیں، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا، اُسے میں ادا کرنا نہیں چاہتا، اس کے نام پچاس ہزار روپے بنک میں جمع کرا دئے گئے ہیں، یہ اس کے حساب کی کتاب ہے، اور یہ اُس سامنے والی کوٹھی کا قبالہ ہے۔ آج سے وہ کوٹھی میری نہیں، دُھنیا کی ہے"۔

سائیں مبہوت تھا، اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، وہ گرنا چاہتا تھا، اس کا دماغ اس کے کانوں کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔ اُس نے سنبھل کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکتا، اسلم نے ذرا زور سے چلا کر کہا: "ایک لفظ نہیں، ایک حرف نہیں، میں شکریہ نہیں چاہتا، جاؤ"۔

سائیں ایک بے جان مگر متحرک بُت کی طرح دروازے کی طرف حرکت کر رہا تھا، وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ اسلم ایک پُرکیف انداز سے اُٹھا، اس کے چہرے پر آسمانی نور کی ایک جھلک تھی، اس کے لبوں پر تبسم تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں، اور اس کو وہ اطمینانِ قلب، وہ رُوحانی تسکین، وہ جسمانی آرام میسّر تھا، جو صرف ایک نیک دل انسان کو ایک نیک کام کی تکمیل کے بعد ہی میسّر آ سکتا ہے۔

قاضی عبدالغفار

تین پیسے کی چھوکری

(۱)

آج سے پندرہ سو برس پہلے!

بائی زنطہ کے شاہی سرکس میں، بادشاہ کے وحشی جانوروں کا داروغہ ایک بوڑھا شخص تھا، بہت بوڑھا، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار، اُس نے اپنے بڑھاپے کا سہارا ایک بارہ سالہ چھوکری کو بنا لیا تھا۔ جس کو نہ معلوم وہ کہاں سے لایا تھا۔ وہ نہ اُس کی بیٹی تھی نہ پوتی نہ رشتہ دار، نہ اُس کی ہموطن، لیکن اس نے منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور بیٹی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس چھوکری کی قوم کیا ہے۔ اُس کا مذہب کیا ہے اور وُہ کس طرح بڈھے کے پاس پُہنچی۔

بائی زنطہ کے عظیم الشان دارالسلطنت میں شہنشاہ جسٹینین کا پرچم اقبال بلند تھا۔ اُس زمانہ کی تہذیب اور بائی زنطی مخلوق کا تمدن، خصوصاً امراء اور عمائدین کی معاشرت یونان ورومہ کی قدیم تہذیب سے بھی دس پانچ قدم آگے تھی۔

شہنشاہ اور اُس کے امراء و ارکینِ سلطنت کے اسباب تفریح و تعیش میں سے ایک یہ سرکس بھی تھا۔ جس میں ہزاروں قسم کے وحشی اور جنگلی جانور پائے جاتے تھے۔ ۱۲ برس کی چھوکری کو دنیا میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ سرکس کے درندوں میں صبح سے شام تک کھیلتی رہتی۔ وُہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی، اور دل اُس کا ایسا ہی بے خوف تھا جیسا کہ وحشی درندوں کا، اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوف کس چیز کا نام ہے۔ وُہ شیروں کی ایال پکڑ کر لٹک جاتی تھی اور دوپہر کو کھیلتے کھیلتے اکثر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اُس کی دُنیا میں اُس کے رفیق اور دوست ہاتھی اور ریچھ ہی تھے۔

دن بھر بڈھا سرکس کے جانوروں کی خدمت میں مصروف رہتا اور چھوکری اپنے کھیل میں، شام کو چھوکری سرکس سے تو چلی گئی۔ لیکن گھر نہ پہنچی۔ رات بھر بڈھا اُس کا انتظار کرتا رہا۔ رات بھر وہ غائب رہی صبح کو وُہ ہنستی ہوئی گھر آئی اور بڈھے کے ہاتھ پر تین چمکتی ہوئی اشرفیاں رکھ دیں! یہ اُس کے حسن کا پہلا

سودا تھا! یہ اُس کی جوانی کا پہلا منافع تھا! گزری ہوئی شام اور موجودہ صبح کے درمیان، گذشتہ شب کی تاریکی میں بڑھتے کی چھوکری عورت بن گئی!

ماقوں کو غائب رہنے کا سلسلہ جاری رہا اور سرکس کے درندوں کے ساتھ جو کھیل کود ہوا کرتا تھا۔ وہ اب دُوسری قسم کے حیوانوں کے ساتھ کھیلا جانے لگا! یہ آغاز تھا ملکۂ بازنطہ کی حکومت کا!

تھوڈورا کی جوانی اب ہر طرف سے آنکھوں نظروں اور دلوں کو کھینچ رہی تھی۔ وہ شاہی سرکس میں ناچا کرتی تھی اور بائی زنطہ کے ہزاروں نظر باز شام کو اُس کے حسن کی خاطر سرکس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ شاہی دربار کے رُکن رکین بشپ وجیلیس نے تو ایک دن تھوڈورا کو ناچتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا:۔

"گھانس کا یہ پھدکتا ہوا کیڑا کسی دن سارے بائی زنطہ میں اُچھلیگا ———— دیکھنا!"

لیکن اُس وقت بشپ کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! ستم ظریفِ قدرت اس ناچنے والی کو نہ معلوم کہاں سے کہاں تک اچھالنے والی تھی!

تھوڈورا سرکس کے نظر بازوں سے تھک گئی۔ ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی نہ بھاتا تھا۔ اب وہ منظرِ عام پر تھرکنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حُسن فروش بن بیٹھی۔ حُسن فروشی اُس عہد کی تہذیب میں کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی بلکہ حُسن و ہوس کے یہ کھیل تماشے تو بائی زنطی تہذیب کے جزو لازمی تھے۔ امراء طوائفوں کی نگہِ التفات کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے اور عوام کی زندگی ان رنگین تتلیوں کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی حسین تھوڈورا اپنی دو کانِ حُسن کھول لیتی ہی، دلوں کی مالک، آنکھوں کا تارا، گلیوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی۔ اُمراء اُس کے اشارۂ ابرو کا انتظار کرتے۔ اُن کی خوں آشام تلواریں اُس کے قدموں میں پڑی ٹھوکریں کھایا کرتیں! اہلِ علم اور اہلِ مذہب بھی اُس دیوی کے استھان پہ سر جھکاتے تھے اور سرکس کی ناچنے والی چھوکری بائی زنطہ کی حُسن پرست دنیا میں ایک "ملکۂ عالم" تھی کہ اس کا سکّہ ہر طرف جاری تھا!

نوجوان شہنشاہ جسٹینین بارہا اُس کو تھیٹر میں ناچتے، باغوں میں اٹھکیلیاں کرتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجومِ عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا۔ اُس کے دل میں خلش تھی۔ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔

ایک شب شہنشاہ نے اپنے محافظ دستہ کے کپتان کو موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار دے کر تھوڈورا کے گھر بھیجا اور پیام دیا کہ وہ شاہی خلوت میں آئے۔ آدھی رات کے قریب شاہی کپتان تھوڈورا کے دروازے پر آیا۔ اُس وقت تھوڈورا کی خلوت میں اس کا کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ اُس نے کپتان کو گھر کے اندر نہ بلایا۔ بلکہ خود دروازے پر آگئی۔ شہنشاہ کا پیام سُن کر اُس نے کہا:۔

"شہنشاہ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ، مگر یہ ہار واپس لے جائیے۔ میں بکاؤ نہیں ہوں، شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ اس ہار سے کسی دُوسری حسین چھوکری کا حُسن خریدلیں ———— میری قیمت اس ہار سے بہت زیادہ ہے"!

اب وہ سرکس کی بجائے ایک عظیم الشان سلطنت کے شیر اور ہاتھی سے بے خوف ہو کر کھیل رہی تھی!!

اُسی شب پھر ایک شاہی مصاحب، شہنشاہ کا پیام، بہت سے تحائف اور اکرام و الطاف کے بہت سے وعدے لے کر آیا۔ تھوڈورا نے دوسرا پانسہ پھینکا:۔

"شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ وہ اس کنیز کے طالب ہیں تو اُس کے سیہ خانہ پہ تکلیف فرمائیں"

بائی زنطہ کے شہنشاہ سے، جس کی خاکِ پا بادشاہوں اور گردن کشوں کی سجدہ گاہ تھی۔ یہ گستاخانہ سوال و جواب، موت سے کھیلنا تھا مگر تھوڈورا نے بہت بڑی بازی لگائی تھی ————

شب کی آخری ساعتوں میں بالآخر شہنشاہ خود اُس کے دروازے پر آیا۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ تھوڈورا ایک صلیب کے سامنے جھکی ہوئی عبادت میں مشغول ہے! بہت دیر بعد اُس نے اس طرح کہ وہ گویا کسی دُوسرے عالم میں ہے۔ نظر اُٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا۔

"تم ہی تھوڈورا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا

"ہاں حضور! میرا نام تھوڈورا ہے۔ میں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی۔"

"تم وہی ہو۔ جس کو ہر ملاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے؟" شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

تھوڈورا نے کہا:-

"جی ہاں! میں وہی ہوں!"

"پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو؟" اب جسٹینین کا غصہ تیز ہوتا جاتا تھا۔

"حضور!" تھوڈورا نے دست بستہ عرض کیا۔ "ملاح کے پاس میں اس لئے جاتی ہوں کہ اُس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں اور وہ سب ہیں لے لیتی ہوں۔ وہ تین پیسہ دے کر اپنا سارا سرمایہ مجھے دے ڈالتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے چاہنے والوں سے جو کچھ اُن کے پاس ہو۔ سب ہی لے لیتی ہو؟"

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری قیمت ہے!"

"تو پھر تم مجھ سے کیا مانگتی ہو۔"

"آپ کا تاج وتخت! اے بائی زنطہ کے شہنشاہ!"

اس طرح چند روز بعد یہ "تین پیسے کی چھوکری" شہنشاہ بائی زنطہ کی مشہور عالم ملکۂ تھوڈورا بن کر اُس زمانہ کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کے سیاہ وسفید کی مالک بنی!

وہ اپنا حسن بیچتے بیچتے ملکۂ عالم بنی اور ملکۂ عالم بن کر جب اُس کو حسن فروشی کی ضرورت نہ رہی تو اُس نے بائی زنطہ کے خوبرو جوانوں کی جوانی خریدنا شروع کر دی اُس کی ہوس پرستی کی داستانیں اُسی قدر مشہور ہیں جس قدر اُس کا حسن!

(۲)

مسیح کی پیدائش کے پانچ سو برس بعد!

بائی زنطہ کے دارالسلطنت میں

شہنشاہ جسٹنین اور اُس کی عیش پرست ملکہ تھوڈورا کا زمانہ

بائی زنطہ کی شاہراہ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شہنشاہ اور ملکۂ عالم کی رعایا سڑک کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جمع ہے۔ یہ وہ سڑک ہے جو شاہی محل سے ایا صوفیہ کو جاتی ہے۔ دو رویہ سپاہی کھڑے ہیں۔ سپاہیوں کے عقب میں اہل شہر، امراء و رؤساء سب ملکۂ عالم کی سواری کے منتظر ہیں۔ ہفتہ میں ایک دفعہ ملکہ تھوڈورا۔ ایا صوفیہ میں عبادت کرنے جایا کرتی ہیں۔ یہ جلوس قابل دید ہوتا ہے۔ ملکۂ عالم کے شاندار جلوس کو دیکھنے والے گھنٹوں پہلے سے سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں اور دارالسلطنت میں ہفتہ کا یہ ایک دن گویا ایک عام یوم تعطیل ہوتا ہے ——— وہ ملکۂ عالم کی عبادت کا دن ہے!!

دیگہ بانی کے محافظ دستہ کا ہراول، سُرخ وردیاں پہنے، شاندار گھوڑوں پر سوار، آہستہ آہستہ چلا آتا ہے۔ سواروں کی وردیاں اور ان کے چمکتے ہوئے اسلحہ دھوپ میں اس قدر چمک رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ——— اس دستہ کے پیچھے ایک مرصع تخت رواں ہے اور اُس تخت رواں پر ایک مطلا شامیانہ کے نیچے ملکۂ عالم تشریف رکھتی ہیں۔ تخت رواں کے سامنے امراء اور اراکین سلطنت کی نوجوان اور حسین لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لئے ہوئے اور آٹھ چھوکریاں ہاتھوں میں چاندی کی گھنٹیاں لئے ہوئے چل رہی ہیں۔ چاندی کی گھنٹیاں تھوڑے تھوڑے وقفہ

کے بعد بجائی جاتی ہیں۔ تختِ رواں کے سامنے شاہی منصب دار قرمزی رنگ کا لمبا کپڑا اچھالتے ہوئے آتے ہیں اور ملکہ کی سواری جب اُس کپڑے پر گزر جاتی ہے تو اُس کو لپیٹ لیتے ہیں۔ منصبداروں کی جماعتیں یہ خدمت انجام دیتی آتی ہیں تاکہ ملکۂ عالم کے تختِ رواں کا سایہ ناپاک زمین پر نہ پڑنے پائے!

تختِ رواں، جواہر اور سونے چاندی کی ضیاکاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اُس کی چمک میں سورج کی شعاعوں نے گویا آگ لگا دی ہے ———

اس طرح بائی زنطہ کی ملکہ، دورو یہ خلائق کے سلاموں کا جواب سر کے اشارے سے دیتی ہوئی مسیح کی درگاہ میں جا رہی ہے ———

سلطنت کے دیہاتی علاقہ کا رہنے والا ایک خوبصورت نوجوان استیفؔ جو چند روز ہوئے دارالسلطنت کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس وقت، ایک کنوئیں کی دیوار پر کھڑا ہوا شاہی جلوس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اُس کے قریب اُس کا ایک شہری دوست کھڑا ہے۔ سواری قریب آگئی۔ دفعتہً ملکۂ عالم کی نظر اس دیہاتی نوجوان پر پڑی مگر وُہ نہ سمجھا۔ وُہ سمجھا کہ یہ غلط انداز نظر برسرِ راہ تھی۔ مگر وہ خوش تھا کہ آج اُس نے ملکۂ عالم کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بادشاہوں کا دیدار عقیدت مند رعایا کے دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتا ہے!

استیفؔ بیچارے نے اپنی عمر میں پہلے کبھی شاہانہ طنطنہ کا یہ مظاہرہ کب دیکھا تھا! وہ اس نظارہ میں محو تھا کہ ملکہ کی سواری بالکل اُس کے سامنے آگئی ——— ایک لمحہ کے ہزارویں حصّہ میں اُس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اُس کی نظر ملکۂ عالم کی نظر سے ملی۔ گھبرا کر اُس نے نظریں نیچی کر لیں ——— اتنی ہی دیر میں سواری آگے نکل گئی۔ استیفؔ کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُس کو پسینہ آگیا تھا۔

شاہی سواری کے پیچھے پیچھے ایک منصب دار چاندی کے پھول لٹاتا ہوا جا رہا تھا غریب اور امیر بڑھ بڑھ کر ان پھولوں کو لوٹ رہے تھے۔ جس کے ہاتھ ایک پھول آگیا۔ اُسکو گویا بڑی سعادت نصیب ہوگئی۔ منصبدار جب بڑھتے بڑھتے استیفؔ کے قریب پہنچا تو اُس نے اپنا ہاتھ لوگوں کے اُوپر سے استیفؔ کی طرف بڑھایا۔ اُس کے ہاتھ میں چاندی کے پھول اور ایک تازہ گلاب تھا۔ استیفؔ نے ——— جیسے کوئی مخمور ہو یا عالمِ خواب میں ——— ہاتھ بڑھا کر گلاب لے لیا، وُہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے، شکریہ ادا کرے ——— لیکن اتنی ہی دیر میں منصبدار بہت آگے نکل چکا تھا!

سواری بادِ بہاری گزر گئی۔ مجمع منتشر ہو رہا ہے۔ استیفؔ گلاب کا سُرخ پھول ہاتھ میں لئے جا رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاہی منصبدار خاص طور پر اُس کی طرف کیوں مائل ہوا۔ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں گلاب کا پھول تنہا اُسی کو کیوں دیا گیا ———؟

گلاب بہت بڑا اور بہت خوبصورت تھا۔ وُہ اس قسم کا پھول تھا۔ جس کے چند ہی درخت شاہی باغیچے میں تھے اور شاہی باغیچہ کے علاوہ کہیں نہ تھے۔ یہ گلاب بائی زنطہ میں شاہی محل کے علاوہ کہیں میسر نہ آسکتا تھا۔ مجمع سے باہر نکل کر استیفؔ نے بغور اُس پھول کو دیکھا۔ اُس کی پتیوں کے نیچے ایک پرزہ بندھا ہوا تھا۔ اُس پرزہ پر سُرخ رنگ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:-

"شاہی محل کے جنوبی دروازے پر ——— آج دس بجے ——— یہ پھول لیکر آؤ ——— اس پھول سے تمہاری قسمت کا دروازہ کھُلے گا"

استیفؔ ششدر تھا۔ وُہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس واقعہ کے معنی کیا ہیں وُہ کیوں محل کے دروازے پر جائے۔ اُس کی قسمت کا دروازہ کیونکر کھُل سکے گا۔ اُس کا دل کہتا تھا:-

"جانا چاہئے، اگر یہ شاہی اکرام و الطاف کا اشارہ ہے تو تیری قسمت جاگ جائے گی۔ کیا معلوم تو شاہی دربار میں منصبدار بنا دیا جائے۔ کیا معلوم تو کیا ہو جائے ——— جانا چاہئے"

عقل کہتی تھی:-

"کوئی دھوکا، کوئی فریب تو نہیں، بھلا کہاں ملکۂ عالم، کہاں تو غریب دہقانی، منصبدار نے تیرے گنوار پن کا مذاق نہ اڑایا ہو یا کسی دشمن نے تجھے دھوکہ دے کر نہ بلایا ہو"

عقل اور دل کا جھگڑا ختم نہ ہوتا تھا۔ لیکن قدم دل کے فرمانبردار تھے۔ عقل کا زور ان پر نہ چل سکا۔ وقت مقررہ سے کچھ پہلے استیفؔ کے قدم بلا ارادہ شاہی محل کی طرف بڑھنے لگے۔ کبھی اپنے دل سے، کبھی اپنی عقل سے اُلجھتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا ———

دل کہتا :-

" تیرا انتظار کیا جا رہا ہے، قدم بڑھا "

عقل کہتی :-

" تو بیوقوف ہے، تیرا اور انتظار! دیوانے! سپاہیوں اور دربانوں کی ٹھوکریں کھائے گا "

جوانی کا خون گرم تھا۔ دل کی حرکت تیز تھی۔ چہرہ پہ سُرخی جھلک رہی تھی۔ پیشانی پر پسینہ کے قطرات تھے۔ اس طرح استیفؔ شاہی محل کے دروازہ پہ پہنچا اُس کو یہ خبر نہ تھی کہ دروازہ مغربی ہے یا مشرقی! وہ بڑھا چلا گیا!

شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ بڑے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔ اُس کے قدموں کی آواز اور تلواروں کی چمک استیفؔ کو اپنے ساتھ کھینچے ہُوئے اندر لے گئی۔ وُہ محل کے پہلے برآمدہ میں داخل ہُوا۔ جہاں شاہی دربان مسلح کھڑے تھے۔ ایک قوی الجثہ حبشی بارگاہ کے سرا پردے کے پاس ایک برہنہ تیغہ ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا تھا۔ استیفؔ نے آگے بڑھ کر سُرخ گلاب اُس کے سامنے پیش کیا ——— اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہے کیا!

دربان مسکرایا۔ " بیوقوف آدمی! مجھے کوئی حسین چھوکری سمجھا ہے تونے؟ گدھا! "

استیفؔ کے بدن میں ان تحقیر آمیز الفاظ نے آگ لگا دی۔ وُہ بے اختیار ہو گیا۔ اسے خبر نہ تھی کہ کس طرح اُس نے دربان کے سیاہ تاب گال پر ایک چانٹا مارا ——— سارے برآمدہ میں شور مچ گیا۔ محافظ دستہ کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کے قبضوں سے مار مار کر استیفؔ کو فرش پہ گرا دیا۔ چند منٹ میں اُس کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر ہنگامہ کی آواز سُن کر دربانوں کا داروغہ کمرہ سے نکل آیا۔ اُس کو دیکھ کر سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

" اسے تو کون ہے دہقانی؟ " داروغہ نے کہا

استیفؔ جھنجھلایا ہُوا اُٹھا۔ اُس کا گلاب زمین پہ گر گیا تھا۔ اُس کی چند پتیاں منتشر ہو چکی تھیں جُھک کر اُس نے گلاب کو زمین سے اُٹھا لیا اور اُٹھا کر داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔

" ہاں! " سُرخ گلاب کو دیکھ کر داروغہ مسکرایا۔ " بے وقوف آدمی! اس پھول کو لے کر یہاں کیوں آئے؟ "

پھر اُس نے مجمع کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو جھڑکا :-

" جاؤ! اپنا کام کرو، کیا کچھ تماشہ بنایا ہے؟ " جب سپاہی ہٹ گئے تو اُس نے استیفؔ کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر دبی زبان سے کہا :-

" یہ حماقت کی تم نے! اس پھول کو لے کر یہاں گھس پڑے۔ نہیں جہاں یہ پھول لے کر جانا چاہئے۔ یہ وہ جگہ نہیں "

یہ کہہ کر استیفؔ کو وُہ اپنے ساتھ ایک دوسرے دروازہ پہ لے گیا اور وہاں کے چوبدار کو آواز دے کر کہا

" لو یہ ایک بے وقوف پھول والا آیا ہے۔ اس کو اندر پہنچا دو۔ یہ آدمی ہماری طرف کا نہیں ہے۔ تمہاری طرف کا ہے "

ملکہ کے چوبدار نے پھول پہ نظر کی اور استیفؔ کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ملکہؔ کے محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

آگے آگے چوبدار اور اُس کے پیچھے استیفؔ ——— دونوں ایک پُر فضا آراستہ اور خوبصورت برآمدوں اور کمروں سے گزر کر ——— باغیچہ میں داخل ہوئے۔ جس کے وسط میں ایک فوارہ جاری تھا۔ اس کے پانی کی سطح پر سینکڑوں رنگین پھول تیر رہے تھے۔ باغیچہ سے گزر کر ملکہ عالم کی خاص محلسرا تھی۔ محلسرا کے برآمدوں میں نوعمر اور خوبصورت لڑکے، زرق برق لباس پہنے ہوئے حسین مامائیں اور باندیاں، خوفناک شکل کے خواجہ سرا اور حبشی غلام جن کے سروں پہ زرد پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں، کچھ بیٹھے، کچھ لیٹے، کچھ ٹہل رہے تھے۔ کچھ چھوکریاں قدم بڑھائے اِدھر سے اُدھر جا رہی تھیں استیفؔ

کی دہقانی وضع اور پھر اُس کے ہاتھ میں سُرخ گلاب کے پھُول کو جس نے دیکھا۔ وہ مُنہ پھیر کر مسکرا دیا۔ شاہی خواصیں اپنے ہاتھ کے پنکھوں کی آڑ میں ایکدوسرے کو اشارے کر رہی تھیں اور کم عمر لڑکے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روک رہے تھے۔

استیفق کو اپنے گرد و پیش ان حرکات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وُہ چوبدار کے پیچھے پیچھے پردہ اُٹھا کر شاہی محلسرا کے خاص کمروں میں داخل ہُوا۔

ایک مزیّن کمرہ کے ایک گوشے میں ریشم کے قرمزی پردوں کی آڑ میں، بڑے بڑے گدوں اور تکیوں پر ملکہ تھیوڈورا آرام فرما رہی تھیں۔ ایک رنگین فوارہ کمرے کے وسط میں جاری تھا چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کی مہک سے تمام کمرہ معطر تھا۔

کچھ ایسی ہلکی روشنی ریشمیں پردوں میں سے چھن چھن کر کمرہ میں آ رہی تھی جیسی کہ رات کے ختم ہونے اور دن کے شروع ہونے کے وقت ہوتی ہے ——— وہ سب جنت کا ایک تخیل تھا۔ جس کو استیفق نے آج اپنی عُمر میں پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ——— ریشم کے پردوں کی آڑ سے اس دھندلی روشنی میں، ملکہ نے اشارہ کیا، کمرہ کے سکونِ کامل میں، رُومی قالینوں پر استیفق کے قدموں کی آواز گم تھی۔ وُہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے ملکہ تھیوڈورا کا آغوشِ محبت اپنے لئے کھُلا ہُوا پایا!

"تمہارے جانے کا وقت آگیا" نظریں نیچی کئے ہوئے ملکہ نے فرمایا۔

استیفق کے جسم میں ایک عجیب لرزش، ایک عجیب سنسناہٹ تھی جو آج سے پہلے اُس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

وہ ابھی تک ملکہ کے آغوش کی مستیوں سے مخمور تھا! ——— اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب اُس نے کہا:۔

"کیا پھر کبھی ملاقات نصیب ہو گی؟"

ملکہ مسکرائی! استیفق اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا کہ یکایک وہی خواجہ سرا جو اس کو اندر لایا تھا۔ کمرہ میں داخل ہُوا۔ استیفق چونکا۔ اُس کو محبت کی خلوت میں خواجہ سرا کی یہ درانہ ناگوار گذری۔ گویا یہ سیاہ فام حبشی اس کی اس نئی محبت کے راز کو فاش کئے دیتا ہے! لیکن ملکہ سے اپنے سوال کا جواب نہ پاکر وہ یک گونہ مایوس ہُوا اور سر جھکائے دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔ ملکہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر وہ پھر ذرا رُکا۔

"استیفق کل پھر آؤ!"

ملکہ کے شیریں لبوں سے یہ شیریں پیامِ الفت کس قدر رُوح پرور اور دلنواز معلوم ہُوا۔

اُس دھندلی روشنی میں ملکہ ——— نہ جانے کس طرح ——— اس کمرے سے جا چکی تھی۔ استیفق نے اس کو جاتے نہ دیکھا۔ لیکن اُس کی جگہ خالی تھی اور استیفق "وعدۂ فردا" کی مسرتوں سے جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم باقی تھے کہ ایک حبشی غلام کی نوکدار چھُری اس کی پشت پر چمکی اور چشم زدن میں اس کی پشت کی طرف سے سینہ کے پار ہو گئی۔ وہ صرف ایک ہچکی لے کر دروازے کے سامنے فرش پر اوندھا گر گیا۔

غلام نے چند لمحے اپنی چھُری کو اُس کے گرم جسم میں آرام لینے دیا۔ اس کے بعد اس کے خون آلود پھل کو باہر کھینچ لیا۔ استیفق کے سر کے لمبے بالوں سے اُس حبشی نے اپنی چھُری کا خون صاف کیا۔ پھر لاش کی ٹانگ پکڑ کر اُس کو کھینچتا ہُوا کمرہ کے باہر لے گیا۔

اُس کمرے کے فرش پر، جہاں استیفق نے ایک لمحہ کے لئے تھیوڈورا کے آغوش میں محبت کی ایک بازی لگائی تھی۔ سُرخ گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی رہ گئیں اور اُن پتیوں میں سے ایک پر استیفق کی جوانی کے گرم خون کا صرف ایک قطرہ جما ہُوا رہ گیا۔

اسی شام کو جب چند ملاح اپنی کشتیاں ساحل کی طرف لا رہے تھے۔ شاہی محل کے چور دروازے سے باسفورس کے پانی میں ایک سربند تھیلا جو خون آلود بھی تھا پھینکا گیا؛ ملاحوں نے دیکھا اور اپنے پتوار تیزی سے چلانے لگے۔ اُن کیلئے اس قسم کے تھیلے کوئی نئی چیز نہ تھے۔ ہر روز صبح و شام وہ دیکھا کرتے تھے کہ شاہی محل سے باسفورس کی بھوکی مچھلیوں کی یہ مخصوص غذا پانی میں پھینکی جاتی ہے۔ انکو یہ بھی معلوم تھا، اور بائی زنطہ میں کس کو معلوم نہ تھا کہ رحمدل ملکۂ عالم حُسن کی دعوت کے بعد باسفورس کی مچھلیوں کیلئے اپنے حسن کے دسترخوان سے تازہ غذا اُن تک پہنچایا کرتی ہیں

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سُنی نہیں کہتا، آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں، اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے، جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھیے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سُننا:

دو بھائی تھے چنو منو نام، کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا اور ددھیال سید واڑے میں۔ ماں، پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لئے اور نتیجہ میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتنا پڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لئے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے، اچھے ہاتھ پاؤں نکالے، چنو ذرا سنجیدہ تھا، ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا، اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی، چمار ٹولی، جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے، لجاتی سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔ اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔

اس نے آہستہ سے کہا:

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی

اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے رہے۔
اتفاق سے انہی دنوں دُوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹھکی ہوئی ہے سیدانی بی ان درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رنگیلا نہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا:

"اچھا! گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کروں گی۔"

اُدھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے ان کی تاریخ یوں بیان کی:

"راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کنجڑن، کنجڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا" اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے" خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جزبز ہوئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفا کے گھر میں۔ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر انہوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو، کل اس کا عقد ہوگا۔"

بیچاری جولاہن کو چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا نہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہی کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی انہی کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بحاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنوایا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس دس روپے منو کی ماں کو دئے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے، دن بیتتے گئے، مہینے ہوئے، ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکلے میں اچھے ہو گئے ——— کہ دفعتہً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھڑی میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی، جولاہن سوائے "ممتا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دے دیا "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون، گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا" ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ——— اور تاڑی بند ہو گئی ——— نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ——— اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد، سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار رہا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں ——— اور منو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دئیے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گذری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس، بھلا کس سے کم تھیں، انہوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر دو لات ماری کر وہ الٹے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ تھا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتۂ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتہً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدۃ کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلاتے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد دل بیان ہوئے، تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحثتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں "چل اسے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے، میں خوش، میرا خدا خوش!" ——— چنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا اور

اپنے چاروں بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا، دو بیتے، تین مہینے بیتے مگر پہلے مہینے چنو کی کمر میں اُچک آگئی۔ اکڑنا، بورنا، تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ محسن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے، ان کو دکھایا۔ انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا۔ بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس اچنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی چنیا بیگم مانگتی ہیں دودھ، مکھن، گھی، ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی ملائی میں کہاں نصیب، وہ لگا کھیسے نکال کے ہانڈ لپھیانے اور بیٹھیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاویں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خان کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلہ میں حاضر تھا۔ ڈلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آرہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں! ارے ماں!" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا، سنبھلتا پھسلتا، لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بکری کے پنجے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح دھم سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الٰہ آباد چلی گئی۔

حامد اللہ افسر

ڈالی کا جوگ

گنگا کے کنارے موضع ارتسی کے مشرقی حصہ میں جامن اور فالسے کے درختوں میں چھپا ہوا ڈالی کا غریب گھر تھا۔ سفید مٹی سے پُتی ہوئی کچی اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں عارفانہ سکون و اطمینان کے ساتھ پھونس کے چھپر کو اپنے سروں پر خاموش لئے کھڑی تھیں، صاف و شفاف چھوٹے سے صحن کو محصور کر لینے والی نیچی اور خوشنما دیواروں نے ڈالی کی پرورش گاہ کو تمام بستی سے علیحدہ کر دیا تھا صحن کے مغربی پہلو میں کھرنی کا گنجان درخت تھا جس کے پتّے ہوا کے توسّل سے تالیاں بجا بجا کر ڈالی کے ننّھے دل کو ہمیشہ بہلاتے رہے ہیں گھر کے چاروں طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے جن کی گود میں ڈالی نے پرورش پائی تھی۔

شام کا وقت تھا اور تمام دن کی مسافت طے کرنے کے بعد آفتاب اپنی سنہری خوابگاہ میں آرام کرنے کے لئے جا رہا تھا۔

زمین اور آسمان تاریکی کی گہرائیوں میں غرق تھے، پہاڑوں کی بلندیاں اور میدانوں کی پستیاں ایک سطح پر ہو گئی تھیں اور نیلی کملی والا آج کالی کملی اوڑھے ہوئے تھا اندھیری رات سکون و خاموشی کا جامہ پہنے ہوئے تھی۔ مٹی کا چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا چراغ اپنی دھندلی اور افسردہ روشنی میں ڈالی کے غمزدہ چہرہ کو تک رہا تھا نمبردار کیلاش کی پُر اسرار گم گشتگی نے ایک معصوم اور بھولی بیٹی کو اُس کے عزیز ترین باپ سے جُدا کر دیا تھا،

کاش وہ اس سنسان اور ڈراؤنی رات کے پہلے حصّے میں اپنے ہرے بھرے کھیتوں کی رکھوالی کو نہ جاتا۔ کہتے ہیں کہ لُٹیروں کا گروہ مسلّح تھا اور "کولی" جس وقت کھیت کی ڈول پر سے کُود کر بھاگا ہے تو بدنصیب نمبردار اُن کے قبضہ میں آچکا تھا۔

نعش کا پتہ نہیں ملتا صدہا دل اُسے اپنے سینوں سے لگانے کے لئے بے چین ہیں۔ کاش اُنھیں اتنا موقع مل جاتا کہ اپنے عزیز اور بے گناہ کیلاش پر کسی قسم کی مصیبت آنے سے پہلے وہ اپنی جانیں قربان کر دیتے خون کے چھینٹے بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ ہاں کھیت کے قریب والی زمین کی مٹی ضرور اِدھر اُدھر کو مٹی ہوئی ہے جس سے زور آزمائی اور دست و گریبان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

تمام گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا لیکن ڈالی اپنے گم گشتہ باپ کو صبر و تحمّل کے دُشوار گذار راستوں میں تلاش کر رہی تھی۔

(۲)

اِس غم انگیز سانحہ کے بعد زمین مع اپنے غیر محدود تغیرات کے چھ مرتبہ آفتاب کے گرد چکر کاٹ چکی ہے کاتک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے صبح کا وقت ہے نسیم اِدھر اُدھر کھیلتی پھرتی ہے۔ اس کے خوشگوار اور دل لبھانے والے جھونکے موسم سرما کے ابتدائی زمانہ کا عکس لئے ہوئے ہیں۔

اَرتشی سے چند میل کے فاصلے پر ہمالہ کی ناک رس چوٹیوں سے آنے والی گنگا کے اُس پار پھونس کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی زاہدانہ انداز سے خاموش کھڑی ہے، ہلکی سُرمئی ساری پہنے ہوئے ایک دوشیزہ جوگن اٹھکھیلیاں کرنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں میں پانی دے رہی ہے۔ بیلے اور چنبیلی کی خوشنما کلیاں اس کے مقدس اور سنجیدہ چہرہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے دیتی ہیں، سُورج جو کچھ دیر پہلے سے صنفِ نازک کے اس پاکباز سنیاسی کو خاموشی کے ساتھ مشرقی پردوں سے مُنہ نکال کر جھانک رہا تھا اب آہستگی سے اُوپر اُٹھ آیا ہے کیونکہ اُس نے اندازہ کر لیا ہے کہ ماہتاب کی للچائی ہوئی آنکھیں کھلنے سے پہلے وہ بلا شرکت غیرے اس متبرک اور دلچسپ نظارے سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

جوگن اپنی پھونس کی کُٹی میں بیٹھی ہے جسے اُس نے خود اپنے ننھے اور نازک ہاتھوں سے آٹھ شبانہ روز کی محنت میں بنا کر کھڑا کیا ہے۔ دو تصویریں اُس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ زاہدانہ صبر و استقلال کے ساتھ تخیل کی وسیع گہرائیوں سے نکلنا چاہتی ہے مگر مجبور ہے۔

(۳)

"ڈالی آخر میرے بچپن کے خواب کی تعبیر نکل آئی۔ مجھے مقدّس دیویوں نے پسند کر لیا۔ پاک خدا تجھ پر مہربان ہے۔ تُو گناہوں سے بری ہے اور تیرے زُہد و اِتّقا کی قسم کھائی جاتی ہے۔

تو جوگن کے بھیس میں کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے گویا خدائے بزرگ و برتر خود تیرے جسمانی مندر میں جلوہ افروز ہے۔ تُو شبنم سے دُھلے ہوئے اُس پھُول کی مانند پاکیزہ اور دلفریب ہے جو دیویوں پر چڑھانے کے لئے لایا جاتا ہے۔

اُٹھ پیاری ڈالی اُٹھ اور اپنے ہاتھوں سے مجھے برکت دے میں اب بھی وہی دانی ہوں جو آج سے چند سال پیشتر تھا۔ اُس وقت تو میرے لئے ایک حسن کی دیوی تھی مگر اب"......

"دانی۔ بس بس۔ جسے میں نے بھلا دیا اُسے اب پھر یاد نہ دلاؤ۔ میں دُنیا کو چھوڑ چکی۔ وہ غم و اندوہ کا مسکن ہے۔ میں یہاں آزاد ہوں تم مجھے آزاد رہنے دو۔"

"اور محبّت کا وہ عالیشان محل جس کی تعمیر دونوں نے مل کر کی ہے اور جو رُوح افزا وعدوں سے مزیّن کیا گیا ہے کیا آج بے گناہ دانی کے سر پر گرا دیا جائے گا۔"

"نہیں دانی نہیں۔ میں تمہاری محبّت کی قدر کرتی ہوں۔ میں تمہیں بھُولی نہیں ہوں۔ مگر ہاں اب میں مجاز کے شور و شر سے نکل کر حقیقت کے سکون و اطمینان میں آگئی ہوں۔"

"ایک سچّے پرستار کے محبّت بھرے پہلو میں تقدّس اور پاکیزگی پر دھبّہ آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"لیکن دانی جو خدا کی ہو چکی ہے وہ پھر کیسے اور کسی کی ہو سکتی ہے۔"

"ڈالی۔ شاید تم بھول گئیں۔ تمہارے پتاجی مجھ پر مہربانی کی نظر رکھتے تھے۔ کیا تم اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا پسند کروگی؟"

"پتاجی کی مرضی ہرگز نہ تھی کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو، اُنھوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہاری طرف اِس نظر سے نہ دیکھوں۔

ڈالی۔ کیا تمھیں وہ دن یاد نہیں جب میں کئی ہفتہ متواتر مغموم اور افسردہ خاطر رہی ہوں تم مجھ سے میرے تفکرات کا سبب پوچھتے تھے اور میں ٹال جاتی تھی۔"

"ڈالی مجھ پر رحم کرو!"

"میں اپنے پیارے پتا کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گی۔"

"ڈالی۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرتے ہوئے ایک بے گناہ کا خون اپنی گردن پر نہ لے، دونوں وقت ملتے ہیں۔ مبارک فال ہے، دیکھ ایسے سہانے اور متبرک وقت میری درخواست رد نہ کر۔"

"ڈالی۔ میں مجبور ہوں۔"

سورج اپنے طلائی زیور کو دُنیا کی آنکھوں سے چھپانے کی کوشش میں تھا، اُفق پر بادل منڈلا رہے تھے اور مالن محبت کے جذبات کو اپنے سینہ میں دبا رہی تھی۔

ڈالی اب بہت دُور نکل گیا ہے، یاس اس کی ساتھی ہے، مایوسی اس کی غمخوار ہے اور موت اس کی رہنما۔

(۴)

ایک روز صبح کی ابتدائی دُھندلی روشنی میں جوگن مقدس گنگا کے پانی میں کھڑی ہوئی ستارۂ سحری کی طرف نظر جمائے ہوئے اپنے پاکیزہ سُروں میں بھجن گا رہی تھی، گنگا کے مشرقی پہلو پر آسمان میں ازغوانی رنگ کی شگفتگی ظاہر ہوئی، تاریکی کھِلتی ہوئی کلی کے بالائی نقاب کی طرح ہٹ گئی اور صبح ایک ہلکے پھول کی مانند آسمانی جھیل میں شگفتہ ہوئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوگن کے ہر حرف پر صبح کا جادو ٹوٹ رہا ہے، چاند اور ستارے مغرب میں غرق ہو رہے ہیں، سورج مشرق میں طلوع ہو رہا ہے اور اس طرح دُنیا کا منظر اس کی سحر انگیزی سے تغیرات کے زیر اثر ہے،

اشنان کے بعد وہ خوبصورت اور پاکباز ہستی دریا کے باہر آئی اس کے ریشمی بالوں کی جٹا سے پانی ٹپک رہا تھا اور نوزائیدہ سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں اُس کے جسم پر منعکس تھیں،

ایک غصہ سے بھری ہوئی آواز اُس کے کانوں میں آئی، ڈالی صاف نہ سمجھی، پھر وہی آواز سُنائی دی "ٹھہر او مکار جوگن ٹھہر"

ایک قوی ہیکل انسان ہاتھ میں ننگی تلوار لئے نمودار ہوا، ڈالی کے دماغ میں غصہ اور حیرت کا طوفان جوش زن تھا، آواز دینے والا قریب ہوا۔ ڈالی نے اس شکل اور جسم کو ضرور کہیں دیکھا ہے، اُس کے کان بھی اس آواز سے مانوس ہیں، ڈالی کے دل میں عجیب طرح کے جذبات کا ہجوم تھا۔ انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد اُس نے بولنے کی جرأت کی "میں ......"

"ہاں تو تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کو پناہ دیتی ہے، میں نے اس خطہ کو ان تباہ کن ہستیوں سے پاک کر دیا ہے، ایک دانی باقی ہے، سو وہ تیری پناہ میں دیکھا گیا ہے، مجھے اُس کا پتہ دے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھولے۔"

ڈالی ایک بار پھر خیال کی وسیع اور غیر محدود گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔

بالکل میرے عزیز پتا کی آواز ہے، وہی چہرہ ہے، وہی قد ہے۔ مگر اُن کی داڑھی نہ تھی، تصور مجھے دھوکا نہ دے، میں خواب میں ہوں،

تخیّل نے ایک پیاری شبیہ بنا کر میرے سامنے کھڑی کر دی ہے۔ آہ ظالم لٹیرے، امگہ، دانی اور لٹیرا! خدایا!.....

"جوگن بول، مجھے اُس نامراد دانی کا پتہ دے جس نے میرے قتل کی سازش کی تھی اور اس طرح میری عزیز بیٹی اور میرے مال و متاع پر قبضہ کرنا چاہا تھا، میں اُس کے خون سے اپنی پیاری ڈالی کے بیاہ کا جوڑا ———"

"پتاجی! پتاجی! تمھاری بیٹی۔"

"کون! ڈالی!..... ڈالی!..... جوگن!....."

دریا کا پانی جوش میں اُچھل اُچھل کر کنارے والی زمین کو بوسہ دے رہا تھا، سرو اور کیلے کے درخت خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے اور ایک مدت کا چھوٹا ہوا باپ اپنی پیاری اور پاکباز بیٹی کو اپنے قدموں سے اُٹھا کر سینہ سے لگا رہا تھا۔

عاشق بٹالوی

زندگی

صبح چند مہمان آجانے کی وجہ سے تمام دن اُن کی خاطر مدارات میں صرف ہوگیا۔ عصر کے قریب میں بمشکل مطالعہ کے لیے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہری کی ہواخوری بھی ضائع ہوگئی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہوکر صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کیجئے یا یونہی چہل قدمی کے لیے، میں مکان کی چاردیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا ہوں گا کہ کسی نے آہستہ سے میرے پیچھے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کے دیکھا تو ایک دُبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا۔ گہری شام کے غلیظ دھندلکے میں اُسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقّت ہوئی۔ لیکن جب اُس نے مانوس اور شیریں آواز میں، اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہوسکتی تھی، میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اُس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا۔ تو سب سے پہلے میں نے اُس کی ظاہری وضع قطع پر لب کشائی کی، جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی ہو رہا تھا۔ پرانے بے تکلفانہ انداز میں اُس کی کمر پہ زور سے تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟ تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمہیں پہچان بھی نہ سکتا۔"

اُس نے رُکتے رُکتے کہا۔ "میں مُلتان سے آ رہا ہوں، راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہوگیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے مُنہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا، پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "واللہ قدرت بھی عجب ستم ظریف واقع ہوئی ہے تمہارے کپڑوں کے بکس کا گُم ہوجانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے، بلکہ اس سے بھی شدید، جیسا کسی مصوّر، نقّاش یا سنگ تراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کیے ہوئے نوادر کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثے سے صنعت اور فنونِ لطیفہ کی دُنیا کو بہت نقصان پہنچے گا۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟"

اُس نے کہا۔ "بندۂ خدا مذاق پھر کرلینا۔ پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام وطعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھہروں گا۔"

"بسم اللہ۔ آئیے۔"

میں سیدھا اُسے اپنے مکان میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ اور لیمپ کی روشنی اُس کے چہرے پر پڑی، تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اُس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو نہایت لااُبالیانہ طریق سے اُتار کر میز پر پھینک دیا۔ اور زیر لب گنگنانے

لگا۔ لیکن اس کی ہیئتِ مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ ہنسنے کی کوشش کر رہا ہے۔ درحقیقت آج کا اصغر اُس اصغر سے جسے میں جانتا تھا، کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اُداس، منحنی سا چہرہ، معمولی ادنیٰ درجے کے لباس میں ملبّس آنکھوں میں کھویا پن اور کہاں وہ چاق، چوبند، خوش طبع، انگریزی معاشرت کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحرکار شخصیت اور ندرتِ کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کی بزم کو کشتِ زعفران بنا دیتا تھا۔ اُس کا حسنِ مذاق مسلّم اور اُس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقۂ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

چند لمحے خاموشی میں گذر گئے۔ تو میں نے کہا "ہاں، تو تم نے بتایا نہیں وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟"

"ارے بھائی کوئی بات ہو تو کہوں۔ سراسر میری ہی غلطی تھی۔ میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اُسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی، اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں۔ ریل میں بیٹھا تو بھی وہ اُدھیڑ بُن طاری رہی اور میں اُس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ بعد ازاں میں نے محسوس کیا کہ وہاں دو شخص ایسے موجود تھے۔ جو اپنی حرکات سے بہت مشکوک چلن کے معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی۔ اور خانیوال اسٹیشن پہ جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ، اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی۔ وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے وہیں ٹھہر جاؤں تاکہ ان کو تلاش و تفتیش میں سہولت ہو۔ مگر میں نے سوچا ما مضیٰ ما مضیٰ، قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا۔ ورنہ جان تو باقی ہے۔ اُن کو ضروری ہدایات دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیشِ نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں۔ وہاں لباس ایسی اہم چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہوگا۔"

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا "اصغر، ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے۔ تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑ بُن میں گذار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوتِ مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک نقلی معلوم ہوتی ہے۔"

"نقلی؟" اصغر جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ "تم دیکھو گے کہ میں اصول سے سرِ مو انحراف نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو عرض ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعوےٰ نہیں کیا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اور منجملہ اُن بالا از شمار نفوس کے ایک میں بھی ہوں جسے اسرارِ حیات کو سمجھ لینے کا دعوے تو نہیں ہاں جس نے بزعم خود ایک ایسا راز جان لیا ہے۔ جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں۔ جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو۔ لیکن ایسی ہنسی میں پہلے کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ لاریب مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کو رفع کرنے کے لئے میں ہمیشہ جد و جہد میں مصروف رہتا ہوں۔ آخر انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردشِ مدام سے گھبرا نہ جاؤں۔ ہر چند کہ جانتا ہوں یہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیلِ حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن میرے عمل کی کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زریں اصول جس کی حقانیت اور صداقت پر مجھے دو اور دو چار والا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو۔ لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی ایسی چیز مادی یا غیر مادی، بھی ہے جس کی بنیاد وہم نہ ہو؟ عزیز دوست، انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پہ آپ نے

سے باہر ہو جاتے اور ناکامی پر گریہ و زاری کرنے کے کیا معنی ؛ تم میرے ہی کہنے سے اُس اصول کو جسے مَیں صداقت اور تم وہم سے تعبیر کرتے ہو ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو۔ پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اُٹھ جاتے ہیں یا نہیں ؛ علّت و معلول کی اس دنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلے میں منسلک ہیں۔ اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشاء نتائج اخذ کرنے کے لئے اسباب پر قدرت حاصل کرنے کا متمنی ہوں مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں "

ابھی خدا معلوم وہ اس کے بعد کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اُسے خاموش کر دیا۔

مَیں نے کہا " سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کی لسّانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آ جائے۔ ذرا اس چہرے کو دیکھو جس میں خونِ زندگی کا قطرہ تک نہیں آتا۔ اپنی جھرّیوں سے اٹی ہوئی پیشانی دیکھو۔ رخساروں سے زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈّیاں گن لو۔ ایک چھلکتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اُس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ذوقِ جمال و آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگِ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے ؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں تاکہ یہ گفتگو پس منظر کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابلِ التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے اصغر اور مَیں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں رہے۔ جن میں سے ایک سال کے لئے مَیں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات کشیدہ نہ تھے۔ تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے طوعاً و کرہاً وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ سے اصغر کی صرف اپنی زندگی اس کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں کبھی آپ کے، یونہی فرصت کا وقت گزار لیتا یا اگر جیب گرم ہوتی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگاتا اس کا محبوب مشغلہ تھا حالات کی اس ناموافق روش نے۔ جو یقیناً مجھ ایسے ذکی الحس انسان کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی، اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور قوتِ ارادی پیدا کر دی۔

سماج میں فرد کی حیثیت سے انسان پر بہت سے ایسے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت، دوستوں کی مروّت، بیوی بچوں کی اُلجھن، بھائی بہنوں کی محبت، تعلقات کی ایسی سینکڑوں زنجیروں نے ہمیں سماج کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ کر رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ در اصل انسانی زندگی ایسے ہی خونی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں۔ اور اُس کا قیام بھی ممکن ہے۔ جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا تھا۔ ایسا قائم بالذّات شخص جو طعن و تشنیع کے دغدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن الحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادہ کار ہو جائے۔ جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو، جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندۂ استہزا کے خوف سے یکسر آزاد ہوں، بلا شبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذّت رکھتا ہے۔ بعض دنیا دار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں۔ لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب مَیں اوّل اوّل اصغر سے ملا تو اُس کی اسی قسم کی آزادی و بے عنانی نے مجھے بھونچکا سا کر دیا۔ کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعت طلبہ میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اُس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریق سے تقسیم کر رکھے تھے اس لئے

بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا۔ پڑھنے پر آتا تو زاہد شب زندہ دار کی طرح رات کو آنکھ جھپکنا بھی حرام سمجھتا تھا۔ میں کبھی اُس کے لاابالی پن پر لب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ "میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں۔ کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصودِ زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدے کی صلاحیت سلب کر لے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے۔ جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے۔" اور پھر عالمِ سرخوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا۔

مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمہیں نصیب

ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو!

دو سال کے بعد جب اتفاق سے میری اور اُس کی رہائش ایک ہی کمرے میں ہو گئی تو اُس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اُس کا معمول تھا۔ کہ سرِ شام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم نو بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت بامذاق اور زندہ دل تھے۔ انہوں نے جب بھی سرزنش کی۔ اصغر نے ہنس کر جواب دیا۔ "حضرت! نوعِ انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں بعض کو قدرت مستثنیات کے لئے پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے۔"

اُس کی صحبت یقیناً افزائشِ مسرت کا موجب تھی مگر جب وہ آدھی رات کو آ کر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اُٹھتی تھی، اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں، اُس کا تو مہینے میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلافِ معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بڑی بیتابی سے پوچھنے لگا۔ "خیر ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں چلّانے لگا۔ "تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا دن بھر تو کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے۔ رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر ایسی ہی آوارگی دماغ میں سما گئی ہے تو کالج کو خیرباد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔"

وہ بستر سے اُچھل کر مجھ سے آ لپٹا۔ "دوست خفا ہو گئے، سچ پوچھو تو تمہارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گزر رہی ہے۔ ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا سلیقہ کب تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملّا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں ہے۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصولِ علم کی سیکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کوئیں کا مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو۔ دنیا جہان کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے یا ذاتی تجربات سے۔"

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق اس کا نظریہ بھی عجیب تھا۔ وہ کہتا تھا "مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو لازمۂ حیات تصور کرتے ہیں۔ چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے اور آنکھ کے اشارے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں، پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہوگا۔ جو گزشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو روتے اور ایامِ رفتہ کو یاد کر کے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بے چارے اُسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔

نادان نہیں سمجھنے کہ اس تغیر پذیر عالمِ ارضی میں اکثریت ان کی ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ بھائی! سچ جانو مَیں تو شطرنج اور ٹینس کی طرح دوستی کو بھی وقتِ فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں۔ اسی طرح دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

اصغر صرف لباس کے معاملے میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعے سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ "میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیاتِ انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر مَیں نے اُن کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں۔ تمدنِ جدید کے مطابق شاندار لباس زیبِ تن ہو اور واقعاتِ عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو تو دنیا کو اُلّو بنا لینا بڑی بات نہیں۔"

ایک دفعہ تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا۔ جس میں شرکت کے لئے اُس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوایا تھا۔ ڈنر کے روز جب اُس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی حسبِ پسند نکٹائی نہ تھی۔ ادھر مہینے کا اخیر تھا۔ اور اُس کی جیب خالی ہو چکی تھی اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفے کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے بازار سے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے ہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی۔ اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کی بوقلمونی کے لحاظ سے اصغر ایک اچنبا تھا۔ ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کارکنانِ قضا و قدر نے کبھی حکومتِ پنجاب کی کرسیٔ وزارت مجھے بخشی تو پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ پانے کے باوجود مَیں تھوڑا بہت مقروض ضرور رہوں گا۔" جن لوگوں کو اُس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اُسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصوّر کرتے تھے۔ جیسے حالاتِ دنیا کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا۔ اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی۔ لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلّیاں دیکھ دیکھ کر زہر خند ہونے کی عادت ہو گئی تھی۔ عیب و صواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا تھا اور نیکی بدی کا شاید ہی کوئی کوچہ ہوگا جس کو اُس نے پامال نہ کیا ہو۔ مَیں اُس کی دقّتِ نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ بے خبری اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ اُن چند در چند نفوس میں سے تھا جو سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں۔ اصغر یقیناً ایک رجائی تھا۔ لیکن اُس کی رجائیت جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اُس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کر دیا۔ پھولوں کے تختوں میں سے نسیمِ سحری بن کر گزرا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی نگاہ میں رنگینی داخل کر لو اور کل کائنات قوسِ قزح کی طرح نظر فریب ہو جائے گی۔ طبیعت میں استغناء پیدا کر لو تو جھونپڑوں میں محلوں کے عیش اٹھاؤ گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اُس کی ذہانت اُس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ اُس کا تخیل طوفان زدہ جہاز کی طرح ہمیشہ پریشان و مضطرب رہتا تھا۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، قدرے مریض اور اُس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہدِ ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا۔ وہ اصغر کو ہر جگہ کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اصغر صاحب تھے کہ اس نام کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلۂ کلام جاری رکھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا۔ وہ کہنے لگا "دیکھو بھائی وحید اگر چندے تمہاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہ کنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی۔ اور تم اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسندِ تاریخ پر رونق افروز نظر آؤ گے۔ اگر شہیدانِ عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو تمہارا یہ طریقِ عمل بہت موزوں ہے لیکن اگر زندہ رہنا اور زندگی کے خواہشمند ہو یا بقائے دوام

کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اُس نیک بخت کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے میں سنتا ہوں کہ تمہاری محبوبہ ہندوستان کے جذبات کش طرزِ انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم کیوں ہمالیہ سے ٹکرا کر سر کو لہو لہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے۔ جہاں خون کا جوش زیادہ ہوا۔ محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ میں حیران ہوں کہ اس "غلام آباد" میں اور مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ ایزاد کر دیا جائے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا لینا، ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا، دُنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا، ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دینداری میں داخل ہے تم گردن جھکا کر، آنکھیں بند کر کے چپ چاپ گزر رہے ہو۔ درحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے موجود ہیں، تمہیں زبانِ حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بسترِ علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی فکرِ فردا و غمِ ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ کیوں ؟ صرف اس لئے کہ ہم ابھی تک بحرِ حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گراں قدر دفینے اور زر و جواہر کے عظیم الشان انبار مدفون ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو سرد و معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گزر جاتا ہے اور تم اس جانفزا نسیم کو مقید کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گزرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ اُن کی عطر بیزی سے اپنے دل و دماغ کو مسرور بناؤ اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعتِ بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دنیا جیسی ہزاروں دنیائیں آباد ہیں۔ اور پھر اُن دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے۔ اُس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشمِ تخیل کے سامنے لاؤ۔ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غارِ عمیق کے کنارے کھڑی بادِ مخالف کی تُندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنےٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سہ روزہ زندگی کی ناپائداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر پر سے صحیح و سالم اُٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اُس لامتناہی سلسلہ پر غور کرو جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا اوہام و تردّدات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں ؛ دماغ کو برتو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا اس نقطہ پر نہیں آٹھہرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے ؛ اور پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی کو فاقوں مرتے یا شارعِ عام پر برہنہ جسم پھرتے دیکھا ہے ؛ یقین جانو کہ ہر شخص قوتِ لایموت کے مطابق کھا رہا ہے اور منظرِ عام پر برہنہ پھرنے والے کو خود حکومت لباس مہیا کر دیتی ہے۔ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو ؛ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسر نہیں تو بلا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر درحقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں۔ جن سے متاثر ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض اور غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو لیکن اس دوران میں اپنے احساس کو واقعہ کی نوعیت سے آلودہ نہ ہونے دو۔ اِس عالمِ متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے زمانے کی نیرنگیوں اور انقلاباتِ دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعاتِ عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنسدان کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ و زاری کی تو بے حد ارزانی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر

معمولی اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح بہجت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کو دحرام کر لے تو مطالعہ کا مقصد فوت ہو گیا۔ وکیل اگر گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر تک ہی زندگی محدود کر لے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے امراض کی تشخیص اور مریضوں کے معائنے تک ہی اپنے آپ کو وقف کر دے تو اُس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں ردّ و بدل کرتے رہو گے۔ تو دنیا کی چیزیں زیادہ خوبصورت اور جاذبِ توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی "فقیروں کا بھیس" بنا کر "تماشائے اہل کرم" دیکھو تو کبھی اہل کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔"

بی اے تک ہم اکٹھے رہے اس کے بعد میں ایم۔ اے میں آ گیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ اُس کے والد اُسے تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درس گاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گزر گیا اور اگلے برس اصغر نے لا کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل لیکن شاید اس نے اپنی آبلہ پائی کا یہی علاج سوچا تھا کہ وکالت کی وادیٔ پرخار کے کانٹوں کی پیاس بجھائی جائے۔ ہم جانتے تھے کہ اس بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل ہے۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز صبح آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اُس کی باقی زندگی اُنہی دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی متلاشی تھا اور شاید لا کالج میں داخل ہونا بھی حصولِ جدت کی ایک سعی تھی۔ مگر اُس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دنیا کو صرف دو اور دو چار سے تعبیر کریں امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اُس کے والد جو پہلے ہی سے اُسے ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی برس پڑے اور لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف انہوں نے کہہ دیا۔ کہ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماش بینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا۔"

یہ حالت تھی جب اصغر صاحب نیمے دروں و نیمے بروں کی صورت بنائے افسردہ و مضمحل میرے پاس آئے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں بمبئی جا رہا ہوں۔"

"بمبئی؛ وہاں کیا کرو گے؟"

وہ کہنے لگا "تم حیران کس بات پر ہوتے ہو، میں تمہاری طرح آئی سی ایس کے خواب تو دیکھ ہی نہیں رہا کہ اس سے کم کسی چیز پر میری تسلی نہ ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ چیزیں میں ہر حال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنؤ، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں۔"

چند روپے اُس کے پاس تھے کچھ اُس نے مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو اڑھائی سال گزر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے۔ کیونکہ نہ اُس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے پرانے ہم مکتب دوست، آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں اُن کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی

اس تقریبِ سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب شادی کی گھما گھمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع اور شاندار عمارت کے ایک پُر تکلف کمرے میں بیٹھے ہم سامانِ اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم رکابیاں اُٹھائے کمرے میں داخل ہُوا۔ اُس نے دہلیز کے اُس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اُس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ مَیں سمجھا کہ عالمِ خواب ہے اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں اُس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور سوائے ایک خفیف تبسم کے اُس کے چہرے پر حیرت و استعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چُن رہا تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہُوا تو مَیں نے بے اختیار اُس کا بازو پکڑ لیا اور چلایا "اصغر تم کہاں؟"

اُس نے تحمّل سے جواب دیا "یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے۔ پھر باتیں کریں گے۔"

میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ مَیں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہو گی۔ جب ہم ہوٹل سے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم نہیں ہُوا اور نہ مَیں آپ کے ہمراہ چل سکتا ہوں۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہو؟ مَیں کل صبح آؤں گا۔" مَیں نے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور منت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اوّلین فرصت میں ضرور پہنچنا۔

دوسرے روز مَیں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہُوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے فاختی رنگ کا سوٹ، بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جو اب تک اصغر کے حالات و اطوار سے بے خبر تھے۔ اُس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آدابِ مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ مَیں بار بار اُس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا، اور سخت متعجب تھا کہ اِس طُرفہ معجون شخص کا خمیر کس مٹی سے بنا ہے۔ رات ایک ہوٹل کا خدمت گار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ مَیں نے پُوچھا "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل اور تم سا زیرک و خوش فہم شخص یوں ذلیل و خوار ہو۔"

اُس نے کہا "اگر تم نے زجر و توبیخ کی پُرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمدللہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستور کاربند ہوں۔ مَیں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر ناقابلِ عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو کہ مَیں کس انداز سے اس اصول سے اپنی عملی زندگی میں جاری و ساری کر چکا ہُوں۔ بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔ غمِ دُنیا و فکرِ عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا، اچھا پہننا، بمبئی ایسے شہر میں فطرتِ انسانی کا مطالعہ، اور مجھے کیا چاہیئے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدّت میں بیسیوں پاپڑ بیل چُکا ہوں۔ مُدرّسی اور اخبار نویسی مَیں نے کی۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا مَیں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری مَیں نے کی۔ غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ میری صحت دیکھو، قابلِ رشک ہے یا نہیں!"

اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی۔ گوشت اور خُون کی کثرت، اس پر اُس کا ورزشی جسم، پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔

آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی انہی کے مکان پر ہوں۔ اور شام کو تاج محل ہوٹل پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی تھی وہ اپنے کاروبار کے

سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے۔ شرائط ابھی طے نہیں ہوئیں۔ ممکن ہے چند ماہ تک جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

سیّد فیاض محمود

لاری میں

منور ایک سادہ سا آدمی ہے۔ میرا اس کا تعارف تین سال ہوئے ایک دوست کے ہاں چائے کے موقع پر ہوا تھا۔ اس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ کسی نہ کسی جگہ ہماری ملاقات ہوتی رہی اور اب دو سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہوا کہ میری اس کی خاصی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اکثر میرے ہاں آجاتا اور ہماری لمبی چوڑی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ دیکھنے میں منور میانہ قد اور سانولی رنگت کا نوجوان ہے۔ اس کی عمر غالباً ۲۳-۲۴ سال کے درمیان ہوگی۔ کچھ عرصہ ہوا۔ وہ "جنگلات" میں ملازم ہو گیا ہے۔ وہ خوش پوش ہے اور چونکہ اس کا جسم سیدھا اور ورزشی ہے۔ اس لئے وہ جامہ زیب بھی ہے۔ چلتے ہوئے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کپڑے مانگے کے ہیں۔ شکل و شباہت میں اگرچہ کوئی خاص نقش قابلِ ذکر نہیں، مگر بحیثیتِ مجموعی خوش شکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر دو ایک چیزیں اس کی البتہ ضرور جاذبِ نظر ہیں۔ ایک تو اس کے بال اور دوسرا تبسّم۔ بال اس کے گھنگھریالے نہیں مگر دو ایک خم اُن میں قدرتی طور پر اس طرح قائم ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے والے پر اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ پھر اس کی آنکھیں اتنی شرمیلی ہیں، جیسے کسی لڑکی کی ہوں۔ ان سے فقط یہی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کے تجربات علمی اور تخیلی ہی ہیں۔ یوں اچھا پڑھا لکھا شخص ہے۔ اور خصوصیت سے اقتصادی اور سیاسی مسائل سے اسے بہت انہماک ہے۔ اکثر انہی مضامین کی کتابیں پڑھتا ہے۔ اور اس کی گفتگو ان ہی مسائل کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہوتی ہے۔

ہماری باتوں میں اگرچہ سماجی زندگی کے کئی ایک پہلو موضوع بنے ہیں مگر نسوانی موضوع پر ہم نے بہت کم تبادلۂ خیالات کیا ہوگا۔ کیونکہ منوّر اگرچہ اپنے خیالات میں کافی حد تک جدید بلکہ انقلاب پسند ہے۔ مگر عورتوں کے معاملہ میں وہ شرمیلا ضرور ہے، اس لئے اس نے اگرچہ معاشرتی اور متعلقہ امور پر کئی دفعہ بحث کی ہوگی۔ لیکن اپنے ذاتی خیالات یا محسوسات یا تجربات کی بابت اس نے مجھے بہت کم بتایا ہے۔ کبھی کبھی برسبیلِ تذکرہ اگر ذاتی معاملات پر گفتگو چھڑ جاتا تو وہ رُک رُک کے شرما شرما کے تھوڑا بہت اپنی بابت اور کسی واقعہ کے متعلق کچھ بتاتا۔ جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اسے کسی سے کبھی محبت ہوئی بھی ہوگی تو بے زبان گہری قلبی۔ بلا اظہار اور اس لئے پُرحسرت یعنی بے اثر۔ اور چونکہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کے راز کریدتا رہوں۔ اور اس کی شخصیت باوجود اس حجاب کے بھی کافی دلچسپ ہے۔ اور چونکہ دورِ حاضرہ کے عمرانی اور سیاسی معاملات میں اس کی رائے قابلِ وقعت اور اس کی معلومات وسیع ہیں۔ اور اس کے خیالات اور تجاویز بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور چونکہ ذاتی طور پر بھی وہ ایک دل پسند طبیعت کا مالک ہے۔ اس لئے ہمارے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔

یہ کہانی اس کے متعلق ہے۔ مگر نہ اتنی کہ اس کے جان پہچان والے اسے پڑھ کر مذاق کرتے پھریں۔ اور پھر اس واقعہ کو اب ایک سال ہونے کو ہے۔ اور یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خود منوّر اسے بھول گیا ہے۔ مگر چونکہ میں نے اس سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں .... اسے کسی نہ کسی دن لکھ دوں گا۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب اس واقعہ کے اعادہ سے ناراض نہیں ہوگا۔

ایک دن غالباً فروری کے مہینے میں منوّر شام کے وقت مجھ سے ملنے آیا۔ ہمیں ملے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے اس لئے اس کا آنا باعثِ مسرت تھا۔ اور میں نے بہت اشتیاق سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا انداز کچھ بشاش نہیں ہے۔ بلکہ اگر پژمردہ نہیں تو خاموش اور غیر معمولی طور پر متین ضرور ہے۔ میں نے کہا خیر تو ہے؟ کہنے لگا نہیں بات تو کوئی نہیں ہونی چاہئے۔ مگر طبیعت پریشان ضرور رہے۔ چونکہ عادتاً وہ قدرے راست گو واقع ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی وجہ ہے۔ چنانچہ میں نے کہا اتنے دن کہاں رہے؟ بیس ایک دن ہو گئے تمہیں دیکھا نہیں۔ کہنے لگا یہیں تھا۔ کچھ دنوں کے لئے گوجرانوالہ ایک کام کو گیا تھا۔ میں نے یہ تو نہ پوچھا کہ کام کیا تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ گوجرانوالہ کا لفظ ادا کرنے میں اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ کم از کم فرق ضرور تھا۔ جیسے کوئی بات اس لفظ کے ادا کرنے میں مانع ہو۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا شک درست تھا یا نہیں مگر اس کی آواز میں ارتعاش کے علاوہ کچھ تلخی کی آمیزش بھی تھی۔ بہرحال میں نے اس سے گوجرانوالہ کے متعلق مطلقاً کچھ نہ پوچھا۔ محض ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر وہ معمول کے خلاف کچھ باتیں کر کے چپ ہو جاتا۔ دو ایک دفعہ جب وہ میرے سلسلۂ کلام کو جاری کرنے پر بھی چپ رہا تو میں نے اس سے بہت زور سے پوچھا کہ بھئی کیا ہو گیا ہے۔ کوئی وجہ ضرور ہے جو اتنے ملول ہو، کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟ تو مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ اور اگر میں کچھ نہیں بھی کر سکتا تو کہہ ڈالو شاید تمہارا دل ہی ہلکا ہو جائے۔ اس پر اس نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا مگر میں جان گیا کہ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی ہیں اور اس کی نگاہ لاابالی ہے۔ آخر کار تھک کر میں نے ذرا سختی سے پوچھا کہ بھئی کیوں گھلے جا رہے ہو ذرا ہمیں بھی بتاؤ۔ جب بہت اصرار کیا تو اس نے یہ واقعہ سنایا۔

،، تمہیں یاد ہوگا ابھی کچھ منٹ ہوئے میں نے تجھ سے گوجرانوالہ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے وہاں ایک کام تھا، واپسی پر گاڑی واڑی کا تو مجھے وقت یاد نہیں تھا میں لاریوں کے اڈے پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی بس سروس کی لاری بس دو منٹ میں چلنے والی ہے۔ مگر شاید جانتے ہو بس سروسوں کی لاریاں دور دور مقاموں کے درمیان چلتی ہیں۔ یہ لاری لاہور اور سیالکوٹ کے درمیان چلتی تھی۔ چنانچہ جب میں ٹکٹ لے کر بیٹھنے لگا تو دیکھا کہ اگلی نشست تو رکی ہوئی تھی ہی، درمیانی درجہ یا حصہ بھی کسی ہندو خاندان سے اٹا پڑا تھا۔ غالباً کسی برات پر جانے والی مستورات تھیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سب نشستیں پُر ہوں گی چنانچہ میں جو اندر داخل ہونے لگا تو ایک لڑکا جو انہیں میں سے تھا بولا "صاحب یہاں سب مستورات بیٹھی ہیں، اگر آپ پیچھے بیٹھ جائیں تو نوازش ہوگی۔" میں نے خیال کیا کہ شاید سارا درجہ ہی محفوظ کرا رکھا ہوگا۔ مگر میں لاری میں اب تک کبھی پچھلے حصہ میں نہیں بیٹھا۔ کچھ مجھے تامل ہوا مگر ڈرائیور کہنے لگا "صاحب بیٹھنا ہے تو بیٹھئے گاڑی چلنے والی ہے۔" چنانچہ طوعاً و کرہاً میں پچھلے حصہ میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ بھی لے چکا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ جانے دوسری لاری کب چلے اور پھر پچھلے حصہ کی دائیں جانب کی وہ نشست جو بالکل درمیانی حصہ کے ساتھ لگتی تھی خالی تھی، یا کم از کم وہاں ایک مسافر بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں اسی نشست کی طرف لپکا اور بیٹھ گیا۔ اب جو اطمینان سے نظر اٹھا کر ارد گرد دیکھا تو معلوم ہوا کہ نشست بھی کوئی بری نہ تھی۔ میرے دائیں طرف برات والیاں بیٹھی تھیں اور خوش قسمتی سے ان میں سے جن کی پشت میری طرف تھی ان میں ایک وہ لڑکا تھا، ایک اس کے ساتھ پانچ ایک برس کی پیاری سی چھوٹی بچی تھی اور ایک بوڑھی عورت اور ایک اور لڑکی جس کی عمر کوئی سات ایک برس کی ہوگی۔ البتہ جو نشستیں اب میرے مقابل تھیں ——— مقابل ہی سمجھو نا، کیونکہ میں تقریباً انہیں کی طرف رخ کر کے بیٹھا تھا یعنی بیٹھا تو آڑا تھا مگر میں انہیں بآسانی دیکھ سکتا تھا اور وہ سب میری طرف دیکھ سکتی تھیں۔ اگر چاہتیں یعنی کہ۔ میں پہلے شاید کہہ چکا ہوں کہ یہ خواتین کسی برات میں جا رہی تھیں۔ اور جب اس پر اس امر کا خیال کیا جائے کہ وہ ہندو عورتیں تھیں تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ لباس کے لحاظ سے تو وہ سب کی سب جگمگا رہی ہوں گی اور خصوصیت سے ایک تو شاید تازہ شادی شدہ تھی یا کم از کم اسے ایک سال سے زیادہ تو ہرگز نہیں ہوا ہوگا۔ کیونکہ ایک تو اس کے کپڑے ہی سب سے اچھے تھے اور پھر زیور کے لحاظ سے بھی وہ سب سے ممتاز تھی۔ اور یوں تو گویا تم جانو

میرے لئے تو اس کے سوا وہاں گویا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے دو ایک نظر میں سب کو دیکھ لیا۔ اور پھر ان کو بھی جن کی پشت میری طرف تھی۔ لڑکے کی پشت میری طرف تھی اس لئے اس طرف سے تو تسلی تھی۔ اس کے ساتھ کی سواری وہ ننھی منی سی لڑکی تھی۔ جانتے ہو اتنی عمر کا بچہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرائی وہ یہی لڑکی تھی جسے بار بار وہ جو سامنے کی نشست پر کونے میں بیٹھی تھی یہ کہہ کے چپ کراتی تھی "ارے چاند تو آرام سے تو بیٹھ" چاند رانی معلوم ہؤا اس چھوٹی سی سرخ گالوں والی شوخ لڑکی کا نام تھا کرتی وہ کیا تھی؟ یہ پوچھو وہ کرتی کیا تھی! کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی اور ہر وقت اپنی چھوٹی سی ریشمی اوڑھنی کو اپنے سر کے گرد لپیٹنے میں مشغول رہتی۔ پھر ایک جیب میں سے جو کافی پھولی ہوئی تھی ایک بڑا سا ریشمی رومال نکال کر چوسنے والی مٹھائی کی ایک گولی نکالتی۔ رومال کو پھر جیب میں ٹھونستی اور مٹھائی کو منہ میں ڈال کے اپنے دوپٹہ کو جو اس اثنا میں ضرور سر پر سے اتر گیا ہوتا سنبھالنے لگ جاتی۔ یا اپنی جگہ کھڑے ہو کر پچھلے حصہ کی طرف منہ کر کے ہم سب کی طرف ایک ایک نظر غور سے دیکھ کر پیچھے کی کھڑکی سے سڑک اور ہٹتے ہوئے درختوں کو دیکھتی رہتی۔ مگر ایک منٹ سے زیادہ نہیں۔ اس کا دہن چھوٹا سا تھا، اور جب وہ پیچھے دیکھتی تو منہ میں گولی ہونے کے باعث اس کے ہونٹ ضرور ملے ہوئے ہوتے۔ منہ بس ایک ننھی سی گلاب کی کلی معلوم ہوتا اور چونکہ توجہ اس کی یا سڑک کی طرف یا کسی اور چیز کی طرف مرکوز رہتی۔ اس لئے چہرہ جو عام طور پر جب اس کا رخ اپنی ماں یا ممانی یا ماموں کی طرف ہوتا شوخی اور شرارت اور ہنسی اور خوشی سے چمکتا ہوتا۔ اس قدر متین نظر آتا کہ میں نے موٹر کے چلنے کے پانچ منٹ کے اندر اندر اس سے واقفیت پیدا کر لی اور وہ اس طرح کہ جب وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی تو میں نے آہستہ سے ایک انگلی سے اُس کے بائیں گال کو سہلا دیا۔ پہلے تو وہ ایسا کرنے پر وہ ایک دفعہ شرما کر اور تھوڑا بہت غصہ کر کے فوراً ہی منہ دوسری طرف کر لیتی مگر اس کے ایسا کرنے پر بھی اسے دوپٹہ درست کرنے کی ضرورت پیش آتی تو میں موقعہ پا کر اس کے دائیں گال کو جواب میرے نزدیک تر ہوتا سہلا دیتا۔ اس پر وہ اتنا لجاجاتی کہ دوہری ہو کر گول مول ہو جاتی۔ مگر نچلا بیٹھنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ مجھے بھول کر اور میرے چمکارنے یا گدگدانے کو بھول کر اپنی ماں سے یا اپنی ممانی سے جو بالکل اس کے سامنے بیٹھی تھی سوال و جواب میں مشغول ہو جاتی۔

میں نے چاند کے متعلق اتنی لمبی تمہید اس لئے دی ہے کہ دراصل میرے اس واقعہ یا سانحہ کی روح اگر چاند نہ تھی تو وسیلہ ضرور تھی۔ اس کے بائیں طرف جو بوڑھی عورت بیٹھی تھی وہ اتنی کم سخن تھی کہ مجھے یاد نہیں اس نے ایک دفعہ بھی کچھ کہا ہو۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ تو وہ بولی ہوگی۔ چاند کے سامنے والی نشست پر جو تین فرد تھے ان میں سے معلوم ہؤا کہ جو عورت لڑکے کے سامنے بیٹھی تھی وہ چاند کی نانی تھی۔ پھر چاند کے سامنے اس کی ممانی اور پھر اس کی ماں جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ برات سے واپس جا رہی تھیں یا برات کو جا رہی تھیں۔ غالباً کسی شادی سے واپس آ رہی تھیں۔

چاند سے چھیڑ چھاڑ شروع کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے سامنے بیٹھنے والی کو نظر بھر کر دیکھ لیا تھا۔ اور جو میں نے دیکھ لیا تھا وہ یہ کہ اس کی عمر بیس اکیس سے بمشکل زیادہ ہوگی۔ گول چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ گلابی ہونٹ، چھوٹی سی خوش قطع ناک اور چھوٹے چھوٹے مگر خوب جڑے ہوئے سفید دانت جو اکثر جھلکتے ہی رہتے تھے۔ باقی رہے کپڑے سو ان کا عالم یہ تھا کہ گلابی رنگ کا بنارسی دوپٹہ تھا اور آتشی گلابی کمخواب کا سوٹ اور کامدانی گرگابی۔ قمیض پر ہلکے زرد رنگ کا اونی سویٹر کوٹ اور زیور؟ زیور کا ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ کڑے بھی تھے اور چوڑیاں بھی اور گھڑی پہنچی بھی جس میں ادم بنا ہؤا تھا۔ اور جسے شاید نفیسیاں بھی کہتے ہیں۔ اور گلے میں ہار اور نیکلس۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں، کانوں میں لمبے لمبے بندے۔ دوپٹے کے اوپر جوگیا رنگ کی چادر۔ لباس سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ شادی کو بہت عرصہ نہیں ہؤا۔ اور یہ بھی کہ کسی امیر گھرانے کی بہو ہے۔

جو چیز اس کی ہر وقت سامنے رہتی ہے وہ اس کی مسکراہٹ ہے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیلتا رہتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہونٹ بنے ہی مسکراہٹ کے لئے ہیں۔ اور پھر اسی کی مسکراہٹ کے لئے۔ تم نے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو مسکراتے دیکھا ہوگا۔ اچھا بہت سی کو نہیں تو کچھ تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ اور شاید ہر لڑکی ہی جوان ہو کر مسکرا سکتی ہے یا کم از کم عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے۔ مگر دراصل یہ خیال غلط

ہے۔ اور لوگوں کی بے وقوفی نہیں تو ناتجربہ کاری پر مبنی ہے۔ ورنہ میری بھی چوبیس سال کی عمر ہے، میں بھی تو ایسی مسکراہٹ کبھی دیکھتا! تبسّم کیا تھا حسن کا رقص
تھا، نشہ تھا نشہ .... یقین جانو جب اس مسکراہٹ سے اس نے مجھے دیکھا تو میں دو تین سیکنڈ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا، اور
اس کی آنکھیں! اللہ! .... آنکھیں! وہ اتھاہ گہرائیاں! ان میں جھجک بالکل نہ تھی۔ ان میں اطمینان، سکون، غرور، احساسِ حسن تھا اور ظاہر تھا کہ وہ
جانتی تھی کہ ان میں جاذبیت ہے اور میرا ان کے سامنے جھک جانا یا مجھے اس کے حسن کا اعتراف کرنا لازمی تھا۔ بے باکی، خود اعتمادی، میں تمہیں کیا بتاؤں!
میں تو نہ دیکھ سکا، یقین جانو میں تو شرما گیا۔

پہلے تو میں نے سرسری طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے مگر چونکہ لاری ابھی چلی ہی تھی میں نے زیادہ عجلت نہ کی اور اس کے درجے کی باقی
عورتوں کو اچھی طرح دیکھا کیا اور ان کی باتیں سنتا گیا مگر اس کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ آیا تھا۔ دوسرے چاندرانی ہی مجھے اپنی طرف مشغول رکھنے میں کافی
تھی۔ ایسی پیاری اور سرخ و سپید اور شوخ کہ پہلے پانچ منٹ تو جیسا میں نے کہا ہے میں اسی میں مشغول رہا۔ ایک دفعہ جو وہ گول مول بنی سمٹی سمٹائی اپنے آپ
کو دوپٹہ میں لپیٹی جا رہی تھی اور میں کبھی یہاں کبھی وہاں انگلی سے گدگدا رہا تھا تو میری نظر اٹھ کر اس کی ممانی پر جا پڑی۔ اتفاق سے وہ بھی میری طرف
دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جو میری نظر اٹھ کر اس کی آنکھوں میں گڑ گئی تو میں کچھ دیر کے لئے چاندرانی اور لاری اور برات اور
سب کچھ بھول گیا۔ معلوم نہیں میں ایک منٹ دیکھتا رہتا تو کیا ہو جاتا۔ میں تو پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں دیکھ سکا ہوں گا۔ مگر تمہیں کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں
میں کیا دیکھا۔ شاعر تو پیٹتے رہتے ہیں۔ شرمائی ہوئی باحیا کنواری نظر کو۔ میں کہتا ہوں ان آنکھوں کو کیا دیکھنا آئے جو شرم و حیا سے آپ ہی بند ہوئی
جاتی ہوں۔ آنکھیں تو وہ تھیں! میں کبھی نہیں بتا سکتا کہ ان آنکھوں کا یقین، ان کی بے حجابی، ان کی گویا "معلومیت" جیسے کہ مرد عورت کا فرق
اجنبی اور غیر محرم کی غیریت، سب پردے فضول ہیں۔ اور دیکھنے والی آنکھ کے سامنے سب پردے عریاں ہیں۔ یقین کرو مجھے تو اپنی نظر سے شرم آگئی۔
مجھے محسوس ہوا کہ گویا اسے معلوم ہے کہ میری نظر کیا کہہ رہی ہے، کس چیز کی خواہش کر سکتی، کون سی چیز اسے مل سکتی ہے، مرد عورتوں کو کس نظر
سے اور کس لئے دیکھتے ہیں اور ان سے کس چیز کے طالب ہوتے ہیں .... اور ستم یہ تھا کہ اس جاننے والی نظر کے باوجود ابھی اس
کی آنکھیں ایک جوان لڑکی کی آنکھیں تھیں۔ اور اس کی مسکراہٹ میں شباب کا تمام نشہ موجود تھا۔"

یہ کہہ کر بے چارہ منوّر اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے دو قدم ادھر اور دو قدم ادھر پھرا۔ پھر جیسے یک دم چونک کر بیٹھ گیا اور ایک
کمزور سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں خوب غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ میں جانتا تھا جتنا حسّاس وہ ہے۔ اور مجھے اس کے احساسات
کے ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ اگرچہ چونکہ اس سے قبل اس نے کبھی اپنی جذباتی زندگی سے مجھے اچھی طرح روشناس نہیں کیا تھا، میں حیران ضرور ہوا کہ یہ
خاموش سا شربتی آنکھوں والا نوجوان جس چیز سے اتنا متاثر ہو گیا ہے وہ اتنی جاذب تھی بھی یا نہیں؛ مگر منوّر پھر شروع ہو گیا تھا:۔

'میں نے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیں مگر نہ جانے وہ مجھے کتنا عرصہ دیکھتی رہی، یا شاید اس نے دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا ہو کیونکہ جب کچھ دیر بعد
میں نے پھر اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اب کی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا بلکہ میں اس کے ہونٹوں، اس کے
چہرے، اس کے ہاتھوں کی طرف جن میں سے ایک میں رومال پکڑا ہوا تھا، دیکھتا رہا۔ کلائیوں پر اس نے نفیریاں پہن رکھی تھیں۔ نفیریوں کی طرف
میں اس لئے بھی غور سے دیکھتا رہا کہ میں اول اول یہ نہ معلوم کر سکا کہ ان کے درمیان سرخ سے جو نقوش بنے ہوئے ہیں وہ کیا ہیں۔ غور کرنے سے
معلوم ہوا کہ وہ اوم ہے۔ مگر اس کے بعد پھر جو میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھر میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے قدرے
بے چینی سے اپنے بائیں طرف دیکھا کہ شاید وہ کسی اور کی طرف دیکھ رہی ہو۔ مگر نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ پلکوں سے آدھی آدھی ڈھکی ہوئی
آنکھیں، جن کی چمک اور نظر اور عمق اور وثوق پلکوں میں سے چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہا تھا میری طرف ہی جھکی ہوئی ہیں اور وہ نگاہیں میرے جسم
دماغ اور دل سے گزر کر میری تمام حسیات کو بے نقاب کر کے کمال آسانی اور اطمینان اور لطف سے ایک کتاب کی طرح پڑھ رہی ہیں۔ شاید

یہ سب کچھ اس ترتیب سے مجھے اسی وقت نہ سوجھا ہو مگر یہ احساس اسی وقت کا ہے۔ شاید بعد میں میں نے سوچ اور فکر میں ان احساسات کو ترتیب دے دیا ہو۔ کیونکہ اب تو مجھے یاد بھی آتا ہے کہ وہ نظریں گویا بہت ہی حلیم نظریں تھیں۔

اس کے کافی عرصہ بعد یعنی تقریباً دس منٹ تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ مطلقاً نہیں۔ مگر اس اثنا میں میں چاندرانی سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے گدگدانے یا ہاتھ لگانے سے اتنی سمٹتی نہ تھی۔ بلکہ اگرچہ بظاہر میری توجہ اور چھیڑ چھاڑ سے اب تک ناپسندیدگی یا حجاب کا اظہار کرتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ اس نے گویا مجھے قبول کر لیا ہے۔ اور وہ بھی نہایت غیر جانب داری سے اپنی توجہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے افراد کی طرف رکھتی تھی، اور آدھی یا میری طرف یا ان اطراف اور اشیا کی طرف جن سے میں اس تک پہنچ سکوں۔ لطف یہ تھا جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں جب کبھی میں اسے چھیڑتا یا گدگداتا یا اس کے گال یا بالوں کو سہلاتا تو وہ منہ ایسا ہی بناتی تھی۔ جیسے کہ میرا ایسا کرنا اسے ناپسند ہے۔ اور اگر میں دو منٹ تک بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیتا تو وہ اس اجتناب کو محسوس کر لیتی اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی اور یا لاری کے پچھلے حصہ کی طرف منہ کر کے اپنی نشست پر کھڑی ہو جاتی اور بغیر ادھر ادھر دیکھنے کے سیدھی پیچھے ہٹتی ہوئی سڑک یا اس پر گزرتے ہوئے لوگوں یا چھکڑوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی۔ مگر دراصل مجھے معلوم ہوتا کہ اسے انتظار اس بات کا تھا کہ کب میں اس سے پھر کھیلوں۔

ان دو کے علاوہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چاند کی والدہ بھی اس کی ممانی کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ اور جب میں چاند کی طرف نہ دیکھتا اور جب میں اس کی ممانی کی طرف نہ دیکھ سکتا تو چاند کی ماں کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ڈیڑھ یا دو گھنٹوں کے سفر میں ایک گھنٹہ سے زیادہ میں چاند کی والدہ کی طرف دیکھتا رہا ہوں یا اس کی باتوں کو سنتا رہا ہوں۔ مگر میں مانتا ہوں کہ بعض عورتوں میں نہ دیکھتے ہوئے دیکھنے کا ملکہ بھی کامل طور پر موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ اس عورت کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ میں اس کی طرف دیکھ رہا ہوں اور اس کی باتوں کو غور سے سن رہا ہوں۔ مگر اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ طور پر میری طرف نہیں دیکھا۔ اب شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ اتنی مدت تک ایک عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنا بدتمیزی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ واقعی یہ آداب کے خلاف ہے۔ اور شاید تم جانتے ہو کہ میں ایسی حرکت عام طور پر کرنے کے ناقابل ہوں۔ بلکہ اگر کہیں میرا گزر ایسے گلی کوچے سے ہو جائے جہاں عورتیں بیٹھی ہوں یا موجود ہوں تو میرے لئے وہ بیس پچیس قدم مصیبت بن جاتے ہیں۔ اور میں نے آج تک کبھی اچھی طرح نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر یہاں بات جو میری بہت معاون تھی وہ یہ تھی کہ اس عورت نے گویا میری طرف نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ شاید چھپتی ہوئی نظر مجھ پر سے پڑ کر گزر گئی ہو گی کیونکہ آخر میں تو چاندرانی کے عین پیچھے اور اسی سمت میں بیٹھا تھا اور وہ کونے میں ترچھی تقریباً میری طرف رُخ کئے بیٹھی تھی اور اس لئے بھی کہ وہ تمام وقت ہی چاند کی ممانی اور نانی اور چوتھی عورت جو چاند کے ساتھ بیٹھی تھی اس سے تیز تیز لہجہ میں باتیں کرتی رہی۔ پہلی باتیں جن سے رفتہ رفتہ ان سب کا رشتہ آپس میں معلوم ہوا وہ یہ تھیں:۔

دوسروں سے وہ کہہ رہی "ہائے ہائے یہ کیا طریقہ ہوا، پورن کی ماں نے شام دیوی کے بیاہ پر مجھے دو لڈو اور تھوڑے سے مرمرے بھیجے تو کس کے ہاتھ؛ اپنی چھوٹی کانتی کے ہاتھ۔ میں نے کہا میں تو لیتی نہیں۔ میں تو نہیں لیتی۔ بھیجا تو دوسرے دن اور آپ تو نہ آسکی۔ بھیجا تو بالشت بھر کی لڑکی کے ہاتھ۔ میں نے کہا میں کیوں لوں، برابر کی شریک ہے میں کیوں نیچی ہوں۔ دو لڈو اور مٹھی مٹھائی! اور کانتی کے ہاتھ میں نے تو کہہ بھی دیا تھا کہ لے جا مار اپنی ماتا کے سر پر کہ چاند کے پتاجی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو تمہیں وہ خود دینے نہیں آئی تو تمہارے ہاں کچھ ہو گا تو تم بھی دیجانا تم بھی چاند کے ہاتھ بھیج دینا۔ میں نے کہا کہ اچھا میں بھی چاند کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔ (اور دودھ پیتے بچے کو ہاتھ لگا کے) میں بھی کاکاجی کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔ میں نے کہا چاند کے پتاجی سے میں چاند کے ہاتھ بھی کیوں بھیجوں گی، میں بھی نوکر کے ہاتھ بھیجوں گی۔ یہ بھی کیا طریقہ ہوا! پورن کی ماں کو تو لین دین اور برتاؤ کا کوئی طریقہ آتا ہی نہیں۔ مٹھائی بھیجی بھی تو چٹکی سی اور کانتی کے ہاتھ۔ میں بھی نوکر کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔"

جس تیزی سے اور اشاروں اور اعضا اور نقوش کی حرکت کی مدد سے اس نے یہ سب کچھ کہا وہ میرے لئے اتنا دلچسپ تھا کہ میں تو مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس لئے بھی کہ زیادہ دفعہ چاند کی ممانی کی طرف دیکھنا بھی مخدوش تھا۔

اب چاند کی ماں اپنی ماں یعنی چاند کی نانی سے کہہ رہی تھی "آپ سے میں نے کئی دفعہ کہا آپ لاہور آئیں تو میں آپ کو قلعہ دکھاؤں۔ میں چڑیا گھر دکھاؤں۔ میں انارکلی دکھاؤں۔ میں سینما دکھاؤں، آپ تو آتی ہی نہیں۔ اب چلی ہیں تو ہم کل سب چلیں گے۔ تین تانگے لیں گے، تین۔ نہ دو میں تو ہم سب نہ آسکیں گے۔ سویرے کھانا کھا کر دس بجے گھر سے نکلیں۔ سارا دن سیر کریں گے۔ شام کو آپ کو نہر بھی دکھائیں گے۔ اب تو سردیوں میں وہاں رونق نہیں ہوتی۔ گرمیوں میں تو شام کو وہاں میلہ لگا رہتا ہے۔" ابھی وہ یہیں تک تھی کہ وہ لڑکا بولا "تو بہن جی ماتا جی نے تو کبھی شالامار بھی نہیں دیکھا ہوگا اور سینما بھی، تو آج کل "مہاتما" جیسی فلم آئی ہوئی ہے۔ ماتا جی نے تو کبھی سینما دیکھا ہی نہیں۔ افسوس ہے میرا تو امتحان قریب ہے ورنہ میں بھی ساتھ رہتا۔ مگر آپ تو ساتھ ہوں گی۔ انہیں سینما تو دکھائیے اور بھائی جی بھی تو شام کو دفتر سے آجائیں گے۔" اس پر ان کی والدہ نے کہا "میں تو لاہور آتی اس لئے نہیں آئی کہ ٹھہروں کہاں۔ اب منوہر کی بدلی ہوگئی ہے اب آجایا کروں گی۔"

معلوم ہوا منوہر چاند کی ممانی کا خاوند ہے۔ تم جانتے ہو نا یہ ہندو لوگ اپنی لڑکیوں کے ہاں نہیں رہتے۔ اور نہ ان کے ہاں کا کھاتے ہیں شاید پانی بھی نہیں پیتے۔ اسی لئے غالباً اس لڑکے اور ہاں معلوم ہوا اس لڑکے کا نام مراری تھا، اسی لئے اس مراری کی ماں چاند کی ماں کے ہاں نہیں اترتی۔ خیر اس دفعہ معلوم ہوا کہ وہ منوہر کے ہاں جا رہی تھی۔

ایسی ویسی ہی باتیں ہوتی رہیں مگر مجھے ابھی خود اس کا نام نہ معلوم ہوا اور نہ یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہ لے لینا کہ ان کا پتہ معلوم کرنے سے میرا کوئی مدعا تھا۔ مگر جانتے ہو مجھے لحظہ بہ لحظہ یہ امر شاق گزر رہا تھا کہ اب لاہور آجائے گا اور یہ اتر کر چلے جائیں گے۔ اور میں خود بھی لاری چھوڑ دوں گا۔ اور پھر شاید ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر باوجود اس کے اس کا نام جاننے کے لئے میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں بار بار اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور چونکہ میں نے اس اثنا میں پانچ چھ مرتبہ گھڑی کو بھی دیکھا۔ شاید وہ سمجھ گئی ہوگی کیونکہ اب کی بار جو اس نے مجھے دیکھا تو اس کی مسکراہٹ میں شوخی کے علاوہ میرے اضطراب کا علم ضرور تھا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ مجھے کیسے معلوم ہو گیا۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی اس کی آنکھوں اور اس کے تبسم کو سمجھ لیتے۔ اس کا ہر احساس تو شاید تم نہ سمجھ سکتے (اس پر میں مسکرایا) مگر ایسا صاف جذبہ تو اس کا ذکی الحس بشرہ صاف ظاہر کر رہا تھا۔ کم از کم اس کی پُر معنی نگاہ سے مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ضرور میری بے چینی کی وجہ کو پہچان رہی ہے۔ اب لاہور غالباً بیس میل رہ گیا تھا۔ اور مجھے ہر منٹ یہی خیال ہو رہا تھا کہ ہم اب لاہور پہنچے کہ اب۔ حالانکہ لاری کم از کم پینتالیس منٹ لیتی۔ مگر میں سوچتا کہ پون گھنٹہ کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ابھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی پتلی پتلی گلابی مونیا رنگ کی انگلیاں اور ان میں سبز اور نیلے نگوں کی انگوٹھیاں اور اس کی کلائیوں کی نقیبیاں کہاں چلی جائیں گی۔ مجھے زیور اس سے پہلے لگتا ہی بُرا تھا۔ اور جب کبھی میں ان عورتوں کو دیکھتا جو زیوروں سے لدی ہوئی ہوتیں تو مجھے سخت نفرت ہوتی۔ اور اب مجھے یہ خیال ہی نہ تھا کہ اس نے زیور بھی پہن رکھے ہیں کہ نہیں۔ البتہ اس کی کلائیوں پر وہ گھڑی پہنچیاں اس قدر اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ جب میں اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ رہا ہوتا تو اس کے ہاتھوں یا کلائیوں یا ان پہنچیوں کی طرف دیکھتا ہوتا، اور خوش قسمتی سے اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی کلائیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کیونکہ یا تو عام طور پر اس کے ہاتھ اس کی چادر کے اندر ہوتے کیونکہ ہوا میں سردی ضرور تھی اور یا اب شاید ہی وہ ایک آدھ بار چھپائے گئے ہوں گے بلکہ عام طور پر وہ دونوں یا کم از کم ایک تو کہنی کے سہارے گھٹنوں پر ٹیکے ہوئے چہرہ تھامنے میں مصروف رہتے۔ شاید اس کے پاؤں کے نیچے کوئی سوٹ کیس ہوگا۔ کیونکہ اس کے گھٹنے اٹھے ہوئے تھے اس لئے اس کی کہنیوں کے ٹیکنے کے لئے جگہ بھی موجود تھی۔ یوں بھی پتلی پتلی گلابی ناخنوں والی انگلیاں دونوں گالوں کو حمائل کئے ہوئے وہ چاند رانی سے منٹوں تک باتوں میں مصروف رہتی اور کیا باتیں ہوتیں —

اس پر منور نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "بھئی یہ تو میں سمجھ گیا کہ وہ ماہ طلعت ضرور ہی تمہارے جذبات سے متاثر ہو رہی ہوگی، اور ہوگی بھی اسی قابل کہ تم والہانہ طور پر اُسے دیکھتے رہتے، اور کاش کہ تمہارا سفر لمبا ہوتا، یا تمہاری لاری ہی راستہ میں فیل ہو جاتی تا کہ تمہیں ایک آدھ گھنٹہ اور مل جاتا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ خاندان تو ہندو عورتوں کا تھا، اور جانتے ہو اپنے اعمال کی پاداش میں مسلمان لڑکیوں کو ہم پردہ کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور

ہندو لڑکیاں ہمیں مسلمان سمجھ کر نہیں دیکھتیں۔ تمہیں وہ کس طرح دیکھتی رہی اور تمہارے دیکھنے کو وہ کیسے برداشت کرتی رہی۔ نہ بے پروائی کی تیوری چڑھائی نہ آنکھوں سے شعلہ باری کی اور نہ تمہاری طرف سے منہ ہی پھیرا اور نہ نشست ہی تبدیل کی؟ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔"

منور نے کہا "ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری ملعون زندگی سے بدتر اور کیا زندگی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں تو لڑکیوں کا مردوں کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے زندگی کا لطف خاک آئے۔ اس سے تو افریقہ ہی میں پیدا ہوتے! ہم سے تو حبشی ہی اچھی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ اتنی قیدیں، اتنی رکاوٹیں۔ احساس کو بیدار کرنے کے لئے ہزاروں لاکھوں چیزیں موجود ہیں اور دل کی تسلی کے لئے ایک بھی نہیں! مگر کیا کریں؟ ...... اور ہاں تم پوچھ رہے تھے کہ میری طرف اس نے دیکھا کیوں؟ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لمحوں کے لئے میرا ستارہ کسی منحوس برج سے نکل کر اکیلا گشت لگا رہا ہوگا۔ اور کیا بتاؤں؟ اور ہندو مسلمان کے متعلق تو جواب آسان ہے۔ کہ میں سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور میرے سر پر ہیٹ تھا۔ شکل سے نہ ہندو لگتا ہوں نہ مسلمان، یا دونوں ہی۔ اور شاید اسے یہ خیال ہی نہ آیا ہو۔ کیونکہ آخر اسے بھی تو معلوم ہوگا کہ یہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کا سفر ہے پھر وہ کہاں اور میں کہاں، اور اگر اسے نہ بھی آیا ہو تو مجھے ہر لمحہ یہی خیال آ آ کر گھبرا رہا تھا۔"

"مگر میرے لئے سوائے اس کے کہ چاندرانی سے چھیڑ چھاڑ یا پیار میں مشغول رہوں اور اس کی ممانی کی طرف دیکھ لوں اور کیا تھا۔ چنانچہ اب چاندرانی نے بھی میرے قرب کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے گدگدانے کو میرا حق مان لیا تھا۔ مگر اس وقت چاندرانی میرے بہت کام آئی۔ خدا اسے جوان ہونے پر بھی اتنی کامنی اور من موہنی رکھے جتنی پیاری وہ پانچ برس کی عمر میں تھی۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی ممانی اب اس سے یہ باتیں کر رہی تھی" چاندجی اپنے ماموں کے گھر چلو گی۔ تمہیں پتہ ہے اپنے ماموں کے گھر کا؟ چاندجی چپ تھی اور مگن مگر موٹی موٹی آنکھوں سے اپنی ممانی کو نہایت عبادت مندانہ انداز سے حد درجہ کے پیار سے دیکھنا اگر جواب ہو سکتا ہے تو چاندجی اپنی ممانی سے خوب باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ چاندرانی کو اگر کسی سے پیار تھا تو اپنی ممانی سے اور ممانی کے منہ پر جو مسکراہٹ تھی اس میں اتنا پیار اور اتنی ملائمت تھی کہ مجھے تو چاندرانی ہی سے ایک لمحہ کے لئے حسد ہو گیا۔ مگر چاندرانی سے جو باتیں ہو رہی تھیں وہ میرے لئے اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے اور کسی چیز کا دھیان ایک سیکنڈ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا تھا۔ چاندرانی سے پوچھا جا رہا تھا "چاندجی تم اپنے ماموں جان کے گھر آؤ گی نا؟ کہاں ہے تمہارے ماموں جان کا گھر؟ پنج محل روڈ پر۔ جانتی ہو کہاں ہے پنج محل روڈ؟ تم تو لاہور کی رہنے والی ہو۔ تم نے تو لاہور کی خوب سیر کی ہو گی۔ چاندجی ہمارے ہاں آؤ گی نا۔ ہم اور تم سیر کو چلیں گے۔ ہم اور تم چڑیا گھر چلیں گے، لارنس باغ چلیں گے اور خوب سیر کریں گے۔ تم پنج محل روڈ پر آنا۔ تمہارے گھر سے دور تو نہیں۔ اپنی ماتاجی کو لے کے آنا۔ ہم سب سیر کو چلیں گے۔ ہم تو لارنس باغ میں شام کو سیر کیا کرتے ہیں، تم نہیں کیا کرتیں۔ ہائے سیر نہیں جایا کرتیں۔ چاندجی تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہیں ماتاجی سے لے لیں گے۔ ہم تمہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ ہم روز شام کو سیر کو جایا کریں گے۔ ہم موٹر پر جایا کریں گے۔ موٹر پہ سیر کرو گی نا۔ ہم تمہیں موٹر پر سیر کرائیں گے۔ ہم گرمیوں میں نہر پر جایا کریں گے، تم بھی آؤ گی نا؟ چاندرانی تو کھل کھل کر ہنس رہی تھی، اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی ممانی سے لپٹی جا رہی تھی۔ مگر ایک منٹ کے بعد ممانی جان نے آنکھ اٹھا کر پھر میری طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر! کیا نظر تھی! ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل اس نگاہ کی گرمی محسوس کر رہا ہے۔ اور اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی پُر معنی چمک تھی۔"

"میں نے سوچا کہ یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے مگر اس سے فائدہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں پھر اسے دیکھ سکوں، اور وہ بیاہی بھی ہوئی ہے اس کا تو خاوند بھی ہے۔ اور خاوند سے اسے ضرور پیار ہو گا۔ ابھی تو شادی کو زیادہ عرصہ ہوئے نہیں معلوم ہوتا۔ ایک نہیں تو ڈیڑھ سال ہوا ہو گا۔ اور میں مسافر، اجنبی اور ڈیڑھ گھنٹے کا سفر۔ اور میں کون اور میرے لئے کس کی دلچسپی، کس کا شوق، بکواس، اسی ادھیڑ بن میں میرا چہرہ اداس سا ہو گیا ہو گا، اور میں نے چاندرانی کو چھیڑنا چھوڑ کر اس کی طرف پانچ منٹ تک دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر چاندجی نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر میری طرف منہ کر کے دوپٹہ لیتے لیتے دوپٹے کو اس طرح جھٹکا دیا کہ میرے ہیٹ پر آ لگا۔ ہیٹ ٹیڑھا ہو گیا۔ میں نے ہیٹ اتار کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور اس وقت سوچا کہ اور سب کچھ تو نظر کا دھوکا ہوگا، مگر چاندرانی تو واقعی ایک پیاری سی لڑکی تھی۔ اور وہ تو کم از کم سچائی سے آرزو مند تھی کہ میں اس سے کھیلوں۔ مان لیا کہ وہ مجھے لاہور پہنچنے پر پانچ منٹ

کے اندر اندر بھول جائے گی مگر اس وقت تو وہ حقیقی طور پر مجھ سے کھیلنے کے لئے مشتاق تھی۔ اور پھر وہ تھی اتنی پیاری سی۔ چنانچہ میں نے اس کی ممانی کی طرف، پانچ منٹ تک نہ دیکھا۔

اب اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں کہ وہ پانچ منٹ بھی کیوں ضائع کئے۔ دیکھتا رہتا تو کیا تھا، اسے کیا پروا کہ میں کیوں اداس ہوں یا میرا جی کیا چاہتا ہے۔ مگر خیر دو تین میل تک میں نے اسے نہ دیکھا۔ پھر جو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھے متجسس نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا جاننا چاہتی تھی، مگر اس کی نگاہ بالکل غیر مضطرب اور پرسکون تھی، جیسے کوئی حادثہ اسے گھبرا نہیں سکتا۔ واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ دنیا میں ایسی آنکھیں بھی ہو سکتی ہیں۔ کیا صاف اور بے ہراس نگاہ تھی، یہ تو کبھی میرے قیاس میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اسے میرے ساتھ کچھ دلچسپی پیدا ہونے کا امکان بھی ہے۔ اور آخر تم جانتے ہو لاری میں ڈیڑھ گھنٹے کا سفر فقط ایک سو منٹ ہوں گے اور کیا ہے۔ اس سے کچھ توقع کرنا حماقت تھی۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ ایسی نظر اتنی تیز اور پرمعنی لاابالی نہ ہو۔ مجھے شک پڑتا تھا کہ اسے میری گھبراہٹ اور میرے اشتیاق سے لطف آرہا ہے۔ مگر پھر اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا تھا تو اس میں کوئی ترشی نہ تھی، اور وہ ایسی ملائم اور میٹھی اور رحیم تھی ...... شاید!

یہ کہہ کر منور پھر ایک دو منٹ کے لئے چپ ہو گیا۔ میں نے بھی اس "شاید" کی تشریح اس سے نہ پوچھنی چاہی۔ پھر وہ ذرا مدھم آواز میں بولنے لگا ——

"اس کے بعد میں کسی خیال میں مستغرق تھا کہ مجھے اس کی آواز نے چونکا دیا، اور میں نے دیکھا کہ وہ چاند کی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "آپ نے ہی تو اس دن مجھ سے کہا تھا کہ شانتی تو یہیں بیٹھ، میں کھانا کھلا کے تجھے اندر بلاتی ہوں اور جب میں تھک کر آپ کا انتظار کر کے اندر چلی گئی تو آپ ناراض ہو گئیں اور اب تک آپ نہیں بھولیں۔"

"تم تو پہلے ہی چاہتی تھیں کہ باہر نہ بیٹھو۔" یہ چاند کی ماں نے کہا مگر ترش لہجہ میں۔ "اور میں نے تو تمہیں باہر بھی کھلے منہ بیٹھے دیکھا تھا، میرے دیور جیٹھ سامنے ہی گزر رہے تھے۔ وہ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ کل کی دلہن اور ننگے منہ۔ میری سسرال تھی، میرا خیال کیا ہوتا۔ مگر وہ تو آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"مگر میں کہاں اندر جاتی تھی، آپ ہی نے کہا تھا شانتی یہاں بیٹھ۔ میں وہیں بیٹھی رہی۔ اور بھی میرے پاس بہتیری تھیں، کسی نے بھی برا نہیں مانا، اور گھونگھٹ نکالنے سے تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور نکالتی تو باقی سب مجھے کھا نہ لیتیں، شانتی یہ کیا؟ اور شانتی یہ کیوں؟ اندر بیٹھی تھی تو کسی نے کہا شانتی باہر آ کے بیٹھ۔ تو ابھی دلہن ہے، باہر نکل کے مہمانوں میں بیٹھ، صحن میں رونق ہو، تو شانتی باہر جا بیٹھی پر سب ایک ایک کر کے شانتی کے پاس سے اٹھ بھی گئیں تو شانتی وہاں کیا کرتی؟ اور گھونگھٹ تو میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے نکالا نہیں جاتا۔"

"بہن تم تو آزاد ہو، تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تو یہی کہا تھا کہ اندر میرے دیور جیٹھ بیٹھے ہیں، اٹھ جائیں تو تم آجانا۔"

"تو بہن جی وہ تو میرے پاس ہی کوئی نہ بیٹھا رہا اور آپ بھی نہ آئیں۔ پرایا گھر، میں گٹھڑی بن کے کیا کرتی۔ اور مجھے خیال تھا کہ سب اٹھ گئے ہوں گے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں، میری سسرال کی بات تھی، سب کہتے ہوں گے کہ ان کی دلہن سال ابھی ہوا نہیں سب کے سامنے منہ کھلے پھرتی تھی۔ اور ہرج تو کوئی نہ تھا۔"

"تو بہن جی مجھے کیا پتہ تھا کہ ابھی تک اندر کوئی بیٹھا ہے یا پھر باہر ہی آپ کسی کو میرے پاس بھیج دیتیں۔ آپ کرتی ہی زبردستی ہیں۔ اور آپ نے یہ بات ایک دفعہ نہیں کی، کئی دفعہ کی ہے۔ ہم تو کبھی اتنی دور تک بات کو نہیں کھینچتے۔ آپ کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔"

"تو بہن تو کون سی کم ہے۔ تو بھی تو ایسی نہیں کہ ......"

یہاں چاند کی نانی بیچ میں آگئی اور اس نے کہا "اچھا اچھا جانے دو، شانتی تو ہی جانے دے، ساوتری (یہ چاند کی ماں) چھوڑ ابھی کر بات کو، کیا بری عادت ہے تیری! اب لاہور تو آنے کو ہو گا، شام ہو چلی ہے۔ یہ موٹر ہمیں گھر تک پہنچا آئے گی یا کہیں اور چھوڑ دے گی؟" ہمراری نے کہا "ماتا جی یہ تو چنگی خانے کے اڈہ کی لاری ہے۔ یہ ہمیں سٹیشن پر ہی چھوڑ دے گی۔ وہاں سے ہمیں ٹانگہ لینا پڑے گا۔" اس پر ساوتری نے جو اتنے میں شانتی سے اپنی چپقلش شاید بھول بھی چکی تھی کہا "یہ ہمیں شاہ عالمی کے اڈے پر پہنچا دے تو اچھا ہے۔ وہاں ٹانگے ہمیں کرشن نگر تک مل جائیں گے۔ نہیں تو یہ لاری ہی ہمیں کرشن نگر تک پہنچا دے۔"

میں نے کہا "یہ کرشن نگر کہاں ہے؟"

منور نے کہا "معلوم نہیں یہیں کہیں ہوگا عجیب عجیب سے نام لوگوں نے رکھ لئے ہیں۔ اچھرے وچھرے کی طرف ہوگا یا کسی اور طرف۔ ہماری بلا جانے۔ میں تو تمہیں بتاتا ہوں جو میں نے سُنا۔ اب شاید لاہور پانچ چھ میل رہ گیا تھا۔ اگرچہ شاہدرہ ابھی نہیں آیا تھا۔ شام پڑ رہی تھی۔ میں لاہور کی نزدیکی سے بہت گھبرایا۔ مگر جانتے ہو کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نام تو اس نے مجھے اپنا بتا دیا تھا۔ مگر شاید اس کا یہ مطلب نہ ہو۔ پھر سوائے اس کے کہ میں اس کے چہرے یا آنکھوں یا ہونٹوں یا اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہوں اور کیا کر سکتا تھا۔ روشنی ابھی اتنی تھی کہ میں سب کچھ بآسانی دیکھ سکوں۔ ہاتھوں کا اس کے رنگ تھا کہ غضب۔ ہاتھ کیا تھے موتیا کے پھول تھے۔ ایسا لطیف رنگ، ایسی نرم جلد! محسوس ہوتا تھا کہ ہاتھ لگانے سے ان پر داغ پڑ جائے گا۔ میں نے کہا اس کی نندیا ساس یا کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے۔ باقی پندرہ منٹ تو میں سوائے اس کے دیکھنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ مگر دیکھنے سے کیا سیری ہو سکتی ہے۔ اور آنکھوں کی بھوک کا احساس دوسرے کو ہو بھی جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے! اگر میں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی چاندرانی پر بھی نظر ڈال دیتا۔ مگر اس سے کھیلنے کو زیادہ جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اب منتظر رہتی کہ کب میں گدگداؤں مگر میں کئی کئی منٹ اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا۔"

اب مجھے اس کا نام بھی معلوم تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ مگر یہ کہ میں پھر کبھی اسے دیکھ سکوں گا۔ یہ خیال مجھے بہت بے چین کر دیتا۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں اس کے چہرے میں اتنا منہمک تھا۔ اور لاہور پہنچنے کے ڈر سے اتنا مضطرب ہو رہا تھا کہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام باتیں یعنی اسے پھر نہ دیکھنے کا ڈر...... اور اسے دیکھنے کا گمان اور ایسے ویسے اندیشے مجھے سوجھ بھی رہے تھے کہ نہیں۔ مجھے یہ بھی وثوق سے یاد نہیں کہ کیا میرا اس وقت واقعی خیال تھا کہ اس نے اپنا نام اور پتہ دانستہ طور پر بتایا ہے؛ شاید یہ محض میرے دماغ کی آفرینش تھی۔ یا شاید اس کی نگاہوں کا کچھ مطلب تھا! یا وہ مجھے اب ہر دو یا تین منٹ کے بعد ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ لیتی تھی۔ یا اب آنکھوں میں وہ بے پروائی اور غرور کیوں نہیں تھا۔ یا کیا واقعی اس کی نظر میں کچھ بے چینی موجود تھی یا اس کی مسکراہٹ اب کیوں غائب ہو گئی تھی۔ یا اب اس کے ہاتھ کیوں رومال کو لپیٹنے، مروڑنے، کسنے اور کھولنے میں مشغول تھے یا اب وہ کیوں نظریں ملا کر آنکھ جھکا لیتی تھی؛ افسوس ہے ان سوالوں کا جواب شاید مجھے تا حشر نہیں مل سکے گا۔"

"مجھے اب اس بات کا افسوس بھی ہے کہ چاندرانی سے بھی کیوں کھیلتا رہا۔ میں ساری راہ اُسے ہی کیوں نہ دیکھتا رہا۔ آخر میں اس کے ہونٹ نہ مسکرا رہے تھے۔ نہ بولنے کے لئے کھُلے ہوئے تھے۔ مگر اُن کے ایک ایک خط سے اُن کے خفیف سے جھکاؤ سے کتنی ملائمت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"لاہور آ گیا، ہم اڈے پر پہنچ گئے۔ اور لاری کھڑی ہو گئی۔ اس وقت سب مسافر اترنے میں مشغول۔ ان کے حصے میں دونوں طرف کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ وہ چونکہ بیچ میں بیٹھی تھی۔ شاید اس لئے وہ سب سے آخر میں اُتری۔ میں بھی اپنی کھڑکی سے دور تھا، میں بھی بیٹھا رہا۔ اترتی دفعہ بھی اس نے مجھے خاص اپنی نظر سے دیکھا۔ کاش وہ اترتی دفعہ ہی مجھے اُس نظر سے نہ دیکھتی! پھر بھی میں شاید اسے کبھی بھول جاتا۔"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کبھی بیچ محل روڈ پر نہیں گیا۔ یا کیا وہ اسے کبھی لارنس باغ میں نہیں دکھائی دی۔ مگر اس کی نظر کی افسردگی کو دیکھ کر مجھے یہ پوچھنا بے سود ہی معلوم ہوا۔

امتیاز علی تاج

"— کہ عالم دوبارہ نیست"

فراعنۂ مصر کے محل کا دستور تھا کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمانوں کی میگساری اور بیباکی اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنے لگتی تو معبد قصر کا پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوانِ نشاط میں داخل ہوتا اور اس وقت جبکہ خدام مورت کو اٹھائے مخمور فرعون کے بدمست مہمانوں میں تھم تھم کر گھوم رہے ہوتے، تو پکار پکار کر کہتا "انجامِ ہستی کو دیکھو۔ اور ان ترغیبات سے احتراز کرو۔ جو تمہارے حواس کو فریب میں لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حبابِ ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دیگا۔"

موت کی چیرہ دستی کا بھیانک نتیجہ آنکھوں کے سامنے آجانے سے منادی کی آواز مقسوم کے گھڑیال کی گونج معلوم ہوتی۔ جسے سن کر دست درازوں کے بازو ڈھیلے پڑجاتے اور مے آشاموں کے ہاتھ پیالوں کو نہ سنبھال سکتے اور ایک لمحہ کے اندر اندر محفل پر مدہوشی اور خود فراموشی کے بجائے عبرت کا خیال آفریں سکوت طاری ہوجاتا۔

لیکن یہ صدیوں کا پرانا دستور جسے زمانۂ قدیم کے کسی معلمِ اخلاق نے وضع کیا تھا، اور جس سے اخلاقِ عام کے محافظ، پروہت اور پجاری اعتدال و احتیاط کی درس آموزی کیا کرتے تھے۔ ایک ہی رات کے اندر ایک نوجوان فرعون کے ہاتھوں اپنے معانی کی تعبیر میں یوں منقلب ہوا کہ مؤرخ اور فطرتِ انسانی کے طالب کے لئے یکساں طور پر استعجاب انگیز ہے۔

وہ رات بلارسردپ دیوی بسط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات تھی۔ مصر کی وسیع مملکت سے ستر ہزار زائر خشکی کی راہ اور کشتیوں میں سوار ہو کر کھڑتالیں اور مرلیاں بجاتے اور گیت گاتے کئی روز پیشتر بیوبسطس کے شہر میں پہنچ چکے تھے۔ جواں سال فرعون اور اس کے پروہتوں نے پوجا کی تمام خفی و جلی رسمیں ادا کر لی تھیں۔ دیوی کا چولا اور اس کا منڈل جس پر ایک سنپولیا بنا تھا، بدلا جاچکا تھا۔ فرعون نے معطر لیپ دائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے دیوی کی کانسے کی مورت پر مل دیا تھا۔ قربان گاہ پر سیاہ و سفید رنگ کے ہزاروں بیلوں کی قربانیاں چڑھ چکی تھیں۔ اور ان کے سر ان دعاؤں کے بعد کہ فرد اور قوم

اور شہر اور مملکت کی بلائیں ان پر سے ٹل جائیں، نیل میں غرق کئے جا چکے تھے۔ دیوی کے حضور میں شہد اور شراب اور کشمش اور کلیجر کے چڑھاوے چڑھ چکے تھے۔ ہیلیوپولس کے ایک ایک بازار میں عوام کا بحرِ مواج جلاجل اور مجیرے بجا بجا کر سارے دن بھجن گاتا اور دیوی کی جے کے نعرے لگاتا رہا تھا۔ اور اب تمام رسوم ادا کر چکنے کے بعد مرد اور عورتیں اور بوڑھے اور بچے ادائے فرض کی فراغت کے ساتھ اپنے آپ کو طرب و نشاط کے اس عام میلان کے سپرد کر چکے تھے جس کے تند و پرشور سیلاب کے ریلے سارے اژدحام کو بہائے لئے جا رہے تھے۔ اور بہار کی اس جذبات انگیز رات میں تاباں و فروزاں مندروں کی منقش دیواروں کے باہر جا بجا مشعلیں گھماتے اور جھانجھیں اور الغوزے بجاتے عریاں گیتوں اور ولولہ انگیز ناچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

بلاریب دیوی بسطہ کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات میں ضیافت کے بعد نوجوان فرعون کا ایوانِ نشاط مملکتِ مصر کے تمام قابلِ ذکر لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور اگرچہ اژدحام کے ہنگاموں سے علیحدہ اور جدا تھا لیکن نہ اتنی دور کہ بیرونی وارفتگیاں محسوس ہوئے بغیر رہ سکیں۔

نوجوان فرعون کا ایوانِ نشاط عشرت و تجمل کا ایک نادر و یگانہ خواب تھا جسے معمار اور نجّار اور مصوّر اور سنگتراش کی متفقہ مجنونانہ کاوشوں نے زندگی بخش دی تھی۔ عظمت و نزہت میں اہرام کھڑے کرنے والوں کی اولاد کے شایانِ شان طول و عرض میں اس قدر وافر کہ ایک اژدہام کی معیت اس میں ناچیز نظر آتی تھی۔ اس کی وسعت اپنے اندر ایک شورِ قیامت کو گم کر سکتی تھی۔ مجلّٰے و مصفّٰی فرش پر منقش اور رنگین دیواروں کے ساتھ ساتھ استرکاری کے ستونوں کی ایک دنیا آباد۔ جن کے پائے، اور سر قدیم صنّاعی، رنگ آمیزی کا ایک فردوس تھے۔ اور ان کے درمیان جا بجا دیوی بسطہ کے عظیم الجثہ مجسّمے وقار اور تمکنت میں ترشے ہوئے کھڑے تھے۔ ایوان کی وسعت کے برابر نیچی نیچی اور چوڑی چکلی بے شمار سیڑھیاں دو ایسے ہی دوسرے وسیع تختوں کو رہنمائی کرتی تھیں۔ گرانڈیل صد شاخوں کی مختلف اللون روشنیوں میں انسانی صنّاعی کا یہ حیرتناک مظہر جس میں رنگ و آہنگ کی موجوں پہ خوشبوئیں ہلکورے لے رہی تھیں، اپنی تابانی و درخشانی سے ہوش ربائی کر رہا تھا۔

زرنگار پایوں کے ہزاروں گدیلے اور تخت اور کرسیاں بچھی تھیں۔ جن پر نوجوان فرعون کے مہمان ضیافت کے بعد رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیٹھے تھے۔ نیل کی مچھلیوں اور بطوں اور جنوبی جنگلوں کے غزالوں اور گایوں کے کبابوں کے ساتھ مہمانوں کو کرنب بھی کھلایا گیا تھا کہ ان کی پیاس بھڑک اٹھے اور وہ اسے وادیٔ نیل کے انگوروں کی لال اور سفید شراب سے بجھا سکیں۔

تنومند ہاتھوں نے قدم بڑھا رکھے تھے۔ اور گوری ساقنیں زمرّد کا مینا لئے فراخ حوصلگی سے انھیں لبالب بھر رہی اور خالی مینا ساتھ کی سبزہ فام کنیزوں کے سپرد کرتی جا رہی تھیں۔ جام ہونٹوں پر سرنگوں تھے اور منہ پونچھنے والے خادموں کے رومال ہٹا ہٹا کر ہل من مزید کی صدائیں بلند کی جا رہی تھیں۔

ایوان کے مختلف حصّوں میں مختلف تفریحیں جاری تھیں۔ نچلے تختے میں مزامیر کے غل کے ساتھ نٹ اور بازی گر اور شعبدہ باز اور مسخرے اپنے کمالِ فن کو نظارہ افروز کر رہے تھے۔ کئی کئی چرمی گیندیں آگے پیچھے اچھال کر واپسی میں باری باری لپکی اور پھر اچھالی جا رہی تھیں۔ رنگین دائروں والی لکڑی کے اندرونی دائرے میں خنجروں سے نشانہ لگایا جا رہا تھا۔ دو دو مرد اور عورتیں زمین پر ٹانگیں پھیلا کر برابر برابر بیٹھے تھے۔ اور ایک دوسرے کی بانہوں میں باہیں ڈال کر بغیر زمین کا سہارا لئے کھڑے ہو رہے تھے۔ مسخرے اور بونے اپنی چست پھبتیوں اور مضحکہ خیز حرکتوں پر قہقہے وصول کر رہے تھے۔

دوسرا تختہ خوش آواز سازوں اور نامور مغنیوں کے راگوں سے سماعت کے لئے ایک خوش آیند وارفتگی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔

طنبور اور سرود اور نے بجانے والی جماعتیں فضا کو کیف و مستی کی جنت بنا رہی تھیں اور مغنیوں کی گلے بازیاں متاعِ ہوش کی غارتگری میں مصروف تھیں۔ نازنینیں اپنے سبک بربط سینے سے لگائے اور کندھوں پر اٹھائے اپنی نازک انگلیوں سے ان کے تاروں کو ہلاتی اور اپنے گیتوں اور تبسموں سے بجلیاں گراتی مہمانوں کے درمیان سے گذر رہی تھیں جن کے ذہن عشرت کی مدہوشی میں جیسے سن تھے۔

تیسرے تختے کے پرلے کنارے ایک جڑاؤ تخت پر جس کے پایوں کو شیروں کے بڑے سر بنا کر مزین کیا گیا تھا، نوجوان فرعون وقار آمیز تجمل میں بیٹھا تھا۔ شباب کے اولین مراحل میں اور ناکتخدا۔ اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں۔ اور خط بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے نفیس ترین کتان کی ایک لمبی اور دودھ سی سفید عبا پہن رکھی تھی۔ جس کی آستینیں چست تھیں۔ اور جس کے دامن پر سنپولیوں کی زرتار قطار سے مصر کا شاہی نشان بنا رکھا تھا۔ زری کے ایک کمر بند سے جس نے عبا کو خوش مذاقی سے چنٹیں دے رکھی تھیں، سامنے کی طرف باریک چمڑے کی ایک مثلث آویزاں تھی جس پر شوخ رنگ میں لہریئے کے نقش بنے ہوئے تھے۔ سر پر مصنوعی بال تھے۔ جن پر کنول کے شگفتہ پھولوں کا سُبک سا تاج رکھا تھا۔ گردن میں ہیروں کا ایک ہار دھک رہا تھا۔ اور بازوؤں، کلائیوں اور انگلیوں میں سونے کے موٹے موٹے بازو بند، پہنچیاں اور انگشتریاں جن پر نایاب پتھروں سے مگرمچھ اور بچھو اور تصویری خط کے حروف بنے ہوئے تھے۔

قدِ آدم بربط جن کے سروں پر ارواحِ خبیثہ کے انوکھے چہرے ترشے ہوئے تھے، ایک مناسب فاصلہ پر کھڑے تھے اور مزاج شناس سازندوں کی مشاق انگلیاں انھیں ایسے سلیقہ سے ہولے ہولے بجا رہی تھیں کہ رقاصہ لڑکیوں کے لطیف رقص کے ساتھ مل کر وہ تھکے ہوئے دماغ پر خوش آیند غنودگی طاری کر سکیں۔ خوشبوؤں اور روشنیوں میں کھوئے ہوئے نشاط پر اس تیسرے تختے میں ہیبت سے رنگا ہوا ایک سکون مسلط تھا۔ جس نے ہر قسم کے تجاوز و تواتر کو عنان گیر۔ اور تمام حرکات اور آوازوں کو منضبط کر رکھا تھا۔ پروہت کے نزدیک عشرت کا یہی تصور تھا جو تہوار کی رات میں ایک نیک فرعون کے شایانِ شان قرار دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ضعیف پیشانی پر اطمینان و تشفی لئے اس انتفاع آمیز طرب میں دلجمعی سے بیٹھا تھا۔

لیکن نوجوان فرعون بے قرار نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تکان تھی۔ ایک بے کلی۔ جیسے تکلیف کی یہ محتاط فضا گھٹانے کے بجائے بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ حرکات میں ایک اکتاہٹ، ایک دل برداشتگی، ماحول کی نوعیت سے سیری۔ اس سارے ماحول میں جو تال مضمر تھی۔ اس سے بے آہنگی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا جیسے ایک تلخی کے امتلا میں۔ صرف ادائے فرض کی تسکین کے سہارے۔ اس لئے کہ پروہت وہاں موجود تھا۔ جس نے اس کی طبعِ آزاد کو ہمیشہ آئین پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نزدیک تربیت کا لب لباب ناجائز جذبات کا انسداد تھا۔ اور جس کی خشک دانائی کے لئے وہ تمام جذبات ناجائز تھے جو فرعون کی مقررہ مذہبی و معاشرتی فرائض سے تعلق نہ رکھتے تھے یا جن سے اس کے فرعونی جلال و جبروت میں کوئی عام انسانی خصوصیت جھلک رکھنے کا احتمال کیا جا سکتا تھا۔ اس منضبط عشرت کا صدر بنے اور اپنے کشیدہ دل میں پروہت اور رواج کی احتجاج کی چبھن سینے میں دبائے۔ وہ بیٹھا ہوا تھا۔ دیوی بسطت کے تہوار کی یہ آخری ہنگامہ پرور رات جس کی ریل پیل کا شور باہر اور ایوانِ نشاط کے طرف سے ایک دور آفریں شکوہ لئے ایک مدھم گونج بن کر اس تک پہنچ رہا تھا۔ اسے عجیب طرح متاثر کر رہی تھی۔ ایک انوکھی تشنگی تھی جس نے دل سے زبان تک نچلے نتھنوں سے اس کے سینے اور حلق کو خشک کر رکھا تھا۔ شراب میں اس پیاس کے لئے تسکین نہ تھی۔ وہ اتنی گاڑھی معلوم ہوتی تھی کہ حلق جبر سے ... اس کے بے قرار خون کی بڑھی ہوئی حرارت کسی اور تسکین کی تشنہ تھی۔ اس تسکین سے بہت مختلف جو بربط کے اس کے لئے کھلتا تھا۔

ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے تاروں اور رقاصوں کے لطافت سے اُٹھتے ہوئے قدموں میں تھی اور جو اس شبستان کے ضبط و ترتیب اور تہذیب و شائستگی کی جلا میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ زیادہ تند، وحشیانہ، خلافِ معمول۔ اپنی نوع میں اس سب سے مختلف جس نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کچھ اس سے ہمنوا جو اژدہام کے شور و غل کی مدھم گونج میں تھا۔ لیکن زیادہ بلند، زیادہ شدید، زیادہ بے تکلف، حواس کی لطف اندوزی کے لئے زیادہ واضح جو وہاں نہ تھا۔ جو گلیوں میں تھا۔ اژدہام کے ان وارفتہ مخلوط ناچوں میں جہاں لباس جذبہ کی فراوانی میں حائل ہونے سے معذور تھا۔ جہاں کی فضا میں صرف بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی بُو تھی۔ جہاں جسموں کا باہمی مَس تھا۔ جہاں شانے بھڑ سکتے تھے۔ جہاں سینہ ہر طرف سے گوشت پوست کے گرم دباؤ میں دب سکتا تھا۔

دیومی لبط کے تہوار کی اس آخری ہنگامہ خیز رات کا رنگ رس جو اپنی فراوانی اور بے عنانی میں بے خودی و مستی کا ایک ابلتا ہوا سمندر تھا، اس کے نوجوان خون پر اپنا افسوں پھونک کر اس کو پکار رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنی روح میں سے اُٹھتی ہوئی لبیک کو دبائے چپ چاپ بیٹھا رہے۔ شفقتِ پدری سے بچپن میں محروم ہو جانے کے بعد پروہت نے اسے یوں ہی تربیت دی تھی خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی تربیت۔ نفس کی ہر پیداوار کو دیکھے یا پرکھے بغیر خود کچل ڈالنے کی تربیت۔ اور اس نے ہمیشہ پروہت کے کہے پر عمل کرنے اور اپنے نفس کو اپنا سب سے عیار دشمن سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی لیکن آج کی رات میں۔ تہوار کی اس ولولہ انگیز رات میں جب ہر طرف نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی، وہ پروہت کے سکوان اور برگشتگی اور اپنے نفس سے ایک حجاب آمیز موانست محسوس کر رہا تھا۔ ایک موانست جو اس رات میں حیرت ناک رفتار سے ترقی کر رہی تھی۔ جو اس کی تمام ہستی سے ساز باز کرتی ہوئی اس پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ اور جس کے دزدیدہ تموج کی سرکشی سے اور اپنے ایک دوسرے آپ کی مغلوبیت سے اس کی فطرت کا زیادہ گہرا عمق ایک پوشیدہ مسرّت حاصل کر رہا تھا۔

اور جذبات کی اس درہمی برہمی میں ایک نیا اور قوی ارمان اس کے اندر جنم لے رہا تھا۔ جو شاید اپنی نوزائیدگی کی وجہ سے شاید اجنبیت کے باعث اُسے بے حد مجبوب معلوم ہو رہا تھا۔ جس کی قوت کا اصرار جس کی سرکشی کا دعویٰ باوجود درد آمیز ہونے کے ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ جس کی سنسناہٹ وہ چاہتا تھا۔ اس کے خون میں فروزاں تر ہوتی چلی جائے۔ اور جس کی پھریریاں اسے کسی زیادہ موافق ماحول میں چھوڑ آئیں۔

وہ آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے خود مغلوب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ بربطوں کے یک لخت تھم جانے سے وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنی گرم گرم آنکھوں سے پلکیں ذرا سی اُٹھائیں۔ پچھلا رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک نئی رقاصہ اکیلی رقص کرنے کو محفل میں آ چکی تھی۔ خاموشی کی علت نے آہستہ سے اس کے شعور سے مس کیا۔ اور اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ لیکن اس میں ایک دامنگیری، اس کے ارمان کی حرکت کی تال ایک دعوت تھی۔ اس کی پلکیں رفتہ رفتہ زیادہ اُٹھتی چلی گئیں۔

روشنی سے دہکتے ہوئے فرش پر ایک نئی رقاصہ جو لبنان کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سے لائی گئی تھی، ایک باریک سفید نقاب میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ساکت کھڑی تھی۔ یوں جیسے کسی سنگ تراش کی گرمیٔ جنوں ایک سفید جسامت میں حسنِ متناسب کا خوابِ جمیل دیکھ رہی ہو۔ تفصیل کھوئی ہوئی۔ لیکن خاکہ کی صفائی اور محتاط اور احتیاط میں کامل گولائیاں عشرتِ نظر اپنے جمود میں بھی سبکی حرکات کا تصوّر ابھرتا ہوا پیر کا انگوٹھا زمین پر گھٹنے میں خم ایک بازو بدن سے چمٹا ہوا۔ دوسرا جدا جس کے فاصلے اور انگلیوں کے خم میں ایک حرکت تھمی ہوئی۔ گردن میں آگاہی۔ بدن کے تناؤ میں ایک تامّل جیسے اپنی بے تکلفی میں شباب کی للکار ٹھٹک کر تھم گئی ہو۔

ایک خادم نے جھک کر لمبے نقاب کا دامن زمین پر سے اٹھانا شروع کیا۔ سازوں کے لمبے لمبے تار دھڑکنے لگے۔ ان کی دھڑکن

میں خیال کی مخلوق نے حواس کی دنیا میں جنم لینا شروع کر دیا۔ صحرا کے آفتاب میں پلا ہوا گداز سانولا جسم، تکمیل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعصاب، جن میں سے زندگی کی گرمی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، سرخ اور سبز منکوں کی ایک مختصر جھالر کے مس سے لرزشیں کھاتی ہوئی، گدرایا ہوا بدن خط و خال پر ایک بے تکلفی۔ ایک ناتراشیدگی۔ غیر واضح ٹھوڑی۔ ہونٹ موٹے، نچلا ہونٹ درمیان سے کسی قدر دبا ہوا۔ اور اوپر کا ہونٹ ابھرا ہوا۔ سرخ خون سے پُر اور نمناک۔ ناک چھوٹی اور کسی قدر پھیلی ہوئی۔ نتھنے نازک جو کچھ سونگھتے اور کھنچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں لمبی اور سیاہ جن میں ایک سحر رقیق ہو کر کبھی پلکوں کی چلمن میں چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا تھا۔ تنگ پیشانی اور سر پر پھولے ہوئے گھنگھریالے بال۔

فرعون اسے تک رہا تھا۔ اور اپنی پلکیں بھی گرانا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے عجیب طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ ارمان کی طرح نئی۔ اور تازہ اور اسرار سے بھری ہوئی اس ماحول میں جہاں سب کچھ جچا تلا اور جانچا پرکھا ہوا تھا ایک مختلف شے اس کے ارمان کی طرح مختلف جو باوجود تخالف کے بے محل نہ تھی۔ جس کا تضاد منظر کو ایک انوکھی طرح نیا بنا رہا تھا۔ جس میں اس وسیع اور رنگین چھتی ہوئی چار دیواری سے باہر کا پیغام تھا۔ وہاں کا پیغام جہاں سے نعروں اور چیخوں اور قہقہوں اور گیتوں کی گونج آ رہی تھی۔ جہاں اجڈ پنڈلیاں اور زندگی سے بھری ہوئی رانیں تھرک رہی تھیں۔

فرعون کانوں میں سنسناہٹ لئے اس کا ناچ دیکھنے لگا۔ جو اس کے بھرے بھرے اور لچکتے ہوئے بازوؤں کی بیباک حرکات سے شروع ہوا تھا۔ اور جس کا زہر اندر ہی اندر اس کے دھڑ میں لہریں مارتا ہوا دردانہ نیچے کو بڑھ رہا اور اس کے تندرست و توانا اعضا میں تند اور البیلی حرکات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ حرکات جس میں نہ فرعون کا پاس ادب تھا اور نہ پروہت کا حجاب۔ حرکات جن کا منبع شباب کا جوش مارتا ہوا اور کف اُڑاتا ہوا چشمہ تھا۔

فرعون کا انہماک بڑھ رہا تھا۔ رقص جیسے اس پر کوئی افسوں پھونکتا جاتا۔ اور اس پر ایک سنسناتی ہوئی معطر غفلت طاری کر رہا تھا ایک غفلت جو اندر سے بیدار اور حیات افروز تھی۔ جس میں وہ سب خیالات کروٹیں لے لے کر آنکھیں کھول رہے تھے۔ جنہیں اچانک پیدا ہونے پر پروہت کی ہدایت کے مطابق اس نے ہمیشہ کچل ڈالا۔ اور مُردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے کی گہرائیوں سے زندہ ہو کر اُٹھ رہے اور اس کے نوزائیدہ ارمان کے اندر سما سما کر اس ناچ پر جھوم جھوم کر وجد کر رہے تھے۔ اور ان کے وجد میں رقاصہ مانوس معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک بیزار لطافت جو ہمیشہ ٹکڑوں میں اس کے پاس آئی تھی۔ جب وہ دیوی کا چولا بدل رہا تھا۔ تو اسی کی پنڈلی کی ایک جھلک نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ جب وہ دیوی کی برہنہ مورت پر لیپ مل رہا تھا تو اس کی چھنگلی اسی کے مس سے لرز کر تھم گئی تھی۔ جب اس کا رتھ اژدہام میں سے گزر رہا تھا تو یہی تھی جس نے بالوں میں سے کہیں اپنا شانہ اور کہیں اپنی پیٹھ کا وقار ننگا کر رکھا تھا۔ جس کی آنکھیں نگاہیں چار ہونے کے بعد منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ جس کی آواز نے اس ہجوم کے شور میں سے اس تک پہنچنے کا راستہ بنا لیا تھا۔ جو کہیں اس کے آگے آگے بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کہیں اس کے گزر چکنے کے بعد پیچھے سے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اب وہ اکٹھی ہو کر کھڑی ناچ رہی تھی۔ ایک ناچ جس کا خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جو جسم میں رچ چکنے کے بعد اُسے چال میں متحرک کرنے لگا تھا۔ لمبے لمبے قدموں کی البیلی چال میں جس کا تعلق گھٹنوں سے زیادہ کولھوں سے تھا۔ جس میں خلوت کی بیباکی تھی اور جلوت کا احتراز جس میں رزم کی یورش تھی اور بزم کا پس و پیش۔ جس میں سرودر آشام قوت کے اچانک دھاوے تھے اور رعنا ضعف کی پسپائیاں۔ نفس کے دروازوں پر بیباک دستک بھی اور دبی ہوئی آہیں بھی۔

فرعون جلتی ہوئی آنکھوں سے اس گدرائے ہوئے جسم کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے مانوس اعضا اس وقت یکجا ہو کر ایک یقینی اور ناقابل

ہلکے ہلکے بلتے ہوئے تاروں اور رقاصوں کے لطافت سے اُٹھتے ہوئے قدموں میں تھی اور جو اس شبستان کے ضبط و ترتیب اور تہذیب و شائستگی کی جلا میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ زیادہ تند، وحشیانہ، خلافِ معمول۔ اپنی نوع میں اس سب سے مختلف جس نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کچھ اس سے ہمنوا جو ازدہام کے نشہ و غل کی مدھم گونج میں تھا۔ لیکن زیادہ بلند، زیادہ شدید، زیادہ بے تکلف، حواس کی لطف اندوزی کے لئے زیادہ واضح جو وہاں نہ تھا۔ جو گلیوں میں تھا۔ ازدہام کے ان وارفتہ مخلوط ناچوں میں جہاں لباس جذبہ کی فراوانی میں حائل ہونے سے معذور تھا۔ جہاں کی فضا میں صرف بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی بُو تھی۔ جہاں جسموں کا باہمی مَس تھا۔ جہاں شانے بھڑ سکتے تھے۔ جہاں سینہ ہر طرف سے گوشت پوست کے گرم دباؤ میں دب سکتا تھا۔

ویوی لیط کے تہوار کی اس آخری ہنگامہ خیز رات کا رنگ رس جو اپنی فراوانی اور بے عنانی میں بے خودی و مستی کا ایک ابلتا ہوا سمندر تھا، اس کے نوجوان خون پر اپنا افسوں پھونک کر اس کو پکار رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنی روح میں سے اُٹھتی ہوئی لبیک کو دبائے چپ چاپ بیٹھا رہے۔ شفقتِ پدری سے بچپن میں محروم ہو جانے کے بعد پروہت نے اسے یوں ہی تربیت دی تھی خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی تربیت۔ نفس کی ہر پیداوار کو دیکھے یا پرکھے بغیر خود کچل ڈالنے کی تربیت۔ اور اس نے ہمیشہ پروہت کے کہے پر عمل کرنے اور اپنے نفس کو اپنا سب سے عیار دشمن سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی لیکن آج کی رات میں۔ تہوار کی اس ولولہ انگیز رات میں جب ہر طرف نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی، وہ پروہت کے سکون اور برگشتگی اور اپنے نفس سے ایک حجاب آمیز موانست محسوس کر رہا تھا۔ ایک موانست جو اس رات میں حیرت ناک رفتار سے ترقی کر رہی تھی۔ جو اس کی تمام ہستی سے ساز باز کرتی ہوئی اس پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ اور جس کے دزدیدہ تموج کی سرکشی سے اور اپنے ایک دوسرے آپ کی مغلوبیت سے اس کی فطرت کا زیادہ گہرا عمق ایک پوشیدہ مسرت حاصل کر رہا تھا۔

اور جذبات کی اس درہمی برہمی میں ایک نیا اور قوی ارمان اس کے اندر جنم لے رہا تھا۔ جو شاید اپنی نوزائیدگی کی وجہ سے شاید اجنبیت کے باعث اسے بے حد محبوب معلوم ہو رہا تھا۔ جس کی قوت کا اصرار جس کی سرکشی کا دعویٰ باوجود درد آمیز ہونے کے ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ جس کی سنسناہٹ وہ چاہتا تھا۔ اس کے خون میں فروزاں تر ہوتی چلی جائے۔ اور جس کی پھریریاں اسے کسی زیادہ موافق ماحول میں چھوڑ آئیں۔

وہ آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے خود مغلوب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ بربطوں کے یک لخت تھم جانے سے وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنی گرم گرم آنکھوں سے پلکیں ذرا سی اُٹھائیں۔ پچھلا رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک نئی رقاصہ اکیلی رقص کرنے کو محفل میں آ چکی تھی۔ خاموشی کی علت نے آہستہ سے اس کے شعور سے مس کیا۔ اور اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ لیکن اس میں ایک دامنگیری، اس کے ارمان کی حرکت کی تال ایک دعوت تھی۔ اس کی پلکیں رفتہ رفتہ زیادہ اُٹھتی چلی گئیں۔

روشنی سے دہکتے ہوئے فرش پر ایک نئی رقاصہ جو لبنان کے تپتے ہوئے صحراؤں میں سے لائی گئی تھی، ایک باریک سفید نقاب میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ساکت کھڑی تھی۔ یوں جیسے کسی سنگ تراش کی گرمی جنوں ایک سفید جسامت میں حسنِ متناسب کا خوابِ جمیل دیکھ رہی ہو۔ تفصیل کھوئی ہوئی۔ لیکن خاکہ کی سہانی اور محتاط اور احتیاط میں کامل گولائیاں عشرت نظر اپنے جمود میں بھی سجیلی حرکات کا تصور بھڑکاتی ہوئی پیر کا انگوٹھا زمین پر گھٹنے میں خم ایک بازو بدن سے چمٹا ہوا۔ دوسرا جُدا جس کے فاصلے اور انگلیوں کے خم میں ایک حرکت تھمی ہوئی۔ گردن میں آگاہی۔ بدن کے تناؤ میں ایک تامل جیسے اپنی بے تکلفی میں شباب کی للکار ٹھٹھک کر تھم گئی ہو۔

ایک خادم نے جھک کر لمبے نقاب کا دامن زمین پر سے اٹھانا شروع کیا۔ سازوں کے لمبے لمبے تار دھڑکنے لگے۔ ان کی دھڑکن

ہیں خیال کی مخلوق نے حواس کی دنیا میں جنم لینا شروع کر دیا۔ صحرا کے آفتاب میں پلا ہوا گداز سانولا جسم، تکمیل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعصاب، جن میں سے زندگی کی گرمی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی، سرخ اور سبز منکوں کی ایک مختصر جھالر کے مس سے لرزشیں کھاتی ہوئی، گدرایا ہوا بدن خط و خال پر ایک بے تکلفی۔ ایک ناتراشیدگی۔ غیر واضح ٹھوڑی۔ ہونٹ موٹے، نچلا ہونٹ درمیان سے کسی قدر دبا ہوا۔ اور اوپر کا ہونٹ ابھرا ہوا۔ سرخ خون سے پُر اور نمناک۔ ناک چھوٹی اور کسی قدر پھیلی ہوئی۔ نتھنے نازک جو کچھ سونگھتے اور کھنچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں لمبی اور سیاہ جن میں ایک سحر رقیق ہو کر کبھی پلکوں کی چلمن میں چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا تھا۔ تنگ پیشانی اور سر پہ پھولے ہوئے گھنگھریالے بال۔

فرعون اسے تک رہا تھا۔ اور اپنی پلکیں پھر گرانا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے عجیب طرح ایک نئی اور تازہ شئے معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ ارمان کی طرح نئی۔ اور تازہ اور اسرار سے بھری ہوئی اس ماحول میں جہاں سب کچھ جچا تُلا اور جانچا پرکھا ہوا تھا ایک مختلف شئے اس کے ارمان کی طرح مختلف جو باوجود تخالف کے بے محل نہ تھی۔ جس کا تضاد منظر کو ایک انوکھی طرح نیا بنا رہا تھا۔ جس میں اس وسیع اور رنگین چھپتی ہوئی چار دیواری سے باہر کا پیغام تھا۔ وہاں کا پیغام جہاں سے نعروں اور چیخوں اور قہقہوں اور گیتوں کی گونج آ رہی تھی۔ جہاں اجڈ پنڈلیاں اور زندگی سے بھری ہوئی رانیں تھرک رہی تھیں۔

فرعون کانوں میں سنسناہٹ لئے اس کا ناچ دیکھنے لگا۔ جو اس کے بھرے بھرے اور لچکتے ہوئے بازوؤں کی بیباک حرکات سے شروع ہوا تھا۔ اور جس کا زہر اندر ہی اندر اس کے دھڑ میں لہریں مارتا ہوا درآنہ نیچے کو بڑھ رہا اور وہ اس کے تندرست و توانا اعضا میں تناد اور البیلی حرکات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ حرکات جس میں نہ فرعون کا پاس ادب تھا اور نہ پروہت کا حجاب۔ حرکات جن کا منبع شباب کا جوش مارتا ہوا اور کف اڑاتا ہوا چشمہ تھا۔

فرعون کا انہماک بڑھ رہا تھا۔ رقص جیسے اس پہ کوئی افسوں پھونکتا جاتا۔ اور اس پہ ایک سنسناتی ہوئی معطر غفلت طاری کر رہا تھا ایک غفلت جو اندر سے بیدار اور حیات افروز تھی۔ جس میں وہ سب خیالات کروٹیں لے کر آنکھیں کھول رہے تھے۔ جنہیں اچانک پیدا ہونے پر پروہت کی ہدایت کے مطابق اس نے ہمیشہ کچل ڈالا۔ اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے کی گہرائیوں سے زندہ ہو کر اُٹھ رہے اور اس کے نوزائیدہ ارمان کے اندر سما سما کر اس ناچ پر جھوم جھوم کر وجد کر رہے تھے۔ اور ان کے وجد میں رقاصہ مانوس معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گریزاں لطافت، جو ہمیشہ ٹکڑوں میں اس کے پاس آ گئی تھی۔ جب وہ دیوی کا چولا بدل رہا تھا۔ تو اسی کی پنڈلی کی ایک جھلک نے اسے سراسیمہ کر دیا تھا۔ جب وہ دیوی کی برہنہ مورت پر لیپ مل رہا تھا تو اس کی چھنگلی اسی کے مس سے لرز کر تھم گئی تھی۔ جب اس کا رتھ ازدہام میں سے گزر رہا تھا تو یہی تھی جس نے بالوں میں سے کہیں اپنا شانہ اور کہیں اپنی پیٹھ کا دوقار ننگا کر رکھا تھا۔ جس کی آنکھیں نگاہیں چار ہونے کے بعد منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ جس کی آواز نے اس ہجوم کے شور میں سے اس تک پہنچنے کا راستہ بنا لیا تھا۔ جو کہیں اس کے آگے آگے بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کہیں اس کے گزر چکنے کے بعد پیچھے سے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اب وہ اکٹھی ہو کر کھڑی ناچ رہی تھی۔ ایک ناچ جس کا خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جو جسم میں رچ چکنے کے بعد اسے چال میں متحرک کرنے لگا تھا۔ لمبے لمبے قدموں کی البیلی چال میں جس کا تعلق گھٹنوں سے زیادہ کولھوں سے تھا۔ جس میں خلوت کی بیباکی تھی اور جلوت کا احتراز جس میں رزم کی یورش تھی اور بزم کا پس و پیش۔ جس میں سرور آشام قوت کے اچانک دھاوے تھے اور رعنا ضعف کی پسپائیاں۔ نفس کے دروازوں پہ بیباک دستک بھی اور دبی ہوئی آہیں بھی۔

فرعون جلتی ہوئی آنکھوں سے اس گدرائے ہوئے جسم کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے مانوس اعضا اس وقت یکجا ہو کر ایک یقینی اور ناقابل

فہم ہستی بن گئے تھے۔ اور اپنی تکمیل سے ایک تسکین پیدا کرنے کی بجائے ایک نئے اور پُر اسرار طریق پر اُسے نبرد آزما ہونے کو للکار رہے تھے۔ اسی نے رقص پر کھڑے ہو کر کسی حریف کے سامنے اپنی قوت کی سیاست کو ایسا متامّل محسوس نہ کیا تھا۔ کسی مدمقابل کے اسلحہ اور فن نبرد آزمائی کو سمجھنے میں اتنا عاجز نہ رہا تھا لیکن عجز اور تامّل کا یہ احساس اسے زیادہ اُکسا رہا تھا۔ اس میں سنسنیوں کے نئے ریلے پیدا کر رہا تھا۔ غلبہ کا منہ زور، ارمان اس کی ساری ہستی میں ایک زلزلہ سا لا رہا تھا اور پکار پکار کر اسے کہہ رہا تھا کہ اس حصول میں وہ سب کچھ ہے، جس سے محرومی مرد کی زندگی کو ماتمی بنا سکتی ہے۔ زندگی کا وہ کامل سرور جو ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے پھسلتا رہا ہے، جو اس کے بے پناہ ارمان میں دھڑک رہا ہے۔ اس سرکش جسم کو مغلوب کرنے میں ہے۔ اس میں اپنی سخت اُنگلیوں کے فشار سے نیل ڈال دینے میں۔ اسے اپنے آغوش کی حدت سے بے سدھ کر دینے میں اور اس کے بھرے بھرے سانولے بازوؤں میں اپنے سفید دانت گاڑ دینے میں۔

پروہت چیں جبیں سے اس کی بے کلی کو دیکھ رہا تھا لیکن اپنے میں جرأت نہ پاتا تھا کہ اس رقص کے طغیان کو روک کر فرعون کی سُرخ جلتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکے وہ اُٹھا اور اپنے سلگتے ہوئے غصّے کے شعلوں کو دبائے پروہتوں سمیت خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

اور رقاصہ کا رقص اپنی تندی اور تفصیل اور وحشیانہ خود فراموشی میں ترقی کرتا چلا گیا۔ صحرا کی وہ ارواح خبیثہ جن کی ترغیبات کی روایتیں معبدے مجسمہ میں محفوظ تھیں، اس کے رقص میں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی تھیں اور اس کے اندازوں میں اپنا شیطانی افسوں پوری وضاحت سے پھونک رہی تھیں اس کی آنکھوں میں اس کی خناسی نظریں دہک رہی تھیں۔ اور اس کے نتھنوں سے اس کی سانس کی گرم بھاپ نکل رہی تھی۔

فرعون کے اندر خواہشوں کی موجیں عظمت اور بلندی اور غضبناکی میں بے پناہ بن گئی تھیں۔ اس کی کمر اور اس کی رانوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی تمام ہستی غلبہ کے ایک پھونک ڈالنے والے ارمان سے بھڑک رہی تھی۔ اس کا فرعونانہ جلال نرم گوشت اور لچکیلی ہڈیوں کی اس کمزور ہستی کو جو اپنی نوبلی حرکات اور البیلے اندازوں میں اجیت بن بن کر تھرک رہی تھی، اس سے زیادہ سرکش نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اعضا نے چیتے کی گھات کا انداز اختیار کر لیا تھا، یکلخت وہ ایک شیر کی سُرعت سے لپکا۔ اس کے بازوؤں نے اژدھے کا بل ڈال دیا اور ایک زہریلا ناگ بن کر انتقام کی پوری خونخواری میں رقاصہ کے ہونٹوں پر ڈسنے لگا۔ قدآدم ستاروں کے تار شدید دھڑکوں کے ساتھ ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور ذرا دیر کو ایک کانپتا ہوا سکوت طاری ہو گیا۔

اور پھر ایوان نشاط کا تیسرا تختہ ہاؤ ہو کے ایک فلک شگاف غل سے گونج اُٹھا جس میں خُموں کے مُنہ کھل گئے۔ قدحوں میں سے شراب اُبل اُبل کر گرنے لگی، مینا فرش پر لڑھکتے ہوئے دکھائی دینے لگے، رقاصہ لڑکیوں کی کلائیوں پر پنجے گڑ گئے اور ساقیوں کے دامن تار تار ہو گئے۔

لیکن یہ رنگ رس ابھی پورے طور پر بے قابو نہ ہونے پایا تھا کہ یکلخت کانسے کا ایک گھڑیال بجنا شروع ہوا۔ اور فرعون کے تخت کے پیچھے ایک منقش دروازہ رسم کے تکلّف و اہتمام سے کھول دیا گیا۔ چونکی ہوئی نگاہیں اس سمت کو اُٹھیں تو دیکھا کہ غضب آلود پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورتی خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہو رہا ہے۔

غل گھٹنے لگا اور گھٹتے گھٹتے نابود ہو کر رہ گیا۔ تامّل آمیز سکوت میں جب خدّام ممی کو اُٹھائے اُٹھائے نوجوان فرعون کے مہمانوں کے سامنے چپ چاپ تھم تھم کر گھومنے لگے تو پروہت پکار پکار کر کہنے لگا "انجام ہستی کو دیکھو اور ان ترغیبات سے احتراز کرو جو تمھارے حواس کو فریب پر لا کر تمھیں بھلا دیتی ہیں کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حیات ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دے گا۔

پروہت کی آواز جیسے اہرام کے اندر سے گونج گونج کر نکل رہی اور ہڈیوں میں نفوذ کرتی چلی جا رہی تھی۔ مورتی کے سامنے آتے

ہی لرزہ براندام مہمانوں کے رنگ پیلے پڑ گئے اور حلق سوکھ کر رہ گئے۔ ہیبت نے دلوں کو دہلا دیا اور عبرت آفریں خاموشی میں نظروں کے اندر سے استغفار کی پَو پھٹنے لگی۔

فرعون اپنی بوجھل اور عطر پاش خود فراموشی سے چونک اُٹھا تھا۔ رقاصہ اس کے بازو پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اپنے تمام جسم میں ایک پیاسا اور مضطرب لیے ساکت تھا۔ پروہت کے الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں شائیں شائیں کر رہی تھی۔ اور اس گونج میں ایک ہیبت کا سایہ اس کے دل پر اُترتا آرہا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی نظر مورتی پر پڑی۔ جسے خدام کے کندھے احترام کی آہستگی اور خاموشی میں اُٹھائے لیے آرہے تھے۔ اس نے خوف آلود پس و پیش سے نظریں اُٹھائیں۔ اور آسیرس کی مورتی کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسیرس کے ساکت و جامد چہرے میں اس کے اپنے خط و خال اُبھرتے چلے آرہے ہیں زندگی کی روانی سے منقطع۔ موت کی چیرہ دستی سے مغلوب۔ انجام ہستی کے شدید احساس نے یک لخت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ ایسے چہرے اور اس بے بسی کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں اور دلآویزیوں کو الوداع! مقبرے کے دروازے کا خاموش اور مہیب اور درد انگیز راستہ! وہ راستہ جو صرف جاتا ہے اور واپس نہیں آتا۔

اچانک اس کے بازوؤں میں پڑی ہوئی رقاصہ اپنی مدہوش غفلت میں کراہی اور فرعون کی متامل نگاہیں اس کے چہرے پر مچل گئیں۔ اس کے نمناک ہونٹ ایک شیریں آرزو میں کھلے ہوئے تھے۔ اس کے نازک نتھنوں سے ارمانوں کے لمبے لمبے اور رُکتے ہوئے سانس نکل رہے تھے۔ اس کی بھیگی ہوئی پتلیوں میں تشنہ تمنائیں گم تھیں۔ وہ سب کچھ تھا جو یہ مختصر اور عارضی اور اپنی جگہ گا ہٹوں میں بھاگتی ہوئی دُنیا اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور اس کا خون بجلیوں کی طرح اس کے دماغ میں تڑپ تڑپ کر پوچھنے لگا۔ اس کو تیاگنا، اس سے منہ موڑ لینا اس سربستہ مسرت کے دروازے پر سے ترستی ہوئی روح لے کر لوٹ جانا! کیوں؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اس زندگی کے آگے آخرت کا سفر درپیش ہے کسی روز شاید کل۔ شاید اسی وقت۔ اس لئے کہ جب روح اس سفر میں ہو گی تو یہ جسم اس ممی سے مشابہ ہو جائے گا خشک اور سرد اور بے رنگ اور بے حس۔ ان تمام شیریں ارمانوں سے محروم جو رگوں کے تاروں سے نغمے نکالتے اور اس کے ساتھ لہک لہک کر گاتے ہیں۔ صرف ایک تودہ۔ ایک لوتھ۔ ایک ڈھیر۔ جس کی رعنائیاں اور رونقیں۔ جس کی گرمیاں اور بجلیاں جس کے میلان اور ارمان اس نورانی عالم کا تمام حاصل۔ اس حسین دُنیا کی ساری متاعِ عزیز بھی فنا ہو کر رہ جائے گی۔

اس نے بے قرار ہو کر پروہت پر نظر ڈالی۔ جس کی ملامت سے اُبلتی ہوئی نظریں اپنے اقتدار کی جراحت اور اپنی بے بسی کے ضعف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے فریبی اور دغا باز اور ملعون و مردود و فرار دے رہی تھیں۔ مایوسی اور برافروختگی کے شدید اعلان میں وہ نوجوان فرعون کو اپنے تمام وقار اور جلال سے عجیب طرح خالی نظر آرہا تھا۔ اپنے زہد و اتقا میں خشک اور کم ظرف، اپنی ناتجربہ کاری میں ادنیٰ و جاہل۔ جذبات کی بلند آہنگ نمائش نے تکلف و تقدس کی عبا اس کے شانوں پر سے گرا دی تھی اور وہ اپنی عریانی میں ایک بازاری انسان بن کر نظر آرہا تھا۔ جس کی گردن کی رگیں پھول سکتیں اور جس کا منہ غیظ و غضب سے کف آلود ہو سکتا تھا۔ جس میں نہ زندگی کی پیچیدگی کی سمجھ تھی اور نہ موت کے اسرار کی فہم — جو محض ایک پیشہ ور تھا اور اپنے پیشہ کے فروغ کے لئے دلوں میں اوہام و وساوس پیدا کر رہا تھا۔

نوجوان فرعون پروہت کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اپنے سرکش اور باغی نفس کو اس کی گرفت سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اس باغی نفس کو جو رقاصہ کے نرم جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پا رہا اور اپنے طغیان میں مقسوم سے بھی نبرد آزما ہونے کا بل حاصل کرتا جا رہا تھا۔

"مرتضےٰ خاں بڑوں کے معاملے میں چھوٹے دخل نہیں دیا کرتے"

یہ فقرہ احساس برتری کی اسی مخصوص حالت میں کہا گیا تھا۔ گویا مرتضےٰ خاں جیسے صادق دوست کے ذرا سے اکسانے پر وہ اپنے راز کو فاش کر دیگا ۔

مرتضےٰ خاں نے مصنوعی اشتیاق سے لبریز آواز میں سوال کیا "کچھ اتا پتا تو دو۔"

حیات خاں نے اپنی ظاہری معلومات کو ایک معنی خیز مسکراہٹ میں تبدیل کر کے دبی آواز سے پوچھا "تم کیا اندازہ لگاتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں"۔ "یہی تو وجہ ہے کہ تم ابھی تک سپاہی کے درجے سے نہیں بڑھے مردِ خدا فوج میں ترقی کرنے کے لئے مضبوط بازوؤں کے علاوہ عقل کی بھی ضرورت ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں بازوؤں کے بلّوں کی طرف شادماں نظر سے دیکھا اس کا چہرہ خوشی کے ایک ناگہاں سیلاب سے تمتما اٹھا۔ اُسے اس قدر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی ایک جرنیل کو گھمسان لڑائی جیتنے پر بھی نہیں ہو سکتی۔ مرتضےٰ خاں نے ایک ادائے تسلیم سے ان نشانوں کو ترقی کا ایک اعلیٰ ترین ثبوت سمجھتے ہوئے ان کی طرف رقابت کی ایسی حریص نگاہوں سے دیکھا کہ حیات خاں کے سمندِ غرور کو مہمیز ہو گئی۔ اس نے اپنی کارروائی کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے تہیہ کر لیا۔ کہ اپنے بچپن کے اس رفیق کو جس سے وہ بلند رتبہ ہونے کے باوجود برابر کا برتاؤ کرتا تھا اپنی معلومات سے فائدہ پہنچا کر رہے گا اس نے اپنی آواز کو اور زیادہ دبا کے اور اپنی آنکھوں میں ایک مبہم اور تاریک جذبہ مشتعل کر کے مرتضےٰ خاں کے کان میں کہا "دیکھتے نہیں ہمارا بہادر سردار کتنا سہما ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کبھی موقعہ پر کبھی نہیں گھبرایا۔ مگر ان دنوں اس کے انداز سے بھی پریشانی برستی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چونکا ہو جاتا ہے اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ رات کو خاص طور پر دو سپاہی اس کے خیمے کے آگے متعین کئے جاتے ہیں اور اس وقت دن کو بھی ہم دو گھنٹہ سے اس کے خیمے کے آگے کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں۔ ان باتوں سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ گویا زیادہ کہنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔

"کیا نتیجہ نکلتا ہے؟"

حیات خاں نے چاروں طرف دیکھا اور دل کو پورا پورا اطمینان دلا کر کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ اپنے رفیق کی حماقت پر دل ہی دل میں لعنتیں بھیجتے ہوئے ناراضگی سے کہا "کہ چپ رہو کہیں کوئی سن لے گا تو کھال اُدھڑوا دی جائے گی"

مرتضےٰ خاں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور حیات خاں کی سپاہی منش خصلتوں کو بھڑکانے کے لئے کہا "تم کسی بات سے ڈرتے ہو"؟

حیات خاں نے تیز ہو کر جواب دیا "اچھا تو لو سنو۔ ہمارے سردار کو جان کا خطرہ ہے۔"

"جان کا خطرہ" مرتضےٰ خاں کو اس بات کی امید نہ تھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں اس کی اپنی جان کی نسبت ایسی پیشینگوئی کی جاتی تو وہ پروا بھی نہ کرتا، مگر ان کا سردار ہر دلعزیز سردار جس کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار تھا، اس کی نسبت ایسی خبر سن کر وہ بجھا بجھا سا ہو گیا، پھر اس نے اپنے دل میں ایک خوفناک مگر مستقل ارادے کے خاکے کو محسوس کیا۔ اور اسی جذبہ کو نشو و نما پاتے دیکھ کر اس کا ذہن خوشی سے معمور ہو گیا۔ اس نے اپنے سپاہیانہ انداز میں ایسے سکون سے جس کے بین السطور میں خوفناک جذبات کی شورش متحرک تھی۔ پوچھا "اُسے کس طرف سے خطرہ ہے"؟

"ایک عورت کی طرف سے"۔

مرتضےٰ خاں نے صورت حال کو سمجھنے کے لئے اپنے دماغ کو صرف کاوش کر کے ایک نتیجہ پر پہنچتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں حقیقت کے سمجھنے کا اظہار کیا۔

"جبھی ہر آنے جانے والی عورت کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ہر ایک طوائف کی نسبت اطمینان کیا جاتا تھا۔"

"ہاں"

مرتضےٰ خاں نے اپنے سردار کے خیمہ کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا، اندر سے بلند قہقہوں کی آواز آرہی تھی کبھی کبھی آوارہ ہوا اپنے دوش پہ شراب کی ناخوشگوار اور تیز بو کو بھی لے آتی۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اندر محفل نشاط گرم ہے۔ اب شام ہوچکی تھی۔ پہاڑی ریگستان کی خوش نما اور شاعرانہ شام جو ہر ایک شے پہ کسی مہیب اور مافوق الفطرت پرندے کے سیاہ آبنوسی پروں کی طرح چھا جاتی ہے۔ تاریکی لمحہ بہ لمحہ گہری ہورہی تھی، خیموں میں چراغ روشن ہونے لگے۔ سپاہی جو گرمی کے مارے خیموں میں ایک عارضی اور غیر مطمئن پناہ تلاش کررہے تھے۔ اب باہر نکل آئے۔ جنگل میں منگل ہوگیا۔ مرتضےٰ خاں اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ اُسے اپنے قریب کئی قدموں کی چاپ سنائی دی اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو چند آدمی ایک خوشنما فینس کو اُٹھائے آرہے تھے۔ جس کا وجود وہاں حیرت انگیز تھا۔ فینس کے آگے چند کم عمر چھوکرے شمعیں ہاتھوں میں لئے ہوئے سبک خرامی سے چلے آرہے تھے۔

دونوں نے پُراشتیاق نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ فینس خیمے کے قریب آکر ٹھیر گئی۔ ایک چھوکرے نے بڑھ کر حیات خاں کو صحیح طور پہ افسر سمجھتے ہوئے نہایت سلیس لہجہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا "کیا سردار شبیر علی کا خیمہ یہی ہے"

"یہی ہے مگر تم کیا چاہتے ہو"

چھوکرے نے فینس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ یہاں کی مشہور طوائف لیلےٰ ہیں، انہیں آج سردار صاحب نے پورے آٹھ بجے طلب فرمایا ہے"

"اچھا ٹھہرو۔ میں سردار صاحب کو خبر کرتا ہوں"

حیات خاں خیمہ کے اندر گیا۔ اور واپس آکر سیدھا فینس کے قریب جاکر بولا "بی صاحبہ آپ کو تکلیف تو ضرور ہوگی۔ مگر کم از کم رسماً میرا فرض ہے کہ میں آپ کی تلاشی لے لوں"

پردوں میں سے ایک سُریلی آواز آئی "کیا وجہ؟

"سردار صاحب کا حکم"

"اچھا میں حاضر ہوں"

حیات خاں نے پردے اُٹھائے۔ وہ حقیقت میں ایک خوبصورت عورت تھی۔ بلند و بالا شاہانہ انداز اور رعب رکھنے والی ایک ہلکے سے لباس میں ملبوس تھی۔ اُس نے ایسی مسحور کن نگاہوں سے حیات خاں کی طرف دیکھا۔ جس طرح صرف ایک عورت ہی مرد کی طرف دیکھ سکتی ہے۔

"اچھا اپنا کام شروع کیجئے"

"میں آپ سے پھر معافی مانگتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر چارہ نہیں"

اُس نے اپنے مرمریں ہاتھ اپنی گردن پہ رکھ کر حیات خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور کہا "معافی مانگنے کی ضرورت نہیں یہ تو آپ کا فرض ہے"

حیات خاں کو ڈر تھا کہ وہ اس کی مدافعت کرے گی۔ اس مغلوبیت کی ادا نے اس کی تمام بدظنی کو دور کرنے کے علاوہ اسے مسحور کرلیا۔ اس نے اپنے تجربہ کار ہاتھوں کی چار پانچ جنبشوں سے اس کے لباس کے تمام سلوٹوں کو ٹٹول کر اطمینان کرکے کہا "جائیے مگر مجھے بھول نہ جائیے گا"

"آپ نے مجھے بڑی تکلیف سے بچایا ہے۔ میں کبھی آپ کو بھول سکتی ہوں"

فینس بالکل خیمہ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کہ لیلےٰ نے اپنا سر پردوں میں سے نکال کر حیات خاں کی طرف دیکھا، جس کی حریص نگاہوں سے اس کے چہرے پر ذلت کی سرخی دوڑ گئی۔ اور خوشامدانہ لہجہ میں کہا "حوالدار صاحب میری ایک پیش خدمت پیچھے آرہی ہے اُسے بے روک ٹوک اندر آنے دینا اس کے پاس میری چند ضروری چیزیں ہیں"۔

حوالدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "مطمئن رہیئے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا"۔

"شکریہ"

لیلےٰ کے رسیلے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے فتحمندی کا ایک زہریلا تبسّم کھیلنے لگا۔ مگر فوراً ہی اس کا سر مخمل اور ریشم کے خوش نما زرتار پردوں میں چھپ گیا۔ فینس خیمہ میں داخل ہو گئی۔ مگر حیات خاں اسی طرح مخمور نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

۲

نفیس ولطیف پھولوں کے دھوئیں نے خیمہ کی محدود ہوا میں ایک تیز و تند خوشبو کا اضافہ کر دیا تھا۔ بیش قیمت ایرانی فرش پر جس کی ہر سلوٹ عیش کی دراز دستیوں کا پتہ دیتی تھی۔ شراب کے تازہ داغ موجود تھے۔ جابجا ارباب نشاط اپنے اپنے سازندوں کو ساتھ لئے بیٹھی تھیں۔ کوئی اپنی شمعی انگلیوں سے پاندان کھولنے میں مصروف تھی۔ کوئی کسی خوشگوار لطیفہ پر اپنی آواز کے سُریلے پن کو ایک جھوٹے قہقہہ کے لوچ میں ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

لیلےٰ بظاہر دوپٹے کے ایک شکن کو درست کرتے ہوئے مگر حقیقت میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

سب نے سر اُٹھا کر نووارد کی طرف ایک خاص نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ لیلیٰ نے تھوڑا عرصہ بیٹھ کر اپنے پیش خدمت کو ایسے انداز تحکمانہ اور شان رعونت سے آواز دی اور ایسی دھیمی اور سُریلی آواز میں پانی لانے کے لئے حکم دیا۔ کہ طوائفوں نے حقارت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اب لیلیٰ کا بے پناہ اور سحر ساز حسن ایک ایشیائی لمپ کی لطیف روشنی میں اپنی پوری خیرہ کن عریانی میں ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں رقابت کی چمک اور چہروں پر انفعالی کی سرخی دوڑ گئی، لیلیٰ نے اپنی اس بے باک فتح کو دیکھ کر دل میں طمانیت کی ایک گہری سانس لی، مگر ظاہر میں ایک بے پروائی کے انداز میں آنکھیں جھکا لیں، وہ مسرور تھی، کہ وہ اپنے حسن سے اپنی ہم جنسوں تک کو مرعوب کر رہی ہے۔ اور اب اس کیلئے ایک کام باقی تھا۔ سردار کو بھی اپنے حسن سے مغلوب کرنا۔

یہ تمام محفل گرم تھی۔ لیکن سردار شیر علی کا دل سرد تھا۔ وہ خیمہ کے آخری سرے پر دو مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے خاموش اس منظر کو دیکھ رہا تھا ایسی گہری سوچ میں کہ اس کی آنکھیں بغیر کسی شئے کا جائزہ لئے ہوئے گویا خیمہ کے پردوں میں سے نکل کر دُور کسی اور منظر میں مصروف تھیں۔ وہ ایک کریہہ المنظر شخص تھا۔ ایک سپاہی منش خصلت سے ممیز جس کے بازو اور طبیعت کئی لڑائیوں میں کام آ آ کر فولاد کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ ایک تین چار سال کا بچہ خیمہ کا پچھلا پردہ اُٹھا کر داخل ہوا۔ لیکن وہ اس شیطانی ہجوم سے کچھ گھبرا گیا۔ کیونکہ اس نے شیر علی کے دائیں بازو کو اپنی ننھی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے توتلی زبان میں کہا "ابا! ابا!" شیر علی اس آواز کو سن کر اس طرح چونکا جس طرح اچانک کسی شخص کا پاؤں ایک زہریلے سانپ پر جا پڑے اُس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں دفعتاً پُرآب ہو گئیں بچے کو گود میں اُٹھا کر وہ اُسے پیار کرنے لگا۔ بچّے نے اپنی معصوم نگاہوں سے شیر علی کی طرف پیار سے دیکھنا شروع کیا۔

لیلےٰ جس کا رنگ سُرخ سے زرد اور زرد سے سفید ہو گیا تھا۔ دزدیدہ نگاہوں سے اس منظر کی طرف دیکھ رہی تھی، اور دیکھتی رہی جب تک بچّہ شیر علی کی گود سے اُتر کر پھر دُوسرے خیمہ میں نہ چلا گیا۔

حیات خاں اور مرتضےٰ خاں باتوں میں مشغول تھے، کہ ایک عورت جو اپنی تراش خراش سے پیش خدمت معلوم ہوتی تھی۔ لپکی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نقرئی پاندان تھا جسے طرح طرح کے نقوش سے مزین کیا گیا تھا، وہ خیمہ میں جانا چاہتی تھی۔ مگر حیات خاں نے بڑھ کر روکا۔
حیات خاں کے کرخت ہاتھوں کی گرفت کو محسوس کر کے اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ایک دیوانہ وار کوشش کی۔ اور اپنی کمزوری سے مایوس ہو کر ایک دلدوز چیخ ماری۔

حیات خاں نے کڑک کر کہا "کون ہے تو چڑیل"

عورت نے جس کا رنگ لمحہ بہ لمحہ اُڑتا چلا جاتا تھا، گلوگیر آواز میں جواب دیا "میں لیلےٰ کی پیش خدمت ہوں۔" اس کی سُرمگیں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

حیات خاں ہنس پڑا۔ اور اُس کا بازو چھوڑ دیا۔ "جاؤ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
پیش خدمت نے نیم تبسم سے حیات خاں کی طرف دیکھا اور خیمہ کے اندر چلی گئی۔ مرتضےٰ خاں بھی جس کے دماغ میں ایک نئی تجویز کا خاکہ گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا اس کے پیچھے دبے پاؤں چل پڑا۔

لیلےٰ ناچ رہی تھی اس کے مشتاق پاؤں کے ساتھ بندھے ہوئے گھونگرو دلوں کے گہرائی میں موسیقی کی جھنکار پیدا کر رہے تھے۔ طوائفوں کا گروہ اس کی طرف دیکھ کر اپنی کم مائیگی کو ایک حاسدانہ ہنسی میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں میں غرور کی تمام تمکنت حسن کی تمام کشش جوانی کی تمام مستی کو لے کر ایک بہتے ہوئے سیل کی طرح آگے بڑھی۔ اپنے مرمریں جسم کو جس کی صباحت ململ کے کپڑوں سے پھُوٹ نکلی تھی۔ موسیقی کے ہر ایک تال پہ سبز شاخ کی طرح لچکاتے ہوئے آگے بڑھی اُس نے تمام خیمہ کا تیزی سے چکر لگایا اور چشم زدن میں وہ شبیر علی کے سامنے تھی۔
شبیر علی کی آنکھیں لیلےٰ سے ملیں اور اُس نے اس ناچتے ہوئے رنگ و بُو کے پیکر میں کسی بھُولے ہوئے زمانہ کی یاد کو منعکس دیکھا وہ بھی آنکھیں پھاڑے ہوئے سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ لیلےٰ کی پیش خدمت داخل ہُوئی۔ اور لیلےٰ فوراً اپنے گھونگرؤوں کی جھنکار کو کانوں میں چھوڑتی ہوئی پھر اپنی جگہ پہ جا کر بیٹھ گئی۔

شبیر علی غور سے لیلےٰ کی طرف دیکھ رہا تھا مگر آخر کار اُس نے چونک کر آواز دی "سہیل خاں" "حضور حاضر"
جواب دینے والا خود بھی آ پہنچا۔ وہ ایک مکاری کا پتلا معلوم ہوتا تھا۔ دبلا پتلا کوتاہ قد و کوتاہ گردن، تنگ پیشانی چھوٹی چھوٹی آنکھیں وہ مسکرانے لگا۔

شبیر علی نے سرگوشی سے پوچھا "سب انتظام مکمل ہے نا؟"
"پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"
تلاشی کوئی معتمد آدمی لیتا ہے؟" یہ سوال ذرا گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا گیا۔
تلاشی حیات خاں لیتا ہے۔ جو فوج میں سب سے زیادہ بیوقوف اور آپ کا سب سے زیادہ خیر خواہ نوجوان ہے"۔
شبیر علی کے لب ایک مسکراہٹ سے آشنا ہُوئے۔ اور اُس نے گویا کسی نو پیدا شدہ شبہ کو ذہن سے بالکل دُور کر دیا۔ کیونکہ اُس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "اچھا تم جا سکتے ہو"
سہیل خاں تین دفعہ تسلیم بجا لایا۔ اور اُلٹے قدموں واپس گیا۔
لیلےٰ پھر اُٹھی گویا فتنہ خوابیدہ پیدا ہُوا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ہلال نما لکڑی کا نیام تھا۔ جو پیش خدمت نے اسی وقت ایک نقرئی پاندان سے نکال کر دیا تھا۔ ناچتے ہوئے لیلےٰ نے اسے اپنی باہوں پر اُچھالا۔ اور پھر ایک رنگین تیتری کی طرح نہایت تیزی سے ایک چکر لے کر ہاتھوں پہ

سنبھال لیا۔ فنِ رقص کے اس کمال سے وہ ہر ایک کو متحیر کرتے ہوئے شیر علی کی طرف تیزی سے بڑھتی گئی۔ دس دس قدم کے بعد وہ ناچ کے دوران میں کورنش کے لئے جھک جاتی دائیں ہاتھ سے نیام کو ہوا میں اچھالتی۔ اور وہی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر جھک کر بائیں ہاتھ سے گرتے ہوئے نیام کو روکتی وہ تیزی سے بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ شیر علی کے عین مقابل میں آ پہنچی۔ شیر علی دنگ ہو کر لیلےٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک لیلےٰ نے نیام ہوا میں اچھالا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح حرکت دی کہ ہوا سے نیچے آتے وقت نیام کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ لیلےٰ پھر کورنش کے لئے جھک گئی۔ اور اب وہ نوں ٹکڑوں کی جگہ لیلےٰ کے بائیں ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا آبدار خنجر تھا۔ خنجر ایک لمحہ میں شیر علی کے دل میں اتر جاتا کہ یکایک خیمہ کا ایک حصہ جو لیلےٰ سے بالکل قریب تھا۔ تلوار کی تیز دھار سے چاک کیا گیا۔ اور مرتضےٰ کی زبردست گرفت نے لیلےٰ کا ہاتھ ہوا ہی میں روک دیا۔

شیر علی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیلیٰ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

۳

دوسرے دن لیلےٰ کا کورٹ مارشل ہوا۔ ایک خیمہ ضروری سامان سے آراستہ کر دیا گیا۔ صدر میں شیر علی دائیں طرف مرتضےٰ خاں لیلےٰ کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے وقوفانہ وقار سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

سامنے سپاہیوں کے ایک دستے کی حراست میں لیلےٰ کھڑی تھی، اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ مگر وہ مدافعانہ آنکھوں سے شیر علی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

شیر علی نے ہر ایک قسم کے جذبہ سے خالی آواز میں کہا "صاحبان کیا مجرم کے بیان شروع ہوں"۔

مرتضےٰ خاں اور حیات خاں نے کہا "ہاں"۔

لیلےٰ کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی اور پھر شیر علی نے جو اس وقت اپنے نافذ کردہ اصول کے مطابق خود ہی منصف اور خود ہی مدعی تھا۔ لیلےٰ کی طرف دیکھ کر کہا کہ :۔

"کیا وجہ ہے کہ تمہیں موت کی سزا نہ دی جائے"۔

"وجہ تم جانتے ہو۔ مگر میں اس کی آگاہی کے لئے گذشتہ سال کے واقعات کی اجازت طلب کرتی ہوں"۔

شیر علی نے پھر پوچھا "صاحبان آپ کو کوئی اعتراض ہے"۔

پھر مرتضےٰ خاں اور حیات خاں کے منہ سے نکلا "کوئی نہیں کوئی نہیں" اور خاموشی چھا گئی۔

"دو سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں ایک دوشیزہ تھی۔ میری پرورش عشرت اور گناہ کے درمیان ہوئی۔ لیکن میرا دل تمام خارجی تاثرات سے آزاد رہا۔ میری بوڑھی ماں جو اپنے زمانے کی ایک جہاں دیدہ طوائف تھی، اپنی محنتوں کو اس طرح اکارت جاتے ہوئے دیکھ کر گھبرا اٹھی مگر سب بیہود ثابت ہوا۔ گناہ کے اس مہیب عشرت کدہ میں جہاں میری ماں بڑے سے بڑے داؤں لگانے والوں کے ہاتھ حسن کو بیچ دیا کرتی، میں ہراثہ سے بے نیاز رہی۔ بڑے بڑے رئیس زادے جو ہزاروں روپے میرے ایک تبسم کی قیمت دینے کے لئے تیار تھے واپس جاتے تو میری ماں کا دل بہت کڑھتا۔

وہ مجھے سمجھاتی "بیٹا اوپر کے دل سے ان کی خاطر داری کیا کرو۔ یہ تو ہمارا پیشہ ہے"۔ لیکن اس بات پر میں بگڑ کھڑی ہوتی۔ اور وہ یہ سمجھ کر چپ ہو جاتی کہ شاید کسی دن مجھے عقل آ جائے۔ بہت عرصہ یہی حالت رہی اور ہمارے دلوں کے درمیان جو خلیج تھی۔ وہ گہری ہوتی چلی گئی۔ ماں بیٹی کی قدرتی محبت بھی اس خلیج کو عبور نہ کر سکی۔ آخر کار ہمارے دلوں میں ایک خفیہ لڑائی چھڑ گئی۔ ظاہر میں ہم نہایت میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے، مگر

نفرت کا کڑوا بیج پرورش پا رہا تھا۔ وہ غالباً اس کوشش میں تھی کہ مجھے کسی رئیس زادے کے پاس اونے پونے بیچ ڈالے مگر ناکام ہو کر اب اس نے ایسی باتوں کا تذکرہ ہی چھوڑ دیا۔

میں بھی بیکار نہیں تھی، ہمارے یہاں آنے جانے والوں میں ایک غریب نوجوان بھی تھا۔ جس کی شرافت اور محبت افلاس کے بادلوں میں ستارے کی طرح چمکتی تھی۔ اس کی شریفانہ گفتگو اس کے مہذب اطوار رفتہ رفتہ مجھے ایک نامعلوم کشش سے کھینچنے لگے۔ رفتہ رفتہ میں بالکل بے بس ہو گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں اور خوبصورت چہرے نے مجھے مسحور کر لیا۔ آخر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

دیر کرنا خطرناک ثابت ہوتا۔ ہم نے بہت جلد خفیہ نکاح پڑھوا لیا اور میں اپنی ماں کی دوربین نظروں سے بچ کر بھاگ نکلنے کا موقعہ تلاش کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں بلی کی طرح میری ہر حرکت کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی مکاری کو بھگا دے کر نکل جانا آسان نہیں۔ میری چھوٹی سے چھوٹی بات اس کے زیر نظر تھی۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ اسی اثناء میں میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میری ماں نے اس پہ بہت واویلا مچایا مگر کیا ہو سکتا تھا لڑکا میرے خاوند اسمٰعیل کے سپرد کر دیا گیا۔

جیٹھ کی ایک سہانی صبح تھی، اور میں ایک دھانی جوڑا پہنے ہوئے کھڑکی میں بیٹھی تھی، ہمارے دروازہ پہ ایک شاندار ٹمٹم آکر رکی اصیل گھوڑے باگ کی ایک غیر معمولی سختی سے سر کو بلند کئے ہوئے نتھنے پھلائے زمین پہ پاؤں مار رہے تھے۔ گاڑی سے ایک پستہ قد دبلا پتلا آدمی اترا اور ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ میری ماں کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف رہی پھر میرے قریب آکر پرتبسم نگاہوں سے بولی: "بیٹی تمہارے لئے ایک جگہ سے پیام آیا ہے تم ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔"

میں چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ آنے کو تو میں آ گئی۔ لیکن میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، کبھی کبھی کوئی لفظ سنائی دیتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے یہ لفظ سنائی دیئے: "بیشمار دولت" "بہت دور" لیکن میں ان الفاظ میں کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ شاید وہ کسی خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔ جو بہت دور تھا یا کسی ناچ مجرے کا ذکر تھا جس میں بے شمار دولت ہاتھ آنے والی تھی، اسی ادھیڑ بن میں کھڑے کھڑے میرے گھٹنے تھک گئے۔ پنڈلیوں میں درد ہونے لگا۔ میں واپس آنے کو تھی کہ یکایک میں نے اپنی ماں کو غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کچھ کہتے ہوئے سنا۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ مجھے ایک آواز سنائی دی۔ جو بظاہر میری ماں کی معلوم ہوتی تھی۔

"مجھے منظور نہیں..........."

میں نے اتنے ہی لفظ سنے۔ پھر یوں معلوم ہوا گویا کسی نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ ایک بار چپ ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، گویا نووارد اسے سمجھا سمجھا کر دھیمی سنجیدہ آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔

مجھے پھر اپنی والدہ کی آواز سنائی دی: "میں جو ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے منظور نہیں۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی: "بہت اچھا۔"

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، نووارد آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترا اور گاڑی پہ جا کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحہ میں کوچبان نے سڑاک سے ہنٹر مارا۔ اور اصیل گھوڑے دھاک دھاک کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بہت عرصہ تک نظر سے غائب ہو جانے والی گاڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ میرے دماغ میں "بے شمار دولت" "بہت دور" کے فقرے نوکِ نشتر کی طرح چبھ رہے تھے آخر کار میں نے منہ موڑا تو اپنی ماں کو پشت پر پایا۔

میں نے اشتیاق سے پوچھا: "اماں کیا بات تھی؟"

اُس نے جواب دیا "کچھ نہیں تمہارے لئے ایک رئیس زادے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ مگر میں نے رخصت کر دیا۔"

زیادہ کرید کرید پوچھنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ میں خاموش رہی۔ عید کی چہل پہل میں یہ بات میرے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد جب گرم گرم سوئیوں کی پلیٹ میرے سامنے آئی۔ میں نے فکر سے آزاد ہو کر خوب جی بھر کے کھائیں۔ لیکن سوئیاں کھاتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے فوراً دھوکے کا شبہ ہوا۔

میں نے اپنی ماں کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا "اماں تم نے مجھے کیا کھلایا؟"

اُس نے جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ میں اُسے مارنے کے لئے اُٹھی مگر مجھے ایک چکر آیا، اور میں بے ہوش ہو کر کمرے میں گر پڑی۔ جب مجھے ہوش آیا۔ میرے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ کمر شدت سے دُکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ میرے چاروں طرف تاریکی مسلط تھی۔ میں نے چاروں طرف سہارے کے لئے ہاتھ مارے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی گہرے کنوئیں میں گری جا رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ میرے چاروں طرف سیاہ ریشمی پردے تھے۔ میں نے آہستہ سے ایک پردہ اُٹھا کر دیکھا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک اونٹ پر کجاوے میں سوار ہوں اور اسی کے ہچکولوں سے میرا بدن چور چور ہو رہا ہے۔ میں پھر لیٹ گئی۔ میرے اردگرد گھوڑوں کے سموں کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے تعجب سے پھر پردے اُٹھا کر دیکھے۔ ایک طرف دُبلا پتلا شخص تھا۔ دوسری طرف ایک نہایت تنومند نوجوان آدمی تھا۔ جو ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھا۔"

لیلےٰ یہاں رُک گئی۔ پھر شبیر علی کی طرف دیکھ کر بولی کیا "اُن دونوں آدمیوں کے نام بتانے کی ضرورت ہے؟"

شبیر علی نے جواب دیا "ہاں جس تنومند نوجوان کا تم ذکر کر رہی ہو وہ میں تھا۔ اور ابھی وہ دُبلا پتلا شخص بھی آ جاتا ہے" یہ کہہ کر شبیر علی نے آواز دی "سہیل خاں"۔

سہیل خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

لیلےٰ نے اس کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں یہی ہے" پھر اُس نے اپنا بیان شروع کیا۔

"ایک نہایت لق و دق بیابان سے ہوتے ہوئے ہم آخرکار منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اور مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔"

لیلےٰ نے مرتضےٰ خاں اور حیات خاں کو جو اس تمام بیان سے متاثر ہو کر دل ہی دل میں لیلےٰ کے طرف دار ہو گئے تھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اسی رات آپ کا سردار میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا اور میری مسہری پر بیٹھ گیا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مگر اُس نے میرے منہ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف پھیر لیا اور پُر زور آواز میں کہا۔ "میری جان محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔"

میں نے سہم کر گردن جھکا لی۔

اُس نے پھر کہا۔ "دیکھو میں تمہارے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ مر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں تیس ہزار روپیہ دے کر خریدا ہے۔ سمجھیں میں نے تیس ہزار! مجھ پر رحم کرو۔ اُف اُف میری طرف ان آنکھوں سے نہ دیکھو۔ ان سے آگ برستی ہے۔"

وہ پھر میری طرف بڑھا۔ مگر میں نے اس کو روک کر کہا "خاموش! تم نہیں جانتے کہ تم ایک بیاہی ہوئی عورت سے گفتگو کر رہے ہو" اس کا رنگ فق ہو گیا، اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بیاہی ہوئی۔ بیاہی ہوئی یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں بیاہی ہوئی تمہیں دھوکا دیا گیا۔ تم مسلمان ہو۔ اس پاک رشتہ کی عزت کرو۔"

تھوڑا عرصہ وہ خاموش بیٹھا میری طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک بڑھ کر میری طرف آیا اور میری گردن کو دبا کر بولا "بتاؤ

کون شخص ہے میں اُسے قتل کر کے تمہیں اس پاک رشتے سے آزاد کر دوں گا۔"

میرا گلا بند ہو گیا۔ میری آنکھیں باہر نکل آئیں میرے منہ سے ایک چیخ نکلی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور نرم آواز میں بولا "اف پیاری میں نے تم پر بہت ظلم کیا۔ اچھا آئندہ سے میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ مگر تمہیں رہنا یہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہ بتاؤ گی کہ تمہارا خاوند کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ تمہیں چھٹکارا نصیب نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد وہ روز رات کو میرے پاس آتا رہا۔ وہ مجھے سمجھاتا۔ اس کی آواز جذبات کے وفور سے بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے کہتا "لیلٰے لیلٰے تم کسی مجہول الاسم خاوند کے لئے موزوں نہیں آہ تم ایک فوج کی تمام عظمت تمام شوکت تمام سرداری کو اپنے قدموں میں دیکھنا چاہتی ہو تو دیکھو۔" یہ کہہ کر وہ میرے قدموں پر گر جاتا۔

لیکن میں اسے ٹھکرا دیتی۔ ہاں اس طرح ٹھکرا دیتی۔ جس طرح ایک شہزادی اپنے ذلیل سے ذلیل نوکر کو اپنے حنائی پاؤں کی ایک رنگین ٹھوکر سے ٹھکرا دیتی ہے مگر اب اس کی سفاکی اور خونخواری جاتی رہی۔ وہ ایک وفادار کتے کی طرح میری ٹھوکریں کھا کر میرے پاؤں میں پڑا رہتا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس کی سفاک سپاہیانہ اور گہری محبت مجھے متاثر کرنے لگی مگر میں نے اس گنہگارانہ خیال کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہ پکڑنے دی۔ میری دلی کوفت دن بدن ترقی پر تھی۔ میں حیران تھی۔ کہ اسمٰعیل ابھی تک میرا پتہ کیوں نہیں لگا سکا۔ محبت میں تو وہ طاقت ہے کہ پہاڑوں کو پانی کی طرح بہا دے کیا اسمٰعیل تھک کر بیٹھ رہا ہے۔ کیا اس کی محبت عارضی اور جھوٹی تھی۔ میں نے تو اس کے لئے بہت بڑی قربانی کی تھی۔ مگر آہ مرد عورتوں کی قربانیوں کو اپنی مردانگی کا خراج سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی خیالات میں ایک رات میں اپنے وسیع اور شاندار کمرے میں بیٹھی تھی، ہاں اسی طرح بیٹھی تھی، جس طرح کوئی آزاد اور وحشی پرندہ سونے کے ایک خوشنما قفس میں بیٹھا ہو۔ کمرے کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہوا کسی مجروح انسان کی طرح کراہتی ہوئی ریت کے ذرّوں کو اپنے دوش پر لئے ہوئے سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک لمپ کی مدھم روشنی فضا کی تاریکی کو ڈراؤنا اور بھیانک بنا رہی تھی۔ میرے دل کا چراغ بھی بجھ چکا تھا۔ اسمٰعیل کے آنے سے مایوس ہو کر میں اضطراب کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی،

یکایک داہنی طرف سے مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ گویا کوئی لوہے پر ریتی کو رگڑ رہا ہو۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے داہنی کھڑکی کی طرف دیکھا مجھے ایک مبہم سی سیاہ شکل دکھائی دی۔ جو کھڑکی کی سلاخ کو ایک ہاتھ سے مضبوط تھامے دوسرے ہاتھ سے سوہان کی مدد سے سلاخ کو کاٹ رہی تھی۔ میں ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

اُس شخص نے لب پر انگلی رکھ کر کہا "چپ چپ" آواز کچھ شناسا سی معلوم ہوئی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لمپ اٹھا کر سامنے کیا۔ اور روشنی کی ایک چمکتی ہوئی شعاع اسمٰعیل کے مسخ شدہ اور مکروہ چہرے پر پڑی۔ انتہائی کرب سے بے قرار ہو کر میں نے دوسری چیخ ماری اور لمپ میرے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ مگر مدھم سی روشنی میں میں نے اسمٰعیل کو کمرے میں کودتے ہوئے دیکھا اس کے ہاتھوں میں ایک چوروں کا لمپ تھا اُس نے وہ لمپ میرے چہرے کی طرف پھرایا اور دانت پیس کر کہا "مردار شور مچا کر آدمیوں کو اٹھا دینا چاہتی تھی۔"

یہ کہہ کر اُس نے لمپ میز پر رکھ دیا۔ حیرت انگیز واقعات اس تیزی اور شدت سے عمل میں آ رہے تھے کہ میری زبان بند ہو گئی تھی، رات کا خوفناک وقت اسمٰعیل کا چوروں کی طرح آنا پھر اس کی یہ حیرت انگیز گفتگو خواب کے سے واقعات معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اب گہری جھریوں کے نشان تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے وہ ابھی تک میری طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن عورت کی محبت جلدی فنا نہیں ہوتی۔

میں نے آہستہ سے کہا "اسمٰعیل"

وہ دیوانوں کی طرح ہنسا۔ ہا ہا ہا .... اسماعیل! اسمٰعیل تمہارا پہلا خاوند۔"

میں ڈر گئی۔ میں نے لجاجت کہا "اسمٰعیل تمہیں کیا ہو گیا۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے"؟

اُس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ "دیوانہ؟ ہاں تم سچ کہتی ہو۔ مجھے ایک عورت کی بیوفائی نے دیوانہ کر دیا۔"

میں نے چلّا کر جواب دیا "بیوفائی! تم کیسے بیوفائی کا الزام دیتے ہو۔"

اُس نے میری طرف انگلی اُٹھا کر کہا "تم کو۔"

میں نے گردن جھکا لی۔ یہ تھا میری مصیبتوں کا انجام میری کلفتوں کا خاتمہ جس کے لئے میں نے سب کچھ گوارا کیا، وہ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے بیوفائی کا الزام دے رہا تھا، اس ناگن کی طرح جس کے بچّوں کو کسی نے کچل دیا ہو۔ میں نے سر اُٹھا کر طعن سے کہا "پھر تم یہاں کیوں آئے ہو۔"

"مجھے امارت کبھی نصیب نہ تھی تم ہمیشہ سے امیر تھیں۔ اب بھی ہو۔ جس سے تم نے اب بیاہ کیا ہے۔ اس کے پاس دولت ہے عشرت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم ہو۔"

اب اُسے سمجھانا بیکار تھا۔ خدا جانے وہ کن مصیبتوں میں پڑ کر اس حالت تک آ پہنچا تھا۔ کہ اپنی تمام مردانہ غیرت کو چھوڑ کر مجھ سے روپیہ مانگنے آیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں کسی اور کی بیوی ہو چکی ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے یقین کو نہ بدل سکتی تھی، یہ سوچ کر میں خاموش ہو رہی

اس نے پھر کہا "میں جوا کھیل کر آ رہا ہوں، ہار کر آ رہا ہوں۔ تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینا ہو گا۔"

میں نے جل کر کہا "میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔"

اُس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ "یعنی تم کچھ نہ دو گی۔"

"کچھ نہیں۔"

وہ خاموشی سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور نیچے گلی میں "محمد" کہہ کر آواز دی۔ میں نے تعجب سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جہاں اب ایک سیڑھی لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص اس سیڑھی سے کھڑکی تک آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ جو اُس نے اسمٰعیل کے ہاتھ میں دیدی۔ وہ اُسے اپنے ہاتھوں پر لئے ہوئے میری طرف آیا اور اس کا منہ کھول دیا۔

"پہچانتی ہو یہ کون ہے؟ تمہارے چہروں کی شباہت بیوقوف سے بیوقوف آدمی کو بھی یقین دلا دے گی کہ یہ تمہارا ہی بچّہ ہے، اگر تم اپنی ہٹ پر قائم رہیں تو میں اسے شیر علی کے پاس لے جاؤں گا۔ اور پھر اس کی اور تمہاری زندگی کا خدا حافظ۔"

میرے سینے میں دودھ بہنے لگا۔ "میرا بچّہ" کہہ کر میں نے اُس کے ہاتھوں سے اپنے دل کے ٹکڑے کو چھیننا چاہا۔ مگر اُس نے مجھے روک دیا۔ اور کہا "بس اب یہ بچّہ صرف میرے کام آئے گا۔ بولو کیا جواب دیتی ہو۔"

میرا غرور خاک میں مل گیا۔ میں اس کے سامنے دو زانو ہو کر زار قطار رونے لگی۔ میں نے لجاجت کہا "اسمٰعیل! اسمٰعیل! رحم کرو۔ میں ابھی تک تمہاری بیوی ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف مڑا، اور کھڑکی کی راہ سے نیچے اُتر گیا، میں نے اُسے بہت روکنا چاہا۔ مگر وہ مجھے دھکیل کر نکل گیا۔ میں نے باہر کے دروازے سے کان لگا دیئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے شیر علی اور اسمٰعیل کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر وہ مقفل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگرچہ شیر علی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس کی محبت رقابت کے اس زندہ ثبوت کو کبھی برداشت نہ کر سکے گی۔ وہ ضرور اسمٰعیل اور میرے معصوم بچّے کو قتل کر ڈالے گا۔ میں نے کمرے میں ایک مقید عفیرنی کی طرح چکر لگانا شروع کر دیئے۔ اور یکایک میں نے

کھڑکی میں سے دیکھا کہ اسمٰعیل اور اس کا ساتھی مکان سے نکلے اور بھاگتے ہوئے صحرا کا رُخ کیا۔ ان کے پیچھے سہیل خاں اور دو ایک اور نوکر مشعلیں لئے ہوئے نکلے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ مفرورین بہت دُور نکل گئے ہیں واپس مکان میں داخل ہو گئے۔

تھوڑے سے عرصے بعد جب مکان میں خاموشی چھا گئی۔ میں خدا کا نام لیکر کھڑکی سے نیچے کود پڑی اور اُٹھ کر اس طرح بھاگی جس طرح کوئی ہرن شکاری کی بندوق کی آواز سُن کر بھاگتا ہے۔

۴

یہ کہہ کر لیلےٰ نے شبیر علی کی طرف دیکھا۔ اور بولی "میں اسی اُمید پر زندہ تھی کہ ایک دن تم سے اپنے معصوم بچے کا انتقام لوں۔ میں ناکام رہی مگر میری رُوح کو یہ تسلی ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔"

شبیر علی نے اُٹھ کر کہا۔ "صاحبان مجھے اس قصے کو اختتام تک پہنچانا ہے .... سہیل خاں!"

سہیل خاں آگے بڑھا۔

"جمیل کو لاؤ!"

سہیل خاں گیا اور چند لمحوں میں ایک معصوم بچے کو لے کر آیا۔ شبیر علی نے بچے کو جو اس مجمع سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں پر لیکر کہا "لیلےٰ یہ ہے تمہارا بچہ۔ اس رات جس کا تم ذکر کرتی ہو۔ میں نے تمہاری تمام گفتگو سُن لی تھی۔ اور میں نے اسمٰعیل کو مار کر باہر نکال دیا تھا۔ کیونکہ وہ کسی صورت سے تمہارے لائق نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دُوسری صبح تمہیں تمام واقعے کی خبر دوں۔ مگر تم غائب ہو چکی تھیں۔ اب تک میں نے اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالا ہے۔ لو آج تمہاری امانت تمہاری نذر ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ لیلےٰ کے ہاتھ کھول دیئے گئے وہ بیتاب ہو کر اپنے بچے کی طرف بڑھی جو مہر مادری کی کشش سے خود بھی اس طرف کھنچا جاتا تھا۔ لیلےٰ نے اُسے گود میں اُٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ جمیل بے اختیار لیلےٰ کے سینے سے لپٹ گیا اور کہا "اماں"۔

خیمے سے تمام لوگ دبے پاؤں رخصت ہونے لگے وہ محسوس کرتے رہے کہ انہیں اس مقدس اور آسمانی خوشی میں حارج ہونے کا کوئی حق نہیں۔

محمد مجیب

کیمیاگر

یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک ان کی حکومت کسی قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے چند حملے کئے تھے۔ ہندو تصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی اور اس بے چینی کو دور کرنے کے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حاوی ہو جانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اس کا گھر سب کا گھر ہے۔ اس کا نیا دین دنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی انہیں حکم ملا کہ جونپور کی طرف کچھ اور نووارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا نام خالدپور رکھا گیا تھا مسلمان آبادی کی بنیادیں ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالدپور میں جا بسے رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آگئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی۔ حکیم مسیح نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہو گئے اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرا دی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں۔ وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار رہتے تھے۔ تجربہ نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا، ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح باوجود اپنی دلیری اور ہردلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی کچھ ہندوستان کی فضا۔

مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصّب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو اپنے جیسا آدمی سمجھتے تھے نہ ہندوستان کو اپنے جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کی سسرال کا تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو ان کی اس قدر عزت، ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن ان لوگوں کے تعصّب کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسے کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لئے طبیعت میں وہ سکون پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گذرتے گئے۔ حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور ان کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔

"کاش! مجھے ایک ایسا کیمیاگر ملتا" انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا؟"

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا:

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیاگر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادرِ مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی ان کے مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہئے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی، اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے۔ تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا تمام نوکر بوکھلائے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہے۔ پہلے تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار ہوا ہے مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہی کا ماتم ہو رہا ہے۔ ان کی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود ہی رونا دھونا شروع نہیں کر دیا تھا بلکہ تمام محلہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی، اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان کے خسر اور سالے آگئے اور انہیں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اس قدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور خدا اور رسولؐ اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں۔ ان کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ یہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنی چاہئے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے سوچ رکھی تھیں

وطن ہے۔ اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہوگا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی بچے کچھ نہیں .... میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں جہاں نیند آئی وہیں سو جاتا ہوں۔"

"مگر مسافر! تیرے بیوی بچے ہوتے تو تُو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میری اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں، ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر، میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں ...."

"مگر مسافر! طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو تیار تھے اور بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"حکیم مسیح!" مسافر اچانک بول اٹھا "مسلمان کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا۔ اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ، خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کر دو۔ تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیہ بھیگ گیا تھا لیکن ان کو اب نہ اپنی سُرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی۔ انہوں نے "یا رسولؐ" کا نعرہ مارا۔ پلنگ پر سے اُچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دیئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سُن کر خالد پور کی آبادی میں اُودھم مچ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہ رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آ گئی۔ جس نے بھی یہ خبر سُنی وہ اپنا دل مضبوط کر کے ان کے مطب میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی تھیں۔ مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوا لی۔

اُدھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر "یا رسولؐ" کا ایک نعرہ سنا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے، نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سُرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔ مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی، اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے

نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا:

"لالہ سیتا رام کی بیوی بیمار ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمارداری کے لئے کوئی نہیں۔ اگر آپ وہاں چلی جائیں......."

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام و نشان نہ تھا، آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوتے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتا رام کے گھر پہنچ گئیں.......

خالد پور میں دو ماہ تک طاعون کا دورہ رہا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی تدبیر کوئی نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھتے ہیں اور ان کے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کو تسکین دلانے کے لئے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جلانے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں لیکن اس کام کے لئے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانے میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو ان کی بیوی کی اور ان کی بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاقات کے لئے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی مگر ان کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ مایوسی، خود غرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکا۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہو گئے، کام کم ہوا، فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لئے آتے تھے، ماہران فن قدردانی اور ہمت افزائی کے لئے، مظلوم شکایات کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے۔ ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔ ان کے لئے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے، گھر کا سامان، کپڑے، جواہرات ایسے جو بادشاہوں اور لٹیروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے مگر حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے۔ تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اسی محبت سے دوسروں کو دے دیتے تھے جس سے وہ ان کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور ان کی بیوی کو علم نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا دھندلا عکس ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے، خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیئے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی

اس لئے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چندہ جمع کر کے ایک عالی شان عمارت بنائی جائے لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ کرنے کے لئے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو کبھی ساری رات گذارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس خلوص سے ان کے چہرہ پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے، اس بیچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے مسافر کی طرح حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت کو دوگونہ کرے، ان کے فرائض یاد دلاتی رہے اور انہیں ادا کرنے کی قوت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی۔ حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا:

"تم کو شاید یاد ہو، میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیا گر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے، اس قوم میں مجھے کھپا دے۔ دیکھو اس کیمیا گر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بی بی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما، ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دونوں اپنے کیمیا گر کے تصور میں محو ہو گئے۔

اختر انصاری

نازو

میرے شوہر کو مناظرِ قدرت اور ان کی دل پذیر رنگینیوں سے بہت محبت ہے اسی لئے ہم شہر سے بہت کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں، کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر عروسِ فطرت دستِ انسانی کی گستاخیوں سے ناآشنا ہے۔ چاند، سورج، مینہ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں اور اس کے سادہ حسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹڑی ہے جس پر سے دن رات ریلیں گذرتی ہیں۔

یہ گذرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پاکر اپنی بہن کو داغ دے گئی، جو جوان ہوئی اور جوان ہوکر مر گئی۔ جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن، لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی زیادہ مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت اور بڑی محنت سے پالا۔ سارا دن گود میں لئے رہتی اور ساری ساری رات پنگوڑے میں لٹا کر لوریاں دیتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اگر اماں جان بھی زندہ ہوتیں تو شاید نہ کرسکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی، جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہوگئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آ گئیں۔ اس کے سیاہ بال بے حد لانبے اور گھنے ہوگئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہوگیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مچ ایک عورت معلوم ہوتی۔ میں اس اٹھان، اس بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن آہ! مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری پھبن، یہ تمام رعنائی ایک سراب ہے، ایک دھوکا ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح آئی ہے ایک جھونکے کی مانند گذر جائے گی۔

ہائے وہ کیسی منحوس اور نامراد صبح تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا "آپا میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے اس کے چڑھتے ہوئے بخار کو سوءِ ہضم کا نتیجہ سمجھا تھا اور زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار وہ بخار نہیں ہے جو ایک دن کی دوا کے

بعد اتر جاتا ہے۔ بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر دبیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ ابا جان نے علاج میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلوائے اور جب ان کی کوششیں نامشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا۔ لیکن بخار کسی طرح نہ اترا اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلا دیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے جتنا رویا گیا میں روئی، جتنا غم کیا گیا کیا، اور جتنی دعائیں مانگی جا سکیں مانگیں مگر طبیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری ناز کی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی، صرف رونا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سنبھالا بات کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر کبھی اس کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آکر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا تو بہت کم ہو گیا لیکن زبان کی ویسی ہی گونگی رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کبھی زبان سے کچھ نہ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑی رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی، اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی، سب کچھ جانتی تھی اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک دفعہ ——— یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکے ——— اس نے اپنے صندوق میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلہ میں نکالے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے۔ جس خیال کے تحت اس نے یہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا۔ تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی۔ اس طرح اکثر اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لاعلاج مرض کو پہچانتی ہے اور نتیجہ سے اچھی طرح واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی ——— بیمار نہ پڑی تھی ——— تو اس کے جوان دل میں بہت سی جوان آرزوئیں تھیں۔ بخار میں یہ آرزوؤں کا لہلہاتا ہوا چمن بالکل جھلس کے رہ گیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہو گئے لیکن اس حالت میں بھی دو ارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور زبیدہ آپا کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزومند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہیں گئی۔ اس لئے اس کو ریل کے سفر کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے انہیں ریل کا سفر آئے دن درپیش رہتا ہے۔ لیکن ہمارے تمام عزیز و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے چنانچہ جب نازو گود میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور ادھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں، یہ تعلق بالکل ختم ہو گیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جا سکی۔ اس کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو۔ وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیماری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔ میرٹھ میں ہماری خالہ کی لڑکی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے ابا جان کو لکھا تھا کہ زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہو گی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤں گی۔ وہ دن اور ہفتے گن گن کر کاٹ رہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موذی بخار نے اس کو آلیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہو گا تو میں تجھ کو ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گی اور فی الحقیقت میں اس کو لے جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے۔ جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے بلاوے کا خط لکھا تو میں نے ابا جان سے ذکر کیا اور نازو کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی اور پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ نازو کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گا تو میں نے اپنی

تمام کوششیں ابا جان کو راضی کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ میں روئی بھی، منتیں بھی کیں، اوروں سے سفارشیں بھی کرائیں لیکن ابا جان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

نازو خالہ اماں کے خط کی اطلاع پاکر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہوں گی لیکن تین دن گزر گئے اور نہ ابا جان نے اجازت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں نازو سے کہہ دیتی کہ پیاری نازو! تمہارے ابا میاں تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے؛ تم وہاں نہ جاؤ گی۔ آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کڑا کر کے کہا "نازو! صبح کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی ہے۔ غالباً ایک دو مہینے کے بعد ہو گی"۔ نازو نے یہ سن کر نظریں جھکا لیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دوا لینے الماری تک گئی۔ جب دوا شیشے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ نازو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے ڈھلک کر نیچے گر رہے ہیں اور تکیے کو بھگو رہے ہیں۔

اس واقعہ کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اب نہ نازو ہے نہ ابا جان ہیں، نہ وطن ہے، نہ وہ گھر ہے جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔

میں ہوں، میرا ویران دل ہے، پردیس ہے اور میرا جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے، آسمان سے تاریکیاں برستی ہیں اور جنگل کی وسیع پہنائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے، ریل اپنی شاندار ہیبت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ میرے مکان کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ نازو افق کے کسی بعید ترین گوشے سے حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے۔ لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال کرتی ہوئی، اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی، سفاکانہ بے التفاتی کے ساتھ نکل جاتی ہے تو اس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

شوکت تھانوی

دولت خانہ

میں ابھی بستر کی چاء پی کر بستر کا پان کھانے کے لئے بیگم کو پاندان کی طرف متوجہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور مجبوراً اسی حالت میں باہر آنا پڑا۔ باہر نکل کر دیکھا ریاض کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر لپٹتے ہوئے کہا۔

"ارے ریاض۔ کمال کر دیا تم نے۔ یعنی تم مرے نہیں"

بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے تھے اور جب جالندھر کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہوا ہے تو اس حملے کے بعد جتنے ساتھی نظر نہ آئے ان سب کے متعلق یہ طے کر لیا تھا کہ شہید ہو چکے ہوں گے بلکہ لاہور پہنچ کر اس ریاض کی تو غائبانہ نماز جنازہ تک میں شریک ہو چکے تھے۔ مگر ریاض زندہ سلامت کھڑا ہوا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب یہیں کھڑے کھڑے محبت جتا دو گے یا گھر میں بھی لے چلو گے"

میں نے گھبرا کر کہا "گھر؟ ——— ہاں ٹھیک ہے یہ گھر ہی تو ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو" اور دروازے کے اندر جھانک کر کہا "میں نے کہا سنتی ہو ریاض آ گیا ہے ذرا پردہ کر لو۔ اندر ہی بلا لیں"

ایک منٹ میں پردہ ہو گیا اور ریاض کو میں نے ڈرائنگ روم میں بلا لیا۔ ریاض نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف وحشت سے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا:۔

"کیا مطلب یعنی یہیں۔ صرف ایک دروازے کی کوٹھڑی جس میں صرف ایک چارپائی آ سکتی ہے تم اس میں رہتے کس طرح ہو؟ اور یہ جو تم نے بھابی سے پردہ کرنے کو کہا ہے وہ آخر گئیں کہاں اور کس دروازے سے گئیں۔ مجھ کو تو صرف ایک دروازہ نظر آ رہا ہے جس سے میں داخل ہوا ہوں"

میں نے کہا "ہاں دروازہ تو اتفاق سے ایک ہی ہے ——"

ریاض نے ایک اور دروازہ دیکھتے ہوئے کہا "اچھا یہ ہوگا اندر جانے کا دروازہ"

اس کی غلط فہمی رفع کرنے کے لئے عرض کیا "جی نہیں یہ الماری ہے۔ اور الماری کھول کر ریاض کو دکھا دی جس میں تین تختے لگے ہوئے تھے۔

ریاض نے پاگل ہو جانے کے قریب پہنچتے ہوئے کہا "اے بھائی تو بھابی کہاں سما گئیں"

اب میں نے اس معمے کے حل میں دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ میں ریاض کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا میں نے کہا۔
"میاں مبارک باد دو مجھ کو کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے اور تم سے کسی فٹ پاتھ پر ملاقات نہیں ہوئی جہاں تمہاری بھابی کو تم سے پردہ بھی نہ کرا سکتا۔ خوش نصیب ہوں میں کہ خانہ بدوش نہ بنا اور شکر ہے اس پروردگار کا جو خود لامکان ہے مگر مجھے مکان دے دیا۔"

ریاض نے جل کر کہا "عجیب آدمی ہیں آپ یعنی آپ اسے مکان کہہ رہے ہیں۔"

نہایت اطمینان سے کہا "ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے۔ ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود۔ سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں یہی میرا ڈرائنگ روم ہے یہی میرا بڈ روم ہے۔ یہی میرا آفس ہے۔ یہی میری لائبریری ہے۔ یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانا پکانے کا کمرا۔" اور پھر میں نے ذرا پکار کر کہا "ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو ذرا پان بھیج دینا"۔ اس پر ریاض نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا کہ یہ آواز سننے والی آخر کہاں ہو سکتی ہے۔ آخر اس نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا "بھابی آخر ہیں کدھر؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا "یہیں ہیں اور کہاں ہوتیں ––

عفو کیسا جلوۂ رحمت بھی نکلے گا یہیں
ذوقِ عصیاں چاہیئے عرفانِ عصیاں چاہیئے"

ریاض کو غالباً یہ شعر قطعاً پسند نہ آیا۔ اس نے ذرا تلخی سے کہا "یہ آخر معمہ کیا ہے بتلاتے کیوں نہیں صاف صاف۔"

میں نے کہا "بھائی میرے کہہ چکا ہوں تم سے بس یہی اتنی سی جگہ ہے اسی میں اپنی تمام ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ یہ الماری دیکھ رہے ہو اس کے تینوں تختوں پر تینوں بھتیجے سوتے ہیں تمہارے۔ رات کو اوپر والے خانے میں بڑا بچہ درمیانی تختے پر منجھلا نیچے چھوٹا جو انبالے میں پیدا ہوا تھا۔"

ریاض نے حیرت سے کہا "کہاں ہے یعنی اس الماری میں۔ ارے بھئی اس میں تو ٹانگیں بھی نہ پھیلاتے ہوں گے یہ بچے۔"

میں نے کہا "ٹانگیں پھیلانا یا سمیٹے رہنا سب عادت پر منحصر ہے۔ اب ان کو ٹانگیں سمیٹ کر سونے کی عادت پڑ گئی ہے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، صبح اٹھنے کے بعد دن بھر ٹانگیں پھیلاتے پھرتے ہیں وہ مثل تو تم نے سنی ہوگی کہ چادر دیکھ کر پیر پھیلائے جاتے ہیں۔ میں نے اس میں بس ذرا سی ترمیم کر دی ہے کہ الماری دیکھ کر پیر پھیلانا میرے بچو۔"

ریاض نے ہکا بکا ہو کر کہا "بچے نہ ہوئے اچار کا مرتبان ہو گئے۔ شربت کی بوتلیں ہو گئے کہ الماری میں رکھے جاتے ہیں۔ اور بھابی اس وقت کس الماری میں ہیں؟"

اور یہ کہہ کر وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے سخت دحشت برس رہی تھی۔ وہ وحشت جو اچانک کرنٹ لگ جانے سے کسی پر برس سکتی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں خود گھبرا گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اور جلدی سے پوچھا "کیا ہوا؟"

اس نے سہمے ہوئے انداز سے پلنگ کو گھورتے ہوئے کہا "یہ اچھلا تھا۔ جیسے کسی نے ٹھوکا دیا ہو مجھے۔" اور میں نے ہنس کر کہا "لاحول ولاقوۃ۔ وہ سمجھی ہوں گی کہ میں اُدھر بیٹھا ہوں۔" اور پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر خاصدان لے لیا۔ ریاض آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جب میں نے خاصدان کھول کر پان اس کی طرف بڑھائے تو اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔
"تو کیا بھابی پلنگ کے نیچے ہیں؟"

میں نے کہا "جب کوئی آجاتا ہے وہ پلنگ کے نیچے ہی پردے میں چلی جاتی ہیں۔ کافی اونچا پلنگ ہے اور اس کے نیچے دری بچھی ہوئی ہے

چاروں طرف پھاوڑا لٹک رہی ہے اچھا خاصا محل ہے۔"

ریاض نے حسرت کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ چلو باہر چلیں یہ کیا بیہودگی ہے کہ ان کے سر پہ سوار بیٹھے ہیں۔"

بیگم نے پلنگ کے نیچے سے فرمایا "نہیں بھائی صاحب آپ تشریف رکھیئے یہ تو خانۂ بے تکلف ہے یہاں ان باتوں کا خیال چھوڑ دینا پڑتا ہے۔"

اور میں نے بھی ریاض کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا "بھیا وہ عادی ہو چکی ہیں آج یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے احباب آخر آتے ہی رہتے ہیں۔ دوسرے وہ تو نہایت آرام سے بیٹھی ہوں گی اس پلنگ کے نیچے دری ہے چادر ہے ایک گاؤ تکیہ ہے پورے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں جب تک ہم لوگ بیٹھے رہیں گے وہ مزے سے چھالیہ کترتی رہیں گی۔"

ریاض کی حیرت کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہنے لگا "صاحب عجیب مہمل زندگی ہے۔ الماری میں بچے پلنگ کے نیچے بیوی ایک دڑ کی قبر نما کوٹھڑی اور اسی میں ساری کائنات!"

میں نے کہا "توبہ کرو ریاض توبہ کرو۔ یہ بڑا بول ہے۔ میں تو بخدا اس کوٹھڑی پر ناز کرتا ہوں۔ اور میرے دوست میری قسمت پہ رشک کرتے ہیں کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے۔ وہ جو زندگی بھر گوشۂ عافیت سنتے آئے تھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ دراصل یہی کوٹھڑی ہے۔ اب ذرا اس کوٹھڑی کا پروگرام سن لو کہ رات کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تینوں بچے احتیاط سے الماری میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور ہم دونوں میاں بیوی اسی پلنگ پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جس طرح جوتے کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک کی ایڑی ادھر پنجہ اُدھر دوسرے کی ایڑی اُدھر پنجہ اِدھر۔ صبح اُٹھ کر وہ دیکھو کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہے اس پہ بیگم چائے بناتی ہیں اور بڑا بچہ الماری کے اُوپر والے خانے سے نکل کر دودھ لے آتا ہے پھر سب مل کر چائے پیتے ہیں اور بچے رات کا بچا ہوا کھا کر اسکول چلے جاتے ہیں صرف چھوٹا بچہ رہ جاتا ہے اس کے بعد بیگم برقع اوڑھ کر اور بچے کو گود میں لے کر شاپنگ کے لئے نکل جاتی ہیں اس لئے کہ ان کا خیال یہ ہے کہ مجھ نہ دراصل گوشت کی پہچان ہے نہ میں ترکاری ٹھیک لاسکتا ہوں میں اس موقع کو غنیمت جان کر اس پلنگ کو کھڑا کر دیتا ہوں فرش سمیٹ لیتا ہوں اور سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی لا کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل شروع کر دیا —"

ریاض نے ٹوکا "جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل؟"

میں نے کہا "صاحب غسل کا غسل صفائی کی صفائی یعنی اپنی بھی صفائی کوٹھڑی کی بھی صفائی نہاتا جاتا ہوں اور جھاڑو دیتا جاتا ہوں۔ پھر یہ جو میز تم کو نظر آرہی ہے نا۔ یہ بے نقاب ہو جاتی ہے اس کا سامان اُٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہوں اور میز پوش ہٹاتا ہوں تو تلے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک نمودار ہو جاتے ہیں ان میں سے اُوپر والے ٹرنک میں میرے دفتر جانے کے کپڑے ہیں۔ وہ پہن کر پھر ان ٹرنکوں پہ میز پوش ڈال کر اس کو میز بنا دیتا ہوں اور اس کا سامان جوں کا توں اس پہ سجا دیتا ہوں۔ فرش پھر کر دیا جاتا ہے۔ پلنگ پھر بچھ جاتا ہے اور میں سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی اور لا کر رکھ دیتا ہوں کہ دن میں بیگم کو تکلیف نہ ہو۔ اس عرصے میں بیگم واپس آجاتی ہیں اور اپنی شاپنگ کے کمالات کا بڑے فخر سے اظہار فرماتی ہیں کہ دیکھا اس کو کہتے ہیں گوشت پھر یہ کہ سارے شہر میں اتنا سستا شاید ہی کہیں ملے اور ٹماٹر تو دیکھو سیب نظر آرہے ہیں۔ میں کچھ اخلاقاً اور کچھ انتظاماً داد دیتا ہوا ان سے رخصت ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ دفتر سے واپسی کا سودا میرے ذمے ہے یعنی صبح کے ناشتے کے لئے بسکٹ۔ پان۔ رات کے لئے کچا گوشت ترکاری وغیرہ اس سلسلے میں روز باتیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ گوشت آخر کس جانور کا اُٹھا لائے ہو اور یہ جو ترکاری لائے ہو یہ اصلی ہے یا بناسپتی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر اگر آدمی ذرا مسکرانے کا عادی ہو جائے تو بات زیادہ نہیں بڑھتی ورنہ اتنی سی کوٹھڑی میں بات کا بڑھ جانا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی تو خیر برحق ہے بشرطیکہ

باقاعدہ میدانِ جنگ بنا رہتا ہو۔ ایک کمرہ لڑنے کے لئے ہو۔ دوسرا بیوی کے پھول سورج کرنے کے لئے تیسرا شوہر کے اینٹھ کر پڑے رہنے کے لئے اور چوتھا سہمے ہوئے بچوں کے لئے۔ پھر یہ کہ اس جنگ کے باوجود ملازم کم سے کم کھانا وغیرہ پکاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ارمان اس کوٹھڑی میں چونکہ پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا مجبوراً صلح صفائی سے کام رکھنا پڑتا ہے۔"

ریاض کو اب کچھ کچھ ہنسی آئی کہنے لگا "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی ——"

میں نے کہا "بھئی کون کافر تم سے مسخراپن کر رہا ہے۔ میں تو بجدا اظہارِ واقعہ کر رہا ہوں۔ مگر اُستاد عجیب عجیب فوائد ہیں اس کوٹھڑی کے۔ تم کو معلوم ہے لکھنؤ میں میرا گھر سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئے دن بھانت بھانت کے مہمان تو مستقل قیام کے لئے آتے رہتے تھے۔ پھر مقامی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کسی کے لئے چائے بن رہی ہے تو کسی نے کہا چائے نقصان کرتی ہے شربت منگاؤ۔ کوئی بے تکلف دوست ناشتہ مانگ بیٹھا دن بھر اور آدھی آدھی رات تک دربار گرم رہتا تھا۔ مگر جب سے یہ کوٹھڑی ملی ہے اوّل تو کوئی مہمان آیا ہی نہیں اور اگر آ بھی جائے تو اس کوٹھڑی میں رہنے کے بجائے غالباً یہی مناسب سمجھے گا کہ قیام کا انتظام کرنے کے لئے کسی کی جیب کاٹ کر جیل چلا جائے۔ مگر بہت سے مہمان ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھہرانے کے لئے خود جی چاہتا ہے اور پھر کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔ مثلاً اب تم آ گئے ہو ——"

ریاض نے بات کاٹ کر کہا "بندہ نواز میں تو دو مہینے سے یہاں ہوں اور صرف دو چیزیں تلاش کر رہا ہوں ایک اپنے لئے مکان دوسرے جناب کا دولت خانہ۔"

میں نے کہا "شکر ہے کہ ایک چیز تو آپ کو مل گئی رہ گیا مکان اس کے متعلق اگر آپ فارسی جانتے ہوتے تو یہ مصرع پڑھتا کہ۔ ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

اور فی الحال آپ ہیں کہاں۔"

ریاض نے بیزاری سے کہا "ہوتا کہاں ہوٹل میں ہوں۔ میرا کیا ہے اکیلی جان نہ بیوی نہ بچے۔ پھر بھی آخر ہوٹل میں زندگی بھر تو کوئی رہ نہیں سکتا جی چاہتا ہے کہ اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔"

میں نے کہا "خیر اپنا گھر تو خدا کے فضل سے پورا پاکستان ہے البتہ یہ کہو کہ ہوٹل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔"

ریاض نے کہا "بھیّا اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہوں مجھے ایک مکان مل رہا تھا کرایہ زیادہ تھا اور مکانیت کم۔ تین کمرے تھے۔"

میں نے حیرت سے کہا "ایک نہ دو یکمشت تین کمرے۔ اچھا تو پھر ——"

کہنے لگا "میں نے لینے سے انکار کر دیا اور زیادہ گنجائش کے مکان کی تلاش میں ناکام رہ کر پھر جو گیا اُسی مکان کو لینے تیسرے دن تو معلوم ہوا کہ اب اس میں تین خاندان آباد ہیں۔ اپنا سر پیٹ کر چلا آیا۔ پھر پتہ چلا کہ ایک اور مکان خالی ہے وہاں گیا تو صاحب خانہ نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا کہ شادی ہو چکی ہے میں نے کہا۔ جی نہیں۔ کہنے لگے کہ اگر میں اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کر دوں تو اُسے کہاں لے جا کر رکھیئے گا۔ عرض کیا کہ گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہوں۔ وہ حضرت سخت برہمی سے بولے کہ میں شادی اس لئے تو کرنا چاہتا ہوں کہ لڑکی جائے تو کچھ گنجائش پیدا ہو گھر میں آپ آئے خود بھی یہاں سامنے چلتے پھرتے نظر آئیے۔"

میں نے کہا "بھئی ریاض صاف بات یہ ہے کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر ایک موٹر گیراج خالی نظر آیا تھا۔ کچھ دن ہوئے دیکھو اسکی بات کرتا ہوں۔"

ریاض نے ڈپٹی پیروں پر رکھنے کے انداز سے کہا "میرے بھائی اگر وہ مل جائے تو میں بک جاؤں گا تمہارے ہاتھوں تم ابھی چلیے میرے ساتھ۔"

لاکھ لاکھ کہا کہ یہ دفتر کا وقت ہے۔ مگر آخر دفتر کے ایک صاحب کو جا کر عرضی دینا پڑی اور ریاض کے ساتھ اس موٹر گیراج کی تلاش میں نکل گئے مگر توبہ کیجیے وہاں ایک بزرگ والدین اپنے ایک درجن بچوں کو لئے گیراج کے باہر ہی نظر آئے۔ گیراج پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا جس کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا اور اندر کسی ہانڈی میں میتھی کا بگھار دیا جا رہا تھا۔

اب ریاض کو بھی مجھ پر شک ہے اور میں شب و روز اس کے لئے مکان اور رشتہ دونوں چیزیں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ یا تو مکان مل جائے ورنہ کوئی اُسے گھر داماد بنا لے۔ آج خبر آئی ہے کہ ایک رئیس ہیں ان کے گھوڑے کا انتقال ہو گیا ہے خدا کرے اصطبل ہی مل جائے اور یہ چھینکا ریاض ہی کی قسمت سے ٹوٹا ہو۔

میرزا ادیب

درونِ تیرگی

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشندان ایک مدّت سے بند پڑے تھے، یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیانک تاریکی سنگینی رہتی تھی۔ اس گہرے اندھیرے میں نہ تو کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوا تھا۔ اور تو اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی نحوست آثار منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہمہمائیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا ——— اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرّات کی بدولت تھا جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ یا دیوار کی دراڑ میں سے اندر آ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہلچل نظر نہیں آتی تھی۔ وہ تاریکی کے جزو بن کر رہ گئے تھے ——— ان میں انفرادیت نام کو بھی باقی نہیں رہی تھی۔

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک ترگوشے میں ایک چھوٹا سا ذرہ نڈھال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا:

"توبہ، کس قدر اندھیرا ہے، کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟"

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرّے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

"خوب! ناچیز ذرّے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو۔ بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے ہمیشہ اندھیرے ہی سے وابستہ رہیں گے۔ ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے!"

"ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے؟" ننھا ذرہ بولا۔

"کبھی نہیں ——— میری مانو ایسی بیہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرّے ہو؟"

یہ کہہ کر بوڑھے ذرے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ننھا ذرہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی ——— اور اس وقت اس کا سینہ ایک شدید، تند و تیز ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک لذت انگیز سنسنی سی دوڑ گئی اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، بے مایہ وجود نہیں ہے ——— اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے ——— وہ کچھ کر بھی سکتا ہے، اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے، اس کے سامنے ایک وسیع، ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے، ناچ سکتا ہے، گا سکتا ہے ——— مگر افسوس اسی وقت ہوا کے ایک جھونکے نے اسے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کے اردگرد دوبارہ بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دُکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید مایوسی بھی اس مشعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی ——— اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دنیا میں پہنچ جائیگا ——— اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی، وہ بے بس ہو کر، مجروح ہو کر، چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے ذرے نے حسبِ معمول کرخت لہجے میں کہا:

"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر کبھی یہاں آ جائے گی، اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی۔"

ننھے ذرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ سکے تھے۔ اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ مایوسی نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

بزرگ ذرے نے آنکھیں جھپکا کر کہا:

"گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی، یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا اور وہ یہی سامان لینے کے لئے یہاں آ گئی تھی، ورنہ وہ اس متعفن فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سنا بیٹا! تم سن نہیں رہے کیا؟"

ننھا ذرہ خاموش تھا۔

"غائب کہاں ہو گئے ہو؟ ——— اچھا بھئی تمہاری مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں!" بڑے ذرے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لئے تھرتھرائی اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آ گیا جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرے کی آواز نہیں سنی تھی، تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے اردگرد پھیلے ہوئے بزرگ ذرے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں، اور روشنی کی تمنا کو کتنا بیہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔

ذروں کی دنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حیرت و مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی، ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا باغیانہ احساس بھی کارفرما تھا۔ اپنے آپ کو وہ اس قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر دوبارہ اٹھنے کا نام ہی نہ لے اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے۔

اس سے بہت دور کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدھم سی، ننھی سی لکیر لرز رہی تھی اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی تھی ——— نہ صرف مرکز بن گئی تھی۔ بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی اُمنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کر رہی تھی ——— وہ مایوسی کی سطح سے بلند ہو رہا تھا، اور

سوچ رہا تھا ——— "آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے، انہیں ہم سے کیا دشمنی ہے، وہ ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں ؟"

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آگیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرّے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ بوڑھا اسے مایوس کرنے کی کوشش کرے گا ——— اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بزرگ ذرّہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا :

"میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصّہ ہیں ——— آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ ہے! تم بالکل ننھے ہو۔ بے فائدہ اس چیز کے لئے بیتاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو، اس قسم کی خیال آرائی نہ کیا کرو۔ سُنا تم نے بیٹا!"

ننھا ذرّہ اب خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اُٹھا :

"وہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اندر آجائے گی ؟"

"بہت خوب بیٹا!" بزرگ ذرّے نے خوفناک قہقہہ لگایا "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بینائی کا خیال کر کے دروازہ کھول دیگا یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے انسان کو سمجھا ہی نہیں ——— اسے ہم حقیر ذرّوں کی کیا پروا ہو سکتی ہے ——— اگر تم نے اس مجنونانہ خواہش کو دماغ سے نہ نکالا تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا اور تم مر جاؤ گے۔"

اس وقت ذرّے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہو گئی، روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ذرّے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا ——— اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے، اور کیا ہونے والا ہے۔

پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی، اس تاریکی میں اس کے بزرگ، اس کے ہم عمر لاکھوں ذرّے اپنی مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے، ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر نیچے چلے جاتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے جنہیں روشنی کی تمنا ہو گی، جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن اپنے گرد وپیش بے شمار رکاوٹیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہوں گے ان کی خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی اور نوجوان ذرّہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ راستے کی مشکلات کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے اوپر جانے کی کوشش کی تھی مگر طاقتور ذرّوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا ——— وہ ایک بے وقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تگ و دو سے بچانا چاہتے تھے ——— کم از کم ان کا نقطۂ نظر یہی تھا اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

"کیا وہ اسی طرح ختم ہو جائے گا ———" اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا، اور وہ اپنے اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

نئی فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے ذرّے جب اس سے ٹکراتے تو وہ ایک دم کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک دفعہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں اور ساتھیوں نے طعن وتشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا :

"دیکھو ایسی بیہودہ حرکت نہ کرو، تم نہیں جانتے کہ ———"

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہو وہ تیزی سے اوپر کے کمرے میں آگیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا ادھر آنکلا اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اس حصے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرا رک کر اس نے نیچے دیکھا۔ دور اس کے پست ہمت ساتھی کلبلا رہے تھے اور اپنی محدود و تاریک دنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا ——— مگر حیرت و مسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے۔ کیونکہ اب وہ جن ذرّوں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنا ساتھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاریک بستیوں کا باسی کہتے تھے اور اسے اپنے کمرے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمت و عزم بلند پر تحسین کہیں الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک ذرّے نے تو صاف صاف کہہ دیا:

"بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ۔ تمہارا مقام اسی پستی میں ہے جہاں سے تم آئے ہو۔ اگر ہم میں سے کسی طاقتور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے یا زخمی ہو کر نیچے زمین پر گر پڑو گے اور زمین کے ذرّوں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے، اور پھر کبھی نہیں اٹھ سکو گے!"

باقی ذرّوں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لمحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے۔ لیکن وہ تھکاوٹ کے باوجود اوپر جانے لگا۔ یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرّہ بھی اسی کی طرح ایک دور دراز گوشے سے نکل کر بالائی حصے کی طرف پرواز کر رہا تھا چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہم سفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی چیخ اٹھا:

"آندھی۔"

"کیا؟" نوجوان ذرّہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

"باہر آندھی آ رہی ہے۔ یہ شور سن رہے ہو نا!" اس کا ساتھی بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آگئی ہے آج!"

اس کے ہم سفر نے بتایا "آندھی تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے جھونکے اندر بھی آ جائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آ گئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور ——— یہ بھی خبر نہیں کہ ———"

یکایک اِدھر اُدھر ایک ہل چل سی مچ گئی ——— ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ چھوٹے ذرّے نے محسوس کیا کہ سب ذرّے مل کر اسے پستیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا تھکا سا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقتور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی عرصے کے بعد جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چمٹا ہوا ہے اور یہ تنکا دیوار کی طرف بہا جا رہا ہے یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا ——— فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلّط تھا اور لمحہ بہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جتنے ذرّے موجود تھے وہ سب کے سب تھک کر مضمحل ہو کر سو رہے تھے ——— ایک بڑا مایوس کن خیال اس کے ذہن میں آیا ——— "کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے۔ اور کیا میں اپنا سفر پورا کر کے پھر اسی ناپیدا کنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں جس کے بطن سے میں پیدا ہوا تھا ——— کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سیلاب میں چھلانگ لگا سکتا ——— صرف

ایک مرتبہ اور ـــــ"

"روشنی میں جانے کا مزا دیکھ لیا ہے نا!" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔

"مطلب کیا ـــــ شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں ـــــ اگر ایک بھی کھڑکی کھلی رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئے ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں اور کھڑکیوں نے بچا لیا ہے۔"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سا جھونکا اندر آ سکا تھا اور اس ہلکے سے جھونکے نے ایک ہلچل سی مچا دی تھی، اگر وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ مایوس تھا مگر اب کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گذرتا رہا اور ایک دن پھر اس نے یکایک بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی۔ "ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع، کس قدر خوبصورت ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر آ گیا ہے۔ ایک نئے مقام پر۔

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اس کا پہلا باہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سفر جاری رکھنے کی امنگ از سر نو اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

ابھی اس نے کچھ کہا نہیں تھا ـــــ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہم سفر بولا:

"مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔ دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے، میں اس میں بری طرح پھنس گیا ہوں، نہ جانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن کہیں سے ہوا کا جھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ جھونکا نہ آئے میں اس الجھن غبار سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوشش تو کرو!"

"کوشش تو کرتا ہی رہوں گا، تم تنہا روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں بھی نہ کبھی آؤں گا ـــــ کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔"

"نہیں، جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے چھوٹے ذرّے کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

دوسرا ذرہ بولا۔ "اس کا خیال نہ کرو۔ اس وقت فضا کافی پرسکون ہے تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہو گی!" دوسرے ذرّے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہم سفر سے محرومی کے احساس نے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں اور اس کے ذہن میں ایک چبھن سی ہونے لگی۔

"یہیں ٹھہر جاؤں یا روانہ ہو جاؤں ـــــ" وہ سوچنے لگا۔ اس وقت فضا واقعی پرسکون تھی اور دور بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک لہر پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرواز کرنے لگا۔

وہ تاریک فضا میں گر گر کر اڑتا رہا، اڑ اڑ کر گرتا رہا۔ کبھی طاقتور ذرّوں سے ٹکرا کر بالکل زمین کے قریب پہنچ جاتا اور کبھی مسلسل تگ و دو سے کسی نئی فضا کو چھونے لگتا۔ نئی فضا کے ذرّے اسے حقیر اور اجنبی سمجھ کر ـــــ اپنی دنیا سے نکال دیتے، متکبر ذرّے اس کا راستہ روک لیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کر کے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لمحہ بڑھتی ہوئی مشکلات کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے اس کی ہمت جواب دے جاتی لیکن اس کے دل میں روشنی میں جانے کی جو تمنا بے قرار تھی اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی، کسی حال میں بھی نہیں بجھتا تھا

یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لحظہ مصائب کے ہجوم میں بھی سرگرمِ سفر رکھا، اور جو اسے ہر گھڑی ایک حسین، ایک شاداب دنیا کے خواب دکھاتا رہا تھا۔ جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگین خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلملا اٹھتا اور وہ اسی حالت میں اپنے مجروح جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ تاریکی کی دنیا میں اس کا کوئی ہم سفر نہیں تھا، کوئی ہمدرد نہیں تھا، سب کے سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کو پاگل تصور کرتے تھے، تاہم وہ تاریکی میں جذب ہونے کے لئے تیار نہیں تھا ——— اور نہ اپنے دل سے اپنی عزیز ترین خواہش کو نکال سکتا تھا۔

وہ اڑتا رہا ——— بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کثیف اندھیرے کی حدیں ختم ہو رہی تھیں اور اس کی ننھی ننھی آنکھوں کے آگے دور تک روشنی اور تازگی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آ رہا تھا جس میں لاکھوں صحت مند ذرّے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی حائل تھی ——— وہ ٹھہر نہ سکا، تیزی سے آگے بڑھنے لگا، برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اس پر ایک نیم بیہوشانہ سی کیفیت طاری تھی۔

وہ کہاں ہے، کس دنیا میں پہنچ گیا ہے، کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے، یا ابھی تک اس دم گھٹنے والی تاریک فضا میں لڑکھڑا رہا ہے۔

اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا ——— کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا ——— اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی۔ ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوبصورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے ذرّے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا ——— یہاں تک کہ تھک گیا ——— اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔

اس نے حیران ہو کر ایک ذرّے سے پوچھا:

"روشنی کہاں گئی؟"

نئے ذرّے نے جواب دیا:

"اب شام ہو گئی ہے، کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر رات کے غار میں اتر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے ——— تھوڑی سی روشنی اندر آ سکے گی ——— آہ خوبصورت اور حیات آفریں روشنی تو باہر ہے ——— باہر کی لامحدود دنیا میں!"

"میں اسی لامحدود دنیا میں جانا چاہتا ہوں" چھوٹا ذرہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"آگے ہوا کے بڑے تیز اور تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں، باہر جانا ممکن نہیں"

"——— مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ تو ہے ——— دروازے ہیں" وہ بولا۔

"راستہ ہے، لیکن باہر نکلنا بے حد مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے"

"کوئی پروا نہیں ——— میں باہر جاؤں گا ——— میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں گا ——— ضرور جاؤں گا"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا، اوپر ہی اوپر ——— بلند سے بلند تر فضا میں!

حجاب امتیاز علی

صنوبر کے سائے

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی "نہر روحناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سُنتی تھی، لوگ کہتے اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھنپے ہوئے کنارے دل پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے۔ اور روحناک کی نیلی دھار وہیں سے اُترتی اور کوہساروں میں سے ہرنی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آنکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سُن کر مجھ جیسی سیر و سیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جا سکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا "جسوتی! ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں۔"

جسوتی کو آپ جانتے ہیں۔ سفید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں میں اُسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔

اُس نے مسکرا کر کہا "جیسی تمہاری مرضی روحی۔ لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اسی وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زاد نے کہا "خاتون میں نے سُنا ہے ساحل روحناک پر ایک بہت مشاق سو سال کا بوڑھا ملاح رہتا ہے اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگاتی اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے۔"

میں نے بے پروائی سے کہا "کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو۔"

جسوتی کہنے لگی "سو سال کا ملاح خاک کشتی چلاتا ہوگا۔"

خانہ زاد نے کہا "خاتون! سنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے۔ اور آج تک اُس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

غرض اسی وقت ہم نے اُسے کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

(۲)

جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے جہاں سے سیاح رودخناک کی سیر کے لئے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ تو ہم نے دیکھا۔ کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکارا ہمارے انتظار میں ہے۔ اس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین پاروں پر رکھے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیئے دعوتِ استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر جبوتی سے کہا۔ یہ "خلیفۂ بغداد کا محراب تفریح معلوم ہوتا ہے"!

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا۔ ایک پیر صد سالہ کشتی کے پچھلے سرے پر چپو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی ڈاڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں زندگی کی تابانی و درخشانی نہ تھی۔ بلکہ ——— جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرتِ دیدار چمکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چاء تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے رودخناک کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے نیل پر غروب آفتاب جھل جھل کر شہاب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا۔ جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو، فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لمحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ! سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی۔ رومان کا جزیرہ تھا۔

سبیدے اور تناور صنوبر جیسے دم بخود کھڑے تھے۔ اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھنپی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں۔ کہیں ایک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ہرے ٹیلے، اور کہیں اُفق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا، ہم کتنی دور نکل گئے۔ اور ہمارے شکارے کو چلتے کتنا وقت ہو گیا۔

یکایک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"جناب واپس چلئے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں"!

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا "راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں"!

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی۔ جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا "گویا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو"؟

"جی ہاں"!

"تمہارا مکان کہاں ہے"؟

"مکان کہیں نہیں خاتون ——— صنوبر کے ان سایوں تلے پڑ رہتا ہوں ———"

مجھے محسوس ہوا۔ یہ کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے اک آہ بھری ہے۔

"صنوبر کے سایوں تلے"؟ میں نے حیران ہو کر کہا "بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔ اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے"؟

"علاج؟" اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو۔ اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا"۔

میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی "تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے"۔

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑاتا رہا تھا۔ "مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پر ان سایوں سے چند گھنٹے کی مفارقت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لئے اِدھر اُدھر پھرتا رہتا ہوں"۔

"کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کرسکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ "سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے۔ اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں"۔

جسونتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں۔ کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا "چپو" ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

(۳)

"آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے۔ کہ دنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملّاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا۔ جب میں اسی ردحناک کے ساحل پر انھیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونہ پر پڑی...... ایک کمسن لڑکی پر جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا آتو آئے گا۔ سمجھ لیجئے۔ میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی۔ جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انھیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے۔ اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی"۔

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکایک چلّائی۔ بوڑھے نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر لمحہ رُک کر کہا۔ "یہ دیوانہ پرندہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا؟ کہ محبت بہت ظالم چیز ہے"۔

جسونتی نے مجھے اور میں نے جسونتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے اُبلتے رہے تھے۔ بڈھے نے چند ہاتھ چپّو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔

"شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گزرے۔ پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رُخ پلٹا دیا۔

ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکئے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ اُداس لہجے میں بولی۔ "میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے"۔

میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا "کیا خواب؟"

بیوی نے آہ کھینچ کر کہا "میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پَر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اُجڑ جائے گا"۔

آج سے ستّر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سُن کر میرا عشق سہم سا گیا۔
میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی " پر اتنے فکر کی کیا بات ؟"
میں نے کہا " فکر کیسے نہ ہو ؟ شیریں تریں ! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے ؟"
میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا " نایاب ؟ پھر کیا کرو گے ؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہُوا گھر تباہ ہو جائے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا "
نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگی " میں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام باغوں میں شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں "
میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لئے چشمے پر چلی گئی۔ تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔
میں پریشانی کے عالم میں اُسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقہ میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکم شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اُس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا " کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اُس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں "
میں نے چھ اشرفیاں اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔
میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور مُسکرا کر بولی " اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی "
میں نے کہا " اسے فوراً بالوں میں لگا لو "
پر نہ جانے اُس نے کس خیال سے کہا " میرے بال گیلے ہیں ابھی " پھر لگاؤں گی۔ جب رات شروع ہو گی تو لگاؤں گی "
یہ کہہ کر اُس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا۔ اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تازہ ہو لے کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔
میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ دکان پر جا بیٹھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آ رہا تھا۔ تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اُسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔
" میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا۔ تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آ گیا "
اُس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا۔ کہ میری نظر اُس کی عبا کے کاج پر پڑ گئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔
میں نے بکلفت پوچھا " حمری یہ کاسنی گلاب تمھیں کہاں سے ملا ؟"
حمری طبعاً شوخ تھا۔ ہنس کر بولا " کیوں ؟ تمھیں کیونکر فکر پیدا ہوئی ؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے "
میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب ! تقدیر کا فرشتہ ! اس کی پیشین گوئی ! سب جھوٹ تھا ! محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لئے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی ! سنگدل زندگی !

(۴)

مَیں غصہ میں کانپتا ہُوا گھر پہنچا۔
مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی دوڑی آئی۔ اور اشک آلود آنکھوں سے بولی " افسوس ! بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا ! میں اب کیا کروں ؟ ہم پر ضرور کوئی مصیبت نازل ہو گی "

"ضرور نازل ہوگی۔" میں نے گرج کر کہا۔ "موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمھاری موت آگئی۔"

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اُس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر کہا "تمھاری موت آگئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشین گوئی کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

وہ متعجب ہو کر بولی "تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اُسے باغ کی دریچی میں تازہ ہوا کے لئے رکھ دیا تھا۔ اندر بال سنوارنے گئی تھی۔ واپس آکر دیکھتی ہوں۔ تو پھول وہاں نہ تھا۔"

اُس کی ان مکارانہ باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیئے۔ میں نے اُس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا۔ کہ ٹکر کھا کر اُس کے سر سے خون کا ایک سُرخ فوارہ پھوٹ نکلا۔

راتوں رات میں نے اُسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ کہ اتفاق سے میرا دوست حمری پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اُسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

وہ ہنس کر بولا "تمھاری آنکھیں ایسی سُرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا گویا میں اُس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا "بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا؟ میں اُسے ٹھکانے لگا چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اُس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا، اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔

حمری آنکھوں میں وحشت لئے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اُس سے کہا کہ میں نے اُس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں۔ تو اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ اور کہنے لگا "کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اُٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اُٹھا لیا۔ شاید تمھارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو۔"

یہ سُنکر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا ——— جس نے آج تک دُنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے اوجھل کر رکھا ہے۔

(۵)

تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور جلد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

آج اس قصے کو ستّر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں۔ جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے میری محبت دفن ہے۔"

کشتی ساحل سے آلگی۔

ایم اسلم

نیا مریض

ہوا بھی کچھ کچھ تھکی تھکی تھی ندی بھی ممکن ہے تھم گئی ہو
ستارے آنکھیں جھپک رہے تھے چاند پھیکا پڑا ہوا تھا

سونے والی کے گیسوؤں کی مہک تھی کمرے میں بھینی بھینی
سانس رک رک کے آ رہا تھا سینہ اٹھتا تھا بیٹھتا تھا

وہ خواب میں کر رہی تھی ماتم، لٹی لٹی سی جوانیوں کا!
کہ گورے گورے سے اس کے گالوں پہ ایک آنسو چمک رہا تھا

سائے ڈھل چکے تھے۔ سینی ٹوریم کے دروازے پر ایک کار آ کر رکا۔ ایک جوان لڑکی۔ ایک بھاری بھرکم عورت۔ خادمہ اور ایک نوکر اترے۔ دو تین سوٹ کیس بستر اور کچھ اور سامان بھی ساتھ۔ مزدور ادھر ادھر سے بھاگ کر آ گئے اور موٹر پر سے اسباب اتارنے لگے۔ لڑکی نے فاختی رنگ کی ساری پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں ملے جلے رنگ کی نفیس ہیل کا سینڈل تھا۔ پتلی پتلی گوری گوری کلائیوں میں سونے کی باریک باریک چوڑیاں تھیں۔ بائیں ہاتھ کی کلائی میں سونے کی ایک خوبصورت گھڑی تھی۔ اور سیاہ رنگ کا نگینہ گوری گوری نازک کلائی میں بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ پتلی پتلی انگلیوں میں جڑاؤ انگشتریاں تھیں۔ ناخن کیوٹکس سے سرخ ہو رہے تھے۔ کانوں میں مرصع آویزے تھے اور گلے میں خوبصورت لاکٹ۔ چھوٹا سا قد۔ پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نرگسی آنکھیں۔ صراحی دار گردن۔ ریشم ایسے لامبے بال اور ان خوبصورت بالوں میں ہلکی سنہری جھلک۔ بیس بائیس سال عمر۔ لیکن اس عمر میں حسن کا کارواں لٹا لٹا معلوم ہوتا تھا۔ شکل و صورت صاف بتلا رہی تھی کہ مریضہ یہی ہے۔

اور اس بھاری بھرکم عورت کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ بدن پر سونے کے دو چار زیور بھی تھے۔ چہرہ گو کچھ بے رونق سا تھا۔ لیکن بڑے ٹھسے کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ سینی ٹوریم کے ایک ملازم نے پاس آ کر پوچھا۔

"آپ نے کوئی کمرہ لے رکھا ہے یا علیحدہ انتظام ہے؟"

"ہاں!" بڑھیا نے جواب دیا۔ "علیحدہ مکان کا انتظام ہے۔ موتی رام بانیئے کی دوکان کہاں ہے؟"

"یہ دس قدم آگے جاکر بازار کی نکڑ پر ہے۔" ملازم نے کہا۔ "اس کی معرفت مکان لیا ہے آپ نے!"

"ہاں!" بڑھیا نے جواب دیا۔ "اسی کو لکھا تھا۔"

"مکان تو ایسے بھی مل سکتا تھا۔" نوکر نے کہا۔

"خیر!" بڑھیا بولی "پسند کا نہ ہوا تو اور دیکھ لیں گے۔ تم یہاں کام کرتے ہو؟"

"جی ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کیسا ہے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"بہت اچھا آدمی ہے۔" ملازم نے جواب دیا۔ "پادری ہے۔"

"کس وقت مل سکیں گے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جب بھی آپ چاہیں۔" ملازم نے کہا۔ "آپ اسباب ٹھکانے سے رکھ لیں پھر ان سے مل لیں۔"

"کھانے پینے کی چیزیں تو مل سکیں گی یہاں؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جی ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔ "بازار ہے برابر میں۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ سبزی۔ دودھ۔ مکھن۔ گاؤں والے خود لے آتے ہیں۔"

"اچھا بیٹا جیتے رہو۔" بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔ پھر نوکر سے جو ایک پتھر پر بیٹھا باتیں سن رہا تھا۔

"ابے چھدّے! موتی رام کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ بی نصیبن آئی ہیں اور مکان کا پوچھتی ہیں۔"

نوکر بازار کی طرف چلا گیا۔ نصیبن نے لڑکی سے جو ایک بستر پر بیٹھی پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پوچھا۔

"انوری! تمھارے چلنے کا انتظام کیا ہو گا۔ چڑھائی نظر آ رہی ہے۔"

"پہلے مکان کا تو پتہ ملے۔" انوری نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا۔ "پھر چڑھائی کا بھی دیکھ لیں گے۔"

نصیبن نے نوکرانی سے کہا۔

"اری مرادن! اونگھ رہی ہے کیا۔ انوری کو پان تو بنا دے۔"

"مجھے نہیں چاہیئے۔" انوری نے ذرا کھانستے ہوئے کہا۔

اور مرادن مسکرا کر بولی۔

"آج تو انوری بہت تھک گئی۔"

"تو مجھے ہی ایک بنا دے۔" نصیبن نے کہا۔

مرادن پاندان کھول کر پان لگانے لگی۔ انوری نے کلیا میں سے دو ایک الائچیاں اٹھالیں۔ اتنے میں چھدّو ایک آدمی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اور مزدوروں سے اسباب اٹھانے کو کہا۔ مزدور اسباب اٹھانے لگے۔

"چلو اب تم بھی۔" چھدّو بھی ایک ٹوکری اٹھاتے ہوئے بولا۔ کچھ دور نہیں جانا اور انوری نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔

"پہلے یہ تو بتاؤ۔ مکان ہے کہاں۔ کتنی دور ہے۔ پھوٹے منہ سے کچھ کہو گے بھی۔"

"الٰہی خیر!" چھدّو کان کو ہاتھ لگا کر بولا۔

اور نصیبن بھی ذرا غصّے سے بولی۔

"اب ایکّا کیوں نہیں۔ کہاں ہے مکان۔ انوری کیسے جا سکے گی!"

"بی بی!" چھدّو بھی ذرا اکڑ کر بولا۔ "میں دیکھ تھوڑی ہی آیا ہوں۔ یہ آدمی ساتھ آیا ہے بتا دے گا۔"

"کیوں بھیا!" نصیبن نے اس آدمی سے پوچھا۔ "کتنی دُور چلنا ہوگا۔"

اس نے چیڑھ کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف ہاتھ سے بتا کر کہا۔

"ان درختوں کے پاس ہے۔ بہت اچھا مکان ہے۔ کوئی دس ایک منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

"ہم تو پہنچ جائیں گے" مرادن بولی۔ "لیکن لڑکی کیسے جا سکے گی؟"

"بالکل سیدھا راستہ ہے" قلیوں میں سے ایک بولا۔ "معمولی چڑھائی ہے۔"

"چلو!" انوری اُٹھتے ہوئے بولی۔ "وہ موا موتی رام خود کیوں نہ آیا۔"

تو خیر! کچھ اسباب قلیوں نے اُٹھایا۔ کچھ چھدّو نے سنبھالا۔ ایک آدھ چیز مرادن نے پکڑی۔ بی نصیبن نے پاندان لیا اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ منزل کی طرف چلا۔

ہسپتال سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ساتھ ساتھ تین کمرے تھے۔ گو کچا مکان ہی تھا۔ لیکن خاصا صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ شمال کی جانب برآمدہ تھا۔ مکان سے کوئی دس ایک قدم کے فاصلے پر ایک اور کوٹھری تھی۔ یہ باورچی خانے کا کام دے سکتی تھی۔ اور گودام کا بھی۔ برآمدے میں تین چار چارپائیاں رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی سامان نہ تھا۔ شمال کی جانب کہسار کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کی جھکتی ہوئی ہری بھری کھیتیاں تھیں اور عقب میں چیڑھ کے درخت تھے۔ اور ایک پہاڑی ندی کسی شوخ اور چنچل حسینہ کی طرح اچھلتی کودتی مکان کے پاس سے گزرتی تھی۔ ادھر اُدھر اور بھی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ یہی سینی ٹوریم تھا۔ اور ان میں مریض رہتے تھے۔

چھدّو اور مرادن نے جلدی سے ایک کمرے میں دری بچھائی اور چارپائی ڈال کر بستر جما دیا۔ انوری لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اور مرادن دبانے لگی۔ نصیبن نے قلیوں سے اسباب ٹھکانے سے رکھوایا۔ پھر انوری کے پاس آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بیٹی! طبیعت تو اچھی ہے؟"

"اچھی ہوں" انوری نے جواب دیا۔

مرادن بولی۔

"تم نے جلدی کی ہسپتال سے مریضوں کو اُٹھانے کی کرسی منگوالی ہوتی۔"

"ٹھیک کہا تم نے" نصیبن بولی "خیال ہی نہ آیا۔ خیر! اب اٹھو تم کچھ کھانے کا کرو۔ پہلے چائے تیار کر لو۔ بازار سے دودھ ابھی آجاتا ہے۔"

مرادن اُٹھ کر باورچی خانے کو چلی گئی۔

سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ انوری برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ وادیوں میں بادل نے چھاؤنی چھائی تھی۔ تارپین کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ نصیبن نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا تھا۔ اور اب اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ڈاکٹر آیا۔ اس کے ساتھ اس کی میم اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر بھی تھا۔ نصیبن اور انوری نے اُٹھ کر سلام کیا۔ چھدّو دو اور کرسیاں اُٹھا لایا۔ ڈاکٹر اور اس کی میم دونوں بیٹھ گئے۔ نصیبن اور دیسی ڈاکٹر کھڑے رہے۔

ڈاکٹر کی میم نے انوری کی طرف دیکھ کر شوہر سے کہا۔

" ہاؤ ڈیری بیوٹی فل شی از ! (لڑکی کتنی خوبصورت ہے)

اور ڈاکٹر نے کہا ۔

" بٹ لکس سِک ! (لیکن بیمار معلوم ہوتی ہے)۔

ڈاکٹر کے جو بہت اچھی ہندوستانی بولتا تھا ۔ پوچھنے پر نصیبن نے بتلایا ۔ کہ انوری اس کی اکلوتی بیٹی ہے ۔ چار پانچ مہینے سے کھانسی کی شکایت ہے ۔ کسی وقت بخار بھی ہو جاتا ہے ۔ اور ڈاکٹروں کے مشورے سے بیٹی کو سینی ٹوریم میں علاج کے لئے لائی ہوں ۔

ڈاکٹر نے انوری سے پوچھا ۔

" بخار کس وقت ہوتا ہے اور کتنا ہوتا ہے ؟"

انوری نے کہا ۔ کہ کبھی دوپہر کو ہو جاتا ہے ۔ کبھی شام کے وقت ٹمپریچر کبھی سو کبھی ایک سو ایک ہو جاتا ہے ۔

" نیند کیسے آتی ہے ؟" ڈاکٹر نے پوچھا ۔

" بہت کم ! " انوری نے جواب دیا ۔ " اور کھانسی بھی رات کے وقت ہی زیادہ پریشان کرتی ہے ۔"

ڈاکٹر مسکرا کر بولا ۔

" فکر مت کرو ۔ اچھی ہو جاؤ گی ۔ کل نو بجے ہسپتال میں معائنہ کرنے کے بعد دوا تجویز کی جائے گی ۔"

نصیبن ہاتھ جوڑ کر بولی ۔

" حضور ! میری بیٹی اچھی ہو جائے تو عمر بھر بندی بن کر رہوں گی ۔"

ڈاکٹر کی میم نے مسکرا کر کہا ۔

اچھا ہو جائے گا ۔ اس کا شادی ہو گیا ؟"

نصیبن نے کہا کہ ہم ناچ گانے کا کام کرتے ہیں ۔ یہی ایک لڑکی زندگی کا سہارا ہے ۔

" ہم کو کسی روز ناچ دکھاؤ گی ؟" میم نے انوری سے پوچھا ۔

" انوری مسکرانے لگی ۔" نصیبن نے کہا ۔

" میری بچی اچھی ہو جائے گی ۔ تو ضرور دکھاؤں گی ۔"

انوری کو سینی ٹوریم میں آئے بہت روز ہو چکے تھے ۔ باقاعدہ علاج اور پرہیز سے اس کی صحت دن بدن اچھی ہو رہی تھی ۔ لیکن وہ ہر وقت کچھ اداس اداس سی رہتی ۔ پہاڑوں کے سکوت میں اسے گزرے ہوئے ایام کی یاد بہت ستاتی ۔ رامش و رنگ کی محفلیں ، قدر دانوں کی قدر افزائیاں ۔ چاہنے والوں کی ناز برداریاں ، منتیں ۔ خوشامدیں اور بے قراریاں بات بات پر قسم کھانا ۔ وفا کے قول و قرار ۔ نت نئے تحائف ۔ نئی سوغاتیں ۔ دلداریاں اور دلنوازیاں ، کوئی زیور بنوا کر لا رہا ہے ۔ کسی کے ہاں سے سواری آرہی ہے ۔ کوئی سیر کرنے کو موٹر بھیج رہا ہے ۔ لیکن ایک انوری ہے جو سب کی ہے اور کسی کی بھی نہیں ۔ ایک دل کس کس کو دے ایک جان کس کس کی نذر کرے ۔ دین ایمان ! صرف روپیہ ! روپیہ ! جس کی جیب بھاری وہی سب پر بھاری ۔

وہ گلابی جاڑے کی رات ! چھٹکی ہوئی چاندنی ۔ سیماب کی طرح حوض کا چمکتا ہوا پانی ۔ اور رامش و رنگ ! وہ نگاہوں کے تیر اور اہل محفل کی بیقراریاں !

وہ رات ! وہ دلفریب رات !

رات کا وقت تھا ۔ انوری پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی ۔ چھدا برآمدے میں لحاف میں بیٹھا خراٹے بھر رہا تھا ۔ نصیبن ساتھ کی کوٹھڑی میں سوئی ہوئی

پھنکارے مار رہی تھی۔ اور انوری کے پاس مراد ان فرش پر سوئی ہوئی تھی۔ کمرے کے دونوں کواڑ بند تھے۔ لیکن کھڑکی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھلی تھی۔ چاندنی چیڑھ کے درختوں میں سے چھن کر آ رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور پہاڑی ندی فراق کی راگنی الاپتی مکان کے پاس سے گزر رہی تھی اور انوری ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک حسین خواب۔

شہر کے ایک مشہور سیٹھ کا بیٹا بدری ایک مدت سے انوری پر جان چھڑکتا تھا۔ مکان پر آتا۔ گانا سنتا اور سو پچاس نذر کئے۔ اور چلا گیا۔
کچھ روز اسی طرح گزر گئے پھر تحائف آنے شروع ہوئے۔ اور وہ بھی بن مانگے کبھی کوئی زیور پیش ہو رہا ہے۔ کبھی کوئی قیمتی ساری نذر ہو رہی ہے۔ کبھی انوری کے لئے قسم قسم کے ملبوسات بن رہے ہیں۔ سہیلیوں کے ساتھ سینما جانا ہو یا کہیں سیر و تفریح کو تو موٹر بھیجا جا رہا ہے۔ کبھی نصیبن آٹے کی بوری منگوا رہی ہے۔ کبھی گھی کا کنستر آ رہا ہے۔ کبھی یہ کبھی وہ! کیا مجال جو ایک روز بھی خالی جائے۔ اور نہیں تو دو چار روپے کا پھل تو کہیں گیا نہیں۔ یہ سب کچھ تو ہے لیکن تخلیہ میں انوری سے بات کرنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ نصیبن سو عیاروں کی ایک عیار۔ ادھر انوری کو ہنسکر بات کرنے میں حجاب اور بدری حرفِ مطلب زبان پر لانے کے لئے بیتاب۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ انوری کے ناچ گانے کی دور دور تک دھوم تھی۔ گلے میں رس اور آواز میں کوئل کا سوز تھا۔ اور وقت کی مشہور گانے والیوں میں شمار ہوتی تھی۔ دور دور سے ناچ گانے کے پیغام آ رہے ہیں۔ مہینے میں دس روز گھر تو بیس روز باہر۔ لیکن سفر کے تمام اخراجات بدری کی جیب سے نکل رہے ہیں۔

اُدھر انوری کہیں سے واپس آئی۔ اُدھر بدری کا نوکر جو پل پل اور گھڑی گھڑی کی خبر رکھتا تھا۔ آیا۔ لیکن جواب کیا لے کر گیا۔
"سیٹھ جی سے ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ ابھی تو انوری بہت تھکی ہوئی ہے۔ دو ایک روز بعد تشریف لائیں"۔
اور ادھر انوری کسی اور کی آغوش میں بیٹھی مکر اور فریب کے جادو جگا رہی ہے۔

اِسی اثنا میں بدری کا باپ مر گیا اور بی نصیبن کے لئے وہی بات ہوئی کہ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اب بدری کی مراد بھی بر آئی۔ اور اس خوشی میں بدری نے گلابی باغ میں اپنے دوستوں کو دعوت دی۔ آج انوری کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ اور نصیبن بھی رانی بنی ہوئی تھی۔ شہر کی دو ایک اور بھی گانے والیاں بلائی گئی تھیں۔ جب وہ گا چکیں تو انوری کی باری آئی۔ انوری کے ناچ نے سب کو مسحور کر دیا۔ پھر اس نے کچھ گا کر سنایا۔ آج انوری پر اتنے روپے نچھاور ہوئے کہ نصیبن کی جھولی بھر گئی۔ انوری اور اس کی ماں نصیبن تو شاداں و خراماں گھر آئیں۔ لیکن دوسری گانے والیاں ایک داغ حسرت لے کر لوٹیں۔

لیکن آج وہی انوری جس پر کبھی یہ مثال صادق آتی تھی۔ کہ یک انار و صد بیمار۔ آج خود بیمار تھی۔ اور چاہنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی خیر خیریت پوچھنے کا خیال نہ آیا۔ نہ کوئی سندیسہ۔ نہ پیام نہ خط۔

انوری سو رہی تھی۔ ہوا بھی شاید کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ اور ندی بھی غالباً تھم گئی تھی، سناٹے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ چاند بھدکا پڑ چکا تھا۔ اور سونے والی کے سنہری رنگت والے خوبصورت بالوں کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اور سینہ اُبھرتا اور بیٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ شاید انوری خواب میں اپنی اُجڑی جوانی کا ماتم کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی پلکوں کے سائے میں آنسو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

انوری کا وقت عموماً گھومنے گھامنے میں گزرتا تھا۔ دھوپ ہوتی تو وہ ندی پر جا بیٹھتی۔ کبھی تنکے اُٹھا اُٹھا کر پانی میں پھینکتی۔ کبھی کاغذ کی ناؤ بنا بنا کر ندی میں بہاتی اور میٹھے میٹھے گیت گاتی۔ وہ گیت جس کے سننے کو کبھی ایک دُنیا بیتاب رہتی تھی۔ لیکن اب اسے دنیا پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے نام سے بھی بیزار معلوم ہوتی تھی۔ اور تو اور اسے اپنی ماں سے بھی اب نفرت تھی۔ وہ ماں جس کے لالچ اور ہوس نے اسے اس حال پر پہنچا دیا تھا۔ نصیبن کا دین ایمان خدا جو کچھ بھی تھا۔ پیسہ تھا۔ اور لوگوں کی جیب سے پیسہ کھینچنے کے لئے اس کے پاس ایک مقناطیس بھی تھا۔ اور اس مقناطیس کا نام تھا انوری۔ لیکن تاب کے احد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالیوں نے اب انوری کو بھی موت

کے گھاٹ پہ لاکھڑا کیا تھا۔

انوری نے تھوڑے ہی دنوں میں گاؤں کی عورتوں سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ گاؤں میں بھی دس بارہ گھر تھے۔ انوری جب کسی کے گھر جاتی تو اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آجاتیں۔ ان عورتوں سے انوری کو باتیں کرنے میں بہت لطف آتا۔ وہ ہنستی تو دوسری عورتیں بھی ہنسنے لگتیں۔ ہر ایک کو یہی تمنا ہوتی کہ وہ کبھی ان کے گھر میں بھی آجائے۔

ایک روز جو وہ گاؤں میں گئی تو اسی گوالے کے ہاں جو انہیں دودھ دیا کرتا تھا۔ جا بیٹھی۔ دو ایک روز سے دودھ اچھا نہیں آتا تھا اس لئے وہ شکایت کرنے گئی تھی۔ گوالا تو موجود نہ تھا لیکن اُس کی بیوی موجود تھی جب انوری نے اس سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم دودھ میں پانی ملا کر لاتے ہو۔ تو گوالے کی بیوی نے کہا۔

"بی بی! قسم لے لو جو ہم نے کبھی آج تک دودھ میں ایک قطرہ بھی پانی کا ملایا ہو۔ دُودھ تو خدا کا نور ہوتا ہے۔ اتنا ظلم کر کے کسی نے دوزخ مول لینا ہے کیا۔ ایسے کام تو شہر والے ہی کرتے ہیں"۔

"او ہو!" انوری نے ہنسکر پوچھا۔ "تم ہم لوگوں کو بہت بُرا سمجھتی ہو"

"نہ بی بی!" گوالن بولی۔ "خدا نہ کرے تم بری ہو لیکن شہر والے تو سنتی ہوں خدا کو بھی بھولے رہتے ہیں۔ اور ایک ہم لوگ ہیں کہ بس اسی کے سہارے ان بنوں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں"

"تمہارا دل یہاں کیسے لگتا ہے"۔ انوری نے پوچھا۔

"وطن جو ہوا!" پاس سے ایک اور نے کہا "وطن کسے پیارا نہیں ہوتا"

ایک اور نے پوچھا۔

"بی بی! تمہارا بیاہ نہیں ہوا ابھی"

"ہو چکا" انوری ہنسکر بولی "مدت ہو گئی"

"تمہارا شوہر ساتھ ہی آیا ہو گا" اس نے پوچھا۔

"نہیں" انوری نے جواب دیا۔

"کہیں شہر میں ملازم ہو گا" ایک اور نے پاس سے کہا۔

اور انوری نے ہنسکر کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ چھوڑ دیا میں نے"

"چھوڑ دیا؟" ایک دو عورتوں نے تعجب سے پوچھا "طلاق لے لی کیا"

"نہیں" انوری نے ہنسکر کہا "میں نے طلاق دے دی"

"بن نہ آئی ہو گی" ایک بڑھیا نے کہا۔

ایک اور بولی۔

"تو پھر اور شادی نہیں کرو گی؟"

کی تھی" انوری نے جواب دیا۔ لیکن اسے بھی چھوڑ دیا۔

سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ گوالن بولی۔

"جب ساتھ نہیں آیا تو چھوڑنا ہی ہوا نا۔"

اور انوری نے ہنس کر کہا۔

"نکال دیا اسے بھی گھر سے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اٹھی۔ اور واپس چلی گئی۔

اسی گاؤں میں ایک جوان لڑکا بھی رہتا تھا۔ یہی بیس اکیس کے لگ بھگ عمر ہو گی۔ اس کا نام تھا میر عالم۔ میر عالم گو ایک مفلس بڑھیا کا مفلس بیٹا تھا۔ لیکن قدرت نے اسے مردانہ حسن عطا کرنے میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔ میر عالم گاؤں والوں کی گائیں بھینسیں چراتا اور اس کے عوض اسے دونوں وقت کی روٹی مل جاتی اور فصل ہونے پر کچھ اناج۔ انوری جب گاؤں میں آتی تو میر عالم کچے اخروٹ انوری کے لئے توڑ کر لاتا۔ اور وہ بھی اسے کبھی دونی کبھی چونی دے دیتی۔ کبھی کبھی میر عالم سڑک تک بھی اس کے ساتھ آ جاتا۔

ایک روز انوری ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ ہوا چیڑھ کے درختوں میں سنک رہی تھی۔ اور دھوپ پتوں میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اتنے میں کہسار کے سکوت میں کہیں دور بنسری کی سریلی آواز جادو جگانے لگی۔ انوری نے ادھر اُدھر دیکھا۔ لیکن بنسری بجانے والا کہیں نظر نہ آیا۔ لیکن آواز تدریج نزدیک چلی آ رہی تھی۔ اچانک انوری نے میر عالم کو دیکھا۔ میر عالم اپنی دھن میں بنسری بجاتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن جب اس نے انوری کو دیکھا تو بنسری بجانی چھوڑ دی۔ اور اس کے پاس آ کر اپنے پھٹے ہوئے کرتے کی جیب سے ایک بھنا ہوا بھٹا نکالا اور کہا۔

"یہ لو گرم ہے ابھی۔"

انوری نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم کھاؤ۔ اپنے لئے بھی تو لائے ہو گے۔"

"نہیں!" میر عالم نے سادگی سے جواب دیا۔ "تمہارے لئے لایا ہوں۔"

"لیکن اس وقت میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں۔" انوری نے جواب دیا۔

"میں پیسے لینے کو نہیں لایا۔" میر عالم نے جواب دیا۔ "میں بھکاری نہیں۔ محنت کرتا ہوں اور روزی کماتا ہوں۔"

"نہیں! نہیں!" انوری نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں۔ لیکن اگر کوئی کسی سے چیز لے تو اس کی قیمت تو دینی چاہیئے۔"

"امیر لوگ یوں ہی کہا کرتے ہیں۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"لیکن میں تو امیر نہیں۔" انوری نے ہنس کر کہا۔

میر عالم کے ایک ہاتھ میں بھٹا تھا۔ دوسرے میں بنسری۔ اس کے چہرے پر جوانی کی رنگت تھی۔ چھوٹی چھوٹی خمدار مونچھیں تھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی تھی۔ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ لیکن اس مفلسی اور غربت میں بھی اس کی چال میں ایک وقار تھا۔ بات بھی کرتا تو ذرا مسکرا کر۔ انوری نے اس سے بھٹا لے لیا اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھانے لگی۔

"سچ کہتے ہو" انوری نے پوچھا "تم میرے ہی لئے بھون کر لائے ہو۔"

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "تمہارے لئے۔"

"لیکن تم نے کیسے جانا کہ میں اس وقت تمہیں ندی پر ملوں گی"۔ انوری نے پوچھا۔

"میں نے کئی بار تمہیں یہاں بیٹھے دیکھا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"چھپ چھپ کر دیکھا کرتے ہو گویا؟" انوری نے ہنس کر کہا۔

"مجھے چھپ کر دیکھنے کی ضرورت ہے"۔ میر عالم نے جواب دیا۔

"لیکن!" انوری نے پھر پوچھا "تم مجھے دیکھا کیوں کرتے تھے"

"جو چیز آنکھوں کے سامنے آجائے۔ انسان اسے دیکھ ہی لیتا ہے"۔ میر عالم نے جواب دیا۔

انوری بولی۔

"بھٹا تو میں نے کھا لیا۔ لیکن اگر پیٹ میں درد ہوا تو پھر"

ایک بھٹا کھا لینے سے کیا میر عالم نے تعجب سے کہا "مجھے تو جلنے بھی ملیں کھا لیتا ہوں"

"تم تگڑے آدمی ہو"؟ انوری نے مسکرا کر کہا "میں بیمار ہوں۔ مجھے ڈاکٹر نے ایسی چیزیں کھانے سے منع کر رکھا ہے"

"تو پھر تم نے کھایا کیوں"! میر عالم نے کہا۔

"کوئی اگر محبت سے کچھ دے تو کیسے انکار ہو سکتا ہے"؟ انوری نے جواب دیا۔

میر عالم نے کچھ جواب نہ دیا۔ انوری بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو"؟

"میں ڈر رہا ہوں کہیں تمہیں پیٹ میں درد نہ ہونے لگے"۔ میر عالم نے جواب دیا۔

"ڈرو نہیں"! انوری بولی "جو چیز محبت سے کوئی کھلائے اس سے تکلیف نہیں ہوتی۔ تم بھی تو محبت ہی سے لائے تھے نا"

میر عالم صرف مسکرا دیا۔ انوری بولی۔

"تم بنسری تو خوب بجاتے ہو"

"تم سنو گی"؟ میر عالم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں"! انوری نے جواب دیا "سنوں گی۔ بجاؤ تو"

میر عالم بھی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور بنسری بجانے لگا۔ اور انوری پھر کھوئی ہوئی محبت کے خواب دیکھنے لگی۔

میر عالم کو انوری سے باتیں کرنے کا کیوں شوق تھا۔ یہ تو میر عالم کو معلوم ہوگا۔ لیکن انوری کو آج پھر وہی فریبوں کی دنیا آباد کرنے کے سامان نظر آرہے تھے وہ جب سے یہاں آئی تھی۔ اس کا غنچۂ دل ہمیشہ مرجھایا رہتا۔ کہاں وہ دن کہ ملنے والے سو سو پھیرے ڈال رہے ہیں۔ جگہ جگہ سے بلاوے آرہے ہیں۔ ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے۔ اور کہاں آج یہ حالت کہ دل بہلانے کا کوئی سامان ہی نہیں لیکن قدرت کو شاید اس پر پھر رحم آگیا تھا۔ جو اس نے دل لگی کے لئے میر عالم کو اس کے پاس بھیجا تھا۔ میر عالم جوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ اور سادہ لوح تھا۔ تو پھر میر عالم ہی انوری کے لئے کھلونا کیوں نہ بنے۔ جیتا جاگتا۔ چلتا پھرتا۔ ہنستا بولتا کھلونا اور اس نوجوان کے دل میں محبت کی گرمی پیدا کر دینا تو انوری کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اور نہیں تو وقت تو اچھا کٹ جائے گا۔

اور ہو سکتا ہے کہ انوری کی بیچارگی اور مایوسی پر قدرت نے ترس کھا کر اسے سنبھلنے کا ایک موقع دیا ہو۔ اور میر عالم کے ذریعہ اس کا امتحان لینا چاہتی ہو پھر کیف واقعات سے خود بخود روشن ہو جائے گا کہ عورت کی فطرت بدل سکتی ہے یا نہیں۔

تو خیر! انوری نے تھوڑے ہی دنوں میں میر عالم سے تعلقات کچھ اس قدر بڑھا لئے کہ اب وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ جب دیکھو دونوں اکٹھے نظر آتے۔ کبھی انوری کسی درخت کی شاخ پر بیٹھتی اور میر عالم شاخ کو پکڑ کر جھولا دیتا۔ اور انوری جھولا جھولتی۔ کبھی دونوں بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتے۔ کبھی میر عالم بنسری بجاتا اور انوری گاتی۔ کبھی دونوں مل کر جھومر ڈالتے۔ کبھی انوری اسے میٹھے میٹھے گیت یاد کراتی۔ پھر دونوں

مل کر گاتے۔ گائے بھینسیں چرتی چگتیں دور نکل جاتیں۔ اور میر عالم کو خبر تک نہ ہوتی۔

ایک روز دونوں ندی پر بیٹھے تھے۔ انوری نے پوچھا۔

"ماشاء اللہ! تم جوان ہو شادی کیوں نہیں کرتے۔"

"شادی؟" میر عالم نے مسکرا کر کہا "مجھ سے کون شادی کرے گی؟"

"کیوں؟" انوری نے پوچھا "کیا انکار ہو سکتا ہے کسی کو؟"

"میرے پاس رکھا ہی کیا ہے" میر عالم نے جواب دیا "جو کوئی میری جورو بننے پر راضی ہو گی؟"

"لیکن تمھارا دل تو کرتا ہو گا؟" انوری نے مسکرا کر پوچھا۔

"دل کس کا نہیں کرتا" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر کوئی لڑکی پسند بھی آئی؟" انوری نے پوچھا "کبھی کسی سے محبت بھی کی تم نے؟"

"جب میں ہی کسی کو پسند نہیں، تو میں کسی کو کیوں پسند کروں" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"لیکن کسی سے محبت تو ہو گی؟" انوری نے پوچھا۔

"نہیں!" میر عالم نے جواب دیا۔

"میر عالم!" انوری ہنس کر بولی "مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔ کبھی دل سے بھی پوچھا؟"

"دل سے کیا پوچھنا ہے" میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا "دل کی باتیں تو الٹی ہی ہوتی ہیں"

"تم میری بات کا جواب دو" انوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "کبھی کسی سے محبت کی تم نے؟"

"نہیں!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"سچ کہتے ہو؟" انوری نے پوچھا "کھاؤ تو میرے سر کی قسم"

لیکن میر عالم بنسری بجانے لگا۔ سڑک کی جانب سے کبھی کبھی کسی لاری یا موٹر کی آواز سنائی دینے لگتی۔ کبھی کسی پیڑ پر سے جنگلی کوّے کی بھدّی سی آواز آنے لگتی۔ میر عالم ایک بے خودی سے بنسری بجا رہا تھا۔ اور انوری چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینک رہی تھی۔ ننھے ننھے گرداب پیدا ہوتے اور مٹ جاتے۔

جانے اس وقت انوری کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے میر عالم سے بنسری لے لی۔ اور خود بجانے لگی۔ بھلا اس سے کہاں بجتی تھی۔ میر عالم ہنس کر بولا۔

"بنسری تمھیں بجانی نہیں آتی۔ لیکن نقل خوب اتارتی ہو۔"

"تم نے کبھی سکھائی ہوتی تو بجانا بھی آجاتی" انوری نے کہا "خیر چھوڑو یہ باتیں تم یہ بتاؤ تمھیں میرے پاس بیٹھنا پسند ہے؟"

"یہ کیا پوچھا تم نے" میر عالم نے ہنس کر کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا!"

"اچھا!" انوری نے کہا "تم یہ بتاؤ میں خوبصورت ہوں یا نہیں؟"

"بہت!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"تمھیں پسند ہوں؟" انوری نے پوچھا۔

"بہت!" میر عالم نے پھر ہنس کر کہا۔

"کیوں؟" انوری نے پوچھا۔
"معلوم نہیں!" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔
"معلوم کیوں نہیں!" انوری نے پوچھا۔
"بس!" میر عالم نے کہا۔ "معلوم نہیں!"
"تمھیں مجھ سے محبت ہے؟" انوری نے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ۔"
"سچ سچ!" میر عالم نے کہا۔
"ہاں!" انوری نے کہا۔ "سچ سچ!"
"تو کل بتاؤں گا!" میر عالم نے جواب دیا۔
"آج کیوں نہیں؟" انوری نے پوچھا۔
"پوچھ کر بتاؤں گا!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔
اور انوری نے تعجب سے پوچھا۔
"پوچھ کر۔ کس سے؟"
"دل سے!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔
یہ سُن کر انوری کو خیال ہونے لگا کہ جسے وہ بالکل سادہ لوح سمجھتی تھی وہ کچھ ہوشیار بھی ہے۔

ایک روز رات کا وقت تھا۔ اور انوری سو رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی جو جنگل کی طرف کھلتی تھی۔ آدھی کھلی تھی اور آدھی بند چاندنی پتوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اور میر عالم اس وقت ندی کے کنارے بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ شاید انوری کو کسی مچھر نے کاٹا ہوگا۔ جو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ساتھ ہی بنسری کی بھنک کان میں پڑی پہلے تو اس نے جانا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ بلکہ ایک حقیقت تھی اور وہ بیدار تھی۔ کچھ دیر تو وہ پلنگ پہ ہی لیٹی رہی پھر کمبل اوڑھ کر چپکے سے گھر سے نکلی اور ندی کے کنارے کنارے چلی۔ چھٹکی ہوئی چاندنی رات کی خاموشی۔ جنگل کا سکوت کائنات سوئی ہوئی۔ ندی کا پانی چمکتا ہوا اور بنسری کی پُرسوز آواز۔ انوری کو آج ایک ایسی کیفیت ایک ایسا لطف اور ایک ایسی خوشی محسوس ہونے لگی جو آج سے پہلے اسے کبھی میسّر نہ ہوئی تھی۔ میر عالم خاموش بیٹھا ایک ایسا نغمہ بجا رہا تھا۔ جو دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہا تھا اور جوانی کے جذبات کو بیدار کرنے والا تھا۔ جانے کیوں انوری کا دل بھی اس وقت دھڑک رہا تھا۔ وہ کبک کی طرح مست اداؤں کے ساتھ قدم اُٹھاتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ لیکن میر عالم کو جیسے خبر تک نہ ہوئی آخر انوری بولی۔

"میر عالم! کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"
میر عالم نے ایک چیڑ کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"یہ درخت دیکھتی ہو۔ چاند ابھی اس کے عقب میں تھا۔ جب میں یہاں آیا۔"
"کوئی بھینس جنگل میں کھو گئی تھی کیا۔ جو اس وقت گاؤں سے نکل آئے؟" انوری نے پوچھا۔
"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "کچھ کھو ہی گیا ہے!"
"کیا؟" انوری نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کھو بیٹھے تم؟"

میرے پاس ایک "من" تھا۔ میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "دنیا میں یہی میری دولت تھی۔ اور اسی پر مجھے بھروسہ تھا۔ ایک روز ایک خوبصورت ناگن کہیں سے آنکلی۔ اور چپکے سے میرا "من" مجھ سے چھین کر لے گئی"۔

"ناگن؟" انوری نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "لیکن بڑی خوبصورت!"

"تو تم اس ناگن کو بلانے کے لئے اس وقت بنسری بجا رہے تھے؟" انوری نے پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔

"تو پھر ناگن آئی بھی یا نہیں؟" انوری نے پوچھا۔

میر عالم نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور سر جھکا لیا۔ انوری کچھ دیر اس کی طرف خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ پھر میر عالم نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"لیکن تم کیوں آئیں اس وقت؟"

انوری نے میر عالم سے بنسری لے لی۔ اور ہونٹوں سے لگا کر مسکرا مسکرا اس کی طرف دیکھنے لگی۔

میر عالم ہنس کر بولا۔

"سمجھا! بنسری کی آواز نے جگا دیا تمہیں؟"

"ہاں!" انوری نے مسکرا کر کہا۔ "اور اب تمہیں جرمانہ ادا کرنا ہوگا"۔

"منظور!" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔

"کیا دو گے؟" انوری نے پوچھا۔ "بولو!"

"پانچ بھنے ہوئے بھٹے!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

انوری بھی ہنسنے لگی۔

"تم نے دل سے مشورہ کر لیا؟" انوری نے پوچھا۔

"ہاں کر لیا!" میر عالم نے جواب دیا۔

"پھر کیا کہا دل نے؟" انوری نے پوچھا۔

"دل نے کہا کہ پوچھنے والا اپنے دل سے پوچھے"۔ میر عالم نے ہنس کر جواب دیا۔

"تمہیں تو کچھ نہیں بتایا؟" انوری نے پوچھا۔

"نہیں!" میر عالم نے کہا۔

"میں بتاؤں"۔ انوری بولی۔ "تمہارا دل کیا کہہ رہا ہے"۔

"ہاں بتاؤ!" میر عالم نے کہا۔

انوری نے اپنی نازک اور خوبصورت باہیں میر عالم کے گلے میں ڈال دیں اور مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے نا!"

میر عالم مسکرانے لگا۔ انوری بھی مسکرا رہی تھی۔ اور شاید ستارے بھی مسکرا رہے تھے اور ندی کے کنارے جو بوٹے تھے وہ بھی رقص کرتے معلوم

ہوتے تھے۔ چاند ہالے میں چھپ گیا تھا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ پہاڑ کی آب و ہوا۔ دوا اور پرہیز سے انوری کی کایا پلٹ گئی تھی۔ سردی بھی کچھ پڑنے لگی تھی۔ اور ڈاکٹر نے انوری کو واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اور واپسی کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن میر عالم غریب کو ان باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ دن انوری کے ساتھ گزرتا رات سہانے خواب دیکھتے کٹ جاتی۔ جس روز انوری کو جانا تھا۔ اس رات وہ میر عالم سے جنگل میں ملی۔ رات کافی سرد تھی۔ مطلع آسمان صاف تھا۔ شبنم پڑ رہی تھی۔ ہری ہری گھاس گیلی معلوم ہوتی تھی۔ ستاروں نے اپنی بساط بچھا رکھی تھی۔ اور ندی پر آج اداسی کا عالم چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ محوِ خواب تھا۔

"اُف توبہ!" انوری نے میر عالم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "آج تو بہت سردی ہے۔"

"ہاں میر عالم نے کہا "اب رات کے وقت باہر مت آیا کرو۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔"

"تم یہ کہو۔" انوری بولی "کہ تمہیں جاڑا لگتا ہے۔"

"میرا کیا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا "میں تو ہوں جنگل کا رہنے والا۔ گاؤں ہو یا جنگل میرے لئے برابر ہے۔ جہاں نیند آگئی۔ وہیں سو رہا۔"

"اور میں؟" انوری نے پوچھا۔

"تم پھولوں کی سیج پر سونے والی پھولوں کی رانی۔" میر عالم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھولوں کی رانی! میں؟" انوری نے اس کے سینے کے ساتھ سر لگا کر کہا "اور تم! بن کے راجہ! ٹھیک ہے نا؟"

"جو کچھ تم سمجھو!" میر عالم نے جواب دیا۔

"میر عالم!" انوری نے ہنس کر پوچھا "سچ بتاؤ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" میر عالم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے؟" انوری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میں غریب کیا بتاؤں۔" میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"تم نے آہ کیوں بھری؟" انوری نے پوچھا "ناراض ہو کچھ؟"

"تم سے؟" میر عالم نے مسکرا کر کہا "تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔"

"میں جان لے کر کیا کروں گی۔" انوری نے مسکرا کر کہا "کچھ اور دو۔"

"دینے کو کچھ ہوتا تو کیا چھپا کر رکھتا۔" میر عالم نے پھر ایک آہ بھر کر کہا۔

"من کہاں ہے؟" انوری نے پوچھا۔

"من جس کے پاس ہے تمہیں معلوم ہی ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں جب تمہارے پاس نہیں ہوتی تو مجھے کبھی یاد بھی کیا کرتے ہو؟" انوری نے پوچھا۔

"یاد آدمی اسے کرتا ہے جو پاس نہ ہو۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں بھی تو تمام وقت تمہارے پاس نہیں ہوتی۔" انوری نے کہا۔

"یہ تو دل کی بات ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں تمہارے دل میں رہتی ہوں کیا؟" انوری نے پوچھا۔

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" میر عالم نے جواب دیا۔

"چاند کالے کالے بادلوں میں سے اچانک جھانکنے لگا۔ دُنیا کا ذرہ ذرہ چاندی کی طرح چمکنے لگا۔ میر عالم کا ہاتھ انوری کی کمر میں تھا اور انوری کا خوبصورت سر اس کے سینے پر۔ اچانک کہیں پاس ہی سے اُلّو کی منحوس آواز سُنائی دی۔ میر عالم نے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ جب بولے گا نحوست ہی لائے گا۔"

"میر عالم!" انوری نے پوچھا۔ "مجھے کبھی یاد بھی کیا کرو گے؟"

"تو کیا جانے کا ارادہ ہے اب؟" میر عالم نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"جانا تو پڑے ہی گا۔" انوری نے ہنسکر کہا۔

"کہاں؟" میر عالم نے پوچھا۔ "مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"تم بھی تو چلے جاتے ہو۔" انوری نے کہا۔

"بس یہی ذرا گاؤں تک۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"اور میں بھی بس ذرا گھر تک ہی جاؤں گی۔" انوری نے ہنسکر کہا۔

"کب؟" میر عالم نے پوچھا۔

"اب!" انوری نے ہنسکر جواب دیا۔

میر عالم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اُٹھا لیا اور ہنسکر کہا۔

"جاؤ تو بھلا۔ کیسے جاتی ہو۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

"بہت خوش ہو۔" انوری نے پوچھا۔

"تم جو پاس ہو۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"اور جب میں پاس نہیں ہوتی۔" انوری نے پوچھا۔ "پھر بھی خوش رہتے ہو۔"

"کون کہتا ہے تم پاس نہیں ہوتیں۔" میر عالم نے اس کی ٹھوڑی ہلا کر کہا۔ "میں نے تمھیں ایسی جگہ چھپا رکھا ہے۔ کہ اب تم کہیں جا ہی نہیں سکتیں۔"

"کہاں چھپا رکھا ہے؟" انوری نے ہنسکر پوچھا۔

"اوہوں!" میر عالم نے ہنسکر کہا۔ "یہ نہیں بتا سکتا۔"

"اور اگر میں نے بوجھ لیا۔" انوری نے پوچھا۔

"بوجھو!" میر عالم نے کہا۔

انوری نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہاں۔" "ٹھیک ہے نا؟" میر عالم ہنسنے لگا۔ چاند ایک کی عیاری دوسرے کی سادگی دیکھ کر پھر بادلوں میں چھپ گیا۔

آؤ! وہ گیت گائیں!

"کیا؟"

"ہماری گلی آنا" انوری نے کہا۔ "اچھا جی!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"بہت پسند ہے تمھیں" انوری نے پوچھا۔

"اور تمھیں بھی تو پسند ہے" میر عالم نے پوچھا۔

"ہاں!" انوری نے کہا "تو گاؤ پھر"

دونوں گانے لگے۔

ہماری گلی آنا .... اچھا جی
ہمیں نہ بھلانا .... اچھا جی
پہلی محبت کی باتیں .... اور ہیں جوانی کی راتیں
گاتا ہے پی پی پپیہا .... ڈولے ہے من کی نیا
ہم تم ہیں دونوں کھویا .... اچھا جی
کشتی کنارے لگانا
ہماری گلی آنا .... اچھا جی
ہمیں نہ بھلانا .... اچھا جی

جنگل کی فضا گیت سے معمور معلوم ہوتی تھی۔ میر عالم مکان تک انوری کے ساتھ آیا۔ انوری مسکرا کر بولی۔

"میر عالم مجھے بھول نہ جانا"

میر عالم ہنستا ہوا چلا گیا۔

اگلے روز سورج نکلتے ہی ایک موٹر بسینی ٹوریم کے دروازے پر آکر رکا۔ انوری اور اس کے ساتھ والے سوار ہو کر وطن کو چل دیئے۔ میر عالم جب مویشی لے کر مکان کے پاس سے بنسری بجاتے گزرا تو مکان خالی نظر آیا۔ غریب دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اب انوری کہاں تھی۔ ایک مریض اچھا ہو کر چلا گیا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک نیا مریض برآمدے میں کھڑا بنسری بجا رہا تھا۔ اور جنگل کی خاموش فضاؤں کو اپنا دکھڑا سنا رہا تھا۔

سچ ہے عورت کی فطرت نہیں بدلتی۔

صادق الخیری

اب کے موسمِ بہار کس تابانی سے آیا ہے! ہر جگہ سبزہ، ہر طرف پھول، ہر سمت تازگی۔ گویا کائنات کو حیاتِ نو ملی ہے۔ لیکن یہ ہریالی اور یہ شادابی جاوداں نہیں۔ ایک دن اسے نذرِ خزاں ہونا ہے۔ زندگی کی بہار بھی عارضی ہے، ہماری خوشیاں بھی زوال آمادہ ہیں مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ گلشنِ حیات میں دائمی بہار کیوں نہیں آتی؟! ایسی بہار جو خزاں کو جنم نہ دے جس کے بطن سے افسردگی پیدا نہ ہو!

میرا دل چاہتا ہے کہ والد کی طرح جنھیں میں بچپن سے ڈیڈی کہتی ہوں، اپنے اہم واقعات باقاعدہ تحریر کروں۔ وہ کہتے ہیں اس سے جی بہلتا ہے اور جو بات زبان پر برملا نہیں آسکتی، وہ نوکِ قلم پر پوشیدہ طور پر آکر دل کی پھانس نکال دیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی ڈائری کسی کو نہیں دکھاتے، مجھ تک کو نہیں، بلکہ ایک دفعہ میں نے ضد کی تو وہ خاموش ہو گئے، اور اس کے بعد پھر کبھی مجھے اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ڈائری صرف اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے، یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے کسی غیر کو پڑھنے کا حق نہیں، ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے کی ڈائری پڑھنا، لکھنے والے پر ظلم ہے، یہ تو دل کی کتاب ہے اور دل کا حال سوائے خدا کے کسی اور کو جاننا زیب نہیں دیتا ——— آج میں نے ڈائری لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس میں لکھا کروں گی، اُسے کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا۔

۳۱ مارچ

یہ ڈائری نہ جانے کب شروع ہوتی، لیکن شام کو ایک عجیب بات شروع ہو گئی، یونیورسٹی کی طالبات لان کے ایک کونے میں جمع تھیں۔ گفتگو کا موضوع بار بار بدل رہا تھا، اور بات میں بات نکلتی تھی، ہم سب ہنس بول رہے تھے، چہلیں ہو رہی تھیں، کبھی سلمیٰ، کبھی عابدہ اور کبھی احمدی کو نقلِ محفل بنایا جا رہا تھا کہ ناموں کا ذکر چل نکلا۔ عابدہ ایک دفعہ ہی مجھ پر ڈھل گئی، کہنے لگی "جلیلہ میرا نام تو ماں باپ نے غلط رکھا مگر تم بتاؤ، یہ بنتِ قمر کیا ہوا؟" قدسیہ نے میری طرف سے جواب دیا "ان کا نام تو بالکل ٹھیک ہے شکل جو چاند سی پائی ہے، چشم بد دور، ذرا پیچھے ہٹ کے دیکھو، ماہ پارا ہے یا نہیں؟ یہ قدِ موزوں، یہ سنہرے بال، یہ میدہ و شہاب رنگ، یہ ماہتاب سا چہرہ..." مگر میں چپ ہو گئی، دماغ میں بے شمار افکار بہ یک وقت تیزی سے گردش کرنے لگے۔ میں ایک بات اچھی طرح نہیں سوچ پاتی کہ دوسری سطحِ ذہن پر ابھر آتی تھی۔

...... میں اُن سے نہ کہہ سکی کہ ہاں میرا نام بنتِ قمر ہے، میں قمرالزمان کی بیٹی ہوں، ڈیڈی نے یہ نام اس لئے تجویز کیا کہ وہ مجھے صرف اپنے وجود کا حصّہ سمجھتے ہیں، وہ مجھے سرتاپا اپنا ہی عکس تصوّر کرتے ہیں۔ وہ یہ بھُول جانا چاہتے ہیں کہ میری رگوں میں ایک ایسی عورت کا بھی خون دوڑتا ہے، جس نے دوسرے مرد کی خاطر، اُن سے بے وفائی کی، یہ عورت میری فرنگی ماں تھی جس نے میرے بڑے چچا کو اپنی زندگی کا ساتھی چُنا اور میری ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے ابّا کی ہو گئی، ڈیڈی نے اس سانحہ کو بہادر انسان کی طرح انگیزا، اور اس کے بعد ان کی تمام توجہات ساری شفقتیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی دیکھا کہ وہ زیادہ تر وقت میری تربیت اور نگرانی پر صرف کرتے ہیں، میرا بچپن اور لڑکپن، اُن ہی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ وہ ہی میرے باپ اور وہ ہی میری ماں ہیں۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے میرا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے —— لیکن یہ گھر کے لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ ممی نے کیوں بے وفائی کی؟ کیوں انھوں نے ڈیڈی جیسے نیک دل اور اپنی کھیلتی مالتی بچی کو چھوڑ کر دوسرے آدمی کا گھر بسایا؟

جب وہ ڈیڈی سے علیحدہ ہوئیں تو میں بہت چھوٹی تھی، جدائی کے وقت کیا ہوا ہوگا، یہ مجھے خبر نہیں بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں سنِ شعور کو پہنچ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں الگ رہنے کی عادی تھی مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا، لیکن ڈیڈی رنج سے نڈھال ہو گئے، مجھے یاد ہے جس روز ان کے مرنے کی خبر آئی، وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے بہت دیر تک یونہی دیکھا کئے حتیٰ کہ مجھے رونا آ گیا، میں اُٹھ کر ان کے پاس چلی گئی اور انھوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

ہمارا بھرا پُرا گھر ہے۔ کنبہ وسیع اور آسودہ حال ہے، جب تک ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع نہیں کیا، میں رشتے داروں سے اکثر ممی کے متعلق پوچھتی تھی، مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈیڈی کی یہ شادی بھی غلط انتخاب کا نتیجہ تھی۔ پہلی شادی اس لئے ناکام رہی کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف والدین نے کی تھی۔ ڈیڈی کو پہلی بیوی ایک آنکھ نہیں بھائی اور انھوں نے ولایت سے آکر اُسے طلاق دے دی، ولایت میں انھوں نے ممی سے شادی کی اور وہ چند سال بعد انھیں چھوڑ کر بڑے ابّا کے پاس چلی گئیں، تو گویا دونوں شادیوں میں انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ دوسری ٹھوکر بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی، اس لئے انھوں نے پھر شادی نہیں کی —— لیکن شادی میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میاں بیوی کا غلط انتخاب زندگی کو اس قدر برباد کر دیتا ہے؟

۱۸ مئی

حمید، جن سے میری نسبت ہوئی ہے مجھے وقتاً فوقتاً خط لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ پہلے وہ اپنی برتری جتاتے تھے، مگر میرے ٹوکنے پر انھوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اپنا رویّہ بدل لیا۔ لیکن جب سے وہ پی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں، انھوں نے پھر شیخی بگھارنی شروع کر دی ہے۔ ان کے خیالات میں چھچھور پن ہے اور ان کی نظر میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں معلوم ہوتی۔ دس پندرہ دن ہوئے میں نے انھیں پھر لکھا کہ آپ یہ نہ بھولئے، عورت بھی انسان ہے اور شریف انسان عزتِ نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ بس اس بات نے جیسے شتابہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب کے جو خط آیا ہے، اس میں وہ بدتمیزی پر اُتر آئے ہیں اور مجھے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ میں عنقریب ان کی بیوی بننے والی ہوں، اس لئے مجھے ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہیئے جو ان کی شان میں گستاخی ہو۔ انھوں نے میرے اس خیال کا بھی مضحکہ اُڑایا ہے کہ میں ایم۔ اے میں پولٹیکل سائنس لوں گی اور تاکید کی ہے کہ میں اب مزید تعلیم کا سودا اپنے دماغ سے نکال دوں۔ آخر میں انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں بے حجابی اور بے باکی یکسر ترک کر دوں اور شریفوں کی سی خو بو پیدا کروں تاکہ جب میں ان کے نکاح میں داخل ہوں تو ہر لحاظ سے ان کے لائق بن جاؤں —— اس خط کو پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا ہے۔ جی میں آئی اس خط کے پرزے پرزے کر دوں اور انھیں لکھ بھیجوں کہ آئندہ آپ مجھے کوئی خط نہ لکھئے، لیکن اس سے ان کا کیا بگڑتا؟ میں غصے سے

کھڑی کھڑی کانپتی رہی اور جب تک میں نے اس کا جواب نہیں لکھ لیا مجھے قطعی تسلی نہیں ہوئی۔

۴ ر جون

میرا خط پڑھ کر حمید آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس دفعہ اس نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی مجھے کبھی توقع نہ تھی۔ کیا وہ اس قدر گرا ہوا ہے جو اس نے مجھے ممی کا طعنہ دیا ہے؟ اس نے لکھا ہے "اتنا مغرور ہونا اچھا نہیں، ایسی بد زبان نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ شبہ ہونے لگے کہ تم اپنی فرنگن ماں کے نقشِ قدم پر چلو گی" یہ اس نے خط نہیں لکھا، میرے دل پر گھونسہ مارا ہے۔ شادی کے بعد تو وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا، اُٹھتے بیٹھتے ممی کے طعنے دے کر مجھے کچوکے دیا کرے گا۔ میری حالت کو کیا ہو گیا ہے؟ رونا چاہتی ہوں تو آنسو نہیں نکلتے، چیخنا چاہتی ہوں تو فریاد حلق میں اٹک جاتی ہے ضبط کرتی ہوں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ڈیڈی، اے ڈیڈی! کیا آپ مجھے اس مردود سے بیاہ دیں گے؟ اس خفاش سے، جو ابھی سے مجھے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے؟ کیا یہ شریف آدمی ہے؟ کیا یہ کبھی مجھے رفیقۂ حیات سمجھے گا؟

۱۴۔ اگست

آج جشنِ پاکستان ہے۔ چاروں طرف خوشیاں ناچ رہی ہیں، میری قوم کو آج کے دن آزادی ملی تھی اور میں بھی آج آزاد ہو گئی ہوں شب و روز سوچتے سوچتے، آخر صبح میں نے ڈیڈی کو حمید کے خطوط دکھا دیئے، میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، اور پیشتر اس سے کہ میں کچھ کہتی ڈیڈی نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں یہ منگنی ابھی توڑے دیتا ہوں"

آزادی کتنی بیش بہا شئے ہے اسے میرا دل سمجھتا ہے۔ سچ کہتی ہوں، کل تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا ہے۔ میری راتیں اندھیری ہو گئیں اور میں سمجھتی تھی کہ اب صبح کبھی نہیں ہو گی۔ مگر ڈیڈی، پیارے ڈیڈی نے میری قید کی بلائیں کاٹ ڈالی ہیں۔ انھوں نے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پر ضرب کاری لگا کر، چراغ نور پاش نصب کیا ہے، ہاں اب وہ سیاہی میری زندگی کے مطلع سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہے میرے سامنے آزادی کا سورج لبِ بام جگمگا رہا ہے۔ آج ۱۴ اگست ہے۔

۲۳ ر اکتوبر

یہ سارا ہفتہ بڑا لطیف و پُرکیف گزرا، صبح و شام سیر و تفریح، دن رات خوش کن باتیں، میری عم زاد بہن کے شوہر، جنھیں میں بھائی صاحب کہتی ہوں، جب کراچی آتے ہیں تو گویا عید آجاتی ہے وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں کوئی پینتیس چالیس سال عمر ہو گی، مگر صحت مند اور جامہ زیب ایسے ہیں کہ بالکل نوجوان لگتے ہیں، طبیعت ایسی شگفتہ پائی ہے کہ ہر وقت کنول کا کھلا ہوا پھول معلوم ہوتے ہیں سُست آدمی سے انھیں چڑ ہے، خود اس قدر چُست و چالاک ہیں کہ جوانی کا پارا پاکیئے ان کی زندگی رواں دواں ہے، ان کی گفتگو نغمہ ریز آبشار ہے، جمود سے انھیں وحشت ہوتی ہے، ان دنوں انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی، چچا زاد اور پھوپھی زاد بہنیں، بھائی، بھاوجیں اور کنبے کے دولھا، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر گئے، کبھی کلفٹن کے ساحل پہ، کبھی ملیر کے باغوں میں، کبھی ہم سینڈز پٹ کی لہروں میں گھنٹوں کھیلتے رہے۔ کبھی ہم نے ہوکس بے کی دلکش شاموں کا لطف اُٹھایا، جس دن گھر سے نہیں نکلے، تو ہم نے سینما دیکھا ہندوستانی فلم بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، ان میں بے حیائی رچتی جا رہی ہے۔ جسے دیکھ کر بعض دفعہ تو سینہ دھڑکنے لگتا ہے۔

اب کے میں نے ایک نئی بات محسوس کی، بہنوں، بھاوجوں یا بھائیوں میں اگر کوئی مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے تو بھائی صاحب فوراً میری حمایت کرتے ہیں، انھوں نے کئی مرتبہ کہا "بھئی بنتِ قمر پھول ہے۔ اسے کوئی رنج نہ پہنچایا کرو ورنہ یہ کمھلا جائے گی" اور ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے "اب کے تم مجھے بہت یاد آؤ گی!" بھائی صاحب مجھے بے حد چاہتے ہیں، ان کے پیار میں خلوص اور بزرگی میں حمایت و حفاظت ہے، لیکن ان کی گھریلو زندگی کیوں تابناک نہیں؟ آپا نہ جانے کیسی بیوی ہیں! دل کی اتنی پیاری، پر زبان کی کڑوی، ذرا ذرا

سی بات پر بگڑ جاتی ہیں اور بھائی صاحب ہر دفعہ مسکرا کر ٹال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں بڑا صبر و ضبط ہے لیکن آپا ان کے سامنے اتنی چڑچڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟ کیوں صرف انہی سے بدمزاجی کرتی ہیں؟ باقی سب کے ساتھ باتیں کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ باجی سے ان کی بڑی دوستی ہے۔ دونوں پرانی سہیلیاں ہیں، دوپہر کو وہ اُن سے رازدارانہ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے چپکے چپکے سُنا، کہ بھائی صاحب کو خوبصورت عورتیں بڑی پسند ہیں اسی لئے وہ ان پر آنکھ رکھتی ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ بھائی صاحب آوارہ ہیں، بدچلن ہیں۔

یہ میاں بیوی کا تعلق کیسا ہے؟ چاہے دونوں میں اچھی نبھتی ہو، لیکن اندر سے ٹٹولا جائے تو یہ اس سے نالاں، وہ اس سے شاکی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں، امانت مرزا۔ وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی محبت کا اظہار اتنی شد و مد سے کرتے ہیں کہ عجیب سا لگتا ہے، مگر کسی کو اس سے کیا۔ وہ خود تو اپنی بیوی کے پرستار ہیں اور ان کی بیوی اُن پر جان چھڑکتی ہیں، دراصل امانت بھائی مولوی طبیعت کے ہیں، نماز کبھی قضا نہیں کرتے اور سارے شرعی احکام کی باقاعدہ تعمیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ابھی ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر ان کا حلیہ دن بدن اسلامی ہوتا چلا جاتا ہے، ماتھے پر سجدوں کا نشان، بھرواں داڑھی، کتری ہوئی لبیں اور کثیر الاولاد ——— اللہ میاں کی ساری برکتیں انھیں میسّر ہیں۔ پچھلی دفعہ جب ہم سیر کو گئے تو میں ایک دن سمندر میں اُتر کر پانی سے خوب کھیلی تھی، سب ہی ہنسنے بولنے میں مشغول تھے۔ میں نے ایکا ایکی جو نظر اُٹھائی تو امانت بھائی میری پنڈلیوں کو جو پائینچے سمیٹنے سے کھُل گئی تھیں بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا، پھر بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ ان کی نظریں مجھ پر اکثر جمی رہتی ہیں۔ آخر وہ مجھے یوں کیوں دیکھنے لگے ہیں ——— مگر نہیں، یہ میرا واہمہ ہوگا۔ وہ بیاہتا ہیں، اور اپنی بیوی پہ فدا ہیں۔

۱۲ر جنوری

اس دوران میں میری کئی نسبتیں آئیں مگر ڈیڈی نے میرے لئے جو رشتہ پسند کیا ہے وہ سب سے اچھا ہوگا۔ ایک دن پھوپھی، چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں "خدا کرے قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں، بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں" لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلد ان کے گھر سے چلی جائے، اور میرے ڈیڈی تو مجھ کو اتنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کر کے رنجیدہ نہیں ہوں گے؟ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولہا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و شاداں رہوں گی۔

۶ر فروری

اس وقت میں بڑی مشکل سے، اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں، پرسوں . . . . . میری زندگی میں ایسا طوفان آیا جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند پڑی سو رہی تھی کہ . . . . . ہائے میں کیسے لکھوں! مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پہ کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ خوف سے میری زبان گنگ ہو گئی، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ چلتا ہوا ہاتھ، کبھی میری باہوں، کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا، ذرا دیر میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا ——— یہ دہکتا ہوا ہاتھ، یہ بھبکتا ہوا چہرہ ——— بھائی امانت مرزا کا تھا، مولوی امانت کا، اور وہ دم بہ دم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے مچلے جا رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی، مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا "ایسا نہ کرنا، ایسا نہ کرنا، تم بدنام ہو جاؤ گی ——— تم عورت ہو" میرا دماغ ماؤف ہو گیا میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور وہ مجھے بے حس و حرکت پا کر، اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے "چھوڑ دے۔ ظالم چھوڑ دے میں تیری بہن ہوں۔ دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی . . . . . خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا، میری شادی ہونے والی

ہے۔ میرے کنوار پنے کو بے داغ رہنے دے۔ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں" ——— لیکن یہ سب باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت، میرے چہرے کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا، پھر دفعتاً میرے کانوں نے سُنا کہ میری زبان میں گویائی آ گئی ہے اور میری روح چیخ کر فریاد کر رہی ہے "ڈیڈی!"

اس کی گرفت یکلخت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہونے گئے، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پہ پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح، دبے پاؤں، رُکتا رُکتا، میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

۱۰ر فروری

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں۔ غصّے، حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے۔ جی میں طرح طرح کی باتیں آتی ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا پھوپھی سے کہہ دوں، پھر خیال آتا ہے، اس کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا، نہ جانے ڈیڈی کیا کر گذریں، اور خود امانت کی بیوی کا کیا حال ہوگا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر میرا عاشق ہے۔ یہ بات کھل گئی تو صرف انہی کی نہیں، سارے خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی۔ گھر کے کسی فرد پر، کسی کو بھروسہ نہیں رہے گا۔ اندیشہ ہائے دور و دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، کم حوصلگی اور مصلحتوں نے میرے لبوں پہ مہرِ خاموشی لگا دی ہے، لیکن میں امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی، اس نے میری عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

۱۵ر فروری

وقت تیزی سے پرواز کر رہا ہے، آج سو کر اُٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا، ڈیڈی نے کہا "تمھاری طبیعت کئی دن سے سُست ہے، تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں؟ آج ڈاکٹر کو ضرور بلوا لو" ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اگر یونہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہوتی چنانچہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو بیچ کے کمرے میں وہ صاحبِ ایمان، امانت جاءِ نماز پہ کھڑا تھا۔ میرے پاؤں بلا ارادہ رُک گئے، اور اس نے معاًنیت توڑ کر میری طرف دیکھا میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اس کے پاس پہنچی، تو اس نے چھوٹتے ہی کہا "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، بہت دن سے دل کے ارمان دل میں دبے ہیں ———" میں غصّے سے بے قابو ہو گئی "فریبی! شادی شدہ ہو کر......" میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ شکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا "تم راضی ہو جاؤ تو میں فیروزہ کو چھوڑ دونگا اور ——— یہ تو حد ہو گئی۔ مجھے ایک دھکّا سا لگا، اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ——— "تو کمینہ ہے" ——— اتنے میں بھابی فیروزہ کی دُور سے مسرور لہجے میں آواز آئی "دیکھنا تم جو میرے لئے آج چکن لائے ہو، وہ واقعی لاجواب ہے"۔

میرا خیال خود بخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا، جو صحن میں بیٹھی چھپا چھپ چکن کا کُرتہ سی رہی تھیں لیکن اُنھیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کا دم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر جس وقت چاہے گا انھیں لات مار کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ اس تصوّر نے میرے غصّے کو فرو کر دیا اور میں نے حیرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا، جو میری خشمناکی اور بیوی کے ڈر سے مصلّے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا۔

۲۸ر فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی، پرہیزگار، مولوی امانت ہے، اس کی بزرگی کا بُت زمین پر اوندھے منہ گر پڑا ہے، پہلے میں اس کا جس

قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں۔ عمر کے تفاوت اور اس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا، اب میں نڈر ہو گئی ہوں اور اُسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں، وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴ اپریل

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے، ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے، لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے، یہاں کی آب و ہوا آپ کے لئے مفید ہو گی، ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا "تم چلو گی؟" میں نے کہا "شوق سے چلوں گی" بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں، اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵ مئی

سنگلاخ بلوچستان کا سلسلہ دُور دُور تک پھیلا ہوا بے آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے، راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی، مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس لحیم شحیم بھونڈے اور بھدے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے، نازک شاداب اور حسین، یہ ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، جہاں ساری فضا پُرسکون اور خیال افروز ہے۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے، جہاں امیر بہت زیادہ آسودہ حال اور غریب بہت زیادہ فلاکت زدہ ہے، یہاں کانیں ہیں، منڈیاں ہیں، غریبی ہے۔ یہاں مزدوری ہے، چاکری ہے مفلسی ہے۔ سیلانیوں کے لئے عیش ہیں، پھل ہیں اور گوشت کی فراوانی ہے۔ بلوچیوں کے لئے جفاکشی ہے، محرومی ہے اور آمدنی کی نایابی، اتنی کہ وہ بمشکل روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے ہیں، لیکن خدا نے انھیں غیرت سے مالامال کیا ہے شکستہ پائی اور بوسیدہ حالی کے باوجود، وہ تندرست و توانا ہیں ان میں خون کی کمی نہیں، انھیں طاقت کی دوا نہیں چاہیئے، انھیں قدم قدم پر احتیاطوں کی ضرورت نہیں —— وہ جو یہاں روپیہ کمانے آئے ہیں، مزے سے اپنی خواب گاہوں میں آرام کرتے ہیں، یہ جو بلوچ زادے ہیں مہمانوں کے بھیس میں آنے والوں کی خاطر، خون پسینہ ایک کر کے اپنے گھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور خود الگ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لے جاؤ، یہ سیم و زر تمہارا ہے۔ اس پر تمہارا ہی حق ہے، تم اتنی دُور سے چل کر جو اسے لینے آئے ہو! دولت مند ٹھٹے لگاتا ہے اور غریب بلوچی آسمان کی طرف مُنہ اُٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ کب تک یہ جہالت کا اندھیرا چھایا رہے گا؟ کب علم کی روشنی یہاں تک پھیلے گی؟ کب خدا ہمیں احساس اور اہلیت دے گا کہ ہم اپنی دولت سے خود متمتع ہوں؟

۲۰ مئی

یہاں کئی قدرتی سیرگاہیں ہیں جہاں انسان بازاروں کی گہما گہمی اور آمد و رفت کے ہنگاموں سے محفوظ ہو کر اپنے تفکرات بھول جاتا ہے، مجھے یہ خاموش مقامات ہمیشہ یاد رہیں گے خصوصاً بروری جہاں ہم لوگ کل پک نک کے لئے گئے تھے۔ یہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک عمدہ تفریح گاہ ہے، جہاں چٹانیں اور پہاڑیاں اس طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑی ہیں گویا انھیں کسی خاص مقصد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں بھائی صاحب، ڈیڈی، آپا، بچے اور ملازم شامل تھے، بروری کے دامن میں چشمے کی طرف خراماں خراماں آگے بڑھتا جاتا اور ہمارا راستہ کبھی کشادہ، کبھی تنگ اور کبھی پھر وسیع ہو جاتا تھا۔ دائیں جانب ایک لمبی پختہ نالی تھی جس میں چشمے کا شفاف پانی اٹھلاتا، ناچتا، گاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا، ہم اس آبِ رواں کا مخرج نہ دیکھ سکے، جو

کہیں بلندی پر پہاڑیوں میں چھپا ہوگا، لیکن وہ ہم سے بے خبر، اپنی منزل کی طرف مصروفِ سفر تھا، جو بہت دُور نیچے آبادی میں تھی۔ چلتے چلتے بچے تھک جاتے تو کسی کی گود میں آجاتے، آپا کچھ تھک سی گئی تھیں، ڈیڈی بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور بھائی صاحب حسبِ معمول لطیفے سُنا سُنا کر ہمیں آگے بڑھنے پر اُکسا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا میدان آیا جس کے ایک جانب اُونچی اُونچی پہاڑیوں کے دو سلسلے حبش کے وفادار غلاموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے، معلوم نہیں ان کے درمیان راستہ قدرتی تھا یا فرزین بیشتر انسانی ہاتھوں نے پتھر کے سینے کو چیر کر اسے بنایا تھا۔ کیا خبر غیر منقسم ہندوستان کو فتح کرنے والے جانباز سینکڑوں سال پہلے اسی راہ پہ گامزن ہوئے ہوں اور اس وقت ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے یہ سارا سلسلۂ کوہ گونج اُٹھا ہو۔ جب ہم اس درے سے گذر کر باہر آئے تو آپا کی ہمت نے جواب دے دیا اور ڈیڈی نے ایک اُونچی سی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا کہ یہیں ہمارا ڈیرہ جمے گا۔ دن بھر سب لوگ گھومتے پھرتے رہے، بچے روتے کھیلتے رہے، آپا کھانا کھلا کر فارغ ہوئیں تو تکیہ ان لے کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی کتب بینی میں مشغول ہو گئے۔ میرا دل اس ماحول سے کسی طرح نہیں بھرتا تھا، دُور دُور تک ہو آنے کے باوجود میری طبیعت یہی چاہتی تھی کہ ابھی اور جاؤں، ابھی اور دوڑوں، بھاگوں۔ سب تھک کر سستانے بیٹھ گئے، مگر بھائی صاحب نے میرا برابر ساتھ دیا، بلکہ جب میں نے ڈیڈی سے کہا کہ بس سامنے والی پہاڑی کے اُوپر اور ہو آؤں، تو اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ چنانچہ، جب ہم منزل، منزل چوٹی پر پہنچے تو میرا سانس پھول گیا، بھائی صاحب بھی ہانپنے لگے تھے اس لئے ہم ایک کالی سی عمودی چٹان کی اوٹ میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ میلوں پرے نشیب میں کوئٹہ کی چھوٹی سی آبادی سبزے میں گھری ہوئی نظر آرہی تھی، جگہ جگہ پھولوں کے باغات کھڑے لہلہا رہے تھے، دور دراز سے آنے والی ہوا اپنے دوش پر جنگلی پھولوں کی خوشبو اور بلوچستان کی خنکی لئے آرہی تھی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں دُور و نزدیک ایک طلسم سا بندھا تھا اور اس میں گُم ہو کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اسی جگہ کے لئے پیدا ہوئی ہوں، یہ چٹانیں، یہ بلندیاں، یہ خاموشی، یہ پُر سکون مقام، کتنا امن ہے یہاں! کتنی آزادی ہے اس ماحول میں! اور جب میں اپنے خواب سے چونکی تو آپ ہی آپ میرا سر بھائی صاحب کے شانے پر آگیا، وہ بڑی ملائمت سے بولے "کس گہری سوچ میں ہو، واپس نہیں چلو گی؟" میں نے جواب دیا "ذرا اور ٹھہر جائیے میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا" پھر ہم دونوں قدرت کی بوقلمونیوں اور زندگی کے اُجلے رخوں پر باتیں کرنے لگے، ایسی باتیں جن میں شیرینی اور خلوص تھا، ہمدردی اور ہم خیالی تھی اور جب سورج ارغوانی ہونے لگا تھا تو بھائی صاحب نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا، ان کے کندھے پر سر رکھ کر، ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر، ان کے اتنے قریب بیٹھ کر، مجھے بڑی راحت ہوئی۔ افسوس یہ وقت کتنی جلدی گذر گیا۔

۱۵ر جون

آپا کو اللہ نے ایک اور چاند سا بیٹا دیا ہے۔ بالکل چینی کا بت لگتا ہے مسکراتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے، ہمکتا ہے تو جی چاہتا ہے سینے سے چپٹا لوں۔ بھائی صاحب کے سب بچے پیارے پیارے ہیں مگر یہ سب سے بڑھ گیا، اس کے خد و خال بھائی صاحب کے سے ہیں، اس کی آنکھوں میں ان کی جھلک ہے۔ مجھے ننھے بچے اچھے نہیں لگتے، وہ کلبلاتے ہیں تو مجھے پھریریاں سی آتی ہیں، مگر بھائی صاحب کا یہ منا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ ہی آپ مجھے اس پہ پیار آتا ہے، پرسوں ہم لوگ واپس جا رہے ہیں۔ روانگی کے خیال سے میں افسردہ ہو گئی ہوں، کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکتی۔

۳ر جولائی

۱۶ر تاریخ کو میری شادی ہے۔ جُوں جُوں دن قریب آتا جاتا ہے، شوق اور وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ خدا جانے ایوب کس مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے خیالات کیسے ہیں، ان کے رجحانات کیا ہیں اور ہم دونوں کی کیسی نبھے گی؟ جبح میں نے ان کی تصویر بھی دیکھی، بڑے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں، طبیعت بھلی ہوگی، میں کوشش کروں گی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھیں۔ تو ہمارا مستقبل ضرور خوش آئند ہوگا۔ لیکن سب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتی ہوں، تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر شادیاں ناکام ہیں، میاں بیوی کے جذبات و احساسات میں ہم آہنگی نہیں۔ وہ درگذر، چشم پوشی، اور فراخدلی کو اپنی عادت نہیں بناتے۔

یکم ستمبر

الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ شادی کے نام سے مجھ پر یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے؟ ایوب میں تو سرے سے آدمیت ہی نہیں، وہ تو انسان کا نقلی چہرہ لگا کر بیاہنے آیا تھا، وہ سرتاپا ———— حیوان ہے، اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ شروع میں تو میں ہکا بکا رہ گئی اور سوچتی رہی کہ مرد اور عورت کا یہ رشتہ آخر بنا کیوں ہے؟ عورت کو پا کر، مرد کیوں بلندیٔ خیال اور پاکیزگیٔ نفس سے محروم ہو جاتا ہے؟ کیوں تنہائی میں، وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا؟ لیکن سب مرد تو ایسے نہ ہوتے ہوں گے، یہ ایوب ہی ہے جو صرف میرے جسم کی لذت چاہتا ہے۔ وہ میرے دل میں کبھی نہیں اُترتا، میں اس سے بات کرتی ہوں، تو کوئی اثر نہیں لیتا، اُسے صرف میرا حسن چاہیے، حُسن، اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جب کچھ عرصے بعد میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بھدّی اور بے ڈول ہو جاؤں گی، تو وہ مجھ سے بیزار ہو جائے گا، مجھے مجبور و مقہور چھوڑ دے گا۔

ایوب ریچھ کی طرح ہے، اس کے سینے، پیٹھ، ہاتھوں بلکہ سارے جسم پہ اس قدر بال ہیں کہ دیکھ کر کراہیت ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے ہاتھ میری طرف بڑھاتا ہے تو میرے بدن پر سینکڑوں چھپکلیاں رینگ جاتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کمرے سے نکل بھاگوں اور کہیں روپوش ہو جاؤں، لیکن ایسا نہیں ہوتا، میں ہنوز اپنی سسرال میں قید ہوں، میری سہیلیاں بھی یہاں نہیں، جو میرے دل کا حال سُن سکیں، جن سے میں پوچھ سکوں "سچ بتاؤ، کیا بیوی اسی کو کہتے ہیں؟"

۲ر اکتوبر

میں نے کنوار پنے میں شادی کے جو محل بنائے تھے وہ ڈھے گئے ہیں، ایوب جنگلی اور اوباش ہے۔ اُسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، وہ مجھ سے یوں پیش آتا ہے، جیسے میں اس کی رفیقۂ حیات نہیں، بس ایک عورت ہوں۔ اس کے دل میں بہت سی عورتیں ہیں، اور جب کسی عورت کا خیال، جسے وہ نہیں پا سکا، اسے دیوانہ کر دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ مجھ سے اُتارتا ہے، کبھی کبھی تو بے رحمی سے گھسیٹ کر مجھے اپنے سے چمٹا لیتا ہے، میں مزاحمت کرتی ہوں تو اول فول بک کر دھکّا دے دیتا ہے۔ کل میرے بڑی چوٹ لگی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں خیالات میں کھو گئی اور روتے روتے مجھے بھائی صاحب اور آپا یاد آ گئے، تو میں نے کہا "آپا، بھائی صاحب کو کچھ نہ کہا کرو۔ تم نے مرد نہیں دیکھے!!"

۲۰ر اکتوبر

میں بڑی مشکل سے میکے آئی ہوں، یہ میرا اپنا گھر تھا مگر آج یہ مجھے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ قدم قدم پہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی غیر ہوں۔ مہمانوں کی طرح میری خاطریں ہوتی ہیں اور بار بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں بہت جلد اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ ڈیڈی بھی

جو میرے آنے سے بے حد خوش ہیں۔ موقع دیکھ کر یہی نصیحت کرتے ہیں کہ میرا اصلی گھر میرے شوہر کی دہلیز ہے اور مجھے تمام عمر وہیں رہنا ہوگا۔ جیسے رخصت کے وقت انھوں نے مجھے سمجھایا تھا، اب بھی وہ باتوں باتوں میں یہی دہراتے ہیں کہ جس شخص سے ایک دفعہ دامن بندھ جائے، ساری زندگی اسی کی ہو کر گذار دینی چاہیئے، یہی شرافت کا تقاضا اور نسوانیت کا فرض ہے، مگر وہ مجھے یہ سبق دیتے ہیں؟ جی میں آتا ہے، اُن سے کہہ دوں ڈیڈی! میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہوں میرے اور ایوب کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت نہیں۔۔۔۔۔۔

نہیں نہیں یہ میں کبھی نہیں کروں گی، ان کو اگر شبہ ہو جائے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا، اور کیا خبر، طیش میں آکر وہ میری ماں کا طعنہ دے دیں، کہ میرے خون میں شوہر پرستی کا جذبہ اور شرافت مفقود ہے، اس لئے مجھے اپنے کردار پر شرافت کی مہندی لگانی پڑیگی۔ ایوب میری اہانت کریگا، اور میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی، وہ مجھے جلائے گا اور میں مسکراتی رہوں گی۔

۲۵ ر اکتوبر

کل رات گئے تار آیا کہ دل کی حرکت اچانک بند ہو جانے سے، ایوب کا انتقال ہو گیا ہے، تھوڑی دیر میں وہاں جانے کے لئے سوار ہو جاؤں گی۔ دنیا کی رسوم کے مطابق مجھے سوگ کا پیراہن پہننا پڑے گا، لیکن در اصل میں رنجیدہ نہیں ہوں، اس کے یوں دفعتاً مر جانے کا افسوس ضرور ہے۔

۱۳ ر مارچ

میں عدّت پوری کر کے واپس آگئی ہوں۔ ڈیڈی ایوب کی موت سے بے حد متأثر ہیں۔ ان کے دل پر دھاک بیٹھ گیا ہے۔ کہتے ہیں، یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تمہاری بیوگی دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا۔ ان کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرا گھر پھر بسا دیں، مگر میں اب شادی نہیں کروں گی، میرا دل پک گیا ہے۔

امانت مرزا، جو اس عرصے میں اور زیادہ عابد و متقی بن گئے تھے پھر میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے ہیں۔ ان کو گانے کا بھی شوق ہو گیا ہے اور وقتاً فوقتاً ہجر و فراق کے اشعار آپ ہی آپ گنگناتے رہتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں کہ یہ عشقیہ کلام کس لئے ہے؟

۳۱ ر مارچ

کوئٹہ سے خط آیا ہے کہ بھائی صاحب سخت علیل ہیں، معمولی سی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، ان کی گھبراہٹ اور کم خوابی نے آپا کو پریشان کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں، ان کی آئی کسی اور کو آجائے۔ ان کی بجائے امانت مر جائے، میں مر جاؤں!

اگر خدانخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس تصوّر سے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ میں کسی ایسی دنیا میں چلی جاتی ہوں، جہاں خزاں آگئی ہے، جہاں ہر طرف حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، جہاں گل بوٹے نہیں کھلتے، جہاں سبزہ نہیں لہلہاتا۔ یہ کیسی فضا طاری ہو رہی ہے؟ ایک بھائی صاحب کے نہ ہونے سے، کس نے زندگی کی آرائش نوچ لی ہے، کس نے اس چمن کا سہاگ لوٹ لیا ہے؟ کیوں ایک، صرف ایک شخص کے چلے جانے سے آبشاروں کے نغمے ٹوٹ گئے ہیں، خوشبوؤں کی تابندگی مٹ گئی ہے، زندگی کا بانکپن غروب ہو گیا ہے؟

میں ڈیڈی کے ساتھ کوئٹہ جا رہی ہوں، کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی، ساری پہاڑ سی رات باقی ہے، ایک ایک پل گذارنا عذاب معلوم ہو رہا ہے ابھی گیارہ ہی بجے ہیں، اتنی دیر سے یہی بج رہا ہے، سوئیاں کیوں تیزی سے نہیں چلتیں، یہ سیاہ شب کیوں جلدی دم نہیں توڑتی؟

صبح ہوتے ہی ہم سوار ہو جائیں گے، خدا کرے گاڑی کہیں لیٹ نہ ہو، پرسوں دوپہر تک کوئٹہ پہنچ جائیں گے اور میں سیدھی بھائی صاحب کے پاس چلی جاؤں گی، فوراً اُن کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لوں گی اور آہستہ آہستہ سہلاؤں گی، اُن سے باتیں کروں گی، ہردری کی پہاڑیوں پر جو ہم نے شام گذاری تھی وہ اُنھیں یاد دلاؤں گی، اُنھیں سکون آجائے گا، اُنھیں ضرور نیند آجائے گی......

لیکن، لیکن، کوئی میری راہ میں حائل ہو رہا ہے، کہتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں اُن سے سب کے سامنے گھل مل کر باتیں نہیں کر سکتی، ان کے پاس یوں آزادانہ نہیں بیٹھ سکتی، کوئی میرا دل پکڑ کر بھینچتا ہے، میرے اُٹھتے قدم روکتا ہے —— یہ ناصح ٹھیک کہتا ہے۔ یہ میرا نادیدہ ہادی مجھے عرصہ سے سمجھا رہا تھا، مگر میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، میں یہی کہتی رہی" تو جھوٹا ہے، تو مجھے نہیں سمجھا، میرے دل میں چور نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو آپا سے چھیننا نہیں چاہتی" اور وہ مجھے یہ جواب دیتا" تم بلاشبہ سچ کہتی ہو اور میں تمھیں جانتا ہوں، مگر دُنیا نہیں جانتی، اسے تمھاری باتوں پر اعتبار نہیں آئے گا۔ تم جس حد کو توڑ کر آگے جانا چاہتی ہو، وہ بہت سنگین اور بلند ہے، اس سے ٹکراؤ گی تو پاش پاش ہو جاؤ گی" پہلے میں نے اس کا کہنا نہ مانا، لیکن ابھی ابھی اس نے یہ بات بھی کہی ہے" صرف تم ہی برباد نہیں ہو گی" اس کی لپیٹ میں دوسرے بھی آجائیں گے، تمھاری آپا، ان کا ننھا منّا گھرانا تمھارے بھائی صاحب!!

یہ میرے دل نے بھرپور وار کیا ہے، جس سے میں پسپا ہو گئی ہوں۔ مجھ میں بغاوت کی بھی ہمّت نہیں رہی، میں کوئٹہ جاؤں گی تو دُور ہی دُور سے اُنھیں دیکھوں گی، آنکھیں روئیں گی تو آنچل کی اوٹ میں انھیں بہلا لوں گی، مجھے اپنی قسمت معلوم ہو گئی ہے، میرے لئے موسم خزاں آگیا ہے، میں اب چراغِ کشتہ کی مانند خاموش ہو جاؤں گی۔

شبیر محمد اختر

لکھ داتا

"جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" کتنے پیارے الفاظ تھے۔ لیکن جس زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ وہ ایک بدصورت نابینا انسان کی زبان تھی۔ اس کی آواز بھدی اور کرخت تھی۔ لیکن یہ الفاظ میرے کانوں کو کس قدر شیریں معلوم ہو رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔

"جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" زندگی میں میرا لکھ داتا بن جانا ناممکن تھا۔ یہ میں نے آج تک نہیں سوچا تھا۔ لیکن ایک شخص مجھے لکھ داتا کہہ کر میری زندگی کے لئے دعائیں کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔

واقعی! عجیب بات تھی۔ یہی مال روڈ، یہی لاٹ صاحب کے بنگلہ کا موڑ، یہی پولیس گارڈ کا لمبا سپاہی، یہی موٹریں، میں ان سب کو روز دیکھتا تھا، لیکن آج کا رنگ کچھ اور تھا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہوا میں اڑا جا رہا ہوں عام لوگوں سے بلند۔

ایک معمولی کلرک کی زندگی ایک مسلسل چکر ہے وہ ایک مشین کی طرح ہر صبح اٹھ کر نہاتا دھوتا ہے۔ ۹ بجے کھانا کھاتا ہے۔ ایک ایسا کھانا جس میں حیاتین کی کم از کم مقدار ہو۔ اس کے بعد تمام دن فائلوں کے انبار میں دبا رہتا ہے۔ فائل کتنا دلچسپ لفظ ہے۔ لیکن جب اس پر سُرخ یا سبز لیبل فوراً (URGENT) یا آج ہی (TODAY) لگ کر آجائے۔ تو روح کانپ اٹھتی ہے۔

دفتر کی زندگی سے چار بجے کے بعد رہائی ملی۔ گھر آئے، ذرا دم لیا، سستائے، نہا دھو کر بنے ٹھنے اور زندگی کے اسٹیج پر ایک نیا پارٹ ادا کرنے کے لئے گھومنے نکل پڑے۔ یہ ہے مشین کا چکر —— میری زندگی۔

آج میں مشین کی حرکت پوری کرنے کے لئے لارنس گارڈن کی طرف جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ لاٹ صاحب کے بنگلے کی نکڑ پر جا کر ایک نابینا لکڑی کے سہارے کھڑا دردناک لہجہ میں چلا چلا کر بھیک مانگ رہا تھا۔

"سرکار ان بھک منگوں کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتی" ایک حسین لڑکی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دونوں پاس سے گزر رہے تھے۔

"وہ بولا، یہ واقعی ہمارے دیس کے لئے لعنت ہیں" اپنے نزدیک گویا بڑی فلسفیانہ بات کہی۔

پاس سے ایک موٹر تیزی سے گزری اور غبار اڑاتی ہوئی غائب ہو گئی —— حسین لڑکی ناک تک رومال بھی نہ لے جا سکی۔ اس کا غازہ

خراب ہو گیا۔ اُس نے ناک چڑھائی اُس کے ساتھی نے حقارت سے موٹر کی گرد کو دیکھا۔ بیچارا سوچتا ہوگا کہ اگر اس کے پاس بھی موٹر ہوتا، تو وہ کیوں غبار آلود ہو جاتے ——— موٹر کی آواز سُنکر فقیر پھر زور زور سے چلانے لگا " پرماتما کے نام پہ بابا۔ اندھے محتاج کو بابا ایک پیسہ ——— آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا ——— " لیکن موٹر نے جواب دیا " اندھے لے، اور دھول آنکھوں میں ڈال لے، مجھے تم ایسے اندھوں کی کیا پروا ——— ایک سائیکل سوار ——— کسی کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا ——— سیٹی بجاتا ہوا گزرا۔ سائیکل کی آواز پہ فقیر پھر چونکا اور چلانے لگا۔ سائیکل موٹر کی طرح برق رفتار نہ سہی تیز رفتار تو تھی ہی، سیٹی کی مسلسل آواز فضا میں ایک نغمہ پیدا کرتی ہوئی لارنس گارڈن کے دروازے میں غائب ہو گئی ——— سڑک پہ ایک تانگہ آ رہا تھا۔ اس میں ایک خان صاحب بیٹھے تھے۔ مونچھوں کا تاؤ اُن کو اور بھی پُر رعب بنا رہا تھا۔ اندھا پھر چلایا ——— لیکن غریب کی پکار کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے ——— قہقہہ۔

مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا۔ میرے پاس صرف ایک پیسہ تھا۔ ایک پیسہ ——— لیکن اس کی اہمیت میرے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ لارنس گارڈن کے باہر بار رود کے پل پہ ایک پنواڑی بیٹھتا ہے۔ مجھے اس سے ایک پان خریدنا تھا۔ تاکہ تکمیل آرائش ہو جائے ——— ایک ایکٹر کی کامیابی کا انحصار اس کے رکھ رکھاؤ پر ہے۔ اور اس کی ذرا سی خامی اداکار کو ناکام رکھتی ہے۔ یہی حال میرا تھا، وہ ایک سوٹ ہیں۔ وہ بھی کالج کے زمانے کی یادگار، جنھیں میں گھر ہی میں دھو کر ہر دوسرے تیسرے استری کر لیا کرتا ہوں۔ اور لارنس گارڈن جانے کے لئے استعمال کرتا ہوں، پان کی ہلکی سی سُرخی لبوں کو ذرا " دیدہ زیب " بنا دیتی ہے ——— اب اندھے کی پکار ——— اور میرے سوانگ کی تکمیل کا سوال تھا۔ میرا ہاتھ کئی بار جیب کی طرف گیا۔ لیکن پھر رُکا ——— فقیر کی آواز میرے دل کے اندر ڈوبی جا رہی تھی۔ شاید غریب کی آواز کا غریب پر زیادہ اثر ہوتا ہے یا غریب کا دل زیادہ کمزور ہوتا ہے ——— میں مغلوب ہو ہی گیا۔ میں نے دل کڑا کر کے پیسہ فقیر کے ہاتھ پہ رکھ دیا ——— اپنی ساری پونجی دان کر دی ——— " جُگ جُگ جیو، میرے لکھ داتا " ——— مجھے ایسا محسوس ہونے لگا، گویا میں کسی اور دُنیا میں ہوں ——— موٹر کی شان، سائیکل سوار کی سیٹی، تانگہ پہ جانے والے کی مونچھوں کا تاؤ، میری نگاہ میں سب ہیچ تھے ——— فقیر کی آواز کی گونج سن کر حسین لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ گویا اُنھیں میرے دان دینے کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ تانگے والے مجھے حقارت سے تک رہے تھے شاید وہ سمجھتے تھے کہ سوٹ پہن کر ہر پیدل چلنے والے کی جیب خالی ہوتی ہے۔ پنواڑی کی حسرت بھری نگاہ مجھ پہ پڑ رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ایک مستقل گاہک چھن گیا تھا ——— اچانک اُس وقت ایک چھکڑا لارنس باغ سے نکلا، اور مال روڈ کو پار کرتے ہوئے لاٹ صاحب کے بنگلہ کے سامنے سے گزرا۔ چھکڑا اور موٹر ——— میں نے دل میں موازنہ کیا ——— تہذیب کی ساری داستان چھکڑا موٹر کی ابتدائی شکل ہے، فقیر اور امیر۔ کیا یہ بھی ہندوستان کی تہذیب کی ساری داستان نہ تھی، خونی داستان، صنعت کا ارتقا چھکڑے سے موٹر تیار کرتا ہے۔ لیکن دولت کا ارتقا ——— لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو فقیر اور محتاج کر دیتا ہے۔ چھکڑے کی سُست رفتاری موٹر کی برق رفتاری میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن زر کی ہوس نے " جنت نشان " کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ فقیر کو دیکھنا تک اب نازک طبائع پر ایک بارِ گراں ہے۔ اور سماج پہ ایک دھبہ ——— " لکھ داتا "، میرا دماغ اس لفظ کے گرد گھوم رہا تھا۔ لکھ پتی ہونا بہت بڑی بات ہے لیکن لکھ داتا ہونا۔ لاکھ روپیہ دان کرنا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے، میں نے لاکھ روپیہ دان کر دیا تھا۔ میری کل کائنات یہی ایک پیسہ تھی۔ یہی میرے لئے لاکھ روپیہ تھا ——— میں باغ کے اندر داخل ہو چکا تھا، اور حسب معمول " سکندر مونٹ " پہ چڑھنے لگا۔ آج میرا ہر قدم خود بخود بلندی کی طرف اُٹھ رہا تھا۔ میرے کان منتظر تھے کہ میری طرح اور کوئی لکھ داتا اسے خیرات دے اور پکارے کہ میرے لکھ داتا۔ لیکن میرے سوا اور کوئی لکھ داتا نہ بن سکا۔ میں نے ایک بنچ پہ بیٹھتے ہوئے باغ کا جائزہ لیا۔ سبزہ زار، قسم قسم کے پھول، شیشے سے زیادہ شفاف سڑکیں، سامنے بینڈ بج رہا تھا۔ وسط باغ میں موٹروں کی قطاریں، کتنا پُر لطف سماں تھا، شام کا دُھندلکا۔ شفق کی سُرخی، خوشگوار موسم، ہر طرف ہریادل

ہی ہریاول - لیکن میں نے سوچا یہاں آنے والوں میں سے ایک بھی لکھ داتا نہ تھا، حالانکہ اُن کی موٹریں خریدی جاتی ہیں غریبوں کے لہو سے۔ ان کے سنٹ اور خوشبودار تیل حاصل کئے جاتے ہیں مزدوروں اور کسانوں کے پسینے سے، اُن کے بڑے بڑے بنگلے، قبریں ہیں، انھیں بیکس انسانوں کی جن سے جانوروں سے بھی زیادہ کام لیا جاتا ہے، مگر جب ان بے زبانوں میں سے کوئی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار بن کر محتاج ہو جائے اور دستِ سوال دراز کرے۔ نہیں نہیں بلکہ اپنا حق مانگے، تو یہ قدرت کے چہیتے اسے حقارت سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں، ان کی موٹریں اس پہ زیادہ دھواں پھینکتی ہیں۔ ان کے تانگوں کے گھوڑے زور سے ہنہناتے ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ فقیر کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں آ رہی تھی، وہ چلا رہا تھا "بابا پرماتما کے نام پہ ایک پیسہ۔ صبح سے بھوکا ہوں بابا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں ———" پرماتما کے نام پہ۔ کیا پرماتما کوئی ایسی چیز ہے، جس کے نام پہ صرف ایک پیسہ مانگا جا سکتا ہے، پرماتما یا خدا کا یہ تصور کس قدر غلط ہے خدا کو کتنا محدود کر دیا گیا، اس کا نام صرف بھیک مانگنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے، لیکن پرماتما نے فقیر کو اندھا کیوں کر دیا۔ مالی باغ کو آراستہ پیراستہ کر رہا ہو، ہر طرف عجیب و غریب پھول دکھائی دیتے ہوں، یکایک وہ چند پھولوں کو لے کر مسل دے تو اسے کیا کہیں گے۔ پرماتما نے ایسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا، جو اس کے لئے خود باعثِ عار ہیں۔ اور پھر ان کا یوں سِسک سِسک کر زندگی کے دن کاٹنا خدا کی پناہ، اس کا جذبۂ رحم کہاں چلا جاتا ہے۔ جب ایک غریب آدمی بیمار پڑ جاتا ہے اور اس پہ انحصار رکھنے والا ایک کنبہ فاقوں مرنے لگتا ہے ایک کی بیماری کئی اور وں کے لئے پیغامِ قضا بن جاتی ہے، وہ سوکھی روٹی کو ترستے ہیں، اُن کے حلق خشک ہو کر ان میں کانٹے سے چبھنے لگتے ہیں، لیکن عین اس وقت اُن کے پاس کے عالی شان محل ایک انسان اپنے ہوسِ نفس کو پورا کرنے کے لئے دعوتیں دے رہا ہوتا ہے۔ اُس کے کُتّے کو ایک وقت کا اتنا راشن مل جاتا ہے جو اس کے ہمسایہ کے ایک غریب کنبہ کے لئے کئی دن کافی ہو سکتا ہے۔

"بنارسی پان بابو جی"، ایک پنواڑی میرے سامنے کھڑا مجھ سے پوچھ رہا ہے "نہیں" میں چونک اُٹھا —— پان ——— میں آج پان بھی نہ کھا سکا اور ——— فقیر اور میں ——— ہم میں سے کون مالدار تھا ——— جسے فقیر لکھ داتا بتا رہا تھا۔ وہ اب ایک پیسہ کیلئے محتاج تھا۔ اور فقیر ایک پیسہ کا مالک تھا۔ کیا امارت اور فقیری محض اضافی چیز نہیں؟

مسز عبدالقادر

رسیلا

میں من کوٹ میں ایک برانچ سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ سکول شہر سے باہر کھلی فضا میں ایک نہر کے قریب واقع تھا۔ جس سے تھوڑے فاصلہ پر مست رام کی کٹیا تھی۔ یہ ایک چرسی سادھو تھا۔ جس کے پاس قصبہ کے تمام چرسی جمع ہوا کرتے تھے۔ مست رام زندہ دل ملنسار اور خوددار آدمی تھا۔ اس نے نور کا گلا پایا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا رس تھا کہ جانوروں تک کو اپنے داؤدی نغموں سے مسحور کر لیتا تھا۔ یہی چیز میری اور اس کی دوستی کا باعث تھی۔

جاڑا ہو یا طوفان رات کے پچھلے پہر راگنی آسا گانا گویا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پو پھٹنے پر جب وہ اپنی غمگین سے اور پرسوز آواز سے ملتانی زبان میں دوت نہیں آؤ نا دیس پیا یسے کھیڈن دے دن چار نی مائے اگانا شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی اپنی پوری شان ربوبیت کے ساتھ کسی جدید راگنی کی تخلیق میں مصروف ہے۔ یا کوئی فرشتہ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ملکوتی نغمے عالم ناسوت میں بکھیر رہا ہے۔ اس کے گیت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اترجاتے تھے۔ میں اس کے گیتوں کا عاشق تھا اور خصوصاً راگنی آسا کا۔ کیونکہ یہ راگنی آسا میری روح کی غذا بن چکی تھی۔ اس لئے میں من کوٹ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب کبھی تبدیلی کی بھنک میرے کان میں پڑتی تو میں انسپکٹر کی منت وسماجت کرکے پھر یہیں رہ جایا کرتا۔

۲

من کوٹ کہنے کو تو قصبہ تھا۔ مگر اپنی دیرینہ شان وشوکت کے لحاظ سے اچھا خاصا شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار، سکول، ہسپتال وغیرہ سب کچھ موجود تھے۔ اگر کچھ کمی تھی تو ریل گاڑی کی۔ کیونکہ ریل گاڑی صرف غازی گھاٹ تک ہی آتی تھی۔ اور باقی چالیس میل کا سفر لاری یا کسی دوسری سواری کے ذریعہ طے کرنا پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ من کوٹ دوسرے شہروں کی طرح ترقی نہ کر سکا۔ اور اب تک قصبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہاں آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی تھی۔ جو چودھری کہلاتے تھے ان کی حویلیاں بہت بڑی اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی قلعہ نما تھیں۔

من کوٹ گو ایک صحرائی علاقے میں واقع تھا۔ مگر شاہجہاں کے عہد کی قدیم نہر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہ مقام بہت سرسبز وشاداب تھا۔ اس علاقے میں آم اور کھجور کے درخت کثرت سے تھے۔

نہر کے پاس کوس بھر کے فاصلے پر ٹھکہ نامی ایک گاؤں آباد تھا۔ جس کے ارد گرد من کوٹ کے چودھریوں کی جاگیریں تھیں۔ اور موضع ٹھکہ میں پختہ حویلی صرف ایک ہی تھی جس کا مالک چودھری گوبند رام تھا۔

گوبند رام نہایت بوڑھا آدمی تھا۔ تمام چودھری برادری کا سردار تھا۔ راج دربار میں بھی اس کی عزت تھی۔ اس کی حویلی کے سیاہ زنگ آلود اُٹے گذشتہ عظمت اور مٹتی ہوئی تہذیب کے گن گاتے ہوئے من کوٹ سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

پار جانے کے لئے نہر پہ شاہان مغلیہ کے وقت کا پُل بنا ہوا تھا۔ یہ نہر بہت چوڑی اور دریا کا ہم پلّہ تھی۔ اس نہر کے کنارے الگ تھلگ میرا سکول تھا۔
عموماً شام کے وقت مست رام اپنے دو چار سنگی ساتھیوں کو لے کر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ جو طرح طرح کی بے سروپا خبریں سناتے اور بے تکی ہانکا کرتے اسی طرح ایک شام کو ہم لوگ اسکول کے احاطہ میں جس کے ایک طرف باغیچہ بھی تھا بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے احاطہ مہک رہا تھا اور مست رام سرور کی حالت میں بیت بولنے لگا۔

اتنے میں اس کا ایک اور چوسی دوست آ گیا جسے مست رام نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ کھڑا رہا اور سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا "یار بڑے بیت بانٹنے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟" مست رام بیت کو ادھورا چھوڑ کر حیرت سے پوچھنے لگا "یار کیا بات ہے؟" اس چوسی نے کہا "سُنا ہے کہ مظفر گڈھ اور غازی گھاٹ میں لوگ دھڑا دھڑ پلیگ سے مر رہے ہیں۔" میں نے کہا "ہاں اس کے متعلق آج میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔"

یہ خبر سُن کر سب سہم گئے۔ "اب کیا ہوگا ماسٹر جی" سب نے پریشانی سے کہا۔ میں نے جواب دیا "خدا رحم کرے۔ اگر زندگی ہے تو کوئی خطرہ نہیں۔" وہی چوسی کہنے لگا "خدا اب کیا رحم کرے گا۔ دنیا تھوڑے ظلم کر رہی ہے۔ کلجگ ہے ماسٹر جی کلجگ۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے۔ کہ ایک گائے بیچاری سڑک کے درمیان کہیں جا بیٹھی۔ ادھر سے لاری آ رہی تھی۔ تو لاری والے اندھے نے اس کے اوپر لاری چڑھا دی۔ جس سے گائے کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر لاری والے سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔

اگلے دن پنڈت کا لڑکا ایک اچھوت عورت بیاہ لایا۔ سُنا ہے کہ وہ کہیں تماشے میں رانی کا روپ بھرا کرتی تھی۔ وہیں اُس پر ریجھ گیا اور اسے گھر ڈال لیا۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بھولا ناتھ کا ایک جوگی جو کہیں باہر سے آیا تھا۔ شامت کا مارا چودھری متھرا داس کے گھر چلا گیا اور شہری طریقے سے ناواقف ہونے کے باعث اندر جا گھسا۔ کمرے میں اس وقت چودھری متھرا داس کا چھوٹا لڑکا جو نیا نیا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اپنی میم کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ جوگی کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ اور چور چور کہہ کر جوگی کو پکڑ لیا۔ پھر چمڑے کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ وہ ادھ مُوا ہو گیا۔ مگر جوگی نے بھی اُسے بڑے سراپ دیئے۔ رام رام جوگی کا سراپ بھی اٹل ہوتا ہے۔ جوگی کی زبان کالی ہوتی ہے۔ جو ظالم کو نشٹ کر دیتی ہے۔" وہ دیر تک نمک مرچ لگا کر اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔

جوں جوں دن گذرتے گئے۔ نئی نئی افواہیں اڑتی رہیں۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ پلیگ مظفر گڈھ اور غازی گھاٹ کے علاوہ دیہات میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔

بیساکھ کے آخری دن تھے۔ صحرا کی شفق آلود شام تھی۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے بور سے لدے ہوئے آم کی ڈالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ کوئل اپنی پُر درد آواز میں کوکو کا شور مچا رہی تھی۔ میں چبوترے پر چارپائی ڈالے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں مست رام بھی آ گیا۔
"کچھ آپ نے بھی سُنا ماسٹر جی" اس نے وکھلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔ کیا کچھ نئی خبر لائے ہو۔" میں نے پوچھا۔ مست رام نے کہا "ہاں ماسٹر جی لوگ کہتے ہیں کہ موضع ڈوہڑی میں ایک ڈنگر تیرے کی عورت کے بچے کی بجائے بلا پیدا ہوئی ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بولنے لگی ہے۔ اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا کہ میں نرک کی چڑیل ہوں۔ جو دنیا کو ہڑپ کرنے آئی ہوں۔ پھر وہ سارے گاؤں میں پھری۔ اور بعد ازاں اُس نے من کوٹ کا رُخ کیا۔ آہ

اب کوئی دن میں اس شہر پر بھی تباہی آنے والی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا اُسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا اس کی باتیں نہ سُن لے۔ مجھے اس کی بدحواسی پر بے اختیار ہنسی آگئی۔

"کیوں ماسٹر جی اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے" اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

میں نے کہا "بھئی مست رام۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ پچھلے زمانے میں جب نیلا ریوں کا نیل پھوٹ جایا کرتا تھا تو وہ ایسی لایعنی داستانیں جوڑا کرتے تھے" وہ چڑ کر کہنے لگا "واہ ماسٹر جی سب باتیں تو جھوٹ نہیں ہوتیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ کسی کی بات کو مانتے ہی نہیں۔ مگر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ سب کچھ دیکھ لیں گے۔ بُرے آثار تو شروع ہو ہی گئے ہیں"۔

میں نے اکتا کر کہا "اچھا جو کچھ دیکھنا ہے بعد میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ مگر وہ آثار جو تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بھی دکھا دو۔ مست رام نے متانت سے کہا "تو کیا آپ نے رات کو کبھی کتوں کا رونا نہیں سنا۔ وہ آج کل ایسی خوفناک آواز سے روتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور گُنی لوگوں کا قول ہے کہ رات کو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں جنہیں کتا اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر چیختا چلاتا ہے"۔ مست رام کے کہنے پر فوراً مجھے ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔ کہ رات کو اتفاقاً میری آنکھ کھلی۔ تو اُس وقت باہر ایک کتا منحوس آواز میں لمبی لمبی چیخیں لگا رہا تھا۔ جس کا میرے دل پر بہت ناگوار اثر ہوا۔ اور پھر تمام رات نیند نہ آئی۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا "اونہہ یہ کوئی بڑی بات نہیں، کتے ہمیشہ رویا کرتے ہیں۔ یہ بُرے آثار کی کوئی معقول دلیل نہیں"۔ مست رام نے زچ ہو کر کہا "اچھا نہ سہی۔ لیکن یہ تو بتائیے آپ نے آسمان پر کبھی پہلے اتنی سُرخی دیکھی تھی۔ پرانے زمانہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جب کسی بے گناہ کو سُولی چڑھایا جاتا تھا تو سُرخ آندھی آتی تھی۔ مگر اب تو آندھی بھی نہیں۔ اور آسمان بلا وجہ خون کبوتر ہو رہا ہے۔ اگر یہ بدشگونیوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں"۔

ایکدم میری نظر سامنے کی طرف اُٹھی۔ نہ جانے واہمہ کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ لمبا چوڑا صحرا آسمان کی سُرخی سے لہولہان ہو رہا ہے بلکہ نہر کا پانی بھی سُرخ بانات کی چادر کی طرح ہلکورے لیتا اور موجوں کی خونیں سلوٹیں ڈالتا سُست روی سے بہہ رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ تاہم میں نے ایک اونہہ کے ساتھ بات کو ٹال دیا۔

۳

جیٹھ کا آغاز تھا حسب دستور گرمی کا جوش بڑھ رہا تھا دو دن سے میں نے مست رام کو کہیں نہ دیکھا۔ اس لئے سہ پہر کو خود اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ اس کی کٹیا گلو کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف پانی کا چہ بچہ تھا۔ جہاں اُس نے کبوتروں کے لئے لمبی لمبی چھتریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ وہ اسوقت چرسیوں کے درمیان ایک کبوتر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ سب تعظیم کو اُٹھے۔ ایک چرسی نے فوراً کٹیا سے ایک رنگیلی چارپائی نکال کر بچھا دی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بھئی مست رام دو دن کہاں غائب رہے"۔ مست رام نے اپنے کبوتر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ماسٹر جی میرا بچہ ٹوڈرو بیمار ہو گیا تھا"۔

میں نے کہا "بچہ ٹوڈرو کون۔ کیا تمہاری مراد اس کبوتر سے ہے۔ جسے چھاتی سے لگائے ہو" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "ہاں ماسٹر جی یہی میرے بال بچے ہیں۔ ان پر میری جان جاتی ہے۔ یہ خدا کے جی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں بڑا آنند ملتا ہے"۔

اس کے بعد اُس نے اُٹھ کر کٹیا سے ایک نیا حقہ نکالا اور بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں حقہ پینے لگا اور اُس نے پاؤں دبانا شروع کئے۔ میں نے کہا "بھئی کئی دن سے کوئی تازہ خبر سننے میں نہیں آئی"۔ مست رام نے کہا "ماسٹر جی آج کل تو چاروں طرف پلیگ کی خبریں ہی پھیل رہی ہیں اور غالباً آج یا کل وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی"۔ میں نے ہنس کر کہا "وہ کیسے کیا اُس نے تمہیں پیغام بھیجا ہے"۔ اس کے جواب میں مست رام نے اپنے ایک چرسی دوست

سے کہا "اچھا بھئی دھنی تم خود اپنی زبان سے ماسٹر جی کو وہ واقعہ سناؤ۔"

دھنی لمبی مونچھوں والا شخص تھا۔ جو عام چرسیوں کی طرح مرا ہوا نہ تھا۔ یہ آدمی یکہ چلایا کرتا تھا۔ اس نے پہلے ایک جھرجھری سی لی۔ پھر گول مٹول دیدوں کو پھیلا کر کہنے لگا "ماسٹر جی! رام رام کچھ نہ پوچھئے" پھر کافی دیر سوچنے کے بعد بولا "میں روزانہ رات کے ڈھائی تین بجے موضع دوہرہ سے سواریاں لادتا ہوں اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی من کوٹ پہنچ جاتا ہوں۔ میری سواریوں میں زیادہ تر گوالے اور دھوبی وغیرہ ہوتے ہیں۔ جنہیں صبح سویرے ہی اپنے کام پہ پہنچا ہوتا ہے۔

چنانچہ گذشتہ رات جب سواریاں لادنے لگا تو ان میں ایک برقعہ والی عورت بھی تھی۔ میں رات کے وقت اکیلی عورت کو سوار کرنے سے ہچکچانے لگا جس پہ وہ عورت منتیں کرنے لگی۔ ان سواریوں میں موضع لوہڑی کا ایک چھٹی رساں بھی تھا۔ جو رخصت گزار کر کسی گاؤں سے واپس آ رہا تھا۔ اور صبح اُسے اپنی ڈیوٹی پہ حاضر ہونا تھا۔ اس عورت کی منت سماجت پہ اُس نے کہا "بھئی لے بھی چلو اسے۔ یہ بیچاری اب رات کو کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ ہم سب بہو بیٹی والے ہیں اسے لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔"

چھٹی رساں کے کہنے پر میں نے اُسے سوار کر لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ من کوٹ جائے گی۔ خیر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ لیکن رام جانے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر رک جاتا اور بُری طرح ہانپنے لگتا۔ گویا منوں بوجھ کے تلے دبا ہوا ہو۔ آخر میں نے تنگ آ کر اس کی لگام پکڑ لی اور قدم قدم اُسے چلانے لگا حتیٰ کہ لگام کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور گھوڑے کا دہانہ بھی زخمی ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دئیے۔ جن پہ واقعی چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر کیا ہوا؟" دھنی کہنے لگا "اسی طرح میں نے کوئی پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ گھوڑا پھر ٹھہر گیا۔ عین اُسی وقت چھٹی رساں نے یکہ سے اُترتے ہوئے کہا کہ میں ذرا پیشاب کر آؤں اور پھر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا یہ اشارہ پا کر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

تھوڑی دُور پہ ایک درخت کی اوٹ میں جا کر اُس نے مجھ سے کہا "بھئی اس عورت کو تو سوار کر کے ہم نے بڑی غلطی کی۔ کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی ہوائی مخلوق ہے۔" میں نے کہا "وہ کیسے؟" چھٹی رساں کہنے لگا "میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں۔ وہ کبھی وقت جوان دکھائی دیتی تھی کبھی وقت بوڑھی، کبھی گوری ہو جاتی اور کبھی کالی۔ اس لئے میں نے اسے زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ لہٰذا اب معلوم ہوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں بھی ہیں میں ڈر کر پیشاب کے بہانے نیچے اتر آیا۔"

چھٹی رساں کی بات سُن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ بڑا دل گردے والا آدمی تھا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ایسے موقع پہ دل چھوڑنا مناسب نہیں اور اس کے بعد وہ پھر یکہ پر سوار نہ ہوا۔ بلکہ گھوڑا پکڑ کر چلانے میں میری مدد کرتا رہا اور اس کی ہمت و کوشش تھی کہ میرا یکہ پو پھٹتے ہی موضع لوہڑی پہنچ گیا۔ جہاں میں نے اپنی سب سواریوں سے کہا۔ چونکہ میرا گھوڑا بیمار ہو گیا ہے۔ اور میں آگے نہیں جا سکتا۔ اس لئے کرایہ معاف کرتا ہوں۔

سواریاں اُتر گئیں مگر برقعے والی کہنے لگی۔ "لالہ اور کسی سے خواہ کرایہ لو یا نہ لو۔ مجھ سے ضرور لے لو۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے میرے ہاتھ میں ایک نوٹ دے دیا۔ اور قریب کی ایک گلی میں داخل ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُس کے جانے کے بعد چھٹی رساں نے کہا "بھئی تم پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ دکھاؤ تو کتنے کا نوٹ دے گئی ہے۔"

میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا "ہائیں یہ کیا" اُس نے نوٹ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ تو معمولی کاغذ ہے۔" میں تعجب سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جھک گیا۔ چھٹی رساں نے کہا "ٹھہرو بھئی اس پہ تو کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔" اور اس کاغذ کو لالٹین کے بالکل قریب لے جا کر پڑھنے لگا۔

کاغذ کا مضمون بہت لرزہ خیز تھا۔ لکھا تھا کہ یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ میں لاری سے جانا چاہتی تھی۔ مگر تمہارا

یکہ دیکھ کر جی میں آئی کہ اسی پر چلی جاؤں۔ جلدی جا پہنچوں گی۔ مگر یہ خیال ہی نہ آیا کہ گھوڑا میرا بوجھ نہ اٹھا سکے گا۔ کیونکہ میں دراصل عورت کے بھیس میں پلیگ تھی لیکن تم لوگ بھی بہادر نکلے۔ جو یکہ کو گھسیٹ گھساٹ کر لوہڑی تک لے آئے ہیں تم لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ من کوٹ تو مجھے پہنچنا ہی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی تاہم تم لوگوں کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی اس کے صلہ میں تم لوگوں کی جان بخشی کرتی ہوں۔

اس مضمون سے ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور فوراً وہاں سے روانہ ہوا۔ تاکہ من کوٹ جاکر یہ کاغذ لوگوں کو دکھاؤں لیا اب میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے فوراً مجھے من کوٹ پہنچا دیا۔ مگر من کوٹ پہنچ کر جب میں نے وہ کاغذ نکالنے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب، خالی تھی!"

ابھی دھنی اپنا بیان ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا خس وخاشاک اُڑاتا ہوا کٹیا کی دیواروں سے ٹکرایا۔ "اوہ۔ کتنی سخت آندھی ہے" مست رام نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو سچ مچ خوفناک اور سیاہ آندھی بلائے ناگہانی کی طرح تیزروی سے چلی آتی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا اسکول کی طرف بھاگا۔ مگر میرے پہنچتے ہی پہنچتے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

یہ آندھی کیا تھی خدا کا قہر تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اُکھڑ گئے مکانوں کی منڈیریں اور مزدوروں کے چھپر صاف اُڑ گئے۔ آم کا بور بالکل جھڑ گیا تمام رات آندھی بڑے زور شور سے چلتی رہی اور صبح کے قریب بارش کا چھینٹا پڑنے سے اُس کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن صبح صبح مست رام میرے پاس آیا اور آتے ہی رات والی آندھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس آندھی کو پلیگ کا پیش خیمہ تصور کرتا تھا کیونکہ ان دنوں اس کو سوائے پلیگ کا چرچا کرنے کے دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا۔ وہ بہت ہراساں تھا۔ میں نے ان توہمات باطلہ سے اس کا خیال ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ خیر اسوقت تو وہ کچھ قائل بھی ہو گیا۔ مگر شام کو پھر وہی خبط لئے آدھمکا۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک اور چہرہ بھی تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا "ماسٹر جی مہاراج۔ آج مادھو نے ایک اور تازہ خبر سنائی تھی کیا اسے بھی آپ جھوٹ ہی کہیں گے؟" میں نے کہا۔ "کیسی خبر ہے جلدی بیان کرو۔" مست رام نے جواب دیا۔ "مادھو خود ہی بیان کرے گا۔ اور اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں۔ کیونکہ میری بات کو تو آپ ہنسی میں اُڑا دیتے ہیں۔"

مادھو ادھیڑ عمر کا بھٹیارا تھا جس کے سر پر لمبی سی چوٹی اور کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ اس نے ایک میلی کچیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور گلے سے ننگا تھا۔ یہ کچھ نیم پاگل سا آدمی تھا۔ جس کی شکل وشباہت دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "سناؤ بھئی مادھو کیا بات ہے"

مست رام نے میری تائید کرتے ہوئے کہا "مگر دیکھو خبردار جھوٹ نہ بولنا" مادھو نے پھٹے پھٹے دیدوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے اور سونے کے مندروں کو پکڑ کر کہنے لگا۔ "مہاراج میں اس پوتر سونے کو چھو کر کہتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولونگا۔

مست رام نے کہا "اچھا تو پھر بیان کرو۔"

مادھو نے کہا۔ "مہاراج۔ دوپہر کو میں حسب معمول بھٹی کے لئے گھاس پھوس جمع کرنے کی خاطر شہر سے باہر گیا۔ اور قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو پیچھے دُور سے کسی نے مجھے مادھو مادھو کہہ کر پکارا۔ میں نے سمجھا کوئی جان پہچان والا ہوگا۔ کیونکہ سوائے جان پہچان والے کے کوئی کسی کا نام لیکر کیسے پکار سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہاں کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ میں آگے بڑھا تو قریب کے کھیت سے پھر آواز آئی۔

باندو پہر مل کا کھیت تھا میں اس طرف ہو لیا۔ تو کچھ دُور پہ پہر مل کے کھیت میں ایک بڑھیا دکھائی دی۔ جو اپنے بدن پہ سالو نا لئے پڑی تھی اس عورت کا چہرہ اتنا ڈراؤنا تھا کہ میں دہل گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں سخت پیاسی ہوں۔ جلد کہیں سے پانی لاؤ۔ مارے خوف کے میری

زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا اور اُٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا۔ تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "ماتا پانی کہاں سے لاؤں۔ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں"۔ اس نے حکم دیا کہ جا کہ نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہہ کر واپس ہؤا۔

ابھی میں تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اُونچی آواز میں پکار کر کہا۔ "مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا۔ میں پلیگ ہوں اگر تم پانی لیکر نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں"۔ اُس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں اُتر گئے اور خوفزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر پر آکر دم لیا"! اس کی یہ مضحکہ خیز داستان سُن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا"۔ اچھا تو پھر تم پانی لے کر گئے تھے"؟ مادھو نے کہا۔ "رام رام پھر وہاں کون جاتا"! میں نے اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھا مٹی کے مادھو اب وہ تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا "بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا۔ مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہئے۔ اور تم مہربانی کر کے ذرا گھر تک پہنچا دو۔ کیونکہ اکیلا جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی"۔

میں نے اُس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا۔ لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام اُسے گھر تک پہنچانے جائے آخر کار اُسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دُوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہؤا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا میں نے کہا "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہؤا"۔ مست رام نے افسوسناک لہجے میں کہا "ماسٹر جی۔ اب خیر کہاں۔ آج مادھو بھی مر گیا ہے"۔ یہ سنکر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اعتباری سے کہا "ہائیں رات کو تو وہ اچھا بھلا تھا۔ اس قدر جلد کیسے مر گیا"؟ مست رام نے کہا۔ "ماسٹر جی مر تو وہ اُسی وقت گیا تھا۔ جس وقت اس کے سر پر پلیگ نے چپت لگائی تھی"۔ میں نے کہا "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ وہ پاگل آدمی تھا واہمہ کا شکار ہو گیا ہوگا۔ مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا"؟ مست رام نے کہا "اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آکر مجھے لے گیا۔ لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ آہ اس کا منہ اور سر سُوجا ہوا تھا اس کے گلے میں پلیگ پھوٹی تھی"۔

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پر رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے پاس بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا غرضکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی پھلدار ڈالوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے۔

اُسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آ نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سُنائی۔ اُس نے کہا "میں بھی نندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سُن کر آیا ہوں"۔ میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے"۔ اُس نے کہا "نندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودھری درگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا جہاں باتوں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا۔ تو تحصیل کے نکڑ پر اُسے ایک عورت ملی۔ جو دہاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اُس کی آواز بہت دردناک تھی۔ اُس نے چودھری سے خیرات مانگی۔ آدھی رات اور سنسان سمے میں اس کی مکروہ آواز کا چودھری پر بہت اثر ہوا۔ اُس نے کچھ نذرِ نقد عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مگر عورت نے وہ پیشکش قبول نہ کی۔ اور کہا کہ میں بھوکی ہوں۔ مجھے کھانے کو کچھ دو۔ چودھری نے نرمی سے کہا۔ یہاں میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو گی تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا۔

چودھری کا جواب سُن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور پھر بولی نہیں ہیں تمہارے گھر نہ چلوں گی۔ کیونکہ تم بھلے آدمی ہو۔ بس اتنا کہتے ہی اس کا قد لمبا ہونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر چودھری کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا۔ اب سنا ہے وہ یگیہ کی تیاری کر رہا ہے۔"

خیر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اُسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دونے انھوں نے مجھے بھی دیئے۔ میں نے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں۔" انھوں نے کہا "چودھری درگا داس کے ہاں سے۔" میں نے کہا "کیا تقریب ہے۔" انھوں نے جواب دیا "کہ چودھری جی نے یگیہ رچایا ہے۔" میں نے کہا "کیوں۔" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "ان کی مرضی۔" میں لاجواب ہو گیا اور دونے چپکے سے اُٹھا کر رسویا کے حوالے کر دیئے۔

(۴۴)

رفتہ رفتہ من کوٹ بھی پلیگ کی زد میں آگیا۔ اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ من کوٹ میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی ارزاں ہو گئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر گر کر مرجاتے۔ اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر بیمار پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چکے تھے۔ اور باقی کثرت اموات کی بدولت مُردوں سے بدتر ہو رہے تھے۔ غرضکہ ہر طرف ہراس اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے بھی نہر کا پل تھا جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس وحشت خیز منظر کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا "بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں۔ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔" مست رام نے کہا "یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے کیونکہ یہ "نگمہ" جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "نگمہ" کون سا اتنا دُور ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکے۔" مست رام نے کہا "نہیں وہاں پلیگ نہیں جا سکتی۔ ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے۔" میں نے کہا "نگمہ" میں پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی۔"

مست رام نے جھوم کر کہا "وہ رسیلے کی نگری ہے ماسٹر جی رسیلے کی۔ جس کا نام سنتے ہی پلیگ رفو چکر ہو جاتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا "رسیلے کی نگری! وہ رسیلا کون ہے۔" مست رام نے کہا "ماسٹر جی رسیلا ایک بھاگوان پرش تھا۔ جتی ستی سا۔ گنی آدمی تھا۔ بلوان تھا۔ ایشور کا روپ تھا۔ ایک وقت میں اُس نے پلیگ کو اپنی قوت بازو سے زیر کیا تھا۔" میں نے اشتیاق سے کہا "وہ کیسے؟" مست رام کہنے لگا "یہ بہت لمبا قصہ ہے جو پھر کبھی وقت سناؤں گا۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں۔"

آخر کار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہو گیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھول محیط رہتی تھی اور نامعلوم طور پر آہ و بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا۔ اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے تاکہ بستر گول کروں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا کم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا۔ اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا۔ دو دن سے میں بھی بہت پریشان تھا۔ کیونکہ میرا رسویا بھاگ چکا تھا۔ اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو ثقل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولھا جھونکا۔ اور کچا پکا کھانا زہر مار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلساتے تھے۔ مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سُنائی دی۔ جس سے میں چونک اُٹھا۔ اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

آخر میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور چندو بھنگی کو آواز دی۔ جو چبوترے کے قریب ہی چارپائی پر پڑا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ فوراً اٹھا اور کہنے لگا "مالک میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا ہوں" میں نے کہا "چندو خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے"۔

چندو میرے قریب کھڑا اپنے ہاتھوں کو زور زور سے مل رہا تھا جیسی کہ اس کی عادت تھی! میں نے کراہتے ہوئے پھر اُسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا "مالک میرا بھی یہی حال ہے"۔ میں نے نڈھال ہو کر کہا "تو ایسا کیوں ہو رہا ہے"۔ اُس نے جواب دیا "مالک وجہ تو جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں بے علم آدمی ہوں ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو"۔

میں نے گھبرا کر کہا "ہاں ہاں وہ وجہ ضرور بتاؤ۔ یہاں علمیت کا سوال نہیں۔ تجربہ علیحدہ چیز ہے"۔ چندو نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا "مالک کئی برس گزر گئے۔ میں اس وقت جوان تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے چودھری کی دوسرے گاؤں کے چودھری سے سخت دشمنی تھی۔ اور اُسے چوری کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اُس نے مجھے چوکیداری پر ملازم رکھا۔ میرا باپ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اور اُسے بےخوابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے وہ اکثر رات کو میرے ساتھ چودھری کی حویلی پر چلا آتا تاکہ رات آسانی سے کٹ جائے۔

چنانچہ ایک رات جب ہم دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایسا ہی سماں چھا گیا اور اسی طرح ایک پُر ہیبت خاموشی اور جانسوز پژمردگی طاری ہو گئی۔ میں بہت ہی خوفزدہ ہوا۔ مگر میرے باپ نے کہا "بیٹا حوصلہ کرو اور بھجن گاؤ۔ کیونکہ اس وقت کوئی پوتر رُوح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی پیشوائی کے لئے معمولی یم دوتوں کے علاوہ ان کا سردار بھی آیا ہے"۔

غرضکہ ہم دونوں بھجن گانے لگے۔ اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت خود بخود زائل ہو گئی آخر صبح معلوم ہوا کہ رات کو قریب ہی کے گھر میں پجاری کی نوجوان اندھی کنیا گزر گئی ہے۔

میں نے متوحش ہو کر کہا "تو کیا اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ یہاں بھی گرد و پیش کوئی موت واقع ہونے والی ہے" "جی ہاں ضرور"۔ چندو نے بڑے وثوق سے کہا "اس وقت کوئی پوتر رُوح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی خاطر خود موت کا فرشتہ یم دوتوں کے پورے لشکر سمیت وارد ہوا ہے۔ یہ اسی کے پروں کی تیکھی جنبش سے مہیب خاموشی۔ اور لرزہ خیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

چندو کی اس گفتگو سے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ میں فرطِ خوف سے بےحال ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا "آہ وہ فرشتہ شاید میری ہی رُوح قبض کرنے کو آیا ہے"۔ چندو نے دعائیں دیتے ہوئے کہا "مالک ایسی بات نہ کہو ابھی کوئی دم میں یہ سختی رفع ہو جائے گی۔ آؤ وہی بھجن گائیں۔ جو ایک ایسے ہی وقت میں میں نے اپنے باپ کے ساتھ گائے تھے"۔

غرضکہ اُس نے نہایت عقیدت اور جوش سے بھجن گانا شروع کیا۔ ساتھ میں بھی لڑکھڑاتی زبان اور کمزور آواز میں اس کے ساتھ بھجن گاتا رہا مگر باوجود اس کے کئی گھنٹوں تک وہ حالت بدستور قائم رہی۔ رات اتنی لمبی ہو گئی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی مست رام بھی آج ایسا خاموش تھا کہ جیسے رگنی آسا چھیڑنا بالکل بھول گیا ہو۔

آخر خدا خدا کر کے یہ کافر رات ختم ہوئی۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ بےحس و حرکت درخت آہستہ آہستہ انگڑائیاں لیتے ہوئے گہری نیند سے جاگے۔ برگ و بار کے مردہ تنوں میں گویا جان سی پڑنے لگی۔ اور ماحول بتدریج سکون پذیر ہونے لگا۔ میرے دماغی انتشار اور دلی ہیجان میں بھی کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا۔ جس کی ہر کرن تپتی ہوئی سلاخ بن کر جسم کو داغ رہی تھی۔ میں کلبلا کر اُٹھ بیٹھا چندو اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ پی رہا تھا مجھے بیدار پا کر میرے پاس آ گیا۔ اور مزاج پرسی کے بعد ساتھ حسبِ معمول اپنے ہاتھوں کو زور زور

سے ملنے لگا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہچکچا رہا ہے۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بیشک کہہ دو۔" مالک اس نے دھیمی آواز سے کہا۔ "رات کو جو بات میں نے کہی تھی بالکل سچی ثابت ہوئی۔" میں نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہا۔ "یعنی" اُس نے جواب دیا۔ "یعنی رات کو بھلا آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کون؟" چندو بولا۔ "مست رام۔" میں نے بدحواسی سے چلّا کر کہا۔ "کیا مست رام مر گیا؟" "ہاں مالک ابھی اس کی لاش کمیٹی والے اُٹھا کر لے گئے ہیں۔" اُس نے افسوس سے کہا۔

مست رام کی موت کی خبر ایک زبردست آہنی ہتھوڑے کی ضرب کی طرح میرے دماغ پر لگی۔ میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس دن بارہ بجے کی ڈاک میں مجھے انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ملا۔ کہ میں سکول بند کر کے چھٹی پر چلا جاؤں۔ لہٰذا اُسی دن میں روتا دھوتا اپنے گھر چلا آیا۔

(۵)

اس واقعہ کے چند ماہ بعد موضع ٹکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے مست رام کے وہ الفاظ یاد تھے کہ ٹکہ کے قریب رسیلی نگری ہے جس نے پلیگ کو قوت بازو سے زیر کیا تھا۔ رات کو میں چودھری گہند رام کی حویلی ہی میں ٹھہرا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے بوڑھے چودھری سے رسیلے کا قصّہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ صحرائی گرمی کا جوش کسی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی معتدل ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریچوں سے باہر وسیع و لامحدود صحرا۔ رات کی خاموشی اور تاریک آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا۔ تاروں کی کثرت سے آسمان سیاہ و مقیشی چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کے کوٹھے پر جس کے کونوں میں کلسوں پر بڑے بڑے روغنی آبدان نصب تھے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

بوڑھا چودھری گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ کسی زمانے میں ہمارے گھر ایک بوڑھا مصری دیوی ناتھ رہتا تھا۔ یہ میرے باپ کے وقت کا بہت نیک اور وفادار ملازم تھا۔ "رسیلا" اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس لئے بوڑھا مصرا اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جب رسیلا نے زندگی کی ساتویں سیڑھی پر قدم رکھا تو بوڑھا مصر چل بسا اور مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گیا۔

بوڑھی مصرانی بہت سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ ادھر رسیلے کو میں نے پاٹھ شالہ میں داخل کرا دیا۔ رسیلا بڑا ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ دوپہر کو جب پاٹھ شالہ سے واپس آتا تو بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بلکہ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی نہایت شوق سے حصّہ لیتا۔ اور اپنی حُسنِ لیاقت سے وہ بہت جلد گھر بھر میں عزیز ہو گیا۔ رادھا کے سوائے گھر کے تمام افراد اس سے خوش تھے میری اکلوتی بیٹی رادھا اس وقت بارہ سال کی تھی یہ بہت تند اور تلخ مزاج کی لڑکی تھی۔ رسیلے کے ساتھ اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ یہ اسے اپنا حریف سمجھتے ہوئے اکثر بلاوجہ ہی اسے پیٹ ڈالتی تھی۔ بوڑھی مصرانی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی غمناک آنکھوں کو دیکھ کر میں رادھا کی سرزنش کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس لئے رادھا کی عداوت روز بروز بڑھتی گئی۔ اسی طرح دن گذرتے گئے۔ حتیٰ کہ رسیلا چودہ سال کا ہو گیا۔ رادھا اس وقت بیس سال کی تھی۔ اس کی شادی میں نے ایک امیر گھرانے میں کی تھی۔ مگر وہ چوتھے سال ہی ودھوا ہو کر ہمارے گھر واپس آگئی۔ مگر رسیلا پہلے سے زیادہ جانفشانی سے اس کی خدمت کرنے لگا۔ مگر وہ بدستور اس کی مخالف رہی۔

رفتہ رفتہ رسیلا جوان ہوتا گیا۔ جوان بھی ایسا جس کو درشنی جوان کہنا زیادہ موزوں تھا۔ جس طرف نکل جاتا انگلیاں اُٹھنے لگتیں گاؤں کی لڑکیاں اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں گاؤں کے لڑکے اس کی دوستی پر فخر کرتے اور بڑے بوڑھے اس کو دعائیں دیتے تھے۔ وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسا شاہانہ پن تھا کہ سادہ لباس میں بھی راجکمار دکھائی دیتا تھا۔ اب میں نے بجائے گھر کے کاموں کے باغات کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ جس کے حُسنِ انتظام سے میری آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

بوڑھی مصرانی بیٹے کی سعادت مندی اور قابلیت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی زبردست خواہش تھی کہ بیٹے کا بیاہ کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ لہٰذا اُس نے من کوٹ کے ایک اچھے کھاتے پیتے برہمن کی حسین لڑکی کے ساتھ اس کی سگائی کر دی۔ لیکن جب لڑکی والوں نے شگن بھیجا تو رسیلے نے شگن لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مصرانی نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت سماجت بھی کی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہُوا۔

بوڑھی مصرانی اپنے فرمانبردار بیٹے کی جسارت اور گستاخی سے بہت آزردہ ہُوئی۔ اور روتی ہوئی میرے پاس آئی تاکہ میں رسیلے کو سمجھا بجھا کر شادی پر آمادہ کروں۔ لیکن میں بھی کوشش میں ناکام ہُوا۔

اُس نے کہا "مالک۔ یوں تو آپ کو مجھ پر ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ لیکن شادی کے معاملے میں آپ دخل نہ دیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ کیونکہ میں عورت ذات سے سخت نفرت کرتا ہوں۔" میں نے حیرت سے پوچھا "اس کی وجہ؟" اُس نے جواب دیا کہ میری مرضی۔ میں لاجواب ہو گیا۔

رسیلے کی اس ہٹ دھرمی سے اس کے متعلق گاؤں میں منافرت کی لہر دوڑ گئی۔ گاؤں کی لڑکیاں اسے ذلیل و حقیر تصوّر کرنے لگیں۔ لوگ اپنے لڑکوں کو اس کے میل جول پر ٹوکنے لگے۔ تاکہ وہ اپنے زہریلے خیالات کہیں ان کے دماغوں میں نہ بھر دے۔

رادھا کو بھی اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ اُس نے اسی بہانے سے رسیلے کو جی بھر کے کوسا۔ بہت بے عزت کیا اور آخر انتہائی نفرت سے اُس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ غرضیکہ رسیلے نے زمانہ کی بدسلوکیوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آیا۔ بوڑھی مصرانی کو بیٹے کی اس ضد سے بہت صدمہ ہوا اور اسی سال وہ بہو کی آرزو دل میں لئے سرگباش ہو گئی۔

ماں کے مرنے کے بعد رسیلا بالکل خود مختار اور آزاد تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہوتا گیا۔ لوگ اُسے سنت رسیلا کہنے لگے۔ اور اسی حالت میں اُس نے زندگی کی پچپن منزلیں طے کر لیں۔

اس بات کو چالیس سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہی موسم تھا کہ اس علاقے پر پلیگ کا زبردست حملہ ہُوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ اکثر ایسا بھی ہُوا کہ گھر کے تمام افراد ایک دم مر گئے۔ ان کے مردے گھروں کے اندر ہی سڑتے رہے اور چوہے درندوں کی طرح ان کو کھاتے بھی رہے۔ بعض اوقات یہ مردہ خور چوہے بھیڑ بکریوں کی طرح غول در غول گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے۔

ان دنوں اکثر ایسی بعید از قیاس اور بے تکی باتیں ظہور پذیر ہوئیں کہ بہت سے آدمی تو دہشت سے ہی مر گئے۔ آخر کار خلقت نے بدحواسی سے گھر چھوڑ کر باہر صحرا میں چھپر ڈال لئے۔ ہم لوگ بھی یہ حویلی چھوڑ کر باہر کچی حویلی میں چلے گئے۔ جو سامنے والے باغ میں بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی رادھا پلیگ میں مبتلا ہو گئی۔

رادھا چونکہ واحد اولاد ہونے کی وجہ سے میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ سینہ کا سرور اور آنکھوں کا نور تھی اس لئے اس کی بیماری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارا کنبہ تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ اس موقعہ پر رسیلے نے اس کی اتنی خدمت کی کہ اگر کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ بھی شاید نہ کر سکتا۔ وہ دن رات برابر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اس کی صورت سے وحشت برستی تھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا مبادا بیمار نہ ہو جائے۔

خیر ایک ایک لمحہ گنتے ہوئے رادھا کی بیماری کو چھ دن گزر گئے۔ اور ہمیں اس کی زندگی کی کچھ آس بندھ گئی (کیونکہ عام طور پر یہ مرض آناً فاناً اپنا کام کرتا ہے۔ اور جو مریض کچھ لٹک جائے۔ وہ یقینی طور پر بچ جاتا ہے) لیکن جونہی ساتویں رات آئی تو رادھا نے پھر درد و کرب سے تڑپنا شروع کیا۔ یعنی اس کی دوسری بغل میں ایک اور گلٹی نمودار ہو گئی جس سے اس کی حالت دم بدم بگڑنے لگی۔

رادھا کو دم توڑتے دیکھ کر گھر بھر کے چہروں پر مُردنی چھا گئی۔ میں فرطِ غم سے نڈھال ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ باغ کے شمالی دامن میں ایک

گھنے کنج کے درمیان ہمارے بزرگوں کے وقت کا ایک پرانا مندر تھا۔ جس میں کرشن بھگوان کی بڑی سی مورتی نصب تھی۔ انسان چاہے کتنا ہی پاپی ہو، مصیبت کے وقت ضرور پرماتما کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کے چرنوں میں اُسے شکتی اور شانتی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا میری بھی یہی حالت تھی۔ میں نے بے اختیار مندر کا رُخ کیا۔

پورنماشی کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ جس کی تیز روشنی میں صحرا کے ذرات اس آب و تاب سے چمک رہے تھے گویا ہر ذرہ بذات خود ایک چاند تھا۔ لیکن نصف شب کی بھکی بھکی ہواؤں کی فراقیہ گونج سے کائنات میں بجائے رنگینی کے ایک اُداسی اور رقت چھا رہی تھی۔ صحن باغ میں چاندنی سے منور زمین پر درختوں کے سائے اس طرح متحرک تھے۔ جیسے پلیگ کے ہاتھوں بے موت مرے ہوئے انسانوں کی رُوحیں عالم ارواح سے اُتر کر اپنے مردہ جسموں کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔ غرضکہ اس سنسان اور ہُو کے عالم میں۔ میں بھی ایک رُوح کی طرح فکر و آلام کو پیچھے چھوڑتا ہوا مندر تک جا پہنچا۔

مندر کی پُر ہول اور گہری خاموشی میں حقیقی مسرت برس رہی تھی میرے دل میں روحانیت کا چشمہ اُبلنے لگا۔ میں فوراً جوشِ عقیدت سے مورتی کے سامنے جھک گیا۔ اور نہایت عاجزی سے رادھا کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرنے لگا۔ درحقیقت من کی صفائی اور آتما کی تسلی کے لئے پرارتھنا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

اس طرح جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں مورتی کی پشت کی جانب سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے مندر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص والہانہ جوش سے اندر داخل ہوا۔

آنیوالا رسیلا تھا جو اندر آتے ہی مورتی کے چرنوں میں گر گیا اور گڑگڑا کر بھگوان سے کہنے لگا۔ "ہے بھگوان میری رادھا کو پلیگ کے خونخوار پنجے سے بچا لے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور ذلیل سمجھتی ہے مگر میرا دل اُس پر مائل ہے۔ میں اُس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے من کی رانی ہے۔ آہ میری بوڑھی ماں میری شادی کی آرزو دل میں لئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن میں اس کی آرزو پوری نہ کر سکا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی رادھا کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ آہ آج ظالم پلیگ میری محبت کا وہ خزانہ مجھ سے چھیننے کے درپے ہے۔ جس کی حفاظت پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آہ آج وہی رادھا۔ جس کا میں پجاری ہوں۔ میرے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ بھگوان! اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہونگا۔" کثرت گریہ سے اُس کی آواز رُک گئی۔

اس انوکھے انکشاف پر میں ششدر رہ گیا۔ مگر مصلحتاً کونے میں دبکا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اُس نے پھر سر اُٹھایا۔ اور کہنے لگا۔ "آہ بھگوان تم تو بالکل خاموش ہو۔ اگر خود میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے ہی موقعہ دو۔ تاکہ میں پلیگ سے زور آزمائی کر کے اُسے شکست دوں۔ اور اس کے پنجے توڑ کر رادھا کو بچا لوں۔"

عین اسی وقت باہر سے ایک نہایت مکروہ اور کرخت آواز سنائی دی۔ "کہ اگر مجھے مندر میں داخل ہونے پر قدرت حاصل ہوتی۔ تو تمہیں شیخیاں بگھارنے کا مزہ چکھا دیتی۔ ہاں اتنے بہادر ہو تو باہر آ کر ذرا اپنی طاقت دکھاؤ۔" آواز سُن کر میرا دل دہل گیا۔ مگر رسیلا جس کی رگوں میں جوانمردی کا خون پورے جوش سے رقص کر رہا تھا۔ بجلی کی سی سرعت سے تڑپ کر اُٹھا۔ اور شیر نر کی طرح دروازے سے باہر کود گیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں اُسے پکڑنے کے لئے اُٹھا تو سہی۔ مگر دروازہ پہ پہنچ کر میرے پاؤں خود بخود رُک گئے۔ باہر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور حواس باختہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کہیں دُور سے مرغ سحر کی دھیمی سی ککڑوں کوں کی صدا خاموشیوں کو چیرتی ہوئی فضا میں گھل مل گئی۔

میں پیغام صبح سُن کر ایک دم چونکا۔ اور حوصلہ کر کے باہر نکلا۔ باہر بدستور وحشت برس رہی تھی۔ خشک چاندنی شبنمی ہواؤں سے قدرے نرم پڑ چکی تھی۔ لیلائے شب کے منتشر سیاہ گیسو بتدریج سنورتے اور سمٹتے جا رہے تھے۔ میں ادھر اُدھر رسیلے کو تلاش کرنے لگا۔

یکایک مویشی خانہ کی طرف سے چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ یہ آواز نہایت بھیانک اور اُلّو کی چیخوں کے مانند تھی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہُوا ادھر گیا۔ لیکن مویشی خانہ کے سامنے پہنچ کر مجھے رُکنا پڑا۔ کیونکہ کوئی شخص چیختا ہُوا میری طرف آ رہا تھا۔ جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں سہم کر درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آنے والی ایک نہایت میلی کچیلی اور بے حد کریہہ المنظر بڑھیا تھی۔ جس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکا رکھے تھے۔ گویا ٹوٹے ہوئے ہوں۔ وہ چیختی چلاتی اور بے تحاشا بھاگتی ہُوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

اس کے دُور چلے جانے پر میں چھپر کی طرف بڑھا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر رسیلا چھپر کی منڈیر کے سہارے نیم دراز تھا۔ اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر چھاتی سے لگا رکھی تھیں۔ میں نے اُسے پکارا مگر اُس نے جواب نہ دیا۔

اُس کی بے ہوشی سے آگاہ ہو کر میں نے اُس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اس کی کنپٹیاں سہلائیں اور آہستہ آہستہ اس کی کسی ہُوئی مٹھیوں کو کھولا۔ تو کوئی چیز اُس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر بکھر گئی۔ میں نے تعجب سے اس چیز کو جھک کر دیکھا۔ اُف اُس ہولناک اور ناپاک چیز کو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ خدا معاف کرے وہ تو دس لمبے لمبے ناخون تھے جو کسی درندے کے پنجوں سے تازہ جھڑے ہُوئے معلوم ہوتے تھے۔ دہشت اور کراہت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

کافی وقفہ کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ رسیلا ابھی تک بدستور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کیونکہ وہ دُوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ صبح صادق کی پُر عظمت دھیمی روشنی اور چاندنی کے ڈھلتے سایوں میں ہوائیں موت کا راگ گاتی ہُوئی ہچکیاں لے لے کر چل رہی تھیں۔ پڑوس کا کنواں نہایت حسرت ناک لَے میں (وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) کی راگنی گاتا ہوا اس کی جوانمرگی پر آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فتح اور کامیابی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ وہ بازی جیت چکا تھا۔

رسیلے کی موت کے بعد رادھا کی حالت روز بروز سنبھلتی گئی۔ یعنی رسیلے نے پلیگ کے پنجے توڑ کر اُسے بچا لیا۔ بلکہ بستی میں بھی بہت جلد امن قائم ہو گیا۔ اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس گاؤں میں پلیگ نہیں پھوٹی۔ چنانچہ اس پُر حسرت واقعہ کی یاد میں اس گاؤں کا نام نگرہ پڑ گیا۔ پرانے زمانے کے لوگ اسے رسیلے کی نگری بھی کہتے ہیں۔ ورنہ کسی زمانہ میں یہ گاؤں من کوٹ کا ہی ایک حصہ تھا جو نیا من کوٹ کہلاتا تھا۔

(۶)

رسیلے کے صبر و استقلال۔ پاکیزہ عشق اور بہادری کی انوکھی داستان سُن کر میں نقشِ حیرت بن گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری راتوں کا کمزور چاند گرد و نواح میں اپنی رُوکھی پھیکی چاندنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یک لخت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا سوکھے پتوں کی جھانجھ بجاتا ہوا اُٹھا۔ اور بلند ہو کر کھجوروں کی دراز چوٹیوں سے ٹکرایا۔ تو کھجوروں کی سخت اور نوکیلی شاخوں نے زبانِ بے زبانی سے (وت آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) کا غمگین ترانہ الاپنا شروع کیا۔ تمام صحرا میں ایک پُر درد گونج پیدا ہو گئی عین اُسی وقت کسی صحرا نشین نے بھی یہی راگنی چھیڑ دی۔

چاروں طرف سے پیغام فنا سُن کر دُنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا میرے دل پر بہت اثر ہُوا۔ آزردہ حالی سے میرا دماغ معطل ہو گیا۔ حتیٰ کہ میں نیند کی وادی میں داخل ہو کر ایک لاہوتی دنیا میں کھو گیا۔

صالحہ عابد حسین

سارے گھر میں بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مریضہ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر معائنے میں مشغول تھے۔ موہنی کا شوہر پرتاب اور اس کا بھائی کمرے کے اندر تھے۔ اس کی بھاوج سرسوتی برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موہنی کی تیرہ سال کی بچی سوہنی اور سترہ سال کا لڑکا پریم کمرے کے باہر دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے اور مایوسی کے اشارے کرتے۔ ان کے چہروں سے رنج و غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے ...... موہنی کا محبوب کتا ہیرا بھی ایک طرف خاموش اور اُداس سا بیٹھا تھا۔ گویا وہ بھی آنے والے افسوسناک حادثہ سے سہما ہوا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرنل شہاب سر جھکائے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے نرس اور دو تین اور ڈاکٹر بھی باہر آئے۔ پریم اور سوہنی ایک ساتھ دوڑے اور ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سوہنی نے بے قراری سے پوچھا، ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب بتائیے ممی کو ہوش آیا؟ اب وہ کیسی ہیں؟ اچھی ہو جائیں گی نا؟ بولئے ڈاکٹر صاحب ایشور کے لئے کچھ تو کہئے"۔ پریم نے منہ سے کچھ نہ کہا مگر آنکھوں آنکھوں میں سینکڑوں سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر نے محبت اور افسوس بھری نگاہ سے دونوں بچوں کو دیکھا۔ اور سوہنی کے سر پر ہاتھ پھیر کر صرف اتنا کہا "گھبراؤ نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو"۔

موہن نے بیوی کو اشارہ کیا اور وہ سوہنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ پرتاب نے دوسرے ڈاکٹروں کو فیس دے کر رخصت کیا۔ اور ڈاکٹر شہاب۔ موہن اور پریم چاروں ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر موہن نے اس خاموشی کو توڑا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

موہن ۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا رائے قائم کی۔ موہنی بچ جائے گی؟

ڈاکٹر ۔ مسٹر موہن آپ ان کی حالت دیکھ رہے ہیں۔ آٹھ دن سے بالکل بیہوش ہیں۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے۔ طاقت کی دوائیں اور انجکشن سب اب تک بیکار ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

پرتاب ۔ ڈاکٹر کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟

ڈاکٹر - پرتاب اگر تم صاف صاف پوچھتے ہو تو سچ یہ ہے۔ کہ مسز پرتاب کا بچنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے (رکا یک پریم کو دیکھ کر) لیکن اگر انھیں ہوش آگیا تو دوا ضرور اثر کرے گی۔ ہم اپنی طرف سے کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھیں گے (کچھ دیر بعد) پرتاب مجھے تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کہنا ہیں۔

موہن اور پریم اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ پرتاب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

پرتاب - کیوں شہاب کیا واقعی اب میری بیوی نہیں بچ سکتی ؟

ڈاکٹر - خدا میں بڑی طاقت ہے۔ لیکن میرا علم اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ اب مسز پرتاب نہیں بچیں گی۔

پرتاب - شہاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کچھ تو کرو۔ آپریشن ! کیا آپریشن کرنے سے زندگی کی امید ہو سکتی ہے ؟

ڈاکٹر - آپریشن بالکل فضول ہے وہ پہلے ہی شدید تکلیف اُٹھا رہی ہیں۔ میں انھیں اور زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ ان کا دِل اس قدر کمزور ہے کہ وہ آپریشن تو بڑی چیز ہے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

پرتاب - افسوس۔

ڈاکٹر - پرتاب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مسز پرتاب کی بیماری کا سبب تم اور صرف تم ہو۔ اگر وہ مر گئیں تو اُن کا خون تمھاری گردن پر ہوگا

پرتاب - (خفگی سے) شہاب یہ کیا بک رہے ہو ؟ میں ان کی بیماری کا سبب کیسے ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر - مجھ سے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں بیس برس سے تمھیں اور انھیں جانتا ہوں۔ تمھارا دوست ہوں اور تمھارے خانگی حالات سے پوری طرح واقف۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے۔ جب تم نے پہلی مرتبہ اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ مسز پرتاب اس وقت شاید سترہ یا اٹھارہ سال کی ہوں گی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میں انھیں دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ کیسا بے مثل حسن تھا۔ اور پھر کتنی نیک اور بھولی طبیعت لیکن تم نے انھیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ پہلے انھیں سوسائٹی سے روشناس کرایا۔ ہر اچھی بُری محفل میں زبردستی لے گئے۔ اپنے کم ظرف اور ذلیل طبیعت دوستوں تک سے ان کی ملاقات کرائی۔ اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے تم نے انھیں تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا۔ شراب جیسی مذموم چیز اور مہلک زہر کی انھیں زبردستی لت لگائی۔ ان کے حمل دواؤں سے ضائع کرائے جس کی وجہ سے ان کی صحت اور بھی زیادہ خراب ہوگئی۔ اور پھر خود ہی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ خود بُری صحبت میں پڑ گئے اور ان پر الزام رکھے۔ ان پر بے جا بندشیں لگائیں اور ہر طرح اُن کے نازک دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ شراب پینے لگیں اور تم نے بجائے اس کہ ان کی اس عادت کو جو خود تمھاری ہی ڈالی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ چھڑاتے اس کی پروا بھی نہ کی۔ بجائے دلجوئی کے دل آزاری سے کام لیا۔ نتیجہ جو کچھ ہے تمھارے سامنے ہے۔ شراب کی کثرت اور دلی رنج و غم نے ان کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ ان کے قوی غیر معمولی طور پر اچھے تھے جو وہ اتنے سال بھی یہ سب جھیل گئیں۔ دوسری عورت دو چار سال بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ پرتاب! موہنی کی غلطیوں کا کفارہ تو ان کی بیماریوں نے کر دیا مگر تم خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے ؟"

پرتاب سر جھکائے ڈاکٹر کی لعن طعن سُن رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سُرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ آنکھیں غیر معمولی انہماک سے ایک طرف جمی ہوئی تھیں اور گذشتہ بیس سالہ زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح اس کے دماغ کے پردوں پر اُبھر رہے تھے۔

نرم و گداز بستر پر موہنی بے سدھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا سُرخ و سفید رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو کبھی چشم آہو کو شرماتی تھیں، گہرے گہرے گڈھوں اور سیاہ حلقوں سے گھری ہوئی ہیں، لمبے لمبے سیاہ بال ماتھے اور تکئے پر پریشان ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت

ہاتھ اور پاؤں جو موزونیت میں بے مثل تھے اب سوج کر ڈبل روٹی کی طرح ہو رہے ہیں اور شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر بھی ورم ہے۔ باقی تمام جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے پہلی نظر میں دیکھنے والے کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اور وہ ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھال اور ہڈیوں کا یہ پنجر کبھی حسن اور موزونیت کا مکمل نمونہ ہوگا۔ اس کی صورت " آثار پدید است صنادید عجم را " کا عبرت ناک مرقع ہے۔

پریم اور سوہنی ماں کے پلنگ کے پاس تصویر کی طرح خاموش بیٹھے اس کی صورت ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک طرف سرسوتی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہن بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ موہنی کے سرہانے نرس ہاتھ میں انجکشن کی خالی پچکاری لئے کھڑی ہے۔ ڈاکٹر شہاب موہنی کی سوکھی اور زرد کلائی اپنے مضبوط اور طاقتور ہاتھ میں تھامے نبض پر انگلیاں رکھے اس کی طرف جھکا ہوا کھڑا ہے

——— ایک منٹ ——— دو ——— تین ——— چار ——— پانچ ——— دس ——— بیس ——— منٹ گذر گئے کمرے میں ہر شخص کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں۔ آخر ڈاکٹر نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ موہن کی طرف دیکھ کر "مسٹر موہن! مسز پرتاب کی نبض اب بہتر حالت میں ہے کچھ دیر میں انھیں ہوش آجائے گا۔"

سوہنی اور پریم کے چہرے کھل گئے۔ "سچ ڈاکٹر صاحب"

"ہاں امید تو یہی ہے"

بیس پچیس منٹ اور گذر گئے۔ موہنی کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے منہ پر انگلی رکھ کر کمرے کے بے چین لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا آہستہ آہستہ موہنی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بچوں پر جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ لب ہلے ——— بہت خفیف سی جنبش ہوئی ——— کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہا ہے ——— ڈاکٹر نے اپنا کان اس کے لبوں کو لگا دیا۔ "سوہنی...... پریم ...... بلاؤ"

ڈاکٹر شہاب نے دونوں بچوں کو، جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے ضبط گریہ کی انتہائی کوشش کر رہے تھے، اشارہ کیا ——— وہ جلدی سے ماں کے قریب آئے۔ موہنی کی آنکھوں سے دو قطرے ادھر ادھر گرے۔ کمزور آواز نکلی "میرے بچے"

دونوں نے اپنے سر ماں کے سینے پر جھکا دیئے۔ آنکھوں سے دریا امنڈ آیا۔ ماں نے اپنا ہاتھ بڑی کوشش سے اٹھا کر بچوں کے سر پر رکھا۔ کچھ دیر یونہی گذری۔ یکایک موہنی نے نسبتاً بلند آواز سے کہا "پریم ——— موہن بھیا کو ——— تار دے کر ——— بلا دو" موہن بیقرار ہو کر آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "موہنی۔ موہنی۔ میری پیاری بہن۔ میں تمھارے پاس موجود ہوں" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فرط گریہ سے آواز رک گئی۔ موہنی نے بھائی کی طرف نظریں پھیریں۔ چہرے پر کچھ آثار زندگی ہویدا ہوئے رک رک کر بولی "بھیا تم آگئے ہاں اب میں اطمینان سے مروں گی" ڈاکٹر نے اتنے میں دوسرا انجکشن تیار کر لیا تھا وہ موہنی کے بازو میں لگایا اور سب سے کہا "آپ لوگ باہر جائیے۔ ان کو آرام کرنے دیجئے۔ اب بیہوشی نہ ہوگی بلکہ نیند آئے گی" نرس نے پردے گرا دیئے۔ موہنی نے نقاہت سے آنکھیں بند کر لیں۔

باہر نکل کر دونوں بہن بھائی کرنل شہاب سے لپٹ گئے "ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب، ممی اب اچھی ہو گئیں؟ اب کوئی خطرہ تو باقی نہیں؟ ایشور نے ہماری دعائیں سن لیں" خوشی کے مارے پورے جملے ان کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ موہن نے بھی سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا "میں سمجھتا ہوں خطرہ اس وقت ٹل گیا ہے" سوہنی نے پریم کا ہاتھ پکڑا! "آؤ بھیا پاپا کو فون

کر کے خوشخبری سنائیں" دونوں خوشی سے ناچتے ہوئے چلے۔ پیچھے پیچھے موہنی کا کتا ہیرا دم ہلا ہلا کر اظہارِ خوشی کرتا ہوا جا رہا تھا۔

آج موہنی کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہیں سر گندھوایا ہے اور تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔ اس کے ملنے والے اور دوست ڈاکٹر کی اجازت سے دو دو منٹ کے لئے اس کے پاس آ کر مزاج پرسی کر جاتے ہیں۔ وہ مسکرا کر ان سے دو ایک باتیں کرتی ہے۔ سارا گھر خوش و خرم ہے کہ وہ اب اچھی ہو رہی ہے۔

جب سب ملنے والے جا چکے تو موہنی نے بھائی کو بلا کر کہا "بھیا میرے دونوں بچوں اور بھابی کو بلا لو۔ آج میں تم سب سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔" موہن نے ڈاکٹر شہاب کی طرف دیکھا جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی اپنی مریضہ کو دیکھنے آئے تھے "ایسا نہ ہو کمزوری ہو جائے۔" موہنی نے آزردگی سے کہا "کچھ ہو مجھے آج ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے۔" ڈاکٹر شہاب نے کہا "آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ اب آپ روبصحت ہیں مگر آپ کی مکمل صحت کے لئے سب سے لازمی چیز یہ ہے کہ آپ خود ہمت اور پوری قوتِ ارادی سے کام لے کر دل میں یہ بات جما لیں کہ میں ضرور اچھی ہو کر رہوں گی۔"

موہنی نے ڈاکٹر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا "ڈاکٹر صاحب آپ مجھے ——— مریض کو دھوکا دیتے ہیں ——— مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے کہ میں اچھی ہوں گی یا نہیں ——— یہ صحت نہیں سنبھالا ہے۔ ذرا میری طرف دیکھ کر کہئے۔ کہ میری حالت اچھا ہونے کی ہے؟" ڈاکٹر شہاب نے سر جھکا لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔

موہن، سوہنی، پریم اور مسز سوہنی کو بلا لایا۔ چند منٹ بعد پرتاب بھی کمرے میں داخل ہوا اور موہنی کی مزاج پرسی کی۔ موہنی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد موہن سے بولی "تم سب میرے قریب آ جاؤ تاکہ میری آواز اچھی طرح سن سکو۔ ڈاکٹر صاحب آپ یہیں رہیئے۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔ ہاں سسٹر (نرس) تم کچھ دیر کو باہر چلی جاؤ۔" نرس باہر چلی گئی۔ باقی سب لوگ آ کر موہنی کے پلنگ کے قریب بیٹھ گئے صرف پرتاب ذرا سے ہٹ کر آرام کرسی پر پڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ ڈاکٹر نے انار کا عرق موہنی کو پلایا اور موہنی آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی۔

"جانتے ہو میں نے تم سب لوگوں کو کیا کہنے کو بلایا ہے؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ وصیت کروں گی۔ نہیں مجھے کوئی وصیت نہیں کرنی۔ میں تو تم لوگوں کو اپنی دردبھری مصیبت کی کہانی کے چند ورق سناؤں گی۔ دنیا ہمیشہ اس دھوکے میں رہی کہ میں بڑی خوش نصیب ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ خوبصورت ہوں۔ بال بچے والی ہوں۔ گھر میں روپیہ پیسہ کی ریل پیل ہے۔ نام، عزت، دولت، اولاد، حسن کیا چیز تھی جو میرے گھر میں نہ تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی کی خوش قسمتی نے اس کے میاں کو معمولی اوورسیر سے ایک لکھ پتی ٹھیکیدار بنا دیا آخر یہ خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے؟ مگر آہ کسی کو کیا معلوم، کوئی کیا جانے کہ اس عزت اور دولت کے حصول کی خاطر ایک کمسن شریف لڑکی کی شرافت کا اس کی نیکی، اس کے ارمان اور آرزوؤں، اس کی محبت اور سکونِ قلب، اس کی صحت اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خون کیا گیا ہے ——— کاش اے کاش مجھے یہ بناوٹی عزت، یہ منحوس دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی کاش میں ہمیشہ ایک غریب اوورسیر کی بیوی رہتی۔ ہائے کیا اچھے دن تھے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں قدم رکھا تھا۔ بھیا آپ کو تو یاد ہوگا اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟"

"چودہ یا پندرہ برس کی۔"

"تو بھیا پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ شادی کے بعد تین چار سال میں نے کس قدر خوشی اور اطمینان سے گذارے؟ یہ (پرتاب کی طرف اشارہ کر کے) جو اب میری صورت سے بیزار ہیں۔ اس وقت پروانہ وار مجھ پر نثار تھے۔ میری ہر خواہش پوری ہوتی۔ دن رات میری دلداری

اور دلجوئی کی جاتی۔ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجا جاتا تھا ——— آہ میں اُس وقت انھیں ایک فرشتہ سمجھتی تھی! ——— دُنیا کا بہترین انسان تصور کرتی تھی! دیوتا جانتی تھی!!! مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اس ملمع کے نیچے کھوٹی چاندی بھی نہیں۔ سیاہ لوہے کا ٹکڑا ہے ——— ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوتا کے بھیس میں شیطان ہے"!

پریم اور سوہنی نے حیرت اور خوف سے ماں باپ کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سرسوتی نے پرتاب پر جو خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا نفرت کی نظر ڈالی۔ موہن نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملائمت سے کہا "موہنی میری جان ذرا انسانیت سے کام لو۔ موہنی نے آنسو بھری آنکھیں بھائی کی طرف اُٹھائیں" بھیا سولہ سترہ برس سے میں یہ سب مصیبتیں سہہ رہی ہوں اور کبھی کسی کے سامنے اُف نہیں کی۔ کون سا الزام اُنھوں نے مجھ پر نہیں لگایا۔ کیا کچھ جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت میں نے نہیں اُٹھائی۔ پر اپنا حال لوگوں پر کھلنے نہ دیا ——— خصوصاً اپنے میکے والوں پر کبھی اپنے مصائب کا اظہار نہ کیا۔ کیا اب آخری وقت میں بھی تم مجھے دل کی بھڑاس نہ نکالنے دو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ساری دُنیا کی طرح میرے بھائی بھاوج اور میری اولاد بھی مجھے مجرم گنہگار اور سیاہ کار سمجھیں۔ میں گنہگار ضرور ہوں، بہت ہوں مگر اتنی نہیں جتنی دنیا نے اور اس شخص نے مجھے مشہور کر رکھا ہے"۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا:۔

" میں سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی جب پریم بیٹا تم پیدا ہوئے۔ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میں سچ مچ اپنے کو دُنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی، تھوڑے دن بعد پرتاب نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کا ایک افسر جو اُن پر بہت مہربان تھا۔ انجینیر ہو کر اس شہر میں آیا۔ پرتاب کو امید تھی کہ اگر یہاں ٹھیکیداری کی جائے۔ تو انجینیر صاحب کی عنایت سے خوب چلے گی۔ کچھ روپیہ ہم لوگوں نے کئی سال میں جوڑا تھا، کچھ میرا زیور بیچ کر فراہم کیا۔ افسروں کی سرپرستی سے انھیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور ہمارے گھر میں دولت کی گنگا بہنے لگی۔ سارا خاندان خوش تھا، دوست احباب خوش تھے، یہ خوش تھے اور خود میں بہت خوش تھی ——— آہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اس پر عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ دولت کے ساتھ ساتھ حیثیت بھی بڑھی اور ہم اُونچی سوسائٹی میں آنے جانے لگے۔ تعلیم یافتہ فیشن ایبل عورتوں کے سامنے میں بالکل جاہل گنوار اور بے وقوف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اُن عورتوں کی عادتیں اور طریقے ناپسند تھے۔ دل میں اُن سے نفرت کرتی تھی۔ مگر جب ان کے سامنے جاتی تو اپنے کو کچھ کمتر اور ذلیل سا محسوس کرتی ——— پرتاب نے مجھے انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا اور ایک میم خاص اس لئے رکھی کہ مجھے موجودہ تہذیب اور آداب و معاشرت اور "ہائی سوسائٹی" کے "ایٹیکیٹ" کی تعلیم دے۔ بہت جلد یہ سب باتیں میں نے سیکھ لیں۔

ہم لوگ خوب سیر تماشوں میں مصروف رہتے۔ کبھی سینما، کبھی تھیئٹر، کبھی پک نک اور دعوتیں۔ کبھی بال رُوم میں جا کر تماشا دیکھنا، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے خاص خاص دوستوں سے میری ملاقات بھی کرا دی تھی۔ جنھوں نے مجھ سے بڑی عزّت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ رفتہ رفتہ میں سوسائٹی میں روشناس ہو گئی۔ ہر جگہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔ دعوتوں اور تقریبوں میں سب سے پہلے میرا بلاوا آتا ——— ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ مجھے ملتا، پارٹیوں میں مرکز نگاہ میں ہی ہوتی ——— ہر روز کہیں نہ کہیں آنے جانے دعوت وغیرہ کا پروگرام بنایا جاتا۔ میری گھریلو زندگی روز بروز ختم ہونے لگی۔ اور میں اپنے گھر سے بیگانہ ہوتی گئی ——— گھر کا انتظام اور خرچ باورچی اور بیرے وغیرہ کے ہاتھ میں تھا۔ جن عورتوں سے میں نفرت کرتی تھی اب خود بھی ان کے رنگ میں رنگی جا رہی تھی

دو تین سال بعد سوہنی۔ تم پیدا ہوئیں۔ کئی مہینے بیماری کے سبب مجھے بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ اس زمانے میں، میں نے محسوس کیا کہ پرتاب میری بیماری سے پریشان نہیں بلکہ بیزار سے ہیں۔ دراصل گذشتہ کئی سال ہر وقت اس قدر مصروفیت اور کھیل تماشوں میں بسر ہوئے تھے۔ کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے یا پرتاب کے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں۔

بچی روتی تو خفا ہوتے کہ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کر لیا اور کہا آج کل یہی فیشن ہے کہ میاں بیوی کا بیڈ روم بھی الگ الگ ہو۔ یہ پہلا صدمہ تھا جو مجھے پہنچا مگر میں نے ایک لفظ مُنہ سے نہیں نکالا۔ بچّوں کے لئے آیا ئیں اور گورنس رکھ دی گئی اور مجھے حکم ملا کہ ان کے کمرے بھی الگ کر دو۔ خیر چند مہینے بعد میں اچھی ہو گئی۔ کچھ دن بعد ایک پارٹی میں چیف انجنیئر صاحب نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا۔ پرتاب کا اصرار تھا کہ ضرور جاؤ بہرحال میں گئی۔ میں اُس شخص کی دوستی سے بچنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ میری حد سے زیادہ تعریف اور بے حد خاطر مدارات کرتا اور ان کی طرف رُخ بھی نہ کرتا۔ یہ چیز مجھے کھٹکتی تھی اور ناگوار گزرتی تھی مگر پرتاب اس کی بہت تعریف کرتے اور اس سے تعلقات بڑھانے پر زور دیتے۔ کیوں؟ تاکہ ان کا فائدہ ہو۔ اور انھیں اور زیادہ بڑے بڑے ٹھیکے ملیں۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں پرتاب کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا کہ یہ شخص اس قدر بے غیرت اور خود غرض ہے کہ غیر لوگوں سے بیوی کی دوستی کراتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان سے اسے کوئی عقیدت ہے یا ان کے اخلاق و عادات سے بہت متأثر ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اور زیادہ دولت سمیٹ سکے۔ اسے جائز یا ناجائز ہر طریقے سے لاکھوں کے ٹھیکے ملیں۔ خواہ اس کے لئے بیوی کو بدچلن مردوں سے دوستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے ——"

موہنی نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ موہن نے تھوڑا سا انگور کا عرق اُسے پلایا۔ اور زائد تکئے ہٹا کر آرام سے لٹا دیا۔

"ان کی دولت روز بروز بڑھنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی بدلتی گئی۔ راتوں کو غائب رہتے۔ مجھ سے بے اعتنائی برتتے۔ مزاج میں بھی سختی آ گئی تھی۔ صرف سوشل موقعوں پر مجھ سے اظہارِ محبّت اور خصوصیت ظاہر کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے ان سے بالکل متنفر کر دیا۔ ڈاکٹر! آپ تو جانتے ہیں وہ واقعہ کیا تھا؟ نہیں میں خود بتاتی ہوں! اُنھوں نے ایک بے تکلّف پارٹی میں مجھے جبراً شراب پلائی۔ میں اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گی —— مجھ میں اتنی طاقت اور برداشت نہیں —— انھیں اُس زمانے میں کسی بہت بڑے ٹھیکے کی فکر تھی اور انھوں نے اپنے خیال میں چیف انجنیئر کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ اس دن سے ہمارے تعلقات اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ یہ روز بروز آزاد اور لاپروا ہوتے گئے۔ میں نے وہ ایک مرتبہ شکایت کی تو مجھے سخت سُست کہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ پر سخت شرمناک الزام لگایا۔ میں غصّے میں آپے سے باہر ہو گئی اور برس پڑی۔ انھوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی۔ مارنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ اس کے بعد سے مجھے ان کی صورت سے دِلی نفرت ہو گئی۔ اُنھوں نے مجھ پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کر دی۔ صرف اس پارٹی اور جلسے میں مجھے جانے کی اجازت تھی جس میں یہ خود بھی جائیں۔ یہی حال تفریح اور سینما وغیرہ کا تھا۔ اگر کبھی ملنے والی عورتوں سے یا عزیزوں سے بھی ملاقات کو جاتی۔ تو دو تین نوکر خفیہ پولیس کی طرح میری نگرانی کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ دفتر سے دس مرتبہ فون آتا کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں۔ میری ذلّت کی انتہا ہو چکی تھی۔ دن رات کی کوفت اور روحانی اذیّت نے میری صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ اور اس پر طرہ یہ ہُوا، مجھے کہتے بھی لاج آتی ہے —— ڈاکٹر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں؟ جب کبھی بچّہ ہونے والا ہوتا زبردستی دوائیں پلا کر اور انجکشن لگوا کر اُسے ضائع کر دیا جاتا۔ اس طرح پانچ مرتبہ ہُوا۔ صحت اور بھی بدتر ہو گئی۔ شراب کی لت تو یہ لگا ہی چکے تھے۔ اب میں اپنا غم غلط کرنے کو باقاعدہ شراب پینے لگی۔ اگرچہ یہ خود بھی پیتے تھے۔ اور خود ہی اس منحوس شے کو مجھے زبردستی کر کر کے پلایا کرتے تھے؛ مگر پھر اس کو بھی ملامت اور طعن کرنے لگے۔ میں ضد میں آ کر اور زیادہ پینے۔ مجھے اندر ہی اندر یہ گھن کھائے جاتا تھا کہ اس شخص نے جسے میں اپنا دین، اپنا ایمان، اپنی جان، اپنا دیوتا، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اس نے میری غیرت پر، میری وفاداری پر شک کیا اور مجھ پر اتنا بڑا شرمناک الزام لگایا!"

موہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرتاب جواب تک بالکل خاموش بیٹھا تھا آگے بڑھا اور موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "موہنی —— آج مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا میں غلطی پر تھا اور میری بدگمانی بالکل بے بنیاد تھی —— یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی؟" موہنی نے بیباکی سے پرتاب کی نظروں کا مقابلہ کیا۔ "میں آخری وقت میں جب کہ پرمیشور کے سامنے جانے کو تیار ہوں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گی —— تم

نے مجھ ناسمجھ کم عمر لڑکی کو یہ آزادی کی راہ دکھائی اور اپنی اس ذلیل سوسائٹی سے روشناس کرایا ——— میں کچی لکڑی تھی جس طرف جھکایا جھک گئی۔ بیٹھک میں لوگوں سے ہنستی بولتی تھی۔ مذاق دل لگی کرتی تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب لوگ میرے حسن و جمال کی تعریفیں کرتے تو مجھے سرور سا حاصل ہوتا ——— لوگوں کے اشارے کنایوں میں اظہارِ الفت کو میں قہقہوں میں ٹال دیتی۔ میں نے شراب بھی پی ——— تمہارے مجبور کرنے پر ڈانس بھی کیا ——— لیکن پھر بھی ——— میں پاک ——— باعصمت ہوں۔ میں جھوٹ نہ بولوں گی۔ چیف انجنیئر مجھ سے اکثر اشاروں، کنایوں میں اظہارِ الفت کرتا تھا۔ مگر میں مذاق میں اُڑاتی رہتی ——— ایک مرتبہ اس نے مجھ سے صاف صاف اظہارِ محبّت کیا۔ مگر میں نے اُسے ایسی ڈانٹ پلائی ——— اتنی غیرت دلائی ——— اس قدر شرمندہ کیا کہ وہ رونے لگا۔ مجھ سے معافی مانگی اور تب سے آج تک ——— اُس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور ہمیشہ محبّت اور احترام کا برتاؤ کیا ——— بیشک وہ شریف آدمی ہے اور تم ...... تم ...... نہایت ذلیل ——— کم ظرف ——— بد باطن ——— بدگمان ——— جاؤ ——— جاؤ۔ ایشور کے لئے یہاں سے چلے جاؤ ——— میری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جاؤ ——— تم نے خود بدکاریاں کیں اور اپنی بے گناہ بیوی پر الزام لگائے ——— تمام دُنیا میں بدنام کیا ——— میرے بچّوں کو مجھ سے جُدا کر کے دُور دُور پڑھنے بھیج دیا کہ وہ ماں کی بُری عادتیں سیکھیں گے ...... ان تک کے سامنے مجھے ذلیل کیا ——— چلے جاؤ ——— یہاں سے چلے جاؤ ——— مجھے تم سے نفرت ہے ———"

موہنی کا سر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پریم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سوہنی ہچکیوں سے روتی رہی۔ موہن کا چہرہ رنج اور غصّے کو ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی سُرخ ہو جاتا کبھی زرد اور کبھی سفید۔ پرتاب تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہاب نے نرس کو بلایا۔ دونوں نے مل کر خدا جانے کیا کیا تدبیریں کیں انجکشن دیئے دوائیں مُنہ میں ڈالیں تب کہیں گھنٹہ بھر بعد میں موہنی ہوش میں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریم اور سوہنی کو اشارے سے قریب بلایا اور گلے سے لگایا۔ اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "میرے بچو ...... تمہاری ماں گنہگار ہے۔ تم اس کی مکتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے رہنا ...... اور ...... اس کی ناکام و نامراد زندگی سے سبق لینا۔ دُنیا کی جاہ و منزلت ——— عزّت اور دولت کی خواہش سے کبھی مغلوب نہ ہونا ——— ہمیشہ اپنی ماں اور باپ کی ناکام زندگی کی مثال پیشِ نظر رکھنا۔ سچی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ سچی محبّت اور اعتبار سے، قناعت اور خدمتِ خلق سے حاصل ہوتی ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی "بھیا میں بہت گنہگار ہوں ——— ایشور سے میرے لئے دعائیں کرتے رہنا ——— اور دیکھنا میرے بچّوں کا خیال رکھنا ——— یہ بھی میری طرح تباہ نہ ہو جائیں" موہن سے ضبط نہ ہو سکا۔ بہن کی پٹی پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ ڈاکٹر شہاب بہت پریشان، کبھی موہنی کی نبض دیکھتے، کبھی سانس کی رفتار گنتے، کبھی انجکشن دیتے اور پاؤں کے پاس گرم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ موہنی کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا اور اس پر ایک خود فراموشی، کی سی کیفیت طاری تھی ...... اُس نے آنکھیں کھولی کہ اِدھر اُدھر دیکھا۔ بہت نحیف آواز میں کہا "پرتاب کو بلاؤ ——— میں آخری دفعہ انھیں دیکھنا چاہتی ہوں" سوہنی جا کر پرتاب کو بلا لائی۔ اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور بال پریشان تھے۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا جو کبھی کبھی سوہنی کی ہچکیوں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ پرتاب نے جھک کر اپنا ہاتھ موہنی کے ماتھے پر رکھا ——— اس کی آنکھیں بند تھیں پر لب ہل رہے تھے ——— پرتاب نے اپنا کان اس کے لبوں سے ملا دیا ——— "میں نے ——— معاف کیا ——— معاف کر دیا ——— مجھے اب بھی ——— ہاں ——— اب بھی ان سے ——— محبّت ——— ہے ——— ایشور ——— میرے گناہ ——— بخش دے ——— شاید" پرتاب لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا اور بے تاب ہو کر چیخ اُٹھا۔ "موہنی ——— میری مظلوم موہنی ——— تم بے قصور ہو ——— تم بے گناہ ہو ——— میں نے تم پر بے جا شک کیا۔ خواہ مخواہ الزام دیا ——— میں گنہگار ہوں ——— سیاہ کار ہوں ——— آہ موہنی تو دیوی ہے ———" موہنی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بڑی

بڑی آنکھیں پوری کھلی ہوئی اس وقت بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں ——— ان میں سے موت جھانک رہی تھی! اُس نے پرتاب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ——— لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور ایک نامعلوم سی آواز منہ سے نکلی " اب میں شانتی سے مروں گی ——— ایشور ——— مجھے ——— معاف ——— "

ڈاکٹر نے ہلکے سے موہنی کی کھلی ہوئی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر دیں۔ جن سے آنسوؤں کے دو قطرے اِدھر اُدھر ٹپک پڑے ——— ڈاکٹر نے چادر سے موہنی کا منہ ڈھک دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ——— سارا گھر شور و شیون کی آواز سے گونج اُٹھا۔
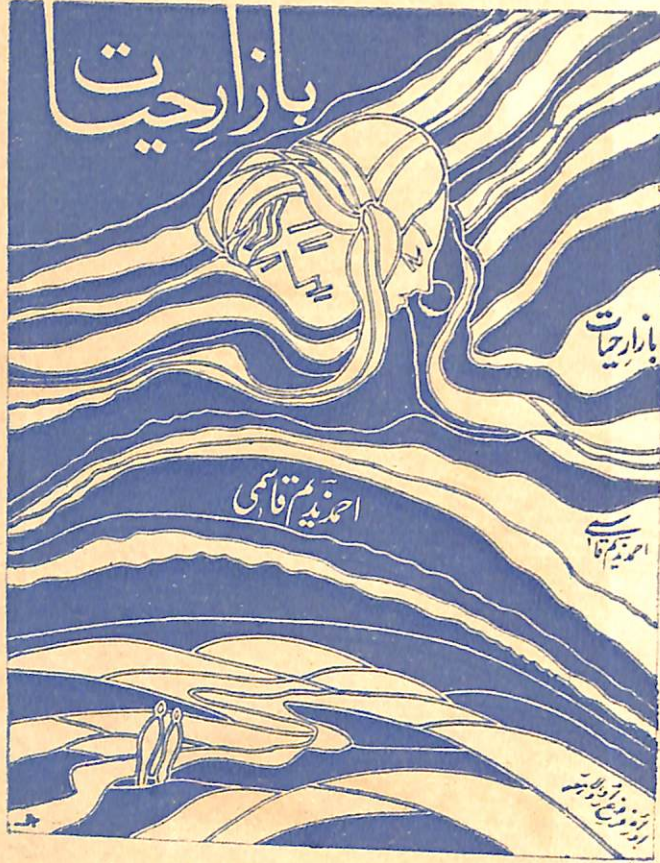
یہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جتنے معیاری افسانے ندیم نے لکھے ہیں اتنے معیاری افسانے اور کسی افسانہ نگار نے نہیں لکھے۔ قیمت ۳/۸